ماہنامہ

# فاران

ماہر القادری

جلد (۱) ـــــ شمارہ (۱۳)

ماھنامہ

# فاران

مدیر

ماہر القادری

اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ آٹھ آنہ

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ گیارہ آنہ

مقام اشاعت

کیمبل اسٹریٹ ـــــ کراچی ـــــ (پاکستان)

## نظم و ترتیب



## حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقشِ اوّل

لوگوں سے ذرا ذرا سی بات پر لڑائی مول لینا اور اُن سے اُلجھنا، شریف آدمیوں کو زیب نہیں دیتا، سلامتی، جنگ میں نہیں صُلح میں ہے، بحث و مناظرہ میں رفتہ رفتہ "مکابرہ" اور "مجادلہ" کا رنگ آجاتا ہے، اور "احقاقِ حق" کا مقصد فوت اور اُس کی افادیت مجروح اور مشتبہ ہوتی چلی جاتی ہے، پند و موعظت، افہام و تفہیم اور احتساب و انتباہ میں "خطابِ عام" زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سُنّت تھی کہ حضور کسی شخص کو اُس کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہتے، تو اُس کا نام نہ لیتے بلکہ فرماتے ـــــ "لوگ ایسا کرتے ہیں، یوں کرتے ہیں" اس طرح غلط کار اپنی لغزش پر متنبہ بھی ہو جاتا اور دوسرے اصحاب بھی اس خصوص میں احتیاط برتنے لگتے۔

مگر کتاب و سُنّت سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب ضرورت محسوس ہوئی ہے تو خطابِ عام کو چھوڑ کر، افراد اور اشخاص کو نام لے لیکر ٹوکا گیا ہے، اور عوام پر اُن لوگوں کی غلطیاں، کوتاہیاں اور گمراہیاں واضح کی گئی ہیں، قرآن پاک جس کی ایک خصوصیت "خطابِ عام" بھی ہے، خود اُس میں بہت سے سرکشوں، باغیوں، جاہلوں، فتنہ و فساد پھیلانے والوں اور اُن افراد کے نام آئے ہیں جو سر سے پیر تک اور نگاہ سے ضمیر تک تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے مگر اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم روشنی میں ہیں اور گمراہیاں جنکا اوڑھنا بچھونا تھیں، وہ اس بات کے مُدعی تھے کہ جہاں جہاں ہمارے نقشِ قدم نظر آتے ہیں، بس وہی صراطِ مستقیم ہے، قرآن نے ان خطا کاروں، ظالموں اور گمراہوں کی نشان دہی کی، اُن کے نام بتائے اور قرآن ہی کے اس تعارف کی بدولت آج ہم جالوت، فرعون، قارون، حضرتِ نوح کے نافرمان بیٹے، جناب لوط کی غلط اندیش بیوی اور اُن قوموں کے ناموں کارناموں اور کرتوتوں سے واقف ہیں، جن پر اُن کے انکار، جحود، سرکشی اور فسق و فجور کے سبب اللہ کا غضب نازل ہوا ـــــ یہاں تک کہ کُفّارِ قریش کے عام تذکرے کے علاوہ، اُن کے ایک فرد ـــــ ابو لہب کے نام لینے کی ضرورت محسوس فرمائی گئی۔

ہم نے پچھلے شمارے میں جو شخصی تنقید کی تھی وہ ایک فرض ناگوار تھا جو ہمیں ادا کرنا پڑا، ہم کئی مہینہ تک طرح دیتے رہے! مگر جب ہم نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے اور غیر ذمہ دار قلم کی بے لگام گھوڑے اور شتر بے مہار جیسی حالت ہو گئی ہے تو پھر ہم نے کھُل کر تنقید کی، تلمیحوں، اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کرتے تو سیدھی سادی بات ایک "معمہ" اور "پہیلی" بن کر رہ جاتی ——— آج کی صحبت میں معمول کے مطابق ہمارا خطاب شخصی نہیں عمومی ہے، مگر گزشتہ تنقید سے یہ کوئی غیر متعلق بھی نہیں ہے، یہ ایک اُصولی بحث ہے، ہمیں دلوں کی عُقدہ کشائی کا دعویٰ نہیں ہے لیکن چونکہ ہم حق کی حمایت کر رہے ہیں اس لئے اللہ کے فضل کی بدولت اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کوئی خلوص کے ساتھ ہماری تحریر کو پڑھ کر، اُس پر غور کریگا تو انشاء اللہ حق کو واضح پائے گا ——— اور کیا عجب ہے کہ کسی کسی کے دل کی گرہ بھی کھُل جائے۔

خدا، نبی، قرآن، دین اور اسلام ——— اپنی ذات سے جو کچھ ہیں، وہ ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی واقع ہوئے ہیں جو اس غلط اندیشی کا شکار ہیں کہ جو کچھ ہم سوچتے اور سمجھتے ہیں، اللہ، رسول، کتاب اور دین و اسلام کو اُسی طرح کا ہونا چاہیئے، اور اگر وہ اُس انداز کے نہیں ہیں تو وہ انشا پردازی، تاویلوں، دلیلوں اور نکتہ سنجیوں کے زور سے ایسا بنا کر چھوڑیں گے۔ ——— ایک تو ہے خود "حق" کا تقاضا، اور ایک ہے کسی انسان کا خود اپنی طبیعت اور رُجحان کا مطالبہ اور تقاضا، تو بعض کم نظر چاہتے ہیں کہ وہ "حق" کے تقاضوں کا ساتھ نہ دیں بلکہ "حق" اُن کے خود ساختہ نظریوں اور ذاتی تقاضوں کی ہاں میں ہاں ملائے۔

ہونا یہ چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھ کر کسی مسئلہ میں کوئی نظریہ، عقیدہ، تصور اور نصب العین متعین کیا جائے مگر جو لوگ اجتہاد و جدت کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ کرتے یہ ہیں کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں، اور اُس نظریہ کو ذہن میں رکھ کر، قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کا نتیجہ ظاہر ہے یہی نکلتا ہے کہ وہ قرآن کی کسی آیت کی شرح کرتے ہوتے ہیں مگر اُس شرح میں خود اُن کا اپنا پہلے سے متعین کیا ہوا نظریہ بولتا ہوتا ہے۔

مثلاً بعض فلسفیوں نے یہی تو کیا کہ پہلے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر کچھ نظرئے قائم کر لئے، اُس کے بعد قرآن پر غور کرنا شروع کیا اور قرآن کی تفسیر کو پیچ پیچ ژند پاژند بنا دیا، جس کسی سے بھی یہ غلطی سرزد ہوئی اُس نے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا، اور اُس کی فکر کی گمراہی اور خود رائی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبی۔

ایک شخص پر معیشت اور اقتصادیات کا غلبہ ہے، قرآن کو وہ اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اُس کے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج وہ نہیں ہو سکتے جو قرآن کے ہونے چاہئیں حالانکہ قرآن کا مطالعہ اور اُس میں تدبر، معیشت و اقتصاد کے بارے میں خود قرآن کا نقطۂ نگاہ اور منشا معلوم کرنے کیلئے ہونا چاہیئے تھا ——— مفکرین کا ایک گروہ جس پر عقل کا بے پناہ غلبہ تھا ——— (اس طنز سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں عقل پر طنز اور جہالت کی مدح کر رہا ہوں، کہنا یہ ہے کہ وہ خدا جس نے انسانوں کو بار بار تفکر، تعقل اور تدبر کا حکم دیا ہے وہی خدا "ایمان بالغیب" کا بھی حکم دیتا ہے، اور اس بات کو سب جانتے ہیں کہ "غیب" اُس تجربہ اور مشاہدہ سے ماوراء ہے جو عقل کا سب سے بڑا سہارا ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ کی آیتوں میں عقل اور ایمان بالغیب ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جس نے صرف "ایمان بالغیب" ہی کو سب کچھ سمجھا اور عقل کو بالکل معطل کر کے چھوڑ دیا، تو اُس نے ایک افادیت کو ضائع کر دیا، اور جس نے "عقل" ہی کو حق و صداقت کا معیار ٹھہرایا یہاں تک کہ "غیوب" جن پر ایمان لانا بہر طور ضروری تھا، اُن کو بھی عقل کی کسوٹی پر کسنا چاہا تو وہ بھی غلط روی سے نہ بچ سکا) ——— ہاں!

تو ہیں اہلِ فکر کے جس گروہ کا ذکر کر رہا تھا اُس نے جنّت، دوزخ، معاد، حشر و نشر، حضرت موسیٰؑ کے عصا سے سمندر کے پھٹ جانے کا واقعہ ——— اور اس قسم کے تمام حقایق کی عقل کے زور سے ایسی ایسی تاویلیں کیں گویا کہ وہ ان حقایق سے پیچھا چھڑانا (اعتزال) چاہتا ہے، اس قسم کی "فکر" خود ایک "مکتبۂ خیال" بن گئی اور عقل کی اس چُنان چنیں اور نکتہ آفرینی نے ہدایت کو جو قرآن کا منشا تھا بڑی اُلجھنوں

## قرآن کا موضوع

ہر ایک کتاب کا ایک موضوع ہوتا ہے، اور قرآن کا موضوع "ہدایت" ہے! اُس میں زمین سے سبزے کی روئیدگی اور درختوں اور شاخوں کا جہاں کہیں ذکر آگیا ہے، تو اُس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالےٰ "نباتیات" کے مسائل بیان فرما رہا ہے، یا جہاں چاند سورج ستاروں اور آسمانوں کا بیان ہے اُس کو "علم الافلاک" سمجھ لینا شوخیٔ فکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں جو کچھ بھی فرمایا ہے اُس کی غایت صرف "ہدایت" ہے ——— وہ عاد و ثمود کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ عاد و ثمود کے آثار کو کھود کھود کر، کچھ چیزیں برآمد کی جائیں اور وہ "دارالانطیقات" کے show cases کی زینت بنی رہیں، یا آثارِ قدیمہ اور حفریات کے کوئی ماہر ایک اچھا سا مقالہ لکھ کر چھپوا دیں، ان مغضوب اور مقہور قوموں کا اللہ نے ذکر اس لئے کیا ہے کہ سُننے والوں کو عبرت حاصل ہو، اور اس طرح وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں ——— اگر یہ کوششیں طلبِ ہدایت اور حصولِ عبرت کیلئے ہوں تو مستحق تبریک اور لائقِ تحسین! اور اگر اُن کا مقصد صرف "علمی ریسرچ" ہو، تو یہ سعی قرآن کے منشاء کے اعتبار سے بالکل ناقص اور ادھوری!

قرآن جامع اس اعتبار سے نہیں ہے کہ دُنیا کے تمام علوم و فنون اُس میں آگئے ہیں، اگر یہ بات قرآن سے منسوب کر دی جائے تو ایک ایک پیشہ والا اپنے ہُنر کیلئے قرآن سے کچھ "some instructions" طلب کریگا، درزی کہے گا کہ میں کپڑوں کی تراش کے اُصول جاننا چاہتا ہوں، باورچی پکاریں گے کہ کھانا پکانے کے طریقے ہمیں بتاؤ، ریاضی کے طلبا چیخیں گے کہ ریاضی کے فلاں نظریہ اور "   " کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟ فلسفیوں، سائنسدانوں، شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے اسی انداز پر مطالبے پیش ہوں گے ——— اور زمخشری اور رازی بھی ان لوگوں کو مطمئن نہ کر سکیں گے۔

قرآن اس اعتبار سے بلا شُبہ نہ صرف جامع بلکہ جامع ترین کتاب ہے کہ اُس میں "ہدایت" کے بنیادی اُصول اللہ تعالےٰ نے بیان فرما دیئے ہیں، ان اُصولوں کا انسانی زندگی سے اتنا گہرا ربط اور قریبی تعلق ہے کہ قرآن کی ہدایت اور حیاتِ انسانی کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا، جو زندگی قرآن سے ربط اور مطابقت نہیں رکھتی وہ غیر فطری اور مصنوعی زندگی ہے اُس میں اصلیت کم اور بناوٹ زیادہ ہے؟

جس خدا نے قرآن کو ہدایت کا آخری صحیفہ اور انسانیت کیلئے جامع ترین دستور بنا کر بھیجا ہے، اُسی خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اطاعت" کو فرض قرار دیا ہے اور حضورؐ کے "اُسوۂ حسنہ" میں انسانوں کیلئے فلاح و نجات کو جمع فرما دیا ہے، قرآنی ہدایت اور اُسوۂ حسنہ کا اتنا گہرا ربط ہے کہ جہاں اُسوۂ حسنہ کا اتباع ہے وہاں خود بخود قرآنی ہدایت کی اطاعت پائی جاتی ہے اور جس جگہ قرآن کی ہدایت کی اطاعت ہے وہاں، رسول اللہ کا اُسوۂ حسنہ بھی اُس اطاعت میں شامل ہے اس لئے رسولؐ کی اطاعت اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ سے بیزاری، خود اللہ اور اُس کی کتاب سے بیزاری ہے ——— اور یہ بات ہم کسی تصوّف آمیز عقیدے کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، قرآن یہی کہتا ہے، اللہ تعالےٰ کا یہی منشا ہے اور جو کوئی بھی قرآن میں تدبّر کریگا وہ اسی نتیجہ پر پہونچے گا جس پر ہم پہونچے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ضرور سمجھ لیجئے ——— اللہ تعالیٰ جو اپنی "اطاعت" کیلئے بار بار حکم دیتا اور

تاکید فرماتا ہے، آخر "اطیعوا اللہ" سے مراد کیا ہے، اس لئے کہ نہ خدا کو ہم دیکھتے ہیں اور نہ اُس کی آواز سُنتے ہیں تو پھر اللہ کی اطاعت آخر ممکن کس طرح ہے؟ اس طرح کہ اُس کے قول کی اطاعت کی جائے اور خدا کا قول سُننے والوں نے رسولؐ کی زبان سے سنا ہے اور اللہ کی اطاعت کے طریقوں کو رسول اللہؐ سے سیکھا ہے اور اطاعت کے یہ طریقے "احادیث" کی کتابوں میں مذکور ہیں ـــــ اگر "اُسوۂ رسولؐ" کو درمیان سے خارج کر دیا جائے تو قرآن کی "جامعیت" اپنی جگہ باقی رہے گی مگر وہ تفصیل، تشریح، تعبیر اور اطاعت کے طریقے گم ہو جائیں گے، جو دین کی عمارت کے ستون ہیں۔

قرآن پاک میں "صلوٰۃ" کا بار بار حکم آیا ہے۔۔ مگر نماز کس طرح پڑھی جائے اور اس حکم کی تعمیل اور اس فرض کی تکمیل کس طرح ہو، رسول اللہؐ کی "احادیث" بتاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے "زکوٰۃ" کو فرض قرار دیا، اور پھر رسول اللہؐ نے اللہ ہی کے حکم سے نصاب زکوٰۃ کی تعیین فرمائی اور خود زکوٰۃ کے نظام کو قایم فرما کر دکھا دیا، جہاد کا وہ حکم جو درخت کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں پر لکھا تھا اور مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ تھا اُسے رسول اللہؐ نے بدر و اُحد کے میدانوں میں متشکل فرما دیا، یہی حال دوسرے فرائض، واجبات اور معروفات (نیکیوں) کا ہے، اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے، رسول اللہؐ اپنے عمل سے اُس حکم کو تشکیل دیتے ہیں، احکامِ الٰہی کی یہی تشکیل "اُسوۂ حسنہ" ہے جو احادیث کے مجموعوں میں پائی جاتی ہے ـــــ یُوں سمجھئے کہ وہ ہدایت جو قرآن میں ایک جامع اصول کی حیثیت رکھتی ہے، رسول اللہؐ کے اُسوۂ حسنہ میں مفصل نظر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "معروف" و "منکر" کی جامع اصطلاحیں بیان فرمائی ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ "معروف" کے سرچشمے یہ ہیں، اور "منکر" کی خبیث جڑیں یہاں سے پھوٹتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں یہی احکام مفصل ملتے ہیں اور یقیناً اُن کی حیثیت تشریعی ہے، رسول اللہؐ جس چیز کے بارے میں حلت اور حرمت کا حکم دیتے ہیں، تو وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، اور قرآن کے "معروف" و "منکر" کے عین مطابق!

غلط سمجھتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہؐ کی احادیث قرآن میں چونکہ اضافہ کرتی ہیں، اس لئے "قرآن" پر ناتمام ہونے کا حرف آتا ہے ـــــ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ رسول اللہؐ کی احادیث قرآن کے جامع احکام کی تفصیل پیش کرتی ہیں اور کسی متن کی تشریح، تفسیر، تفصیل اور عملی تشکیل، متن پر اضافہ نہیں ہوا کرتی، تشریح و تفصیل کے بعد بھی متن کی جامعیت اور اولیت کا شرف اپنی جگہ باقی رہتا ہے! قرآن کسی سہارے کا محتاج نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے بندوں کی سہولت اور آسانی کے لئے رسول اللہؐ کے "اُسوۂ حسنہ" کو دین و کتاب کے منشاء اور اُس کی غایت کا مظہر بنا دیا ہے۔

اس پر بھی اگر یہی کہا جائے اور کوئی اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے کہ "احادیث" قرآن پر اضافہ کرتی ہیں، تو پھر اس ذہنیت کا شخص ہم سے پوچھنے کی بجائے خود اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ اُس نے اپنی "اطاعت" پر "اطاعتِ رسولؐ" کا اضافہ کیوں گوارا کیا، اور قرآن کی جامع تعلیم کی موجودگی میں رسول اللہؐ کے "اسوۂ حسنہ" کی اتباع کو کیوں ضروری سمجھا۔

اب ایک دوسری بحث "یقین" اور "ظن" کی باقی رہ جاتی ہے، جس پر ہم گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ یہ آخری اُلجھن بھی دُور ہو جائے؟ یقیناً یہ بات اپنی جگہ صحیح اور درست ہے کہ قرآن کی آیتیں "یقینی" اور رسول اللہؐ کی احادیث "ظنی" ہیں! یعنی جس یقین کے ساتھ ہم قرآن کی ہر آیت کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ ہی کا کلام ہے، اُس یقین کے ساتھ رسول اللہؐ کی ہر حدیث کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہؐ نے لفظاً لفظاً ایسا ہی فرمایا ہوگا، اس اعتبار سے قرآن "یقینی" اور احادیث "ظنی" ہیں!

قرآن کے ایک حرف کے بارے میں بھی دو رائیں نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح اُسے نازل فرمایا تھا حرفاً حرفاً وہ اسی طرح

موجود ہے مگر احادیث میں یہ صورت ملتی ہے کہ ایک ہی حدیث کو دو یا چند راوی روایت کرتے ہیں، اور لفظوں میں کمی بیشی ہو جاتی ہے —— اس لحاظ سے بھی قرآن "یقینی" اور احادیث "ظنی" ہیں۔ (یہاں "ظن" کا "گمان" پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے، جسکو عام اصطلاح میں ظن و تخمین" مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ احادیث چونکہ "ظنی" ہیں اس لئے اُن پر عمل نہ کرنا چاہیئے —— کیا اپنی زندگی میں ہم "یقینی" باتوں کے علاوہ "ظنی" باتوں پر عمل نہیں کرتے؟ ڈاکٹر دوا دیتا ہے اور ہم اُسے ذرا سا بھی تامل کئے بغیر پی لیتے ہیں — حالانکہ ہم دوا کے بارے میں "یقینی" طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب کی سب صحیح ہیں، ہم موٹر، ریل اور ہوائی جہاز میں کھٹ سے سوار ہو جاتے ہیں حالانکہ ہمیں اُن کے کل پُرزوں اور مشینوں کے بارے میں پورا یقین نہیں ہوتا کہ یہ بالکل ٹھیک حالت (normal condition) میں ہیں! —— یہی حال زندگی کے دوسرے معاملات میں ہے کہ "ظن" پر ہم عمل کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ "ظن" پر عمل کرنا عقل اور فطرت کے مخالف نہیں ہے اور "ظن" پر عمل کرتے سے اس زندگی میں مفر ممکن نہیں۔

ایک اہلِ دل بزرگ نے بڑی حکمت کی بات کہی کہ ماں کے بارے میں تو یقین کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ یقینی فلاں شخص کی ماں ہے، مگر باپ کے بارے میں اُس یقین کے ساتھ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اس لئے ماں کے وجود کا علم "یقینی" ہوا اور باپ کا "ظنی" —— پس قرآن کو (بلا تشبیہ) ماں کے وجود کی طرح "یقینی" سمجھو اور احادیث کو باپ کے وجود کی مانند "ظنی" —— بعض باتیں از قسمِ لطائف ہوتی ہیں مگر اُن میں گہری حکمت پائی جاتی ہے، یہ بھی اُسی طرح کا حکمت آمیز نکتہ ہے۔

## ذہنی انارکزم

جو لوگ تشکیک و تذبذب میں مبتلا ہیں اور ابھی تک دین اور اسلام کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ ہی نہیں کر سکے، اُن سے ہم کچھ کہنا ہی نہیں چاہتے، اُن کا جب تک جی چاہے تحقیق کرتے رہیں —— ہمارے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے یقین و ایمان کی لازوال دولت سے نوازا ہے، اور خدا رسولؐ، اور دین و اسلام کے بارے میں کسی قسم کا شک نہیں رکھتے —— اُنہی کی آگاہی کے لئے کچھ ضروری باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

ایک تو وہ ہیں جو کھُل کر دین اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں، اُن کے شر اور فساد سے بچنا ممکن ہے —— مگر کچھ ایسے لوگ بھی اندنوں پیدا ہو گئے ہیں جو دین کے نام پر بے دینی پھیلاتے ہیں، جو اسلام کی حمایت کی آڑ میں، خود اسلام ہی کی جڑیں کاٹتے ہیں، جو قرآن کا نام لیکر چلاتے ہیں، اور قرآن میں معنوی تحریف کرنا جن کی "[illegible]" بن گیا ہے، جو رسول اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر حضورؐ کی احادیث کو ناقابلِ اعتبار، اور ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں" ان لوگوں کے فریب سے بچنا مشکل ہے، دشنہ در آستینی اور تبسم بر لبی آدمی کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے، یہ وہ سفاک ہیں جو ہنس ہنس کر متاعِ دین و ایمان لوٹ لیتے ہیں۔

ذہنی انارکسٹوں کا ایک گروہ ہے، جس کے نزدیک فہمِ قرآن کے لئے رسول اللہؐ کی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار نہ صرف غیر ضروری بلکہ بیکار ہیں، پچھلے مفسرین کی ان کی نگاہ میں وقعت اس لئے نہیں ہے کہ وہ لوگ احادیث و آثار پر اعتماد کرتے تھے، فقہ پر یہ دریدہ دہن "جنسیات" کا الزام لگاتے ہیں —— ان کو اپنی عقل و فہم پر پورا اعتماد ہے، بس اُسی کے زور اور بل بوتے پر قرآن کے "معارف"۱؎ کے دریا بہاتے چلے جاتے ہیں، یہ قرآن کے نہیں خود اپنی عقل کے پیرو اور غلام ہیں —— ان کی عقل جو کہہ دے وہ دُرست اور بجا ہے اُس کے لئے خود قرآن میں کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ

۱؎ بزعمِ خود

کیوں نہ کرنی پڑے ——— اور ایسا یہ کرتے رہتے ہیں ——

اس ذہنیت کے لوگ قرآنِ حکیم کی تفسیر اس جذبہ کے تحت کرتے ہیں کہ قرآن پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اُس سے ہٹ کر کوئی نئی بات ہمیں کہنی ہے۔ "جدت طرازی" کا یہ لپکا قرآن کی تفسیر کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے، قرآن ہی کے نام پر قرآن کی رُوح کو یہ لوگ ذبح کرتے ہیں۔

مثلاً سورہٗ "الم ترکیف" کی تفسیر وہ اس انداز میں کریں گے :—

"ہم قرآن کی تفسیر کا ایک نیا باب دُنیا کے سامنے کھول رہے ہیں، اب تک جو کچھ کہا جاتا رہا ہے وہ کورانہ تقلید تھی، آبا پرستی تھی، نقل در نقل کا ایک ایسا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، جس نے فکر و عقل کو عقیم بنا دیا تھا، اسرائیلی روایتیں اور عرب کے جاہلانہ دور کی تاریخی کہانیاں دل و دماغ پر مستولی تھیں، ہم نے قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی ہے!

اگر گزشتہ تفسیروں سے ہمارے نتائج قرآنی کا تصادم ہوتا ہے، تو ہم اس کے لئے معذور ہیں، ہم شخصیتوں کے اقوال کی رعایت کے لئے اللہ کے کلام میں قطع و برید گوارا نہیں کر سکتے۔

"فیل" سے مراد کجلی بن کا وہ بھاری بھرکم اور کوہ پیکر جانور نہیں ہے جس کے سونڈ ہوتی ہے، اور نہ "طیرا ابابیل" سے ہواؤں میں اُڑنے والی چڑیاں مراد ہیں" قرآن پاک میں اللہ پاک نے حقایق کے اظہار کے لئے استعاروں اور تشبیہوں کے کچھ "Symbols" مقرر فرما دیئے ہیں، اگر گزشتہ مفسرین کی طرح "فیل" سے یہی ہاتھی اور "ابابیل" سے پرند مراد ہوں، تو قرآن کی جامعیت بہت محدود ہو جائے گی، سُنیئے! "اصحاب فیل" سے باطل کی قوت اور "طیرا ابابیل" سے "حق" مراد ہے، یعنی یہ کہ حق جو بہ ظاہر کمزور دکھائی دیتا تھا، اُس نے باطل کے شکوہ کو غبار کی طرح اُڑا دیا۔ ۔ ۔ ۔"

یہ "کفر" ہم نے صرف مثال اور نقل کیلئے گوارا کیا ہے، اور یہ نمونہ ہم نے اُن کی خود ساختہ تفسیروں کے انداز پر خود ہی پیش کیا ہے، جو مفسرین اسرائیلی روایتوں کی کثرت کے لئے بدنام ہیں، وہ اِن بے راہ روں سے ہزار بار اچھے تھے کہ اُن کے یہاں کوئی نہ کوئی اُصول اور ضابطہ تو پایا جاتا ہے ——— اور پھر اُن کی تفسیروں میں صرف اسرائیلیات ہی نہیں ہیں، احادیث اور آثار بھی ملتے ہیں، اُن میں خلوص و تقویٰ کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں ——— اور یہ داستان سرا اور افسانہ نگار "مفسر" تو قرآن کے ساتھ مذاق کرتے ہیں، اللہ کی کتاب کو اُنہوں نے بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے، کاش! ان لوگوں کے دلوں میں، خدا کا ذرا سا بھی خوف ہوتا اور اپنی ادبی صلاحیتوں کو شرحِ قرآن کی بجائے افسانوں اور ناولوں میں صرف کرتے تو علم و ادب کی کوئی خدمت تو انجام دے سکتے؟

قرآن کی یہ افسانوی تفسیریں، فتنۂ اسلام اور آشوبِ دین ہیں، ان کے پڑھنے سے کچھ ادبی استعاروں اور شاعرانہ تشبیہوں کا تو اضافہ ہو سکتا ہے، مگر دل میں وہ گداز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جس کا نتیجہ "خشیتِ الٰہی"، "حبِ رسولؐ" اور "رغبتِ دین" ہونا چاہیئے۔

قرآن مکمل ترین دستورِ حیات اور قانونِ زندگی ہے ——— انفرادی بھی اور اجتماعی بھی! اس کی تنزیل کا منشا ہی یہ ہے کہ قرآن کی جامع ہدایت کے تحت انسان اپنی زندگیاں گزاریں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاشرت، معاملت، حکومت، فراست، تقویٰ، نیکو کاری، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ اُن کو جُدا نہیں کیا جا سکتا! ———

یہ درست ہے اللہ تعالےٰ کے نام پر جو جانور قربان کئے جاتے ہیں، اُن کا گوشت پوست نہیں بلکہ دلوں کا خلوص اللہ کے یہاں پہونچتا ہے، مگر دل کا یہ "خلوص" اور جانوروں کی قربانی کی رسم دونوں ملے جلے ہیں، کوئی گمراہ یہ مشورہ دے کہ بس "خلوص" ہی کافی ہے، قربانی کی ظاہری رسم کی ضرورت نہیں تو وہ قرآن میں تحریف اور دین کے ساتھ مذاق کرتا ہے، یہی حال دوسرے ارکان اور مناسک کا ہے کہ آدمی نیکوکاری اور تقویٰ کی کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ پہونچ جائے مگر اُن ظاہری ارکان کی پابندی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، یہی اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ کی سُنّت ہے۔

جس تفسیر میں اس قسم کے رجحانات پائے جاتے ہوں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے واجبات کی بس "روح" سے سروکار رکھو، یہ ظاہری پابندیاں تو رسمیں ہیں، سمجھ لو کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بے دینی اور زندقیت ہے، اس الحاد کی وبا سے خود بچو اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کرو ———!

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ اس عرصہ میں ہمارے پاس ماہ مارچ کے "نقشِ اول" کے بارے میں خطوط موصول ہوئے، جن میں ہمارے معروضات کو قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھا گیا، ان میں سے ایک خط جو جناب عبد المجید حیرتؔ شملوی نے موڑک (راجھستان) سے ۱۰ر مارچ کو لکھا ہے، ذیل میں درج کرتے ہیں :—

"(القاب و آداب کے بعد) مارچ کا فاران کل ۹ر مارچ کو ملا، جناب پرویز میرے دیرینہ کرم فرما ہیں بلکہ محسن، دو سال سے طلوعِ اسلام بھیج رہے ہیں اور مفت، یہی نہیں بلکہ میرے اشتیاق کی یہاں تک پذیرائی کی کہ معارف القرآن جلد چہارم بھیجی اور بلا قیمت! لیکن مجھے اُن کے بہت سے خیالات سے اختلاف رہا اور اُن کی اس روش پر افسوس کہ وہ دین میں ایسے مباحث چھیڑ رہے ہیں جن سے ملت میں فتنہ و فساد کا دَر باز ہوتا ہے، میں نے اپنے بعض عریضوں میں اُنھیں اس پر روکا اور ٹوکا بھی، لیکن ظاہر ہے کہ مجھ ایسے بے علم کے کہنے کا اُن پر کیا اثر ہو سکتا تھا، بہر حال جی چاہتا تھا کہ کوئی خدا کا بندہ اُٹھے اور اُن کی خاص طور سے مزاج پُرسی کرے! الحمد للہ کہ آپ نے اس فرض کا احساس کیا اور اس شدومد سے کیا، جزاکم اللہ اس موضوع پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، میں اس سے بہتر کا تصوّر نہیں کر سکتا، پھر آپ نے اُن کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے بلکہ امرِ حق واضح کیا ہے اور پرویز صاحب کے مزعوماتِ لایعنی سے آگاہ ——— میں ہنوز اُن سے مایوس نہیں ہوں، ممکن ہے بہ توفیقِ الٰہی اپنی غلطی سے رجوع کر لیں[1]۔ غلطی سے علی الاعلان رجوع کرنا شاید سب سے مشکل جہاد ہے، لوگ آن پر جان دیتے ہیں مگر آن نہیں چھوڑتے، کاش! کوئی یہ بھی دیکھے کہ غلطی پر اصرار کوئی آن نہیں بلکہ جہالت ہے اور اُس کا اقرار عند اللہ و عند الناس محمود!

دین کے بارے میں پرویز صاحب نے ابھی تک دماغ سے کام لیا ہے، دل سے نہیں! اور ان کی مشکل یہ ہے کہ وہ عقل کے قایل ہیں، وجدان کے نہیں! وہ استدلالی ہیں، پائے چوبینی کی بے تمکینی کے باوجود چلتے ہی رہیں گے، یہ کہ ٹانگ بالکل جواب دیدے، ایسے حضرات کی قلبِ ماہیت کے لئے تو نگاہِ مردِ مومن کی ضرورت ہے اور اس کا ملنا مشکل! ... ... ..."

ماہر القادری
۲۸ مارچ سنہ ۵۰ء

[1] ہم اس دعا پر صدق دل سے "آمین" کہتے ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

# محراب و منبر سے لیکر حرم سرا

## اور رزم گاہ تک!

علم و ادب کی روشنی، عیش و عشرت کی دھوپ چھاؤں، بلندیوں کے ساتھ پستیاں بھی! تلواروں کی چھاؤں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں! ـــ جب شعر، نغمۂ، سیاست، سخاوت، جرأت، بہادری اور تیغ و ربط ایک ساتھ بول رہے تھے اور علم اذان دے رہا تھا۔

تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ہارون الرشید کے عہد حکومت میں سلطنتِ عباسیہ اپنے اوج کمال کو پہونچ گئی تھی، حکومت کی سطوت، فتوحات کی فراوانی، رعایا کی خوش حالی، اقتصادی اور علمی ترقی، دربار کی شان و شوکت اُمرا کی ثروت اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے علاوہ خود ہارون کی شخصیت اس قدر مسحور کن، اور جاذبِ توجہ تھی کہ عوام اور خواص شاعر اور ادیب، علماء اور فقہا، عسکری اور بدوی، سب اس کی توصیف میں رطب اللسان تھے۔

مشیت ایزدی نے ایک طرف اس کی ذات کو مجموعہ کمالات بنا دیا تھا (بایں معنیٰ کہ وہ بیک وقت شاعر بھی تھا ادیب بھی، عالِم دین بھی تھا، ماہر سیاست بھی، فنون لطیفہ کا قدردان بھی تھا اور فلسفہ و حکمت کا سرپرست بھی، بادشاہ بھی تھا اور زُہاد کا خادم بھی منتظم اور مدبّر ملک بھی تھا اور مرد مجاہد بھی) تو دوسری طرف اُسے بہترین خدّامِ سلطنت اور اصحاب الرائے بھی عطا کر دیئے تھے مثلاً یحییٰ بن خالد برمکی اس کا اتالیق تھا فضل اور جعفر اس کے وزیر تھے امام ابو یوسف جیسا فقیہ اس کا قاضی تھا، مروان ابن ابی حفصہ جیسا شخص اس کا شاعر تھا، عباس بن محمد جیسا شخص اس کا ندیم تھا، فضل بن ربیع جیسا شخص اس کا حاجب تھا، ابراہیم موصلی اس کا مُغنّی تھا فضیل ابن عیاض اور ابن سماک جیسے زاہد اور عابد اس کے ناصح تھے سفیان ثوری جیسے محدث اس کے ہمنشین تھے اور زبیدہ جیسی عاقلہ اور مذہب دوست خاتون اُس کی بیوی تھی۔

اس مضمون کے لکھنے سے میرا مقصد ہارون کی پوری زندگی بیان کرنا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے

تو ایک مستقل کتاب درکار ہوگی بلکہ اس کا محرک حقیقی، صرف ایک واقعہ ہے جو ہارون الرشید کو اپنی زندگی میں پیش آیا تھا۔ اس واقعہ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے یہ مختصر مضمون مرتب کر دیا۔ وہ واقعہ کیا تھا؟ اس کا ذکر اس جگہ کرنا نہیں چاہتا، میں اس واقعہ کو مضمون میں بیان کر دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ ناظرین خود سمجھ جائیں گے۔ میرا مقصد اس مضمون کے لکھنے سے یہ ہے کہ کاش! حکومت پاکستان میں بھی باطل اور مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی اسی طرح جرأت پیدا ہو سکے، لیکن یہ بات اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب اربابِ اقتدار اور عوام دونوں کے قلوب عشقِ رسول ؐ سے معمور ہو جائیں۔

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
(اقبالؒ)

## ولادت

ہارون الرشید ماہ رجب ۱۴۵ھ/۷۶۵ء میں بمقام رَے پیدا ہوا اُس کا باپ مہدی اس زمانہ میں اس صوبہ کا گورنر تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

ہارون بن مہدی بن منصور بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب۔ حضرت عباس، سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔

ہارون کی ماں کا نام خیزران تھا یہ خوش نصیب خاتون، خلیفہ مہدی کے محل میں ایک کنیز کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔ غالباً اس کے حسن و جمال کی بنا پر مہدی نے اس کو ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا نہایت عاقلہ اور فرزانۂ روزگار تھی شیخ سعدی کا وہ مشہور شعر　بالائے سرش ز ہوشمندی　می تافت ستارۂ بلندی　اس خاتون پر حرف بحرف صادق آتا تھا۔ اپنی عقلمندی اور دلکشی اور شخصی خوبیوں کی بدولت چند ہی سال میں ملکہ بن گئی۔ ہادی اور رشید کی ولادت کے بعد مہدی نے اس کو آزاد کر کے ۱۵۹ھ میں اُس سے نکاح کر لیا تھا۔ مہدی کی وفات پر جب اس کا بڑا بیٹا ہادی تخت نشین ہوا تو خیزران، حکومت کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی، روزانہ قصر الخلد میں باقاعدہ دربار کرتی تھی اور تمام وزراء اسی کی بارگاہ عالیہ سے احکام حاصل کرتے تھے۔

## تعلیم و تربیت

جس شخص کا باپ (مہدی) اور دادا بغداد کے حکمراں ہوں ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم میں کیا کچھ اہتمام نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ یحییٰ بن خالد برمکی، جو وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز تھا اور جملہ علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھا، اس کا اتالیق مقرر ہوا، اس کے علاوہ اُس کی تربیت ہر فن کے اربابِ کمال کے سپرد ہوئی، لیکن ہارون بذاتِ خود علم کا شایق تھا اس لئے اُس نے جملہ علوم و فنون میں مہارتِ تامّہ حاصل کی۔

اس کی علم دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام سیوطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دو بادشاہ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے طلب علم کے لئے سفر کی زحمت گوارا کی ایک تو ہارون الرشید کہ اُس نے اپنے بیٹوں امین اور مامون کو ساتھ لیکر مؤطائے امام مالکؒ کے لئے سفر کیا چنانچہ جو نسخہ اس کے زیر مطالعہ رہا وہ عرصۂ دراز تک شاہانِ مصر کے کتب خانہ میں محفوظ رہا۔ اور دوسرا بادشاہ بطل اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رح تھا جو اسی مؤطا کا درس لینے کے لئے امام علی بن طاہر بن عوف کی خدمت میں اسکندریہ گیا تھا۔

مشہور درباری شاعر منصور نے اس شعر میں، ہارون کی مذہب دوستی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جَعَلَ القرآن امامہٗ ودَلیلہٗ　لمّا تخیّرہٗ القرآن ذماماً

اُس نے قرآن شریف کو اپنا امام اور رہنما بنا لیا ہے اور قرآن مجید نے (بھی) اُسے از روئے ذمہ داری، قبول کر لیا ہے۔

ہارون الرشید کو حدیث، فقہ اور ادب سے غیر معمولی شغف تھا، بلکہ ان علوم میں بہت مہارت تھی۔ شعر و شاعری کا ذوق فطری طور پر اس میں موجود تھا لیکن خود بہت کم شعر کہتا تھا، نقد شعر میں بہت بلند مرتبہ رکھتا تھا اور بعض اوقات شاعروں کو اُن کی ادبی اور زبان کی غلطیوں پر متنبہ کرتا تھا، ایک مرتبہ مامون نے کسی تقریب میں چند شعر لکھ کر پیش کئے تو جواب میں لکھا کہ جانِ پدر! شاعری عوام کے لئے باعثِ زینت و افتخار ہو سکتی ہے تم کو شعر گوئی سے کیا کام ؟

## ولایاتِ مغرب کی گورنری

سولہ [۱۶] سال کی عمر میں ہارون الرشید نے علوم کے علاوہ فنون سپہ گری میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا اس لئے ۱۶۴ھ میں جبکہ اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی اس کے باپ مہدی نے اُسے ولایات مغرب کا جن میں آرمینیہ آذر بائی جان اور کردستان بھی شامل تھے وائسرائے مقرر کیا، اور یحییٰ بن خالد کو اس کا مشیر خاص اور وزیر بنایا۔

۱۶۵ھ میں سلطنت روما کے مشہور جنرل نیگا تاکوس (                ) نے، ایک بڑی فوج کے ساتھ، حملہ کیا اور سرحدی علاقوں میں بے گناہ باشندوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ جب ہارون الرشید کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو فوراً ایک لشکر جرار لیکر مقابلہ کے لئے پہونچا اور رومیوں کو شکست فاش دی۔ افسران فوج نے واپسی کا مشورہ دیا لیکن ۱۷ سالہ ہارون نے جواب میں کہا کہ جب تک دشمن کو اس جسارت کا مزہ نہ چکھاؤں گا واپس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ رومی فوج کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا باسفورس کے ساحل پر پہونچ کر خیمہ زن ہوا اور قسطنطنیہ کے محاصرے کی تیاری شروع کی جب ملکہ آئیرین (                ) کو، جو اپنے شوہر لیو چہارم کی وفات کے بعد اپنے بیٹے قسطنطین ششم کی کمسنی کی وجہ سے خود حکومت کر رہی تھی یہ معلوم ہوا کہ عربوں کی فوج محاصرہ کی تیاری کر رہی ہے تو اس نے آخری مرتبہ پھر فوج بھیجی لیکن اُسے بھی شکست ہوئی، اس پر ملکہ نے عاجزانہ طور پر صلح کی درخواست کی، چنانچہ ۷۰ ہزار دینار سالانہ پر صلح ہوگئی شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ مسلمان واپسی میں جن جن راستوں سے گذریں گے وہاں رومی بازار لگائیں گے اور سامان رسد مہیا کریں گے اور رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیں گے اس مہم میں مسلمانوں کو اس قدر مال غنیمت ہاتھ لگا کہ اچھا گھوڑا ایک درہم میں بک گیا۔

## ہارون کا نکاح

اس مہم سے واپسی پر خلیفہ مہدی نے، ہارون کا نکاح، اپنے حقیقی بھائی جعفر بن منصور کی شہرۂ آفاق بیٹی امۃ العزیز سے کر دیا جو تاریخ میں اپنے لقب زبیدہ سے مشہور ہے۔ چونکہ شیر خوارگی کی حالت میں یتیم ہوگئی تھی اس لئے اس کی پرورش، اس کے دادا خلیفہ منصور نے بڑے ناز و نعم سے کی تھی امۃ العزیز بہت حسین اور نازک اندام تھی، زبیدہ کا لقب اُس کے شفیق دادا منصور نے دیا تھا اور یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اُس کا اصلی نام بھول گئے، اور زبانوں سے لیکر تاریخ کے صفحات تک زبیدہ ہی بولا اور لکھا گیا۔

قاضی ابو یوسف کی روایت ہے کہ اس نکاح میں جس قدر رقم خرچ ہوئی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ دعوتِ ولیمہ پر ۲۷ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے۔ نکاح کے وقت مشک و عنبر کی گولیاں نچھاور کی گئیں جن کے اندر انعامات کے پرچے تھے۔ اور دعوتِ ولیمہ میں طلائی اور نقرئی ظروف تقسیم کئے گئے۔

## سفیر روم کی آمد

شرائط صلح کے مطابق، کچھ دنوں کے بعد، سفیر روم جزیہ کی رقم لیکر بغداد حاضر ہوا اور ادائے رقم کے بعد، تمام عیسائی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ اس مہم میں دو لاکھ دینار اور پندرہ لاکھ درہم صرف ہوئے۔

## ہارون کی تخت نشینی

۱۷۰ھ میں اپنے بھائی ہادی کی وفات کے بعد ہارون تخت نشین ہوا۔ اور اس نے اس شان کے ساتھ حکومت کی تمام مورخین اس پر متفق ہیں، کہ اس کا شمار دنیا کے اکابر سلاطین ( Great Kings ) میں ہوتا ہے، بخوف طوالت اس کے عہد کی فتوحات کو نظر انداز

کر کے اب ایک خاص واقعہ سپردِ قلم کرتا ہوں جس کی خاطر یہ مضمون لکھا ہے۔

۸۰۲ء میں قیصر نقفور (Nicephorus I) نے، جو ملکہ آیرین کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد تخت نشین ہوا تھا، ہارون الرشید کو حسب ذیل خط لکھا:۔

مِن نقفور ملکِ الروم اِلیٰ ھارون ملکِ العرب۔ اَمّا بعد فَاِنّ الملکۃ التی کانت قبلی اَقامتکَ مقام الرخ واقامت نفسہا مقام البیدق فحملت الیک مِن اموالہا احمالاً وَ ذٰلِکَ لِضُعفِ النساءِ وحُمقِھِنَّ۔ فاذا قرأت کتابی فارْدُدْ مَا حُصِل قبلک من اموالہا والاّ فالسّیف بینی وبینک فقط۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

نقفور قیصر روم کی جانب سے ہارون بادشاہ عرب کے نام:۔

واضح ہو کہ وہ ملکہ جو مجھ سے قبل حکمران تھی، اُس نے تجھ کو (بساطِ سیاست پر) رُخ کی جگہ رکھا اور خود پیدل کی جگہ اختیار کی۔ (یعنی تیری زیردست بن کر رہی) اور اپنی دولت کا کثیر حصہ تجھکو (بطور جزیہ) بھیجا اور یہ اُس نے اس لئے کیا کہ عورتیں ضعیف، ناقص العقل اور احمق ہوتی ہیں پس میرا خط پڑھتے ہی وہ تمام دولت جو تجھے حاصل ہوچکی ہے واپس کردے ورنہ تلوار تیرے اور میرے درمیان فیصلہ کرے گی۔

جب ہارون نے یہ خط پڑھا تو چہرہ شدتِ غضب سے سرخ ہوگیا۔ یہ حالت دیکھ کر سب درباری سہم گئے اور بعض امراء اُٹھکر چلے گئے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ جب غصہ فرو ہوا تو خلیفہ نے قلمدان منگوا کر خط کی پشت پر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل جواب لکھ کر سفیر کے حوالہ کیا جس کے ہر لفظ سے اسلام کی شوکت اور مسلمانوں کی سطوت کا اظہار ہوتا ہے:۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ مِن ھارون امیر المؤمنین الیٰ نقفور کلب الروم۔ قد قرأت کتابک یا ابن الکافرۃ! والجواب ما تراہ دون ان تسمعہٗ۔

ہارون امیر المومنین کی طرف سے نقفور رومی کتے کے نام۔ او کافرہ کے بچے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ اس کا جواب تو اپنی آنکھ سے دیکھے گا، سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مختصر خط کو، جو تاریخ سیاست وشجاعت کا زرین ورق ہے سفیر کے حوالہ کرنے کے بعد، ہارون نے فوراً سپہ سالار کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور ایک لاکھ پینتیس ہزار فوج ساتھ لیکر سلطنت روما پر چڑھائی کردی۔

یہ واقعہ محرم ۱۸۷ھ کا ہے۔ اسی ماہ کے آخری ہفتہ میں ہارون ایشیائے کوچک کی سرحد پر پہونچ گیا اور ہرقلہ (Heracl) فتح کرلیا۔ نقفور کو ہرقلہ کے معرکہ میں ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی اور اُس نے صلح کی درخواست کی۔ ہارون نے، ازراہ کرم اس کی درخواست منظور کرلی۔ دیگر شرائط صلح کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ نوے ہزار دینار سالانہ خراج کے علاوہ ہر رومی باشندہ ایک دینار سالانہ بطور جزیہ ادا کرے گا تکمیل معاہدہ کے بعد ہارون اپنی قلمرو میں واپس آیا اور چند دن کے لئے رَقّہ (عراق عرب) میں مقیم ہوا۔

یہ زمانہ سخت سردی کا تھا اور ایشیائے کوچک میں، اس موسم میں بہت شدید برف باری ہوتی ہے۔ نقفور نے خیال کیا کہ ہارون ایسے خراب موسم میں دوبارہ جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوسکے گا اس لئے اُس نے کمال بے حیائی کے ساتھ، معاہدہ فسخ کردیا، اور سرکشی شروع کردی۔ جب یہ خبر ہارون کے لشکر میں پہونچی تو مشیرانِ دولت کو خلیفہ کے حضور میں اس واقعہ کے ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس لئے ایک امیر کے مشورہ سے، ابو محمد عبداللہ مکی نے جو درباری شاعر تھا اس واقعہ کو ایک قطعہ کی صورت میں

نظم کرکے پیش کیا۔

نقض الذی اعطیتہ نفقور　　فعلیہ دائرۃ البوار تدور

ابشر امیر المومنین فانہ　　فتح آتاک بہ الالہ کبیر

جو معاہدہ نقفور نے امیر المومنین سے کیا تھا، اُسے توڑ دیا (اس کا نتیجہ یہ ہے) کہ اس پر مصائب کا ہجوم ہو رہا ہے، اور مصیبتوں کی چکی چل رہی ہے۔ امیر المومنین کو یہ خوش خبری سنا دو کہ نقفور کے مقابلہ میں جو فتح حاصل ہوئی وہ خدائے بزرگ و برتر کا عطیہ ہے۔

یہ قطعہ سنکر ہارون نے حاضرین دربار سے کہا کہ میں نے تم لوگوں کا مطلب سمجھ لیا ہے چنانچہ اسی وقت دوبارہ کوچ کا حکم دیا۔ نقفور اپنی حماقت سے اس خواب خرگوش میں تھا کہ ایسی شدید برفباری میں اسلامی لشکر دوبارہ حملہ آور نہیں ہوسکتا لیکن جس وقت، اُس نے یہ دیکھا کہ اسلامی فوج، ہرقلہ کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور مجبور ہوکر نہایت عاجزی کے ساتھ، دوبارہ صلح کی درخواست کی بعض امیروں کی سفارش کی بنا پر منظور ہوگئی۔ اس مرتبہ معاہدہ میں یہ شرط بھی لکھی گئی کہ اب ہرقلہ کبھی آباد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس شرط سے ناظرین کو مسلمانوں کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس فتح کی خوشی میں ابو العتاہیہ نے حسب ذیل اشعار ہارون کی خدمت میں پیش کئے۔

الا نادت ھرقلۃ بالخراب　　من الملک الموفق بالصواب

غداً ھارون یرعد بالمنایا　　و یرقب بالمذکرۃ القضاب

درایات یحل النصر فیھا　　تمر کانھا قطع السحاب

امیر المومنین ظفرت فاسلم　　وابشر بالغنیمۃ والایاب

ہاں! امیر المومنین کے ہاتھوں سے، جس کو خدا کی طرف سے بھلائی کی توفیق عطا کی گئی ہے ہرقلہ چیخ اٹھا۔ کل ہارون میدان جنگ میں موتوں کے ساتھ گرجے گا اور قتل و غارت کے لئے فولادی تلوار ہاتھ میں لیکر انتظار کریگا۔ اور جھنڈے جن پر فتح نازل ہوتی ہے، اُن کے پھریرے، ہوا میں بادل کے ٹکڑوں کی طرح اڑیں گے۔

امیر المومنین! خدا نے تجھ کو فتحیاب کیا پس تجھے یہ فتح مبارک ہو زندہ باد! اور خوش خبری سُن مال غنیمت کی اور کامرانی کے ساتھ واپسی کی۔

چونکہ قیصر روم کو مسلمانوں کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہوچکا تھا اس لئے خراج کی رقم پابندی کے ساتھ، بیت المال میں داخل ہوتی رہی اور اس کی وفات کے بعد، اس کا جانشین بھی اس معاہدہ کی پابندی کرتا رہا۔ مورخین نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہارون الرشید کو یہ فتح ایسی عظیم الشان حاصل ہوئی کہ گذشتہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ مروان اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وکل ملوک الروم اعطاہ جزیۃ　　علی الرغم قسراً عن ید وھو صاغر

## ہارون کی سیرت

بلاشبہ ہارون الرشید، دنیا کے نامور ترین حکمرانوں میں سے تھا۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ صاحب سیف والقلم تھا، دنیا میں بہت کم بادشاہ گذرے ہیں جو اس کے مقابلہ میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں صرف محی السنۃ حضرت اورنگ زیب عالمگیر غازی رح کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ابو العلائے ہارون الرشید کی تعریف میں لکھا ہے:-

فمن یطلب لقائک او یردہ　　فبالحرمین او اقصی الثغور

فَفِی اَرضِ العدوِّ عَلیٰ طِمرٍ ‏ ‏ ‏ ‏ فَفِی اَرضِ البریّۃِ فوق کورٍ

جو شخص اس کے دیدار کا خواہشمند ہو تو اُسے لازم ہے کہ یا تو اُسے حرمین شریفین میں تلاش کرے یا مملکت کی دور دراز سرحدوں پر۔ دشمن کی زمین میں، تو اس کو تیز رفتار گھوڑے پر پائے گا اور ارض مقدسہ (حجاز) میں اونٹ کے کوہان پر۔

حق یہ ہے کہ اس تعریف میں مطلق مبالغہ نہیں ہے۔ اس کا دستور تھا کہ ایک سال حج کرتا تھا دوسرے سال جہاد کرتا تھا۔ اُن کمزوریوں سے قطع نظر کرکے، جو عموماً بادشاہوں میں پائی جاتی ہیں یعنی عیش کوشیاں اور عشرت سامانیاں، ہارون بہت عمدہ خصائل کا مالک تھا وہ پنجگانہ نماز باجماعت کے علاوہ سو رکعات نفل ادا کرتا تھا اور اپنی ذاتی دولت میں سے ہر روز ایک ہزار درہم خیرات کرتا تھا۔ علم اور اہل علم دونوں کو نہایت دوست رکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اگر اصمعی جیسے ادیب، اور ابو یوسف جیسے فقہا، سفیان ثوری جیسے محدث، سیبویہ جیسے ائمہ نحو، کسائی جیسے قاری موجود تھے تو ابن سماک اور فضیل ابن عیاض جیسے اربابِ باطن بھی لوگوں کو شمع ہدایت دکھا رہے تھے اور ہارون ان سب کی صحبت سے استفادہ کرتا تھا۔

حضرت فضیل ابن عیاض سے اُس کو اس درجہ عقیدت تھی کہ پیادہ پا چل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت سفیان ثوریؒ اور ابن سماک سے بھی بہت عقیدت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے ابن سماک رح سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ انھوں نے کہا اے ہارون! اللہ سے ڈر جس کا کوئی شریک نہیں اور حقیقی بادشاہت اُسی کی ہے، اور اس بات پر یقین رکھ کہ کل تجھے اس کے روبرو جانا ہے اور وہاں دو مقاموں میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہے اور ان کے علاوہ تیسرا مقام کوئی نہیں اور یہ مقام دوزخ اور جنت ہیں یہ سنکر ہارون اس قدر رویا کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ یہ دیکھ کر اس کے حاجب فضل بن ربیع نے کہا انشاء اللہ امیر المومنین ضرور جنت میں جائیں گے کیونکہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں اس کے حقوق ادا کرتے ہیں اور بندوں کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ ابن سماک نے ہارون سے کہا اے ہارون! اس دن یہ شخص تیرے ساتھ نہ ہوگا تجھے تن تنہا جواب دہی کرنی پڑے گی اس لئے اللہ سے ڈرتا رہ اور تقویٰ اختیار کر اور اپنے نفس کی دیکھ بھال کرتا رہ،، یہ سنکر ہارون پھر زار زار رویا۔

ایک مرتبہ ابن سماک کے سامنے، ہارون نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ جب خادم پانی لیکر آیا تو انہوں نے ہارون سے پوچھا کہ اگر یہ پانی روک دیا جاوے اور تم شدت تشنگی سے قریب الموت ہو جاؤ تو اس کو حاصل کرنے کے لئے کتنی دولت خرچ کروگے؟ ہارون نے جواب دیا میں ایک پیالہ کے لئے اپنی آدھی دولتِ سلطنت بخوشی دیدوں گا۔ جب وہ پی چکا تو ابن سماک نے یہ پوچھا،، اگر یہ پانی بدن سے خارج نہ ہوسکے تو اس کے اخراج میں کس قدر رقم خرچ کروگے؟ ہارون نے کہا نصف سلطنت ابن سماک نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا اے ہارون! جس سلطنت کی قیمت صرف ایک پیالہ پانی ہو اس کے لئے قتل و خوں ریزی کبھی نہ کرنا یہ سنکر ہارون بے اختیار رونے لگا۔

ہارون کی اسی صفت (خشیۃ اللہ) کی وجہ سے حضرت فضیل ابن عیاض جیسے بزرگ اُس سے محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ لوگ ہارون کو ناپسند کرتے ہیں لیکن میں اُسے دوست رکھتا ہوں کیونکہ اس کا قلب خشیۃ اللہ سے لبریز ہے۔

ہارون جہاد کا شوق اور شہادت کا بڑا ولولہ رکھتا تھا، ایک مرتبہ مشہور محدث حضرت ابو معویہ نے اُس سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری آرزو یہ ہے کہ میں خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ جب ہارون نے یہ حدیث سُنی تو روتے روتے ہچکی

بندھ گئی اور اسی ولولہ کا اثر تھا کہ وہ ایک سال حج کرتا تھا ایک سال جہاد۔ اور جس سال کسی وجہ سے خود حج کے لئے نہ جا سکتا، تو سو آدمیوں کو زادِ راہ دیکر بھیجتا تھا۔ اور دوران حج میں بڑی الحاح وزاری سے دعائیں مانگتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہارون الرشید میں متضاد اوصاف جمع تھے۔ اگر ایک طرف وہ پابند شریعت تھا تو دوسری طرف اس کی زندگی بڑی رنگین اور عیش پسندانہ تھی۔

ہارون الرشید شاعروں کا بڑا قدردان تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود شاعر تھا اور اعلیٰ درجہ کا ادیب اور سخن سنج! جب وہ خلیفہ ہوا تو ابراہیم موصلی نے یہ شعر کہے:۔

فلمّا اتیٰ ھارون اشرق نورھا — اَلم تر انّ الشمس کانت مریضةً
فھارونُ والیھا ویحییٰ وزیرھا — تلبّستِ الدنیا جمالاً بملکہٖ

اے مخاطب کیا تجھے معلوم نہیں کہ سورج مریض تھا لیکن جب ہارون خلیفہ ہوا تو اُس کا نور چمکنے لگا اس کی حکومت کی وجہ سے دنیا سر تا پا حسین ہوگئی ہے۔ کیونکہ ہارون اس کا مالک ہے اور یحییٰ اس کا وزیر ہے۔

یہ سنکر ہارون نے اُسے ایک لاکھ درہم عطا کئے، اور چونکہ شاعر نے ضمناً یحییٰ کی تعریف بھی کی تھی اس لئے اس نے پچاس ہزار درہم عنایت کئے۔

ایک مرتبہ داؤد بن رزین نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں:۔

وقام بہٖ فی عدل سیرتہٖ النّھج — بھارون لاح النور فی کلّ بلدةٍ
فاکثر ما یعنی بہ الغزو والحج — امامٌ بذاتِ الله اصبح شغلہٗ
اذا ما بدا للنّاس منظرہ البلج — تضیق عیونِ الخلق عن نورِ وجھہٖ
فاعطی الذی یرجوہٗ فوق الذی یرجو — تفسّحتِ الآمال فی جودِ کفّہٖ

ہارون کے خلیفہ ہونے سے ہر ایک شہر روشن ہوگیا ہے اور اس کی معدلت پسندی سے تمام ملک میں راہیں کشادہ ہوگئی ہیں وہ ایسا امام ہے کہ ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے اور اسی لئے اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جہاد و حج میں بسر ہوتا ہے۔

اس کا چہرہ اس قدر تابناک ہے کہ جب وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے تو ان کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اس کی بخشش کو دیکھ کر امیدیں کشادہ ہوگئی ہیں اور وہ لوگوں کو ان کی توقع سے بڑھ کر دیتا ہے۔

قیصر روم نے ایک نہایت حسین وجمیل کنیز ہارون کی خدمت میں بھیجی تھی جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا جب اس کی وفات ہوئی تو ہارون کو بہت صدمہ ہوا اور اس کے فراق میں حسب ذیل اشعار کہے:۔ [۵]

لمّا استخصّ الموتُ ھیلانا — تاسیتُ اوجاعاً واحزانا
فما اُبالی کیف ما کانا — فارقتُ عیشی حین فارقتُھا
فی قبرِھا فارقت دنیانا — کانت ھی الدنیا فلمّا ثوت
لستُ اری بعدکِ انسانا — قد کثر الناس ولٰکنّنی
ریحٌ باعلیٰ نجدٍ اغصانا — والله لا انساکِ ما حرّکت

میں نے مصیبت اٹھائی دردمند ہوا اور غمگین جب ہیلن کو موت نے اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ جب میں

۵ اُس کنیز کا نام ہیلن ( Helen ) تھا!

ہیلن سے جدا ہو تو گویا زندگی سے جدا ہو گیا اور اب مجھے پروا نہیں دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے۔ وہ میری دنیا تھی اور جب اُس نے اپنی قبر میں اپنا ٹھکانا بنا لیا تو میں نے دنیا کو ترک کر دیا۔

انسان تو بہت ہیں لیکن اے ہیلن! تیرے بعد مجھے دنیا میں کوئی انسان نظر نہیں آتا خدا کی قسم میں تجھے فراموش نہیں کروں گا جب تک ہوا نجد کی بلندیوں پر شاخوں کو ہلاتی رہے گی۔

اسحاق موصلی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے ہارون کو یہ شعر سنائے۔

وَامرۃٍ بالبخلِ قلت لہا اقصِری فذٰلک شئٌ ما الیہ سبیلُ
اَرَیَ الناس خلّان الجواد ولا اَریٰ بخیلاً لہٗ فی العالمین خلیلُ
وَاِنّی رأیتُ البخل یذری باھلہٖ فاکرم نفسی ان یقال بخیلُ
وَمِن خیرِ حالاتِ الفتیٰ لو علِمتہٗ اذا نال شیئًا ان یکون ینیلُ
عطائی عطاءُ المکثر ین تکرماً ومالی کما قد تعلمینَ قلیلُ
وکیف اخافُ الفقر او اُحرِمُ الغنیٰ ورایُ امیر المؤمنین جمیلُ

بہت سی عورتیں بخل کا حکم کرنے والی ہیں لیکن میں نے اُن سے کہدیا کہ یہ وہ بات ہے جو حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ سخی کے دوست ہوتے ہیں اور بخیل کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ کنجوسی، بخیل کو دنیا میں ذلیل کر دیتی ہے پس میں اپنے نفس کو اس بات سے بچاتا ہوں کہ اُسے بخیل کہا جائے۔ اگر تو سمجھے تو ایک انسان کے تمام حالات میں، سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جب اُسے کوئی چیز ملے تو وہ دوسروں کو دیدے۔ میں اس طرح بخشش کرتا ہوں جیسے امیر آدمی بخشش کرتے ہیں حالانکہ تو جانتی ہے کہ میں دولتمند نہیں ہوں میں محتاجی سے کیوں ڈروں اور دولت سے کیسے محروم ہوسکتا ہوں جبکہ میں امیرالمؤمنین کو احسان کرنے والا دیکھتا ہوں۔

جب ہارون نے آخری شعر سُنا تو فوراً کہا اسحاق! یوں مت کہو بلکہ یہ کہو کہ اگر اللہ چاہے تو میں فقر سے نہیں ڈروں گا۔ کیونکہ در اصل دینے والا تو وہی ہے میں تو ایک واسطہ ہوں۔ یہ کہہ کر فضل بن ربیع کو حکم دیا کہ اسحاق کو ایک لاکھ درہم دیدو۔ اس کے یہ اشعار بہت عمدہ ہیں۔

اسی شاعر نے یہ روایت بھی کی ہے کہ ایک مرتبہ ابو العتاہیہ نے ابو نواس سے کہا کہ آپ نے حسب ذیل شعر میں جو مضمون ہارون کی تعریف میں باندھا ہے کاش یہ مضمون میں نے باندھا ہوتا وہ شعر یہ ہے:۔

قد کنت خفتک ثم امّننی من ان اخافک خوفک اللہٖ

اس سے پہلے میں تجھ سے ڈرتا تھا لیکن تیرے خدا سے ڈرنے نے مجھے تجھ سے ڈرنے سے محفوظ کر دیا ہے۔

## خانگی زندگی

ہارون الرشید بادشاہ تھا، اس لئے عیش و عشرت جو ملوکیت کا لازمہ ہے اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی، اُس کے مناقب کا ورق بہت سی کمزوریوں سے داغدار بھی ہے۔

**بس ایک جھلک** ——— ہارون کے قصر خلافت میں دو ہزار سے زاید غلام اور سات سو سے زائد خواجہ سرا ملازم تھے اور دو ہزار سے زاید کنیزیں تھیں یہ سب ریشمی لباس اور اعلیٰ درجہ کے مرصع زیورات پہنتی تھیں اور ان کے زیورات میں عصائب سب سے زیادہ دلکش اور حسین ہوتے تھے۔

ہارون کی بہن عُلیّہ کی پیشانی بہت زیادہ چوڑی تھی اس لئے وہ اس عیب کو چھپانے کے لئے اپنی پیشانی پر چار انگل چوڑی ریشمی پٹی باندھے رہتی تھی اور اس میں جواہرات ٹکے رہتے تھے اس پٹی کو عصابہ کہتے تھے۔ شاہزادی

کی تقلید میں دوسری خواتین نے بھی عصابہ کا استعمال شروع کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ پٹی عورتوں کا فیشن بن گئی چنانچہ کنیزوں کو بھی عصابہ باندھنے کی اجازت مل گئی۔ انہوں نے اس میں یہ جدّت کی کہ عصائب پر، ریشم اور سنہری تاروں سے مختصر دل کش جملے اور اشعار مُطرّز (کشیدہ) کرائے۔ مثلاً

من کان لنا کُنّا لہٗ — جو ہمارا ہے ہم اس کے لئے ہیں

الا باللّٰہ قولوا یا رجالُ — اشمسٌ فی العصابۃ ام ھلالُ

اے لوگو! تمھیں خدا کی قسم یہ بتاؤ کہ میرے عصابہ میں آفتاب چمک رہا ہے یا ہلال؟

## کنیزوں کی حاضر جوابی

شاہی محل سرا میں جو کنیزیں داخل ہوتی تھیں وہ عموماً بہت تعلیم یافتہ، بذلہ سنج اور شاعرہ ہوتی تھیں وجہ یہ تھی کہ ان کنیزوں کو پہلے ہر قسم کی تعلیم دی جاتی تھی اس کے بعد فروخت کی جاتی تھیں۔

ایک دن ہارون اپنی مجلس میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک طبق میں گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے جن کی خوبصورتی اور خوشبو سے وہ مسرور ہو رہا تھا اسی اثناء میں کسی امیر نے ایک حسین و جمیل کنیز اس کی خدمت میں نذر کی۔ ہارون کبھی پھولوں کو دیکھتا تھا کبھی اُس کنیز کے رخساروں کو، لیکن اُس کنیز کے رخسار اس کی نگاہ میں پھولوں سے زیادہ حسین قرار پائے، چنانچہ اُس نے مفضل بن ضبی شاعر سے جو اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا اپنا عندیہ ظاہر کر کے، حسب حال شعر کی فرمائش کی۔ اُس نے برجستہ یہ شعر پڑھا:-

کانّہٗ خدُّ مَوموقٍ یُقبّلہٗ — فمُ الحبیب وقد ابدیٰ بہٖ خجلا

یہ گلاب کا پھول گویا کسی محبوب کا رخسار ہے، جس کو چومتے ہی خجالت کا رنگ ظاہر ہو گیا ہے یہ سن کر کنیز نے ایک ایسا برجستہ شعر پڑھا کہ شاعر پر اوس پڑ گئی اور ہارون الرشید نے خوش ہو کر اُسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اصمعی نے روایت کی ہے کہ ایک دن میں ہارون کو اپنے اشعار سنا رہا تھا کہ ایک شخص نے ایک کنیز لا کر خدمت میں پیش کی۔ ہارون نے اس کی صورت دیکھ کر کہا اس کی ناک چپٹی ہے اور چہرے پر چھائیاں ہیں اگر یہ دو عیب نہ ہوتے تو میں خرید لیتا یہ سُن کر کنیز نے دست بستہ عرض کی کہ امیر المومنین! میں فی البدیہہ دو شعر عرض کرتی ہوں انھیں سن لیجئے اس کے بعد آپ کو اختیار ہے ہارون نے کہا اجازت ہے۔ کنیز حسب ذیل شعر پڑھے:-

ما سلم الظبیُ علیٰ حُسنہٖ — کلّا و لا البدرُ الذی یُوصفُ

الظبیُ فیہ خنسٌ بیّنٌ — والبدرُ فیہِ نکتۃٌ تعرفُ

ہرن اپنی خوبصورتی کے باوجود عیب سے محفوظ نہ رہ سکا اور نہ چاند ہی، جس کی اس قدر تعریف کی جاتی ہے۔ ہرن کی ناک کا چپٹا پن تو ظاہر ہے اور چاند میں داغ ہے جو دور سے پہچانا جاتا ہے۔

ہارون، اس حاضر جوابی سے اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اسی وقت اس کی خریداری کا حکم صادر کیا، اور چند دنوں کے بعد کنیز اپنی شاعری اور علمی قابلیت کی بنا پر اس کی منظور نظر بن گئی۔

ایک دفعہ ایک کنیز نے رات کے وقت ہارون سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ صبح کو جب ہارون نے اُسے وہ وعدہ یاد دلایا تو اُس نے ایک خاص ادا کے ساتھ یہ مصرع پڑھا۔

کلامُ اللیلِ یمحوہٗ النّہارُ۔ یعنی رات کی بات صبح کو بھولی بسری ہو جاتی ہے۔

ہارون کو یہ مصرع پسند آیا اس لئے اُس نے درباری شعراء کو یہ مصرع تضمین کے لئے دیا، سب شاعروں نے

اپنی استعداد، قابلیت، اور قوتِ فکر کے مطابق مصرعے لگائے، مگر ابو نواس کے مصرعے سب پر فوقیت لے گئے اور خلیفہ کو بہت پسند آئے۔

ابو نواس نے اپنے شعروں میں کنیز کے حُسن کی تعریف کی، اُس کی مست خرامی اور والہانہ انداز کا نقشہ کھینچا، اُس کے قد و قامت کی موزوں اور برجستہ مصرعوں سے تصویر بنائی، اور سر سے چادر ڈھلک جانے کو خاص انداز میں بیان کیا۔

فقلت الوعد سیدتی فقالت
کلام اللیل یمحو النہار

میں نے کہا میری جان! اپنا وعدہ پورا کر تو وہ کہنے لگی رات گئی بات گئی۔

یہ دلکش اور فی البدیہہ اشعار سُن کر ہارون بہت متحیر ہوا اور بے اختیار پکار اٹھا یا غلام سیفاً و نطعاً (یعنی ارے کوئی ہے تلوار اور وہ چمڑے کا ٹکڑا جس پر سر کٹ کر گرتا ہے فوراً حاضر کرو) ابو نواس نے دست بستہ عرض کی حضور والا! غلام سے کیا خطا سرزد ہوئی جو آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟ ہارون نے کہا " تو نے اس قدر سچی تصویر کیسے کھینچ دی! کیا تو رات کو میرے ساتھ تھا؟ شاعر بے چارے نے جو بید کی طرح لرز رہا تھا قسم کھا کر کہا کہ حضور میں کہاں اور آپ کی حرم سرا کہاں؟ یہ سب میرے تخیل کی خلاقی اور فکر رسا کی کار فرمائی ہے۔ یہ سن کر ہارون کا غصہ فرو ہوگیا اور ابو نواس کو دس ہزار دینار انعام دیئے۔

## ملکۂ زبیدہ

زبیدہ کی شادی کا ذکر مضمون کے شروع میں ہو چکا ہے۔ جب ہارون خلیفہ ہوا تو زبیدہ ملکہ بن گئی اور قصر دار السلام اُس کی سکونت کے لئے آراستہ کیا گیا۔ زبیدہ نے اپنی ذاتی خوبیوں سے ہارون کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور یہ اس کی دانائی کی دلیل ہے کہ اُس نے اپنے شوہر کے سیاسی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا اور ہر معاملہ میں اُس کی دلجوئی کی۔

جب تک ہارون زندہ رہا، زبیدہ بہت آسایش اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی کیونکہ اس کے مصارف کے لئے کئی کروڑ کی جاگیر مقرر تھی۔ البتہ ہارون کی وفات اور امین کی تخت نشینی کے بعد، پریشانی میں مبتلا ہوگئی تھی لیکن جب مامون حکمراں ہوا تو اس کی سب کلفتیں دور ہوگئیں کیونکہ مامون نے اس کی ایسی دلداری کی کہ وہ رشید اور امین دونوں کو بھول گئی۔ چنانچہ خود کہتی ہے :-

اذا بقی المامون لی فالرشید لی　　ولی جعفر لم یفقد ا و محمد

جب مامون موجود ہے تو میرے لئے رشید (شوہر) جعفر (باپ) اور امین (بیٹا) گویا سب زندہ ہیں۔

امین کے قتل کے بعد، مامون نے زبیدہ کو قصر الخلد میں دوبارہ آباد کیا اور معمولی مصارف کے لئے بیت المال سے ایک لاکھ اشرفیاں اور دس لاکھ درہم نذر کئے، اور اس کے قدموں کو بوسہ دیا اس اطاعت سے زبیدہ کا دل مامون کی طرف سے بالکل صاف ہوگیا۔

سنہ ۲۰۰ھ میں زبیدہ نے حجاز کا سفر کیا۔ مکہ معظمہ پہونچکر اس کو معلوم ہوا کہ حج کے زمانہ میں، بعض اوقات، پانی کی ایک مشک ایک اشرفی کو فروخت ہوتی ہے، لہذا اُس نے نہر کھودے جانے کا حکم دے دیا، ماہرین فن نے پیمایش کے بعد، مکہ کی پتھریلی زمین کو ہموار کر کے بارہ میل کی مسافت میں ایک نہر نکالی جو آج تک نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اس کی تعمیر میں رائج الوقت سکہ کے مطابق نوے لاکھ روپے صرف ہوئے، حجاز کی چٹیل زمین میں اس نہر کا جاری ہونا معجزہ سے کم نہیں، یہ نہر جب تک جاری ہے زبیدہ کا نام باقی رہے گا۔

عبادت اور دینداری میں زبیدہ خاتون، اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں ممتاز تھی۔ اس کے محل میں سو خادمائیں حافظِ قرآن تھیں جو روزانہ دس دس پارے ختم کرتی تھیں۔

ہارون کی وفات سنہ ۱۹۳ھ میں ہوئی یعنی زبیدہ ۲۸ سال تک اپنے شوہر کی رفیقۂ حیات رہی۔ اُس نے سنہ ۲۱۵ھ میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

ہارون الرشید اور زبیدہ تاریخ کی بہت بڑی شخصیتیں ہیں، ان کی زندگیوں میں عبرت بھی ہے اور بصیرت بھی! نیک لوگ مشاہیر کی سیرت کی کمزوریوں اور غلطیوں کو نہیں دُہراتے صرف اچھائیوں پر نظر رکھتے ہیں ——— ہارون اور زبیدہ اتنا کچھ رکھنے کے باوجود دنیا سے خالی ہاتھ گئے ——— اُن کے اعمال بس اُن کے ساتھ رہے! اور آخرت نیکو کاروں کے لئے ہی ہے!



# ہندوستان کے خریدار

## "فاران" کا زرِچندہ (آٹھ روپے) دفتر "الحسنات" رام پور (یو-پی) کو روانہ فرما کر دفتر "فاران" کو مطلع فرمادیں۔

میکش اکبرآبادی

تمہید: از مدیر "فاران"

# اہلِ تصوف اور شریعت

(تازہ ترین غیر مطبوعہ تصنیف "نقدِ اقبال" کا ایک ورق)

"تصوّف" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے —— موافق بھی اور مخالف بھی، اور بعض نے افراط و تفریط کی دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر اعتدال کی راہ بھی اختیار کی ہے، ہم بھی بہت دنوں سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کا ارادہ کر رہے تھے مگر یہ ارادہ ذہن و خیال ہی کی زینت بنا رہا اس کی عملی طور پر تشکیل کی نوبت نہیں آئی —— اب جناب میکش اکبرآبادی کے اس مقالہ نے طبیعت کو اُکسایا، ذہن کو اُبھارا، ارادے میں تحریک پیدا کی یہاں تک کہ وہ افکار جو بہت زمانہ سے ذہن میں کھٹک رہے تھے کاغذ پر منتقل ہو گئے، صاحبِ مقالہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، ہماری اس "گزارش" سے اُن کے سمجھنے اور سوچنے میں بھی مدد ملے گی۔

کسی چیز کی حقیقت، فطرت، رُوح اور غایت ایک ہی ہوتی ہے، مختلف اور متضاد نہیں ہوا کرتی، سفید رنگ سفید ہی ہو سکتا ہے، سبز، سیاہ یا کسی اور رنگت کا ہو ہی نہیں سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ سفید بھی ہو اور سرخ بھی! ہاں دیکھنے والے مختلف قسم کی رنگتوں کی عینکوں سے دیکھیں گے تو عینکوں کے شیشوں کی رنگتوں کے اعتبار سے "سفیدی" نظر آئے گی، رنگتوں کا یہ تضاد اس لئے ہے کہ جن عینکوں کے واسطے سے "سفیدی" کو دیکھا جا رہا ہے اُن کے رنگوں میں اختلاف ہے ورنہ "سفیدی" اپنی ذات سے سفید ہی ہے ——

یہی حال حقایق کا ہے لوگ مسائل کو اپنے ذاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں اس لئے لامحالہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہو جاتی ہیں، اگر "حقیقت" کو اس طرح سمجھا جائے کہ جس طرح وہ خود واقع ہوئی ہے اور ذاتی ذوق اور شخصی رجحان کا واسطہ درمیان میں نہ رہے تو پھر حقیقت کی تعبیر میں اختلاف واقع نہیں ہو سکتا اور ہو گا بھی تو فروع میں ہو گا اصل اور حقیقت میں نہ ہو گا۔

نبیؐ کی ذات کو چھوڑ کر، کہ وہ اپنی جگہ خود بولتی ہوئی سچائی اور ناطق حقیقت ہوتا ہے، "حق" ہر شخصیت سے بلند ہے ... تو حق شناسی کی ایک صورت یہ ہے اور یہی راہِ صواب ہے کہ خود "حق" اپنی ذات سے کیا ہے اور اُس کا کیا مطالبہ ہے؟ حق رسی کی اس راہ میں جس کسی کا قول یا عمل حق سے متضاد یا حق سے دور نظر آئے گا، قبول نہیں کیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ "حق" کے بارے میں "افراد اور اشخاص" کیا کہتے ہیں؟ اور انھی کے اقوال اور اعمال کی روشنی میں حق کو سمجھا جائے! اس طرح "حق" آزاد نہیں رہتا مقید ہو جاتا ہے اور حق کی تعبیریں یہیں سے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں ...

ہم نے اُوپر جو کچھ کہا ہے اُس سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کہ بزم میں ہر طرح کے لوگ ہیں —— اہلِ نظر بھی اور تماشائی بھی! —— لہٰذا ہم یہ بھی واضح کئے دیتے ہیں کہ جو لوگ "حق کوش" اور "حق پسند"

ہوتے ہیں اور اس راستہ میں جن کی زندگیاں صرف ہوجاتی ہیں اُن کے اقوال اور اعمال یقیناً ایک مقام اور حیثیت رکھتے ہیں اور حق شناسی، حق رسی اور حق آگہی کی منزل میں اُن سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی بدتوفیقی ہے ـــ مگر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اُن کا ہر قول اور ہر عمل "عینِ حق" نہیں ہوتا، اُس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اپنی آزادیٔ فکر کے اعلان اور خود ی کی نمود کے لئے نہیں بلکہ حق شناسی اور حق آگہی کی خاطر! ـــ خوب کہا مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کہ "اللہ ہی کے لئے اللہ والوں سے لڑ جایئے" ـــ منزلِ حق تک پہونچنے کے لئے ہم اس کے بھی مجاز ہیں کہ ان مقدس نفوس اور حق شناسوں کے اقوال کو ایک دوسرے پر ترجیح دے سکیں اور سچائی کی کسوٹی پر انھیں پرکھ بھی سکیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں اطاعت حق کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے، انسان کو عقل و بصیرت اور وجدان سے کام لینا پڑتا ہے۔

ان باتوں کے بیان کر دینے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم آگے چل کر جو کچھ کہیں گے اس کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوجائیں اور ناظرین کو ہماری بات سمجھنے میں دشواری اور اُلجھن نہ ہو۔

## کتاب و سنت کی روشنی میں

دین اور اسلام جس کا نام ہے وہ "کتاب و سنت" سے عبارت ہے اور اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی معیارِ حق و صداقت ہے جس کسی بڑے سے بڑے آدمی اور مقدس سے مقدس انسان کا قول اور عمل، دانستہ یا نادانستہ کتاب و سنت سے ہٹا ہوا ہے اور اس کسوٹی پر پُورا نہیں اترتا اُس کا شعر و افسانہ کی دنیا میں کوئی درجہ ہو تو ہو مگر دین میں اُس کا کوئی وزن نہیں ہے ـــ کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مقابلہ میں ہر قول ٹھکرا دیئے جانے کے قابل ہے، چاہے بظاہر اُس میں کتنی ہی حکمت کی باتیں اور فلسفیانہ نزاکتیں دکھائی دیتی ہوں، خدا اور رسول کے احکام کے سامنے کسی کی رائے اور مشورت کوئی حقیقت نہیں رکھتی چنانچہ ایسا ہوا ہے کہ کسی مسئلہ میں جب رسول اللہ کی حدیث مل گئی ہے تو صحابہ کرام نے اپنی رائے کو رد کر دیا اور اپنے قول کو واپس لے لیا۔

رسول اللہ کی سنت کے بعد آثارِ صحابہ کا درجہ ہے کہ صحابہ کرام (اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں) نے براہِ راست مہبطِ وحی اور صاحبِ قرآن سے قرآن اور علم و حکمت سیکھی تھی اور حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ اُن کی زندگیوں میں اس طرح جلوہ گر تھی کہ دُنیا سے حضور کی وفات کے بعد بھی لوگ دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ابوذرؓ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے لباس میں، محمدؐ رسول اللہ کی صداقت، عدل، سخاوت، شجاعت اور فقر و غنا کی شان اور ادائیں چل پھر رہی ہیں ـــ اسی لئے بعض علماء نے صحابہ کرام کے زمانہ کو بھی عہدِ نبوت ہی میں شمار کیا ہے۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ اور اُن کی زندگیاں ہیں جن میں بصیرت اور ہدایت کی نشانیاں ملتی ہیں ـــ یہ نفوس قدسیہ صحابہ کرام کے تربیت یافتہ اور حقیقت میں "نظر کردۂ صاحب نظراں" تھے، رسول اللہ اور ان کے درمیان تعلیم علم و حکمت کا صرف ایک واسطہ تھا ان کے نفسِ گرم میں وہی سوز شریک تھا جس نے صحابہ کے دلوں کو گرما دیا تھا۔

اللہ کی کتاب میں عام انسانوں سے مخاطبت ہے، اور امر معروف اور نہی منکر کا ہر صاحبِ ایمان کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، جو شخص خدا، رسول اور آخرت پر ایمان لاکر اچھے کام کرے گا وہی اللہ کا دوست ہے اور خدا کے نزدیک بڑائی اور بزرگی کا معیار "تقویٰ" ہے، قرآن نے بصیرت و فکر اور عمل کے لئے عام دعوت دی ہے، جو شخص بھی اللہ کے بتائے ہوئے حدود میں رہ کر جس قدر زیادہ بہتر انداز میں زندگی گزارے گا اور تقویٰ اختیار کرے گا اُسی قدر وہ فلاح پانے والا اور ہدایت یافتہ ہوگا، قرآن میں دو گروہ ملتے ہیں ـــ حزب اللہ اور حزب الشیطٰن، مومن اور کافر (مشرک اور منافقین بھی اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں) ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل و انعام فرمایا، اور دوسرے وہ

جن پر غضب نازل کیا ــــــــ لیکن خود مومنین کی جماعت میں "اہلِ باطن" اور "اہلِ ظاہر" کی تقسیم قرآن نے نہیں کی اور نہ خدا نے یہ کہیں فرمایا کہ ہمارا نبی جو تمھیں ہماری آیات پڑھ کر سنائے گا، حکمت کی تعلیم دے گا اور تزکیہ نفس کرے گا ــــــــ تو وہ کچھ لوگوں کو تو ظاہری تعلیم سے سنوارے گا اور کچھ پر "باطنی اسرار" منکشف فرمائے گا۔

ہاں! تعلیم و تربیت میں طالبانِ علم کی فہم اور طبیعت کا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس لحاظ اور امتیاز کا "ظاہر و باطن" پر قیاس کرنا غلط ہے یہ تو ذہن، طبیعت اور فہم و ذکاوت کے اختلافات اور مدارج ہیں، مثلاً حضورؐ نے صحابہ کرام کو ایمان، اسلام اور احسان تک کی حقیقتیں بتا دی تھیں مگر ایک عورت جس نے آسمان کی طرف اشارہ کرکے اللہ کا اقرار کیا تھا، اُس کے اِس اشارے ہی کو کافی سمجھا۔

خود رسُول اللہ کے مبارک زمانہ میں صحابہ میں "اہلِ ظاہر" اور "اہلِ باطن" کی تقسیم نہ پائی جاتی تھی، حضرت ابوذر غفاری جو دوسرے وقت کے کھانے کے لئے کچھ اٹھا رکھنا بھی اچھا نہ سمجھتے تھے اور فقر و فاقہ جن کا سرمایۂ حیات تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے مقابلہ میں "اہلِ باطن" کا امتیاز انھیں حاصل نہ تھا حالانکہ عبدالرحمٰن بن عوف کے کاروبار اور دولت کا یہ عالم تھا کہ سیکڑوں اونٹوں پر اُن کا اسبابِ تجارت غیر ملکوں سے آیا جایا کرتا تھا۔

وہ نادار صحابی جن کے پاس آذوقۂ حیات کی بہت تنگی تھی، جن میں سے بعض اپنے افلاس کے سبب غیر متاہل بھی تھے، اسلئے اُن کا زیادہ وقت رسُول اللہ کی صحبت اور صلوٰۃ و تلاوتِ قرآن میں گزرتا تھا ــــــــ اُن کو اصحابِ صُفّہ کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے اور انھیں بھی "اہلِ باطن"، "صاحبِ معرفت"، یا "اربابِ طریقت" نہ کوئی کہتا تھا اور نہ سمجھتا تھا ــــــــ

## تصوّف کیا ہے؟

ہم اس لفظی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ "تصوّف" کی اصطلاح قرآن اور حدیث میں نہیں ملتی یا آج تک اس کا فیصلہ ہی نہ ہو سکا کہ تصوّف کا آخر مادہ کیا ہے؟ اور یہ کس لفظ سے مشتق ہے؟ "صوف" (کپڑے کا نام ہے)، "صُفّہ" (وہ چبوترہ جس پر اصحابِ صُفّہ رہا کرتے تھے) سے یا "صفا" سے! یا یہ کہ صحابہ کرام میں کسی صحابی کا لقب "صوفی" نہ تھا، اور تابعین میں بھی شریعت و طریقت کی حد بندیاں نہیں ہوئی تھیں اور رسول اللہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد یہ لفظ مسلمانوں کے لٹریچر میں ہمیں پہلے پہل ملتا ہے!

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گُہر سے

کسی نئے لفظ کا دین، اسلام، شریعت اور اخلاق و حکمت کی تشریح، تفہیم، ضرورت اور آسانی کیلئے پیدا ہو جانا کوئی بُری بات نہیں ہے، فقہ اور حدیث کی کتنی اصطلاحیں (Technical Terms) ہیں جو بعد کی ایجاد ہیں۔

یہ لفظ (صوفی اور تصوف) اسلامی لٹریچر میں کبھی آیا ہو، اس سے ہمیں سروکار نہیں ــــــــ ہم تو یہ دیکھنا، سمجھنا اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ "تصوف" کہتے کس کو ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے؟ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ تو اس کے ذکر سے خاموش ہیں، وہاں تو ہمیں اس کا جواب نہیں ملتا، تو اب اس مشکل کو حل کرنے کے لئے خود انھیں سے رجوع کرنا ہوگا جو اس علم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے ہوں اور جن کا قول اس خصوص میں سند اور حجت بنایا جا سکتا ہے۔

سید الطائفہ خواجہ جنید بغدادی، معروف کرخی، سری سقطی (رحمہم اللہ تعالیٰ) اور اسی پایہ کے دوسرے بزرگ (زمانہ کے لحاظ سے جن میں تقدیم و تاخیر بھی ہے) "تصوف" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ "شریعت" سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے، جو صُوفی شریعت کے احکام کا پابند نہ ہو وہ "صوفی" نہیں "متصوف" یعنی بناوٹی صوفی اور مصنوعی اہلِ طریقت

ہے، یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو شخص قرآن، حدیث اور فقہ نہ جانتا ہو، وہ تصوف کی وادی میں قدم نہ رکھے ــــــ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہوا میں اُڑ رہا ہو اور شجر و حجر اُس کے اشارے پر چلتے ہوں، اگر وہ پابندِ شریعت نہیں ہے تو وہ اس "خرقِ عادت" (کرامت) کے باوجود "صوفی" نہیں بلکہ گمراہ ہے۔

جن نفوسِ قدسیہ کے اقوال، ارشادات اور ملفوظات کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ خود بھی کتاب و سنت پر عامل اور شریعت کے پابند تھے، اور اُن کے حالات اور تعلیمات سے مترشح ہوتا ہے کہ "تصوف" حقیقت میں "علمِ اخلاق" کا دوسرا نام ہے، افلاطون اور سقراط کا علمِ اخلاق نہیں ــــــ بلکہ وہ "علمِ اخلاق" جو "کان خلقہ قرآن" کا خوشہ چین ہے ــــــ پس معلوم ہوا کہ "تصوف" میں جس کسی کا بھی قول و عمل کتاب و سنت اور شریعت سے ٹکرائے وہ ملنے جانے کے قابل نہیں ہے اور خود "تصوف" اُسے کوئی سندِ جواز دینے کے لئے تیار نظر نہیں آتا ــــــ

بعض صوفیا، کے ایسے اقوال ملتے ہیں کہ جو شریعت کی کسوٹی پر پُورے نہیں اُترتے ۔۔۔ مثلاً کسی بزرگ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اُن سے کسی نے نبوت کے بارے میں کچھ دریافت کیا، وہ اس کے جواب میں بولے کہ "میں تو ابھی "لا الٰہ الا اللہ" پر ہی غور کر رہا ہوں، "محمد الرسول اللہ" تک نہیں پہونچا ۔۔۔۔ یا یہ کہ یہ حدیثیں جو کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں تم ظاہر پرستوں کیلئے ہیں، ہمیں تو حدیثیں سینہ بسینہ پہونچی ہیں ۔۔۔۔ جب "یقین" کا درجہ حاصل ہو جائے تو نماز، روزہ وغیرہ فرائض، واجبات اور تکلیفاتِ شرعی ساقط ہو جاتے ہیں ــــــ ہم پہلے تو اس قسم کے اقوال کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں نے ایسا نہ کہا ہوگا، جو لوگ رسول اللہؐ سے جھوٹی حدیثیں منسوب کرتے ہوئے نہ چوکے، تو ان بزرگوں کے اقوال میں الحاق اور اضافہ کر دینا کیا مشکل تھا، لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے بلکہ ثبوت بہم پہونچایا جائے کہ واقعی ان بزرگوں ہی کے یہ اقوال اور ملفوظات ہیں تو اُن کی "تطبیق" دینے کی کوشش کی جائے گی ــــــ مگر اس انداز پر کہ اُن اقوال کی مطابقت کے لئے "کتاب و سنت" میں ذرّہ برابر کمی بیشی نہ کی جائے گی اور تفسیر و تعبیر میں التباس سے کام نہ لیا جائے گا ــــــ اگر یہ تطبیق کی کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی تو پھر جُراتِ ایمانی کا یہی تقاضا ہوگا کہ اُن اقوال سے براءت اور بیزاری کا اظہار کیا جائے چاہے وہ کتنی ہی بڑی شخصیت سے منسوب کیوں نہ ہوں ــــــ اس لئے کہ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں ہر شخصیت پست ہے اور کتاب و سنت پر کسی کے قول و فعل کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، خدا اور رسولؐ، بزرگوں سے زیادہ احترام کے مستحق ہیں۔

اکابر صوفیا کتاب و سنت کے عامل اور شریعت کے پابند تھے، ان میں بہت سے عالمِ دین بھی تھے اُن کی زندگیوں میں خشیتِ الٰہی اور تقویٰ کا غلبہ ملتا ہے ــــــ اس لئے "تصوف" درحقیقت "علمِ اخلاق" کا نام ہے یعنی کتاب و سنت کے منشاء کے مطابق تزکیہ نفس کی زیادہ سے زیادہ کوشش اور ایمان و اسلام اور فرائض، واجبات اور سُنن کی تکمیل و تعمیل کے ساتھ "احسان" کی اہمیت کا شدید احساس!

فتح مدائن کے بعد جب مدینہ میں مالِ غنیمت آیا تو اُسے دیکھ کر عمر فاروق رضؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، لوگوں نے کہا امیر المومنین! یہ تو شکر و مسرت کا مقام ہے اور آپ رو رہے ہیں! فاروقِ اعظم نے مال و دولت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "یہ دُنیا مسلمانوں میں آرہی ہے" مولانا روم رحؒ نے اسی لئے فرمایا ہے:-

اہلِ دُنیا کافرانِ مطلق اند
روز و شب در زق زق و در بق بق اند

تو دُنیا اگر اللہ کی یاد سے غافل نہ کرے تو وہ عینِ رحمت ہے اور اُس کی طلب (جائز حدود میں رہ کر) عبادت! مگر جب دنیوی لذتیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیں، خدا کا خوف باقی نہ رہے، اور اہوائِ نفس "رب" اور معبود بن جائیں

توپھر ایسی "دنیا" عذاب ہے، بدبختی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں مسافروں کی طرح زندگی بسر کرو۔

صوفیاء کرام دنیوی لذتوں کے معاملہ میں "طلب" پر "گریز" کو ترجیح دیتے تھے، یہ "گریز" جہاں جہاں شدید ہو کر "ترک" بن گیا ہے وہ مستحسن نہیں ہے کیونکہ اسلام میں رہبانیت نہیں پائی جاتی —— لذیذ کھانے کھانا، اچھے کپڑے پہننا، خوشنما اسباب زینت و آرائش سے گھروں کو سجانا شریعت میں حرام نہیں ہے مگر ان چیزوں اور لذتوں سے زیادہ شغف انسان کو عیش پسند بنا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ خدا کی یاد سے دل غافل ہو جاتا ہے —— اور خدا کی یاد سے صرف نماز، روزہ اور تسبیح و تہلیل ہی مراد نہیں ہے بلکہ زندگی اس انداز پر نہیں گزرتی جس انداز پر کتاب و سنت کا منشاء ہے، آدمی لذتوں میں ڈوب کر اس قدر خود غرض بندۂ نفس اور سرشار ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کے ادا کرنے کا بھی ہوش نہیں رہتا —— لذتوں اور چٹخاروں کا یہ فتنہ آج ہمارے زمانہ میں پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے، ہم سب اس میں مبتلا ہیں اور ان سطور کا لکھنے والا بھی!

حکیم الشعراء شیخ سعدی نے صحیح فرمایا تھا:-

درویش صفت باش کلاہ تتری دار

لیکن "کلاہ تتری" کے پہننے سے "درویش صفتی" میں خلل واقع ہوتا ہو تو پھر "کلاہ تتری" کا نہ پہننا اور اتار دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادشاہوں اور امیروں کا جب غلبہ اور تسلط ہوا تو "الناس علیٰ دین ملوکہم" کی حقیقت مسلمان عوام میں پوری طرح جلوہ گر ہو گئی، عام طور پر لوگوں کا لذتوں اور عیش سامانیوں کی طرف میلان تھا، نمازیں پڑھی جاتی تھیں لیکن بے روح ہو گئی تھیں، سجدے میں سر مگر دل دنیا کے چٹخاروں میں اٹکے ہوئے! بعض دنیادار علماء اور فقہا تک بادشاہوں کے ذوق و خواہش کی رعایت کے لئے شریعت میں رخصتیں پیدا کر رہے تھے اور طرح طرح کے حیلے تراشے جاتے تھے! ان حالات میں "تزکیہ نفس"، "تعلیم اخلاق" اور "تربیت قلب و نگاہ" کی سخت ضرورت تھی اور "تصوف" یہی فرض انجام دیتا تھا، بادشاہوں اور امیروں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنے سے گوشہ نشینی بہر حال بہتر تھی، خانقاہیں پروہتوں کے استھان، راہبوں کے تکیے اور سنیاسیوں کے پگوڈے نہ تھے بلکہ اخلاق کی تربیت گاہیں تھیں۔

اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ اخلاق و پاکیزگی کے ان علمبرداروں نے ظلم و معصیت کے خلاف علم جہاد کیوں بلند نہیں کیا، اُن کا فرض تھا کہ قوت کے ذریعہ ماحول کو بدلنے کی سعی کرتے —— یقیناً ایسا کرنا چاہیئے تھا مگر ظلم و عدوان کے مٹانے کی اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کی مخالفت کی جائے اور کسی جبر و قہر کے سبب یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر کم سے کم دل میں اُس کو ضرور بُرا سمجھنا چاہیئے مگر ایمان کا یہ آخری اور پست ترین درجہ ہے —— رسول اللہ نے یہی ارشاد فرمایا تھا۔

وہ سیاسی قوت جس کے ذریعہ جابر بادشاہتوں کے تخت اُلٹے جا سکتے ہیں صوفیاء کرام کو حاصل نہ تھی، اس لئے انھوں نے بعد کی دو صورتوں (ظلم و عدوان کی زبان سے مخالفت اور دل میں اُس سے نفرت و بیزاری) پر قناعت کی، اور یہ حقیقت بھی اُن کے پیشِ نظر تھی کہ جب تک عوام میں اخلاقی طاقت پیدا نہ ہو گی، صرف

تخت وتاج کا انقلاب زیادہ مفید اور خاطر خواہ کارگر ثابت نہ ہو سکے گا ـــــــــ یہ جمہوری انقلاب اور سیاسی آزادی جس کے ہم سب متوالے ہیں درحقیقت اُس وقت تک پوری طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ فکر وخیال اور قلب ونظر کو نفس کی بے جا خواہشوں سے آزادی نصیب نہ ہو ـــــــــ ہم نے خود بھی آزادی کا تجربہ کر کے دیکھ لیا۔

تمام بند غلامی بھی ٹوٹ جائیں تو کیا
دل ونظر ہیں ترے خواہشوں کے اب بھی اسیر

جابر حکومتوں اور غیر الٰہی اقتدار کے خلاف جہاد "اجتماعی فرض" ہے اور یہ فرض "قوت" چاہتا ہے، اگر یہ قوت حاصل نہیں ہے تو ہر مسلمان کو اُس "انفرادی ذمہ داری" سے تو غافل نہ رہنا چاہیئے جس کی بجا آوری ہر آن اس پر ضروری ہے، چاہے وہ غلام ہو یا آزاد ـــــــــ یعنی کسی حکومت میں غیر اسلامی نظام نافذ ہو، اور فواحش ومعاصی کی وہاں کثرت ہو تو اُس قوت کے حاصل ہونے تک جس کے ذریعہ فواحش ومعاصی کو بزور مٹا دیا جائے، ہر شخص کو انفرادی طور پر فواحش ومعاصی سے تو بچتے رہنا چاہیئے اور فواحش ومعاصی سے اجتناب کا جذبہ عام ہو جائے تو چاہے حکومت کے قانون میں منکرات کے لئے گنجایش موجود ہو مگر عملاً ان کا وجود باقی نہ رہے گا، یا بہت کم ہو جائے گا ـــــــــ "تصوف" حقیقت میں اسی فرض کو انجام دیتا تھا، کہ نجس پاکیزہ اور پاکیزہ، پاکیزہ تر ہو جائیں، تصوّف کا "علم النفس" ذہن وقلب کی اُن چوریوں کو بھی پکڑتا ہے جن تک عوام کی نگاہیں نہیں پہونچیں

طریقت، روحانیت، تصوف اور سلوک بہرحال کتاب وسنت کے بتائے ہوئے "علم اخلاق" کا نام ہے اور ہونا چاہیئے، جہاں جہاں کتاب وسنت سے کسی کا قول اور عمل غیر مطابق نظر آئے وہ نہ تصوف ہے اور نہ طریقت! ایسی چیز کو جس کا کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ میں کہیں پتہ نہیں ملتا بلکہ وہ اُن سے معارض نظر آتی ہے، کسی بڑے سے بڑی ولی، قطب، غوث، ابدال، شیخ وقت اور امامِ طریقت سے بھی منسوب کر دی جائے گی تو بھی اُسے نہ مانا جائے گا اور کسی کے دل میں اس قسم کی غلط عقیدت اور مرعوبیت ہو تو وہ مرض ہے، کمزوری ہے اور خدا کے خوف اور حُبِ رسُول کی کمی کی دلیل ہے۔

## ظاہر اور باطن

صحابہ کرام کے عہدِ سعادت میں اس قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں ملتی کہ فلاں طرز پر عبادت کرنے اور چلّے کھینچنے والا "اہلِ طریقت" ان خاص معمولات کا عامل اور مخصوص وضع قطع کا لباس جو پہنتا ہو وہ "اہلِ باطن" باطنی کیفیات اور جذب وسوز کا حامل "اہلِ دل" اور جس سے کرامات کا ظہور ہوتا ہو وہ "صاحبِ ولایت"!

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بعد میں جا کر تخصیص، تقسیم اور تفریقِ مراتب کا یہ تصوّر کچھ اس شدّت کے ساتھ قایم کیا ہوا کہ اچھے خاصے اہلِ خبر اور اربابِ ہوش بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے ـــــــــ صحابہ کرام میں صرف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو "شاہِ ولایت" اور "مظہر عجائب وغرائب" مانا گیا ـــــــــ اور اولیاء کبار کی فہرست میں حضرت جنید بغدادی، معروف کرخی، شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی اور شہاب الدین سہروردی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام تو نظر آتے ہیں مگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، اور امام مالک اور امام بخاری کے نام اس میں شامل نہیں ہیں ـــــــــ اگر "ولایت" تقوی، اخلاص اور اخلاق وکردار کی پاکیزگی کا نام ہے تو یہ بزرگ یقیناً بہت بڑے ولی تھے اور خاص طور سے امام ابو حنیفہ کا تقوی تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اگر خدا کے دوست اور ولی نہ تھے تو پھر پوری اُمت مُسلمہ میں شاید کوئی ولی ہی نہیں ہوا، اسی طرح حضرت حاجی وارث علی شاہ، صوفی محمد حسین الہ آبادی مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی (قدس سرہما) کو تو اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے، مگر صاحب السیف والقلم

علامہ ابن تیمیہ اور حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ کا نام اولیاء کی فہرست میں نہیں ملتا۔
"ولی" کے بارے میں عام تصوّر یہ ہے کہ اُس سے خرقِ عادت اور کرامات کا ظہور ہوتا ہو جس ولی کی زندگی میں جتنی زیادہ کرامتیں ملتی ہیں، اُسی اعتبار سے "ولایت" میں اُس کو مقام اور منزلت حاصل ہے، "ولی" کا ذکر آتے ہی یہ تصورات فکر و خیال میں گردش کرنے لگتے ہیں کہ وہ دیوار پر بیٹھا ہوا ہو تو اُس کے ذرا سے اشارے پر دیوار چلنے لگے، وہ "قم باذن اللہ" کہے تو کچھ نہ ہو مگر جب "قم باذنی" فرمائے تو مرا ہوا آدمی یکایک اُٹھ کر کھڑا ہو جائے، اُس کے حکم سے ڈوبی ہوئی برات دریا سے صحیح سالم نکل آئے، اُس کو اتنی قدرت ہو کہ ملک الموت کو چوتھے آسمان پر جاکر پکڑلے اور اُس کی زنبیل کو اُلٹ دے تو اس دن کی تمام قبض کی ہوئی رُوحیں اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں اور مُردوں کو نئے سرے سے زندگی مل جائے، وہ بارہ برس تک لنگر خانہ سے کھانا بانٹتا رہے مگر خود کچھ نہ کھائے، مسجد میں جمعہ کی نماز کے وقت اُس کی شکستہ حالی کے سبب کچھ لوگ اُسے اندر نہ بیٹھنے دیں تو اس کے اشارے پر مسجد کی چھت گر پڑے اور نمازی ہلاک ہو جائیں۔

بلاشبہ اولیاء اللہ سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں ——— مگر یہ "کرامتیں" ہی صرف اُن کی سیرت نہیں ہیں، اصل چیز تقویٰ اور نیکوکاری ہے، اللہ کا خوف اور خلقِ خدا کی خدمت انسان کی زندگی کے سب سے زیادہ روشن اور تابناک ورق ہو سکتے ہیں، مٹی اور اینٹ پتھر کی بنی ہوئی دیوار ایک جادوگر کے جادو کے زور سے بھی چلتی ہوئی دکھائی دے سکتی ہے، مگر نگاہ و زبان اور دست و پا کو بُرائیوں سے محفوظ رکھنا مشکل ہے، اور یہی سب سے بڑی "کرامت" اور عظیم الشان اعجاز ہے ——— اور اسی قسم کی زندگی میں انسانوں کے لئے ہدایت کی نشانیاں ہیں۔

ولایت کا معیار "کرامت" قرار پائیں" چنانچہ مفسرین، محدثین اور فقہا جن کا عام طور پر "اولیاء" کے زمرے میں نام نہیں لیا جاتا، ان کی زندگیاں کرامتوں اور خرقِ عادات سے خالی نظر آتی ہیں ——— یہاں تک کہ حضرت صدیق اکبر کی زندگی میں شاید ایک بھی کرامت اور خرقِ عادت کا واقعہ نہیں ملتا مگر بہت سے ایسے لوگ جن کو صاحبانِ جذب کہا جاتا ہے اور جو فرائض و واجبات بھی ادا نہ کرتے تھے اُن سے بہت سی کرامتیں اور عجیب و غریب واقعات منسوب ہیں "کرامتوں" کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ کے لئے طریقت کے کسی سلسلہ سے وابستہ ہونا بھی ضروری قرار پایا، جو کسی سلسلۂ طریقت میں منسلک نہیں وہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے مگر "ولی" نہیں ہو سکتا ——— اور یہ حالت اس حد تک پہنچ گئی کہ بادشاہوں کی طرح صوفیوں کی اولاد خانقاہوں کی وارث قرار دی جانے لگی اور مسند نشینی کی رسمیں ادا ہونے لگیں۔
بعض اولیاء اللہ سے اس قسم کے "رومان" ( Romance ) بھی منسوب کئے گئے کہ انھوں نے سرِ راہ کسی امرد کا منہ چوم لیا، اس پر کسی نے اعتراض کیا تو اُن صاحب نے گرم لوہے کو چوم کر یہ بات ثابت کر دی کہ اوے ظاہر پرست! تو اہلِ دل کے اسرار کیا جانے! ہم اس منزل میں ہیں جہاں کسی چھوکرے کے لبِ رنگیں اور دہکتے ہوئے لوہے میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ——— اسی قسم کے خانقاہی تصوف کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:-

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

یہ باتیں یقیناً اُس "تصوف" کی نہیں ہو سکتیں جس کا فلسفۂ اخلاق اور علمِ تزکیہ نفس کتاب و سنّت اور شریعت کا مخالف نہیں ہے۔ ——— مگر اس کو کیا کیا جائے کہ جن کتابوں میں اس انداز کے واقعات کا بیان ملتا ہے وہ "تصوف" ہی کی کتابیں اور اربابِ تصوف کے تذکرے اور ملفوظات سمجھے جاتے ہیں، اسی انداز کا "تصوف" نہ جانے کن ———

"احوال ومقامات" سے گزرتا ہوا اُس منزل میں پہونچ جاتا ہے جہاں منصور حلاج کے "انا الحق" میں کوئی برائی اور کوتاہی نظر نہیں آتی۔

اس قسم کے معتقدات اور افکار نے "تصوف" کے بارے میں یہ تصور پیدا کر دیا ہے کہ شریعت ظاہری احکام سے سروکار رکھتی ہے، باطن کے اسرار اور معرفت وحقیقت کے غوامض تو تصوف کے ذریعہ آشکارا ہوتے ہیں، جو صوفی نہیں وہ عارف باللہ نہیں ——— اور یہ بھی کہ اربابِ تصوف اور اہلِ طریقت ہی "اولیا اللہ" ہوا کرتے ہیں، علماء دین، محدثین اور فقہا چونکہ اس کوچہ سے نابلد ہوتے ہیں لہٰذا اُن بے چاروں کو یہ منصب نہیں ملتا۔

تصوف کا تمام تر تعلق اخلاق اور تزکیہ نفس سے ہے اور ہونا چاہیئے ——— مگر رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل علم بن گیا، اور اُس کے بارے میں لوگوں کا ایک خاص "تصور" قایم ہوگیا ——— مثلاً اس مصرعہ کو سُن کر :-

؎ پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

ہر شخص کسی ذرا سے تامل کے بغیر کہہ اُٹھے گا کہ یہ "تصوف" ہے، جن شعروں میں کفر کو ایمان پر اور بُت خانہ کو کعبہ پر ترجیح دی جاتی ہے وہ سب "تصوف" ہی کے شعر تو سمجھے جاتے ہیں۔۔ ۔۔ یہاں تک کہ

؎ کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

کو سُن کر لوگ جھومنے لگتے ہیں اور اس انداز کے شعروں پر ہم نے صوفیوں کو تالی بجا بجا کر رقص کرتے دیکھا ہے۔

قرآن شریف میں رسول اللہ کی معراج کا ذکر ہے، پھر احادیث میں اس کی تفصیل ملتی ہے ——— مگر تصوف کی زبان میں اس کی تفسیر اس طرح ہوگی کہ "جلوہ جلوہ سے جا ملا۔۔ ۔۔ یا آئینہ آئینہ کے مقابل ہوگیا" شراب کو قرآن "رجس من عمل الشیطان" کہتا ہے اور رسول اللہ نے اُسے "اُم الخبائث" فرمایا ہے۔۔ ۔۔ مگر حافظ شیرازی کہتے ہیں :-

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند
اشہیٰ لنا واحلیٰ من قبلۃ العذارا

اور شارحین فرماتے ہیں کہ حافظ نے اس شعر میں تصوف کے نازک حقایق اور دقیق معارف بیان کئے ہیں۔

منصور حلاج کا نعرہ "انا الحق" ایک فریب آمیز مغالطہ ہے مگر اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ عالمِ سُکر کی باتیں ہیں ——— اُس کا ظرف چھوٹا تھا شرابِ معرفت اُس میں سما نہ سکی اور وہ بنکارنے لگا ——— اور یہ بھی کہ منصور کی بات تو ٹھیک تھی مگر اُسے کہنی نہ چاہیئے تھی۔۔ ۔۔ اس قسم کے تمام تصورات کو "تصوف" ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

یہ جو مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم اور بدعات پھیلی ہوئی ہیں اُس میں یقیناً "تصوف آمیز عقاید" کا ہاتھ ہے ——— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض قبروں، مزاروں پر اور گنبدوں میں اولیاء اللہ کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور وہ پاک روحیں جنھیں کاروبارِ عالم میں تصرف کی قدرت حاصل ہے، تدبیر امر فرماتی ہیں ——— جنید، بایزید اور معروف کرخیؒ شیخ عبدالقادر جیلانی اور دوسرے اکابر صوفیا (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا یہ "تصوف" ہرگز نہیں ہوسکتا، مگر بہر حال ان عقاید اور تصورات کو "تصوف" سے اس درجہ گہری نسبت دیدی گئی ہے کہ اس تعلق اور رابطہ کا چھٹنا بہت دشوار ہے ———

## آخری بات

قرآن ہر حیثیت سے "لاریب فیہ" واقع ہوا ہے، اُس میں کسی قسم کا شک ہی نہیں ہے، اگر کوئی مقام سمجھ میں بھی نہ آئے تو بھی اُس پر یقین لے آنا چاہیئے، قرآن کے بارے میں مذبذب رہنا "کفر" ہے، قرآن پر ایمان لانے کے بعد رسول اللہ کی احادیث واجب العمل ہیں کہ حضورؐ کا "اُسوۂ حیات" معیارِ حق" تھا اور اللہ نے رسول کی اطاعت کو خود اپنی اطاعت فرمایا ہے، فقہ کتاب وسنت سے مقتبس اور مستنبط ہے، دین کے احکام

فقہ میں متشکل نظر آتے ہیں ـــــ اس کے بعد وہ علم کلام ہو کہ اخلاق، فلسفہ ہو کہ تصوف فن طریقت ہو کہ علم حقیقت و معرفت، عالم لاہوت کی باتیں ہوں کہ عالم ملکوت کے اسرار ـــــ ان سب کی غرض و غایت یہ ہونی چاہیئے کہ کتاب و سنت کے سمجھنے میں اُن کے ذریعہ مدد ملے، یقین میں اور زیادہ رسوخ و استحکام اور عمل میں جوش و سرگرمی پیدا ہو، اور اگر اُن کے پڑھنے سے اُلجھنیں دُور ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں، تو اُن سے دور رہنے ہی میں بھلائی ہے۔

حضرت محی الدین ابن عربی "شیخ اکبر" کی شخصیت اپنی جگہ مسلّم! مگر اُن کی شاہکار تصنیف "فصوص الحکم" کے افکار و اقوال کی قرآن و حدیث سے مطابقت کرنے میں جن بزرگوں نے مشقتیں برداشت کی ہیں وہی کہتے ہیں کہ یہ تو "خواص" کے پڑھنے کی کتاب ہے، یعنی عوام کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں ہے اور جو چیز عوام کے پڑھنے کے لئے نہیں ہے اُسے وہ پڑھیں گے تو ظاہر ہے کہ فائدہ تو ہونے سے رہا، تھوڑا بہت نقصان ہی ہو جائے گا ـــــ تو اقبالؔ اس "تصوف" کا تو قائل ہے جس سے بہت سوں کو فائدہ پہونچتا ہو، مگر جہاں دو کا فائدہ اور سیکڑوں کا زیاں ہوتا ہو، ایسا "تصوف" اقبالؔ کی نگاہ میں معتبر نہیں ـــــ کسی نے بڑی جُرأت کے ساتھ کہا ـــــ

"مارا نص درکار است نہ کہ فص" ـــــ

"وحدت الوجود" قرآن کی آیت نہیں" رسول کی حدیث نہیں" صحابہ کا قول نہیں" اس کی حیثیت "قیاس" کی سی ہے اور قیاس میں خطا اور صواب دونوں صورتوں کا امکان ہے، اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس نظریہ کی تردید کی ـــــ

تصوف کا وہ حصہ جو اخلاق اور تزکیہ نفس سے تعلق رکھتا ہے اور کتاب و سنت اور اُس کے مابین کوئی اختلاف بھی نہیں ہے ـــــ تصوف کا روشن ورق ہے ـــ مگر جو حصہ "قم باذنی" "انا الحق" "تصورِ شیخ" "وحدت الوجود" اور "سکر و صحو" . . . . . جیسے نازک، دقیق اور پُر پیچ تصورات سے عبارت ہے اُس سے خواص کو فائدہ ہوتا ہو تو اُس کی ہمیں خبر نہیں مگر ہم جیسے عوام کے لئے اس میں بڑی اُلجھنیں اور دشواریاں ہیں اور فائدہ کم اور نقصان اور خطرے زیادہ ہیں۔

عرش کیا ہے؟ اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے بہت خوب فرمایا "الفاظ معلوم، کیفیت مجہول، اور پوچھنے والا بدعتی"؟ عرش و کرسی، جنت و دوزخ، وحی و الہام، تقدیر ـــــ ان حقایق کی ماہیت پر مطلع ہونے کے لئے ہم مکلف نہیں ہیں، اور نہ ان اسرار کی کُنہ و حقیقت کے بارے میں ہم سے سوال ہوگا، "امر معروف" اور نہی عن المنکر" ہم پر فرض کیا گیا ہے اور اسی میں ہمیں لگے رہنا چاہیئے، یہی سلامتی کی راہ اور نجات کے لئے کافی ہے، حقایق و بسایط کی شرح میں جو نازک بیانیاں ہوتی ہیں وہ دین کا منشا نہیں ہیں! ابنِ عربی نے اسرار معرفت کے جس بحرِ بیکراں میں غواصی کی ہے، افسوس ہے کہ اُسے ہم نہیں جانتے، اس لئے شیخ اکبر کی "فصوص الحکم" کے مقابلہ میں ابنِ جوزی کی "تلبیس ابلیس" ہم جیسے عام مسلمانوں کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔

آپ میری باتوں سے بے کیف ہو گئے۔ لیجئے میکش صاحب ساغر بکف

اور مبنا بر کشش آپ کے سامنے آ رہے ہیں ــــ

(ماہر القادری)

علامہ اقبال کا جو دور وحدۃ الوجود کی مخالفت کا تھا یہی دور ابن عربی کے علاوہ حکیم سنائی، عراقی، وغیرہ ایرانی شعراء کی مخالفت کا بھی تھا اس لئے کہ یہ سب حضرات وحدۃ الوجود کے حامی اور مبلغ تھے۔ اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ اقبال نے کسی زمانے میں بھی رومیؒ کی مخالفت نہیں کی کسی ابتدائی تصنیف میں اتنا کہا ہے کہ رومیؒ نے تو فلاطونی تصور قبول کرلیا۔ حالانکہ رومی بھی دوسرے صوفیوں کی طرح وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ علمأ ظاہر بھی ان کی مخالفت سے گریز کرتے آئے ہیں اور ان کی ظاہری حیثیت سے مرعوبیت روایت بن گئی ہے جو انھیں اپنے عہد میں اپنے علم کے علاوہ حکومتِ وقت کی حمایت کی وجہ سے حاصل تھی۔

ابن عربی اور ایرانی شعرا کی مخالفت اسرارِ خودی کے دیباچے کے علاوہ علامہ کے بعض ابتدائی مکتوبات میں بھی ملتی ہے جس میں سے بعض حصّہ نقل کیا جا چکا ہے۔ شیخ فخرالدین عراقیؒ کے متعلق علامہ نے کہا ہے۔

" تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں ہے۔ (اقبال نامہ مکتوب ۱۹۱۶ء)

حکیم سنائی رح صاحبِ حدیقہ کے متعلق تحریر کیا ہے :-

" ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بہ ظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی اس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی زپے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تراز وست
در روز قیامت ایں بہ او کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست (اقبال نامہ مکتوب ۱۹۱۶ء)

یہ رباعی پیش کرکے علامہ نے یہ رائے قایم کی ہے کہ ان شعرا نے شعائر اسلام کی تردید اور تنسیخ کی ہے مگر اتفاق سے جو رباعی علامہ نے مثال کے لئے انتخاب کی ہے وہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے صرف کشتۂ دوست کا اضافہ کرکے شاعر نے ایک غزلیاتی ماحول پیدا کر دیا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو :-

عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکاھا عند ملیککم وارفعھا فی درجاتکم وخیر لکم من انفاق الذھب والورق وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقھم ویضربوا اعناقکم قالوا بلی قال ذکر اللہ - رواہ مالک واحمد والترمذی -

(مرقاۃ صفحہ ۱۲ ج ۳۰)

یعنی حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھیں تمہارے اعمال میں بہترین اور خدا کے نزدیک پاک ترین اور درجے کے اعتبار سے بلند ترین عمل نہ بتا دوں جو (خدا کی راہ میں)

سونا چاندی خرچ کرنے اور قتل کرنے اور قتل کئے جانے سے بھی بہتر ہو لوگوں نے کہا ضرور رسول اللہؐ نے فرمایا (وہ عمل) اللہ کی یاد ہے۔"

اس سے قبل امام غزالی کے ذکر میں علامہ شبلی کے حوالے سے علامہ ابن رشد کا یہ قول بیان کیا جاچکا ہے کہ

"قرن اول کے اکثر بزرگوں سے منقول ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے جو شخص باطن کے سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتا اس کو باطن کا علم سکھا نا ضرور نہیں۔"

امام غزالی رح نے فرمایا ہے۔

ان علوم کے خفی وجلی کی طرف منقسم ہونے سے کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کرسکتا صرف وہ انکار کرتے ہیں جنھوں نے بچپن میں کچھ باتیں سیکھیں اور پھر اسی پر جم گئے تو وہ علمار کے مرتبے تک ترقی نہیں کرسکتے۔" (الغزالی صفحہ ۶۶)

اس خاص موضوع پر اسلام میں مختلف گروہ ہیں۔ ایک ظاہری یا حنبلی جن کا خیال ہے کہ شریعت میں کچھ اسرار نہیں جو بات ایک عام آدمی سمجھتا ہے ایک خاص شخص کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے باطنی ہیں جن کے خیال میں نہ صرف ہر ظاہر کا ایک باطن ہے بلکہ اصل چیز باطن ہی ہے اس طرح اس فرقے کا اصل مقصود شریعت کی تردید اور اس کے ہر حکم کی اپنی خواہشات کے مطابق تاویل کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے دراصل اسی کو شریعت کی تردید اور تنسیخ کہا ہے ان کے علاوہ ایک گروہ معتدلین کا ہے جن کے خیال میں ہر چیز یعنی تاویل کرنے اور تاویل نہ کرنے کا ایک موقع اور ایک محل ہے۔ تاویل ہو یا تفسیر کسی قاعدے اور دلیل سے ہونی چاہیئے نہ کہ باطنی فرقے کی طرح نماز اور روزے تک سے اور دوسری چیزیں مراد لی جائیں اور نہ ظاہریوں اور بعض دوسرے علما کی طرح مجاز اور استعارے کو بھی حقیقی معنی میں سمجھا جائے۔ امام غزالی نے کہا ہے۔

"تاویل سے کسی فرقے کو مفر نہیں سب سے زیادہ امام احمد بن حنبل رح تاویل سے بچتے ہیں لیکن مفصلہ ذیل حدیثوں میں ان کو بھی تاویل کرنی پڑی۔ (۱) حجر اسود خدا کا ہاتھ ہے (۲) مسلمان کا دل خدا کی انگلیوں میں ہے (۳) مجھکو یمن سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔" (الغزالی)

سنائی رح وغیرہ ایسے لوگ ہیں جن کی عمریں رسولؐ کی محبت اور شریعت کی پابندی واحترام میں گزری ہیں ان کے اشعار پر تبصرہ کرتے وقت ان کی زندگی اور ان کے عقائد بھی سامنے رہنے چاہئیں۔ ایرانی شعرا کے یہاں بے شبہ ایسے شعر ملتے ہیں جن میں اہل ظاہر پر طنز ہے کیونکہ یہ شاعر ایسے زمانے میں تھے جب دلوں سے شریعت کی حقیقی پابندی اور رسولؐ کی محبت جاتی رہی تھی اور صرف رسم پرستی رہ گئی تھی شاعر اپنے دور کا ناقد ہوتا ہے وہ ان عیوب پر تنقید کرتا ہے جن میں اس کے عہد کی جماعت مبتلا ہوتی ہے لیکن اس علاج اور اس دوا کو ہم آج کے امراض کی نسبت سے صحیح اور غلط نہیں کہہ سکتے۔ عراقی، سنائی، حافظ، وغیرہ اپنے دور کے ناقد تھے یہ ممکن ہے کہ ان کی تنقید آج کے مسلمانوں کے لئے مفید نہ ہو۔ علامہ اقبال کا زمانہ وہ ہے کہ مسلمان ظاہر شریعت سے بھی بے تعلق ہو گئے ہیں ایسے مسلمانوں کے لئے حافظ اور ان جیسے دوسرے شعرا کا کلام دلوں سے رہی سہی اسلام کی عظمت بھی کھودینے کے لئے کافی ہے۔ اقبال اپنے زمانے کا حکیم اور مصلح ہے وہ جانتا ہے کہ یہ دوا اس زمانے میں اصلاح کی بجائے فساد پیدا کرے گی اس لئے وہ مریضوں کو ان شعرا کے کلام سے دور رکھنا چاہتا ہے گو وہ خود بھی کبھی ان شعرا کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے کیونکہ اقبال کے زمانے میں جہاں شریعت سے بے پروا لوگوں کی اکثریت تھی ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جو ظاہر پر عمل کرتے ہوں اور باطن کے اعتبار سے صفر ہوں علامہ کے ان اشعار کا مخاطب ایسے ہی لوگوں کو سمجھنا چاہیئے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ___ نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

مقامِ آدم خاکی نہاد دریابند | مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق
---|---
چہ پرسی از نماز عاشقانہ | رکوعش چو سجودش محرمانہ
تب و تاب یکے اللہ اکبر | نہ گنجد در نماز پنجگانہ
جنتِ ملائے وحور وغلام | جنتِ آزادگاں سیر دوام
جنتِ ملا خور و خواب و سرود | جنتِ عاشق تماشائے وجود
کافر بیدار دل پیشِ صنم | بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

---

اس کے علاوہ اقبال کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ علمائے ظاہر کی خشک صحبت اور فلسفۂ مغرب کی سرد مادیت پر اقبال کی روحانیت رفتہ رفتہ فتح حاصل کرتی گئی ہے اور وحدۃ الوجود کے ساتھ ساتھ تصوف اور صوفی شعرا کی مخالفت بھی ختم ہوتی گئی ہے۔ حضرت ابن عربی رحمہ کے متعلق بھی ان کا طرزِ تحریر بدل گیا ہے جن کو سنہ ۱۶ء میں وہ صرف محی الدین ابن عربی لکھتے تھے سنہ ۲۲ء اور سنہ ۲۳ء کے مکتوبات میں انھیں حضرت ابن عربی اور حضرت محی الدین ابن عربی لکھنے لگے ہیں ختمِ نبوت کے عنوان سے جو مکتوب انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں لکھا ہے اس میں ابن عربی کو ہسپانیہ کا برگزیدہ اور عظیم الشان صوفی لکھا ہے۔ اسی طرح علامہ کے آخر زمانے کے کلام میں عراقی اور سنائی کی مدح ملتی ہے۔ بایزید، جنید، غزالی، جامی، رومی کی مدحت سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے یہ سب حضرات مشہور وحدۃ الوجودی ہیں اور ہر دور میں علامہ کے ممدوح رہے ہیں جامی ابن عربی کے مشہور شارحین میں سمجھے جاتے ہیں اور مشہور وجودی ہیں۔

عطا کن شورِ رومی سوزِ خسرو | عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
---|---
چناں با زندگی در ساختم من | نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی
گہے شعرِ عراقی را بخوانم | گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را | شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

(ارمغانِ حجاز)

کشتۂ اندازِ ملا جامیم | نظم و نثرِ او علاجِ خامیم
---|---

(اسرارِ خودی)

---

وہی سنائی جن پر تنسیخ شریعت کا الزام عائد کیا گیا تھا ان الفاظ میں غیر فانی اقبال سے خراجِ عقیدت حاصل کرتے ہیں۔

آں حکیمِ غیب آں صاحب مقام | ترک جوشِ رومی از ذکرش تمام
---|---
من ز پیدا او ز پنہاں در سرور | ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود | فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق | او ز حق گوید من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم | تا متاعِ نالۂ اندوختم
گفتم اے بینندہ اسرارِ جاں | بر تو روشن ایں جہان و آں جہاں

... ... ... ... ... ... ... (مثنوی مسافر)

حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب ، ملت اور ہر فرقے میں سچے ، جھوٹے ، نیکوکار اور بدکار ہوتے ہیں اس لئے ہیں غالباً استثناء ہو ہمارے علما اور صوفیا کا گروہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا لیکن بعض افراد پر سارے فرقے کو قیاس کر لینا یقیناً غلط ہوگا۔

اِن تو عہدِ حاضر کی انسانیت عموماً اخلاقی امراض میں مبتلا ہے لیکن روحانیت داخلاق کے مدعی جب غلط راہ پر ہوں تو ان پر طعن میں شدت فطری بات ہے اسی لئے عوام مذہبی رہنماؤں پر زیادہ شدت سے تنقید کرتے ہیں لیکن علمائے ظاہر اپنی اخلاقی کمزوریوں کو ظاہری رسوم کی پابندی میں پوشیدہ کر سکتے ہیں بہ خلاف ایک جاہل صوفی کے جو طریقت کی طرح شریعت سے بھی ناواقف ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے عیوب کو اسرار ظاہر کرتا ہے اور شریعت کا استہزا کر کے اپنے ناقدین سے فرار اور نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے صوفیوں سے یہ بدگمانی عام ہو جاتی ہے کہ صوفی شریعت کے خلاف ہیں۔ اگلے زمانوں میں علمائے ظاہر نے سیاسی اغراض اور معاصرانہ چشمک کی وجہ سے خود ایک دوسرے پر طعن کیا ہے اور صوفیوں یا دوسرے فرقوں کے علاوہ خود اپنا فرقہ بھی ان کی زبان و قلم سے محفوظ نہیں رہا ذرا سا جزئی اختلاف کفر کا سبب ہو سکتا ہے اور اگر اختلاف نہ بھی ہو تو پیدا کر لینا کچھ دشوار نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی سچا صوفی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ تصوف انتہائے شریعت ہی کا نام ہے یہ ممکن ہے کہ ابنِ جوزی اور ابنِ تیمیہ کی شریعت سے بے نیاز ہو جائے۔

علاوہ ازیں صوفی شعرا نے اہلِ شریعت پر جو تنقید کی ہے اس سے بھی یہ شبہ ہو سکتا کہ تصوف شریعت کے خلاف ہے لیکن اسکی وجہ صرف وہی ہے کہ ان کے زمانے میں علمائے ظاہر رسومِ ظاہری کو شریعت سمجھنے لگے تھے اور بقول حافظؒ جلوۂ محراب و منبر اور خلوت کے کار دیگر میں کوئی مناسبت ہی باقی نہ تھی لیکن سچے اہلِ باطن کبھی بھی شریعت اور اس کے ظاہری آداب تک سے بے نیاز نہ ہوئے علامہ اقبال نے اسرارِ خودی میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ نظم کیا ہے کہ انھوں نے خربوزہ محض اسلئے نہیں کھایا کہ ان کو اس بارے میں پیغمبرِ اسلام کا عمل معلوم نہ تھا۔ ان کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ نزع کے عالم میں بھی ان سے ریش مبارک میں خلال کرنے کی سنت ترک نہ ہوئی۔ حضرت ابن عربی نے نصوص الحکم کے دیباچے میں یہ دعا فرمائی ہے کہ اللہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو شریعت محمدیہ کے ساتھ مقید کئے گئے اور وہ مقید ہو گئے۔ اہلِ باطن نے اپنے مکاشفات اور الہامات کی صحت کا معیار بھی قرآن و حدیث ہی پر رکھا ہے چنانچہ حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا ہے کہ جس حقیقت کی گواہی شریعت نہ دے وہ باطل ہے[۱]

اس قسم کے حالات اور اقوال بہ کثرت ہیں لیکن اکثر اوقات کسی خاص مقصد کو ثابت کرنے کی غرض سے بہت کو چھوڑ کر تھوڑے کا لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ نے اپنے مکتوب ۱۵۲ میں اپنے سلسلے کے ایک بہت بڑے شیخ حضرت خواجہ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے سلطان محمود غزنوی کے پاس جانے سے انکار کر دیا اس کے جواب میں محمود غزنوی نے کہلا بھیجا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یعنی قرآن نے کہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو اس پر حضرت شیخ رحمہ نے فرمایا کہ میں اطاعت الٰہی میں ایسا گرفتار ہوں کہ اطاعتِ رسولؐ سے بہت شرمندگیاں ہیں، صاحبانِ امر کی اطاعت کی نوبت کہاں یہ واقعہ مجدد صاحب نے اس تمہید سے لکھا ہے۔ کہ ——

" بعضے بڑے مشائخ نے سُکرِ وقت اور غلبۂ حال میں ایسی باتیں کہی ہیں جس سے خدا اور اس کے رسولؐ کی طاعت میں فرق ثابت ہوتا ہے "

حضرت مجدد صاحب نے اصل بات کو اس کے موقع سے ہٹا کر اس کے معنی بدل دیئے ہیں، لیکن پھر بھی انھوں نے

[۱] الطبقات الکبری لامام شعرانی

یہ نہیں کہا اور نہ کہہ سکتے تھے کہ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صوفیوں نے اسلام کو چھوڑ دیا تھا مگر یہ ترقی کا زمانہ ہے اور بمصداق اگر پدر نتواند پسر تمام کند ایک اور فاروقی نے یہ واقعہ مجدد صاحب کے حوالے سے لکھ کر کہا ہے کہ ـــ

" جو مکالمہ محمودؔ غزنوی اور شیخ ابوالحسن خرقانی رح کے مابین واقع ہوا وہ یہ ظاہر کرنے کیلئے کافی ہے کہ متصوفین نے اسلام اور پیغمبر اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا۔[1]

حضرت ابوالحسن خرقانی رح کی شخصیت، ان کا علم اور ان کی اطاعتِ رسُولؐ مسلم ہے مجدد صاحب اور ان کے پیروں کا سارا سلسلہ حضرت خرقانی رح کے خوانِ علم کا زلہ ربا ہے اس کے مقابلے میں اس واقعہ کو جو سند کے اعتبار سے بھی مجہول ہے اور ایک لطیفے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا سارے صوفیوں کو خارج از اسلام کرنے کے لئے سند بنا لیا گیا ہے غالباً یہ حضرات یہ فراموش کر گئے ہیں کہ ان کے جدِ بزرگوار سیدنا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام کے سامنے حسبنا کتاب اللہ فرما چکے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ شیخ خرقانی اطاعتِ خدا اور اطاعتِ رسول میں فرق کرتے ہیں بلکہ انھوں نے فرض و سنت میں فرق کیا جیسا کہ مجدد صاحب اور تمام اسلامی فرقے آج تک کرتے آتے ہیں۔

---

[1] مجدد صاحب کا تصور توحید از برہان احمد فاروقی

---

ادارہ

# مجھے بھول نہ جانا

قلعہ معلّیٰ تو چھٹ گیا جاتا رہا مگر اُس کی بہاروں میں جس دُلھن (اُردو) نے سولہ سنگھار کیے تھے وہ اپنے قدر دانوں سے بڑی حسرت کے ساتھ کہہ رہی ہے "دیکھو! مجھے بھُول نہ جانا!"

---

بیسویں صدی ہے بھیا! دنیا کے لوگ بڑے اوچھے اور چھوٹے دل کے ہوگئے ہیں، ہر کوئی بے ایمانی اور چھل فریب سے کام لیتا ہے، خود غرضی اور آپا دھاپی کا چاروں طرف دور دورہ ہے، کوئی کسی کی کٹی انگلی پر پیشاب نہیں کرتا اور کسی کے ساتھ کوئی تھوڑا بہت سلوک کر بھی دے تو طرح طرح سے احسان جتایا جاتا ہے کہ میں نے تیرے ساتھ یہ کیا وہ کیا۔

دودھ، دہی، گھی یہاں تک کہ تیل میں بھی دکان دار ملاوٹ کر دیتے ہیں، چیز بیچتے وقت کیسی کیسی باتیں ملاتے اور کیا کیا قسمیں کھاتے ہیں، مگر جھوٹ، دھوکا، ٹھگی! یہ بیوپاری کاہے کو ہیں گھٹ کٹے ہیں ——— قصائی کے یہاں سے ہمارے گھر اُچاپت پہ گوشت آتا ہے قسم لے لو جو اُس کی ایک پائی بھی ہمارے اوپر نکلتی ہو، مہینہ کی پہلی تاریخ ہوئی اور پُوری کی پُوری رقم کا بھگتان کر دیا، دو چار روپیہ اُس بے ایمان کے ہمارے پڑھاؤ ہی رہتے ہیں، پر صاحب! یہ قصائی بڑا ہی کٹنگ ہے، تولنے میں ڈنڈی مارتا ہے، سیر بھر گوشت تولے گا اور سیر میں آدھ پا[1] تین چھٹانک کم ضرور ہوگا۔

بہت سی پرچونی کی دکانوں پر اصل وزن سے کم کے باٹ ہوتے ہیں، پرسوں میں گھر کا سودا سلف مول لایا تھا، گھر آ کر چیزوں کو جو تولا، تو ہر چیز تھوڑی بہت کم ہوئی، کیا کریں کیا نہ کریں جہاں جاؤ ایک سا حال ہے، میں تو بھیا! دنیا کے لوگوں سے اِتنا[2] ڈرنے لگا ہوں کہ راستہ چلتے میں کوئی اُجلے پوش پاس سے گزرتا ہے، تو سوچتا ہوں کہ کہیں یہ میری جیب نہ کاٹ لے۔

اور یہ درزی ——— خدا کی پناہ! کوئی درزی قرآن کا جامہ بھی پہن کر قسم کھائے تو بھی میں اُس کا اعتبار نہ کروں، تم میرے بھائی کی برابر ہو میاں سعید! تمہارے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں، اپنی اچکن کے لئے تین گز کپڑا درزی کو لا کر دیا تھا، اُس نے پہلے کپڑے کو اپنے فیتے سے ناپا پھر میرا ناپ لیا، میں نے کہا اس میں میری حیدرآبادی اچکن بنے گی اور جو کپڑا بچے گا اُس میں واسکٹ[3] کے پیش نکال دینا، وہ پنسل دانتوں میں دبا کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر عینک کی ٹوٹی ہوئی کمانی میں بندھا ہوا ڈورا انگلی میں لپیٹ کر بولا کہ ہاں دونوں چیزیں نکل آئیں گی، سات روپیہ سلائی ٹھہری اور پانچویں دن اچکن تیار کر کے دینے کا وعدہ کیا، وعدے کے دن جو میں اُس کے پاس گیا تو مجھے دیکھتے ہی اپنے لونڈے کو ملاحیاں سنانے لگا ——— ابے! گدھے کی اولاد تیری وجہ سے لوگوں سے جھوٹا بننا پڑتا ہے، میں نے پوچھا خیر تو ہے کیا ہوا؟ بولا یہ تمہارا لڑکا کل صبح دکان کی تالی لے کر جو غائب ہوا ہے تو دن چھپے لوٹا، دن بھر کام کا ہرج رہا۔

[1] پاؤ [2] اتنا [3] ویسٹ کوٹ۔

اب میں کیا کہتا، کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی، اُس نے بیش بندی ہی کچھ اس طرح کی کہ زبان نہ کھل سکی۔ میں چلنے لگا تو آپ ہی بولا! پرسوں تیسرے پہر تک آپ کا کام تیار ہو جائے گا، جس دن اچکن دینے کا وعدہ تھا اس دن ایک ضروری کام نکل آیا، چوتھے دن میں اُس کی دوکان پر پہونچا، مگر میں کیا دیکھتا ہوں کہ دکان میں تالا پڑا ہوا ہے، پاس پڑوس کے دکان والوں سے پوچھا تو پتہ لگا کہ حضرت کو پتنگ اڑانے کا بہت شوق ہے، آج کسی سے پیچ بدے ہیں وہاں تشریف لے گئے ہیں، دو دن سے شیشہ کوٹا جا رہا تھا اور سمندر جھاگ ڈال ڈال کر مانجا سونت رہے تھے نواب صاحب!

سچ مانئے اُس کی دوکان کا میں نے کوڑی پھیرا کر دیا، تب کہیں جاکر اچکن ملی مگر واسکٹ کے پیش ندارد! کعبہ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگا کہ بابو جی! آپ کی اچکن کے کپڑے میں ایک کتر بھی نہیں بچی، کپڑا بھگونے میں سکڑ گیا۔۔۔ ۔۔۔جی میں آیا کہ ایک جھانپڑ رسید کردوں اُس درزی کے بچہ کے! مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔۔۔ ۔۔۔پھر آدمی کس کس سے لڑے، اس لنکا میں تو سارے کے سارے ہی باون ہاتھ کے ہیں۔

گھر لوٹ کر آیا تو ایک دوست کا پرچہ ملا کہ کل دوپہر کا کھانا میرے یہاں کھانا، چھٹی کا دن تھا، میں نہا دھو کر کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے گھر سے چل دیا، بڑی سڑک پر پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جوان لڑکیوں کی ایک ٹولی "لفٹ رائٹ" کرتی ہوئی جا رہی ہے، یہ زنانہ نیشنل گارڈ تھا! میرے تو شرم کے مارے پسینے چھوٹ رہے تھے، غیرت کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا، مسلمان لڑکیاں اور یہ بے حجابی! جن کے سر کا ایک بال بھی دکھائی نہ دینا چاہیے تھا اُن کا کیا کچھ نظر آ رہا تھا، قرب قیامت ہے! ایسی ایسی بے حیائی کی باتیں جب ہو چکیں گی، تب ہی تو قیامت آئے گی"!

ٹرام میں آج اور دن سے زیادہ بھیڑ تھی، کتنے ہی مسافر تو ڈنڈا پکڑے پائدان پر کھڑے تھے، میں بھی پچھلے حصہ میں کھڑا ہوگیا، مسافروں کی وہ کثرت کہ آدمی پہ آدمی لدا تھا، کس بری گھڑی میں نہ جانے گھر سے نکلا تھا کہ ایسی ہی باتیں پیش آتی جاتی تھیں، لوگوں کی دھینگا مُشتی میں بہار غل کا کرتہ بُور بُور ہوگیا، دلی میں پندرہ روپیہ میں تیار ہوا تھا یہ کرتہ! اُس پر جو بیل ٹکی تھی اُس بیل کی بیل اب مل ہی نہیں سکتی، کتنے دنوں سے سینت کر رکھا تھا میں نے اس کرتہ کو!

بارہ بجے کے لگ بھگ اپنے دوست کے گھر پہونچا، وہاں جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ مہمانوں کا میلہ سا لگا ہے، قوالوں کی چوکیاں اپنے تال طنبورے لئے بیٹھی ہیں ——— اور ایک سفید ریش بوڑھے آدمی کو دیکھ کر تو میرا وہ عالم ہوا کہ ہنسی کسی طرح نہ رکی! ساٹھ سے اوپر سن شریف، بھووں تک کے اِکّا دُکّا بال سپید ہو گئے تھے اس مردِ بزرگ کے ——— مگر حلیہ! اے سُبحان اللہ! ہاتھوں میں چوڑیاں، کانوں میں بُندے، ماتھے پر ٹیکا، گلے میں گلوبند، ناک میں خوب لمبی چوڑی نتھ۔۔۔ ۔۔۔اور نونگے، جوشن، چمپا کلی، سونے میں پیلا ہو رہا تھا وہ بوڑھا آدمی ——— میں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا سوانگ ہے! صاحب! میری اس طنز پر وہ آدمی قریب قریب جامہ سے باہر ہوگیا جیسے میں نے اُسے گالی دی ہو، بولا، آپ نہیں جانتے یہ چڑیا والے میاں صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے سجادے صاحب ہیں! سدا سہاگن کہلاتے ہیں ان کے خاندان میں سب لوگ اسی لباس میں رہتے ہیں، بڑے بڑے پہونچے ہوئے بزرگ گزرے ہیں اس گھرانے میں! ساڑھے چار سو سال کی گدی ہے ——— میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا، کہنا بھی چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا، اُس آدمی کے تیور بدلے ہوئے تھے، میں کچھ کہتا تو شاید وہ ہاتھا پائی پر اُتر آتا ———

اتنے میں میرے میزبان دوست آئے کہ چلئے وضو کر لیجئے! میں نے کہا وضو کیسا! ابھی تو ظہر کا وقت نہیں ہوا، اور وقت ہو بھی گیا ہو تو مجھے بھوک لگ رہی ہے، نماز پڑھوں گا تو کھانے ہی میں دل پڑا رہے گا، فرمایا کہ میرے پیر و مرشد قبلہ قدس سرہٗ کی

آج فاتحہ ہے، اُن کی فاتحہ کا کھانا بے وضو آدمی نہیں کھا سکتا، میں نے کہا کہ میں وضو نہیں کروں گا، یہ پابندی دین میں ایک بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہوتی ہے ..... میرا دوست انتظام میں مصروف تھا، میری بات کچھ سُنی، کچھ نہ سُنی! خیر صاحب! مہمانوں کے ساتھ میں بھی اندر پہونچا ــــــ دالان میں خوب چٹی سپید چاندنی بچھی تھی اس پر ملاگیری رنگ کا دسترخوان تھا، اور بہت سے کھانے چُنے تھے، دسترخوان کے آس پاس اگربتیاں جل رہی تھیں ــــــ اور لوبان سُلگ رہا تھا۔

دسترخوان پر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں کورے سکوروں میں شیر برنج تھی اور ایک تھالی میں پان کے بیڑے رکھے تھے ــــــ میں نے کہا یہ کیا؟ ارے بھئی! ابھی سے پان! ایک لقمہ بھی تو نہیں توڑا؟ جواب دیا گیا ــــــ آپ کو اتنا تک نہیں معلوم! حضور قبلہ کو پانوں کا بہت شوق تھا، اس لئے نیاز میں پان بھی شامل کر لئے گئے ہیں کہ حضور کی روح کو خوشی حاصل ہو ــــــ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا ــــــ آپ کے پیر و مُرشد نے تو بہت سی شادیاں کی ہیں ــــــ تو پھر آج کے دن ایک آدھ نکاح وکاح کا انتظام کیوں نہ ہو جایا کرے ــــــ شادی خانہ آبادی کا ثواب جب حضور کو پہونچے گا تو اور زیادہ خوشی حاصل ہو گی اُن کی رُوح پر فتوح کو ــــــ میں یہ باتیں سُن کر وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا، اور اُس محفل سے "وہابی ہے وہابی" کا شور اُٹھا ــــــ

سچ کہا ہے کسی نے کہ دانہ دانہ پر آدمی کا نام لکھا ہوتا ہے، میری تقدیر میں وہاں کا کھانا لکھا نہ تھا، یہ نیاز فاتحہ کا قصہ نہ ہوتا تو کوئی اور بات نکل آتی ــــــ خیر صاحب! ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا، بے مزہ کھانا! ڈھب ڈھب شوربہ کہ جی چاہے تو غوطہ لگا لو سیٹھی پھیکی دال، بجو مرسے لگا لگا کر روٹی کھائی ــــــ اور بل "ایک روپیہ ساڑھے تین آنہ! لیکن کہتا بھی تو کیا کہتا یہ بھٹیارے کی دوکان نہ تھی، ہوٹل تھا ہوٹل! رلیسٹورانٹ" جسے کیفے بھی کہتے ہیں، یہاں پہلے سر مونڈا جاتا ہے پھر بے بھاؤ کے پڑتے ہیں۔

ہوٹل سے نکل کر گلی میں آیا، یہ ایک پتلی سی گلی ہے، بہت سے بہت دو ڈھائی ہاتھ چوڑی ہو گی، اُس کے دونوں طرف اتنی اونچی عمارتیں کہ اُوپر کی طرف دیکھو تو سر کی ٹوپی اُتر پڑے، اسی گلی میں مسجد ہے، دروازے میں قدم رکھتے ہی سایبان آتا ہے جس پر کھپریل پڑی ہوئی ہے، مسجد میں ایک بڑے میاں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے، طباق سا نورانی چہرہ گول ڈاڑھی جٹی بھویں اور رنگ چٹا بُراق، بڑھاپے میں اتنا کھلتا ہوا رنگ، کم ہی دیکھنے میں آیا ہے، سچے کام کی ٹوپی، چکن کا ڈھیلا کرتہ، اس پر خوبصورت صدری، کاندھے پہ چوخانہ کا رومال، ایک پھول کی جوتیوں کا جوڑا اُن کے سامنے رکھا تھا۔

میں نے وضو کر کے نماز پڑھی، اور آخری رکعت کے سجدے ہی میں تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آکر نماز پڑھنے لگے، میں نے سلام پھیرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا شیر جلدی جلدی اُٹھک بیٹھک کر رہا ہے، ادھر ہاتھ باندھے، دو چار بار ہونٹ ہلے اور رکوع میں جُھک گیا ــــــ اور رکوع، جیسے صاحب لوگ سر کو جنبش دیتے اور "بو" ( bow ) کرتے ہیں، رکوع کے بعد جھٹ سجدے میں سر! نماز کیا پڑھ رہا تھا گھانس کاٹ رہا تھا، میں سمجھتا ہوں اُس نے آیتوں کے عدد نکال کر یاد کرلئے تھے، ورنہ اتنی جلدی کوئی نماز پڑھ کیسے سکتا ہے! ایک ڈاک گاڑی تھی جو فراٹے بھر رہی تھی ــــــ یا ایک گھڑی جس میں کسی نے کوک بھر دی ہو، اب وہ رک کیسے سکتی ہے، بے دلی کی نماز، جیسے آپ نماز کیا پڑھ رہے ہیں، اللہ میاں پر احسان فرما رہے ہیں!

اُس نے نماز ختم کی تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا میاں! تم نماز پڑھنے آئے تھے، یا بیگار ٹالنے آئے تھے، کیا تم دنیا کے کام اسی بے پروائی کے ساتھ کرتے ہو، سر کہیں خیال کہیں منہ سے کچھ پڑھ رہے ہو اور دل میں اور کہیں کی باتیں ہو رہی ہیں ــــــ

Cafe

میں کہتا رہا اور وہ ناخن کی کور کھٹکتا رہا اُس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اُس کا مُنہ کچھ سُست سا گیا نہ جانے پشیمانی سے یا غصہ سے! میں نے بھی اُس کا زیادہ پیچھا کیا مناسب نہ سمجھا —— بھلے آدمی کو بات یہ نسلی گھوڑے کو ایک ہنٹر بہت ہوتا ہے۔

مسجد سے باہر نکلا تو ایک فقیر سیڑھیوں سے لگا کھڑا تھا۔ ہاتھ میں بڑا جنگی تونبا تھا، اُلجھی ہوئی ڈاڑھی، سر پہ کنٹوپ منڈھا ہوا میں نے اُس کے تونبے میں اکنّی ڈال کر پُوچھا —— میاں صاحب! دن بھر میں کتنے کی پیدا ہو جاتی ہے، فقیر بولا —— بابو جی! تم جیسے سکھی داتا کہاں ملتے ہیں، دُنیا دکھی ہو گئی ہے، پیسہ جو ہاتھ کا میل ہے اُسے دین وایمان سمجھتے ہیں، کیسے ٹھَسّے سے مانگ پٹی کر کے گھروں سے نکلتے ہیں، ملکی لاٹ کی طرح اکڑتے ہوئے چلتے ہیں، بڑھیا میل کا جوڑا، پیروں میں گرگابی اور کان میں عطر کا پھویا —— منگتا بے چارہ چلّاتا اور صدا لگاتا رہے گا اور اُن کا پتھر دل کاہے کو پسیجے گا۔ —— بابو جی! دنیا بنے کی ساتھی ہے، رہتے ٹھوتھے آدمی کو کوئی نہیں پوچھتا، میں سدا کا بھکاری نہیں ہوں، میرے دادا کے دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے، گنگا جمنی تو عماری تھی، تین چرکٹے ہاتھی کی ٹہل کے لئے نوکر تھے، اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا، سن ستاون کے غدر میں میرے دادا کو ایک فرنگی کے قتل کے الزام میں پکڑ لیا اور پھانسی دیدی، ساری جائداد سرکار نے ضبط کر لی، اُس دن سے لاکھ کا گھر خاک ہو گیا، میرے باپ ایک زمیندار کے یہاں جا کر کارندے ہو گئے —— اور ۔۔ ۔۔ ۔۔

اتنے میں آگ بجھانے کا انجن گلی کے پاس کی سڑک سے ٹن ٹن کرتا ہوا گزرا، اور فقیر کی بپتا ادھوری رہ گئی، میں وہاں سے چلا آیا، تھوڑی دُور چلا ہوں گا، ایک دوست مل گیا مجھے دیکھتے ہی بولا، تم تو بھیّا! عید کا چاند ہو گئے: ہفتوں اور مہینوں ہو جاتے ہیں کہ درشن تک نہیں ہوتے، ایسی بھی کیا رُکھائی! تمھارے گھر پہ تین چار بار گیا مگر جب دروازے پر دستک دی، یہی جواب ملا کہ "گھر میں نہیں ہیں —— " یار کہیں آنکھ وانکھ تو نہیں لگ گئی اور کوئی دوسرا گھر تو نہیں بسا لیا —— میں نے کہا حمید صاحب! میرے باپ پولس کپتان نہیں ہیں، بھائی! غریب باپ کا بیٹا ہوں، روز کنواں کھودنا اور پانی پینا، گھر میں بیٹھا رہوں تو کھاؤں کیا؟ تھوڑی دیر تک ہم دونوں میں ہنسی مذاق ہوتا رہا، حمید، میرا لنگوٹیا یار ہے! بچپن میں ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، مکتب میں بھی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، مُلّاں جی کی قمچیاں ہم دونوں کو آج تک یاد ہیں، کیا زمانہ تھا —— ہائے! ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک! کسی بچہ کا ذرا کان بھی گرم ہوتا تو پاس پڑوس کے گھروں میں کھلبلی مچ جاتی، اور اب یہ حالت ہے کہ کوئی بخار میں جلتا رہے اور کسی کو مُنہ میں پانی چُوانے کی بھی توفیق نہ ہو۔

اتنی[1] کہانی آج سُن لی ہے، جو رہ گئی ہے اُسے کسی دن پھر سُن لینا، بھائی! جو کچھ کہا ہے وہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے، کسی بات میں ذرا سا بھی فرق نکل آئے تو مجھے تھوتھے تیروں سے اُڑا دینا!

## رہے نام اللہ کا!

[1] اتنی

عاصی کرنالی

# پیمبرانِ ادب

عاصی کرنالی کی شاعری اُس دور میں ہے جہاں پرچھائیاں نہیں خود حقیقتیں شاعر سے تقاضا کرتی ہیں کہ ہمیں شعر کے سانچے میں ڈھال دو۔

وہی چمن، وہی منظر، وہی بہار و طرب
نہ غم، نہ ذہن میں حالات کا پسِ منظر
وہ بجلیاں کہ جو انسانیت پہ ٹوٹی تھیں
دل و نگاہ کے عشرت کدے میں سوتی ہے
کہیں نقاب و تجلّی، کہیں رُخ و گیسو
وہ لوگ دور ہیں ماحول کے تقاضوں سے
وہ گوشِ عیش جو آسودۂ ترنّم ہے
وہ چشمِ مست جو ہے جنتِ بہار و جمال
ہوئے ہیں سرد شراب و قدح کے ہنگامے
ہوا تمام وہ پروانہ و چراغ کا دور
حدودِ لالہ و گُل سے گزر چکی دُنیا!
رباب و چنگ کی جنت میں اونگھنے والو!
جبینِ وقت کے اُبھرے ہوئے نقوش پڑھو
اک انقلاب کے ماحول میں ہیں غرب کہ شرق
بگڑ رہا ہے کچھ ایسا معاشرے کا نظام
تمہارا فرض ادیبو! پکارتا ہے تمہیں
تلاش میں ہے زمانہ سکون و راحت کی،
تم اِن کو حق و صداقت کی راہ پر لے جاؤ
جہاں کی کشمکشِ مستقل کا حل ہے یہی

ہے دوستوں کی طبیعت کا ماجرا بھی عجب!
بہار و گوشۂ آبِ رواں خدا کا غضب!
نظر نے اُن کی چمک کو بھلا دیا یا رب!
وہ آرزو کہ ہے معراجِ زندگی کا سبب
بھٹک رہے ہیں اِنھی وادیوں میں اہلِ طلب
ہے جن کی فکر کا مرکز "ادب برائے ادب"
اُسے کسی کی فغانِ شبی سے کیا مطلب
اُلجھ سکے گی خزاں کے مشاہدات میں کب!
نہ اب وہ سرخوشیٔ صبح ہے نہ عشرتِ شب
یہ قصّۂ دو نفس، وہ فسانۂ یک شب
نہ ساغروں کی کھنک ہے، نہ سازہائے طرب
اُٹھو کہ دہر میں تیغ و سناں کا دور ہے اب
تمام دہر ہے آتش بہ جاں، فغاں بر لب
اک اضطراب کے طوفاں میں ہیں عجم کہ عرب!
کہ زندگی کو شب و روز ہے اجل کی طلب
اگر مِلا ہے تمھیں فکر و شعر کا منصب!
تھکی تھکی سی نگاہیں اُداس اُداس سے لب!
کہ دور دور ہیں عرفان و آگہی سے یہ سب
کہ ہو زمیں پہ خدا کا نظام سب کا سبب!

تم اپنے فن سے زمانے کو روشنی دِکھلاؤ
تمھارا فرض یہی ہے پیمبرانِ ادب!

شفیق صدیقی
جون پوری

# ......ساغر کی جگہ تلوار ہے ساقی!

شفیق قوم کا ترجمان، ماحول کا عکاس اور حالات کا نبض شناس ہے! اُس کے شعروں میں جرأت ہوتی ہے ایمان کی جرأت! جس قوم میں یہ جرأت باقی ہے اُسے کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، مت سمجھو کہ یہ ستارہ ڈوب گیا، اُبھرنا اور اُفق پر چھا جانا اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے ——— تاریخ ایک "انقلاب" کا انتظار کر رہی ہے۔

ہمارا میرِ میخانہ بہت ہشیار ہے ساقی
کہ آنکھیں سو رہی ہیں اور دل بیدار ہے ساقی

بہت حالات نے چاہا خودی کو ختم کر دینا
مگر تیرے جوانوں کی وہی رفتار ہے ساقی

یہ جُھک جائیں تو فرق آجائے میخانہ کی عظمت میں
انہیں سے حریت کی گرمئی بازار ہے ساقی

زمانا چاہتا ہے شیشۂ و ساغر کو ٹکرانا
تو میخانے میں بھی آتش فشاں تیار ہے ساقی

اگر میری وفاداری کو ٹھکراتی رہی دُنیا
تو پھر ہاتھوں میں ساغر کی جگہ تلوار ہے ساقی

کہیں ایسا نہ ہو یہ کہہ کے اُٹھیں تیرے مستانے
رواداری کہاں تک زندگی دشوار ہے ساقی

جو ملت کی جگہ حبِّ وطن کی دُھن ہے واعظ کو
تو پھر کس کو لحاظِ جُبہ و دستار ہے ساقی

وہ ابن الوقت جو لرزاں ہیں تیغوں کی جھناجھن سے
وہاں جائیں جہاں پازیب کی جھنکار ہے ساقی

محبت کا صلہ یہ ہے محبت تو بھی کر مجھ سے
جبیں رکھتا نہیں قدموں پہ جو خوددار ہے ساقی

ذرا اپنے کرم سے بھی تو کرنا تھا سوال آخر
ہمیں سے کیوں برابر پرسشِ ایثار ہے ساقی

شفیقِ مست کو مغرب کے میخانوں سے کیا مطلب
اسے جوشِ ولائے حیدرِ کرار ہے ساقی

# اوراقِ گل

حسرت موہانی:۔
حیرت سے دیکھتا ہے زمانہ ہمیں کہ ہیں دونوں کے ہاتھ میں ہے گریبانِ آرزو
کس نے کہا تھا غیر کا احساں اٹھائیے ہم بھی وہی ہیں آپ وہی جانِ آرزو

علی وارث خاں راہی وارثی:۔
ہو کرم اُن کا تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے دردِ خود دردِ محبت کی دوا ہوتا ہے
نزع میں یاس سے ہر شے پہ نظر پڑتی ہے مرنے والے پہ یہی وقت بُرا ہوتا ہے
کون ہے بجز مصیبت میں بچانے والا ناخدا ڈوبنے والوں کا خدا ہوتا ہے
اُس پہ کیا زور بشر کا وہ اگر کچھ بھی نہ دے اُس کا احسان ہے جو کچھ بھی عطا ہوتا ہے

جب تک اللہ مددگار ہے کیا غم راہی
اک زمانہ مرا دشمن ہو تو کیا ہوتا ہے

ہجر لکھنوی
محبت میں جتنی پریشانیاں ہیں یہ سب حضرتِ دل کی نادانیاں ہیں
عجب کشمکش میں ہے بیمارِ اُلفت یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

حرماں خیرآبادی:۔
میری بربادیاں ہیں مدِ نظر یا فقط امتحان ہے پیارے

توفیق حیدرآبادی:۔
وہ شکستوں پر شکستیں دی ہیں جلووں نے ترے حسرتیں پھرتی ہیں لیکر آئینے ٹوٹے ہوئے

صفی لکھنوی
جام کے چلتے ہی گردش میں مقدر آگیا آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آگیا

آپ جس جرم کا چاہیں مجھے مجرم ٹھہرائیں
شرط یہ ہے کہ وہ تصنیف ہو تالیف نہ ہو
(سائل دہلوی)

تاباںؔ قادری

# تصویر کے دو رُخ

ہم اُن سے کہیں بیکس پہ کرم وہ حسن کے کہیں دستور نہیں
اظہارِ الم مقصود تو ہے توہینِ وفا منظور نہیں
موجود ہے اور موجود نہیں مستور ہے اور مستور نہیں
اندازِ نظر کا فرق ہے یہ وہ پاس نہیں وہ دور نہیں
درپیش شبِ ہستی کا سفر تاریک فضائے راہگذر
رہبر کا ا رہزن پہ نظر خطرے سے مسافر دور نہیں
اب میری خموشی خود شیون اب میرا تبسم خود آنسو
آہوں کا کوئی انداز نہیں نالوں کا کوئی دستور نہیں
اس راز کو تشا کیا کیجئے انساں کی حقیقت کیا کہیئے
مختار ہے اور مختار نہیں مجبور ہے اور مجبور نہیں

عبدالحمید عدمؔ

# پھُول

یُو گلستاں کی ہر اک شاخ ہے پیر رنگ فروش
نکہت و رنگ کے انبار ہیں اشجار دں پر
پھوٹتے ہی چلے آتے ہیں نمو کے چشمے
ہر چٹکتے ہوئے غنچے کا ہے انداز نیا
کتنے ترتیب و تناسب سے بڑھے آتے ہیں
ہے پسِ پردہ مفکر کوئی افسوں طراز

کوئی فردوس بکف ہے، کوئی فردوس بدوش
پھول ہی پھول ہیں گلزار کی دیواروں پر
زیست کی ساحرۂ عربدہ جو کے چشمے
ہر مغنی کی مناجات کا ہے ساز نیا!
مئے ڈھلی آتی ہے یا رنگ چڑھے آتے ہیں
بج رہا ہے بڑی تنظیم سے تخلیق کا ساز

پھر بھی انسان یہ کہتا ہے خدا کوئی نہیں
عقلِ مجروح کے زخموں کی دوا کوئی نہیں

# پیام

جینے کا قصد ہے تو [illegible]ں کی نہ کر تلاش
یہ زندگی حوادثِ پیہم کا نام ہے

وہ حرّیت کہ جس میں نہ آزاد ہو ضمیر
اُس حُرّیت کو دور سے میرا سلام ہے

مانا کہ عرش سدرۂ وطوبیٰ سے ہے بلند
مومن کا اس فضا سے بھی اونچا مقام ہے

میری نظر میں قدر نہیں اُس نگاہ کی
تہذیب[1] جس نگاہ میں ماہِ تمام ہے

اُس زندگی کا آئینہ پتھر سے توڑ دو
جس زندگی کا عیش دو روزہ مقام ہے

جس زُہد میں ہو خوئے غلامی کا رنگ وبو
اس پر ہوائے گلشنِ جنت حرام ہے

خود حُسن کی نمود کو اُلفت کی ہے تلاش
یہ کس نے کہہ دیا کہ محبت غلام ہے

اوجِ برامکہ ہو کہ فرِّ قرامطہ
عشرت کی زندگی صفتِ دورِ جام ہے

نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں
سمع قبول ہو تو خموشی پیام ہے

گل و لالہ و نسترن بیچتا ہوں
کوئی ہے؟ چمن کا چمن بیچتا ہوں

یتیموں کو تسکین دینے کی خاطر
شہیدوں کے خونیں کفن بیچتا ہوں

نہ دل ہی پہ قدرت نہ آنکھوں پہ قابو
تمدن بھی جادو سیاست بھی جادو

قفس کی فضا میں برابر ہیں دونوں
کبوتر کی منقار شاہیں کا بازو

حوادث کے طوفاں سے گھبرا نہ جانا
زمانہ ہے سعیِ عمل کی ترازو

ماہر القادری

[1] غیر اسلامی تہذیب

افسانہ

ماہر القادری

# "رقیب"

ساجد کئی گھنٹے سے میزان میں سر کھپا رہا تھا، مگر ہر بار ہندسوں کا جوڑ غلط ہی نکلا، حساب کتاب کا معاملہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے، کہ جہاں کسی عدد کی بھول چوک ہوئی، پوری کی کرائی محنت غارت ہو گئی —— وہاں اس سے کام نہیں چلتا "کہ قریب قریب ٹھیک ہے"... ہر عدد، ہر گنتی، ہر اندراج اور ہر میزان سو فی صدی ٹھیک ہونی چاہیئے، ریاضی میں اٹکل کو دخل نہیں - یقین، پورا یقین، جس طرح ایک انسان کو اپنے پیدا کرنے والے خدا کی ذات پر ہوتا ہے -

کمپنی کا منیجر بار بار چپراسی کو بھیج رہا تھا کہ صاحب کو کسی پارٹی میں جانا ہے، ساڑھے پانچ بج چکے، حساب کتاب کے رجسٹر مانگ رہے ہیں، افسر کے اس اصرار نے بیچارے ساجد کے اور ہاتھ پاؤں پھلا دیئے، اس نے میزان لگانے میں تیزی کی تو اور کام بگڑ گیا، پہلے دس بیس کی غلطی تھی، تو اب سیکڑوں تک معاملہ پہونچ گیا، اس کے چہرے سے غصہ کے آثار نمایاں تھے اُسے خود اپنے پر غصہ آ رہا تھا کہ آج میں کم بخت اس قدر غیر حاضر دماغ کیوں ہو گیا ہوں —— اور پھر اپنے مقدر اور شومیٔ قسمت پر بھی وہ جھنجھلانے لگا کہ دنیا میں بیسیوں قسم کے روزگار ہیں، یہ غلامی میرے نصیب میں آئی ہے، اور قسمت میں چاکری اور محکومی ہی لکھی تھی تو بنیوں اور ساہوکاروں کے اس بہی کھاتہ کا کام تو مجھے نہ کرنا پڑتا، ایک ایک کرکے دفتر کے تمام کلرک اپنے اپنے گھر کو چلے گئے اور میں ہوں کہ میزان ہی میں اپنی جان کھپا رہا ہوں، قدرت نے روزِ ازل میں میری سرنوشت شاید ٹیڑھے قلم سے لکھ دی تھی جب ہی تو پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں -

ساجد کو تنخواہ ہی اس کام کی ملتی تھی، غلط اور اُدھوری میزان چھوڑ کر وہ دفتر سے جا ہی نہیں سکتا تھا، اُس نے تمام مدوں کو چیک کیا، معلوم ہوا کہ اخراجات کی ایک رقم میزان میں آنے سے رہ گئی، اس رقم کو شامل کرکے جو میزان لگائی تو بیڑا پار تھا —— اُس کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مُسکراہٹ کھیلنے لگی تھکے ہوئے آدمی کی مسکراہٹ زیادہ شگفتہ نہیں ہوتی -

دفتر سے وہ اس طرح نکلا جیسے قیدی اپنی قید کی میعاد ختم کرکے قید خانہ سے بھاگتا ہے، در و دیوار اُسے بھیانک محسوس ہو رہے تھے "دفتر" جہاں چاروں طرف ذمہ داریوں کی سلاخیں کھڑی ہوں، دل لگنے کی جگہ نہیں ہو سکتی، وہاں جو آتا ہے، بہ مجبوری آتا ہے، اس پیٹ کے دوزخ کے لئے آدمی کو بہت سی ناگوار باتیں گوارا کرنی پڑتی ہیں -

ساجد دفتر کی پانچ منزلہ عمارت سے اُتر کر نیچے آیا، رات ہو چکی تھی، بجلی کے قمقمے ہر طرف روشن تھے، سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے، ان میں وہ بھی تھے کہ صرف تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لئے گھروں سے نکلے تھے اور کچھ کام والے بھی، اس دنیا میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے -

ساجد کچھ سوچ رہا تھا —— تھک گیا ہوں، لاؤ سواری کر لوں، پیسہ ہوتا آخر کس لئے ہے، آج طبیعت بھی کیف بھی ہے —— مگر روپیہ سوا روپیہ سے کم میں نہیں جائے گی میرے گھر تک وکٹوریہ گاڑی، ایک جوان آدمی کو میل ڈیڑھ

میل چلنا کیا مشکل ہے، یہ جو سروں اور کاندھوں پر مزدور بھاری بھاری گٹھریاں اور ٹوکریاں لئے لئے پھرتے ہیں آخر یہ بھی تو میری طرح آدمی ہیں، مجھ سے اپنا آپا بھی نہیں سنبھلتا، خالی چلنا بھی دوبھر ہے ——— اور ہاں! خرچ ہی کرنا ہے تو کسی ہوٹل میں کیوں نہ چلوں، جتنا سواری میں خرچ ہوگا، اس سے کم میں تو پُرتکلف قسم کا ناشتہ ہو جائے گا ——— مگر ایک مشکل ہے کہ ہوٹل میں کوئی جاننے والا مل گیا، اور تمھیں اُس کی تواضع کرنی پڑی تو کیا ہوگا! کُل دو روپیہ تمھاری جیب میں ہیں، یاد نہیں ہے پچھلے اتوار کا واقعہ کہ دو جاننے والوں سے اسٹار ریسٹورنٹ میں جھوٹے کو پوچھا اور وہ سچ کو بیٹھ گئے، ساڑھے تین روپیہ کا ہوا تھا چائے اور کیک پیسٹری کا بل ——— مگر ایسا موقع آگیا تو میں طرح دے جاؤں گا، ہوٹل میں ہر جاننے والے کو تواضع کچھ ضروری بھی تو نہیں ہے۔

ساجد ریسٹورنٹ کیطرف چل پڑا، دل نے آخر کار یہی فیصلہ کیا کہ پیٹ پُوجا اور کام و دہن کی تواضع ہو جائے تو اچھا ہے، ہوٹل کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں، قریب کے سینما ہاؤس میں کوئی نیا کھیل آیا تھا یہ اُس کے دم کی چہل پہل تھی" ساجد کو فیملی روم کے قریب ایک میز پر جگہ ملی، اگر وہ دو چار منٹ بعد آتا تو یہ جگہ بھی بھر جاتی، گاہک آئے چلے جا رہے تھے، ہوٹل والے کی قسمت کا ستارہ اوج پر تھا۔

ریسٹورنٹ کا نوکر آیا ساجد نے آرڈر دیا مگر دس بارہ منٹ ہو گئے ملازم لوٹ کر نہیں آیا، اُس نے گھنٹی بجائی اُس کے جواب میں ایک ملازم نے دُور سے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ چائے آرہی ہے ——— نوکر آیا، ساجد نے ڈانٹ کر کہا کہ تمھارے ہوٹل میں سروس کا یہ عالم ہے کہ کوئی چیختا رہے مگر شنوائی نہیں ہوتی، نوکر نے چائے کی کشتی میز پر رکھتے ہوئے کہا کہ صاحب! آپ گاہکوں کی بھیڑ نہیں دیکھ رہے ہیں، کیا کیا جائے، ہوٹل میں سبھی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

ساجد کے بالکل سامنے زنانہ کمرہ (FAMILY ROOM) تھا، کمرہ کا پردہ ملازم کے اندر آنے جانے میں جو سرکا تو ساجد کو ایک جوان عورت کرسی پہ بیٹھی ہوئی دکھائی دی، ایک بار کچھ یوں ہی جھلک، دوبارہ اس سے زیادہ مفصل نظارہ اور تیسری بار دیکھنے میں کوئی حجاب درمیان میں نہ رہا ——— صورت اچھی خاصی دیدہ زیب تھی، ہنس مکھ چہرہ لانبے بال جن کی ڈھیریاں شانوں پہ رکھی تھیں اور لباس سب سے بڑھ چڑھ کر ——— ساجد آوارہ مزاج نہ تھا اُس کی زندگی بہت کچھ سنجیدہ اور ہموار تھی، مگر ایسے رنگین اور حسین نظارے جو بغیر کسی کوشش کے میسر آ رہے تھے، اُن سے منہ پھیرنا بھی تو مشکل تھا، آنکھیں چاہتی تھیں کہ کمرے کا پردہ جلد جلد اُٹھتا رہے۔!

ساجد چائے پی چکا تھا، بل بھی چکا دیا گیا مگر وہ ابھی تک بیٹھا تھا، حسین نظارے نے اُسے جانے سے روک دیا ——— کیا ساجد اُس حسین عورت پر سچ مچ عاشق ہو گیا تھا؟ جی نہیں! اس تہذیب زدہ دور میں کوئی کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا، وہ دن لد گئے جب فرہاد اور مجنوں پیدا ہوا کرتے تھے، نجد و محمل اور سنگ و تیشہ کی بس حکایتیں ہی باقی رہ گئی ہیں، آج کی عشق عاشقی چٹخاروں کا نام ہے، تاک جھانک، اشارے، مسکراہٹیں ——— زیادہ لے بڑھی تو خط و کتابت ٹیلیفون پر بات چیت اور پھر پارکوں کی سیر اور ہوٹلوں کی تفریح! مگر ان چٹخاروں کو بھی ایک حال پر قرار نہیں، دلچسپیوں کے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، ہر خم گیسو بہت سے شانے چاہتا ہے، ہوس بہت بری چیز ہے مگر اس زمانہ میں تو وہ اور بھی ذلیل اور ہرجائی ہو گئی ہے۔

بے چارہ ساجد اسی زمانہ کا نوجوان تھا، بدچلن اور آوارہ نہ سہی مگر اتنا زاہد خشک بھی نہ تھا کہ حسین چہروں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا، آجکل تو آنکھوں کا سب سے بڑا مصرف یہی "نظارہ بازیاں" سمجھی جاتی ہیں، جو اس لذت سے محروم

ہے، اُس غریب کی بدقسمتی پر سماج کو ترس آتا ہے۔

فیملی روم کا پردہ اُٹھا اور اندر سے وہی عورت اور ایک نوجوان دونوں ایک ساتھ برآمد ہوئے، عورت کے چہرے پر ہلکی سی نقاب تھی جس نے قمقموں کی روشنی میں چہرے کی صباحت کو اور چمکا دیا، وہ دونوں ہوٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے، ساجد سے نہ رہا گیا، وہ اب ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بھی کیا کرتا، گھر بھی جانا تھا، بہرحال وہاں سے اُٹھنا ضرور پڑتا، تو یہ موقع بہت غنیمت تھا کہ گھر جاتے جاتے ایک آدھ نظارہ اور ہوجائے گا، ان داموں یہ سودا کیا بُرا تھا۔

ہوٹل کے قریب ہی چوراہہ تھا، پولیس کے دو سپاہی وہاں کھڑے تھے، نوجوان چلنے لگا، عورت اُس کے پیچھے پیچھے تھی، ساجد کو بھی اُسی طرف جانا تھا، وہ بھی اُن کے پیچھے ہولیا، سڑک پر آنے جانے والوں کی خاصی بھیڑ تھی، اُن کو تھوڑی دیر رُک جانا پڑا سپاہی نے ساجد اور اُن دونوں کو قدرے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا، آگے۔ چل کر وہ دونوں ایک گلی میں مڑ گئے اور ایک رومال اپنی نشانی چھوڑ گئے، ساجد کے سامنے رومال پڑا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ رومال اُٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں —— یہ دوسرے کا مال ہے، مجھے اُٹھانے کا کیا حق ہے —— مگر میں نہ اٹھاؤں گا تو کوئی دوسرا اُٹھالے گا —— اور یہ کوئی چوری تھوڑی ہے، بدنیتی کو ذرا سا بھی دخل نہیں ہے اس میں:۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ میرے جذبِ شوق کا سارا ظہور ہے جو اُدھر سے رومال جان کر گرایا گیا؟

ساجد نے رومال اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا، تھوڑی دور چل کر رومال جیب سے نکالا، اُس کی تہ میں وزیٹنگ کارڈ رکھا تھا، رومال کو سونگھ کر اُس نے کارڈ اُسی تہ میں رکھ دیا، رومال میں کچھ یوں ہی سی خوشبو تھی مگر ساجد کے شوق نے اُسے بہت کچھ تیز کر دیا۔

وہ رات کو نو بجے کے بعد گھر پہونچا، گھر والوں نے کہا کہ تم اب تک کہاں رہے ہم سب فکرمند تھے، تمہارے دفتر بھی آدمی کو بھیجا، کہیں آنا جانا ہوا کرے تو گھر میں کہہ دیا کرو، ساجد نے جواب دیا کہ آج کام میں بہت دیر ہوگئی، ایک میزان میں غلطی پڑ گئی تھی اُسی ظالم کی جانچ پڑتال میں شام ہوگئی، پھر ایک دوست کے ساتھ ہوٹل میں چلا گیا، اتفاقی واقعات کی کسطرح اطلاع دی جاسکتی ہے۔

گھر میں ریڈیو بج رہا تھا، خبروں کے بعد اعلانچی نے اعلان کیا کہ فلاں بائی ایک غزل پیش کریں گی، اعلان کے ختم ہوتے ہی ساز چھڑ گئے، اور مغنیہ نے گایا:۔

اُس کی پہلی نظر کو کیا کہئے<br>
عشرتِ مختصر کو کیا کہئے

ساجد اس مطلع پر جھوم جھوم گیا، حسبِ حال تھا، مطابقِ واقعہ، آپ بیتی! یہ چوٹ تھوڑی دیر پہلے کی کھائی ہوئی تھی، اس غزل نے تارِ رگِ جاں پر زخمہ کا کام کیا۔

رات کو ذرا دیر سے نیند آئی مگر یہ نہیں ہوا کہ رات میں کروٹیں بدلنی پڑیں، ایسی چوٹیں تو لگتی ہی رہتی ہیں، آدمی ایک ہی چوٹ کا ہوکر رہ جائے تو تمناؤں میں رنگارنگی کہاں سے پیدا ہو، مزا تو تتلی بن کر پھول پھول کا رس چوسنے میں ہے، نشیمن کے لئے بس ایک ہی شاخ کے ہوکر رہ جانا خشک مزاجی کی دلیل ہے، ہونا یہ چاہئے کہ آج اس پیڑ پر کل اُس پودے پر چھائے تیسرے دن کسی دوسری ڈالی پر بسیرا کر لیا، زندگی کا لُطف رنگ آرائیوں میں ہے —— تہذیبِ حاضر نے یہی سکھایا ہے!

دوسرے دن صبح نو اور دس کے درمیان ساجد مکان سے روانہ ہوا، وہ پیدل چل رہا تھا اور آج کے کام کا پروگرام دل ہی میں بنا رہا تھا، جب وہ ہوٹل کے قریب کے چوراہے پر پہونچا ہے تو اُس کے ہونٹ آپ ہی آپ ہل رہے تھے، بہت ہی دھیمی آواز۔ ——"آج دوپہر تک Balance sheets ضرور تیار کر لوں گا ......" اتنے میں اُس نے محسوس کیا کہ کسی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، اُس نے چونک کر دیکھا تو پولس کا سپاہی اُس کے قریب کھڑا تھا۔

—— یہ کیا .. ایں .... ارے بھائی! تم میرا راستہ کیوں روکے کھڑے ہو —— ساجد نے سپاہی سے کہا

—— تھانے چلئے! تھانے! —— سپاہی نے جواب دیا

—— کیوں، بھئی! تھانے کیوں چلوں، میں کوئی چور ہوں، کسی کی گرہ کاٹی ہے، فوجداری کی ہے میں نے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو! شریفوں کو اس طرح راہ چلتے ذلیل کرتے ہو —— ساجد نے سخت لہجہ میں کہا

—— دیکھئے! زیادہ حجت نہ کیجئے، خیریت اسی میں ہے کہ میرے ساتھ چلے چلئے، ورنہ سر بازار آپ کی رسوائی ہو گی، ابھی یہ دو چار آدمی دیکھ رہے ہیں، پھر سارا بازار تماشا دیکھے گا —— سپاہی وردی کی سلوٹ درست کرتے ہوئے بولا۔

ساجد سپاہی کے ساتھ ہو لیا، اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ہونٹوں پر ذرا سی دیر میں خشکی کے مارے پپڑی جم گئی، پاؤں بہکے بہکے پڑ رہے تھے، زبان سے کہتا کچھ اور نکلتا کچھ تھا، ساجد نے سپاہی سے پوچھا کہ تم مجھے کیوں پکڑے لئے جا رہے ہو، تمہیں دھوکا ہو رہا ہے جمعدار صاحب! سپاہی نے کہا تھانے چل کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

راستہ میں ساجد بھیگے ہوئے کبوتر کی طرح سُکڑا سکڑا چل رہا تھا آنکھیں شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھیں اور دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ کسی جان پہچان والے کا سامنا نہ ہو جائے! مگر ایسے موقعوں پر اکثر وہی ہو کر رہتا ہے جس کے لئے دل نہیں چاہتا، بڑی مسجد کے قریب اُس کا ایک دوست مل ہی گیا، ساجد نے بہت کچھ نظریں بچائیں مگر کامیابی نہ ہو سکی —— دوست نے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بولا کہ چلو چائے پی لو، ساجد نے عُذر کیا کہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے اس وقت چائے پیوں گا تو کام کا ہرج ہو جائے گا، سپاہی کو پاس ہی کھڑا دیکھ کر ساجد کا دوست سپاہی سے خشونت آمیز لہجہ میں، بولا— میاں! تم یہاں کیوں کھڑے ہو .. یہ کیا؟ کچھ کام ہے ہم سے! سپاہی کے جواب دینے سے پہلے ساجد بول پڑا اُن ہی جمعدار صاحب سے میرا ایک کام ہے، بھیّا! مجھے جلد جانے دو، شام کو میں تمہارے مکان پر خود آؤں گا، اُس وقت جتنی بھی چائے چاہو پلا دینا۔

سپاہی ساجد کو لیکر تھانے میں پہونچا، سپاہی نے ساجد کی طرف معنی خیز انداز میں اشارہ کیا یعنی جس آدمی کی تلاش تھی وہ یہی ہے، انسپکٹر صاحب کے کمرے میں بنچ پر ساجد بیٹھ گیا، انسپکٹر نے ساجد سے اُس کا نام، پیشہ، جائے سکونت، اور ضروری باتیں دریافت کیں —— اور اُس کے بعد؟ —— "رات نو بجے آپ گلزار ہوٹل میں تھے، اور ایک عورت اور نوجوان مرد بھی آپ کے ساتھ تھے" اس پر ساجد نے گھبرا کر جواب دیا —— "جی ہاں! میں کمپنی کے دفتر سے اُٹھ کر سیدھا ہوٹل چلا گیا، وہاں میں نے چائے پی تھی، مگر جس عورت اور مرد کا آپ نے ذکر کیا ہے، اُن کو میں نہیں جانتا ....."

انسپکٹر کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی جیسے کسی کو کھوئی ہوئی چیز مل جائے، اُس نے عورت اور اُس کے ساتھی مرد کے بارے میں پھر سوال کیا تمہاری بات ہی کو ہم سچ مانے لیتے ہیں کہ تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے، مگر ہوٹل سے اُٹھ کر تم ان کے ساتھ ساتھ تو گئے تھے —— اس پر ساجد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری قصداً کئی بار کھانسا تاکہ وہ کچھ سوچنے کے لئے

وقفہ چاہتا تھا، پھر بولا، صاحب! میں کسی کے پیچھے یا ساتھ ساتھ نہ تھا، اور یوں کوئی آدمی راستہ میں چلتا ہے تو سارے راہ گیر اس کے ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں اور آگے چلنے والوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ چند آدمی اُس کے آگے تھے اور کچھ لوگ خود اُس کے پیچھے بھی تھے! انسپکٹر صاحب! خدا کے لئے مجھے بتا تو دیجئے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ پولس کو آخر کیا غلط فہمی ہوگئی ہے ——
جی ہاں پولس کو کبھی کبھی غلط فہمی ہوجایا کرتی ہے! ساجد صاحب قبلہ! —— اس طنز آمیز جملہ کے بعد انسپکٹر کے اشارہ کرنے پر سپاہی نے ساجد کے کپڑوں کو ٹٹولنا شروع کردیا، جامہ تلاشی میں وہی رومال اور اُس میں رکھا ہوا وزٹنگ کارڈ برآمد ہوا، کارڈ کو انسپکٹر نے سپاہی کے ہاتھ سے جھپٹ کر جلدی سے پڑھا —— نسیم مرزا —— پڑھتے ہوئے اُس نے قہقہہ لگایا —— اور بولا :-

" کیا کیا شریف بدمعاش پیدا ہوگیا ہے اس زمانہ میں! صورت دیکھو تو فرشتوں کی اور کرتوت شیطانوں سے بھی بدتر! اور پھر اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! پولس کو غلط فہمی ہورہی ہے —— خوب! ارے پولس نہ ہو تو تم جیسے اُجلے پوش بدمعاشوں کے ہاتھوں شریفوں کا زندہ رہنا مشکل ہوجائے —— "

ساجد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اُس کے کان کے پردوں کو تھانیدار کے لفظ تیر کی طرح برماتے ہوئے گزر گئے، وہ اپنا غم کہتا تو کس سے کہتا، عورت کو دیکھنے اور زمین پر گرے ہوئے رومال اُٹھانے کا وہ ضرور گنہگار تھا .. بس! یہی فردِ جرم اُس کے خلاف لگائی جاسکتی تھی مگر وہاں تو مقدمہ کی نوعیت ہی کچھ اور تھی وہ عورت کون تھی؟ مرزا اُس کے ساتھ کیوں تھا؟ اُن کے آپس میں کیا تعلقات تھے! ان تمام باتوں کی اُسے خبر نہ تھی، مگر پولس بھی کیا کرتی دلوں کے حالات معلوم کرنے کا آلہ تو اُس کے پاس ہے نہیں کہ آلہ لگایا اور ساری باتیں آئینہ ہوگئیں، وہ کسی واقعہ اور حادثہ کے بارے میں قراین سے ثبوت ہی مہیا کرسکتی ہے اور کڑی سے کڑی ملانے کے لئے اُسے بہت سے" اضافے" بھی کرنے پڑ جاتے ہیں —— لیکن یہاں تو سارے قرائن موجود تھے یہاں تک کہ مدّعا (رومال اور کارڈ) بھی مل گیا۔

ساجد اب حوالات میں تھا —— اکیلا نہیں چوروں، گرہ کٹوں اور بدمعاشوں کے ساتھ! ایک ہی رات میں اُس کی ایک مہینہ کے بیمار جیسی حالت ہوگئی، چہرہ سُت گیا، آنکھوں کی چمک جاتی رہی، تیوروں کی شادمانی اداسی سے بدل گئی، اُس پر پیچ غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، وہ بار بار سوچتا کہ نہ جانے مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے —— بوڑھے سپاہی نے ایک دن سیاہی کی بوتل پھینک دی تھی میں نے اُسے بُرا بھلا کہا تھا —— جمعہ کی نماز کے بعد اور تو سب فقیروں کو میں نے پیسے دیئے مگر وہ لنگڑا فقیر ہاتھ پھیلاتا ہی رہ گیا —— پڑوس کی بوڑھی عورت نے دس روپیہ اُدھار مانگے تھے میں نے انکار کردیا —— گندے دار نماز پڑھتا ہوں میں بدنصیب! —— اور میری انجیس پکی چھنال بھی تو ہیں —— سینما دیکھنے کے لئے خالو ابّا کی اچکن سے ایک روپیہ میں نے نکالا تھا —— اسکول میں اپنے دوست رمیش کو سزا سے بچانے کے لئے ماسٹر صاحب کے سامنے ایک بار جھوٹی گواہی بھی دی تھی —— اور وہ آموں کی چوری اور ہرن کا شکار کھیلتے ہوئے کسان کی فصل کی پامالی —— غریب میر صاحب کو "ا مجور، ا مجور" کہہ کر چھیڑنا اور اُن کا مذاق اُڑانا —— بچپن میں ابّا کے ڈر کے مارے کئی بار بے وضو ہی نماز کے لئے کھڑا ہوگیا —— ذرا ذرا سی بھول چوک یاد آرہی تھی ——

پولس کی تحقیقات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی، مُلزم شاکر جس نے نسیم مرزا اور فیروزہ کو زخمی کیا تھا دو ہفتہ کے بعد

Ex ...

گرفتار ہوا، مجروحین کی ہسپتال میں مرہم پٹی ہو رہی تھی، پولس کو ضروری ثبوت بھی مہیا کرنا تھا، ساجد کو بڑی کوشش اور دوڑ دھوپ کے بعد شخصی ضمانت پر رہائی ملی، سارے شہر میں اسی حادثہ کا چرچا تھا، کوئی نسیم مرزا کا قصور بتاتا کہ آجکل کے نوجوان بڑے بدمعاش ہوتے ہیں، نادان اور بھولی بھالی لڑکیوں کو طرح طرح سے اپنے دامِ ہوس میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــــ کوئی کہتا کہ سارا قصور اس لڑکی کا ہے وہ سہارا نہ دیتی تو دوسری طرف سے پینگ بڑھانے کی نوبت ہی کیوں آتی، عورت چاہے تو مرد کے پہلے اقدام ہی پر اُسے ناامید کر سکتی ہے، بُری اور بھلی نگاہ کو ہر کوئی پہچانتا ہے!

عدالت میں مقدمہ پیش ہوا ثبوت اور صفائی کے گواہوں کے بیانات ہوئے جس دن پیشی ہوتی، مجسٹریٹ کا کمرہ تماشائیوں سے بھر جاتا، سب سے زیادہ دلچسپ بلکہ مقدمہ کی جان نسیم مرزا اور فیروزہ کے بیانات تھے۔

نسیم مرزا نے بیان دیا:- کریسنٹ نیشنل کالج میں بی۔ اے کا طالب علم ہوں، ہمارے یہاں لڑکیوں اور لڑکوں کی ملی جلی تعلیم ہوتی ہے، فیروزہ بھی میرے درجہ میں پڑھتی ہے اور شاکر بھی اس کلاس کا طالبِ علم ہے، فیروزہ سے میری دوستی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک دن پروفیسر صاحب غالب کا دیوان پڑھا رہے تھے اس شعر پر:-

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زُلفیں پریشان ہو گئیں

میں نے فیروزہ کی طرف دیکھا اور فیروزہ ایک خاص ادا کے ساتھ مُسکرا دی، اب یہ ہونے لگا کہ پروفیسر صاحب شعر پڑھ رہے ہیں اور ہم دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں لُطف لے لیکر باتیں کر رہے ہیں بلکہ سوال و جواب ہو رہے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے، شاکر نے بھی فیروزہ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر فیروزہ نے اُسے ٹھکرا دیا، شاکر سے کالج کی لڑکیاں عام طور پر ناراض ہیں کیونکہ وہ لڑکیوں کو دُھوکا دے چکا ہے۔ (دُھوکے سے کیا مطلب ہے تمھارا ـــــــ عدالت نے سوال کیا) کیا عرض کروں (شرماتے ہوئے) کیا عرض کروں! (عرض تو کرنا ہی پڑے گا ـــــــ عدالت نے کہا) یہی سمجھ لیجئے کہ شاکر نے محبت کر کر کے چھوڑ دی، لڑکیوں کو جھوٹے وعدوں میں رکھا (تو تمھارے کالج میں لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر محبت کرتی ہیں .. .. عدالت!) جی ہاں! معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے، اس دریا میں سوکھا شاید ہی کوئی رہا ہو، جو ڈوبے نہیں وہ تھوڑے بہت تردامن تو ضرور ہو گئے (اور کالج کے پروفیسر کوئی نوٹس نہیں لیتے ـــــــ عدالت!) جی! وہ سب کچھ جانتے ہیں کالج میں دس سال سے ملی جلی تعلیم شروع ہوئی ہے اس مُدت میں ایک لڑکے پر دس روپیہ جُرمانہ ہوا اور ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا اخراج عمل میں آیا ـــــــ ہاں! تو جناب والا میری اور فیروزہ کی جتنی زیادہ گہری دوستی ہوتی گئی، اسی قدر ہی شاکر کی دُشمنی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ۱۲ر دسمبر کی رات کے دس بجے جب میں اور فیروزہ کمپنی باغ میں ٹہل رہے تھے، شاکر نے یہ کہتے ہوئے "اب تم دونوں چین سے قبر میں سونا" ہم پر چاقو سے حملہ کر دیا، اُس نے پہلے میرے چاقو مارا اور دوسرا چاقو فیروزہ کے سینہ میں پیوست کر دیا، فیروزہ سبزہ پر غش کھا کر گر پڑی، میں نے شور مچایا اور شاکر کو پکڑنا چاہا تو اُس نے دوسرا وار مجھ پر کیا، اور پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا، تیسرے دن ہسپتال میں جا کر مجھے ہوش آیا ـــــــ"

فیروزہ نے جس کے بازوؤں کے زخموں پر ابھی تک پٹیاں بندھی تھیں عدالت میں بیان دیا:- "میں نیشنل کالج میں پڑھتی ہوں.. .. ہمارے اُردو کے پروفیسر صاحب نے ایک بار کلاس میں کہا کہ روکسی سینما ہال میں جو "سفینہ"

نام کی فلم چل رہی ہے وہ ہر اعتبار دیکھنے کے قابل ہے، اُس کے مکالمے اردو کے طالب علموں کے لئے فائدے سے خالی نہیں، میں نے جا کر فلم دیکھی، واقعی بہت زیادہ اثر انگیز فلم تھی، خاص طور سے اُس کا یہ جملہ "محبت کے بغیر زندگی سُونی سُونی رہتی ہے" میرے دل پر نقش ہوگیا ۔۔۔ بس اُسی کے بعد سے میرے اور نسیم مرزا کے درمیان" Friend ship "
کی داغ بیل پڑ گئی، میرے اور نسیم مرزا کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے (تو فلم "سفینہ" دیکھنے سے پہلے کالج میں دوسرے لڑکوں سے تمھاری friend ship نہ تھی یعنی جنگ تھی ۔۔۔ عدالت) فیروزہ (شرماتے ہوئے) نہیں لڑائی تو کسی سے نہ تھی سب سے بول چال تھی، فرینڈ شپ سے میری مُراد، محبت اور چاہت ہے، شاکر کو ہم دونوں کی دوستی بھلی نہ لگی، وہ مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتا تھا اور میں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا، اسی درمیان میں دوسری بات یہ پیش آگئی کہ گرلس کالج کی پرنسپل صاحبہ کے ساتھ میں نے ایک بار شاکر کو پھول باغ میں ٹہلتے ہوئے دیکھ لیا اور میرے والد جو گرلس کالج کے ٹرسٹی ہیں، اُن سے اس واقعہ کا ذکر کر دیا، اُس دن سے وہ اور بھی میرا مخالف ہوگیا، ۔۔۔ ایک دن کلاس میں زینہ سے اُترتے ہوئے شاکر نے مجھ سے کہا۔ دیکھو! میں تم کو وارن (warn) کرتا ہوں کہ نسیم مرزا سے ربط ضبط ختم کر دو، ورنہ تمھیں اس کی بڑی بھاری قیمت دینا پڑے گی ۔۔۔ پھر ۱۲؍ دسمبر کی رات کو شاکر نے کمپنی باغ میں چاقو سے ہم دونوں پر حملہ کر دیا، میں چاقو لگتے ہی بے ہوش ہوگئی ۔۔۔ !

شاکر نے عدالت میں کہا کہ میں نے جو کچھ کیا انتقام آمیز اشتعال کے تحت کیا، میری چھوٹی بہن زرینہ جو فیروزہ کی سہیلی ہے اُسے بُری راہ پر ڈالنے والے یہی دونوں نسیم مرزا اور فیروزہ ہیں ۔۔۔ !

ساجد کا کسی ایک نے بھی نام نہیں لیا، وہ اس واقعہ سے بالکل بے تعلق پایا گیا، عدالت نے شاکر کو تین سال قید سخت کی سزا دی اور ساجد کو باعزت طور پر رہا کرتے ہوئے، پولس پر ریمارک کیا کہ ایک شریف آدمی جس کا اس جُرم سے کوئی دُور کا بھی لگاؤ نہیں تھا، صرف پولس کے شُبہ کی بنا پر اتنے دن تک پریشان رہا ۔۔۔

حاکمِ عدالت حکم سُنا کر چیمبر میں چلا گیا، شاکر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں اور وہ گھبرایا اور بوکھلایا ہوا پھٹے پھٹے دیدوں سے سب کو دیکھ رہا تھا، نسیم مرزا اور فیروزہ دونوں خاموش کھڑے تھے، تماشائیوں کی نگاہوں کا مرکز فیروزہ تھی ۔۔۔ مگر ساجد کی آنکھیں زمین میں گڑی جا رہی تھیں، ہوسناک نظارے کی وہ غریب بہت کچھ قیمت دے چکا تھا، اب دوبارہ اس کے دُہرانے کی ہمت نہ تھی، اُس کی آنکھیں فرطِ غیرت سے سدا جھکی ہی رہیں!

# رُوحِ انتخاب

**حدود اللہ کا مقصد** مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت سود کی حرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کرکے چند سرحدی نشانات لگا دیئے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی Personal liberty بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ class war اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلّط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی Family life میں اللہ نے حجاب، شرعی مرد کی قوامیت، شوہر، بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق و طلاق اور خلع کے احکام تعدادِ ازدواج کی شروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کرکے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو مضبوط کرلے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اُٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

میرے لئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کرکے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے، یہاں میں صرف یہ بات آپکے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابلِ تغیر و تبدّل دستور Constitution بنا کر انسان کو دیدیا ہے۔ جو اس کی روح آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک صاف واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے، اسکی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپکو کسی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپنے دیکھا ہوگا کہ پُرپیچ پہاڑی راستوں میں جن کے ایک طرف ایک عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی کاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رَو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں! دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اسکو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رُخ پر نہیں اِس رُخ پر مڑنا چاہیئے، تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حُدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کیں، یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معیّن کرتی ہیں اور ہر پُرپیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اُسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اِس طرف ہے، تجھے اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ٹرکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کیلئے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور پر بنے گا۔ جب تک قرآن اور سنتِ رسول دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جاسکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

مولانا مودودی

# ہماری نظر میں

## عالمگیر اسلامی تصوّرات

"عالمگیر اسلامی تصورات" از :۔۔۔ کانٹ ہنری دی کاستری
کتابت وطباعت دیدہ زیب، مجلد نظر افروز گرد پوش کے ساتھ ضخامت
۲۵۶ صفحے، قیمت تین روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ :۔۔۔ نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱

مغربی مورخین نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف جھوٹ، افترا، غلط بیانیاں اور ناروا تہمتوں کے جو قلعے کھڑے کردیئے ہیں، اُن کو دیکھ کر فرانس کے ایک انصاف پسند عالم کانٹ ہنری دی کاستری نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا کہ آخر یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں! اور اسلام اپنی ذات سے کیا واقع ہوا ہے اور پیغمبر اسلام کی مقدس سیرت کیا ہے؟ واقعات کی اس مطابقت اور حقیقت کی تلاش نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھا دیا۔۔۔۔ یہ کتاب اسی کوشش کا حاصل ہے، جسے احمد فتحی زغلول پاشا نے براہِ راست فرانسیسی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا، اور عربی ترجمہ کو عبدالوہاب ظہوری نے اُردو میں منتقل فرمایا، اردو ترجمہ اتنا اچھا ہے کہ پڑھتے میں یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی غیر زبان کی تصنیف کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں، فاضل مترجم نے زبان کی سادگی، روانی اور نزاکتوں کے ساتھ ادبی خصوصیتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

کتاب کے شروع میں خود احمد فتحی زغلول پاشا نے پُرمغز دیباچہ لکھا ہے، جس میں مسلمانوں کی پستی اور پراگندہ حالی کا کس قدر دردناک مگر واقعی انداز میں ماتم کیا ہے:۔۔۔

"لوگ بدعتوں کے گرویدہ ہوگئے، اور فرائض وواجبات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، قریب ہے کہ قرآن آلاتِ طرب کے ساتھ پڑھا جائے اور نماز شراب خانوں میں ادا کی جائے، علم کا چراغ بجھ گیا، عزائم سست پڑ گئے، اور ہمتیں پست ہوگئیں، اپنی ضروریات کی قلیل مقدار حاصل کرکے ہم کمرِ ہمت توڑ کر بیٹھ گئے، تربیت کی شکل وصورت ہی بدل گئی، اخلاق بگڑ گئے، نفوس میں ہمت اور حوصلہ مندی کی جلا ہی باقی نہ رہی" (صفحہ ۱۸)

فاضل مصنف کی سعی وکاوش قابلِ تحسین وستایش ہے کہ اُس نے اظہارِ حق میں اپنے ہم مذہب لوگوں کی ملامت اور ناخوشی کی پرواہ نہیں کی، جھوٹے اور افترا پرداز بلکہ کمینہ عیسائی تاریخ نگاروں نے دنیا کے سامنے اسلام کی صورت کو بگاڑ کر پیش کیا، اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی پر ایسے رکیک حملے کئے جس کے تصور سے سچائی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مصنف نے جھوٹ کے ان قلعوں کو بڑی چابک دستی سے ڈھا کر حقایق کے سامنے سے اوٹ کو ہٹا دیا، اس مقصد کے لئے اُس نے قرآن، حدیث اور تاریخ سے براہِ راست استفادہ کیا اور پورے علمی وقار کے ساتھ ان مسائل پر گفتگو کی، اس کتاب میں قرآن، حدیث اور تاریخ کے ساتھ علم کلام کے بعض مسائل بھی آگئے ہیں، جن سے صاحبِ تصنیف کی وسعتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے۔

کانٹ ہنری نے بعض مقامات پر محکم اور یقینی چیزوں کو "احتمالات اور امکانات" کے رنگ میں ظاہر کیا ہے، اور

شریعت سے بعض مسائل کی مطابقت میں بھی چوک ہو گئی ہے، مگر ان نقایص کے باوجود یہ تصنیف افادیت سے خالی نہیں اور یورپ والوں کے لئے تو مشعلِ راہ ہے۔

مغربی مورخین نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ اسلام کی اشاعت شمشیر و سنان کی رہینِ منت ہے، مگر لائق مصنف لکھتا ہے:-

" اسلام نے نہ تو شمشیر سے اور نہ زبان ہی سے کسی پر زبردستی کی ہے بلکہ اسلام اختیار اور شوق کے جذبات کے ذریعہ دلوں میں داخل ہوا ہے اور یہ نتیجہ ہے دلوں کی اس تاثیر اور جذب کا جو قرآن میں موجود ہے ۔۔ ۔۔ (صفحہ ۹۴)

مصنف نے قرآن کی آیتوں سے لیکر امیر عبدالقادر الجزائری کے اقوال تک کو استدلال میں پیش کیا ہے، اگر مرتے دم تک مصنفِ کتاب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں اسی قسم کا حسنِ ظن اور عقیدت رکھتا تھا تو پھر "اعراف" تو کہیں نہیں گیا، آگے مالک کی دین ہے۔

## نغمہائے مُبارک

"نغمہائے مُبارک" از:- مولانا ضیاء القادری بدایونی، حجم ۴۸ صفحے، قیمت چھ آنے، ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ ترویج المناقب جٹ لینڈ لائن کراچی ۲۲/۲

جناب مولانا ضیاء القادری بدایونی کو اللہ تعالیٰ نے حمد و نعت اور مناقب و محامد لکھنے کی سعادت عطا فرمائی ہے موصوف کی زندگی کا بڑا حصہ حضور سرورِ کائنات (فداہ ابی و امی) کی نعت گوئی اور مدح خوانی ہی میں صرف ہو گیا، اور اب بھی ان کے لبوں سے صلوٰۃ و سلام کے نغمے بلند ہوتے رہتے ہیں۔

جناب ضیاء القادری کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے والہانہ عقیدت ہے، نعتیہ اشعار اس قدر جذب و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسے صاحبِ گنبدِ خضریٰ کے حضور اپنا دل کھول کر رکھ رہے ہیں اسی خلوص اور محبت نے انکی شاعری میں تاثیر پیدا کر دی ہے اور صحافت انھیں "لسان الحسان" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

یہ کتابچہ نعت و مناقب اور ان سلاموں کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض خود حضور ختمی مرتبتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں گزرانے جا چکے ہیں، ان نظموں اور سلاموں میں نغمگی پائی جاتی ہے اور ایک ایک مصرعہ میں شاعر کا سوزِ دل شریک ہے۔ بعض سلام گانے کی مروجہ دُھنوں پر کہے گئے ہیں۔

ایک بات کھٹکتی ہے جس کا اظہار بہت ضروری ہے —— وہ یہ کہ نظموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب و استعانت اور استمداد و استغاثہ کا جہاں رنگ آگیا ہے وہ درست نہیں، خدا کے بعد تمام ستایش اور عزتیں حضورؐ کو سزاوار، اور آپ کی محبت جزوِ ایمان نہیں بلکہ عینِ ایمان —— لیکن مانگنا اللہ ہی سے چاہیئے، کتاب و سنت کا یہی منشاء ہے اور تمام نبیوں، رسولوں اور نیک لوگوں نے مصیبت کے وقت خدا ہی کو پکارا ہے، توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور تمام معتقدات اسی کے اردگرد گھومتے ہیں! جذب و محبت کے عالم میں بھی یہ سررشتہ ہاتھ سے چھٹنا نہ چاہیئے۔

## تعارف پاکستان

"تعارف پاکستان" مُرتبہ:- محمد عبدالخالق، لکھائی چھپائی بہت اچھی، سرورق دیدہ زیب، ضخامت ۳۷۰ صفحے، تصویریں ۳۶ اور تین نقشے، ناشرین "عابدین اینڈ سنس"، قیمت مجلد چرمی دس روپیہ، قیمت مجلد چھ روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- طارق پریس فریر روڈ کراچی ۳

کراچی میں بین الاسلامی اقتصادی کانفرنس نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئی تھی، اُس کا سب سے بڑا فائدہ

یہ ہوا کہ اس کانفرنس کی بدولت بہت سا معلوماتی لٹریچر وجود میں آگیا، یہ کتاب بھی اسی کانفرنس کی طرف سے مرتب ہوکر منظرِ عام پر آئی ہے۔

اصل کتاب کی زبان انگریزی ہے، جس میں پاکستان سے متعلق مختلف اہلِ قلم اور ماہرین نے معلومات آفریں مضامین لکھے ہیں اور "عابدین اینڈ سنس" نے مختلف مترجمین سے ان مضامین کا اُردو ترجمہ کرا کے شایع کیا ہے، ترجمہ کرنے والے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے علمی نسبت رکھتے ہیں، اور یہ اُس گل کدہ کے شگفتہ پھول ہیں جسے انقلاب کے بے رحم ہاتھوں نے اُجاڑ دیا۔

اس کتاب میں پاکستان کی مشہور شخصیتوں کی مختصر سوانح حیات کے علاوہ اس مقدّس مملکت کی دفاعی افواج، اُمورِ خارجہ، معاشیات، معدنی وسائل، صنعت و حرفت، زراعت، جنگلات، تعلیمات اور دوسرے کارآمد اور ضروری موضوعات پر مضامین درج ہیں، انگریز کے زمانہ میں حاکم اور رعیت دو الگ الگ وجود تھے مگر پاکستان نے اسلام کے نام پر اس دوعملی کا خاتمہ کردیا، اب ہم میں کا ہر شخص پاکستان کی ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہے اور یہ ذمہ داریاں اور فرایض اُسی وقت ٹھیک طور پر پُورے ہو سکتے ہیں کہ ہم پاکستان کے حالات سے باخبر رہیں۔

کتاب کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت نے ہر شعبہ کو ترقی دینے کے لئے مفید تجویزیں مرتب کرلی ہیں، جن میں سے بعض پر کام بھی شروع ہوگیا ہے، اور پاکستان کا صنعتی، زراعتی اور تجارتی مستقبل بہت شاندار ہے، ہمیں اسلامی اصولوں پر پاکستان کو ایک مثالی حکومت بناکر دکھانا ہے کہ ساری دُنیا کے لئے یہ مشعلِ راہ ثابت ہو، پاکستان کے ہر شعبہ اور ہر مسئلہ پر اس تصوّر کے تحت غور کرنا چاہیئے کہ یہ اسلامی حکومت ہے اور اللہ تعالیٰ یہاں کا حقیقی حاکم ہے، پھر انشاءاللہ سارے کام سُدھر جائیں گے اور اس کے دشمنوں اور بُرا چاہنے والوں کو ایسی ذلت نصیب ہوگی کہ آنے والی نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں گی۔

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ جہاں تک غذا کا تعلق ہے پاکستان خود مکتفی ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہے کھانے کی چیزوں میں تقریباً دو لاکھ ٹن شکر کی کمی آکر پڑتی ہے، آہستہ آہستہ یہ کمی بھی دُور ہوجائے گی۔

مضامین قریب قریب سب کام کے ہیں مگر ڈاکٹر انور اقبال قریشی کا مضمون مفید تر ہے، مترجمین نے ترجمہ بھی روانی کے ساتھ کیا ہے، خاص طور سے یحییٰ صدیقی صاحب کے تراجم میں زبان و ادب کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں — بعض باتیں محلِ نظر بھی ہیں:۔

گیلن کو "گیالن" اور قبیلہ محسُود کو "محصود" لکھا ہے ——— صفحہ (۱۹) پر ایک جُملہ ہے:۔

"یہ قائدِ اعظم ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو سیاست کی سُستی اور لفاظی اور منافقی سے نجات دلایا" جہاں جہاں ترجمہ میں یہ رنگ پیدا ہو گیا ہے طبیعت اُلجھتی ہے .. .. .. صفحہ (۲۶) پر:۔

"وہ (قائدِ اعظم) اُنھیں (قابینوں کو) اس وقت سے جمع کررہے ہیں جبکہ اُن کی مالی حالت ابھی سنبھلی ہی نہ تھی، لیکن اس کے باوجود اُنہیں ان سے کوئی وارفتگی نہیں ہے ——— "وارفتگی" یہاں بالکل غلط اور بے جوڑ ترجمہ ہے، "شیفتگی یا دلچسپی لکھنا چاہیئے تھا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے یہاں اس قسم کی فروگذاشتیں دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی، شاید اس کا سبب ڈاکٹر صاحب موصوف کی مصروفیات اور عُجلت کا رہو ——— صفحہ (۲۳) پر قائدِ اعظم مرحوم کے بارے میں ایک

عجیب بات لکھی ہے :— " اُن کی مُسکراہٹ دل کو موہ لیتی تھی، چاروں اَبرُو صفا، اُن کا چہرہ اعتماد کی شعاعیں ساتا تھا" چار اَبرو کا صفایا تو اُس حالت کو کہتے ہیں کہ کسی کی ڈاڑھی مونچھ کے ساتھ ساتھ اُس کی بھویں بھی مُنڈی ہوئی ہوں، اور یہاں یہ صورت کہاں تھی!

سر ظفر اللہ خاں (صفحہ ٦٦) کے متعلق لکھا ہے " عقائد کے لحاظ سے وہ کٹر مسلمان ہیں" حالانکہ عقاید کے اعتبار سے وہ "قادیانی" ہیں — آنریبل غلام محمد وزیر خزانہ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے :— آپ سگریٹ پیتے ہیں نہ شراب، پارٹیوں سے آپ کو اُلجھن ہوتی ہے" (صفحہ ٧٩) یہ تو ایک طرح کی ہجو ملیح ہوئی!

" خراجِ عقیدت" (خواتین کی خدمت میں) جس مضمون کا عنوان ہے اُس میں گُلِ رعنا کلب کراچی کی سماجی سرگرمیوں اور مینا بازار کی کامیابی کو سراہا گیا ہے — حالانکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مسلمان عورتوں کا کھلے منہ بازاروں میں وردی پہن کر مارچ کرنا، ڈرامے کھیلنا، رقص کرنا اور مینا بازار لگانا انتہا درجہ معیوب ہے، ایسی باتیں پاکستان کے دامنِ تقدیس پر بدنما داغ ہیں جن کو جلد سے جلد دھو دینا چاہیئے، ہماری عورتوں کو کسی "مس" "مسز" "بیگم صاحبہ" اور "لیڈی صاحبہ" کی تقلید کی ضرورت نہیں، اُن کے سامنے تو وہ راستہ ہے جس میں ہاجرہ، مریم، خدیجہ، عائشہ، اسماء، فاطمہ اور رابعہ بصری کے نقشِ پا نظر آتے ہیں۔

" تعارفِ پاکستان" کی مجموعی طور پر افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ بہت کام کی چیز ہے، رنگین ناولوں اور افسانوں کے شیدائیوں میں اس قسم کا ذوق پیدا کرنا چاہیئے کہ فنی، اقتصادی اور علمی موضوعات کی خشکی کو نہ صرف وہ گوارا کریں بلکہ اُس میں دلچسپی لیں — " عابدین اینڈ سنز" سے ہم اچھی کتابوں کی اشاعت کی اُمید رکھتے ہیں۔

## بیکراں

" بیکراں" از :— جگن ناتھ آزاد، خوبصورت کتابت وطباعت مجلد دیدہ زیب گردپوش کے ساتھ، حجم ١٦٠ صفحات، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ :— مکتبہ قصرِ اُردو، اُردو بازار دہلی۔

اُردو زبان کے پختہ کار شاعر جناب تلوک چند محرومؔ کے لائق فرزند جگن ناتھ صاحب آزادؔ کے کلام کا مجموعہ " مکتبہ قصرِ اُردو، دہلی" نے خاصے اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے، جس کا پیش لفظ جناب فراقؔ گورکھپوری نے تحریر فرمایا ہے، فراقؔ صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے نثر نگار ہیں اُن کے تنقیدی مضامین میں فکر کی گہرائی کے ساتھ دلکشی اور رچاؤ بھی ہوتا ہے، مگر اس " پیش لفظ" میں اُن کی نثر کی خصوصیات نہیں ملتیں شروع کی سطریں ہیں :—

" سچے معنوں میں بہ حیثیت شاعر مشہور ہونا ہر دور میں ایک مشکل امر رہا ہے، فصیح اور بے عیب کہنے والوں کی اکثریت بھی مشہور نہ ہو سکی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ شروع میں تو نام اُچھلا اور نگاہیں اُٹھیں لیکن شہرت دیرپا ثابت ہوئی" .... فراقؔ کی نثر کا یہ انداز ہی نہیں ہے، اس میں بے دلی حرف حرف سے جھلکتی ہے۔

جگن ناتھ آزادؔ کی شاعری میں جو خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ " شدتِ احساس" ہے، جناب آزادؔ رسم و تکلف سے بلند ہو کر اپنے محسوسات اور قلبی واردات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، ان شعروں کے تیور ذرا دیکھئے :—

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جُڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گزری

نظر تو محوِ غمِ جستجو تھی اے آزادؔ
یہ اُس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گزری

اے سرِ سرا فراختہ، ہاں پردۂ شہناز
اے مطرب نو خاستہ اک، لحنِ یگانہ

عشرت کدۂ جادوئے بابل ہیں لبِ لعل
آنکھیں ہیں کہ حیرت کدۂ سحرِ فسانہ

خرد کا سفینہ جنوں کے ہیں دھارے
کبھی اِس کنارے، کبھی اُس کنارے

تری جستجو میں مری آرزو نے
بہت رنگ بدلے، بہت رُوپ دھارے

عقل کی انتہا ہے کیا، عقل فقط گرہ کُشا
عقل گرہ کُشا بھی ہے اور گرہ پسند بھی

بہار آئی ہے اور میری نگاہیں کانپ اُٹھی ہیں
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

"سرِ محبت"، جگن ناتھ آزاد کی معرکہ آرا نظم ہے، جس میں تخلیقِ کائنات اور ظہورِ انسانیت سے پہلے کا عالم دکھایا ہے، ابھی "کُن" کا اشارہ ہی نہیں ہوا، اس لئے گرمی، سردی، برسات، شام و سحر، چاند ستارے — کہاں سے ہوتے! پوری نظم کا ایک ہی انداز ہے اور کوئی شعر کمزور اور پست ہونے نہیں پایا۔

"آزادی کے بعد" — نظم نہیں، مرثیہ ہے، اس میں شاعر کا خونِ دل شامل ہے :—

گرد دامن سے غلامی کے چھڑانے والے
تیرے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے

جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے

آج بھی روح میں ہے درد کی دُنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینہ میں نہاں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سُو نگراں آج بھی ہے

سوبھاش چندر بوس نے بہادر شاہ ظفر کی قبر پر پہونچ کر جو خطاب کیا ہے، وہ دل ہلا دینے والا ہے، شاعر نے اس نظم میں اپنے قلبِ تپش اندوز کی تمام دھڑکنیں بند کر دی ہیں :—

السّلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار
اے شہنشاہِ دیارِ دل ! فقیرِ بے دیار

آج پہلی بار تیری قبر پر آیا ہوں میں
بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں

سُرمۂ چشمِ بصیرت اے ترے مرقد کی دُھول
اک فقیرِ بے نوا کا ہدیۂ دل ہو قبول

میں بھی ہوں اپنے وطن سے دُور تو بھی دُور ہے
ہاں ! رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے

میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے

علامہ اقبالؔ سے جگن ناتھ آزادؔ کو کتنی خلوص آمیز عقیدت ہے :—

آتش کا سوز، گل کی مہک، برق کی تڑپ
سو جاں سے ہوگئے تری تخئیل کے نثار

تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا
تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی
شہرت پہ تیری تنگ تھا دامانِ روزگار

"تقسیم" کے بعد برِصغیر ہند میں جو کچھ ہوا، وہ انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ خونیں اور سیاہ ورق ہے، جگن ناتھ آزاد کے دل نے ان حادثات کا بہت اثر قبول کیا ہے، اور اُن کی نظموں میں جگہ جگہ اس کے نشان ملتے ہیں، آزاد نے غزلوں تک میں اپنے بے وطن ہو جانے کا ماتم کیا ہے :—

میں کاش تم کو بھی اہلِ وطن بتا سکتا — وطن سے دُور کسی بے وطن پہ کیا گزری
وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر — نہ پوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گزری

اس شعر میں فرزندانِ اسلام کی جُدائی کے غم کو کس قدر اثر انگیز انداز میں ظاہر کیا ہے :—

جُدا جب اُس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم — نہ پوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گزری

صفحہ (۲۴) پر ؎ زمین گنگنائے گی حسین گُل کھلائے گی —— اس میں "زمین کا گنگنانا" کھٹکتا ہے ——
صفحہ (۹۲) پر ؎ اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے —— میں "دوا دارو" جو واحد ہے اُسے جمع باندھا گیا ہے —— صفحہ (۱۶۰) پر غزل کا مطلع ہے :—

تجھ کو نہ سمجھ آئے گی اب میری کہانی — ہر لفظ نے تبدیل کئے اپنے معانی

پہلا مصرعہ زبان کے اعتبار سے غلط ہے، شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "میری کہانی اب تیری سمجھ میں نہ آئے گی" بہت ممکن ہے، کہ کسی خطہ میں اس طرح بولا جاتا ہو، مگر یہ "اُردو" نہیں ہے؟ —— ایک نظم کا عنوان "پھلواری" ہے اُس میں "پھلواری" کو "پھلواڑی" لکھا ہے، جو سماعت پر بہت گراں گزرتا ہے!

جگن ناتھ آزاد اس اعتبار سے اور زیادہ مستحقِ تبریک اور لائقِ تحسین ہیں کہ "نام نہاد ترقی پسندی" کے بگولوں سے وہ دامن بچا کر گزر گئے ہیں، اُن کے خیال اور اظہار میں ربط اور سُلجھاؤ پایا جاتا ہے، اُن کی محبت، بھی مقدس ہے اِن "فرائڈ زدوں" کی طرح آوارہ اور بے باک نہیں ہے —— یقین ہے کہ "بیکراں" کو اُردو دُنیا میں پسند کیا جائے گا —— ! ہائے ! "سخت جان اُردو —" زندہ باد !

## کلیل میں غلیل

"کلیل میں غلیل" از :- مولانا ناطق گلاؤٹھوی، حجم ۶۲ صفحے، قیمت بارہ آنہ، ملنے کا پتہ :- کوثر بک ڈپو میناچی کوئل اسٹریٹ، بنگلور،

کئی سال کی بات ہے، جناب شبلی بی، کام نے ہفتہ وار "خیام" (لاہور) میں اس بحث کو چھیڑا تھا کہ مولانا حالی کے اس مقطع میں :—

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں — بس اتباعِ مصحفی و میر کر چکے

"مغربی" سے کیا مُراد ہے؟ اس بحث میں اُردو زبان کے بہت سے نامور اہلِ قلم اور مشہور شاعروں نے حصّہ لیا، اس سلسلہ میں عام طور پر دو طرح کی رائیں وصول ہوئیں، بعض نے کہا کہ "پیروی مغربی" سے حالی کی مُراد مغرب (یورپ) کی پیروی ہے، اور بعض نے اس خیال کا اظہار کیا کہ مولانا حالی نے فارسی زبان کے مغربی شاعر کا یہاں ذکر کیا ہے، پیروی مغربی سے مغربی شاعر کی تقلید مُراد ہے —— یہ بحث "خیام" میں بہت دن تک چلتی رہی، نوک، جھونک، طعن وطنز اور گرم بیانی کے ساتھ بہت سی کام کی باتیں بھی درمیان میں آگئیں بات ذراسی تھی مگر بحث و مباحثہ نے اسے بہت کچھ طول دیدیا۔
"مرشدِ خمخانہ سخن" مولانا ناطق گلاؤٹھوی نے بھی شبلی صاحب (سابق ایڈیٹر خیام) کے استفسار کے جواب میں

ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا تھا، جسے کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے، اس کتابچہ (کلیل میں غلیل) کا نام خود ہی زبان سے بول رہا ہے کہ: "میں کیا ہوں اور مجھ میں کیا ہونا چاہیئے۔۔۔۔۔" ؟

کتاب پر "تعارف" جناب ابو صالح محمد غضنفر حسین صاحب شاکر ناطقی پرنسپل جامعہ دارالسلام عمرآباد (شمالی ارکاٹ مدراس) نے لکھا ہے جو شروع سے آخر تک نہایت غیر ذمہ دارانہ طنز سے لبریز ہے، حضرت سیماب اکبرآبادی کو "اگر دال" لکھا ہے، اس دشنام آمیز طنز کے بعد ارشاد ہوتا ہے :—

"حضرت مولانا ناطق کا فیصلہ ہے کہ انھوں (سیماب صاحب) نے ساری عمر میں کوئی بے عیب شعر کہا ہو۔۔۔۔"

اس کے بعد ———— "میں آخر میں اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اہلِ کمال علامہ اقبال ہوں یا مولانا حالی یا مرزا غالب کسی کی شاعری سے پروپیگنڈا کرنے والوں کی تحریریں پڑھ کر مرعوب نہیں ہوتے" (صفحہ ۷) گویا شاکر صاحب کی نگاہ میں غالب، حالی، اقبال کی شخصیتیں لوگوں کے پروپیگنڈے کی محتاج ہیں۔ ۔ ۔ ذرّے ستاروں کا مذاق اڑانے لگیں تو اُن کی زبان پکڑی جانے سے رہی ———— اور خود "تعارف نگار" کی زبان دانی اور انشاپردازی کا یہ عالم ہے کہ "بوکھلاہٹ" کو "بکھلاہٹ" اور بات کے "بتنگڑ" کو "بات کا بتکڑا" لکھا ہے ———— اس تحریر کے بس دو تین جملے :—

"مغرب مکانی انگریز کے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے انتقال کر جانے سے پہلے مدعیان ادب اردو میں ذہنی بکھلاہٹ کا کہیئے یا دماغی کلیلوں کا زور آیا ہوا تھا، جس کی بے ہنگام ہنگامہ آرائی نے ادب جدید یا بقول یگانہ چنگیزی ادب خبیث نے جنم لیا اور اس مولودِ نامسعود کی تربیت میں نا اہل نے اہلِ کمال کی گرفت سے گردن چھڑانے کے لئے کیا کیا راستے نکالے ہیں۔۔" (صفحہ ۳)

ماشاءاللہ! طنز کا دروبست کتنا سادہ دپرکار ہے کہ "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر سجاد حسین مرحوم قبر میں اٹھ اٹھ بیٹھے ہوں گے!

حالی کے اس شعر کے بارے میں مولانا ناطق کی یہ رائے ہے کہ حالی نے "پیرویٔ مغربی" سے مغرب (یورپ) کی پیروی مُراد لی ہے اور جن لوگوں نے "مغربی" کو فارسی شاعر مغربی سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں۔۔ ۔ ۔ یہ رائے علمی انداز میں بھی ظاہر کی جا سکتی تھی مگر حضرت ناطق نے اپنے مکتوب میں جو طرز اختیار کیا ہے وہ اُن کے شایانِ شان نہیں ہے اور اس کتابچہ کو پڑھ کر موصوف کے متعلق اہلِ ذوق بُری رائے قایم کریں گے۔۔ ۔۔ ۔۔ یہ جملہ :—

"ان کے کلمہ گو اور جاہل تجارتی مُدیران کے حامی جن کے لئے یہی بات قابلِ ناز ہے کہ فلاں فلاں پروفیسر صاحب کے مضامین رسالے میں آتے ہیں، انھیں اس کی کیوں پروا ہو کہ ان فُلانوں میں کیا رکھا ہے۔۔ ۔۔"

اگر غیر شعوری طور پر تحریر میں "ذم" آگیا ہے تو بھی بد مذاقی اور تہذیب و ادب سے غفلت کی دلیل ہے، اور اگر "دانستہ" یہ طنز کی گئی ہے تو اس طرح سرِ بازار شعر و ادب کو بے آبرو کیا گیا ہے، یہ تنقید کا ہیکو ہے "مادر، چادر" والی بات ہے۔۔۔۔۔۔۔

جناب ناطق نے اپنی تنقید میں بڑے بڑوں پر طنز و استہزا کی چھینٹیں اڑائی ہیں، ثاقب کانپوری بے چارے تو خیر "چھٹ بھیاؤں" میں سے ہیں، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مانک پوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، امیر مینائی، حالی اور غالب تک پر پھبتیاں کہی ہیں، دنیا میں بھول چوک کس سے نہیں ہوتی لیکن یہ شخصیتیں ایسی نہیں ہیں کہ اُن کا مذاق اُڑایا جائے، حضرت امیر مینائی "زبان" جن کے گھر کی کنیز تھی، اُن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے"

"میں نے اپنی تصنیف "شہابِ ثاقب" میں امیر مینائی کو اہلِ زبان ماننے سے انکار کیا ہے" اگر امیر مینائی اہلِ زبان نہیں تھے، تو پھر کوئی "اہلِ زبان" آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

حاؔلی اور امیر مینائی کی زبان دانی پر جو شخص حرف گیری کرتا ہو، خود اُس کی زبان اور روزمرّہ کا یہ حال ہے:۔

(صفحہ ۱۴) "اور جوابًا اوٹ پٹانگ بھی ہندی نوازی میں ہانک دی" ـــــــ "گپ ہانکنا" روزمرہ ہے، اوٹ پٹانگ کے ساتھ "بکنا" بولتے ہیں اور اس جملہ کی ترکیب کے اعتبار سے حرف جار "میں" وجدان پر بہت ناگوار گزرتا ہے، ـــــ (صفحہ ۱۵) "چونکہ اُردو شاعری ہنوز کنگھی چوٹی میں گتھی ہوئی ہے" ـــــــ "اُلجھی ہوئی" کہنا چاہیئے تھا، اسی صفحہ پر ـــ "بے پروا" کو "لاپروا" لکھا ہے ـــــــ (صفحہ ۱۸) "اس لئے شوقِ خود فروشی اُردو ادب میں ڈھکیل دیتا ہے......" "اُردو ادب میں ڈھکیلنا" یہ جملہ پہلی بار سُننے میں آیا اور سامعہ پر چوٹ لگی ـــــــ (صفحہ ۲۲) "اور زبان کو نیم تیتر نیم بٹیر بنانے پر راضی ہو گیا" "آدھا تیتر آدھی بٹیر" بولتے ہیں اور ضرب الامثال میں لفظوں کی تبدیلی جائز نہیں...... مثلاً "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے" اگر "چھاچھ" کی جگہ "مٹھا" یا "لسی" بولیں تو مفہوم صحیح ہے مگر روزمرہ کے اعتبار سے یہ تبدیلی ناروا ہے ـــــــ (صفحہ ۲۱) "جو فرنگی کے چٹے بٹے ہیں" "چٹے بٹے" تنہا نہیں بولا جاتا "تھیلی" کا آنا ضروری ہے ـــــــ (صفحہ ۳۰) "مولانا حاؔلی اور بجنوری صاحبان نے کچھ اپنا زورِ علم نہیں بتایا" ـــــــ "زورِ علم دکھاتا" کہنا چاہیئے تھا "زور بتانا" سی۔پی اور دکن میں بولا جاتا ہے جو اہلِ زبان کے یہاں مستند اور لائق قبول نہیں ـــــ (صفحہ ۴۹) "اوٹ پٹانگ بک کر اشاعتی نام پیدا کریں" "اشاعتی نام" آخر کیا بات ہوئی! شاید کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اخباری شہرت حاصل کریں ـــــــ (صفحہ ۵۷) "ایک ہی ساتھ بحث کرنے کی عادت آجائے" "عادت آنا" آج تک نہ کسی سے سُنا اور نہ کسی کتاب میں پڑھا، عادت پڑ جائے یا عادت ہو جائے" کہنا چاہیئے تھا ـــــــ زبان و بیان کی ایسی بہت سی غلطیاں اس کتابچہ میں پائی جاتی ہیں۔

مولانا ناطق گلاؤٹھوی ہمارے محترم بزرگ ہیں، اُن کے قلم سے اس قسم کی تحریر دیکھ کر ہمیں دُکھ ہوا اور اُن کے شاگرد جناب شاکر نائٹی نے اپنے اُستاد کے اس مضمون کو چھاپ کر اُستاد کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔

## ناموسِ ملّت

"ناموسِ ملت" معروف بہ "پردہ اور اسلام" مصنفہ:۔ منشی خادم علی خاں اخضر بی اے ایل ایل بی پلیڈر ـــ ضخامت ۳۶ صفحے، قیمت ۶/ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ مستقبل بٹی شیر خاں ۲۳۲/ع ملتان شہر۔

یہ ایک مفید اور کار آمد رسالہ ہے جو پردے کی حمایت میں لکھا گیا ہے، خطیبِ ملت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت کے لائق فرزند مولانا سید ابو ذر بخاری نے ـــــــ جو "الولد سر لابیہ" کے مصداق ہیں، اس کتابچہ کو شائع فرمایا ہے، مصنف کو اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے کہ اُس نے دورِ حاضر کی بہت بڑی بے راہ روی پر احتساب کیا ہے اور دانش و دین کے ذریعہ بے پردگی کی بُرائیاں ظاہر کی ہیں۔

اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر پاکستان) امیر جماعت اسلامی کی کتاب "پردہ اور اسلام" اتنی جامع اور مانع تصنیف ہے کہ اُردو تو اُردو عربی میں بھی اس پایہ کی کتاب آج تک کسی نے نہیں لکھی، اس کتاب سے اگر استفادہ کر لیا جاتا تو مصنف کے استدلال میں اور زیادہ قوت آجاتی۔

پاکستان میں بے پردگی، بے حجابی اور بے حیائی بہت بڑھتی جارہی ہے، شاید ہر طلوع ہونے والی صبح چند نقاب آلود چہروں کو بے نقاب کر دیتی ہے، یہ بُرائی اب صرف زبان اور قلم سے نہ رُکے گی اس کے لئے طاقت استعمال

کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارا تمام معاشرتی اور عائلی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور یورپ کی طرح ہماری محفلیں بھی کتوں، بندروں اور سوروں کی تفریح گاہیں بن کر رہ جائیں گی ——

**زندگی** | ماہنامہ "زندگی" ترتیب دینے والے :- سید حامد علی۔ زر چندہ سالانہ پانچ روپیہ، ششماہی دو روپے آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ —— دفتر رسالہ "زندگی" رام پور (یو۔ پی)

بھارت اور پاکستان میں جو رسالے اسلام کی صحیح طور پر خدمت ہی انجام نہیں دے رہے بلکہ نمایندگی کر رہے ہیں ماہنامہ "زندگی" بھی انھیں میں سے ہے، اسلامی ادب کا یہ مجلہ سچائی کا بے باک نقیب اور دینِ حق کا آزاد ترجمان ہے، اس کا شاید ایک لفظ بھی "ادب برائے ادب" کے چٹخاروں کا حامل نہیں ہوتا "ادب برائے اسلام" اس کا مطمحِ نظر ہے، اور اس کا ہر صفحہ اسی خدمت کے لئے وقف ہے —— یقین آفریں مقالے، پاکیزہ افسانے، صاف ستھری نظمیں! پرچہ کے مدیر جناب سید حامد علی صاحب کی اپنی تحریروں میں فکر اور سلجھاؤ کے ساتھ شگفتگی پائی جاتی ہے، "دعوت القرآن" کے تحت سید حامد علی صاحب قرآنی آیات کی جو تشریح کرتے ہیں، وہ پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

ماہنامہ "زندگی" ان تمام "رسالوں" کو جو جاہلانہ اور غیر اسلامی لٹریچر کی یادگار ہیں، آئینہ دکھاتا ہے کہ ادب و انشاء کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ "حق" اس طرح پیش کیا جاتا ہے، غلط خیال ہے کہ "حق" خشک اور بے مزہ ہے، ہاں! ہاں! اُس میں لذت اور شگفتگی ہے مگر معصیت اور گندگی نہیں ہے، اسلامی ادب صرف اُن لوگوں کے لئے خشک اور بے مزہ ہے جو معصیتوں میں ڈوب کر رہ گئے ہیں، مگر جو یقین و ایمان رکھتے ہیں اور اگر نیک نہیں ہیں تو نیک بننا چاہتے ہیں، ان کے لئے اسلامی ادب کا ہر لفظ قند و نبات ہے۔

نظم کا معیار ذرا اور بلند ہو سکے تو معیار کے اعتبار سے نظم و نثر میں یکسانی پیدا ہو جائے، یوں اب بھی اُس کی نظمیں بہت خوب ہوتی ہیں، سید حامد علی جیسے اہلِ قلم درحقیقت بُت کدے میں اذان دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی نصرت اور دستگیری فرمائے!

**انسانیت نمبر** | "انسانیت نمبر" ہفتہ وار شاعر آگرہ۔ مرتبہ :- منتظر صدیقی اکبر آبادی۔ جہازی سائز ضخامت ۱۲۲ صفحے، متعدد تصویریں اس خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ، سالانہ چندہ آٹھ روپے، ششماہی چار روپے، ملنے کا پتہ :- مرکزِ اشاعت آگرہ۔

مشہور صحافی جناب منتظر صدیقی اکبر آبادی نے اپنے ذاتی اخبار "ایشیا" کا "انسانیت نمبر" نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اُردو کے مشاہیر شاعروں اور ادیبوں کے مضامین اور افکار کا ایک تو فراہم کرنا ہی "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں، پھر اُن کو سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ جمع کر دینا اور زیادہ لائقِ تحسین ہے، لکھنے والوں میں ہندو مسلمان، مشہور اور کم مشہور، چھوٹے بڑے سب ہی شریک ہیں، ہر لکھنے والے کا دل داغدار نظر آتا ہے، اور سب نے یہ چاہا ہے کہ :-

خارِ حسرت بیان سے نکلے دل کا کانٹا زبان سے نکلے

یہ فرنگیوں کا نہیں بھارت کے سپوتوں کا "راشٹریہ راگ" ہے، اچنبھے کی بات ہے کہ جس دیس میں کرشن مہاراج نے پریم اور گیان کی بنسی بجائی تھی وہاں آج اربابِ فکر انسانیت کی دہائی دے رہے ہیں!

صفحہ (۱۷) "دینِ انسانیت" کے عنوان سے جوش ملیح آبادی کی نظم ہے جس کا ابتدائی حصہ بہت پُرجوش ہے، اور انسان کی عظمت کے مختلف پہلو شاعر نے دلکش انداز میں پیش کئے ہیں —— مگر آخر میں شاعر آسمان پر پہونچکر دھڑام سے فرشِ خاک پر گر پڑا ہے——

زمیں آدمی، آسماں آدمی　　　الٰہ زماں و مکاں آدمی

جب تک آدمی اپنے کو "الٰہ" سمجھتا رہے گا، انسانیت اسی طرح پامال اور مجروح رہے گی، اور یہ کروروں "الٰہ" اپنی اپنی خدائی برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں گے، ان "الٰہوں" ہی نے دنیا میں فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے! انسان "الٰہ" نہیں بلکہ "نائب الٰہ" اور خلیفۃ اللہ" ہے اور یہی شرف اُس کے لئے سزاوار ہے؟ ٹیپ کا بند ہے:—

نہ انساں بنو گے تو گل جاؤ گے
خود اپنے جہنم میں جل جاؤ گے

یہاں "گل جاؤ گے" بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، ٹیپ کے آخری مصرعہ کے قافیہ کے لئے یہ چیز گوارا کی گئی، کوشش کی جاتی تو موزوں قافیہ مل سکتا تھا، جوش صاحب کے یہاں اس طرح کے اسقام پائے جاتے ہیں۔

جناب مولانا سیماب نے شاعر کی تعریف میں بیحد مبالغہ کیا ہے اور آخر میں یہاں تک لکھ دیا: "اسلامی نقطۂ نگاہ سے اب دنیا میں کوئی پیغمبر مبعوث نہ ہوگا، یہ منصبِ بزرگ اب شاعر کے لئے مخصوص ہے جس کی معنوی پیغمبری صدیوں سے تسلیم کی جارہی ہے، وہ حقیقتاً پیغمبر بن کر دنیا پر ظاہر ہوگا" یہ بھی ایک شاعرانہ قسم کی غیر ذمہ دارانہ بات ہے — پیغمبر کی نیابت کے لئے فکرِ بصیرت کے ساتھ "پاکیزگی کردار" کی بھی ضرورت ہے، اور وہ بے چارے شاعر میں کہاں! اسی لئے شاعر کی اتباع کرنے والوں کو "غاوون" کہا گیا ہے —

جناب شفیق جونپوری کی نظم نہایت پاکیزہ اور اونچے درجہ کی ہے، اسی طرح بعض دوسرے مضامین اور نظمیں بھی تحسین کی مستحق ہیں، حضرت منظر کی یہ کوشش سراہے جانے کے قابل ہے۔

ماہنامہ

# فاران

ماہر القادری

جلد (۲) ——— شمارہ (۲)
ماہنامہ

# فاران

مدیر
ماہر القادری

مئی سنہ ۱۹۵۰ء

سالانہ چندہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ آٹھ آنہ
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ گیارہ آنہ

مقامِ اشاعت

فاران کیمبل اسٹریٹ
کراچی ۲

## نظم و ترتیب



### حصہ نظم

# بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# نقشِ اوّل!

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا دونوں طرح سے امتحان لیتا ہے، خطروں اور پریشانیوں میں ڈال کر اور اطمینان و مسرت سے نواز کر! انسانی زندگی کا ایک لمحہ بھی آزمایش سے خالی نہیں! مسرتوں کا جھُرمٹ ہو تو بھی آزمایش اور مصائب کا ہجوم ہو تو بھی امتحان! بدوِ شعور سے لیکر دمِ واپسیں تک آزمایشوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہ دنیائے اسباب، جہانِ آب و گل اور عالمِ حوادث "امتحان گاہ" ہی تو ہے، جو کوئی اس امتحان میں پورا اُترا اُسے دُنیا اور آخرت کی سربلندیاں نصیب ہوئیں ——— اور سب سے بڑی سربلندی اور کامیابی خود خالقِ ارض و سمٰوٰت کی خوشنودی اور رضا ہے، جسے یہ دولت حاصل ہو گئی اس کی فیروزمندی کا کیا پوچھنا! آسمانوں سے اُس کیلئے سلام آتے ہیں اور زمین اُس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا آخری صحیفہ قرآنِ مقدس ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر انعام و اکرام کی بارش کی اور دُنیا کی بہترین نعمتوں سے ان کو نوازا ——— یہ اُن کی آزمایش تھی مگر وہ اس آزمایش میں پُورے نہ اُترے، کامیابیوں کے نشہ نے انھیں چور کر دیا، وہ مغرور اور سرکش ہو گئے، شکر کی جگہ کفرانِ نعمت کرنے لگے، مسرتوں کی اس آزمایش کو عیش۔ دام اور لذت جاودانی سمجھ بیٹھے، گویا کہ انھیں دنیا میں خوشیاں منانے اور عیش کرنے کیلئے ہی بھیجا گیا ہے، اُن کی تخلیق کی غایت اور ان کی پیدایش کا مقصد صرف یہی ہے کہ عیش و تفریح کے جھُولوں میں سدا جھوتے رہیں، ہوس کاریوں نے اللہ کی یاد سے انھیں غافل کر دیا، وہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرنے لگے جیسے انھیں سدا اسی جگہ رہنا ہے اور ان کے کسی قول و فعل پر کوئی باز پرس نہ ہو گی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی حدود کو جب اُنھوں نے توڑا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ بندوں کے حقوق بھی اُن کے ہاتھوں محفوظ نہ رہے، برائی کسی خاص فرد تک محدود نہ تھی، پُوری قوم بدکاریوں اور نافرمانیوں میں مبتلا تھی، بادشاہوں کے محلوں اور امیروں کے شبستانوں سے لیکر صومعوں اور خانقاہوں تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا تھا، علماء جن سے احتساب اور ہدایت کی توقع ہو سکتی تھی اُن کا یہ حال تھا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں تحریف کرتے، آیتوں کے معنیٰ بدل دیتے اور دین و ایمان کو سستے داموں بیچ دیتے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے، عام طور پر ایسا نہیں ہوا کرتا کہ کسی فرد یا قوم نے غلطی کی اور اُسی وقت اللہ کے عذاب نے غلط کاروں کو پکڑ لیا، ظالموں کو کچھ مدت کیلئے ڈھیل بھی دی جاتی ہے کہ شاید یہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں، جب اللہ کی حجت تمام ہولیتی ہے اور ظلم کا پیالہ بھر چکتا ہے تو پھر عذاب کے فرشتے مسلط کر دیئے جاتے ہیں
چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا، اصلاح حال کی انھیں بہت کچھ مہلت ملی مگر برائیاں اُن کے دلوں میں جڑ پکڑ چکی تھیں اور معصیت اُن کے نفس میں رچ چکی تھی، رفتہ رفتہ نافرمانی اُن کا شعار بن گیا ——— یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دی ہوئی عزتیں ان سے ایک ایک کر کے چھین لیں اور ذلتیں اُن پر مسلط کر دیں، کئی ہزار کی مسلسل مسکنت اور ذلتوں کے بعد یہودیوں کو زمین کے ایک چھوٹے سے خطہ پر حکومت قایم کرنے کا اب کہیں جا کر موقعہ ملا ہے مگر حال یہ ہے کہ سوسائٹی آج بھی اُن ذلت کے ماروں کو ذلیل و خوار سمجھتی ہے اور لوگوں کے دل، انھیں عزت کا کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، یورپ میں کسی کو "Jew" کہہ دینا ایک طرح کی گالی ہے۔
دوسری نافرمان قوموں کا اس سے بھی بدتر حال ہوا، اُن کا عالم یہ تھا کہ جب اچنیں میسر آتیں تو خدا کو بھول جاتے اور اپنی کامیابیوں پر اترانے لگتے، اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعہ جن کاموں کے نہ کرنے کا حکم بھیجتا، اُسی کام کو وہ ادبدا کر کرتے، اُن سے مسلسل نافرمانیاں سرزد ہوتے لگیں، اللہ کو چھوڑ کر اپنی خواہشوں کو اُنھوں نے "رب" بنا لیا، مسرت و طمینان کے اس امتحان میں وہ پورے نہ اُترے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو اس سختی کے ساتھ آن پکڑا کہ نہ تو وہ، اُن کی بستیوں تک کے نام و نشان مٹ گئے، تاریخ کے صفحوں پر بس اُن کے نام رہ گئے ہیں!
ان میں کچھ ایسی قومیں بھی تھیں کہ مصیبت اور پریشانیوں میں جن کے پاؤں ڈگمگا گئے، غموں کی وہ تاب نہ لاسکیں، مصائب نے اُن کو بزدل، کم ہمت، پست فطرت اور ہر اُبھرتی ہوئی طاقت کا بندہ بنا دیا، زندگی کی ضرورتوں نے مجبور کیا تو بادشاہوں اور دولت مندوں کی چوکھٹوں پر اُنھوں نے اپنی پیشانیاں جھکادیں، فرمانرواؤں کی خدائی کا کلمہ پڑھا، معصیت اور نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کی، تن پروری کیلئے جائز اور ناجائز میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا، فرشتوں، دیوتاؤں، بزرگوں کی روحوں سے لیکر اینٹ پتھر، دریا، درخت، سورج، آگ، گائے، اور بیل اور سانپ تک، ہر فائدہ پہونچانے والی اور مرعوب کن چیز کو پوجا، آزمایش کی بھٹی میں ان کو اس لئے تپایا گیا تھا کہ "مس خام" "کندن" بن جائے مگر وہ ذرا سی آنچ کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور آزمائشوں کی تاب نہ لاسکے اور کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔

**آزمایش** دُنیا ایک زمانہ تک اسی ہنجار اور روش پر گامزن رہی، دھرتی کے چاروں کھونٹوں میں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، ظلم، ناخدا ترسی اور حق ناشناسی کا ہر طرف دور دورہ تھا، یہ حالت دیکھ کر غیرتِ حق کو یکایک حرکت ہوئی، اور رحمت کے بادلوں نے بو قبیس کی طرف رُخ کیا یہاں تک ... کہ :-

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دُعائے خلیل اور نوید مسیحا

اللہ تعالیٰ نے جن کو ایمان کی سعادت، اسلام کی برکت اور ہدایت کی توفیق سے نوازا، اُن کو آغاز میں پریشانیوں اور مصیبتوں کی آزمایش سے گزرنا پڑا، امتحان اور آتشیں امتحان، آزمایش اور جاں گداز آزمایش! رفیقوں اور عزیزوں نے اسلام قبول کرنے کے جرم میں ایک ایک چیز چھین لی یہاں تک کہ کسی کسی کے تن کے کپڑے تک اُتروالئے، مگر اللہ کی خوشنودی کے لئے اس جامِ تلخ و آتشیں کو بخوشی گوارا کر لیا گیا، جلتی ہوئی ریت پر تپتے ہوئے پتھر سے جسم داغے گئے، ننگی

پیٹھوں پر کوڑے برسائے گئے، کتنوں کو مکہ کی گلیوں میں بے دردی کے ساتھ گھسیٹا گیا، ایک ایک دانہ کیلئے مسلمانوں کو ترسایا گیا، قوم نے انکا کرکے بائیکاٹ کردیا، خود ذاتِ رسالتؐ مآب کے ساتھ وہ وہ گستاخیاں کیں اور ایسی ایسی شقاوتیں روا رکھیں کہ "رحمۃ اللعالمین" کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اللہ سے عذاب طلب کرکے قریش کے ظالموں کو عاد و ثمود کی طرح بے نام و نشان بنادیتا۔

آزمائش کا یہ سلسلہ اسی حد پر جاکر ختم نہیں ہوا ــــــــــ جب معاملہ انتہا کو پہونچ چکا اور مکہ کی سرزمین خدا کے برگزیدہ نبیؐ اور اُس کے جاں نثاروں پر تنگ ہوگئی تو بمجبوری گھر سے بے گھر ہونا پڑا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پردیس کا رُخ کیا اور اس دیس نکالے اور جلاوطنی کے بعد بھی ظالموں کے کلیجوں میں ٹھنڈک نہ پڑی یہاں تک کہ بدر و احد اور خندق کے معرکے گرم ہوئے، ہزاروں نے چند مٹھی بھر انسانوں کو للکارا وہاں ہتھیاروں اور لڑنے والے آدمیوں کی بہتات تھی اور یہاں یہ عالم کہ بہت سوں کی تو زرہیں بھی ثابت نہ تھیں، ستو پھانک پھانک کر یہ خدا کے بندے لڑے اور سُورج کی آنکھ گواہ ہے کہ ان سے زیادہ بہادر، جری، ثابت قدم اور بلند حوصلہ سپاہی تاریخ نے پیدا نہیں کئے، مرتے مرتے اور جان دیتے دیتے "اللہ" کا نام پکارتے رہے۔

مصائب کے اس دورِ آزمائش میں اللہ کے یہ نیک بندے پُورے اُترے، بڑے سے بُرے وقت میں بھی اپنے رب اور معبود کے سوا کسی غیر کو مدد کیلئے نہیں پکارا، اور اُن کے عقیدے میں بال برابر فرق پیدا نہیں ہوا، ہر نئی افتاد ایمان کے نشہ کو اور تیز کردیتی، نہ صرف فقر و فاقہ بلکہ تلوار کی دھار کے نیچے بھی خدا اور رسول کے وفادار رہے، یہی وفاداری ان کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع تھی اور اس کے کسی ذرا سے جزسے بھی وہ کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوئے۔ آزمائش کی بھٹی میں وہ مردانہ وار تپتے رہے یہاں تک کہ اُن میں خود یہ قابلیت پیدا ہوگئی کہ خاک کی جس چٹکی کو انھوں نے چھولیا وہ اکسیر بن گئی۔

مصائب کا امتحان ختم ہوا تو اس سے سخت تر آزمائش کا سامنا ہوا، یہ مسرتوں اور اقبال مندیوں کا دورہ تھا، قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج اُن کی ٹھوکروں سے لگے تھے، اور جمشید و کیکاؤس کی عظمت اُن کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھی، دنیا میں کوئی حکومت اُن کی برابری نہ کرسکتی تھی، ہر طرف وہ ہی وہ دکھائی دیتے تھے، اُن کا بیت المال زر و جواہر سے بھر بھر کر خالی ہو ہو جاتا، صرف ایک مدآین سے بے شمار مالِ غنیمت اُنھیں ملا جس میں حریر و دیبا کے پردے، زرتار قالین، سونے چاندی کے برتن، کسریٰ کے جڑاؤ کنگن اور نقرئی و طلائی سکے بھی تھے اور یہی نہیں حُسن، عصمتیں، دوشیزگی اور جوانیاں بھی اُن کیلئے چشم براہ تھیں ــــ مگر اس ہجوم فراغ و راحت میں وہ ذرہ برابر نہ بدلے، اُن کے کردار جس طرح فقر و فاقہ اور غم و مصیبت کے عالم میں بے داغ تھے، مسرتوں کے جُھرمٹ میں بھی بے داغ رہے، دولت اُن کو ذرہ برابر مغرور نہ بنا سکی، اللہ کے اس فضل و کرم کا اُنھوں نے نیازمندی کے رکوع اور تواضع کے سجدوں سے خیر مقدم کیا، اللہ تعالیٰ جس قدر اُن کو نوازتا اسی قدر وہ اللہ کے حضور انکسار، فروتنی اور عاجزی اختیار کرتے، اُنکی دُنیوی حیثیت جتنی بلند ہوتی گئی، اُتنا ہی وہ خدا کے سامنے جھکتے چلے گئے، اُن کے دل خدا کے خوف سے لبریز تھے، راتوں کو خشیتِ الٰہی کے سبب اُن کو روتا اور فریاد کرتا دیکھا گیا، انتہائی دیانتدار، راستباز، وعدے کے سچے اور بات کے دھنی! اُن کا غلام امان کا اعلان کردیتا تو بڑے بڑے شریف النسب مجاہد اپنی تلواریں روک لیتے، اُن کے خلفا، کو چوکیداروں کی طرح بستیوں میں گھومتا اور گشت کرتا پایا گیا، صنعاء سے قسطنطنیہ تک حکومت ــــــ مگر جسم پر پیوند لگا ہوا کرتہ، جو کی روٹی زیتون کے تیل کے ساتھ، ایک ایک مظلوم کی دادرسی کے لئے تیار، بارگاہِ خلافت پر نہ حاجب، نہ دربان نہ باڈی گارڈ، ایک صحرانشین بھی خلیفہ کا گریبان تھام کر اپنا حق طلب کرسکتا تھا اور ایک بڑھیا بھی

ر المومنین کو ٹوک سکتی تھی۔
مسرت واطمینان اور راحت وکامرانی کی اس آزمایش میں بھی یہ مقدس نفوس پورے اُترے! انبیا کے بعد تاریخ اتنے
دہ نیک نفس لوگوں کو پیش نہیں کر سکتی، سچائی اِن کے ساتھ ساتھ گھومتی تھی، ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے انصاف
ر داڑتی تھی اور انسانیت ان کی رکاب تھام کر چلتی تھی، فرمانروائی، حکومت اور دولت کا نشہ بڑا مردافگن ہوتا ہے، بعض
یک دو چلو ہی میں بہک جاتے ہیں مگر انھوں نے اس نشہ کے سمندر پی کر بھی دل ودماغ کو متوازن رکھا تاریخ انسانیت
ے یہ سب سے بڑے "ہیرو" ہیں ــــ انکی زندگیوں میں دُنیا کے لئے ہدایتوں کے نمونے اور بصیرتوں کے سامان ہیں، رہتی دنیا تک
انیت ان کے کارناموں پر ناز کرتی رہے گی، جہاں کہیں بھی بھلائی، سر بلندی، نیکوکاری اور حق شناسی کا ذکر آئے گا، ان
وسِ قدسیہ کا نام آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
پاکستان ہو یا ہندوستان، ایران ہو یا شام، مصر ہو یا انڈونیشیا، یمن ہو یا حجاز، چین ہو یا حبش، پولینڈ ہو یا ٹرکی، مشرق قریب
ہو یا شرق بعید، افغانستان ہو یا الجزائر ساری دنیا کے مسلمان جغرافیہ اور نسل ورنگ کی حدبندیوں کے باوجود ایک ہی
شتہ میں منسلک ہیں، انکی زندگی کا مرکزی تصور اور اُن کی منزلِ مقصود ایک ہے، وہ سب کے سب ایک ہی درخت کے پھول،
ب ہی پھول کی پتیاں اور ایک ہی کنبہ کے افراد ہیں، وہ جب تک اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اس "وحدت" کو اُن سے
ئی طاقت چھین نہیں سکتی ــــ اس لئے مشرق میں کسی مسلمان کے پاؤں میں اگر کانٹا چبھے تو اُس کی کھٹک مغرب کے
سلمانوں کے دلوں کو ضرور محسوس کرنی چاہیے، "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" اُن کی معاشرت، معاملت اور ایک دوسرے کے ساتھ
ن سلوک کا معیار ہے ــــ یہی احساسِ قومی اور غیرتِ دینی تھی جس کی بنا پر ہم نے انگریزوں کے جابرانہ دور میں
پنے غیر ملکی بھائیوں کی حتی المقدور مدد کی، بلقان میں جو طبی وفد ہندوستان کے مسلمانوں نے بھیجا تھا اُسے تاریخ بھلا نہیں
کتی، پھر سمرنا میں یونانی درندوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کئے تھے انکی خبریں سُن سُن کر ہندوستانی مسلمان تڑپ تڑپ
ٹھے، اور مظلوموں کی امداد کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے اُس سے گریز نہیں کیا۔ کانپور میں مسجد کا ذرا سا حصہ حکومت نے توڑ دیا
ھا اُس پر مسلمانوں کی غیرت نے جس جوشِ ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے اُسے کوئی کاغذ کے اوراق سے چاہے تو مٹا دے مگر دلوں
ے نہیں مٹا سکتا ــــ یہ کوئی فرضی داستانیں نہیں ہیں جو گرمیٔ محفل کیلئے بیان کی جاتی ہیں، ان واقعات میں ہم
سب کیلئے عبرتوں اور بصیرتوں کی نشانیاں اور عزم وعمل کے اشارے ہیں، نازک اور دقیق نہیں کھلے ہوئے اشارے:۔
ہم دنیا کے پردے پر جہاں کہیں بھی بستے اور رہتے ہیں، ہمیں مسلمان رہ کر جینا اور مرنا ہے، ہم نے خدا اور رسولؐ سے پیمانِ
وفا باندھا ہے، اس وفاداری سے جو وفاداری بھی ٹکرائے گی اُسے ٹوٹ جانا ہوگا مگر یہ رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا، ہم سب نے مل جل کر
للہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہے، ہمارے ہاتھ ٹوٹ سکتے ہیں مگر "حَبلُ اللہ" ہمارے ہاتھوں سے نہیں چھوٹ سکتی یہ تو رشتۂ
نفس کے ساتھ وابستہ ہے!
جو مسلمان دُنیا کے جس خطہ میں بھی ستائے جا رہے ہیں وہ سمجھ لیں کہ اللہ کی طرف سے انکی یہ آزمایش ہو رہی ہے ــــ یہ
نہ ہو کہ مصائب اور سختیاں اُن کے پائے استقامت کو ڈگمگا دیں، انکو غازیوں کی طرح جینا اور شہیدوں کی طرح مرنا چاہیے، وہ
اپنا دُکھ درد اپنے اللہ سے کہتے رہیں، ظلم وستم کی ہر یلغار کے بعد اُن کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو جانا چاہیے، رسول اللہ اور صحابہ
کرام کی مکہ کی زندگی اُن کے پیشِ نظر رہے ــــ اور صبر واستقامت کے ساتھ اللہ تعالے کی نصرت کا انتظار کریں،

اس آزمائش میں وہ پورے اُترے تو پھر میدان اُن کے ہاتھ ہے، اللہ کی فوجیں زیادہ دن تک تماشائی بن کر دیکھتی نہیں رہ سکتیں، پاپ اور اتیاچار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، اللہ کے فرشتوں کی تمام ہمدردیاں مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہیں، ایک وقت آکر رہتا ہے کہ آج کے پامال کل کے سربلند ہوتے ہیں، مظلومیت فتح و کامرانی کا پیش خیمہ ہے، اللہ کا یہ قانون ہے، ایسا ہوتا آیا ہے، تاریخ کے صفحات اسکی گواہی دے رہے ہیں، سُنی ہوئی نہیں، چشم دید گواہی!

مکّہ میں خدا کے نیک بندوں کو کفار قریش نے تھوڑا ستایا تھا، جو ظلم وہ کر سکتے تھے کر گزرے، اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ "مسلمان" تھے، ربِّ واحد کے پرستار، محمدؐ عربی کے غلام، نیکی اور بھلائی کے مُبلّغ اور سچائی کے علمبردار! پاپ کا گھڑا جب بھر چکا اور ظالموں کیلئے اللہ کی دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی تو تاریخ کا ورق دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا، مظلوموں کو فتح و نصرت نصیب ہوئی اور ظالموں کو ذلت و خواری دیکھنی پڑی، ابوسفیان کا دل دہل گیا جب اُس نے پہاڑ کی چوٹی سے مسلمانوں کو مکّہ میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے —— اور پھر "مظلوم" ہی سب کچھ تھے، فاتح، فرمانروا، حاکم اور قریش کی قسمتوں کے مالک! پس مظلوم مسلمانوں کو فتح و نصرت کی بشارت! اور کامرانی کا مژدہ! جس اللہ نے مکّہ میں اُن کی حفاظت کی تھی اور بدر و احد میں اُنکی امداد فرمائی تھی، وہی خدا اپنی اُنھی طاقتوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے، تم صبر و استقامت کا ثبوت دو، اللہ اپنا وعدہ پورا کریگا، وہ تمام نعمتیں تم پر بھی نازل ہونگی جن سے پچھلے مسلمانوں کو نوازا گیا تھا، اور تاریخ اپنے کو دہرا کر رہے گی، اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ انقلاب ہم اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔

یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ "صبر" اور "بزدلی" میں بہت ہی نازک فرق ہے، مسلمان صابر و شاکر ہوتا ہے، بُزدل اور خود فروش نہیں ہوتا، ظلم و ستم کو اللہ کی رضا جوئی کیلئے سہنا چاہیئے، ظالموں کا خوف اگر غالب ہو گیا تو یہ صبر نہیں بُزدلی ہوگی، ڈرنا بس اللہ ہی سے چاہیئے، قلبِ مومن خوف کی دُوئی کو برداشت نہیں کر سکتا، وہ صرف اپنے خدا ہی سے ڈر سکتا ہے، اور جو خدا سے ڈرتا ہے پھر وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا —— اسلام اور ایمان کے بنیادی عقائد کے اظہار کی جہاں ضرورت پیش آئے، وہاں کھُل کر کلمۂ حق بلند کرنیکی ضرورت ہے، اس کے نتیجہ میں ظلم کو اور زیادہ غصّہ آئیگا مگر اسطرح ظلم اظہارِ حق پر برافروختہ ہو کر اپنی تباہی کے منشور پر تصدیق کی ایک اور مُہر ثبوت کر دیگا۔

اپنی خوشی سے مُصیبتیں کون قبول کرتا ہے، پریشانیاں ہر دل کو ناگوار ہوتی ہیں مگر جب آن پڑیں تو انھیں سہنا چاہیئے، مسلمانکی تو یہ شان اور آن ہے کہ ؏ جو مرگ آید تبسم برلبِ اوست! مصائب کی بھٹی کی آنچ کو جو بھی سہہ جائیگا وہ اس آگ سے کندن بنکر نکلیگا اور دُنیا اور آخرت میں اُسی کو سربلندی ملیگی، کردار کی آزمائش آلام و مصائب ہی میں ہوتی ہے اور اس امتحان میں جو پورا اترا کامرانیاں اُسکے لئے مقدر ہو گئیں!

مظلوم مُسلمان اپنے اللہ کے حضور گڑگڑائیں، روئیں، عاجزی پیش کریں —— مگر ظالموں سے بہادروں کی طرح آنکھیں ملا کر باتیں کریں، وقت سے پہلے کوئی کسی کو نہیں مار سکتا، دُنیا کی زندگی کو ٹھہراؤ نہیں، یہاں کی خوشیاں بھی آنی اور یہاں کے غم بھی گریز پا! اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، جس نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی، اُس نے بہت ٹوٹے کی تجارت کی، مظلوم مُسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ وقت نماز اور تلاوتِ قرآن میں صرف کرنا چاہیئے، اپنے معبود کی طرف جُھکتے ہی چلے جائیں، پریشانیوں کے ہجوم میں بھی اخلاق بلند رکھیں، خیانت اور فریب و معصیت سے دُور رہیں —— یاد رہے! کہ مصیبتوں میں بھی جو قوم بُرائیوں میں مُبتلا رہی اور انقلاب و حوادث کے بعد بھی جس قوم کی آنکھ نہ کھلی پھر اُسے فنا کر دیا جاتا ہے اور اللہ کا قانون ایسی فاقہ مست قوم کے ساتھ کوئی رعایت روا

ں رکھتا۔

**زمایش اور تحاد!**

جس جس ملک میں مسلمان حاکم اور خوشحال ہیں وہاں انکی خوشحالی اور فرمانروائی کے ذریعہ آزمایش ہو رہی ہے، اور یہ آزمایش پریشانیوں، خطروں اور مصیبتوں کی آزمایش سے شاید زیادہ نازک ہوتی ہے، اس امتحان کا انھوں
ا احساس نہ کیا اور وہ اس بھلاوے میں رہے کہ اللہ کی ذات "غفور و رحیم" ہے، ہم خواہ کچھ ہی کرتے رہیں بخش نہ دیئے جائیں گے
—— تو انھوں نے اللہ کے قانونِ سزا و جزا کو نہیں پہچانا اور اللہ کی میزانِ عدل کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی، یہ
ی نادانی اور غلط اندیشی ہے! یاد رہے کہ معصیت، فسق و فجور اور بداعمالی بھی ایک طرح کا ظلم ہی ہے، اور ظلم کی کشتی کاغذ کی ناؤ کی
ح ہوتی ہے کہ ذرا دور چلی اور ڈوب گئی، اللہ کی نافرمانیاں اگر وہ کرتے رہے تو دنیا کی خوش حالیاں اور فرمانروائیاں ان سے چھین
ی جائیں گی —— پس! خوشحالی اور فراغ و مسرت کے عالم میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ خدا اور بندوں کا حق ادا
رنے میں اونچ نیچ نہ ہو جائے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ عیش و مسرت میں اللہ کی یاد سے دل غافل نہ ہونے چاہئیں تو تذکیر و تسبیح کے ساتھ ساتھ اسکی یہ بھی
راد بلکہ غایت ہے کہ اللہ کے حدود کی حفاظت کی جائے، اور خوشیوں اور راحتوں کی کارفرمائیاں اللہ کی بنائی ہوئی حدود میں
ہ کر ہوں، جو خوشی اللہ کی حدود کو پھاند گئی وہ معصیت اور نافرمانی ہے، پس مسلمانوں کو اپنے پر احتساب کرتے رہنا چاہیئے کہ
نکی راحت سامانیاں حدود اللہ سے کہاں کہاں تجاوز کر رہی ہیں۔

امن و فراغت کے عالم میں آخرت کے محاسبہ کے عقیدہ کو زیادہ سے زیادہ راسخ کرنیکی ضرورت ہے اس سے اعمال اور
ردار میں توازن پیدا ہوگا اور ہوس ناک امنگوں کو پاؤں پھیلانے کا کم سے کم موقعہ ملیگا، خوشی کے عالم میں اللہ کے خوف سے
نکھیں اشکبار اور دل ترساں اور لرزاں رہنے چاہئیں —— لوگ محاسبہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جو دولت انھیں
ی ہے، وہ اللہ کی حدود میں رہ کر خرچ ہو رہی ہے یا اس سے باہر خرچ کی جا رہی ہے، غریبوں اور حاجتمندوں کو اسمیں سے کیا
ل رہا ہے؟ اپنی ذاتی ضرورتیں اسراف و تبذیر کی حد تک تو نہیں پہونچ گئیں —— اور صرف دولت ہی کا نہیں تندرستی،
جسمانی قوت، ذاتی صلاحیت اور تمام نعمتوں اور طاقتوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ان کو کس کام میں کس طرح صرف
کیا جا رہا ہے؟

ہمارے پاس اطلاعیں آئی ہیں —— جو ممکن ہے مبالغہ آمیز ہوں مگر بے بنیاد نہیں ہیں، لوگوں نے چشم دید
حالات بیان کئے ہیں کہ مسلمان ممالک کی عام طور پر اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے، بے حجابی، مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط،
رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، مسجدیں سنسان، کلب گھر آباد، عیش سامانیاں، لذت اندوزیاں! جیسے انھیں
سدا اسی دنیا میں رہنا ہے —— ہر بات میں "مغرب" کی پوری پوری تقلید! خدا سے بے خوفی، آخرت کے احتساب
سے بے نیازی ہوسناکیاں پروان چڑھتی ہوئیں اور بدکاریاں فروغ پاتی ہوئیں! یہ "لے" روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی
ہے، مصر میں "اخوان المسلمین" نام کی ایک جماعت پیدا ہوئی تھی جس نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جس کے ارکان
اسلامی شعائر کو باقی رکھنا چاہتے تھے ایک پاگل بلکہ ظالم نوجوان نے اسکے قاید کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور اس صالح جماعت کے بہت
سے کارکن قید و بند کی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔

یہ جوانعی نیچے —— یہود حکومت قایم کر کے عربوں کی چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں، یہ دراصل مسلمانوں کی بداعمالیوں کی

سزا ہے، یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا ناگہانی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے مسلمانوں کی غفلتوں اور نافرمانیوں کا! اگر خدا سے اسیطرح دوری اور فسق و فجور کی گرم بازاری رہی، شعائر اسلامی بے حرمت ہوتے رہے، اللہ کی قایم کی ہوئی حدیں ٹوٹتی رہیں تو پھر یقین کیجئے کہ ذلتیں مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہیں اور آج بھی عزت کا وہ مقام کہاں حاصل ہے جس کا مردِ مومن سزاوار ہے!

"پان اسلامزم" کی تحریک ایک خواب بے تعبیر اور "اسلامستان" کا تصور کوشش بے سود ہے اگر مسلمان حکومتوں میں اسلامی نظام قایم نہیں ہوتا ہم جو تمام مسلمان حکومتوں اور ملکوں کو ایک کلمۂ حق پر جمع کرنا چاہتے ہیں تو اسکی غرض ہی یہ ہونی چاہیئے کہ ہماری زندگیاں اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے تحت گزریں گی، خدا اور رسول کی وفاداری اور رضا جوئی ہمارا مقصدِ حیات ہوگا، ہماری معاشرت میں فسق و فجور اور جاہلانہ تعیش کیلئے ذراسی بھی گنجایش نہ ہوگی، شراب تو شراب کسی کلب گھر میں کسی مسلمان کے ہاتھ میں تاش کا ایک پتا بھی دکھائی نہ دیگا، ہماری حکومتوں کا دستور "کتاب و سنت" سے ماخوذ ہوگا، اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "اسلامستان" ایک نظر فریب اصطلاح ہے اور مسلمان حکومتوں اور ملکوں کا اتحاد ایک فلمی اداکاری!

ہمارا اتحاد اللہ کا کلمہ بلند کرنے کیلئے ہونا چاہیئے، "اسلامستان" میں نظامِ اسلامی برپا نہ ہوا تو اسے "اسلامستان" کون کہہ سکتا ہے، اور یوں کوئی اپنے نفس کو دھوکا دینا چاہے تو وہ اور بات ہے، نفس کے بندوں اور حق ناشناسوں نے اسلام ہی کا نام لیکر اسلام کے قوانین کو توڑا ہے، اور ظالموں نے عدل ہی کے نام پر ظلم کیا ہے! جو لوگ کسی تحریک کو اسلام سے منسوب کرنا چاہیں تو ایسا کرنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لیں کہ خود "اسلام" اور اس کے تقاضے کیا ہیں، اگر اسلام کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر کوئی اتحاد کیا اور اس اتحاد کا مقصد اسلامی انقلاب نہ ہوا تو یہ فاسقوں کا اتحاد اور فسق و فجور کے نام پر معاہدہ ہوگا اور معصیت و بے دینی کے "شجرِ خبیث" کی جڑیں اور مضبوط ہو جائیں گی۔

**انصار اور مہاجرین** جب مسلمانوں کیلئے کسی ملک یا بستی میں ظلم و ستم کے سبب رہنا دشوار ہو جائے تو وہ کسی محفوظ مقام کی طرف ہجرت کر سکتے ہیں، یہ ہجرت خدا کیلئے ہو تو بڑے ثواب کی چیز ہے، آجکل اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کیونکہ حالات سب پر روشن ہیں اور بھکاری بھی جانتا ہے کہ طوفان کا رُخ کدھر ہے اور کیا ہو رہا ہے!

پس مہاجرین کو یہ سمجھ کر ہجرت کرنی چاہے کہ وہ کسی پر بار بنکر نہ رہیں گے، اپنی قوتِ بازو سے حلال روزی کمائیں گے اور وہ لوگ جو اُن کے آجانیکے سبب بے آرام ہو جائیں گے، انکی تھوڑی سی کبیدہ خاطری کو بھی برداشت کرلیں گے، اس لئے کہ ہر شخص پیکرِ ایثار و مروت نہیں ہوتا، کسی کے چین آرام میں خلل پڑتا ہے تو اُسکی پیشانی پر شکن آہی جاتی ہے ـــــــ ہجرت ایک مقدس فرض ہے، یہ نیکوکاری اور پاکبازی کیساتھ ادا ہونا چاہیئے، یہ ایک آزمایش ہے! ہجرت سے پہلے کی برائیاں ہجرت کے بعد دور ہو جانا ضروری ہیں، ہجرت زندگی کا دوسرا ورق اور نقشِ ثانی ہوتا ہے اور نقشِ ثانی اگر نقشِ اول سے بہتر نہ ہو تو نقاش کی یہ بہت بڑی کوتاہی اور کمزوری ہے، مہاجرین کی صفت ہے بُردباری، نیکوکاری، قناعت، بلند نظری اور قربانی ـــــــ اور یہ بھی یاد رہے کہ "ہجرت" کی آخری منزل "فتح مکہ" ہے، یہ نہ ہو کہ ہجرت کے بعد مہاجرین دُنیا کمانے میں مُبتلا ہو کر رہ جائیں اور انکی کمیٹیوں اور انجمنوں کی کوششوں کا مقصود حکومت سے چند سہولتوں کیلئے درخواست اور بعض بے اعتدالیوں پر احتجاج ہو ـــــــ ہجرت کے بعد زندگیاں بدل جانی چاہئیں، یہانتک کہ مکہ کے دروازے جو اُن پر بند کر دیئے گئے تھے پھر سے کھل جائیں اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہو تو یہ "ہجرت" نہیں "فرار" ہے!

انصار کو یہ سوچنا چاہیئے کہ یہاں لڈو نہیں بٹ رہے ہیں، جو یہ غریب مہاجر انہیں لینے کیلئے آئے ہیں، اپنی خوشی سے کون گھر سے بے گھر ہوا کرتا ہے، یہ لٹ پٹ کر آئے ہیں، ان کے دل زخمی ہیں، انکی روحیں نڈھال ہیں، ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھین لی گئیں، انکی تمناؤں کے باغ اُجاڑ دیئے گئے، اب عالم یہ ہے:-

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

یہ بھی تمھاری ہی طرح آسودہ اور گھر والے تھے، ان کے پاس بھی مکان، بنگلے، کوٹھیاں، دکانیں، کارخانے اور کھیت تھے، مگر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑا، یہ تمھیں اپنا سمجھ کر آئے ہیں، ورنہ یہ برما اور لنکا کیوں نہ چلے گئے ——— یہ دُھتکار کے نہیں چمکار کے مستحق ہیں، تم انکی غمخواری کرو، روپیہ پیسہ سے نہیں تو کم سے کم شیریں کلامی ہی سے سہی! تم انکی ڈھارس بندھاؤ، ہر جان کیلئے رزق اللہ نے مقرر کر دیا ہے وہ اُسے ضرور ملیگا اور دوسرے کے رزق میں کمی نہ آئیگی! اللہ تعالیٰ تمھارے ایثار کا بدلہ عطا فرمائیگا، انصارِ مدینہ نے مہاجرین مکہ کے ساتھ جو بھائی چارے کا برتاؤ کیا تھا، تم اُسکی برابری نہ کر سکو، تو اپنے اعمال میں کوئی جھلک تو پیدا کر کے دکھا دو۔

ع ما ہم ز آشیاں بہ اُمیدے پریدہ ایم

انصار اور مہاجرین میں کوئی طبقاتی امتیاز اور کشمکش پیدا نہ ہونی چاہیئے، اسلام نے ان سب کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں پرو کر "ایک" بنا دیا ہے، اُن کا مقصدِ حیات ایک ہے!

**ذمہ داری!** ایک بات انصار اور مہاجرین سے بہ یک وقت کہنے کی ہے وہ یہ کہ غیر مسلم اقلیتیں جو پاکستان میں رہ گئی ہیں، اُن کے جان و مال کی حفاظت آپ کے ذمّہ ہے، اس ذمہ داری میں خلل آگیا تو اللہ کے یہاں اس کوتاہی کی باز پرس ہوگی، جب تک کسی غیر مسلم (ذمی) سے صریحی طور پر غداری ثابت نہ ہو جائے، اُس کا مال اور خون مسلمان کے مال اور خون کی طرح محترم ہے، ذمیوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک سے پیش آنا چاہئے کہ وہ ہماری پناہ میں ہیں، مذہب اسلام نے ہمیں یہی سکھایا ہے، ہمارے رسولؐ کی یہی وصیت ہے اور خلفائے راشدین کی یہ سنت رہی ہے، اِسلام سلامتی کا پیام ہے، ساری کائنات کے لئے! اُس کے حُدودِ عمل میں ہر جان کو سلامتی ملنی چاہیئے اور اسلام کی بدولت رحمت اپنے، پرائے اور مُسلم و غیر مسلم سب کیلئے عام ہے ——— جو کوئی اپنی مرضی سے کہیں جانا چاہے تو چلا جائے مگر ہم خود ایسے اسباب مہیا نہ کریں کہ ہماری زیادتیوں کے سبب اُسے اپنا گھر چھوڑنا پڑے۔

ہندوستان میں مسلمانوں پر اکثریت ظلم کرے تو اس کا بدلہ پاکستان کی غیر مُسلم اقلیت سے لینا خود اپنی جگہ "ظلم" ہے اور ساتھ ہی جہالت اور غلط اندیشی بھی! ایک کا جُرم دوسرے شخص پر محض اس وجہ سے نہیں ڈالا جا سکتا کہ وہ اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہے! یہ جاہلانہ انتقام ہے، جسے اسلام روا نہیں رکھتا ——— پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، یہاں امن و سلامتی عام ہونی چاہیئے، یہ روش تو اُنھیں کو مبارک رہے جو دھرم کے نام پر ڈنکے کی چوٹ ایک قوم کو مٹانے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ڈھائی سال سے اُس پر عمل بھی ہو رہا ہے، مسلمان تو بہت وسیع القلب، صاحبِ ظرف، بامروت اور گمبھیر ہوتا ہے، اُسکی تاریخ میں تو ایسے سُنہرے ورق بھی ملتے ہیں کہ خون کے پیاسے دشمنوں پر قابو پاکر، معافی دیدی گئی ———

جنکو "سیکولر اسٹیٹ" کا دعویٰ ہے، اور جو اپنی "غیر مذہبی حکومت" کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں خاص اُنکی راجدھانی کے بعض محلوں اور علاقوں میں مسلمان جاتے ہوئے گھبراتا ہے کہ نہ جانے کیا بپتا آن پڑے، مگر ہم پاکستان کے دارالخلافہ میں غیر مسلموں کو ہر مقام پر پوری آزادی کے ساتھ آتے جاتے اور کام کاج کرتے دیکھتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے مسلمانوں کو فرض شناس، انسان دوست، صاحبِ ظرف اور رواداد بنایا ہے، کوئی چاہے تو اس منظر کو اپنی آنکھوں سے آکر دیکھ جائے۔

مقامِ شکر و مسرت ہے کہ ہمارے لیڈر اور اربابِ اقتدار غیر مسلم اقلیتوں کو پریشان کرنے کیلئے ہر تقریر اور تحریر میں "وفاداری" کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ "تم اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو ـــــ" ہمارے کسی لیڈر نے غیر مسلم اقلیتوں کی کسی کتاب یا کسی پیشوا پر طنز تک نہیں کی اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ ہندو اپنے دلوں سے کاشی، بندرابن، ہردوار اور اجودھیا کی محبت اور عقیدت کو نکال کر پھینک دیں۔

صلح و آشتی، رواداری اور امن و سلامتی کی یہ فضا پاکستان کا "طرۂ امتیاز" ہے اور انشاء اللہ رہے گا، جس کسی مسلمان نے جب بھی غیر مسلموں کی ذمہ داری کے عہد کو توڑا ہے تو اُس نے مذہبی گناہ کیا ہے اور قیامت کے دن اس عہد شکنی کی بازپرس ہوگی، ہم اس سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ـــــ جہاں کہیں اس ذہنیت کے مسلمان پائے جاتے ہوں اُن پر نگرانی رکھنی چاہیئے کہ فتنہ کو اُبھرنے کا موقعہ نہ مل سکے، جو مسلمان اس مکروہ تصور کے تحت اشتعال آمیز گفتگو کرتا ہے، وہ پاکستان کو کمزور اور اسلام کو بدنام کرنے کا مجرم ہے، ہم مسلمان رب العالمین کے بندے اور رحمۃ اللعالمین کے اُمتی ہیں، ہمارے دریائے کرم کو مواج ہونا چاہیئے کہ اپنوں سے گزر کر دوسروں کو بھی سیراب کر سکے!

**اربابِ اقتدار سے!** آخر میں ہم حکومتِ پاکستان کے اربابِ اقتدار کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں ـــــ یہ احتجاج نہیں، گزارش ہے اور دردمند دل کی فریاد! جو سمعِ قبول اور گوشِ شنوا چاہتی ہے! انگریز کے راج میں حکومت اور رعایا کی جدا جدا حیثیتیں تھیں، پاکستان بن جانے کے بعد یہ دوعملی ختم ہو گئی، اب پاکستان کا ہر باشندہ حکومت کی ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہے، ہر بازو پر پاکستان کی ذمہ داریوں کا بار رکھا ہوا ہے، گورنر جنرل اور چپراسی پاکستان کے خادم ہونے کی حیثیت سے تنخواہوں اور عہدے کی ذمہ داری کے تفاوت کے باوجود، برابر ہیں۔

پاکستان کی زمامِ حکومت جنکے ہاتھوں میں ہے وہ ملت کے مخدوم نہیں خادم ہیں، اس لئے ملت کا ہر فرد اُن سے بازپرس اور جواب طلبی کا حق رکھتا ہے، جب عمر فاروق کو ایک بدوی برسرِ منبر ٹوک سکتا ہے، تو فاروقِ اعظم سے بڑھکر کسکی عزت ہے، جو اپنے کو عوام کے احتساب سے بلند سمجھتا ہو، پھر جنکو ذمہ داریوں کے منصب سپرد ہیں، اُن کو اپنی جگہ اتنا بُردبار اور صاحبِ ظرف بھی ہونا چاہیئے کہ عوام کی تنقید و احتساب کو وہ گوارا کر لیں۔

پاکستان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے، جو یہاں "اسلام" کی جگہ اشتراکیت کو کارفرما دیکھنا چاہتا ہے، ان لوگوں کو پاکستان کے بنیادی تصور ـــــ اسلام ہی سے اختلاف ہے، اس لئے پاکستان کے اربابِ اقتدار پر جو وہ نکتہ چینی کرتے ہیں اُس میں "اسلام دشمنی" شریک ہوتی ہے ـــــ مگر وہ جو پاکستان میں نظامِ اسلامی کا قیام چاہتے ہیں، انکی تنقید و احتساب کا مقصد اصلاحِ حال اور تعمیر و ترقی ہے، وہ "انقلاب" کی اصطلاح بولیں گے تو اُس سے اُن کا مقصد اسلامی انقلاب ہوگا ـــــ ان دونوں تنقیدوں میں اربابِ حکومت کو فرق کرنا چاہیئے کہ ایک طرف اسلام دشمنی ہے اور دوسری طرف اسلام دوستی، شاعر نے شاید ایسے ہی موقعہ کیلئے کہا تھا:ـــ

سہ نے نے صنما! میانِ دہا فرق است!

سب جانتے ہیں کہ پاکستان "اسلام" کے نام پر بنا ہے، اور اسلام کے نام پر پاکستان بننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہاں کا نظامِ حکومت خالص اسلامی ہوگا، مسلمانوں نے عصمتوں، عزتوں، دولت اور جانوں کی بیش بہا قربانیاں اس لئے نہیں دیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نام پر ملک تو بٹ جائے مگر بٹے ہوئے ملک (پاکستان) کا نظام جوں کا توں رہے یا اُس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی جائے ——— اگر غیر اسلامی نظام کے تحت ہی رہنا تھا تو مشترکہ اور متحدہ ہندوستان ہی کیا بُرا تھا ——— اور کراچی کے "ہوا بندر" سے بمبئی کا "میرن ڈرائیو" زیادہ فرحت بخش اور دلکش، پنجاب، راوی اور سندھ کے علاقہ سے گنگا جمنا کا دوآبہ زیادہ شاداب، پشاور کے "قصہ خوانی بازار" سے دہلی کا چاندنی چوک اور لکھنؤ کا حضرت گنج بہت زیادہ پُر لطف تھا۔

جہاں تک ظاہری کشش کا تعلق ہے ہندوستان کے مناظر، پاکستان سے زیادہ دلکش تھے، لیکن پاکستان کی "اسلامی کشش" سب پر غالب آگئی، اسلام کی مقدس نسبت نے یہاں کے ایک ذرّہ ذرّہ سے ہمیں مانوس بنا دیا، پاکستان کے خار و خس دوسری جگہ کے لالہ و گل سے ہمیں زیادہ عزیز ہیں، ہم یہاں کی ایک ٹھیکری کے بدلے گوہر و الماس بھی قبول نہیں کر سکتے ——— اسلام کی نسبت ہی کے سبب تو یہ سرزمین "پاکستان" Holy Land بن گئی ——— اور پاکستان بننے کا اس کے سوا کوئی دوسرا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو جائے، یہ نہ ہو کہ نظام حکومت تو ہو غیر اسلامی، یا اسلام و کفر کے بین بین" اور اُس کے چلانے والوں کے ناموں میں "علی" "دین" "محمد" "احمد" اور "حسین" کے اجزا شامل ہوں، اور ان ناموں کو دیکھ کر لوگ مطمئن ہو جائیں کہ حکومت کے نظم و نسق کی باگ ڈور مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے ——— اصل شے افراد نہیں بلکہ وہ رُوح کارفرما ہے جس کے تحت حکومت کی مشین چل رہی ہو ——— "ٹرومین" اپنا نام لینن بدل کر رکھ لے یا ٹرومین کی جگہ کوئی کارل مارکس نام کا شخص امریکہ کی صدارت پر آجائے تو کیا دنیا یہ سمجھ لیگی کہ امریکہ میں اشتراکیت کا راج ہے!

ہم پاکستان کے اربابِ اقتدار سے پوچھتے ہیں کہ ڈھائی سال کی مُدت میں پاکستان کو اسلامی حکومت بنانیکے سلسلہ میں اُنھوں نے کیا کیا؟ شاید جواب دیا جائیگا کہ ملک کی تقسیم بڑی نازک گھڑی میں ہوئی، پاکستان کو طرح طرح کی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا، دشمنوں نے ہمیں چین سے کب بیٹھنے دیا (اور معذرتوں کے اس سلسلہ کو بڑھاتے ہی چلے جایئے) ہم مانتے ہیں کہ پاکستان کو یقیناً شدید نازک دور سے گزرنا پڑا، بڑے بڑے سخت مرحلے پیش آئے اور اس سلسلہ میں اربابِ اقتدار کی بعض کوششیں ستائیش کی بھی مستحق ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ پاکستان کو "اسلامی حکومت بنانا" Islamisation کیا دوسرے مسئلوں سے کم اہم تھا، جب داخلی اور خارجی سیاست کا کوئی کام نہیں رکا تو آخر اسی اہم ترین کام کو کس لئے معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا، اصل کام کرنے کا تو یہی تھا۔

اسلام مشکلوں کو حل کرتا ہے یا اُس کے شریک ہوتے ہی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں، پاکستان کے عقدہائے دشوار کی گرہ کشائی اگر اسلام کے ناخنِ تدبیر سے کی جاتی تو یہ عُقدے کبھی کے وا ہو گئے ہوتے ——— پاکستان کا دفاع یقیناً بہت ضروری اور ہر مسئلہ سے زیادہ اہم، مگر نظامِ اسلامی کے قیام کے بعد تو یہ "دفاع" اور زیادہ مضبوط ہو جاتا، آخر "نظامِ اسلامی" کو ترقی کی راہ کا سنگِ گراں کیوں سمجھ لیا گیا ہے، یہ تو اپنی ذات سے نشوو ارتقا کی رُوحِ رواں واقع ہوا ہے، جہاں اسکی پرچھائیں بھی

پڑجاتی ہے وہاں ترقیاں سبزے کی طرح اُگنے لگتی ہیں۔

پاکستان دستوریہ کا یہ اقدام یقیناً مستحسن ہے کہ اُس نے "قراردادِ مقاصد" منظور کرکے اسلامی حکومت کا اعلان کردیا پاکستان کی تاریخ میں یہ دن بہت بڑے انقلاب کا دن ہے ——— مگر ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سال کی مدت ہونے کو آئی، اس قرارداد کو عملی حیثیت دینے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی گئیں، کہا جائے گا کہ دستور ابھی بن رہا ہے، اُس کی تشکیل ہورہی ہے، اربابِ فکر غور کررہے ہیں، ہمارے پاس الٰہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ اُسے ذرا سا رگڑا اور آن کی آن میں سب کچھ ہوگیا، دستور بننے میں کچھ دیر لگے گی ——— جواب معقول ہے، مگر سوال یہ ہے کہ پاکستان کا اسلامی دستور تو "کتاب و سنت" سے ماخوذ ہوگا، مسائل کی تعیین اور تشکیل میں اللہ کی کتاب، رسولؐ کی سنت سے ہدایت اور اس کے بعد صحابہ کرام کے تعامل سے مدد لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ ——— تو پاکستان کی موجودہ دستور ساز اسمبلی جن ارکان سے عبارت ہے، اُن میں کتنے ایسے ہیں جو اتنا علمِ دین رکھتے ہیں کہ کتاب و سنت کے منشاء کے مطابق دستور کو تشکیل دے سکیں۔ ——— اس پر طنز کی جاسکتی ہے کہ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ دستور سازی کا کام "ملّاؤں" کے سپرد کردیا جائے، اس جواب پر ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلامی دستور کی تسوید و تشکیل کیا بالکلیہ اُن افراد کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جائے جن کے دماغوں کی پرورش "برطانوی قانون" کی فضا میں ہوئی ہے! ہمیں معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں علماء کی ایک کمیٹی بھی ازراہِ نوازش مقرر فرمادی گئی ہے مگر اس "کمیٹی" کی دستور ساز اسمبلی میں کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے، یہ تو بس سفارش کرسکتی ہے ——— حالانکہ "دستوریہ" میں علماء کی حیثیت سفارشیوں اور باہر کے تماشائیوں کی نہیں بلکہ ارکان کی ہونی چاہیئے تھی کہ وہ مسائل پر گفتگو کرسکتے اور دین کا نقطۂ نگاہ سمجھا سکتے۔

دستور دیر میں بھی بن سکتا ہے مگر ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کے لئے کیا جدوجہد کی گئی، اس کے لئے تو کسی دستور سازی اور غور و فکر کی ضرورت نہ تھی، حدود اللہ سب کو معلوم ہیں، اسلام نے جن کاموں کے کرنے کے لئے کہا ہے اور جن سے روکا ہے، اُن کا علم سب کو ہے! بتایا جائے کہ کس "معروف" کو قائم کیا اور اور کس "منکر" کو روکا گیا ——— ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ انگریز جس نہج پر معاشرت، تمدن، دفتری اور سرکاری کاروبار کو چھوڑ گیا ہے، اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، ہر رسم ہر عادت اور ہر طرزِ عمل بلکہ معمولی مشاغل کا "Routine" تک اُسی فرنگی انداز میں نظر آتا ہے، اسلامی جمہوریت کے بعد بھی شاہی دربار لگتے ہیں، آج بھی گارڈ آف آنر کی فرعونی رسم جاری ہے، آج بھی "سواری بادبہاری" جب گزرتی ہے تو راستے روک دیئے جاتے ہیں، آج بھی بندگی اور خواجگی میں حجابات حایل ہیں، آج بھی غریب حاجت مندوں کی اونچے آستانوں پر یہ حالت ہے:۔

سگ و درباں چو یافتند غریب　　　　آں گریباں گرفت وایں دامن

آج بھی موٹر نشینوں کے کام ایک ٹیلیفون پر ہو جاتے ہیں، آج بھی رشوت کی گرم بازاری ہے، آج بھی چھوٹوں اور بڑوں کی تنخواہوں میں ایک اور سیکڑوں کا تفاوت پایا جاتا ہے، آج بھی حکومت کا خزانہ (بیت المال) خوانِ یغما بنا ہوا ہے اور اسراف و تبذیر کی لعنت بدستور موجود ہے، آج بھی ریڈیو پر "مالکوس" اور "بھیرویں" الاپی جاتی ہے، آج بھی بڑے بڑے ذمہ دار عہدیدار جلسہ ہائے رقص و سرود کی سرپرستی کرتے ہیں، آج بھی نامحرم مردوں اور عورتوں کا بے باکانہ اختلاط پارٹیوں اور جلسوں میں نظر آتا ہے ——— اور بعض کلب گھروں میں عورتیں تک شراب پیتی ہیں ——— شہنشاہِ ایران کے سامنے مسلمان لڑکیوں نے تنگ و چست وردیاں پہن کر اور سینے تان کر جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، کیا

ں حقیقت کی غمازی نہیں کر رہا کہ یہاں ارادے کچھ اور ہیں! کیا اسلامی ماحول بنانے والوں کے یہی لچھن ہوا کرتے ہیں!
جو داعیانِ حق وصداقت سیفٹی ایکٹ کے فرنگی اور غیر اسلامی قانون کے تحت جیل میں بند کر دیئے گئے ہیں کیا یہ افسوسناک
اسلامی حکومت کے نظام چلانے والوں کے عزایم کا پتا نہیں دے رہا ہے۔

آپ نے پاکستان پر "اسلامی حکومت" کا لیبل لگا رکھا ہے، اگر امریکہ، انگلستان یا کسی دوسرے بدیسی ملک کا باشندہ
ں جب آتا ہے تو وہ لیاری کوارٹرس کے غریب مسلمانوں کی مسجدوں اور بیٹھکوں میں تو جانے سے رہا، وہ تو یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی
ں نقل وحرکت، "moves" کرے گا، انصاف سے بتایا جائے کہ لندن اور واشنگٹن کی پارٹیوں لنچوں اور
ں میں جو کچھ اُسے نظر آتا ہے کیا یہاں ہماری "اسلامی حکومت" میں اُس سے کچھ مختلف نظر آئے گا؟ اور یہ مناظر دیکھ کر وہ
ر اسلام" اور "اسلامی حکومت" کے بارے میں کتنی غلط رائے قایم کرے گا ——— تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بادشاہوں
نمائندے، حکومتوں کی سفارتیں اور قوموں کے وفود جب دربارِ خلافت میں آتے تھے اور مدینہ کے اسلامی ماحول کو دیکھ کر
ملکوں میں واپس ہوتے تھے تو وہاں کے حالات سُنا کر اور مشاہدات بیان کر کے کافروں کے دلوں میں محبتِ اسلام
رح ڈال دیتے ———

پاکستان پُوری قوم کی امانت ہے، کسی کی جاگیر نہیں ہے، ذمہ داری اور اقتدار کی کرسی پر وہی بیٹھ سکتا ہے اور اُسی کو بیٹھنے دیا
ے گا، جو اسلامی کردار اور اسلامی سیرت کا حامل ہو، جس کا دماغ ہی نہیں دل بھی مومن ہو، جس نے اس ذمہ داری کو لذتِ نفس
لئے نہیں بلکہ "فرض" سمجھ کر قبول کیا ہو، جس کے یہاں فراست وتدبیر کے ساتھ تقویٰ اور نیکوکاری دونوں ساتھ ساتھ نظر آئیں۔
——— ہم نے جو کچھ پورے خلوص اور دردمندی کے ساتھ عرض کیا ہے اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہے ——— سپاساموں کی منقبت
تی اور جی "حضوریوں" کی قصیدہ خوانیوں پر نہ جایئے، یہ سب خوشنما دھوکے ہیں، اُن خاک نشینوں کی گزارشوں کی قدر کیجئے جن
دل اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے درد سے لبریز ہیں۔

عوام اور خواص ہمارے معروضات کو توجہ کے ساتھ پڑھیں، اگر ہمارے مشورے ٹھیک اور مفید نظر آئیں تو ان کو پھیلایا جائے،
ک دوسرے سے بیان کرے، دوسرا تیسرے سے! جن لوگوں کی بڑے درباروں میں رسائی ہے، وہ خدا کے لئے ہماری آواز وہاں تک
ہنچا دیں، ہم نے ایک ہی فرصت میں بہت سی باتیں کہہ دی ہیں، ان میں پاکستان ہی نہیں، تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے دردمندانہ
ارے ہیں ——— وہ جو اسلام ہی کو انسانیت کے درد کا مداوا سمجھتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں بہت
ں تک انتظار کے عالم میں نہیں رہ سکتے، دو ہی صُورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ ع باجاں بہ رضائے دوست می باید داد ———
سری یہ کہ ع یا قطعِ نظر زیار می باید کرد، بس اس کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ "یار سے قطعِ نظر" چاہتے ہو یا "رضائے دوست"
جان دینے کا ارادہ ہے!

ماہر القادری
۶ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء

# یہ ہے سفید تہذیب!

غفور احمد مجددی ایم۔اے

یہ تہذیب جسے آجکل مغربی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ایک "سفید تہذیب" ہے جس میں صرف ان لوگوں کو برتری حاصل ہے جن کا رنگ سفید واقع ہوا ہے۔ اس تہذیب کے مُدعیوں نے عالمِ انسانیت کی تقسیم رنگوں کی بنیاد پر اس طرح کی ہے کہ دنیا میں چار قسم کے لوگ آباد ہیں، سفید، بھورے، کالے اور لال۔ اور ان سب میں فوقیت ان لوگوں کو دی گئی ہے جن کا رنگ سفید ہو کیونکہ اس تقسیم کے بانیوں کا رنگ سفید تھا۔ ان سفید رنگ والوں کے نزدیک دنیا میں زندہ رہنے کا حق صرف گوروں کو ہے اور بقیہ رنگوں والے انسان اگر زندہ رہیں تو صرف اس لئے کہ گوروں کی خدمت کرتے رہیں۔

ظاہر ہے کہ انسانی کردار اور صفات کے ارتقاء میں چمڑے کے رنگ کا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے اس سفید تہذیب کے مدعیوں کے ہوئے اصول انسان کے ذاتی اوصاف کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بنے ہوئے ہیں۔ ایک کالا آدمی سائنس کی تمام قوتوں کے ساتھ اپنا رنگ گورا کرنے سے رہا اور جب تک اُس کا رنگ گورا نہ ہو جائے اِس سفید تہذیب کے دور میں اس کے لئے عزت اور فوقیت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں چاہے وہ اپنے ذہنی، فکری اور اخلاقی لحاظ سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

امریکہ، یورپ اور برطانیہ میں اس امتیازِ رنگ کے جو بھیانک واقعات پیش آتے رہتے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسانی حریت فکر و عمل و قول کے یہ بلند بانگ دعوے جو ہم آئے دن ان گوروں کی زبانی سنتے رہتے ہیں محض دھوکا ہیں۔ ناروے کے ایک ہوٹل سے ایک چینی کو صرف اس وجہ سے خارج کر دیا گیا کہ اُس کا رنگ پیلا تھا، امریکہ میں "سُرخ ہندیوں" کو گوری آبادی کے مساوی حقوق صرف اس وجہ سے عملاً حاصل نہیں کہ ان کا رنگ کالا ہے۔ لطف یہ کہ ان لوگوں کو شاید رنگوں کی پہچان بھی نہیں کہ ان کالے امریکنوں کو سُرخ ہندی کا عجیب و غریب نام دیا گیا ہے۔

برطانیہ جو نسلی اور لونی امتیازات سے بالاتر ہونے کا مُدعی ہے وہاں ہم نے اپنی آنکھوں سے اس تفریق کے افسوسناک مناظر آئے دن دیکھے ہیں۔ ایک ہندوستانی طالب علم جو غیر معمولی طور پر کالا تھا مانچسٹر وارد ہونے کے بعد اپنے لئے جائے رہائش کی تلاش میں نکلا جب وہ کسی لینڈ لیڈی کے دروازے پر گھنٹی بجاتا لینڈ لیڈی دروازہ کھولتے ہی اس کی صورت دیکھ کر دروازہ بند کر کے اس طرح بھاگ جاتی جیسے وہ کوئی قابل نفرت مجرم ہے، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد وہ ایک لینڈ لیڈی سے بات کرنے میں کامیاب ہوا تو اُس عورت نے یہ بہانہ کر دیا کہ تم گائے کا گوشت نہیں کھاتے اس لئے تمہیں ٹھیرانے سے مجبور ہوں۔ ایک دوسری لینڈ لیڈی نے اس شرط پر اس کو ٹھیرانے کی رضامندی ظاہر کی کہ وہ لیڈی کے بچوں کی دیکھ بھال کرے اس طالب علم نے جواب دیا اُسے بچوں کی دیکھ بھال اور خبر گیری کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کئی روز کی تگ و دو کے بعد جب بے چارہ بہت مایوس ہو گیا تو ایک دن سرِ شام وہ ایک لینڈ لیڈی کے گھر پہنچا۔ گھنٹی بجائی اور جیسے ہی اس عورت نے دروازہ کھولا تو یہ طالب علم فوراً بآواز بلند کہنے لگا "لیڈی میں آپ کے یہاں رہنا چاہتا ہوں مجھے کمرہ کرائے پر دیجئے، میں سب

Land Lady ۵ا

...الیتا ہوں اور بچوں کا بڑا شوقین ہوں!" ــــــ عورت دروازہ بند کر کے بے تحاشا بھاگ گئی

...سر سیٹسے کھاما کو اس کی سرداری سے صرف اس بنا پر محروم کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک سفید فام عورت سے شادی کی ہے اور یہ ...اُس حکومت کے اراکین نے کی ہے ــــــ اور گفت و شنید کے بہانے کھاما کو لندن بلا کر لائی ہے ــــــ جو اس وقت ...سوشل ازم کی سب سے بڑی علمبردار ہونے کی مدعی ہے۔ سر تس ی کھاما اپنی ریاست سے محروم، اپنی بیوی سے جُدا اور ...صرف اس "جرم" میں ہے کہ اس کا رنگ کالا ہے، وہ حبشی ہے اور "منشور اوقیانوس" بنانے والوں کے قانون میں حقوقِ ...ت سے محروم ہے!

گرچہ باشد ایں جہانِ رنگ رنگ     من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

منشور اوقیانوس سے نام نہاد حقوقِ انسانیت کے اعلان کرنے والوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، اپنے کانوں میں ...بسہ ڈال رکھا ہے اس لازوال قانون کو دیکھنے اور سننے سے جس نے ساڑھے تیرہ سو برس قبل حبشی اور رومی، عربی اور ...ے اور گورے کو ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

"[۱] اے انسانو تمہاری پیدائش کی گئی ہے مردوں اور عورتوں پر۔ یہ مختلف قبائل اور گروہ جو بنائے گئے ہیں صرف اس لئے ہیں کہ شناخت ہو سکے۔ اللہ کے نزدیک اشرف ترین وہ ہے جو پاکیزہ ترین اوصاف رکھتا ہو"

نجاتِ انسانیت کا جو منشور اور آزادیٔ نوعِ انسانی کا جو وثیقہ ہادیٔ برحق نے آخری پیام میں دنیا والوں کو دیا اور جس ...ظ لفظ بڑے بڑے دستوروں کا مخرج ہے اس میں مساواتِ انسانی کو جس شدت اور صداقت کے ساتھ قایم کیا گیا ویسا پھر کبھی ...جا سکا۔ "[۲] اے لوگو جو تم یہاں موجود ہو پہنچا دو ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں اور اسی طرح پہنچاتے رہو کہ آج سے کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں نہ رنگ کی بناء پر اور نہ نسل کی ــــــ اے اللہ تو گواہ ہے کہ میں نے پیامِ حق پہنچا دیا"....

آج اس پیامِ حق کو نہ سننے والے "سفید تہذیب" کی بنیاد پر اپنی فوقیت قایم کرنے والوں نے عالمِ انسانیت ...پھر اُسی ذلت کے گڑھے میں گرا دیا ہے جس میں وہ اس پیامِ حق سے پہلے گرا ہوا تھا۔

...ٹاک کر یا ایک امریکن حبشی اس سفید تہذیب کی لعنت کے خلاف کس درد سے چیخ رہا ہے:-

[۳] ہاں میں کالا ہوں
کالا، توے کی سیاہی کی طرح کالا
ایسا کالا جس پر پھٹکار ہے
دھوئیں سے اٹی ہوئی چمنیوں کی طرح سیاہ ہوں
سیاہی کی وحشت!    وہ وحشت جیسے عین شادی کے دن اور
ٹھیک روزِ عید کو موت واقع ہو جائے!

[۱] قرآن پاک [۲] حدیث شریف [۳] مصر کے ایک عربی مجلّہ سے براہ راست ترجمہ۔

قابلِ نفرت!
براڈوے* میں ہر شخص مجھ سے نفرت کرتا ہے۔
ہر کوئی میری بے عزتی کرتا ہے۔
ہر ایک اس طرح گھور رہا ہے جس طرح تارے آسمان سے ایک
حقیر کیڑے کو تاک رہے ہوں
مجھے زندہ دفن کیا گیا
میرے اوپر مٹی کے انبار ڈالے گئے اور قہقہوں کے ساتھ کہا گیا
اے حبشی تو مٹی کا ہے تجھے مٹی ہی میں رہنا چاہیے اور تو ہی مٹی میں ملنے کا مستحق ہے۔
میرے انسان ہونے کی ان کے پاس کوئی حیثیت نہیں
میری شخصیت کی ان کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہیں
میری سمجھ ان کے یہاں ناقابلِ اعتبار
ان کے قانون میں میرے حقوق کا احترام نہیں
میرے پاش پاش افسردہ اور مردہ قلب کے لئے ان کے دلوں میں
کوئی ہمدردی نہیں
میں ان کے گھروں کے کتوں کی طرح حفاظت کرتا ہوں
میں ان کے محلوں میں جگمگاہٹ پیدا کرتا ہوں جیسے بجلی کے قمقمے ان کے لڑکوں اور لڑکیوں
کا کھلونا ہوں جیسے بلیاں اور چڑیاں ان کا کھلونا ہیں۔
میں ناچ کود کر اور "جاز" کے نغمات سنا کر ان کے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتا ہوں
جس طرح سیزر کے غلام روم کے رئیسوں کو خوش کیا کرتے تھے میں مسکین اور مہک ہوں
اس لئے ہر ایک نفرت کرتا ہے۔
ہر ایک مجھ سے ڈرتا ہے ہر ایک مجھ سے بھاگتا ہے مبادا میرے کالے خون کی ایک بوند ان کے پاکیزہ
سفید خون میں مخلوط ہو جائے
افسوس ہے مجھ پر، جب کسی گوری عورت کو دیکھ کر دل مچل جائے۔۔۔
زمین کا ہر پتھر اس وقت صرف میری سنگساری کے لئے ہی وقف ہے۔ ظالموں کے ہاتھ میری ہی
گردن دبانے کے لئے دراز ہیں۔ پوری مسلح فوج گویا کہ میری گرفتاری کے لئے ان کے
خیال میں کافی نہیں۔
پھر بھی میں برداشت کرتا ہوں۔۔۔
برداشت کرتا ہوں اور صبر کرتا ہوں

* Broadway امریکہ کا ایک تفریحی مقام

برداشت کرتا ہوں اور خون کے گھونٹ پیتا ہوں
برداشت کرتا ہوں اور ان کی خدمت کرتا ہوں، خوش رکھتا ہوں
گاتا ہوں، ناچتا ہوں، شراب پلاتا ہوں اور پیتا ہوں ہنستا ہوں قہقہے لگاتا ہوں شاید اپنی حسرت کو بھول جاؤں، اپنے رنگ کو بھول جاؤں، اس بات کو بھول جاؤں کہ میں ان جیسا آدمی نہیں، ایک غیر جنس ہوں اور عزت و امارت کے شہر میں ایک بھکاری ہوں محض بھکاری —— ایک اجنبی ہوں تہذیب کی محفل میں
زندگی کے مقام سے گرا ہوا۔
پھر بھی اگر میں نہ بھولوں تو ان مہذب لوگوں کی کڑی نگاہیں ان کے چشم و ابرو کے اشارے ان کا سلوک اور طرزِ کلام مجھے جلد حقیقت کی دنیا میں واپس لے آتا ہے —— ذلت اور تاریکی کی دنیا میں
یہ سب کیوں اس لئے کہ میں کالا ہوں
کالا ان کے نزدیک بدمعاش سے زیادہ خبیث ہے رہزن سے زیادہ خطرناک ہے، درندوں سے زیادہ شقی ہے مردم خور سے بدتر ہے
مگر ہاں رات بھی تو کالی ہوتی ہے ؟ اور اس کا وجود ضروری ہے۔
رات کالی ہوتی ہے اور اس میں بھی حسن ہے
رات کالی ہوتی ہے اور اسی سے روشنی طلوع ہوتی ہے
پس میں کالا ہوں جب تک زندہ ہوں کالا رہوں گا۔
میں فرعون کا غلام تھا میں نے یہ اہرام بنائے
میں سیزر کا غلام تھا میں نے اس کے قصر کی بلند بنیادیں اٹھائیں
میں واشنگٹن کا غلام تھا میں نے اس کے جوتے چمکائے ہیں۔
میں اہلِ بلجیم کا غلام تھا انھوں نے کانگو میں میرے ہاتھ کاٹ دیئے لیکن میرا سفر زمین کے گرد جاری ہے رہا نہریں میں نے دیکھیں نیل کا دریا میں نے دیکھا اور خاموش تکتا رہا، مسی سی پی کو میں نے سنا کبھی میرے حال پر قہقہے لگاتی رہی اور کبھی میری ہمدردی میں آنسو بہاتی رہی۔
میری روح مطمئن رہی
اس کی وسعتیں بڑھتی گئیں جیسے کہ یہ نہریں ہیں

آج میں انسان ہوں
چاہتا ہوں کہ انسان رہوں اگرچہ حبشی ہوں
چاہتا ہوں انسان رہوں
انسان ہوکر ہی رہوں گا!

ماہر القادری

# غزل ایران میں

دُنیائے تغزل، جہاں حسن انگڑائیاں لیتا ہے اور عشق جھومتا ہے، جہاں پھولوں کے ساتھ انگارے بھی برستے ہیں، جہاں شہد و شراب کے ساتھ خونِ جگر بھی پینا پڑتا ہے، جہاں چنگ و بربط کے نغموں میں فغان و فریاد بھی سمو دی جاتی ہے، جہاں آج تک کوہ بیستوں سے تیشہ فرہاد کی صدا آتی ہے — لطافتیں، نزاکتیں — اور جراحتیں بھی! کچھ خواب، کچھ بیداری! کچھ حقیقت، کچھ پرچھائیں — وجدان کی پذیرائی کے لئے وہ سب کچھ جو بزمِ دشبستاں میں ہونا چاہیئے؟

اُردو زبان جو دُنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے، اور وہ اُس وقت پیدا ہوئی جبکہ فنِ تاریخ اپنے شباب پر تھا، مگر آج تک اس بات کا تصفیہ ہی نہ ہو سکا کہ ہندوستان کے کس خطّہ میں اُردو نے پہلے پہل جنم لیا —— تو پھر دُنیا کی وہ زبانیں جو تاریخ سے ہزاروں سال پہلے کی ہیں اُن کے بارے میں ٹھیک طور پر کون کہہ سکتا ہے کہ ابتداء میں اُن کی ہیئت کیا تھی، پھر وہ کس طرح پھیلیں، بڑھیں اور اُن کے اوّلین معمار کون تھے اور اُن کے کارنامے کہاں پائے جاتے ہیں۔ —— اور نہیں پائے جاتے تو آخر کیا ہوئے ؟

ماہرینِ السنہ ( Philologists ) نے اپنی بساط اور حوصلہ کے مطابق اس سلسلہ میں بہت کچھ تگ و دو کی ہے، اور اُن کی کوششیں یقیناً تحسین و تشکر کی مستحق ہیں، مگر اپنی کوششوں میں پوری طرح وہ کامیاب کہاں ہو پائے، ماقبل تاریخ کے اندھیرے میں نہ جانے کیسے کیسے نقش اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے، ظن و تخمین اور قیاس و رائے سے انھوں نے کڑیوں کے ملانے کی بہت کچھ سعی کی لیکن بہت سی کڑیاں نہ مل سکیں اور بہت سی چولیں ٹھیک بیٹھنے سے رہ گئیں —— قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کے کتبات سے بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ مدد لی گئی مگر وہ چند تختیاں پوری زبان کی تاریخ کس طرح بیان کر دیتیں، پھر جو چیزیں اُن پرانے ویرانوں سے برآمد ہوئیں اُن سے اندازہ کیا گیا کہ وہ دور متمدن دور تھا اور اُس کی زبان بھی تمدن یافتہ ہوگی، اس لئے کہ یہ نہیں ہو سکتا چیزیں تو ہوں اور اُن کے نام نہ ہوں، چیزوں کی کثرت اور رنگارنگی زبان کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

ایران کا تمدن بھی بھارت ورش، مصر اور یونان کے تمدن سے قدامت میں کسی سے شاید کم نہیں ہے، جمشید کے پیالے جام سے ساری دنیا دکھائی دیتی ہو یا نہ دیتی ہو، یہ کسی افسانہ خواں کی شوخیٔ فکر بھی ہو سکتی ہے ــــ مگر اس سے یہ تو بہر حال ظاہر ہوتا ہے کہ ایران میں ایسے عجیب صناع اور نزاکت آفریں کاریگر پائے جاتے تھے، حضرت عمر فاروق کے عہد سعادت مہد میں جب مدائن فتح ہوا ہے اور وہاں سے "بہار" نام کا قالین مالِ غنیمت میں آیا ہے تو اس کی صنعت اور کاریگری حیرت میں ڈال دینے والی تھی اور ظاہر ہے کہ کوئی قوم صدیوں اور مدتوں کی پیہم کوششوں کے بعد اس قدر دقت شناس اور چابک دست ہوتی ہے جبکہ آج کی طرح اُس وقت تعلیم و تربیت کی سہولتوں کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔
جمشید و کیکاؤس اور تہمتن و افراسیاب کی عظمتوں کے کارنامے صرف "افسانے" ہی نہیں ہیں اُن میں واقعیت اور صداقت بھی شریک ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ یار لوگوں نے زیبِ داستاں کے لئے کچھ بڑھا بھی دیا ہے ــ زبان، تمدن و تہذیب کی بلندیوں اور وسعتوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے یا پھر عربوں کی طرح سادہ اور فطری ماحول میسّر آ جائے، جہاں زبان خود رَو پودے کی طرح اُگتی ہے اور وہاں قالین، فرش منبّت اور اطلس و دیبا کے پردے نہ ہوں تو "اونٹ" کے لئے بیسیوں نام وضع ہو جاتے ہیں۔
ایران کی زبان کو زرتشت کے فلسفہ نے علمی حیثیت سے بلند پایہ اور نازک طبع بنا دیا پھر مزدک اور مانی کی دقت آفرینیوں نے اس میں اور نزاکتیں پیدا کر دیں اور ایران کی زبان مالا مال ہوتی چلی گئی ــــ آتشکدوں کے مغوں کی بر رسم گذاری زمزمہ خوانی مشہور ہے، ظاہر ہے کہ یہ زمزمے "اشعار" ہی ہوتے تھے، اس طرح شاہانِ ہخامنشی سے لیکر پورنوشیرواں کے زمانہ تک ایرانی شاعری اور ایرانی زبان مختلف دَور سے گزرتی رہی۔
مگر عجیب بات ہے کہ ایران کے قدیم دَور کا ادب تو کیا ملتا اُس کے کچھ دُھندلے اور مٹے مٹے نقوش بھی برائے نام ملتے ہیں اور شاعری تو یکسر سے نا پید سی ہے، اگر عربوں کی طرح اہلِ عجم میں زبانی یادداشتوں کا رواج ہوتا تو دورِ جاہلیت کی عربی شاعری کی طرح ایران کے عہدِ عتیق کی شاعری بھی محفوظ ہو جاتی۔
جرمنی کے پروفیسر دارمسٹیٹر ہوں یا روس کے پروفیسر والن ٹن ژوکوسکی، پروفیسر نولڈیکی ہوں یا سر گور اوسلی صاحب ہوں یا ہمارے شبلی نعمانی اور حافظ محمود شیرانی ان سب کی سعی اکتشاف کے باوجود ایرانی شعر و ادب کی گزشتہ تاریخ تاریکی ہی میں رہی ــــ اور اس پر بھی پوری طرح اتفاق نہ ہو سکا کہ فارسی زبان میں سب سے پہلے شعر کس نے کہا؟ اور اس پہلے شعر گو کے بعد فارسی شعر و ادب نے کیا کیا ترقیاں کیں۔
ہمیں تاریخ بتاتی ہے اور جو کچھ بتاتی ہے ٹھیک بتاتی ہے کہ تقریباً دوسری صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا پرچم ایران پر پوری طرح لہرا چکا تھا، فارسی شاعری اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے، جمشید اور افراسیاب تو بہت پہلے گزرے ہیں، انتہا یہ ہے کہ نوشیرواں کے دربار یا عہد کے شاعروں تک کے نام بھی نہیں ملتے، ایوانِ مدائن کو دیکھ کر بیچارہ خاقانی شروانی تو مرثیہ میں آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے مگر جن کے دل میں اس انقلاب کا واقعی درد ہونا چاہیئے تھا اُن کے شاعر خاموش رہے یا تو اُس زمانہ میں ایران کی دُنیا شاعروں سے خالی تھی اور اگر شاعر تھے تو اُن کے کارناموں کے اوراق انقلاب کی ہوا اُڑا کر برباد کر دیئے ــــ اس کے برخلاف طاہریہ، صفاریہ اور سامانیہ خاندانوں کے دَور میں فارسی شعرا اپنے شاعرانہ سرمایہ کے ساتھ نظر آتے ہیں، مسلمانوں کی قومی اور مذہبی زبان عربی تھی مگر یہ اُن کی عالی ظرفی رواداری

اور بے تعصبی کی دلیل ہے کہ فارسی زبان کو انھوں نے نہ صرف زندگی عطا کی بلکہ اُسے پروان چڑھا کر جوانِ رعنا بنا دیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی حنظلہ بادغیسی تھا، ۲۱۹ھ ہجری اُس کا سالِ وفات ہے اور رودکی وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے کلام کو دیوان کی شکل میں مرتب کیا، ۳۰۴ھ میں رودکی نے دُنیا سے رختِ سفر باندھا اور پھر دقیقی جیسا باکمال شاعر نمودار ہوتا ہے جس نے "شاہنامہ" کی بنیاد ڈالی۔

## غزل

شعر و سخن کا یہ سلسلہ بڑھتا، پھیلتا اور ترقی کرتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ ایران کی سرزمین نے ایسے ایسے نکتہ سنج، شیریں نوا، شعلہ بیان اور صاحبِ فکر شعراء پیدا کئے کہ رہتی دُنیا تک اُن کے کارنامے زندہ و پائندہ رہیں گے اور اُن کی شہرت اور ناموری کسی انقلاب کے دبائے نہیں دب سکتی۔

ہم سب انتہائی انقلابی دور سے گزر رہے ہیں، بھاپ اور مشینوں کا ماحول ہے، اقتصاد و معاش کے مسئلے ہیں اور ساتھ ہی طرح طرح کی سیاسی ہنگامہ آرائیاں! مگر پھر بھی شاعری کا ذکر چھڑتے ہی ذہن "حسن و محبت" کے تصور سے آپ ہی آپ قریب ہو جاتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری میں حسن و عشق کی چاشنی ضرور پائی جاتی ہے اس سے نہ کالیداس کی کوتا خالی ہے اور نہ امرء القیس کے قصیدے ——— ہاں! یہ ضرور ہے کہ کہیں یہ رنگ ہلکا ہے اور کہیں بہت شوخ ہو گیا ہے۔

جہاں تک حسن و عشق کے معاملات، واردات اور کیفیات کا تعلق ہے، ایران کی شاعری مضامین کی فراوانی اور اشعار کی کمیت ( quantity ) میں دُنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری پر فوقیت لے گئی، ایران کا شاعر حسن و محبت کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا، یہ اُس کی زندگی ہے، اُس کی شاعری کا محبوب ترین موضوع ہے، اُس کی شاعری آنکھ ہی اس فضا میں کھولتی ہے، آپ اس کو چاہیں تو "روایتی شاعری" کہہ لیجئے مگر اسی روایتی شاعری نے اشعارِ عجم کو سوز و درد کا آتشکدہ اور کیف و سرمستی کا میخانہ بنا دیا ہے۔

فارسی شاعری کا زیادہ حصہ غزل پر مشتمل ہے ——— غزل، جس کا موضوع صرف حسن و عشق ہوتا ہے! کوئی مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی کرے گا تو بھی بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنے گی اور مجاز کی اصطلاحیں ناگزیر ہو جائیں گی، ایران کی فضا غزل کو سازگار آئی، اس سرزمین میں یہ نہالِ نوخاستہ برگ و بار لایا، اس ساز کے پردوں میں نغمگی کا اضافہ ہی ہوتا رہا، تیشۂ فرہاد کی بازگشت ہر شعر سے سُنائی دی اور شیریں کی ناز آفرینیاں اور جلوہ آرائیاں ہر غزل میں سما کر رہ گئیں۔

فارسی قصیدے اپنی تشبیب کے لحاظ سے غزل ہی ہوتے ہیں، بہار و صہبا کا ذکر، پری وشوں سے سوال و جواب، حسن و عشق کی باتیں ——— جہاں قصیدوں کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :—

رسمِ عاشق نیست با یک دل دو دلبر داشتن

اُسے غزل نہ کہیں تو اور کیا کہیں، مثنویاں بھی اسی رنگ میں کہی گئیں، انتہا یہ ہے کہ مولانا روم جو شاعری کی زبان سے معارف و حقائق بیان فرماتے ہیں، اُن کو بھی مثال اور دلنشینی کی خاطر عشقِ مجازی کا پیرایہ کہیں کہیں اختیار کرنا پڑا، شاہنامہ اور سکندر نامہ میں بھی رزم و رجز کے ساتھ ساتھ حسن و محبت کا چٹخارہ ملتا ہے، اور تو اور شیخ سعدی گلستاں میں حکمت و موعظت کے سادہ مضامین بیان کرتے کرتے "عشق و جوانی" کی شوخیٔ فکر پر اُتر آتے ہیں، رباعیوں میں بھی فلسفیانہ مضامین کے ساتھ "تغزل" ہم رکاب رہتا ہے، حضرت ابو سعید ابو الخیر جیسے صوفی رباعی گو کے یہاں

بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

فردوسی جس کے ہاتھ میں گرز وسناں نظر آتے ہیں، اُس کی آرزو کے ذرا تیور دیکھئے :۔

ازیں پنج بیش روئے رغبت متاب
شب و شاہد و شہد و شمع و شراب

غیاثائے شیرازی سوتے میں محبوب کے لب چوم کر کہتا ہے کہ آہا! چوری کا گڑ کس قدر میٹھا ہوتا ہے

خفتہ بودی کہ لبت بوسیدم
قندِ دزدی چہ قدر شیرین است

سعدی جیسا پاکباز شاعر کہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں کہ جو حلال اور حرام میں تمیز نہ کرسکے ہاں! ہاں میں جانتا ہوں کہ تیرے ساتھ تو شراب بھی حلال ہے اور تیرے بغیر پانی بھی حرام ہے :۔

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم
شراب باتو حلال است و آب بے تو حرام

اور حافظ شیرازی تو خوب کھُل کر ساقی سے شراب مانگتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ گزر گیا، اور صراحی و جام کے بغیر جو وقت گزرا ہے آؤ اُس کمی کی تلافی کرلیں :۔

ساقی بیار بادہ کہ ماہِ صیام رفت
در دہ قدح کہ موسمِ ناموس و نام رفت
وقتِ عزیز رفت بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

ہم مانتے ہیں کہ یہ لوگ "وہ" نہ تھے، جس "کا شعروں سے اظہار ہوتا ہے، مگر ان استعاروں اور تشبیہوں کو کیا کریں کہ ان سے بوئے شراب ہی آتی ہے، اب ہر شخص کی قوتِ شامہ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اکبر کی جیسی تو ہو نہیں سکتی کہ جس پر میخانہ معرفت کے در باز ہوں۔

زبان کی فطری خصوصیتیں بھی شعر و ادب پر بہت کچھ اثر انداز ہوتی ہیں فارسی زبان میں قدرتی طور پر قیامت کی گھلاوٹ اور مٹھاس موجود ہے، جو شاعری میں آکر اور نکھر گئی بھول تو بھول وہاں کے شہروں اور مقاموں کے ناموں میں کتنی حلاوت اور نغمگی پائی جاتی ہے ـــــــــ مثلاً بادغیس، شیراز، قزوین، مشہد، غزنین، سمرقند، بخارا، گلگشتِ سنجر، بلخ، چغان، دیلم، طوس، اصفہان یہی شیرینی اور نغمگی فارسی شاعری کو پُرسوز اور کیف انگیز بناتی چلی گئی۔

## اُردو اور فارسی غزل

ہندوستان میں غزل ایران ہی سے آئی اور اُردو شاعری فارسی شاعری سے بہت کچھ اثر انداز ہوئی ـــــــــ یہاں یہ بحث نامناسب نہیں بلکہ برمحل اور دلچسپ رہے گی کہ اُردو غزل کیا فارسی غزل کی برابر پہونچ گئی؟ یہ بڑی نازک بحث اور ذمہ دارانہ گفتگو ہے، اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا اور تول تول کر بات کہی جائے گی۔

فارسی غزل پر ایک ہزار کی مدت گزری ہے اور اُردو غزل کی عمر بہت سے بہت دو سو سال کی ہے تو آٹھ سو سال کے تفاوت کے لحاظ سے اُردو غزل نے جو ترقی کی ہے اور اُس کا سرمایہ ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے اور اس اعتبار سے

ے موجودہ ایران کے جغرافیہ پر گزشتہ زمانہ کے ایران اور فارسی زبان کے حدود عمل کا قیاس نہ کرنا چاہیے!

اُردو غزل، فارسی غزل کے دوش بدوش نظر آتی ہو ـــــ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری سے کچھ چیزیں مُستعار بھی لی ہیں یہاں تک کہ وہ اُس کی اپنی ملکیت ( Property ) ہوگئیں۔

نرگسِ نیم باز، گیسوئے سنبلیں، رفتارِ کبک، گردنِ آہو، غزالِ رم خوردہ، جعدِ مشکیں، زُلفِ تابدار، طوافِ حرم، پرستشِ اصنام، اعتکافِ صومعہ، گردشِ جام، قلقلِ مینا، حُسنِ میفروش، التفاتِ ساقی، ہمہ اوست، از ہمہ اوست چراغِ دیر، شمعِ کعبہ، تاریکیٔ شب ہجر ـــــ اس انداز کی بہت سی ڈھلی ڈھلائی ترکیبیں اردو میں آگئیں، قبول کرلی گئیں، اُنھیں اپنا لیا گیا ـــــ پھر قمری و شمشاد، گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے عشق و وارفتگی کے تصورات، قیس و لیلیٰ اور فرہاد و شیریں کی داستانِ محبت نے اردو غزل میں جان ڈال دی، الفاظ اور ترکیبیں ہی نہیں اُردو شاعری کے بعض موضوعات تک فارسی شاعری کے رہینِ منت ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہی نہیں کم ظرفی اور احسان ناشناسی کی دلیل ہو۔

بھارت ورش کے راجاؤں کے محلوں میں تو ڈیوٹ اور دیپک جلا کرتے تھے، شمع تو ایران سے یہاں آئی، اسی طرح "بزم و شبستاں" کے بہت سے لوازم عجم کی بدولت عام ہوئے اور کیا عجب ہو کہ شراب میں گلاب ملا کر پینا بھی ایرانیوں ہی نے بھارت باسیوں کو سکھایا ہو، پھر اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے فارسی میں تھوڑی بہت فکرِ سخن نہ کی ہو، بہرحال فارسی سے تعلقِ خاطر ہر دور میں باقی رہا، اور وہاں کے اثرات قبول کئے جاتے رہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اُردو غزل میں اوریجنلٹی پائی ہی نہیں جاتی اور اُس کا پورا سرمایۂ متاعِ دگراں ہو، اُردو کے غزل گو شعرا نے یقیناً خود اپنے ذاتی خیالات بھی پیش کئے ہیں جن میں سے بعض تخیلات کی ایرانی شعرا کو ہوا بھی نہیں لگی ـــــ مگر یہ بھی امرِ واقعہ ہو کہ اُردو غزل کے ہر "خیال" کے بارے میں پُوری قطعیت اور کامل ذمہ داری کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خیال اچھوتا اور تخلیقی ہو، ہم پر خود یہ کیفیت گزری ہو اور ہم نے تجربہ کیا ہو کہ اُردو غزل کے جس خیال کو ہم اوریجنل سمجھ رہے تھے، فارسی شاعری میں وہ ہمیں مل گیا۔

فانیؔ بدایونی کی غزل کا کتنا دل نشین مطلع ہے :ـــ

ع　اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہو خواب ہو دیوانے کا

محمد بد کہتا ہو :ـــ

ع　من گنگ خواب دیدہ و عالم تمام کر　　من عاجزم زگفتن وخلق از شنیدنش

کوئی شک نہیں کہ فانیؔ کا مطلع فارسی شعر سے بلند اور نازک تر ہے مگر فانیؔ کے خیال کا ماخذ یہی شعر ہو اگرچہ فانیؔ تک غالباً یہ شعر نہیں پہونچا۔

اصغرؔ گونڈوی کے اس شعر :ـــ

کیا مرے حال پہ سچ مچ اُنھیں غم تھا قاصد　　تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اُردو غزل میں آنسو کو ستارہ سب سے پہلے اصغرؔ نے نظم کیا ہو، مگر جامیؔ کے اس شعر کے بعد :ـــ

ریزم زمژہ کوکب بے ماہ رُخت شب ہا

تاریک شبے دارم، باایں ہمہ کوکب ہا

لہ اپنے تصورات کے ساتھ !

سنغ کے شعر کا شرفِ اوّلیت مجروح ہو گیا۔
اقبال کہتا ہے :۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

مگر مسعود سعد سلمان، بہت پہلے کہہ گیا :۔

کم کن بر عندلیب و طاؤس درنگ — کانجا ہمہ آواز ست ایں جا ہمہ رنگ

مگر اس اظہارِ حقیقت میں ہم کسی انکسار سے کام نہ لیں گے کہ بعض خاص خاص موضوعات پر اگر فارسی اور اردو شعروں کا موازنہ کیا جائے تو اردو زبان کے شعروں کا پلّہ بھاری رہے گا ——— مثلاً "رشک" اردو اور فارسی غزل کا خاص موضوع ہے، جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے، شیدائی اصفہانی کا یہ "خیال" کہ جب میں کسی کو سر جھکائے ہوئے سوچتا دیکھتا ہوں تو اس غم کے مارے ٹھٹکا جاتا ہوں کہ وہ کہیں تیرے ہی (محبوب) خیال میں ڈوبا ہوا نہ ہو ——— نادر ترین خیال ہے جو کسی دوسرے فارسی شاعر کے یہاں ہمیں نہیں ملا، مگر غالب کے اس شعر نے :۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

شیدائی کے شعر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، اور "رشک" کے موضوع پر غالب کے شعر سے بہتر شعر فارسی شاعری میں ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔

ان تمام واقعات کو یکجا کرنے کے بعد ہمارا آخری فیصلہ یہ ہے کہ اردو غزل مجموعی طور پر فارسی غزل کی برابری نہیں کر سکتی، ہاں! یہ ضرور ہے کہ اردو غزل نے فارسی غزل کی سرحد کو چھو ضرور لیا ہے، اس سلسلہ میں فارسی اشعار کے چند نمونے ہم پیش کرتے ہیں ——— لیکن اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان دنوں ایران میں جو غزل کہی جا رہی ہے، موجودہ اردو غزل اس سے بہت بلند ہے۔

## فارسی اشعار

کمال الدین اسمٰعیل اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ غزال نے رم کرنا، لوٹ پڑنا اور مڑ کر دیکھنا تجھ سے سیکھا ہے

؎ آہو ز تو آموخت بہ ہنگام دویدن — رم کردن و برگشتن و واپس نگریدن

شاہی سبزواری کہتا ہے کہ سروِ راست قامت نے چمن میں ناز سے گردن اٹھائی تھی کہ تیرے قد کو دیکھتے ہی شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔

؎ سروِ سہی کہ خاست بطرفِ چمن زناز — چوں دید شکلِ قدِّ ترا بر زمیں نشست

(اغری) :——— تیرے قد کو خامۂ تقدیر سالہا سال تک کھینچتا رہا، تیرا قامت چونکہ قیامت تھا اس لئے دیر میں جا کر بن پایا :۔ ؎ سالہا قدِ ترا خامۂ تقدیر کشید — قامتت بود قیامت کہ چنیں دیر کشید

سعدی :——— اے میرے محبوب! جب تو گرم رفتار ہو تو سرو کا اس وقت کھڑا رہنا ہی اچھا اور جب تو بول رہا ہو تو طوطی کے لئے خاموش رہنے ہی میں بھلائی ہے۔

؎ سرو ایستادہ بہ چو تو رفتار می کنی — طوطی خموش بہ چو تو گفتار می کنی

نامعلوم ایرانی شاعر :——— ہر تو نے اگر جلوہ دکھایا ہے تو پھر تو بھی اپنے خمِ ابرو کو ظاہر کر دے تلوار کا جواب تلوار

ہی سے دینا چاہیئے۔

؎ ماہِ نو جلوہ اگر کرد تو ابرو بنما  می تواں داد بہ شمشیر، جواب شمشیر

نامعلوم:۔ معشوق کے ابروئے عرق آلود کا سامنا ہوگیا، فریاد! کہ مجھے شمشیر آبدار نے مار ڈالا ۔۔ اس شعر کا پورا طلسم "شمشیر آبدار" میں بند ہے۔

؎ بہ ابروئے عرق آلودہ دوچار شدم  فغاں! کہ کشتۂ شمشیر آبدار شوم

فروغی بسطامی:۔ میرا دل تیری پہلی نظر ہی کا اسیر ہو کر رہ گیا اب اُس بیچارے شکار کو دوسرا زخم کیوں لگاتا ہے جو خود خون میں تڑپ رہا ہے۔

؎ دل بہ نگاہِ اولیں گشت اسیر چشم تو  زخم دگر چہ می زنی صید بخوں طپیدہ را

جمال الدین سلمان:۔ تیری چشمِ مست نے خنجرِ مژگاں سے ایک عالم کو تباہ کر ڈالا ۔۔ اس طرح کے مست و شرارکو کہیں کوئی خنجر دیا کرتا ہے۔

؎ چشمت بہ خنجرِ مژہ عالم خراب کرد  کس خنجر کشیدہ بہ مستے چناں دہد[1]!

حافظ شیرازی:۔ تیری سیاہ پلکوں نے میرے دین وایمان میں ہزاروں رخنے ڈال دیئے، آ ادھر آ تیری دُکھی ہوئی آنکھوں سے درد و تکان کو چُن لوں۔

؎ بہ مژگانِ سیہ کردی ہزاراں رخنہ در دینم  بیا کز چشم بیمارت ہزاراں درد برچینم

سعدی:۔ میں نے کہا تھا کہ جب تو آئے گا تو اپنا غم میں تجھ سے کہوں گا ۔۔ مگر اس کو کیا کہوں کہ جب تو میرے پاس آتا ہے تو غم دل میں رہنے ہی نہیں پاتا

؎ گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم  چہ گویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

سنائی غزنوی:۔ عشق کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس منزل میں شکوہ و شکایت کیسی!

؎ عشق بازیچہ و حکایت نیست  در رہِ عاشقی شکایت نیست

صائب:۔ بیانِ عشق کے لئے بات چیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس ذرا نظر سے نظر مل جائے یہی بہت ہے۔

؎ اظہارِ عشق را بہ سخن احتیاج نیست  چندانکہ شد نگہ بہ نگہ آشنا بس است

نامعلوم:۔ (شعر کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے، اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ بعض اولیا، اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندے سیکڑوں میل کی مسافت ذرا سی دیر میں طے کر لیتے ہیں اسے "طے ارض" کہتے ہیں، شاعر نے اس سے "طے لسان" کی اصطلاح تراشی، یعنی جو بات کہ بہت سے لفظوں میں کہی جا سکتی ہو وہ ذرا سے اشارے میں ادا ہو جائے ۔۔) تو شاعر کہتا ہے کہ عشق کو "طے لسان" حاصل ہے کہ وہ بات جو سو سال میں کہی جانی چاہیئے، دوست اپنے دوست سے پلک مارتے میں کہہ دیتا ہے

؎ عشق را طے لسانیست کہ صد سالہ سخن  دوست با دوست بیک چشم زدن میگوید

[1] بھاشا کا یہ دوہا بھی یاد کر لیجئے:۔ ایک تو نیناں مدہ بھرے دوجے انجن سار
ارے باورے دیت ہیں متوارے ہتھیار

عراقی ہمدانی :- دنیا میں جہاں کہیں بھی دردِ دل پایا جاتا تھا، اُسے ایک جگہ اکٹھا کیا اور اُس کا "عشق" نام رکھ دیا۔

بہ عالم ہر کجا دردِ دلی بود — ہم کردند و عشقش نام کردند

سعدی :- اس شعر کا خود ہی مزہ لیجئے، میں شرح کروں گا تو اس کی لطافت جاتی رہے گی

چہ خوش است بوئے عشق از نفسِ نیاز منداں — دل از انتظار خونیں دہن از امید خنداں

حزیں لاہیجانی :- بلبل کا رونا دھونا اس وجہ سے ہے کہ وہ نو آموزِ عشق ہے، پروانہ سے ہم نے ایک ذرا سی آواز بھی نہیں سُنی (یہ اُس کی پختہ کاری کی دلیل ہے)۔

نالیدنِ بلبل بہ نو آموزیِ عشقست — ہرگز نہ شنیدیم ز پروانہ صدائے

ملا شانی تکلو :- منکرانِ محبت کی نماز ہرگز قبول نہیں ہوتی، چاہے وہ آبِ زمزم سے سو بار وضو کیوں نہ کریں

طاعاتِ منکرانِ محبت قبول نیست — صد بار اگر بہ چشمۂ زمزم وضو کنند

عبرت نائینی :- میری عقل تو کوئے دوست میں رہبری کرنے سے معذور ہے، اے عشق! تو ہی چراغِ ہدایت جلاکر راستہ دکھا۔

عقلم بکوئے دوست ہدایت نمی کند — اے عشق بر فروز چراغِ ہدایتے

حافظ :- لوگ کہتے ہیں کہ پتھر صبر کرتے کرتے لعل بن جاتا ہے۔ ہاں! بن جاتا ہے مگر خونِ جگر سے بنتا ہے

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر — آرے شود و لیک بخونِ جگر شود

تسلی کاشی :- لوگ کہتے ہیں کہ بہار آئی، پھول کھلے، اور دی کا مہینہ گزر گیا، لیکن تیرے بغیر ہمیں اس کا ہوش ہی نہیں کہ کون آیا اور کون چلا گیا۔

گویند بہارے شد و گل آمد و دے رفت — بے تو نہ دانم کہ کے آمد و کے رفت

صبوحی چغتائی :- تو کسی پر عاشق نہیں ہوا ہجر کے صدمے تو نے نہیں اُٹھائے — تو پھر تیرے آگے کوئی فرقت کا دُکھ درد کیوں بیان کرے (اس لئے کہ جس کی بوائی بھی نہیں پھٹی وہ پرائی پیر کیا جانے)

عاشق نشدی محنتِ ہجراں نہ کشیدی — کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

فروغی قزوینی :- میں اپنے دل و دیدہ کو آخر کس چیز میں لگائے رکھوں۔ .. جبکہ دل ہر وقت تجھے چاہتا ہے اور آنکھ ہر لمحہ تجھے دیکھنے کی آرزو رکھتی ہے۔

بچہ مشغول کنم دیدہ و دل را کہ مدام — دل ترا می طلبد دیدہ ترا می خواہد

طہٰ نائینی :- میں نے جس کسی سے بھی تیری فرقت کے غم کو بیان کیا، اُس نے مجھ غریب کے مر جانے کی دُعا مانگی

دردِ غمِ ہجرِ تو بہ ہر کس کہ بگفتم — از بہرِ ہلاکِ من بیچارہ دُعا کرد

شیخ علی حزیں :- میں نے بلبل سے پوچھا کہ دردِ فراق کا علاج کیا ہے؟ — اس کے جواب میں وہ شاخِ گل سے زمین پر گری، تڑپی اور مر گئی۔

گفتم بہ بلبلے کہ علاجِ فراق چیست — از شاخِ گُل بخاک فتاد و طپید و مُرد

نامعلوم :- شاعر محبوب کو عالمِ تصور میں مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو میری آنکھوں سے دُور ہو گیا مگر تیری

یاد کا نقش دل سے نہیں مٹا، جیسے شیشے سے (عرق) گلاب کے جانے کے بعد اُس کی خوشبو باقی رہ جاتی ہے۔

؎ رفتی ز چشم و نقشِ تو از دل نمی رود　　از شیشہ گر گلاب رود بو نمی رود

مرتضیٰ قلی شاملو: — میں راہِ شوق میں اے دوست! تیرے لئے اس قدر شدت اور بے تابی کے ساتھ منتظر ہوں کہ اگر تو جلدی بھی آگیا تو پھر بھی دیر ہی ہو جائے گی (شاید دنیا کی شاعری میں یہ شعر اپنی جگہ منفرد ہو)

؎ آن چنان منتظرم در رہِ شوق　　کہ اگر زود بیائی دیر است

سنائی غزنوی: — تیری وصل کی اُمید ہی نے میری عمر بڑھا دی، نہ جانے خود وصل کیا چیز ہوگا جس کی اُمید ایسی ہے۔

؎ اُمیدِ وصالِ تو مرا عمر بیافزود　　خود وصل چہ چیز است کہ اُمید چنین است

نامعلوم: — آج وصل کا دن ہے، آؤ وصل ہی کی باتیں کریں، ہجر و فراق کی باتیں دوسری راتوں کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔

؎ روزِ وصلست بیا تا سخن از وصل کنیم　　قصۂ ہجر گذاریم بہ شب ہائے دگر

صائب: — مجھے تیری یاد سے چھین کر لے گیا اور تجھے میری آنکھوں کے آگے سے! اب اس سے بڑھ کر زمانہ اور ظلم کیا کرے گا۔

؎ مرا ز یادِ تو بُرد و ترا ز دیدۂ من　　ستم زمانہ ازیں بیشتر چہ خواہد کرد

صائب: — آسمان کی گردش بُرے اور بھلے کو نہیں پہنچانتی، جس طرح چکی گیہوں اور جو میں امتیاز نہیں کرتی۔

؎ گردشِ چرخ بد و نیک ز ہم نشناسد　　آسیا تفرقہ ہم نکند گندم و جو

فخر گیلانی: — اگر میرے دردِ دل کو تقسیم کیا جائے تو دُنیا میں ایک شخص بھی بے درد نہ رہے۔

؎ اگر دردِ دلم قسمت تواں کرد　　نماند در جہاں یک جان بیدرد

فصیحی ہروی: — میں ایسی گیلی لکڑی ہوں کہ مجھے باغ سے کاٹ لیا گیا ہے.. اب حالت یہ ہے کہ گلستاں سے میں محروم ہو گئی اور آگ مجھے قبول نہیں کرتی۔

؎ خارِ ترم کہ تازہ ز باغم دررودہ اند　　محرومِ بوستانم و مردودِ آتشم

صفائی نراقی: — تو سر سے پیر تک حسن و لطافت کا آئینہ ہے.. مگر افسوس ہے کہ تیری آنکھ اور لبوں میں صلح و صفائی نہیں ہے یعنی زبان کچھ کہتی ہے اور آنکھ کچھ اور اشارہ کرتی ہے۔

؎ سر تا قدم آئینۂ حسنی و لطافت　　افسوس کہ در چشم و لبت صُلح و صفا نیست

دھقانی اصفہانی: — جب تک میرے پر و بال رہے تو نے مجھے دام سے رہا نہ کیا.. اب آج مجھے رہائی دے کر نکال رہا ہے جبکہ میرے پر و بال نہیں رہے۔

؎ تا بال و پرم بود ز دامم نرہاندی　　امروز رہاندی کہ مرا بال و پرے نیست

میر اصلی قُمی: — لوگ نصیحت کرتے ہیں کہ اُس بُتِ نامہربان کو کہیں دل نہ بیٹھنا۔ لیکن وہ میرا دل

اس زمانہ میں چھین لیکر گیا جب وہ نامہربان نہ تھا۔

گو بیند دل بہ آں بت نامہرباں مدہ — دل آں زماں ربود کہ نامہرباں نہ بود

شاہی سبزواری:— تیرا یہ گمان ہو کہ میرا دل کوئی دوسرا دلبر لے گیا ہو! خوب! میں تیرے غم میں مرا جا رہا ہوں، اور تو کسی دوسرے ہی خیال میں ہو۔

ترا گماں کہ دلم بُردہ دلستانِ دگر — من از غمِ تو ہلاک و تو در گمانِ دگر

سعدی:— قاعدہ ہے کہ دشمنوں کی شکایت، دوستوں کے پاس لے جاتے ہیں، مگر جب دوست ہی دشمن ہوگیا تو میں پھر شکایت کہاں لے جاؤں۔

از دشمناں برند شکایت بدوستاں — گر دوست دشمنست شکایت کجا برم

صہباحی:— دوسرے لوگوں نے مجھے رام کرنے کے لئے ہزاروں دانے بکھیرے مگر میں رام نہ ہوا، اور تو نے ہزاروں پتھر میرے اوپر برسائے مگر میں نے اڑنے کا نام تک نہیں لیا۔

ہزار دانہ فشاندند و رام ایشاں نشدم من — ہزار سنگ بہ بالم زدی و من نپریدم

سعدی:— وہ میرا دوست جب عہدِ دوستی توڑ کر جانے لگا تو میں نے اس کا دامن تھام لیا، وہ کہنے لگا کہ اب تو مجھے خواب میں دیکھا کرنا۔۔۔۔ (ظالم کی سادگی دیکھنا) گویا اس کے بعد مجھے نیند بھی آئے گی۔

آں یار کہ عہدِ دوستی را بشکست — می رفت و منش گرفتہ دامن در دست

می گفت کہ بعد ازیں بخوابم بینی — پنداشت کہ بعد ازو مرا خوابے ہست

نظیری نیشاپوری:— میں نے دفترِ وفا کا ایک ایک حرف دیکھ ڈالا، تمام معشوقوں کے نام اس میں درج ہیں بس ایک تیرا ہی نام نہیں ہے۔

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف — نامِ خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نامِ تو نیست

میر اصلی قمی:— عاشقوں کی نیازمندی، معشوقوں کو ناز نخرے سکھا دیتی ہے۔۔۔ تو سراپا وفا تھا، میں نے (تیرے ناز اٹھا اٹھا کر اور منتیں کر کر کے) تجھے بے وفا بنایا ہے۔

نیازِ عاشقاں معشوق را برناز می دارد — تو سرتاپا وفا بودی ترا من بے وفا کردم

وصال شیرازی:— دشمن کی خاطر تو نے ہم سے بگاڑ لی اور قطع تعلق کر لیا، اے دوست! مرحبا! کیا دوستی کی یہی ریت ہوتی ہے۔

برائے خاطرِ دشمن زما بریدی دوست — طریقِ دوستی این است؟ مرحبا اے دوست!

صائب تبریزی:— آنسو ہی نے میرے رازِ غم کو جستہ جستہ نہیں کہا، بلکہ میرے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ نے بھی غمازی کی، اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بہت کچھ کہہ دیا۔

تنہا نہ اشک رازِ مرا جستہ جستہ گفت — غمازِ رنگ ہم بزبانِ شکستہ گفت

نوعی:— میں نے سوائے دوست کے کسی کا خیال تک نہیں کیا، میں ڈرتا ہوں (اس عادت کی بدولت) کہیں ایسا نہ ہو کہ دوست کو میں دیکھ پاؤں اور کہنے لگوں کہ یہ دوست جیسا ہی ہے۔

ع ز دوست غیر خیالے ندیدم و ترسم — کہ دوست بینم و گویم بدست مانند است

نوری اصفہانی :— تیری محبت کا مریض موت کا زہر اس مزے کے ساتھ پیتا ہے کہ اُسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے

ع مریضِ عشقِ تو زہرِ اجل چناں نوشد — کہ از تصورِ آں آب در دہاں آید

میر مشتاق اصفہانی :— میرا دل جان کر تیرے دام میں پھنس گیا۔۔۔ تو یہ سمجھتا ہے کہ شکار غافل تھا

ع دلم دانستہ در دامِ تو اُفتاد — تو پنداری کہ صید غافلے بود

قسمی افشار :— میں قتل ہو جانے سے نہیں ڈرتا، اس سے ڈرتا ہوں کہ مجھ میں تھوڑی سی جان باقی ہو اور میرا قاتل مجھے چھوڑ کر چلتا بنے۔

ع باکم از کشتہ شدن نیست ازاں می ترسم — کہ ہنوزم رمقے باشد و قاتل برود

یغمائی چغتائی :— میں کانٹوں پر تیری یاد میں اس طرح مزے کے ساتھ چلتا ہوں، جیسے کوئی دیبا و حریر کے فرش پر خوش خوش چلتا ہے۔

ع بر سرِ خار بیادِ تو چناں خوش بروم — کہ کسے خوش بر رود بر سرِ دیبا و حریر

حافظ :— ہر چند کہ میں بوڑھا، کمزور اور خستہ و مضمحل ہو گیا ہوں مگر جب تجھے یاد کرتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں

ع ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم — ہر گہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم

وحشی یافقی :— دل کوئی کبوتر نہیں ہے کہ جہاں سے اڑا پھر وہیں آکر بیٹھ گیا۔ ہم جس گوشۂ بام سے اُڑ گئے پھر وہاں واپس نہیں آتے۔

ع دل نیست کبوتر کہ چو برخاست نشیند — از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

تسکین اصفہانی :— میں نے طفلِ خود نما کی طرح تیرے دفترِ وصال سے ایک حرف پڑھا اور اُسے سو جگہ لکھا— یعنی تیرے ذرا سے التفات کا ہزار جگہ ذکر کیا (بچپن کی خود نمائی میں سادگی ہوتی ہے، ریاکاری کو دخل نہیں ہوتا، یہی حال محبت کی خود نمائی کا ہے —)

ع از دفترِ وصالِ تو چوں طفلِ خود نما — یک حرف خواندہ ایم و بصد جا نوشتہ ایم

ذوقی اردستانی :— کل میں نے بیابانِ جنوں میں جوں ہی قدم رکھا، جنگل کے تمام وحشیوں نے مجھے آکر مبارکباد دی۔

ع در بیابانِ جنوں دوش چو پا بنہادم — وحشیاں جملہ بگفتند مبارک بادم

فیضی دکنی :— شاعر اپنے محبوب سے جس کا ساتھ چھُٹنے والا ہے، کہتا ہے کہ میں تیری طرف جو دیر دیر کے بعد دیکھتا ہوں تو میری اس حرکت سے کہیں رنجیدہ نہ ہو جانا، میں تو خود اپنے کو تجھ سے دور رہنے کا طریقہ سکھا رہا ہوں کہ اس طرح ہجر کی بُری عادت پڑ جائے گی۔

ع گر دیر دیر می نگرم بر رُخت مرنج — خود را بدوریٔ تو بدآموز می کنم

محتشم کاشی :— تمام حسینوں میں سے میں نے تجھے اس لئے چُن لیا کہ تو تمام خوبرویوں کا بادشاہ ہے۔۔۔ تو میں اگرچہ خود تو فقیر ہوں مگر میرا دل بادشاہ ہے۔

ع زنہاں ترا گزیدم کہ شہ بتاں حسنی — من اگرچہ خود گدایم، دلِ بادشاہ دارم

ناطق :- ہم تیری یاد سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہے، یا تو تیرا ذکر کرتے رہے یا تیرا ذکر سنتے رہے۔
؎ ہرگز دمے زیادِ تو غافل نہ بودہ ایم یا گفتہ ایم حرف ترا یا شنیدہ ایم
صائب :- حسینوں کی زبانِ چشم و نگاہ کو جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا، کیونکہ میں نے ان غزالوں کی ایک زمانہ تک رکھوالی کی ہے (اور انھیں چرایا ہے)
؎ کس زبانِ چشمِ خوباں را نمی داند چو من روزگارے ایں غزالاں را شبانی کردہ ام
حافظ :- اس شعر کی لطافت شرح کو برداشت ہی نہیں کر سکتی، مفہوم سادہ اور واضح ہے۔
غنچہ دہانِ من بیا، تنگ دلیٔ من ببیں
بے تو ہنوز زندہ ام سنگ دلیٔ من ببیں
حافظ :- ہم وفا کرتے ہیں، لوگوں کی ملامت برداشت کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں اس لئے کہ کسی کے دل کو رنجیدہ کرنا، ہمارے مذہب میں کفر ہے۔
؎ وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم کہ در طریقتِ ما کافریست رنجیدن
سعدی :- اے طبیب ہمارے علاج کے لئے تو کیوں زحمت اٹھاتا ہے، ہم تو اچھے ہونے سے رہے، تو بلا وجہ بدنام ہو جائے گا۔
؎ زحمت چہ میکشی پیٔ درمانِ ما طبیب ما بہ نمی شویم و تو بدنام میشوی
سیّد علی نیروی :- پلکوں سے راستہ کی گرد و غبار جھاڑنا، ناخنوں سے پتھر کے سخت ٹکڑوں کو پردنا، کال کوٹھری میں کوئی جرم کئے بغیر قتل کا حکم سننا ــــ اس سے اچھا ہے کہ کمینہ آدمیوں کے سامنے چاپلوسی کی کوئی بات کی جائے۔
بہ مژگاں خاکہائے راہ رفتن بناخن سنگ ہائے خارہ سفتن
بہ بے تقصیری اندر حبس تاریک پیامِ حکم قتلِ خود شنفتن
مرا خوشتر بود از یک تملق بہ نزدِ مردمانِ سفلہ گفتن
صائب :- اگرچہ حسینوں کے وعدے پورے نہیں ہوا کرتے مگر جو زندگی انتظار میں کٹ جائے وہ بہت اچھی ہے
؎ اگرچہ وعدۂ خوباں وفا نمی داند خوش آں حیات کہ در انتظار می گزرد
کلیم کاشی :- شوق نے مجھے تیرا کچھ ایسا امیدوار بنا دیا ہے کہ بغیر کسی وعدے کے میں ہر رستہ میں تیرا انتظار کرتا ہوں
؎ شوقم زبسکہ ساختہ امیدوارِ تو بے وعدہ انتظار بہر رہگذر می کنم
دولت شاہ قاچار :- بس ایک دو روز کے آگے پیچھے کا معاملہ ہے، ورنہ آسمان کے ظلم کے سبب جو بپتا دارا پر آکر پڑی، اسی سے سکندر کو دو چار ہونا پڑا (یعنی موت نے دونوں کا قصہ تمام کر دیا)
؎ یک دو روزے پیش و پس شد ورنہ از جورِ سپہر بر سکندر نیز بگذشت آنچہ بر دارا گذشت
پروین اعتصامی :- ایک دن ایک بادشاہ کسی راستہ سے گزرا، اور اس کے دیدار کے شوق میں ایک خلقت امنڈ آئی اور تہلکہ مچ گیا، اسی بھیڑ میں ایک یتیم بچہ کھڑا تھا، اس نے ایک شخص سے پوچھا کہ بادشاہ کے تاج میں جو چیز چمک رہی ہے وہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ہمیں کیا معلوم کہ کیا چیز ہے، دیکھنے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑی

قیمتی چیز ہو، ایک کُبڑی بڑھیا اُس یتیم کے پاس گئی اور بولی یہ میری آنکھ کا آنسو اور تیرے دل کا لہو ہو (جو بادشاہ کے تاج میں چمک رہا ہو)

روزے گزشت بادشہے بر گزر گہے — فریادِ شوق بر سرِ ہر کوی و بام خاست
پرسید زاں میانہ یکے کودکِ یتیم — کیں تابناک چیست کہ بر تاجِ بادشاست
آں یک جواب داد چہ دانیم ما کہ چیست — پیداست ایں قدر کہ متاعِ گراں بہاست
نزدیک رفت پیرزنِ کوز پشت گفت
کیں اشکِ دیدہ من و خونِ دلِ شماست

سعدی:- جس کے پاس مال پونجی ہو وہ چور سے ڈرتا ہو، اہلِ معرفت نے کچھ جمع ہی نہیں کیا اس لئے انھیں کوئی پریشانی ہی نہیں ہے۔

آں کس از دُزد بترسد کہ متاعے دارد — عارفاں جمع نہ کردند پریشانی نیست

ذوقی اردستانی:- کسریٰ کا محل برباد ہوگیا مگر کوہِ بیستوں اپنی جگہ قائم رہا، اس لئے کہ کوہکن کی سچّی محبت پر اُس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

طاقِ کسریٰ شد خراب و بیستوں برجائے ماند — زانکہ اُورا عشقِ پاکِ کوہکن بنیاد بُود

نامعلوم:- مجھے آئینہ کی تیرہ بختی پر حیرت ہوتی ہو کہ وہ تجھے اپنی گود میں لیکر بھی آفتاب نہ بن سکا۔

بہ تیرہ بختیِ آئینہ حیرتے دارم — ترا کشید در آغوش و آفتاب نشد

یادی:- میں نے محبوب سے کہا کہ تیرے کان کے موتی نے میرے جگر کو زخمی کر دیا، اُس نے میری بات اس کان سُنی اور اُس کان اُڑا دی۔

گفتم دُرِ گوشِ تو مرا خستہ جگر کرد — بشنید ازیں گوش و ازاں گوش بدر کرد

ذوقی اردستانی کا ایک شعر کسی شرح و تفصیل کے بغیر اور سُن لیجئے:-

نرگس بہ چمن از صفتِ چشمِ تو آموخت
بیماری و شہلائی و عاشق کُش دیدن

## شعر و اخلاق

جن شعراء کے منتخب اشعار میں نے پیش کئے ہیں اس میں تقریباً ہر دور کے ایرانی شعراء شریک ہیں، یہ کوئی جامع ترین انتخاب نہیں ہے، کوئی زیادہ دقتِ نظر اور کاوش و تحقیق سے کام لے تو ایرانی شاعروں کے منتخب کلام کا ایک مجلّد تیار ہو سکتا ہو، خود تنہا شعر العجم کے اشعار کا انتخاب بہت شگفتہ اور دلچسپ ہوگا۔ اشعار کے ساتھ میں نے شاعروں کے ناموں کے جو حوالے دئیے ہیں بہت ممکن ہو کہ اس میں مجھ سے بھول چوک ہوگئی ہو، میری غلطی پر مجھے مُطلع کیا جائے گا تو میں شکر گزار ہوں گا، شعروں کی تشریح میں بھی تسامح کا امکان ہو مگر میں نے پوری کوشش کی ہو کہ فارسی اشعار کی شرح اُردو داں طبقہ کے مزاج کے مطابق ہو — شرح و ترجمہ میں اکثر شعر کی حقیقی لطافت اور اصل خوبی جاتی رہتی ہے اور بعض شعر تو حباب کی مانند ہوتے ہیں کہ ذرا کسی نے

لہ غالب نے دوسرے انداز سے کہا اور خوب کہا ہے لطاکھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

۱ اور ٹوٹ گیا۔ جس زبان میں شعر کہا جاتا ہے اُس زبان کی کچھ خاص نزاکتیں ہوتی ہیں، جن کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا
بات کوئی فارسی زبان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے، ہر زبان کا یہی معاملہ ہے، میر تقی میر کا مشہور شعر ہے:-

یُوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آبے! ابے او چاک گریباں والے

س "آبے" اور "ابے" کا لُطف ترجمہ میں کہاں باقی رہ سکتا ہے اور "چاک گریباں والے" کی کیفیت ترجمہ
ے والا کس طرح پیدا کر سکے گا۔

فارسی شاعری نے ایران کے اخلاق پر کیا اثر ڈالا؟ یہ ایک بسیط موضوع ہے، اس بحث کو یہاں چھیڑ دیا
و یہ مقالہ نہ جانے اور کتنا طویل ہو جائے اور شاید پھر بھی بات ناتمام رہے گی۔۔ مگر جب بات زبان پر آ ہی گئی
یوں چُپ چاپ گزر جانا بھی ٹھیک نہیں ——— فارسی شاعری میں جہاں رنگ و بو کے ساتھ ہوسناکی
ندت شامل ہو گئی ہے، اُس نے ایران کے اخلاق پر ناخوشگوار اثر ڈالا ——— بات یہ ہے کہ ہوس انگیز چٹخارہ
بات کو غیر محتاط بنا دیتا ہے، اعتدال باقی نہیں رہتا، یہاں تک کہ خیال سے گزر کر عمل تک معاملہ پہنچ جاتا ہے
——— آپ کہیں گے اور وہ "شعریت" کی افادیت۔۔۔ ؟ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ اخلاق بہر حال
یت "سے زیادہ قیمتی چیز ہے، شعریت کا نقصان، لٹریچر کا نقصان ہے اور اخلاق کا زیاں، زندگی کا زیاں ہے"
دب" ( [illegible] ) زندگی کے لئے وجود میں آیا ہے، زندگی "ادب" کے لئے پیدا نہیں
ئی۔

## رف آخر

یہ دور جس سے ہم سب گزر رہے ہیں "کمیت" کے اعتبار سے ترقی پسند مگر "کیفیت" کے لحاظ سے
"تنزل پسند" ہے، جسم نشو و نما پا رہے ہیں لیکن رُوحیں مضمحل ہوتی چلی جا رہی ہیں، ہر طرف ایک ہی جیسا
ں ہے گویا کہ مادرِ گیتی بانجھ ہو گئی ہے اور "بڑے آدمیوں" کی پیدائش رُک گئی ہے، ایران میں تیل کے چشمے نکل آئے جس
ُسے مالا مال کر دیا۔۔ مگر حافظ کے بعد دوسرا حافظ اور سعدی کے بعد دوسرا سعدی پیدا نہ ہو سکا، ہم پاکستان
ہندوستان کے رہنے والے تو گلستان اور بوستان کی زبان، لٹریچر اور طرزِ نگارش سے مانوس اور آشنا ہیں، ایران
وجودہ زبان پر بعض اوقات ایسا دھوکا ہونے لگتا ہے یہ کوئی artificial سی بولی ہے۔!
یہ درست ہے کہ فارسی زبان و ادب پر ہماری رائے مستند نہیں مانی جا سکتی، اہلِ ایران ہماری تنقید پر مسکرانے کا حق
ھتے ہیں کہ یہ "بوئے کچوری" والے ہماری زبان اور لٹریچر کو پرکھنے چلے ہیں ——— مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ
اُردو جاننے والوں کا فارسی سے اس قدر قریبی اور مسلسل ربط رہا ہے کہ ہمارا "وجدان" خدا کے فضل سے
ت مند ہے۔

فارسی زبان و ادب کو حالات کے نئے تقاضوں نے یقیناً وسعت اور ترقی دی ہے، اس میں بہت سے لفظ
فرس" ( Persianised ) کئے گئے ہیں، ادب میں نئے موضوعات
ھی اضافہ ہوا ہے، یہ سب کچھ درست اور بجا۔۔ مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جدید فارسی میں گلستانِ سعدی جیسی
شیرینی نہیں ملتی۔

ایرانی لہجہ بھی ہمیں عجیب سا محسوس ہوتا ہے، مثلاً "گلستاں" کو وہ "گُلِستُن" بولتے ہیں یعنی اوّل تو "اعلان نون" کرتے ہیں پھر آخری نون سے پہلے جو "الف" آتا ہے عموماً اُسے حذف کر دیتے ہیں اور "الف" کی جگہ "واؤ" یا ضمہ (پیش) لگا کر بولتے ہیں۔۔

رسم الخط میں بھی تبدیلی کر دی گئی ہے، "یائے مجہول" (ے) تو قریب قریب غائب ہی ہو گئی ——— چہ قدر کو چقدر ——— عشق است کو عشقست ——— بہ بلبلاں کو ببلبلاں لکھتے ہیں۔ ایران میں آجکل لفظوں کو ملا کر لکھنے اور وصل دینے کا دستور ہے، اس طرح لکھنے میں بعض وقت "ذم" بھی پیدا ہو جاتا ہے مثلاً "بہ راز" کو "براز" لکھا جاتا ہے۔

فارسی کے جو شعراء اشتراکیت سے متاثر ہیں اُن کے کلام میں بے حد خشونت پائی جاتی ہے، اشتراکیت اپنے مزاج کے اعتبار سے "لطافت" اور "پاکیزگی" کی دشمن ہے، مشہور اشتراکی شاعر لاہوتی کا مجموعۂ کلام ہم نے پڑھا اور طرز و بیان کی کرختگی کو محسوس کیا۔

قاچاریوں کے آخری دور میں ایران میں "قومیت" کی تحریک پیدا ہوئی اور ایرانیوں کو قومی عصبیت کے نام پر اُبھارا گیا، اس تحریک میں شاطرانِ فرنگ کا ہاتھ تھا، جو "وحدتِ اسلامی" کو پارہ پارہ کرنے کی سر ا فکر میں رہتے ہیں اور مسلمانوں کو "قوم"، "وطن" اور "نسل و خاندان" کے نام پر اُبھارتے اور اُکساتے رہتے ہیں ——— ڈاکٹر جیکسن اور لارڈ کرزن (جو اُس وقت تک لاٹ صاحب نہیں ہوئے تھے) نے اس فتنہ کو ہوا دی، "قومی عصبیت" کا یہ سلسلہ فردوسی تک پہونچایا گیا کہ فردوسی نے شاہنامہ میں گنے چنے عربی الفاظ استعمال کئے ہیں اور ایران کی قومی زبان کو عربی زبان پر ترجیح دی ہے،

شعر و ادب میں یہ فتنہ اس طرح نمودار ہوا کہ رسم الخط میں عربی حروف بدلنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ آجکل "طہران" کو جو "تہران" لکھتے ہیں یہ اُسی کی یادگار ہے! عروض کے مُوجد عرب تھے "بحروں کے نام اور تقطیع کے اوزان سب کے سب عربی سے عبارت تھے، چنانچہ فارسی میں عربی بحروں کے نام بدل بدل کر رکھے گئے .... مثلاً "ہزج" کا نام "خوشنوا" رکھا اور "فعولن فعولن فعولن فعول" کو "شنودم شنودم شنودم شنود" کہا گیا۔

اُردو ہو یا فارسی اُسے "قاموسِ دُمنجد" نہیں بنانا چاہئے مگر عربی کے جو الفاظ آچکے ہیں اُن کا ترک کرنا بھی مضرت سے خالی نہیں ——— اُردو جاننے والوں کو فارسی اور عربی سے ربط ضرور رکھنا چاہئے کہ بھا شا کی اس پھلواری کو ان دونوں چشموں نے سینچا ہے، اور اُردو کی ٹکسال میں سونا اور چاندی اُنھی کانوں سے آتا ہے ——— اور عربی زبان سے ربط و مناسبت تو ہمارے لئے باعثِ سعادت ہے!

میکش اکبر آبادی

# "حقایق!"

حجاب ہی کا اٹھانا ہے صرف میرا کام
اگرچہ ہے مری ہستی ترے حجاب کا نام

مرے فسوں نے دکھائی ہے تیرے رخ کی سحر
مرے جنوں نے بنائی ہے تیری زلف کی شام

ترے سکوں نے دیا دہر کو تصورِ حشر
کہاں ہے ورنہ مرے اضطراب کا انجام

ہے شمعِ رہگذرِ باد ذوقِ قلب و نظر
نہ عاشقی مری منزل نہ حسن تیرا مقام

ہر اک مقام میں ہشیاریوں کی داد نہ چاہ
یہ غفلتیں بھی ہیں اپنی جگہ بڑا انعام

چمن میں سب سے ملی اور گزر گئی سب سے
لئے ہوئے ہے مری خو نسیم نرم خرام

نہ مار لافِ خودی صاحبانِ دل کے حضور
کہ بیخودی ہی میں پوشیدہ ہے خودی کا مقام

تری نگاہ کی مستی سے دل ہے آوارہ
ہوا خراب اسی میکدے میں میرا جام

چمن میں کر نہ سکیں گے وہ مجھ سے قطعِ نظر
کہ خار میری تمنا ہیں پھول میرا پیام

ترے کرم کا بہت شکریہ مگر اے دوست!
بغیر فصل کی بارش ہے دل کو تیرا پیام

گئے رزیؔ[1] سے سخن فہم سوئے پاکستان
سنائے میکشِ مجبور کس کو اپنا کلام

---

عبدالکریم ثمر

# "معارِف"

ترا یقیں ہے خام تعجب کی بات ہے
عشق اور ناتمام تعجب کی بات ہے

آثارِ سر بلندیٔ انساں کے مٹ گئے
ملت ہے بے امام تعجب کی بات ہے

حرفِ قرار داد کی تصدیق ہو چکی
بدلا نہیں نظام تعجب کی بات ہے

ملت ابھی ہے کشمکشِ زیست میں اسیر
خواجہ بلند بام تعجب کی بات ہے

اس وحدتِ خیال و عقیدہ کے دور میں
تفریقِ خاص و عام تعجب کی بات ہے

کرگس ہو آسماں کی فضاؤں میں پر کشا
شاہیں ہو زیرِ دام تعجب کی بات ہے

مشہور تیری تلخ نوائی ہے اے ثمر
تو اور خوش کلام تعجب کی بات ہے

[1] حضرت رزی جے پوری

عاصی کرنالی

# اہلِ ہوس

دل و نگاہ کی عصمت کو بیچ دیتے ہیں
بہت سے لوگ محبّت کو بیچ دیتے ہیں

گلوں کے رُخ کی جوانی خریدنے کے لئے
کلی کے دل کی نزاکت کو بیچ دیتے ہیں

جہاں بہار کی دوشیزگی کو دیکھ لیا
وہیں جمال کی فطرت کو بیچ دیتے ہیں

جُنوں کی دست درازی کی اوٹ میں اکثر
وقارِ دامنِ عصمت کو بیچ دیتے ہیں

خریدتے ہیں فقط قہقہوں کی شیشہ گری
اور آنسوؤں کی نزاکت کو بیچ دیتے ہیں

فغانِ لب کی بلاغت کو دیکھنے والے
نگاہِ غم کی فصاحت کو بیچ دیتے ہیں

ہوس کا نرخ گراں کر کے تاجرانِ حریص
جوانیوں کی لطافت کو بیچ دیتے ہیں

جو دیکھتے ہیں کہیں کاروانِ حُسن و شباب
ضمیر و دل کی قیادت کو بیچ دیتے ہیں

جہاں ہوس نے کیا مسکرا کے استقبال
وہیں اُصولِ محبّت کو بیچ دیتے ہیں!

مل سعیدی
(ٹونک)

# دو غزلیں

ملے، نشاطِ بہشت کیوں مجھے اپنی عرضِ نیاز میں
مری عرضِ شوق جھلک رہی ہے ترے تبسّمِ ناز میں

ئی فرق ہی نہیں کر سکا میں حقیقت اور مجاز میں
وہی جوہر آئینے میں بھی ہیں جو ہیں فکرِ آئینہ ساز میں

ے پائے شوق کی ہمتوں میں ہیں ترے عشق کی منزلیں
ہیں مقام قرب کے بھی بہت ابھی راہِ دور دراز میں

ی سینے کے عشق کی چوٹوں کو ہیں یاد اپنی وہ نخوتیں
وہ ترے غرور میں عجز سا وہ نیاز سا ترے ناز میں

نمودِ صبحِ ازل ہوئی تو مزاجِ حسن میں حل ہوئی
وہ ادا جو رنگ ہو پھول میں وہ صدا جو نغمہ ہو ساز میں

یہ نگاہِ مطربِ خوشنوا کا اثر ہے بسملِ بے نوا،
کہ میں سن رہا ہوں وہ نغمے بھی جو ابھی ہیں دبے ساز میں

---

آتی ہے ہر طرف سے صدائے درا مجھے
کن مرحلوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے

یا اُن کے دل سے مجھکو بھلایا نہ جا سکے
یا میرے ذہن سے بھی بھلا دے خدا مجھے

یارب جنونِ عشق میں وہ لمحہ اب نہ آئے
محسوس جس میں ہو کہ یہ کیا ہو گیا مجھے

اشکوں میں رنگِ حسن ہو آہوں میں بوئے حسن
لہ اس آ گئی ہے عشق کی آب و ہوا مجھے

پھر کوئی سجدہ فرض نہیں رہتا جس کے بعد
کرنا ہے تیرے در پہ وہ سجدہ ادا مجھے

بسمل کچھ اُن کی بزم کی مجبوریاں نہ پوچھ
رونے کی بات پر بھی تو ہنسنا پڑا مجھے

# ترکش

غزلیں
حاصل پوری

سنورے تو دشت کو چمنستاں بنا دیا
بگڑے تو گلستاں کو بیاباں بنا دیا

دل کو محیطِ عالمِ امکاں بنا دیا
ذرّہ کو آفتاب درخشاں بنا دیا

مرا ہوش میں ہو کے مدہوش رہنا
حقیقت میں ہے "خود فراموش" رہنا

کوئی شاکی ہو سر رکھنے کو سنگِ در نہیں ملتا
جو سنگِ در کے قابل ہو ہمیں وہ سر نہیں ملتا

خدا والوں سے راحت دُور رہتی ہے زمانہ میں،
جنھیں "تکیہ" خدا پر ہو انھیں "بستر" نہیں ملتا

# تیرونشتر

شفقت کاظمی

تیرے حسن و جمال کی دُنیا
ماورائے خیال کی دُنیا

تیرا عالم نشاط کا عالم!
میری دُنیا ملال کی دُنیا

غم سے خائف ہے عیش کی محتاج
کاظمی اہلِ حال کی دُنیا

قیدِ ہستی سے چھوٹنا آساں
تیرے غم سے مگر نجات نہیں

اُن کو منظور ہے کرم نہ ستم
میری قسمت میں کوئی بات نہیں

# فتراک

عالم
اکبرآبادی

دیکھی تھی کس نے پہلے شکایت کئے بغیر
یہ دلکشی جو حسنِ پشیماں میں آگئی

اہلِ غم پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے دوست
چاند کے ہوتے ہوئے بھی چاندنی ہوتی نہیں

حوصلہ تھا تو قیامت سے بھی ٹکر لی تھی
آج فتنہ بھی قیامت نظر آتا ہے مجھے

تمھیں حشر میں دیکھنے آگئے
نہ حوروں کی خواہش، نہ جنت کی چاہ

غمِ جستجو ہاں! کوئی فیصلہ
ادھر میکدہ ہے اُدھر خانقاہ

مرا غم کدہ منتظر، منتظر
فقیروں کے گھر بھی کبھی بادشاہ

ور قریشی دہلوی

## کچھ اور!

خرد کو چاہیئے عرفاں کی روشنی کچھ اور
فضائے دہر میں باقی ہے تیرگی کچھ اور

طریقِ عشق میں جائز ہے آج مکر و فریب
کہ بزمِ نو میں ہے آئینِ عاشقی کچھ اور

حدیثِ عشق تو ماضی کی اک حکایت ہے
جدید عصر میں ہے طرزِ دلبری کچھ اور

ابھی ہے خام زمانے کی سعیٔ آزادی
فروغ پائے گی دنیا میں خودسری کچھ اور

ابھی نفاق پہ قائم ہے عدل کی میزان
بڑھے گی خون کے پیاسوں کی تشنگی کچھ اور

حیات خود ہی گریزاں ہے اپنی منزل سے
فریب دے گا ابھی عیشِ عارضی کچھ اور

ابھی تو راہزنی رہبری کے بھیس میں ہے
ابھی تو رنگ دکھائے گی گمرہی کچھ اور

ابھی افق پہ نمایاں ہے ایک سرخ لکیر
کہ تیز ہوگی مصائب کی برہمی کچھ اور

بتا رہی ہیں زمانے کی پستیاں خاور
کہ سربلند ابھی ہوگا آدمی کچھ اور

---

## سوزِ ناتمام

ماہر القادری

مسلماں صف بہ صف شانہ بہ شانہ
لرز اٹھا گروہِ کافرانہ

نہ جا اس پر کہ دنیا کیا کہے گی
زمانہ کی روش ہے عامیانہ

خدا حاضر ترے قلب و نظر میں
تعارف ہے اگرچہ غائبانہ

---

تو نیاز مندیوں پر ابھی ناز کر رہا ہے
ابھی غزنوی نہیں ہے تری فطرتِ ایازی

افسانہ

ماہر القادری

# خندق سے بھی نیچے

آپ کا حکم سر آنکھوں پر! مگر میں کیا کروں کہ غیر مردوں کے سامنے آتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، میری ہمت ہی نہیں
——— نجمہ کے اس جواب پر قاسم آدھ جلی سگریٹ کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے جھنجلا کر بولا:—
"پھر وہی شرم کا ڈھکڑا، غیرت کا عذر، خودداری کا شاخسانہ! نجمہ ان رسمی باتوں میں اب کوئی جان باقی نہیں ہے،
پرانے ہو چکے، جس شاخ پر رسم و رواج کی آشیاں بندی ہوتی تھی وہ شاخ ہی مرجھا گئی، اب ایک نئی دنیا اور ایک نئے
نے جنم لیا ہے، آج کا انسان اپنے خیالات اور افکار کے اعتبار سے بالکل "جدید انسان" ہے، برائی بھلائی کی قدریں
شرم و غیرت کا معیار بدل چکا ہے، پرانی باتیں اس نئی دنیا میں اب چل نہیں سکتیں، زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دینا
گا!

نجمہ سہمی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی، شوہر کے تیور عتاب آلود سے تھے، کچھ اور کہتی تو قاسم کے غصہ کا پارہ اور چڑھ جاتا،
رہنے ہی میں بھلائی تھی، جب کوئی آدمی یہ بات طے ہی کر لے کہ چاہے کچھ کیوں نہ ہو جائے مجھے یہی کرنا ہے ———
دلیلوں کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے، ہٹ دھرمی، کٹ حجتی اور خود پسندی کے آگے بقراط و افلاطون کی
بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

نجمہ کی خاموشی سے قاسم کی تسلی نہیں ہوئی، وہ آج دو ٹوک بات چاہتا تھا، انکار یا اقرار، پردہ، یا بے پردگی،
یا انجمن آرائی، گھر کی چہار دیواری یا کلب گھروں باغیچوں اور سیر گاہوں کی کھلی ہوئی فضا، برقعہ کی کفنی برہنہ
یاں اور کھلے ہوئے شانے ——— نجمہ نے ہامی بھر لی اس بات کی کہ آپ کی مرضی کی تابعداری کی جائے
قرار کرتے میں اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی، ضمیر کا جھٹکا رک نہ سکا، یہ جام اس کے لئے انتہائی تلخ تھا
گوارا کرنا پڑا۔

اس گفتگو کے کوئی چھ سات دن بعد شہر کے سول سرجن کے یہاں ایک پارٹی تھی، قاسم اور مسز قاسم۔ دونوں
م دعوتی کارڈ آیا ——— مشترکہ کارڈ، اس لئے کہ میاں بیوی تعلقات کے ایک ہی رشتہ میں بندھے ہوتے
ان کے درمیان کسی قسم کی غیریت اور اجنبیت نہیں ہوتی ——— قاسم نے بیوی سے کہہ دیا بلکہ الٹی میٹم دیدیا
ہیں اس پارٹی میں میرے ساتھ چلنا ہوگا، کسی قسم کا عذر بھی نہ سنا جائے گا۔

قاسم کو پارٹی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر کل کے ہوتے، آج ہی وہ دن آجائے اور نجمہ کی یہ تمنا کہ وقت
یا دل بالکل سن ہو جائیں رفتار زمانہ ٹھہرا دی جائے ——— مگر وقت کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پروا کب
ہے، ایک لاکھ آنسو اور ایک کروڑ قہقہے بھی زمانہ کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، قدرت کے کارخانہ ِ

آدمی کا بس کہاں چلتا ہے، وقت کا دھارا سدا ایک ہی رفتار سے بہتا رہتا ہے۔

پارٹی کا دن آیا، قاسم نے بیوی کے لئے جوڑا منتخب کیا کہ فلاں رنگ کی ساری پہننا وہ آویزے اچھے رہیں گے، یہ جوتا مناسب ہے، کلائی کے لئے یہ سی گھڑی موزوں ہے، ضروری ہدایتیں ایک ایک کرکے دے دی گئیں، نجمہ نے جب پارٹی میں جانا ہی قبول کر لیا تو قاسم کے پسند کئے ہوئے لباس کی مخالفت کیوں کرتی، ہر چیز اُسی طرح پہنی جس طرح بتائی گئی تھی۔

پارٹی کے وقت سے پندرہ بیس منٹ پہلے وکٹوریہ منگوائی گئی اور دونوں میاں بیوی اس میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے، نجمہ کی حالت طائرِ نو گرفتار کی طرح تھی سکڑی، سمٹی اور بھنچی ہوئی بیٹھی تھی جیسے کہ وہ یہاں خود نہیں آئی بلکہ لائی گئی ہے، فرطِ غیرت اور شدتِ حیا نے اُس کے چہرے کو اور زیادہ دل کش بنا دیا تھا، جذبات کی کشمکش رُخسار کی سُرخی میں جھلک رہی تھی۔

سول سرجن کی کوٹھی کے لان پر پارٹی کا انتظام تھا، سبزہ زار کے وسط میں خوشنما سا دروازہ تھا، وہاں مہمانوں کا استقبال کیا جا رہا تھا، قاسم اپنی بیوی کو لیکر وکٹوریہ سے اترا اور سول سرجن سے نجمہ کا تعارف کرایا، نجمہ کی آنکھیں شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھیں، اُس کا بس چلتا تو وہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہوتی، اُس کے پاؤں بوجھل ہوگئے تھے، سینہ دھک دھک کر رہا تھا، اور ہونٹ جیسے کئی وقت سے انہیں پانی میسر نہیں ہوا۔

پارٹی میں انٹروڈکشن کا سلسلہ شروع ہوا —— یہ مس گنگولی ہیں، یہ مسز جیکسن ہیں، یہ بیگم شاہد ہیں، یہ شریمتی مایا دیو، ہیں، یہ وہ صاحبہ ہیں جنھوں نے موسیقی کے مقابلہ میں فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے، یہ بیڈمنٹن کی چیمپین ہیں، یہ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ پولس ہیں، آپ انکم ٹیکس افیسر ہیں، یہ ہیں میرے دوست مسٹر ریاض برڈ اینڈ کمپنی کے جنرل منیجر اور آپ حضرتِ درد شہر کے مشہور شاعر جن کی غزلیں اور گیت فلموں میں گائے جاتے ہیں —— نجمہ ہر تعارف کو محسوس کر رہی تھی کہ اُس کی غیرت کا یہ منھ چڑایا جا رہا ہے، آن پھنسنے کی بات تھی، شوہر کی دلدہی کے لئے آج اُسے انگاروں پر چلنا پڑا

وہ دونوں دن چھپے پارٹی سے چل کر گھر پہونچے، قاسم نے راستہ ہی سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا تھا — اُن کی باتیں

—— نجمہ! پارٹی میں کچھ زندگی محسوس کی! کیا بہار تھی کیا لطف تھا، آدمیوں کے دم کی تو ساری رونق ہے، پارٹیوں میں شریک ہو کر میری تو زندگی بڑھ جاتی ہے۔

—— مگر میری زندگی تو پارٹی میں جا کر گھٹ گئی، دو چار سال کم ہوگئے میری عمر کے! اُس لانبے آدمی نے، نہ جانے کیا نام بتایا تھا اُس کا آپ نے (مسٹر نورانی —— قاسم نے جواب دیا) اُس نورانی کے یہ جملے تیر کی طرح میرے کان کے پردوں کے پار ہوگئے کہ "مسٹر قاسم آپ کی بیگم صاحبہ آپ سے بہت زیادہ حسین ہیں"......

—— (قہقہہ لگا کر) نجمہ! تمھیں اپٹوڈیٹ بنتے بنتے ابھی زمانہ لگے گا، اس میں آخر محسوس کرنے کی کیا بات تھی اُس نے تمھاری خوبصورتی کی تعریف کی تھی، کوئی گالی نہیں دی تھی۔

—— غیر مردوں کا شریف عورتوں کے رنگ روپ کی تعریف کرنا گالی نہیں تو اور کیا ہے!

—— پگلی کہیں کی! یہ فیشن ہے، یہ خوش طبعی کی باتیں ہیں...... اور نجمہ! مغرور نہ ہونے کا وعدہ کرو تو ایک بات کہوں (فرمایئے تو سہی —— نجمہ نے شرما کر جواب دیا) پوری پارٹی میں بس تم ہی تم نظر آرہی تھیں، ارے صاحب! راجہ دیاس جی کی لڑکی منورما اور نواب کانکر کھیڑہ کی بہو پروین تمھارے آگے کنیز لگ رہی تھیں —— میرے کئی بے تکلف دوستوں نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ قاسم! بڑے خوش قسمت ہو اتنی حسین اور دل کش بیوی ہتھے چڑھ گئی۔

— ہتھے چڑھ گئی —— اور آپ نے اُن اوباشوں کی اس طنز کو گوارا کر لیا۔
— یہ طنز نہیں، بے تکلفی کی باتیں تھیں نجمہ! تم تو قُل اعوذی قسم کے مُلّاؤں جیسی باتیں کرتی ہو! جلسوں اور پارٹیوں میں فلسفہ
ور ریاضی پڑھنے کے لئے لوگ نہیں جاتے، وہاں اسی قسم کی باتوں میں لطف آتا ہے۔
— اور —— اُس پارٹی میں جوان لڑکیاں سینہ اُبھار اُبھار کر جو چل رہی تھیں میرے تو شرم کے مارے کپڑے [illegible]
رتے تھے، اُس کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی!
— وہ دلیل ہے اُن لڑکیوں کی صحت مندی اور خوش مزاجی کی —— نجمہ! تم اس شرم کو تہ کر کے رکھ دو، مت کرو
مد کے زمانہ کی بڑی بوڑھیوں کی سی باتیں! یہ تہذیب و ترقی کا دور ہے، ہر چیز کو مولوی اشرف علی تھانوی کے بہشتی زیور سے
پنے کی کوشش نہ کرو ورنہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں تمہارا مذاق اُڑایا جائے گا۔۔۔۔!

نجمہ کی بے حجابی کا یہ پہلا دن تھا، اُس کے احساس کا یہ عالم تھا کہ کئی بار آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ محسوس کر رہی
تھی کہ آج اُس نے غلطی نہیں بہت بڑا گناہ کیا ہے، دل میں شدید گھٹن سی ہو رہی تھی، آئینہ میں چہرہ دیکھتے وقت اُس کے
ضمیر نے چیخ لی کہ رخساروں کی پاکیزگی کو ہوسناک نگاہوں نے میلا کر دیا —— یہ پہلے دن کا احساس تھا اُس کے بعد
پھر ایسے موقعے آئے تو ناگواری کم ہوتی چلی گئی، ضمیر کی آواز اب دبی دبی سی نکلنے لگی، زاویہ نگاہ رفتہ رفتہ بدلتا جا رہا تھا، جھکی ہوئی
آنکھیں اُٹھنے لگیں اور لبِ خاموش زمزمے اُگلنے لگا، غیرت کی رگ بڑی نازک ہوتی ہے، بار بار چھوئے جانے سے وہ سُن اور بے حس
ہی ہو جاتی ہے۔

حسین عورتوں کی پارٹیوں، جلسوں اور کلب گھروں میں ہر جگہ پذیرائی ہوتی ہے، اُن کو محفلوں کی زینت کے لئے خاص طور سے بلایا
جاتا ہے، نجمہ کو مقبولِ عام و خاص بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی، شہر کی کوئی بڑی دعوت ایسی نہ ہوتی جس میں اُسے نہ بلایا جاتا، قاسم
فخر و غرور کے مارے پاؤں زمین پر نہ رکھتا کہ اُس کی بیوی کی کیا کچھ قدر افزائی ہو رہی ہے، نجمہ کے طفیل میں قاسم کی بھی پوچھ گچھ ہو جاتی
بیوی کی بے حجابی اور انجمن آرائی کی قیمت بلکہ یوں کہئے کہ اصل مع سُود اُسے مل رہا تھا —— وہی نجمہ جس نے سول سرجن
کی پارٹی میں پہلے دن اپنی خوبصورتی کی تعریف دوسرے آدمی سے سُن کر بُرا مانا تھا، اب اُس کی زبان سے خود سُنا جانے لگا کہ
میرے رخسار پر جو تل ہے اُس کی پھبن کا جواب کوئی عورت پیش نہیں کر سکتی!

ابھی لفظوں کی شیشہ گری ہو رہی تھی، کشتی ابھی تک دامنِ ساحل ہی میں تھی، لذتیں ہوس نہ بننے پائی تھیں ——
مگر ہر چیز کی داغ بیل پڑ رہی تھی، آغازِ سفر ہی میں منزل کی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔

قاسم ایک فرم میں ملازم تھا، تین سو تنخواہ تھی اور دو سو ڈھائی سو روپے اوپر سے کمیشن کے مل جاتے، دو میاں
بیوی، ایک ملازمہ، ایک چھوکرا، تیس چالیس روپیہ ماہوار کرایہ کا مکان! اوسط درجہ کی گزر اوقات کے لئے یہ آمدنی بہت کافی
تھی —— مگر نجمہ جب سے بے پردہ ہوئی اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔

گھر میں عورت موٹا جھوٹا پہن کر بھی گزر کر سکتی ہے، کسی نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا! مگر جلسوں، پارٹیوں، بازاروں اور
سینماؤں میں تو دیدہ زیب لباس چاہیے اور پھر لباس کی آرائش کے ساتھ ناخنوں پر لگانے کی سُرخی سے لیکر کانوں کے
آویزوں تک ہر چیز ضروری ہے، پیٹی کوٹ کی سلوٹ سے لیکر ساری کی کور تک ہر چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے، عورت
کا باہر آنا جانا ہوتا ہے تو سواری کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو ہی جاتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسروں کے

یہاں تو پارٹیوں، لنچوں اور ڈنرز میں شریک ہوتی رہے اور اپنے یہاں کسی کو چائے پر بھی نہ بلایا جائے، پھر جب مہذب اور خوش حال لوگوں کا اپنے گھر پر آنا جانا رہے گا تو مکان کی آرائش بھی ضروری ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دعوت والے آئیں اور چٹائیوں اور کھاٹوں پر بیٹھ کر اور کھانا کھا کر چلے جائیں۔

سوشل لائف جتنی وسیع ہوتی گئی قاسم کے مصارف بڑھتے چلے گئے، کبھی کسی مہینہ میں قرض لینے کی ضرورت پیش آجاتی، ہر خرچ زندگی کی ناگزیر ضرورت بن کر رہ گیا تھا، مصارف گھٹانے میں اپنی تکلیف سے زیادہ سوسائٹی کا خیال تھا کہ ہم چشموں میں سُبکی ہو گی، نجمہ اور قاسم نے کئی بار اپنے اخراجات کا جائزہ لیا، مگر وہ ہر بار اسی نتیجہ پر پہونچے کہ جس سطح پر ہم ہیں اُس سے نیچے اُتر ہی نہیں سکتے، اور اگر اُترے تو سوسائٹی کی قدر و منزلت اور عزت و پندار کی کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، اس متمدن دُنیا میں کوئی سب سے الگ تھلگ کیسے رہ سکتا ہے، سوسائٹی کو چھوڑ کر گوشہ نشین بن جانے کے مقابلہ میں تو خودکشی بہتر ہے۔

شہر کے سوشل طبقوں میں قاسم کی پہلے بھی جان پہچان تھی، نجمہ کی بے پردگی اور سوسائٹی میں آنے جانے اور ملنے جلنے کے سبب اس شناسائی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا، نجمہ کا وجود اپنی جگہ خود ایک "حسین تعارف" تھا ——— عورتوں اور مردوں سے نجمہ اور قاسم کے تعلقات ایک ہی جیسے نہ تھے، کسی سے بس صاحب سلامت، کسی سے بے تکلفی، کسی سے خوب گہرا یارانہ اور کسی سے رسمی جان پہچان!

قاسم کے ایک دوست کا نام تو تھا منظر عباس مگر سب لوگ اُسے "منجو" کہہ کر پکارتے تھے، یہ عرف اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اُس کا اصلی نام بھول گئے، منجو کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، دوہرا بدن، کھڑا ناک نقشہ، سانولا رنگ چہرے پر چیچک کے داغ کوئی گہرا، کوئی بس یوں ہی اُوپری سا، منجو وکالت کرتا تھا، باپ آنریری مجسٹریٹ تھے اُن کے اثر و رسوخ کی بدولت وکالت خوب چمک رہی تھی، آدمی ذہین تھا مگر کام چور، محنت سے گھبرانے والا، فوجداری مقدمہ میں مسل پڑھے بغیر ہی بحث کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا اور ذہانت کے زور سے ایسے توڑ جوڑ ملاتا کہ فریقِ مخالف کے وکیل کے اوسان خطا ہو جاتے کہ کیا جواب دے کیا نہ دے! فوجداری میں باتونی اور چرب زبان وکیل ہی کامیاب رہتے ہیں، وہاں دھاندلی سے کام چلتا ہے، سنجیدگی، متانت اور قانونی موشگافیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

منجو سے قاسم کی شروع میں جان پہچان تھی، نجمہ سے متعارف ہونے کے بعد ربط ضبط بڑھتا ہی چلا گیا، منجو قاسم کا بھروسہ کا دوست تھا، یہ بھروسہ اور اعتماد خود منجو کی ذہانت نے پیدا کیا تھا، اس میں دلِ پُر شوق کی کچھ نزاکتیں بھی شریکِ کار تھیں۔

قاسم اور نجمہ کے اخراجات کسی عنوان کم نہ ہو سکے، یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی، گھر کا بجٹ کسی مہینہ میں بھی متوازن نہ رہ سکا، ایک مہینہ میں ایسی نوبت آگئی کہ کپڑوں کی سلائی تک ادا نہ ہو سکی، درزی نے کہا کہ میں چند دن اور انتظار کرتا ہوں، آپ نے سلائی کی رقم کا بھگتان نہ کیا تو میں سلے ہوئے کپڑے نیلام کر دوں گا ——— میاں بیوی کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہت کچھ غور و خوض اور سوچ بچار کرنے کے بعد یہ رائے ہوئی کہ وکیل صاحب (منجو) سے ایک مہینہ کے [illegible] روپیہ اُدھار لیا جائے، اور تجویز یہ طے پائی کہ نجمہ اس بات چیت کی پہل

ے ـــــ قاسم کی یہ پہلی کمزوری تھی ـــــ مردانگی کی شکستِ اولین !

دوسرے دن منجو حسبِ معمول شام کے وقت قاسم کے یہاں آیا، میاں بیوی نے اور دونوں سے زیادہ
ج اُس کی آؤ بھگت کی، چائے کا دور چلا، باتیں ہونے لگیں، روپیہ کا ذکر کرتے کرتے نجمہ رُک گئی، منجو نے اصرار
ا تم آخر کیا کہنا چاہتی تھیں، رُک کیوں گئیں، بات اُدھوری کیسے چھوڑ دی مجھے اَدھ کٹ جملوں اور پہیلیوں
بڑی اُلجھن ہوتی ہے، نجمہ نے شرماتے ہوئے اظہارِ مطلب کیا، منجو نے اُنگلیوں کو جھٹکا دیا سگریٹ کی راکھ زمین
بکھر گئی، کچھ ذرّے میز پر رہ گئے ـــ اور بولا ... حد کر دی آپ لوگوں نے بھی غیریت اور بے گانگی کی، بے تکلف دوستوں
ں اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا، اور یہ قرض ورض کس بلا کا نام ہے! ایسی باتیں بے گانوں اور غیروں سے کی جاتی ہیں (جیب
ں ہاتھ ڈال کر سو روپیہ کا نوٹ نکالتے ہوئے) یہ لیجئے ... یہ لیجئے! مجھے تو خود شرم آ رہی ہے کہ میں آج تک آپ کی
بمت نہ کر سکا ... ...

منجو بہت دیر تک قاسم کے یہاں بیٹھا رہا، آج وہ بہت خوش تھا، خوشی کے اظہار کے لئے اُس نے شعر شاعری کا ذکر
ڑ دیا، آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگیں۔

نجمہ :- آپ کو (شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو یہ شعر پسند ہے، اکثر یہی شعر گُنگُناتے رہتے ہیں ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی  جس نے تیری گائے بنائی

منجو :- کیوں بھئی! قاسم! ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی جان! اس حُسنِ انتخاب کے قربان جائیے، اگر دو چار تم جیسے شعر
اور سخن سنج پیدا ہو جائیں تو شعر و ادب کی قسمت کا ستارہ چمکنے لگے۔

قاسم :- اور تمہاری بھابی جان کا پسندیدہ شعر یہ ہے - پہلا مصرعہ بھُول گیا ـــ ؎ دل کی لگی لگی رہی دل کا
انا ہو گیا (سب ہنسنے لگے)

قاسم اور نجمہ کو قرض کا سہارا پڑ گیا، جہاں کوئی ضرورت آ کر نکلی اور منجو کے گھر ملازم پرچہ لے کر پہونچا کہ اتنے روپے
ہئیں، منجو چاہتا تو طرح دے جاتا، مگر یہ تو سب کچھ اُس کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہو رہا تھا ـــ میاں بیوی
دونوں فیشن ایبل خرّاچ تھے، قرض نبٹانے کے لئے پس انداز کہاں سے کرتے، کبھی دیا کبھی نہ دیا، اور وہ بھی کئی کئی وعدوں
ے بعد! یوں ہی معاملہ چلتا رہا۔

منجو اب نجمہ کے لئے تحفے تحائف بھی لانے لگا، منجو کی آشنائی کے حقوق بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے، یہاں قرض
ینے اور تحفے قبول کرنے کی چاٹ پڑ گئی تھی اور وہاں تمنّاؤں کے رنگین قلعے تیار ہو رہے تھے کہ یہ ہو گا، وہ ہو گا! شکار اپنی
رضی سے دام میں پھنسا ہے اُس سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے، اگر ذرا سی بھی چوک، غفلت اور نادانی ہو گئی تو دام میں
یا ہوا شکار نکل جائے گا۔

دینے والا ہاتھ، لینے والے ہاتھ سے اونچا ہوتا ہے، منجو کا پلّہ بھاری تھا، نجمہ اور قاسم دونوں اُس سے دبتے تھے،
یہ کی مار بُری ہوتی ہے، اچھے اچھوں کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں ـــــ منجو کی لغزشوں سے بھی درگزر کیا جانے لگا،
ک دن منجو کے منہ سے "مائی ڈارلنگ" نکل گیا، نجمہ سے مخاطبت تھی! قاسم کی غیرت پر یہ پہلا تازیانہ لگا، اُسے
کلیف ضرور ہوئی مگر ضبط کر گیا، غصہ کرتا اور غیرت کو کام میں لاتا تو منجو کے روپیہ پیسے سے رنگ رلیاں کرنے کا موقعہ

کہاں سے ملتا۔

نجو ہوشیار وکیل تھا اور وہ بھی فوجداری کا وکیل کہ جو باتوں کے زور سے آن کی آن میں ہتھیلی پر سرسوں جمادے ——— وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اندھا دھند چھلانگ مارتا تو کام کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا، نجمہ سے اب چھیڑ چھاڑ ہونے لگی، حسن کی تعریف، ناز و انداز کی ستائش، رنگین اشعار، رومان آفریں افسانے ——— نجمہ سب کچھ گوارا کرتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن قاسم نے نجمہ کے رخسارے کو ٹھوکا دے دیا ——— نجمہ کے تیور غضب آلود ہو گئے، اس قدر بے تکلفی کی آج تک نوبت نہ آئی تھی، اس قسم کا یہ پہلا اقدام تھا۔

نجمہ اُس وقت تو خاموش ہوگئی مگر غیرت بار بار اُبھارتی تھی کہ قاسم سے اس بات کا تذکرہ کر دینا مناسب ہے، آج اتنی بے تکلفی ہوئی کل اُنگلی پکڑتے پکڑتے پہونچے کی نوبت آئے گی، مگر اس کے ساتھ ہی نجو کی نوازشیں یاد آنے لگیں بلکہ ایک ایک کرکے آنکھوں میں پھر گئیں ——— کئی سو روپیوں کا قرض جو ادا نہیں کیا گیا، کلائی کی سنہری گھڑی، ساری کی زریں کور، تصویروں کا البم، ٹائلیٹ کے ڈبے، پھلوں کی ٹوکریاں اور مٹھائیوں کے طباق ۔۔ ۔۔ پھر بڑے دن کی چھٹیوں میں کلکتہ کی سیر و تفریح کا پروگرام ——— غیرت کے تصورات ان عیش سامانیوں میں اُلجھ کر اور ان ہنگامہ آرائیوں میں دب کر رہ گئے، غیرت بر روئے کار آتی تو پھر ان منفعتوں اور فایدوں سے ہاتھ دھو لینا پڑتا، اس "جہاد" کے لئے وہ تیار نہ تھی، نجو کو ٹھکرا دیتی تو جلسوں اور پارٹیوں میں زرق برق ساریاں کہاں سے پہننے کو ملتیں۔

ہوسناکی کا حال کائی کی تہ جیسا ہے آدمی گرتا اور پھسلتا ہی چلا جاتا ہے، نجمہ کا ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا، اس میں بہت کچھ گراوٹ پیدا ہوگئی، اُسے شاید اب یاد بھی نہ رہا کہ اپنے شوہر قاسم سے اُس نے کبھی پیمانِ وفا باندھا تھا؟ ——— اور قاسم، ذلیل اور بے غیرت ہوگیا تھا جس دن بیوی کو غیر مردوں کے سامنے بے پردہ کیا تھا اُس کی "قوامیت" کا جنازہ تو اُسی دن نکل چکا تھا۔

نجو کامیاب وکیل تھا، ہر دلعزیز اور شہرت یافتہ بھی، احباب نے مشورہ دیا کہ تم ولایت جا کر قانون کی کوئی ڈگری لے آؤ، اس طرح ہائی کورٹ کی ججی بہت جلد مل جائے گا، ہائی کورٹ کے جج کے لئے "انگلینڈ ریٹرن" (England Return) ہونا لازمات سے ہے، نجو نے ولایت جانے کی تیاریاں شروع کر دیں، روپیہ پیسہ کی بہتات ہو تو افلاس جس کو مہینوں میں بھی پورا نہیں کرسکتا، دولت اُسے منٹوں میں پایۂ تکمیل کو پہونچا سکتی ہے، روپیہ میں بڑی طاقت اور غضب کی کرامات ہے۔

نجو وطن سے روانہ ہوگیا، نجمہ کی جدائی کا اُس پر کچھ یوں ہی سا اثر تھا، پہلی سی ہما ہمی ہی باقی نہ رہی تھی، نجمہ بھی نجو پر کوئی والہ و فریفتہ نہ تھی جو اُسے غمِ فراق ہوتا، اب تو وہ تجربہ کر چکی تھی کہ "اہل دل" قسم کے دولت مندوں سے کس طرح روپیہ وصول کیا جاتا ہے، اُس کی جوانی ابھی صحیح سلامت تھی، اُسے یقین تھا کہ نجو جیسے بیسیوں خریدار پیدا ہو جائیں گے بس ذرا میرے التفات اور توجہ کی دیر ہے ———

نجمہ کو بلیرڈ کھیلنے کا بہت شوق تھا، کلب کے ایک ممبر، جنھیں سب "نواب صاحب" کہتے تھے، بلیرڈ کے اچھے کھلاڑی تھے، کھیل ہی کھیل میں اُن سے دوستی ہو گئی، نجمہ کھنچ کھنچ کر بڑھی اور رک رک کر اقدام کیا ——— نواب صاحب تو پہلے ہی سے مٹھی میں دلِ بے تاب دبائے پھر رہے تھے، اُدھر سے جو توجہ دیکھی تو جھٹ سے دل سونپ ہی تو دیا۔

منجو دکیل تھا، یہ نواب تھے، رئیس ابن رئیس اور امیر ابن امیر! منجو غریب کا اور ان کا کیا جوڑ! پانی کی طرح روپیہ
اور کنکروں کو گوہر و الماس کی مانند لٹاتے، قاسم بھی ان کی بزم ناؤ نوش میں شریک ہونے لگا، صرف دوستوں
بہلانے کے لئے! مگر طوفان میں رہ کر کوئی سوکھا نہیں نکلتا، یہ کیسے ممکن ہے کہ شرابیوں کے ساتھ رہ کر آدمی چھوٹا
ے، ایک لمحہ کی صحبت بھی اپنا اثر کئے بغیر نہیں چھوڑتی ــــــ قاسم بھی شراب پینے لگا، پہلے بہت تھوڑی
ر بتدریجاً اضافہ اور اُس کے بعد بلا نوشی! پیگ آیا اور دو تین گھونٹوں میں ختم ہو گیا! وہ بیچ بیچ جام چھلکانے اور خم
ھانے لگا، شرابی بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔

قاسم رات کے دس گیارہ بجے بڑے بازار سے گزر رہا تھا، شراب میں دُھت، سر سے پیر تک مستی چھائی ہوئی، پاؤں
بہکے پڑ رہے تھے، آج اُس کا نشہ ہر دن سے زیادہ بڑھا ہوا تھا ــــــ امپیریل بنک کے قریب چوراہہ تھا، شہر
ناک ترین مقام! وہاں سے ہر کوئی دیکھ بھال کر گزرتا تھا، جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے ــــــ قاسم لڑکھڑاتا
ل رہا تھا، فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے کتے پر جو اُس کا پیر پڑا تو کتا ہڑبڑا کر چیختا ہوا بھاگا، قاسم اس بھاگ دوڑ
بدحواس سا ہو گیا، چوراہہ سے اُس نے تیزی کے ساتھ گزرنا چاہا، اتنے میں دوسری طرف سے "بس" آئی اور
ں کی نذر ہو گئی، اُسے ہسپتال میں لے جایا گیا مگر اُس کا وقت آ چکا تھا موت کو کون ٹال سکتا ہے، یہ گھڑی تو ہر جان
یاب نہ ایک دن آنے والی ہے، صبح ہوتے ہوتے قاسم دُنیا سے چل بسا۔

نجمہ کے لئے شوہر کی موت ایک معمولی حادثہ سے زیادہ نہ تھی، دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی اُس نے بھی آنسو بہائے
ان آنسوؤں میں سوزِ دل کہاں شریک تھا! یہ دُنیا دکھاوے کے آنسو تھے، بیوگی اُس پر آئی ہی نہیں، چند دن کے
وہی تفریحیں، پارٹیاں اور انجمن آرائیاں!

نواب صاحب سے پینگیں بڑھ رہی تھیں، لوگوں میں مشہور یہ کیا گیا کہ نواب صاحب سے میں ستار سیکھتی ہوں ــــ
دُنیا والوں کی انگشت نمائی کا احساس بھی جاتا رہا تھا، بیسوا کی سی زندگی تھی، روپیہ حاصل کرنا اور نواب صاحب
ل بہلانا ــــــ ایک دن نجمہ نے خوش ذائقہ حریرے کے دھوکے میں نواب صاحب کے یہاں کی میز سے
ے "محلول" اُٹھا کر پی لیا، اس میں سنکھیا کا غلبہ تھا۔

بس صاحب! اُس کا پینا تھا کہ نجمہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، نواب صاحب نے ڈاکٹر اور یونانی طبیب
ے، سب نے اپنی اپنی سی کوشش کی، جان تو بچ گئی مگر جسم پھوٹ نکلا، سفید داغ، پھر جذام کی سی کیفیت،
ان تک کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا، نجمہ کی قدردانیاں اُس کے رنگ روپ کے سبب تھیں جب وہ نہیں رہا تو قدردانیاں
ں طرح باقی رہتیں۔

حسین و جمیل نجمہ ــــــ اب "کوڑھن فقیرنی" تھی، ہاتھ پاؤں اور چہرہ نہ صرف داغدار بلکہ متورم! اُس کی طرف دیکھنا مشکل
تھا، ہر قدردان نے ساتھ چھوڑ دیا، اب وہ تھی اور شہر کی گلیاں! مرض اس قدر تکلیف دہ تھا کہ بھیک بھی تو نہ مانگ سکتی تھی!
سڑکوں پر اِدھر اُدھر پڑی رہتی ــــــ اُس کا دماغ بھی متاثر ہو چکا تھا، پاگلوں کی طرح چلاتی:۔
ــــ بیٹی! پردہ کرو ــــــ ڈھکو، چہرہ ڈھکو! ارے یہ کُتّے! مگر بے حیا انسانوں سے یہ کتے بہت اچھے ہیں ــــــ
قاسم نے مجھے کنویں میں گرایا تھا ــــــ ہیں ہیں تم، تم، وہ، وہ، بابا! پیسہ ــــــ (ایک دردناک آہ!)

# روحِ انتخاب

## نبی کا طریقِ دعوت و اصلاح

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ــــــ کے عربی مضمون کا ترجمہ مولوی محمد رابع ندوی نے کیا

اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے جب صحابہ کرام رض محبت کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انھوں نے اپنی ساری طاقت آپ صلعم کی اطاعت میں صرف کر دی اس کی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنی اور جماعتِ انصار کی جانب سے بدر سے قبل کہا تھا:-

"میں انصار کی طرف سے شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں، جس کا تعلق چاہیں قائم رکھیں اور جس کا چاہیں توڑ دیں اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں، اور جو کچھ کہ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے، اور جس بارے میں آپ جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے، اور بخدا اگر آپ صلعم برک غمدان تک چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ صلعم سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے۔"

ان کی اطاعت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تین شخصوں سے گفتگو ممنوع قرار دی تھی جو غزوۂ تبوک نہ جا سکے تھے، لوگوں نے آپ کی بات مانی، اور مدینہ ان تینوں کے لئے شہر خموشاں بن گیا، جہاں کوئی بات کرنے والا اور بات کا جواب دینے والا نہ تھا۔ کعب کہتے ہیں:-

"رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم تینوں سے گفتگو منع فرما دی تھی، لوگ ہم سے کترانے لگے اور ان کی نگاہیں بدل گئیں، حتیٰ کہ مجھے زمین تنگ محسوس ہونے لگی گویا وہ زمین ہی نہ تھی جس کو میں جانتا تھا، یہاں تک کہ جب لوگوں کی میرے ساتھ بے رخی بہت بڑھ گئی، میں چلا اور ابو قتادہ کی دیوار پھاند کر ان کے باغ میں گھس گیا، یہ ابو قتادہ وہ ہیں جو میرے محبوب چچازاد بھائی تھے اور میرے سب سے زائد چہیتے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا، بخدا انھوں نے مجھے جواب بھی نہ دیا تو میں نے ان سے کہا، اے ابو قتادہ میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہوں، وہ خاموش رہے، میں نے پھر دہرایا ان کو واسطہ دیا اور وہ خاموش رہے، میں نے پھر لوٹایا اور ان کو واسطہ دیا تو وہ بولے کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، میری آنکھیں بھر آئیں اور میں پلٹ پڑا اور دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔"

ان کی اطاعت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ ناراضگی و بے رخی کے ہدف تھے، کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا
...صد آتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علٰحدہ رہنا۔ وہ بولے "طلاق
...ے دوں یا کیا کروں؟" وہ بولا "نہیں، بلکہ الگ رہو اُن کے قریب مت جاؤ" تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا اپنے
...والوں کے پاس چلی جاؤ، اُن ہی کے پاس رہو، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کچھ فیصلہ کر دے۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اُن کی محبت و تعلق کا یہ حال تھا کہ ہر ایک پر آپ کو ترجیح دیتے تھے۔ عین اس
...اطعہ کے زمانہ میں غسان کا بادشاہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دربار کی پیش کش کرتا ہے، اس بے رخی اور عتاب
...ے زمانہ میں یہ حقیقتاً سخت آزمائش تھی، لیکن وہ رد کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مدینہ کے بازار میں میں چل رہا تھا کہ اُن
...می بنطیوں میں سے جو مدینہ غلہ فروخت کرنے آتے تھے، ایک نبطی کہتا ہے کعب بن مالک کو کوئی بتا دے۔ یہ سن کر لوگ
...ری جانب اشارے کرنے لگے، اُس نے میرے پاس پہونچ کر شاہ غسان کا ایک خط حوالے کیا، میں پڑھا لکھا تھا، میں نے
...س کو پڑھا، اُس میں تحریر تھا کہ

"ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تمھارے آقا نے تم سے بے رخی اختیار کر لی ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت کے لئے نہیں
رکھا، اور وہ تم کو ضائع کرنا نہیں چاہتا ہے، بس تم ہم سے مل جاؤ، ہم تمھارا بہت خیال کریں گے۔"

میں نے جب پڑھ لیا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، اور میں نے جا کر اُسے تنور کی نذر کر دیا۔

اطاعت اور فوری تعمیل حکم کی ایک عجیب مثال وہ واقعہ ہے جو شراب کی حرمت کے حکم کے وقت پیش آیا۔ حضرت
...بو ہریرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ

"ہم مجلسِ شراب میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اُٹھا تاکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں
حاضری دوں اور سلام کروں، ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی "یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر و
المیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان الخ" تو میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا،
اور میں نے یہ آیت ھل انتم منتھون (کیا تم رک جاؤ گے) تک پڑھ کر سنا دی، کہتے ہیں کہ بعض لوگوں
کے ہاتھ میں ساغر تھا، کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا، جو شراب ہونٹوں میں پہونچ گئی تھی وہ فوراً تھوک
دی گئی۔"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور اپنے نفس پر، گھر والوں اور خاندان والوں پر، آپ کو ترجیح دینے کی عجیب و
غریب مثال یہ ہے، کہ عبد اللہ بن ابی کے بیٹے عبد اللہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلایا اور فرمایا "دیکھتے ہو تمھارے
والد کیا کہتے ہیں؟" وہ بولے "یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں کیا کہتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "کہتے ہیں
کہ اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہو گا وہ ذلیل کو نکال دیگا" وہ بولے "خدا کی قسم یا رسول اللہؐ! انھوں نے سچ کہا، بخدا آپ
معزز ہیں اور وہ ذلیل ہیں، یا رسول اللہ آپؐ مدینہ تشریف لائیے، اور اہلِ یثرب کو اس کا علم ہے کہ وہاں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ
کا کوئی فرمانبردار نہیں، اگر اللہ و رسول کی مرضی یہ ہے کہ میں اس کا سر لے آؤں تو میں حاضر ہوں" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ
وسلم) نے فرمایا: "نہیں!"

جب لوگ مدینہ پہونچے تو عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی مدینہ کے دروازے پر تلوار لے کر اپنے باپ کے انتظار میں کھڑے

ہو گئے، جب ان کے والد آئے تو بولے :-

"تم ہی کہتے تھے اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا، خدا کی قسم! تم کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ معزز کون ہے؟ خدا کی قسم! تم مدینہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر رہ نہیں سکتے۔"

اُس نے کہا :-

"اے خزرج کے لوگو! دیکھو میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے، اے خزرج کے لوگو! میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے۔"

وہ بولے :-

"خدا کی قسم! یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ اکٹھا ہو گئے اور اُن کو سمجھایا، انھوں نے کہا :-

"خدا کی قسم! یہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا!"

لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے، آپؐ کو خبر دی، آپؐ نے فرمایا :-

"جاؤ اور عبداللہ سے کہہ دو کہ آنے دو۔"

لوگ واپس آئے، اُنھوں نے کہا :-

"ہاں! اب جبکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت آگئی ہے، وہ مدینہ میں داخل ہو سکتا ہے۔"

---

اس وسیع و عمیق ایمان، اس محکم پیغمبرانہ تعلیم، اس دقیق و حکیمانہ تربیت، اپنی عجیب و غریب طاقت اور شخصیت، اور اس محیر العقول آسمانی کتاب کے ساتھ کہ جس کے عجائب و غرایب ختم ہونے کو نہیں آتے، اور جس کی تازگی میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی شکل میں پڑے پڑے ضائع ہو رہے تھے، جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی، اور جن کو جہالت کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا، آپؐ نے اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیا، اس میں خدا کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرما دیا، زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں اُبھار دیں اور اندرونی استعدادیں اُجاگر کر دیں، پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا کہ اسی کے لئے اس کا وجود تھا، اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی، اور گویا کہ بے جان پتھر تھا اب وہ ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا، اور گویا بے حس و حرکت مردہ تھا اب زندہ ہو کر دنیا پر حکومت کرنے لگا، پہلے نابینا تھا جس کو خود رستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دنیا کا رہبر و رہنما بن گیا۔

| | |
|---|---|
| اومن کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ | بھلا وہ جو مردہ ہو ہم نے اس کو زندہ کیا اور |
| نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ | اس کو ایک نور عنایت کیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں |
| فی الظلمٰت لیس بخارج منھا | چلتا ہو اس جیسا ہے جو اندھیروں میں گم ہو نکل نہ |

آپؐ کی توجہ و تعلیم سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب ہوا کہ دنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو عجوبۂ روزگار اور دنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں، وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے

ن کے باپ ان کو جھڑکا کرتے تھے اور جو کہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں تھے، جن کو کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہ تھا،
ے معاصر ان کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے، وہی عمرؓ تھے کہ یکبارگی تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے متحیر بنا دیتے
ور قیصر و کسریٰ کو تخت و تاج سے محروم کر دیتے ہیں، اور ایسی اسلامی سلطنت کی بنا ڈالتے ہیں جو بیک وقت ان دونوں
نوں پر حاوی ہے اور تدبیر و حسنِ انتظام میں ان سے فوقیت رکھتی ہے، ورع و تقویٰ اور عدل کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو وہ
ب المثل ہیں۔

یہ ولید کے فرزند ہیں قریش کے نوجوان حوصلہ مندوں میں سے ایک شخص تھے، مقامی جنگوں میں انھوں نے نام پیدا کیا
قریش کے سردار قبائلی جنگوں میں ان سے مدد لیتے تھے انھوں نے جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کوئی بڑی شہرت بھی حاصل نہیں
ی، اچانک وہ آسمانی تلوار (سیف من سیوف اللہ) بن کر چمکتے ہیں جو چیز سامنے آتی ہے کٹ جاتی ہے، یہ خدائی تلوار روم پر بجلی
ر گرتی ہے اور تاریخ کے طول و عرض میں اپنے تذکرے چھوڑ جاتی ہے۔

یہ ابو عبیدہ ہیں جن کی امانت اور نرمی کی تعریف کی جاتی تھی اور مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی قیادت کر لیا کرتے
ان کو دیکھئے مسلمانوں کی سب سے بڑی قیادت کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں، اور ہرقل کو شام کے ہرے بھرے ملک سے ہمیشہ
لئے نکال دیتے ہیں غریب اس پر وداعی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے، اے ملکِ شام تجھ کو رخصتی سلام، ایسا سلام جس کے بعد
ملاقات نہیں ہوگی۔

یہ عمرو بن العاص ہیں جن کا شمار قریش کے سمجھدار لوگوں میں تھا، قریش اُن کو حبشہ سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ مسلمان مہاجرین
اپس لے آئیں مگر ناکام واپس ہوتے ہیں، ان کو دیکھئے، مصر فتح کرتے ہیں اور زبردست اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔

اور یہ سعد بن ابی وقاص ہیں اسلام سے قبل ان کے متعلق نہ کسی بڑی فوجی قیادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی ماہر جنگ کی حیثیت
ان کی شہرت ہے، ان کو دیکھئے مدائن کی کنجیاں سنبھالتے ہیں اور عراق و ایران کو اسلامی سلطنت میں شامل کر کے ہمیشہ کے لئے
ح عجم کہلاتے ہیں۔

یہ سلمان فارسی ہیں، ایک مذہبی عہدہ دار کے بیٹے تھے، فارس کا ایک گاؤں وطن تھا، ایک غلامی سے دوسری غلامی اور
ک مصیبت سے دوسری مصیبت دیکھتے ہوئے، مدینہ پہونچتے ہیں، کل جہاں کی رعیت کے ایک فرد تھے آج اس ملک کے حکمران ہیں،
ر اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سے ان کے زہد و سادگی میں فرق نہیں پڑتا، لوگ ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ
ک جھونپڑی میں قیام ہے، سر پر بوجھ ڈھوتے ہیں۔

یہ بلالِ حبشی رضؓ ہیں، فضیلت و عزت میں اس درجہ کو پہونچتے ہیں کہ امیر المومنین ان کو اپنا سردار کہتے ہیں۔

یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں جن میں حضرت عمرؓ کو خلافت کی صلاحیت نظر آتی ہے فرماتے ہیں: "اگر زندہ ہوتے
میں ان کو خلیفہ بناتا"

یہ زید بن حارثہ ہیں، جنگ موتہ کے لئے مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہیں، اور اسی لشکر میں جعفر بن ابی طالب خالد
ن ولید جیسے ممتاز لوگ بھی موجود ہیں۔ اور ان کے بیٹے اسامہ اُس لشکر کی قیادت کرتے ہیں جس میں ابو بکرؓ، عمرؓ جیسے افراد
وجود تھے۔

یہ ابو ذر مقداد، ابو الدرداء، عمار بن یاسر، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب ہیں جن پر اسلام کی بادِ بہاری کا ایک جھونکا چل

جاتا ہے، اور وہ دنیا کے نامور زاہدوں اور جلیل القدر عالموں میں دیکھتے دیکھتے شمار ہونے لگتے ہیں۔

یہ علی بن ابی طالب اور عائشہ اور عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضؓ ہیں جو نبی امیّ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گود میں پل کر دنیا کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہونے لگے جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے، قلب کے سچے، علم میں گہرے اور تکلف سے دور، بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے، خطاب کرتے ہیں تو دنیا کے مؤرخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔

پھر تھوڑا عرصہ بھی نہیں گذرتا کہ متمدن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ خام اشیا، جو بکھری پڑی تھیں، جن کی معاصر قوموں نے بھی ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا، اس سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعۂ کمالات نہیں دیکھا، جیسے ایک ڈھلا کرہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا سرا کدھر ہے، یا باران رحمت کی طرح کہ اس ک پتہ نہ چل سکے کہ اس کا پہلا چھینٹا مبارک ہے یا آخری، ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے، دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لئے اس کے پاس سامان موجود ہے اس لئے اس کو کسی سے مدد کی ضرورت نہیں لیکن دنیا اس کی مدد کیلئے تیار نہیں

اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی، نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی حالانکہ اس کو اس سے پہلے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس کے باوجو اس کو ذرا ضرورت پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے، یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے۔ ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا سکہ دو بڑے بڑے اعظموں کے وسیع رقبہ میں چلتا تھا، اس کے پاس ہر شعبہ اور ہر ضرورت کے لئے متعدد آدمی ایسے تھے جو اپن لیاقت، کارکردگی، امانت و دیانت، قوت، اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر تھے۔ یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اس نوزائیدہ قو نے جس پر تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اس کو پورے آدمی فراہم کئے جن میں کوئی عادل حاکم تھا کوئی امانت دار خازن، کوئی منصف قا تھا اور کوئی عبادت گذار قائد، کوئی پرہیزگار اور متقی فوجی تھا، اس دینی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی، اس اسلامی حکومت کو اہل ترین، خدا ترس، فرض شناس مستعد کارکن ملتے رہے۔ حکومت کی ذمہ داری ان ہی اشخاص کے سپرد ہوتی جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے، جو اپنے کو بجائے تحصیلد کے مبلغ و ہادی سمجھتے، جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح، اور دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہوتا۔ ان کے اثر سے اسلامی تہذ اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، اور دین کے برکات اس طرح وجود میں آئے کہ پھر کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

حقیقت میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا دنیا اور آ کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آ گئے۔ آپؐ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم پاش پاش کر دیا آپ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کر دیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہو۔ یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہیگا!

(من الجاهلية الى الاسلام)

("الفرقان" لکھنؤ)

# ہماری نظر میں

متحدہ اقوام

"منشور متحدہ اقوام اور دیگر دساتیر و دستاویزات" ترجمہ :- احمد عبداللہ المسدوسی بی، اے، ایل ایل بی، ضخامت ۴۷۵ صفحات، پایدار جلد اور خوبصورت گرد پوش کے ساتھ قیمت مجلد معمولی سات روپے، غیر مجلد چھ روپے، ملنے کا پتہ :- مکتبہ خدام ملت اے، ایم، فریر روڈ، کراچی۔

اقوام متحدہ کے جس تاریخی منشور پر ۴۹ حکومتوں کے نمائندوں نے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں دستخط کیے اور ماہ نومبر ۱۹۴۹ء تک جس میں مزید دس حکومتوں کا اضافہ ہوا، یہ اسی کا اُردو ترجمہ ہے، ان حکومتوں میں ایسے نام بھی ہیں، جن سے بہت کم لوگ آشنا ہیں اور سیاسی اور اخباری دنیا میں جن کا ذکر تک نہیں — مثلاً نکاراگوا، ال سالویڈر، باتگو، کاسٹاریکا، ہانڈوراس، ڈومینکن ... ... !

اس کے بعد میثاق اٹلانٹک کا ترجمہ ہے، جس پر برطانیہ، امریکہ، فرانس، بلجیم، کناڈا، لکسمبرگ، ہالینڈ، ناروے، ڈنمارک، پرتگال اور اٹلی کی حکومتوں نے دستخط کئے تھے — پھر منشور اوقیانوس (Atlantic Charter)، اعلان ماسکو، کریمیا کا اعلان، اعلان پوٹسڈم، برٹین وڈ کانفرنس کے فیصلوں کا خلاصہ اور دوسرے دساتیر اور دستاویزوں کا ترجمہ شامل ہے، اس میں "اعلان طہران" بھی ہے جس پر روزولٹ، اسٹالن اور چرچل تینوں شاطر سیاست دانوں کے دستخط ثبت ہیں، اس اتحاد ثلاثہ کی تاریخ یکم ستمبر ۱۹۴۳ء ہے۔

"منشور متحدہ اقوام" بہت مفصل ہے، مجلس اقوام کے سکرٹری سے لیکر جنرل اسمبلی اور اُس کی تشکیل کا ذکر ہے، کتاب بڑی محنت اور سعی و کاوش سے مرتب کی ہے — ناولوں اور افسانوں کا ترجمہ آسان ہے مگر قانونی اور دستوری ترجمہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس میں قانونی اصطلاحوں کی معنوی حیثیت باقی رکھنی پڑتی ہے — جناب احمد عبداللہ المسدوسی اس قانونی اور سیاسی کاوش پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، ترجمہ بہت شستہ اور رواں ہے، فاضل مترجم قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے مزاج اور اُن کی نزاکتوں سے بھی واقف ہیں، اظہار بیان میں کہیں اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوا، کہیں کہیں کوئی لفظ کھٹکتا ہے، مثلاً "معطیہ اختیارات" (صفحہ ۳۲) اگر "مفوضہ اختیارات" ترجمہ کیا جاتا تو اصل سے قریب تر رہتا۔

یہ کتاب جن بین الاقوامی دستور و قوانین پر مشتمل ہے، اُن کی علم و اطلاع کے بغیر آجکل کی سیاسی معلومات ناقص اور ادھوری رہتی ہیں، اُردو داں طبقہ کو اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے !

علامہ اقبال نے "مجلس اقوام" کو "کفن چوروں" کی انجمن کہا اور خوب کہا اس میں شاعرانہ شوخی کے ساتھ واقعیت بھی پائی جاتی ہے — تاریخ کا حافظہ اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا کہ اٹلی نے

جب حبش کو ہضم کرلیا اور شہنشاہ نجاشی فریاد لیکر جنیوا میں پہونچا تو مجلس اقوام کے ارکان نے اُس مظلوم فریادی سے بات تک کرنا گوارا نہ کی، اسرائیلی حکومت جس کی بنیاد ناانصافی اور مکروفریب پر رکھی گئی ہے اس کا نمایندہ اسی مجلس اقوام کا رُکن ہے، کشمیر کا مسئلہ بالکل واضح ہے، مجلس اقوام کا ایک ایک رکن جانتا ہے کہ تمدنی، جغرافیائی اور عوام کے رجحانات کے اعتبار سے کشمیر کو پاکستان سے قریبی مناسبت ہے مگر ابھی تک یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے؟ دھواں دھار تقریریں، کمیشنوں اور ثالثوں کا تقرر، اس مجلس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے! فردوسی نے شاید اسی کے لئے کہا تھا:-

سہ پئے مشورت مجلس آراستند
نشستند و گفتند و برخاستند

مغرب کی خدا ناشناس سیاست مصلحتوں کا طلسم ہے، اُس کے ایوان میں اغراض و مفاد کے مُجسمے نصب ہیں اور اُس کے دستور، قوانین، اعلانات، اعلامیے، معاہدے، میثاق اور منشور خوشنما دھوکے ہیں، ضرورت کے وقت انصاف ہی کے نام پر بڑی سے بڑی ناانصافی اور سفاکی کا ظہور ہوتا ہے ——— یہ کتاب اس لئے بھی پڑھنی چاہیئے کہ خداوندانِ مغرب کی لفظی جادوگری اور سیاسی شیشہ بازی آشکارا ہوجائے۔

**جوڑ توڑ** "جوڑ توڑ" از:- شوکت تھانوی، لکھائی، چھپائی، جلد، گردپوش سب کے سب خوشنما، ضخامت ۳۶۰ صفحے۔ ملنے کا پتہ:- ادارہ "فروغِ اُردو" لاہور

جناب شوکت تھانوی کا نام ہی خود اپنا تعارف ہے، اُن کی دسیوں کتابیں چھپ کر مقبولِ عام ہوچکی ہیں اور اُن کے نئے ناولوں کا لوگوں کو انتظار رہتا ہے، یہ ناول جس پر ہم تبصرہ کررہے ہیں اس قدر دلچسپ ہے کہ کتاب ہاتھ میں لے کر جی چاہتا ہے کہ ختم کرکے ہی دم لیجئے۔

ناول کی سب سے بڑی خوبی اور فن کاری یہ ہے کہ شروع سے آخر تک "پلاٹ" مربوط رہے اور ناول کا کوئی حصہ "پلاٹ" سے غیر متعلق نہ ہونے پائے، یہ بات "جوڑ توڑ" میں پائی جاتی ہے، از اوّل تا آخر ناول کے ربط میں کہیں بھی "خلا" پیدا نہیں ہوا، نئے نئے واقعات پیش آتے ہیں اور کردار ادلتے بدلتے رہتے ہیں لیکن ناول کا مرکزی تصور قلم کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے وقت دل میں گدگدی سی ہوتی ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور کبھی کبھی بے اختیار قہقہہ بھی نکل جاتا ہے ۔۔۔ مگر ناول نگار اس مزاح و ظرافت مسکراہٹوں اور قہقہوں کے جُھرمٹ میں بھی وقار و سنجیدگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا، اور پھر اس میں صرف تفریح و تبسم کے لئے واقعات کی کڑیاں نہیں ملائی گئیں، بلکہ ناول نگار نے ایک "مُصلح اور مُبلّغ" کا فرض بھی انجام دیا ہے، "حق" بہت کڑوا ہوتا ہے مگر "جوڑ توڑ" کے مصنف نے اُسے قندو نبات میں لپیٹ کر پیش کیا ہے ——— مغرب زدگی پر چُبھتی ہوئی طنز کی ہے، یہاں تک کہ نمائشوں اور میلوں ٹھیلوں میں برقعہ پوش عورتوں کا جانا اور شریک ہونا بھی ناول نگار کی نگاہِ احتساب سے چُھپا نہ رہ سکا، "ناول" میں Romance بھی ہے مگر شرافت کی حد میں رہ کر! جہاں شوخی پیدا ہوگئی ہے وہاں بھی سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھُٹنے نہیں پایا، شوکت مسلمان ہے، اسلام کا اُس کے دل میں درد ہے، اس لئے بے دینی اور بے حیائی کی باتیں دیکھ کر اُس کو دُکھ ہوتا ہے معاشرے کی وہ اصلاح چاہتا ہے اور یہ احساس اُس کی تحریروں میں جھلکتا ہے ——— مغرب زدہ شوہروں کو شوکت تھانوی آئینہ دکھاتا ہے ———

ریحانہ نے کہا "آہا ہا! اگر میں لڑکا ہوتی تو ایسی بیوی ضرور لاتی، اس قسم کی بیویوں سے شوہر کو جو شہرت حاصل

تی ہو ذرا اُس کا تو اندازہ کرو، بجائے اس کے کہ عورتیں اپنے شوہر کی "مسز" کہلائیں اُن کے شوہر اس حیثیت سے مشہور
تے ہیں کہ وہ اُن کے شوہر ہیں، مجھ کو کتنا فخر ہوتا کہ میری بیوی ہر جلسہ میں چمکتی ہی ہو، اُس کے قہقہوں کی کھنک سے
اجتماع میں ایک زندگی کی لہر دوڑ رہی ہو، لوگ اُس کے لئے آنکھیں بچھا رہے ہیں اور میں اُس کا کوٹ اپنے شانوں پر
لے ہوئے بیٹھا آئس کریم کھایا کرتا، محض اُس کی وجہ سے مجھ کو بھی ہر پارٹی میں بلایا جاتا اور وہ مجھ کو سب سے ملایا
ی کہ آپ سے ملئے آپ میرے شوہر ہیں اور وہ لوگ اس طرح ملتے گویا کہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں اچھا جانور پالا ہے
ننے! وہ پیانو بجا کر سب کو سُناتی اور میں جھومتا کہ یہ میری بیوی کی زمزمہ باری ہے، وہ بال روم میں دوسروں کے
تھ ناچتی اور میں سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بنا بنا کر خوش ہوتا کہ بیوی اس وقت اتنے بڑے حاکم کے ساتھ ناچ

ی ہے (صفحہ ۱۲۸)

شوخیٔ بیان دیکھئے :-

سلمیٰ نے تڑپ کر کہا:- "ہائے! میں کیوں کر آئینہ دکھاؤں کہ شکیل کا نام آتے ہی تمہارے چہرے پر جو احتجاج
شان پیدا ہو جاتی ہے وہ عجیب قسم کے غازے کا کام کرتی ہے حُسن کی ترکیب بجلیوں، شوخیوں اور شرارتوں سے تو ضرور ہوتی ہے مگر
وڑی بہت پسپائی، اضمحلال اور افسردگی حُسن کو قیامت بنا دیتی ہے۔۔۔" (صفحہ ۲۰۲)

شکیل اپنی انگریز بیوی کے بارے میں کہتا ہے :- "اُس کی ساری لطافتیں اب تو کرخت ہو چکی ہیں (صفحہ ۲۰۷) یہ جملہ شعر
رمرتب ہے!

ناول نویس سے کہیں کہیں لفظ و بیان کی بھول چوک بھی ہو گئی ہے ——————— (صفحہ ۲۱)

"ارے بھئی شلجم لایا کرو، چقندر لایا کرو، لوکی ہے، پالک ہے، یہ آلو کیا داہیات ہے" اس میں "داہیات" کھٹکتا ہے "یہ
لو کیا بلا ہے" لکھنا چاہیئے تھا یا پھر "یہ آلو کیا داہیات چیز ہے" ——————— (صفحہ ۱۴) شیخ صاحب نے مرغیوں کے ڈربے
وکھولتے ہوئے فرمایا ——— "تو ٹھیک ہے جم جم آئیں آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے" یہ عورتوں کی زبان ہے، مرد اس طرح
نہیں بولا کرتے، عورتیں دُعا دیا کرتی ہیں کہ "جم جم رہو جگ جُگ جیو ست" ——————— (صفحہ ۳۰) "مگر آپ جیسے خوشگوار نوجوان
کے خلاف آخر وہ کون لوگ ہیں جو سازش کر سکتے ہیں" آدمیوں کو "خوشگوار" نہیں کہا کرتے یہ اگر جدت ہے تو ناروا جدت ہے۔
——————— (صفحہ ۷۶ اور ۸۶ پر) "محبوب صاحب چھکوں پھکوں رو رہے تھے ——————— اور "مجھ کو تو ایک جھبڑی جھبڑی لڑکی ستارہ
نام کی یاد ہے" "جھبڑی جھبڑی" اور "چھکوں پھکوں" مقامی محاورے معلوم ہوتے ہیں، ہمارے کان ان سے ناآشنا ہیں اور
پہلی بار سُن کر سامعہ نے دہشت سی محسوس کی ——————— (صفحہ ۸۶) "اب تو واقعی وہ ستارہ بن گئی تھی، چمکتا ہوا ستارہ،
سڈول جسم، نہایت شاعرانہ چہرہ" کہنا یہ مقصود ہے کہ ستارہ خوبصورت تھی اور اُس کے چہرے مہرے میں شعریت
پائی جاتی تھی مگر کہا یہ گیا ہے کہ اُس کا "شاعرانہ چہرہ" یعنی شاعروں جیسا چہرہ تھا! ——————— (صفحہ ۱۴)
"آخر میں کیوں مترجم بنوں، جو کچھ کہنا ہے تم خود کہو" یہاں "مترجم" (translator) کا نہیں
"ترجمان" (interpreter) کا محل تھا، ترجمہ اور ترجمانی کے فرق کو ناول نگار نے نظر
انداز کر دیا ——————— (صفحہ ۱۱۹) "جو آنکھوں سے کاجل تک نکال لینے پر قدرت رکھتے ہوں" "آنکھوں سے
کاجل چُرانا" بولا جاتا ہے ——————— (۱۶۶) "پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ایک پوٹلی میں باندھ کر کسی اندھے کنوئیں میں

جھونک دو" "کنوئیں میں ڈال دو یا پھینک دو" لکھنا چاہئے تھا، جھونکنا تو چولھے، بھاڑ اور بھٹی کے ساتھ بولا جاتا ہے ——— (صفحہ ۲۰۰) ریحانہ نے کہا، "خیر یہ تو طے ہے کہ شکیل ولایت سے آکر بھی وہی شکیل ثابت ہوں گے جو وہ دراصل ہیں بلکہ ولایتی معائب کا اضافہ ساتھ لائیں گے . . . " روزمرہ کی بات چیت میں اس قسم کا تکلف جو اس عبارت کے آخری حصہ میں پیدا ہو گیا ہے، ناگوار گزرتا ہے ———

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شوکت تھانوی اس قسم کی قلمی لغزشوں کے عادی ہیں، اُن کی تحریریں زبان کی سادگی اور سلاست کا مرقع نہیں گلدستہ ہوتی ہیں، اُن کا لہجہ شیریں اور انداز نگارش سادہ و پُرکار ہے" باتوں باتوں میں نفسیات کی نزاکتیں بیان کر جاتے ہیں اور "کردار نگاری" پر عبور حاصل ہے، اُن کی منجھی ہوئی زبان دوسروں کے لئے نمونہ اور مثال ہے ——— دین و اخلاق کا رنگ ذرا اور گہرا ہو جائے تو اُن کے ناولوں کی افادیت اور بڑھ جائے گی ——— "جوڑ توڑ" پر مصنف اور ناشر دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک اور تحسین کے پھولوں کی ڈالی!

## کلمہ طیبہ اور نور النور

(۱) "کلمہ طیبہ" ضخامت ۱۳۲ صفحے، قیمت درجہ خاص مجلد تین روپے، درجہ خاص غیر مجلد دو روپے، درجہ اوّل سادہ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ، درجہ دوم غیر مجلّد ایک روپیہ،
(۲) "نور النور" ضخامت ۱۲۴ صفحے، قیمت مجلد تین روپے، سادہ ڈھائی روپے ——— دونوں کتابیں مصنف (مولانا غوثی شاہ) سے بیت النور چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر طلب کی جا سکتی ہیں۔

گزشتہ شمارے میں "تصوف" کے موضوع پر ہم نے اظہارِ خیال کیا تھا، بالکل اتفاق کی بات ہے کہ اِسی مہینہ میں حیدرآباد دکن سے دو کتابیں تنقید کے لئے آ گئیں، جو دکن کے مشہور صوفی بزرگ مولانا غوثی شاہ صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ فاضل مصنف کی نیّت نیک، ارادہ بخیر اور یقین مستحکم ہے، اُن کا دل سوز و درد سے لبریز ہے اور ہر دل میں وہ اس سوز کو بھر دینا چاہتے ہیں، افہام و تفہیم کا انداز بھی دل نشین ہے، حدیث و قرآن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور تصوف تو اُن کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ "نور النور" کے بعض مقامات پر تو وجدان جھوم جھوم جاتا ہے، "کسب و فعل" کے بارے میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔

"یہ ہے قانونِ شریعت، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نسبت کسب کو حق تعالیٰ کی طرف ہرگز نہ پھیر دو ورنہ زندقہ ہو جائے گا اسی طرح خلقِ فعل کو خلق کی طرف کر دگے تو شرک و کفر ہو جائے گا (صفحہ ۵۵)

مولانا غوثی شاہ صاحب کی تحریر میں خلوص پایا جاتا ہے، اپنے معتقدات اور نظریوں پر وہ پورا یقین رکھتے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ ہر دل میں یہی کیفیت پیدا ہو جائے ——— اس اعتراف واقعی اور اظہارِ حقیقت کے بعد ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ ان دونوں کتابوں میں بعض باتیں بہت کچھ کھٹکتی ہیں اور وجدان بڑی اُلجھن محسوس کرتا ہے۔

(کلمہ طیبہ صفحہ ۱۱۶) "چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ" واتقوا اللہ "آیا ہے اُس کے بھی مجملاً دو اعتبار اور تفصیلاً چار قسم ہیں، جسمی جس کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے، پھر قلبی، روحی، سرّی جن کے خلاصہ اعتبارات یہ ہیں . . .

سمی تقویٰ :- مثلاً اعضاء و جوارح کا تقویٰ یہ ہے کہ اوامر و نواہی کی پابندی بدن سے عباداتِ بدنی کے اعتبار
سے ہو ——— قلبی تقویٰ :- قلبی یہ کہ ذہن و علم میں تسلیم و تصدیقِ ایمان کے ساتھ توجہ بحق رہے یہ کہ نفع و ضرر
تعلق نظر سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ کی فعلیت و ربوبیت کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے ——— روحی تقویٰ :- روحی
یہ کہ اعتبارِ روح سمجھ کر صفاتِ خلقیہ کے عدمی امتیاز کو ملحوظ رکھ کر صفاتِ الٰہیہ ذاتیہ کو پیشِ نظر رکھا جائے ———
سری تقویٰ :- یہ کہ خلق اور خلق کے ذوات و مراتب کو مرتبۂ ثبوت و ظہور میں جس اعتبار سے ان کے حقائق و ماہیات
ہیں سمجھ کر بعد تحقیق ان مظاہر کو جان کر، شہودِ حق باعتبار بصیرت پیشِ نظر رکھا جائے اور ان سب باتوں کے حصول کے لئے ولیٔ مرشد
کے ارشاد و تعلیم و تفہیم کی ضرورت ہے۔ ۔۔ ۔۔

آیاتِ قرآنی کی اس تصوف آمیز تفسیر میں ہم جیسے کم علموں اور ظاہر بینوں کے تو کچھ پلّے نہیں پڑتا اور ہم تو اللہ کی آیات
کی اُس انداز پر کھلی کھلی تفسیر چاہتے ہیں جس طرح خود قرآن نے اونٹ، سبزہ، پہاڑ اور آسمان و زمین کی سمجھ میں آنے والی مثالیں
دے کر اللہ کی پہچان بتائی ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو صاحبِ تقویٰ بھی تھے اور قرآن کے سب سے زیادہ
سمجھنے والے بھی، اُنھوں نے قرآن کی اس نہج پر تفسیر نہیں کی ——— اور یہ "علم" اُس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔
صفحہ (۱۳۰) پر ارشاد ہوتا ہے :- نفی خلق کرو تو خالق خدا ——— نفی خالق کرو تو سب فنا، رسول کو دیکھو تو اللہ نما ——— اللہ کو دیکھو تو رسول نما۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اس قسم کی تحریروں سے دل کی گرہیں کھلنے کے بجائے الجھنیں اور بڑھتی
ہیں، خواص کے احوال و مقامات اور واردات و کیفیات کا ہمیں پتا نہیں مگر عوام کو اس سے نفع کے مقابلہ میں نقصان زیادہ
پہونچنے کا امکان ہے۔

"نور النور" کے صفحہ (۲) پر لکھتے ہیں :——— "اسی حال میں تھا کہ ایک تجلّی باطنی ہوئی یعنی شیخ اکبر سیدنا محی الدین
عربی رحمۃ اللہ علیہ کے فیضان کا عرفانی سمندر سامنے ہو گیا، تلافیٔ مافات ہوئی، خوب سیر ہوئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ اسی رنگ میں
تھے کہ یکایک پھر ایک تجلّی ہوئی جس سے اوّل تو حیرانی ہوئی پھر تسکین نظارہ کرنے لگا تو آواز آئی کہ ہاں! ذرا سر اِے
الٰہی کی طرف نکل" ۔۔ ۔۔ ۔۔ صحابہ کرام سے بڑھ کر اور کون حقیقت آگاہ اور معرفت شناس ہو سکتا ہے۔ مگر
کسی ایک صحابی نے بھی "مجھ پر تجلّی ہوئی" نہیں کہا، اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو ان نفوسِ قدسیہ پر تجلّی ہی سرے
سے نہیں ہوتی یا پھر "تجلّی کا ہونا" کوئی دینی ضرورت نہیں ہے اور نہ وہ "حجت" بن سکتی ہے!

اپنے پیر و مرشد کی مدح میں غوثی شاہ صاحب فرماتے ہیں" اب تو یہ" غوثی کے حق میں کریم اللہ شاہ ہے، شیخ
اکبر ہے، بندہ نواز ہے، غریب نواز ہے، غوثِ اعظم ہے، حبیب اکرم ہے، خدا کا جلوہ ہے، پھر کچھ اور ہے، پھر کچھ اور
ہے ۔۔ ۔۔ " عقیدت و منقبت کی یہ "افراط" بہت خطرناک ہے اور یہ نتیجہ ہے "شریعت" کو "ظاہر" کہہ کر اُسے تیسرے
درجہ کی چیز سمجھنے کا! اللہ تعالیٰ نفس کے نازک فتنوں سے بچاتا رکھے۔

اسی صفحہ پر پھر ارشاد ہوتا ہے :- "اُسی (یعنی پیر و مرشد) کے در کا گدا ہوں، اُسی کا کہلاتا ہوں، ایک اُس
کے ہونے سے سب کا ہو گیا، بندہ نواز کا پیارا ہے، غریب نواز کا لطف ہے، شیخ اکبر کی عنایات ہیں، غوث پاک
کے الطاف، شاہِ ولایت کی نوازش، شاہِ صدیقیت کی توجہ، حبیبِ حق کا کرم، خدائے عالم کا فضل ۔۔ ۔۔"
ایک طرف وہ شوراشوری کہ خدا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور دوسری جانب یہ بے نمکی کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بزرگو

کی روحوں کی طرف سے بھی توجہ و عنایت کا فیضان ہوتا ہے، اس تضاد کو آخر ہم کیا سمجھیں! اور حیرت ہے کہ لکھے پڑھے لوگ بھی اُن "خطابات اور القاب" کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں، جو عوام کی عقیدت نے تراشے ہیں ——— توحید پر ایمان رکھنے والوں کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں، اللہ ہی "مشکل کشا" "غریب نواز" اور "بندہ نواز" ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار اپنی اس صفت کو دہرایا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا دُکھ درد کوئی دُور نہیں کر سکتا!

"وحدت الوجود" پر صاحبِ تصنیف نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور بہت ہی نازک باتیں بیان کی ہیں، اس سلسلہ میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ عبد الکریم جیلی، مولانا جلال الدین رومی اور مولانا جامی کے اقوال بھی پیش کئے ہیں اور سب کو "وجودی" کہا ہے اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی نے "وحدت الوجود" کی جو نفی کی وہ در اصل "نفی" نہ تھی صرف لفظی اختلاف تھا، مجدد صاحب شہودی بھی ہیں اور وجودی بھی ——— غنیمت ہے کہ ان دو طبقوں تک ہی معاملہ محدود رہا، ورنہ کیا عجب تھا کہ ہبوطی، صعودی اور اسی انداز کے کچھ اور طبقے اور گروہ بھی پیدا ہو جاتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نام "مومن" اور "مسلم" ہیں اور نام کی یہ وحدت باقی رہنی چاہیئے تھی۔

"وحدت الوجود" کے اسرار و غوامض، ہم جیسے اہل ظواہر کی سمجھ میں نہیں آتے اور نہ اُن کے سمجھنے کی ہمیں تکلیف دی گئی ہے، رسول اللہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تمام کر دیا، اس "دین" میں ظاہر اور باطن سب کچھ موجود ہے، دین کی راہ بہت ہی واضح اور سیدھی سادی ہے، معروف و منکر بتا دیئے گئے ہیں رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں، دین کے مسائل کو وہ کس طرح سوچتے تھے اور کس انداز پر گفتگو کرتے تھے، وہ سب کتابوں میں موجود ہے، ہمارے لئے ہدایت کے یہی چراغ کافی ہیں، قیامت کے دن ہم سے ہرگز یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے اسرار و رموز کو کیوں نہیں سمجھا؟ اور نہ بزرگوں کے قلبی واردات اور باطنی کیفیات کے بارے میں ہم سے پوچھ گچھ ہوگی۔

صفحہ (۱۰۹) پر لکھا ہے:— "شطحیات، اصطلاح میں بزرگانِ دین کے اُن کلمات کو کہتے ہیں جو بحالت استغراق و مستی وغلبہ، عشق بظاہر خلاف شرع صادر ہوں جیسے حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے "انا الحق" کا نکلنا..... ...... چونکہ یہ کلمات باعتبارِ نفس نہیں ہوتے، غلبہ محویت و فنا کی وجہ سے ہوتے ہیں، برایں بنا یہ حضرات معذور ہیں، چنانچہ اسی وجہ سے کسی کامل نے ان کا انکار نہیں کیا"

اگر "استغراق و مستی" اچھی چیز ہے تو صحابۂ کرام اور تابعین کی مقدس زندگیوں میں ہمیں کیوں نظر نہیں آتی؟ اور اگر یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے تو پھر ایسے ایسے اصطلاحیں تراش کر اُسے "محمود" کیوں بنایا جاتا ہے، خلاف شرع الفاظ کو اگر انگیز کیا جا سکتا ہے تو پھر اگر کوئی شخص معصیت کا ارتکاب کر رہا ہو، اُسے آپ ٹوکنے کا کیا حق رکھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ فعل بہ اعتبارِ نفس نہ ہو، بلکہ اس کا سبب غلبہ ہو! حالانکہ کسی خواہش یا جذبہ کا "غلبہ" جو شریعت کی حدود توڑتا ہے اُسی کا نام "معصیت"[1] ہے! اور معصیت پر اصرار کرنا اور زیادہ مضرت کا سبب ہے ——— ہم اُس "تصوّف" کو مانتے ہیں جس کا فلسفۂ اخلاق کتاب و سنت کے عین مطابق ہو، "انا الحق" والے تصوّف پر ہم یقین نہیں رکھتے۔

[1] اس کی تاویلیں کرنے میں اور برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مصنف کی چند نظمیں بھی کتاب میں درج ہیں جن کے چند شعر :—

میں بندہ حق کا ہوں لیکن خدا نما بندہ ‌ ‌ ‌ ‌ خدا ہے بندہ نما لا الٰہ الّا اللہ
خودی مٹی تو خود آیا، خدا خودی میں نظر ‌ ‌ ‌ ‌ ہمیں تھے اس سے جدا لا الٰہ الا اللہ

---

وہیں میں بولتا ہے، جانتا ہے میں ہوں میں لیکن ــــ نہ تو تن ہے، نہ تو دل ہے، نہ تو جاں کون گویا ہے
ں جب اسی قسم کے خیالات "تصوف" کے نام سے پیش کئے جاتے ہیں، تو اُن سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے، تصوف
ی "شاعرانہ شوخیوں اور مستیوں" ہی نے اُسے بدنام اور مشتبہ بنا دیا ہے ــــــ مولانا غوثی صاحب اپنے واردات
ورات کا اظہار ناگزیر ہی سمجھتے ہیں تو "نثر" ہی حد تک اُنھیں محدود رکھیں "نظم" میں اور زیادہ اُلجھنیں پیدا ہو جاتی
ور اس طرح اُن کا کیس ( case ) کمزور ہو جاتا ہے، پھر وہ موزوں طبع ضرور ہیں مگر شاعر نہیں ہیں۔
ـ ہر شخص کے لئے شعر کہنا ضروری بھی نہیں ہے۔

**نامہ "شاعر"** سالنامہ "شاعر" مرتبہ :— اعجاز صدیقی ضخامت ۱۸۰ صفحے، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، سالانہ چندہ ساڑھے پانچ روپے ــ ملنے کا پتہ :— مکتبہ قصر الادب آگرہ۔

"شاعر" اُردو کا مشہور ماہنامہ ہے جو مسلسل اکیس سال سے سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اُردو ادب کی خدمت
م دے رہا ہے ۱۹۵۶ء کا یہ سالنامہ جناب اعجاز صدیقی نے بڑے سلیقہ اور کاوش کے ساتھ ترتیب دیا ہے،
امین میں تنوع پایا جاتا ہے، لکھائی چھپائی بھی دیدہ زیب ہے اور اُردو کے بہت سے مشاہیر ایک جگہ اکٹھے نظر آتے
ــــ صحافت اور شاعری حضرت سیماب اکبرآبادی کے گھرانے کی روایت بن گئی ہے، جناب اعجاز صدیقی سے
اسی انداز کے سالنامے کی توقع رکھتے تھے۔
سالنامہ "شاعر" کے تنقیدی مضامین اور علمی مقالے عام سطح سے بلند ہو کر لکھے گئے ہیں، اُن میں کام کی باتیں ملتی
اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، مختصر مضامین بھی افادیت سے خالی نہیں .. شلاً "مرثیہ یا رزمیہ" صرف تین صفحے
مضمون ہے لیکن مضمون نگار کی وسعتِ مطالعہ اور فکر و نظر کی گہرائی ایک ایک سطر سے ظاہر ہوتی ہے ــــــ بعض
یں کھٹکتی ہیں :—
ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ (۶۱) پر رقم طراز ہیں :— "شاعر فضا کی نئی لرزشوں کو پیتا ہے" "لرزشوں کا پینا"
لی بارسنا اور وجدان بخدا تلملا کر رہ گیا، زبان میں جدت و اضافہ کے ہم مخالف نہیں ہیں لیکن یہ کسی نہ کسی اُصول کے
ت ہونا چاہیئے ــــــ افسوس ہے کہ نام نہاد "ترقی پسند ادب" کی بے راہ روی نے غیر شعوری طور پر
چھے اچھے ذہنوں پر اپنا نحوس سایہ ڈال دیا ــــــ آگے چل کر فرماتے ہیں :— "جوشؔ کی فطرت
سنگ، ایک بالکل مختلف آہنگ سے تیار ہوا ہے، "فطرت کے سنگ کا تیار ہونا بھی" عجیب سی بات ہے،
طرت کا سانچہ یا اسی قبیل کی کوئی مناسب بات کہنی اور لانی چاہیئے تھی"۔
صفحہ (۱۰۸) پر علی عباس حسینی کے افسانہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ــــ "باہر دسمبر کی کالی رات تھی،
راؤنی ٹھٹھرائی ہوئی، یخ سے ڈھکی ہوئی ... ..." اس جملہ میں "باہر" بے محل استعمال ہوا ہے، پھر رات کو "یخ سے

ڈھکی ہوئی کہنا" اور بھی عجیب تر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ صفحہ ۱۲۴ "پر " دل کی سنگدل چٹانیں" لکھا ہے جو " شب برات کی رات" والی ترکیب ہے، رسالہ کے ایڈیٹر کے یہ فرائض میں داخل ہے کہ مضامین میں اس طرح کی سامنے کی غلطیوں کو تو کم از کم نہ رہنے دے۔

حضرت سیماب اکبر آبادی کی غزل کا مقطع ہے :۔ ؎

دیکھتا ہوں کہ سیماب رنگ وفا، صورتِ فصلِ گل جوشش پر ہے

میری آنکھوں میں ہے اشکِ خوں کی جھلک پھولوں میں اُمڈا ور رس کا

لفظ "رس" میں جو لطافت ہے "اُمڈاؤ" نے اُسے مجروح کردیا، پھر پھولوں میں رس کا اُمنڈنا بھی محلِ نظر ہے۔۔۔۔ اس قسم کی غیر مروج زمینوں اور مزاحف بحروں میں شگفتہ شعر مشکل ہی سے نکلتے ہیں ہاں باعروض دانی قادر الکلامی اور استادانہ مہارت کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے۔

اثر لکھنوی کی غزل (صفحہ ۹۵) اُن کے شایانِ شان نہیں ہے، اعجاز صاحب کو چاہیئے تھا کہ اس غزل کو واپس بھیج کر اثر صاحب سے کوئی شگفتہ اور جاندار غزل طلب کرتے، مطلع ہے :۔

جنھیں کچھ ربط ہے سوزِ نہاں سے بہاریں لوٹ لیتے ہیں خزاں سے

"سوزِ نہاں" یہاں معنوی اعتبار سے بہت گنجلک ہے، "سوزِ نہاں" سے اگر سوزِ دل اور سوزِ باطن مُراد ہے تو سوزِ دل سے یہ روایت اور عمل ( sentiment ) وابستہ نہیں ہے کہ خزاں سے وہ بہاریں لوٹا کرے۔۔۔۔ دوسرا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے، شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "وہ لوگ خزاں سے بہار پیدا کر لیتے ہیں" مگر "لوٹنے" سے اس خیال کی ترجمانی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ رونق دکنی کی غزل کا ایک شعر ہے :۔

؎ وجہ ثباتِ ہستی رہی ہیں یہ علم شاید اُن کو نہیں ہے

"ہستی" سے یہاں ممکنات کی ہستی کی مُراد ہے اور یہاں جن کلیہ" کے طور پر ایک حقیقت کو پیش کیا گیا ہے اُس سے ہم "مجاز" مُراد لے ہی نہیں سکتے اور لیں گے تو یہ خود ایک مضحکہ انگیز مبالغہ آرائی ہوگی، کسی محبوب کی ذات بھی وجہ ثبات ہستی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اب رہی حقیقت تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی ذات ثبات ہستی کا سبب ہے، اور واجب الوجود ہی کے سہارے ممکنات قایم ہیں لیکن دوسرے مصرعہ کی کیا توجیہہ کی جائے گی، کیا اللہ تعالےٰ اپنی اس صفت (قیومیت) سے بے خبر ہے (نعوذ باللہ)۔

جناب اعجاز مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے بھارت ورش کی اُردو کُش فضا میں اس قدر شاندار سالنامہ نکال کر حقیقت میں ادبی جہاد کیا ہے، چلتے چلاتے ایک بات اور کہہ دیں۔۔ ۔۔ ۔۔ قدیم روسی ادب کے معمار" کے ساتھ اگر اسلامی ادب پر بھی کوئی مقالہ سالنامہ کی زینت ہوتا تو افادیت کے ساتھ تنوع میں بھی اضافہ ہو جاتا، مسلمان ادیبوں، شاعروں اور صحافت نگاروں کو اپنا فرض پہچاننا چاہیئے کہ اُن پر کسی مقصد کی تبلیغ واشاعت کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے!

**کشمیر نمبر** | کشمیر نمبر ماہنامہ خاتونِ پاکستان" مدیرہ :۔ ایم، شفیق بریلوی، ضخامت ۱۱۹ صفحے بڑے سائز پر، تصویروں اور کارٹونوں کے ساتھ!

ون پاکستان (کراچی) کا یہ "کشمیر نمبر" ہے جسے جناب شفیق بریلوی نے ترتیب دیا ہے، پاکستانیوں کو سرزمین
اس قدر گہرا ربط اور دلی لگاؤ ہے کہ اُسے کوئی طاقت چھین نہیں سکتی، یہ شمارہ اسی جذبہ اور تصور کا مظہر ہے۔
دیباچہ میں (جس کا عنوان سخن ہائے گفتنی ہے) ایڈیٹر نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کشمیر کی کل آبادی
لاکھ اکیس ہزار ہے جس میں سے نصف آبادی یعنی اُنیس لاکھ اکیاسی ہزار باشندے جموں میں رہتے ہیں اور
فرقہ وارانہ تناسب یہ ہے کہ ستتر فی صد مسلمان ہیں بیس فی صدی ہندو اور دو ڈھائی فی صد سکھ اور دوسری
یہ اعداد ہی خود اپنی زبان سے اشارہ کر رہے ہیں کہ کشمیر کا الحاق پاکستان ہی سے ہونا چاہیئے۔
کشمیر نمبر" کے بعض مضامین فکر و خیال کے علاوہ زبان کے اعتبار سے بھی بہت دل کش ہیں، "کشمیر کی سیر" میں
جاوید کے قلم نے بہار آفرینی کی ہے اور پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے سرزمین چنار کے خنک سایہ میں پہونچ جاتا ہے۔
نشاط باغ میں ایک حادثہ" ڈاکٹر ضیا ہاشمی کا دلکش افسانہ ہے، جس میں زبان و بیان ہی کا لطف نہیں فکر و
وسعتیں اور گہرائیاں بھی ملتی ہیں، افسانہ میں حسن و محبت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے مگر اس کا اختتام کس
افروز اور ولولہ انگیز ہے ——
مساجد سے حیّ علیٰ الفلاح کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، پرچم آزادی کی تہیں کھل رہی ہیں آتش کدۂ
دی کو گلزار بنا دینے کے لئے ابراہیم پیدا ہو چکا ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔"
ہمی کا پاکستان آجانا شعر و ادب کی دنیا کا ایک خوشگوار حادثہ ہے، مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگ اُن کو جانتے
فیق بریلوی کی کوششوں سے شاید وہ پہلی مرتبہ پاکستان کے ادبی اُفق پر ضیا پاش ہوئے ہیں۔
نظمیں زیادہ بلند نہیں ہیں ان کا انتخاب کر لیا جاتا تو بلندی و پستی کی یہ ناہمواری جاتی رہتی، فاروق محشر کی
تہ اور جاندار ہے —— صفحہ ۱۷ پر ایک نظم ہے :——

ے اے شہادت گہِ عظمت کے علمبردارو!

ت گہِ اُلفت" کی ترکیب تو ٹھیک ہے مگر یہ "شہادت گہِ عظمت" کیا بات ہوئی! شہادت گہِ عظمت کے تو یہ
ہوئے کہ جہاں عظمت کی قربانی دی جاتی ہو اور اس میں تحسین کا نہیں ذم کا پہلو ہے پہلے بند کا چوتھا مصرعہ ہے:۔

ے سیلِ اظلام میں ہے کشتیِ آئینِ حیات

یلِ اظلام" کتنی نامانوس ترکیب ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایک اور شعر ہے:۔

ے اپنی دیرینہ روایات کو زندہ کردو بھوک اور تشنگی مٹ جائے گی خلاق بنو

خلاق" بننے سے بھوک اور پیاس دور ہو جایا کرتی ہے، اور "خلاقی" آخر کس چیز کی؟ اس شعر میں اس کی طرف
سا اشارہ بھی نہیں ملتا، پھر دیرینہ روایات کو جب زندہ کیا جائے گا تو وہ "تخلیق" (Creation)
"احیا" اور "تجدید" (Revival) ہوگی۔
یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آج کل شاعری کا قافلہ اسی انداز پر گامزن ہے، ذہن و فکر کا سلجھاؤ قریب قریب
ہے، لوگ الفاظ بھی ٹھیک طور پر نہیں برت سکتے، موقعہ بے موقعہ جو لفظ جہاں چاہتے ہیں تھوپ دیتے ہیں
س بے راہ روی کا یہی عالم رہا تو اُردو کا مستقبل اندیشہ ناک ہے ——

**جہانِ نو افسانہ نمبر** "جہانِ نو" کا افسانہ نمبر ... مرتبہ :- اسعد گیلانی، محمد صدیق الحسن، ضخامت ۲۲۶ صفحے، قیمت ڈیڑھ روپے، ملنے کا پتہ :- جہانِ نو، یعقوب خاں روڈ، کراچی۔

پاکستان اور ہندوستان میں جو رسالے اور اخبار جاہلی ادب کے مقابلہ میں اسلامی ادب پیش کر رہے ہیں، ہفت روزہ "جہانِ نو" اس منزل میں پیش پیش ہے، "جہانِ نو" زمانہ ستیز فطرت لے کر میدانِ صحافت میں آیا ہے، حق گوئی اُس کا مسلک اور خدمتِ اسلام اُس کی پالیسی ہے، کسی بڑے سے بڑی دنیوی لالچ اور خوف کے سبب بھی اُس کے پائے استقامت میں جنبش نہیں آسکتی یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کو حق سمجھ کر قبول کیا ہے، اور کوئی دُنیوی خطرہ اور مادّی قوت اس راہ سے انھیں ہٹا نہیں سکتی۔

جہانِ نو کا زیرِ تنقید" افسانہ نمبر" ایک کامیاب ادبی پیشکش ہے، اُس کے تمام کے تمام افسانے وقار اور متانت و سنجیدگی کے حامل اور اسلامی تصورات کے ترجمان ہیں، اسلام پسند افسانہ نگاروں نے دُنیا کو بتایا ہے کہ ادبی دلچسپیاں رومان نویسوں کا ہی حصّہ نہیں ہیں، "حق" اگر سلیقہ سے پیش کیا جائے تو اُس کی دلچسپی بڑی اثر انگیز ہوتی ہے۔

وہ زمانہ لد گیا جب خدا پرستوں کو "ملّا" کہہ کر نظر انداز کرنے کی سعی کی جاتی تھی۔ آج کا مسلمان ادیب زمانہ کے تمام تقاضوں سے باخبر ہے اور وہ شعروادب، نظم و افسانہ اور علم و تنقید کے ہر محاذ پر جاہلی ادب کے پرستاروں کا مقابلہ کرسکتا ہے ــــــ بلکہ شکست دے سکتا ہے۔

ادارہ "جہانِ نو" کی خدمت میں ہدیۂ تبریک ــــ ہماری طرف سے! اور اس کا حقیقی اجر تو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ سے ملے گا ــــ

ماہنامہ

# فاران

ماہر القادری

جلد ۲ شمارہ (۴)

ماہنامہ

# فاران

جولائی ۱۹۵۰ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ آٹھ آنے
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ گیارہ آنے

مقامِ اشاعت

"فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی

## نظم و ترتیب

صفحہ



### حصۂ نظم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# نقشِ اوّل!

نسیم سحری کی خوش خرامیوں اور بادِ صبا کے نرم جھونکوں میں کسی درخت کا اپنی جگہ قایم رہنا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے، اس فضا میں تو نرم و نازک پودے بھی لہلہاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہم نے چھوئی موئی کو بھی جھومتے دیکھا ہے ——— ہاں! جب تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں پُر شور طوفانوں کا زور ہو، درختوں کی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں، کمزور پودوں کی جڑیں اُکھڑی جا رہی ہوں، سارا ماحول انتہائی بھیانک اور خوفناک ہو ——— اس عالم میں کسی درخت کا استقامت کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہنا یقیناً تحسین و ستایش بلکہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

دریا میں سکون ہوتا ہے تو کائی کی ہلکی پھلکی تہیں بھی اپنی جگہ جمی رہتی ہیں اور کمزور سرکنڈے بھی پانی میں مضبوطی کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں مگر حقیقت میں آفریں اُس سفینہ کو جس کا بادبان اور تختے دریا کے طوفان کا اس بے جگری کے ساتھ مقابلہ کریں کہ خود بپھری ہوئی موجیں سرنگوں ہو جائیں اور طوفان اُترنے کے بعد محسوس ہو کہ اس ایک سفینہ کے سوا دریا اور اُس کے پاس کی ہر چیز تہ و بالا ہو گئی، یہاں تک کہ ساحل اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خود دریا کا رُخ بدل گیا۔

سکون و راحت کی آغوش میں زندگی بسر کرنا کوئی قابلِ تعریف کارنامہ نہیں ہے، یہ تو بلبل اور قمری و طاؤس کی زندگی ہوئی کہ جو ساز گار ماحول اور خوشگوار فضا میں نغمہ سرائی کرتے ہیں اور خوبصورت پروں کے ساتھ ناچ بھی لیتے ہیں انسانی زندگی کے جوہر تو حوادث و مصائب کے طوفان میں کھلتے ہیں، امتحانوں اور آزمایشوں کی بھٹی میں سیرت و کردار کا کھرا اور کھوٹا پن ظاہر ہوتا ہے، اور پُر شور ہواؤں میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کس کے آشیانۂ حیات میں طوفانِ برق و باد سے مقابلہ کرنے کی کتنی سکت تھی۔

حریر و دیبا اور مخمل و سنجاف کے نرم گداز فرش پر ہر کوئی گرم خرام ہو سکتا ہے مگر بات تو جب ہے کہ خارزار راہ میں آئے، اور وہاں سے کوئی مردانہ وار گزر جائے، پاؤں چاہے لہو لہان ہو جائیں مگر قدم چلنے سے رکنے نہ پائیں مردانِ راہِ وفا دشواریوں سے گھبرایا نہیں کرتے ——

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

دکھ درد تو زندگی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ایک حالت میں کسی کی سدا بسر نہیں ہو سکتی، کوئی "غمِ عشق" میں مبتلا ہے۔ تو کسی کو "غمِ روزگار" کھائے جا رہا ہے، زمانہ ہر آن انقلاب آمادہ ہے، کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی کی راتیں: کوئی زندگی بھی بیم و رجا کی دھوپ چھاؤں اور مسرت و غم کے اتار چڑھاؤ سے نہیں بچ سکتی، ہر مسکراہٹ اپنے پیچھے آنسوؤں کا ایک سلسلہ رکھتی ہے، مسرتوں کے ہجوم اور عیش و فراغ کے جھرمٹ میں بھی سکون کہاں میسر آتا ہے، اضطراب آدمی کی فطرت میں سمو دیا گیا ہے۔

عیش کے نرم رو دن ہوں کہ غم کی پہاڑ جیسی راتیں، سب گزر ہی جاتی ہیں، ان میں سے کسی کو ٹھیراؤ نہیں ؎ شبِ سمور گزشت و شبِ تنور گزشت، وقت کا ایک لمحہ بھی نہ تو بادشاہ کی دل دہی کے لئے ٹھیرتا ہے اور نہ غریب کی غم خواری کے لئے اُس کی رفتار میں کمی آتی ہے، پریشانیوں کے ہجوم میں گھبرانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا، بلکہ بدحواسی، گھبراہٹ، عزم کی کمزوری اور پستی معاملہ کو خراب کر دیتی ہے۔

زندگی صرف کھانے پینے، نہانے دھونے، چلتے پھرتے رہنے اور سانس لینے کا نام نہیں ہے، اگر یہی زندگی ہے تو پھر آدمی کا مقام رینگنے والے کیڑوں سے زیادہ بلند نہیں ہے —— حالانکہ کسی آدمی کو "کیڑا" کہہ دینا اُس کے لئے بہت بڑی گالی ہے! آدمی کی زندگی ایک مقصد سے وابستہ ہے، اور اسی مقصد کے لئے وہ زندہ رہتا ہے، جس زندگی میں مقصد نہ ہو، وہ زندگی کاہے کو ہے ایک طرح کی موت ہے، یا زیادہ سے زیادہ ایک خواب!

زندگی کی حفاظت اور جان کا بچاؤ اس لئے نہ ہونا چاہیئے کہ ہمیں کھانے پینے اور چلنے پھرنے کے لئے بس زندہ رہنا ہے، اگر اس ذلیل اور پست تصور کے ساتھ جان بچ بھی گئی تو وہ موت سے بدتر ہے، ایسے کمزور انسان دنیا میں عزت کا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے، اُن کے ضمیر مردہ، اور اُن کے دل تاریک ہو جاتے ہیں اور ذلتیں اُن کی قسمت میں لکھ دی جاتی ہیں —— اور "مقصد" کی حفاظت کے لئے اگر جان بھی چلی جائے تو وہ بہت بڑی کامیابی اور فتح مندی ہے، قربانی کا بیج رائگاں نہیں جاتا، یہ ایک دن برگ و بار لا کر رہتا ہے۔

## اسلام کا رشتہ

ہمیں دوسری قوموں سے سروکار نہیں ہے کہ اُن کا مقصدِ حیات اور تصورِ زندگی کیا ہے؟ اور نہ ان کے معتقدات پر ہم تنقید کرنا چاہتے ہیں، ہم تو اُن انسانوں سے چاہے وہ دنیا کے کسی پردے پر بھی رہتے ہوں، مخاطب ہیں جنھوں نے اللہ کو اپنا رب، محمدؐ کو اپنا پیشوا اور خدا کا آخری رسول اور قرآن کو ہدایت و سعادت کا منشور اور زندگی کا دستور سمجھ کر قبول کیا ہے۔

پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب ایک ہی ہار کے موتی، ایک ہی گلدستہ کے پھول اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، ملک بٹ سکتے ہیں، مملکتیں تقسیم ہو سکتی

ہیں سلطنتوں کے حصّے بخرے کئے جا سکتے ہیں مگر "اسلام" نہیں بٹ سکتا یہ ناقابلِ تقسیم ہے، ملکوں کی حدبندیاں بھی دین کی راہ میں روک نہیں بن سکتیں، میدانوں کی بے پناہ وسعت، سمندروں کی اتھاہ گہرائی اور پہاڑوں کی سر فلک بلندیاں بھی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتیں، دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر اسلام کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔

ہم حکومتوں کی مصلحتوں کو نہیں جانتے، ہمیں تو اسلام کی اُخوت نے یہ بتایا ہے کہ مشرق کے مسلمان کے تلوے میں اگر کانٹا چبھے تو اُس کی کھٹک مغرب کے مسلمان کے دل میں ہونی چاہیئے، اُس مسلمان میں دینی غیرت باقی نہیں رہی جو اپنے بھائی کی پریشانی اور دُکھ درد کی بپتا سن کر اپنے دل میں کسی قسم کی خلش اور بے چینی محسوس نہیں کر سکتا۔

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوش تر
زچشمیکہ پیرایۂ نم نہ دارد

پس دُنیا کے جس حصّہ میں بھی جو مسلمان ستایا اور پریشان کیا جا رہا ہے، وہ یہ نہ سمجھے کہ اُس کے درد سے سینے خالی ہیں، نہیں یہ بات نہیں ہے، کروڑوں دلوں کا اضطراب اُس کے ساتھ ہے، بے شمار آنکھوں کے آنسو اُس کے ہمراہ ہیں اور لاتعداد روحوں کی بے چینیاں اُس کی ہم نوا ہیں۔ ایک مسلمان کا درد، پُوری قوم کا درد ہے، انتہائی بیکسی اور مظلومیت کے عالم میں بھی کوئی اپنے کو یکہ و تنہا نہ سمجھے، ہر اہلِ ایمان کا دھڑکنے والا دل اُس کی فریاد پر "لبیک" کہہ رہا ہے۔

طوفان سے مقابل ہونا، حوادث کی چوٹ کو سہنا اور انقلابات کی زد کو برداشت کرنا مسلمان کی فطرت ہے اُس کی تاریخ اسی مد و جزر اور اُتار چڑھاؤ سے بھری ہوئی ہے، تاریخ کا کوئی ایک دور بھی ایسا نہیں گزرا جس میں باطل، حق سے نہ ٹکرایا ہو، یہ کشمکش تو سدا سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی ـــــ بلکہ رہنی چاہیئے!

یقیناً مسلمان کے لئے وہ گھڑی سخت نازک، انتہائی تکلیف دہ اور صبر آزما ہوتی ہے جب خود اسلام، قرآن اور رسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر فتنہ پردازوں کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی تہمتیں جوڑی جاتی ہیں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے کلچر کو چھوڑ کر، اکثریت کا کلچر اختیار کر لیں، ورنہ ... ... ... ؟ مگر اس کا جواب گھبراہٹ بدحواسی، گراوٹ، پست ہمتی اور بُزدلی نہیں ہے، یہ چیلنج اسی غرض سے تو دیا جاتا ہے کہ مسلمان پریشان اور سراسیمہ ہو جائے، اُس کے پاؤں نہ جم سکیں اور اُس کے عزائم میں زیادہ سے زیادہ پستی پیدا ہو جائے، اگر مسلمان کی طرف سے ان باتوں کا ظہور ہوا تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ ہار گیا اور دشمن جیت گیا۔

ایسے مواقع پر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی دینی اور قومی روایات کے چھوٹے سے چھوٹے جُز کی، بے جگری، سر فروشی اور بے باکی کے ساتھ حفاظت کرے، اسلامی کلچر کے سانچے میں خود کو پُوری طرح ڈھال کر دنیا پر یہ ظاہر کر دے کہ یہی "کلچر" تو میری زندگی ہے، میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا ـــــ بہت سے بہت یہی ہو گا کہ اپنے دین کی حفاظت اور کلمۂ حق بلند کرنے کی پاداش میں جان چلی جائے گی مگر جان تو بہرحال ایک نہ ایک دن جانی ہے، مرنا بہر طور مقدر ہے، فنا ناگزیر ہے اور موت سے کسی کو بھی رستگاری نہیں! لوگوں کے سامنے گڑگڑانے، عجز پیش کرنے اور بُزدلی دکھانے سے بھی موت نہیں ٹل سکتی، وقت سے پہلے کوئی کسی کو

مار نہیں سکتا، موت وحیات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جب تک زندہ رہنا مقدر میں لکھ دیا گیا ہے، اس کی ایک گھڑی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتی ——— تو پھر جب موت آنی ہی ٹھہری، تو وہ اس حالت میں کیوں آئے کہ پیشانی آستانۂ غیر پر جھکی ہوئی ہو، یہ تو منافقوں اور بزدلوں کی موت ہوئی !

سچائی کی راہ اور حق کے راستہ میں، "مظلومیت" کی بھی ایک منزل ضرور آتی ہے اور تو اور انبیاء کرام تک کو اس وادیٔ پُر خار سے گزرنا پڑا ——— مگر یہ بھی یاد رکھیئے کہ "مظلومیت"، نصرت و کامرانی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے، تاریخ ایسے بہت سے مظلوموں اور زیر دستوں کو جانتی ہے کہ جو ذرّوں کی طرح کچلے گئے مگر آخر کار آفتاب بن کر طلوع ہوئے۔

پس مظلوم مسلمانوں کو فتح و نصرت کی نوید، اور عزت و کامرانی کا مژدہ! بشرطیکہ وہ "مومن" بن جائیں، اور مومن بننے کے یہ معنیٰ ہیں کہ قول و عمل میں ہم آہنگی، ضمیر اور زبان میں ربط اور گفتار و کردار میں یکسانی ہو، اللہ تعالیٰ نے عزت کا وعدہ "منافقوں" سے نہیں، "مومنین" سے کیا ہے، تم اپنے کو "مومن" کے معیار کے مطابق بنا کر دکھا دو، اللہ اپنے وعدے کو پورا کرے گا۔

جو مسلمان آزادی اور خوش حالی کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مظلوم بھائیوں کے دُکھ درد سے بے نیاز نہ ہو جائیں ورنہ اللہ کے یہاں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی! اپنے مظلوم بھائیوں کے وہ کیا کام آسکتے ہیں؟ یہ بات ان کے پیش نظر رہنی چاہیئے! وہ سب ایک دیوار کی طرح ہیں، جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے۔

پس دُنیا کے جس بعید سے بعید گوشہ میں بھی کوئی اہل ایمان پایا جاتا ہے، اُس تک پیام پہونچا دینا چاہیئے کہ مسافتوں کے بُعد، اختلافِ نسل و رنگ اور مملکتوں کے سیاسی مقاصد سے تضاد اور اختلاف کے باوجود، ہم سب ایک ہی کمند کے اسیر ہیں، ہمارا مقصدِ حیات ایک ہے، ہماری منزل ایک ہے، ہماری کارگاہِ عمل ایک ہے، اس "ایکتا" اور "وحدت" پر جب کبھی حرف آئے گا، ہم سب ایک ہو کر اور مل جُل کر اُس کی حفاظت کریں گے، چاہے اس معرکہ میں ہماری جانیں ہی کیوں نہ کام آجائیں۔
ہم کسی کے خوف اور لالچ سے دوسروں کے کلچر اور تمدن کے سانچے میں اپنے کو ہرگز ہرگز نہیں ڈھالیں گے،

ہمیں مُسلمان اور صرف مسلمان بن کر جینا اور مرنا ھے یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آجائے اور فتح مندیاں ھمارا خیر مقدم کریں!

(انشاءاللہ)

# مُقدّس قانون

## جس میں سیاست اور معاملات سموئے ہوئے ہیں

امام ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے بعض مشائخ نے یزید بن ابی حبیب کی روایت سے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت عمر رض نے حضرت سعد بن وقاص کو فتح عراق کے موقعہ پر خط لکھا!

خطبہ مسنونہ کے بعد! واضح ہو کہ مجھے تمہارا مکتوب ملا۔ تم نے جو بیان کیا ہے کہ لوگ تم سے مالِ غنیمت اور مال فئے کو انھیں میں تقسیم کرنے کی خواہش کرتے ہیں تو جب تم کو میرا یہ خط ملے تو تم اس بات کو دیکھو کہ لوگوں نے لشکر گاہ میں ہتیاروں اور مال ومنال میں سے کیا لاکر جمع کیا ہے!

پس اس مال منقولہ کو مسلمان حاضرین میں تقسیم کردو، اور جائیداد غیر منقولہ زمینیں نہریں ان کے کارندوں (کسانوں) کے لئے رہنے دو، تاکہ عام مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لئے وہ کارآمد ہوں کیونکہ اگر ان کو حاضرین میں تقسیم کردیا گیا تو آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لئے کیا رہ جائے گا!

اور میں نے تم کو ہدایت کی تھی کہ جن لوگوں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو ان کو لڑائی سے قبل اسلام کی دعوت دو پس جو لڑائی سے قبل اس دعوت پر لبیک کہے پس وہ مسلمانوں میں کا ایک فرد ہو جائے گا اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان کے ہیں اور اس پر وہی واجبات عائد ہوں گے جو اُن کے ہیں اور اسلام نے اس کا حصہ بھی مقرر کیا ہے اور جو لڑائی اور شکست کے بعد مسلمان ہوا تو اگرچہ وہ مسلمانوں میں کا ایک فرد تو ہے لیکن اس کا مال مسلمانوں کے لئے ہے، کیونکہ یہ مال اس کے اسلام لانے سے قبل ہی مسلمانوں کے تسلّط میں آچکا تھا۔ بس میری یہی ہدایت ہے جس پر تم کو کاربند رہنا ہے!

امام ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ مجھ سے مدینہ کے کچھ عالموں نے فرمایا کہ جب جیش عراق (کے متعلق اطلاع) سعد بن ابی وقاص رض کی طرف سے حضرت عمر رض کی خدمت میں پہونچی تو آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ لوگوں کے مشاہرہ کی نسبت رجسٹر کس طرح مرتب کئے جائیں۔ اس وقت آپ نے حضرت ابو بکر رض کی رائے کا اتباع کیا کہ سب لوگوں میں برابری ملحوظ رکھی جائے! لیکن جب عراق فتح ہوا تو آپ نے درجات مقرر کرنے کے بارے میں مشورہ کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اب درجات کا تقرر ہی موزوں اور مناسب حال ہے!

آپ رض نے عراق وشام کی اُن زمینوں کے بارے میں بھی مشورہ کیا جو مسلمانوں کی فتح کے ثمرات کے طور پر عطیۂ خداوندی تھیں۔ پس بعض لوگوں کا یہ ارادہ معلوم ہوا کہ وہ تقسیم کے حق میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ فاتحین کو تقسیم کردی جائیں

اور انھیں کو حقوق مالکانہ حاصل ہوں! حضرت عمرؓ نے فرمایا آئندہ جو مسلمان آئیں گے وہ اس سے کیسے متمتع ہوں گے، جب وہ دیکھیں گے کہ تمام زمینیں مع ان کے خدام کے تقسیم کی جا چکی ہیں، ان میں وراثت بھی جاری ہو چکی ہے اور تمام زمینیں گھر چکی ہیں، تو میں تو اس کے خلاف ہوں میری تو یہ رائے نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تو پھر کیا رائے ہے زمینیں اور ان کے خدام خدا کی طرف سے مسلمان فاتحین کے لئے بطور مال فئے ہیں اور یہی ان کی حیثیت ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا بات تو یہی ہے لیکن میری رائے میں ایسا نہیں ہونا چاہیئے!

خدا کی قسم میرے بعد کوئی ایسا شہر فتح نہیں ہوگا جو مسلمانوں کے لئے کثیر المنفعت ثابت ہو بلکہ شاید وہ مسلمانوں پر بار ہی ہوگا۔ پس اگر میں شام و عراق کی زمینیں مع ان کے خدام کے تقسیم کر دوں تو پھر سرحدوں کی کون حفاظت کرے گا۔ اس شہر نیز دیگر شام و عراق کے شہروں کی بیواؤں اور یتیموں کا کون نگران و خبر گیر ہوگا!

پس لوگ اصرار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ کیا آپ اس مال فئے کو جو اللہ تعالےٰ نے ہمیں ہماری تلواروں کے زور کی بنا پر عطا فرمایا اس قوم اور اس کے بیٹوں اور پوتوں پر وقف فرما رہے ہیں، جو نہ موجود ہیں، نہ حاضر، نہ شریک غزا۔ مگر حضرت عمرؓ یہی فرماتے رہے کہ میری تو یہی رائے ہے! لوگوں نے کہا اچھا آپ مشورہ کر لیجئے، چنانچہ آپ نے مہاجرین اولین سے مشورہ فرمایا تو ان میں بھی اختلاف رائے ہوا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی رائے یہ تھی کہ یہ زمینیں حقوق مالکانہ کے ساتھ تقسیم کر دی جائیں اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت ابن عمرؓ، حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق تھے، پھر حضرت عمرؓ نے دس انصاری پانچ قبیلہ اوس پانچ قبیلہ خزرج سے طلب فرمائے یہ دسوں حضرات اپنی قوم میں سربرآوردہ و معزز شمار ہوتے تھے! جب وہ آ گئے تو آپ رضؓ نے حمد و ثنا کے بعد ان سے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ میں نے تم کو اس لئے زحمت دی ہے کہ تم اس امانت میں میرے شریک بنو جو تمہارے معاملات میں میں نے اپنے سر لی ہے! اور میں تم ہی جیسا ایک ہوں اور تم آج حق کو نافذ کروگے! بعضوں نے اس معاملہ میں میری مخالفت کی اور بعضوں نے موافقت، میری یہ خواہش ہرگز نہیں کہ تم میری خواہش نفسانی کا پاس کرو۔

تمہارے پاس اللہ کی وہ کتاب ہے جو حق و صداقت سے لبریز ہے! خدا کی قسم میں جس معاملہ میں بولنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس میں سچائی کے سوا کسی اور شئے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ انصارؓ نے فرمایا امیرالمومنین ارشاد فرمائیں ہم سننے کو تیار ہیں آپ نے فرمایا تم نے ان لوگوں کی بات سُنی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ میں نے ان کے حقوق کے بارے میں ان پر ظلم کیا ہے اور میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کا ارتکاب کروں اگر میں ان کی چیز میں سے کچھ بھی چھین کر غیر کو دوں تو واقعی میں بدبخت ہوں۔ لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ارض کسریٰ کی فتح کے بعد ہمارے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی اللہ نے اُن کے مال و منال ان کی زمینیں مع خدام کے ہم کو غنیمت کے طور پر عطا فرمائیں پس مال غنیمت میں نے سب کا سب اس کے حقداروں کو تقسیم کر دیا اور خمس اس سے نکال کر جہاں صرف کرتا تھا وہاں صرف کر دیا اور صرف کر بھی رہا ہوں! میری رائے ہے کہ میں ان زمینوں کو مع ان کے خدام کے وقف قرار دوں اور ان زمینوں پر خراج اور ان آدمیوں پر جزیہ لگا دوں جس کو وہ ادا کرتے رہیں تا کہ وہ خراج و جزیہ عام مسلمانوں کے لئے فئے کی حیثیت رکھے ان مسلمانوں میں سپاہی عام مسلمان عورت، بچے اور وہ لوگ شامل ہیں جو آئندہ آئیں کیا تم ان سرحدوں کو دیکھ رہے ہو آخر ان کی حفاظت کے لئے بھی تو مجاہدین کی ضرورت ہے اور یہ شام و جزیرہ، کوفہ و بصرہ اور مصر جیسے بڑے شہر آخر ان کی حفاظت اور

انتظام کے لئے بھی تو فوج کی ضرورت ہے اور پھر فوج کو بھی حق الخدمت درکار ہوگا آخر وہ کہاں سے آئے گا جب میں زمینوں کو مع ان کے خدام کے تقسیم کردوں گا! آپ کی تقریر سن کر ان سب حضرات نے بیک آواز فرمایا، واقعی آپ کی رائے درست ہے۔ آپ نے جو ارشاد فرمایا اور جو رائے ظاہر فرمائی وہ بہت اچھی ہے اگر سرحدی چوکیوں اور ان ملکوں کو لوگوں سے بھر نہ دیا جائے اور محافظوں کا آذوقہ حیات مقرر نہ کیا جائے تو کفار دوبارہ ان ملکوں پر قابض ہو جائیں گے!

حضرت عمرؓ نے فرمایا اب بات ٹھکانے کی ہوئی۔ پس ایسا زیرک و دانا کون آدمی ہے جو زمین کی حیثیت کے مطابق اس کا درجہ مقرر کرے اور کسانوں پر ایسا لگان مقرر کرے جس کو وہ برداشت کر لیں۔

پس سب لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کا نام پیش کیا اور کہا کہ ان کو اہم تر جگہ پر مقرر فرمایئے کیوں کہ وہ بصیرت تامہ اور عقلمند ہونے کے ساتھ تجربہ کار بھی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو فوراً طلب فرمایا اور ارض سواد (یعنی عراق) کا افسر پیمائش مقرر کیا، پس حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک سال قبل سواد کوفہ کی مالگذاری جو وصول ہوئی ایک سو ملین درہم (دس کروڑ) تک پہونچ چکی تھی۔ اور اس کا درہم آج کل کے ایک درہم اور ڈھائی دانق کے برابر تھا۔ اور درہم کا وزن اس وقت ایک مثقال کے برابر تھا!

امام ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیث بن سعد نے اور ان سے حبیب ابن ابی ثابت نے حدیث بیان کی کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم　　　اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس امر کا مطالبہ کیا کہ وہ شام کی زمین کو اسی طرح تقسیم کر دیں جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمیں تقسیم فرمادی تھی، اور اس مطالبہ میں حضرت زبیر بن العوام اور حضرت بلال بن رباح بہت زیادہ مصر تھے پس حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پھر تو تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کو میں اس حال میں چھوڑوں گا کہ ان کے لئے چیز باقی نہ رہے، پھر آپؓ نے فرمایا اے اللہ بلالؓ اور اس کے ساتھیوں کے مقابلہ میں تو ہی میری کفایت فرما۔ پس مسلمانوں کا خیال ہے کہ بلال اور ان کے اصحاب جو عمواس میں طاعون کا شکار ہوئے یہ حضرت عمرؓ کی دعا کا اثر تھا! اور حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو ذمی قرار دیا جو مسلمانوں کو خراج دیتے تھے!

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن اسحاق نے اور ان سے زہری نے حدیث بیان کی کہ حضرت عمرؓ نے ارض سواد (عراق) کے متعلق جب وہ فتح ہوئی تو صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا۔ تو عام رائے یہی تھی کہ اس کو تقسیم کر دیا جائے اور حضرت بلال بن رباح کو اس معاملہ میں بہت شدت تھی۔ مگر حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ اس کو بغیر تقسیم کے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ اور انھوںؓ نے کہا کہ اے اللہ بلالؓ اور اس کے ساتھیوں کے مقابلہ میں تو ہی میری کفایت فرما!

اس مشورہ کے بعد تقریباً دو چار دن گذرے تھے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اپنی رائے کی تائید میں کلام اللہ سے دلیل مل گئی ہے اللہ کا ارشاد ہے! وما افاء الله على رسوله منهم فما اوجفتم (الی) شیئ قدیر (سورہ حشر رکوع ۱) (ترجمہ اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوا دیا۔ سو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے)

یہ آیت اگرچہ بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی مگر حکماً تمام آبادیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے! ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ (الیٰ) شدید العقاب

(ترجمہ۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوادے وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا تاکہ وہ تمہارے تونگروں کے قبضہ میں نہ آجائے۔ اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رک جایا کرو۔ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تعالےٰ سخت سزا دینے والا ہے)

اور آگے ارشاد ہے للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم (الیٰ) ھم الصادقون

(ترجمہ ان حاجتمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جدا کردیئے گئے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں)

پھر اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اور لوگوں کو بھی اس میں شامل فرماکر ارشاد فرمایا والذین تبوؤا الدار والایمان (الیٰ) ھم المفلحون (سورہ حشر رکوع ۱)

(ترجمہ اور ان لوگوں کا جو دارالاسلام میں اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے یہ لوگ اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

اور یہ خاص طور پر انصار کے لئے تھا پھر اللہ تعالےٰ نے اس پر بھی اکتفا نہ فرماکر اور دوسروں کو بھی اسی میں شامل کردیا اور فرمایا والذین جاؤا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا (الیٰ) رؤف الرحیم (سورہ حشر رکوع ۱)

(ترجمہ اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخشدے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق رحیم ہیں)

پس یہ حکم آئندہ آنیوالوں کے لئے بھی عام ہوگیا پس موجودہ مال غنیمت میں جب ان آنے والوں کا بھی حصہ ہے تو ہم موجودہ لوگوں میں ہی کیسے تقسیم کردیں اور آئندہ آنے والوں کو بغیر حصہ کے کیسے رہنے دیں اور انھیں کیوں محروم کریں۔ پس ان زمینوں کو حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق یونہی چھوڑ دینے اور ان پر خراج مقرر کردینے پر صحابہ کرام کا اجماع ہوگیا۔

(کتاب الخراج امام ابو یوسف از صفحہ ۲۸ تا ۳۲) (براہِ راست عربی سے ترجمہ)

اسرائیل احمد مینائی
(ایم۔اے۔ایل،ایل،ایم)

# سفارت

## تاریخ کے آئینہ میں

انسانوں میں باہمی احتیاج کا وجود شروع ہی سے پایا جاتا ہے، انسانی ضروریات اور ذرائع برابر بڑھتے ہی جاتے ہیں، قدرتی خزانے ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے، اس کا ناگزیر نتیجہ خود مختار سیاسی وحدتوں کا روز افزوں میل ملاپ اور باہمی استفادہ ہے ــــــ ایلچیوں کا بھیجنا تمدنِ انسانی میں بڑی قدیم چیز ہے۔

تاریخ سفارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن ممالک میں باہمی احتیاج زیادہ تھی وہاں نہ صرف معاشی بلکہ مدافعتی مصالح کے باعث سیاسی ضرورتوں کی بنا پر جلد جلد سفیروں کے بھیجنے کا رواج تھا۔ عجیب و غریب بات ہے کہ عہدِ قدیم میں موجودہ قانون بین الممالک کا کوئی نمایاں تصور نہیں پایا جاتا تھا، مگر سفراء تمام ملکوں میں خصوصی حفاظت و صیانت کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور ان کو امتیازی حقوق عطا کئے جاتے تھے، اس خصوصی برتاو کا سبب سیاسی قانون نہیں بلکہ "مذہب" تھا، سفیروں کی شخصیت کو مذہبی طور پر عظمت حاصل تھی۔

چین کی قدیم ریاستوں میں سفارتوں کا رواج پورے تکلفات اور روایات کے ساتھ نظر آتا ہے ــــــ منو کی دھرم شاستر میں بھارت ورش کے پورے سفارتی نظام کا تذکرہ ملتا ہے یورپ میں مستقل سفارتوں کا رواج تو درحقیقت ۱۶۴۸ء میں صلح نامہ "ویسٹ فالیا" Peace of west phalia کے بعد شروع ہوا لیکن اس کے باوصف قدیم زمانہ میں بھی سفیروں کی روانگی، ان کے حقوق اور امتیازات کے بارے میں کافی ترقی ہو چکی تھی ــــ یونان و روما کے لوگ سفیروں کا پورا پورا احترام اسی طرح کرتے تھے، جس طرح آج کی ترقی یافتہ قوموں میں کیا جاتا ہے۔

سترھویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کی تقریباً ساری مملکتوں نے مستقل سفراء کے مامور کرنے کا طریقہ اپنے یہاں رائج کر لیا تھا، جوں جوں انسانی معاشرہ زیادہ ترقی یافتہ ہوتا گیا، قوموں اور ملکوں کی زندگی بھی زیادہ سے زیادہ (Inter independent) ہوتی گئی۔

ٹولیوں اور ریوڑوں میں مل جل کر رہنے والے حیوانات میں انسان سب سے زیادہ علیحدگی پسند ہے، مگر اس کی بے قرار طبیعت جدائی میں بھی ملاپ ڈھونڈتی ہے، آدم و حوا کا کنبہ ابھی گنتی کے افراد پر مشتمل تھا کہ ان کا بیٹا قابیل اپنی بیوی کے ساتھ الگ ہو گیا، ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ جب انسانی نسل پھیلی، اور کنبوں کی شاخیں بھی کنبے ہو گئیں، تو آپس کی رقابتوں کے باعث اپنی ذات اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے چند و چند رشتہ دار

کنبے مل کر رہنے لگے اور اس طرح گھرانے بنے، جب گھرانے بھی امن و سلامتی کی ضرورت کو کماحقہٗ پورا نہ کر سکے تو متعدد رشتہ دار گھرانے قریب قریب آباد ہو گئے اور امداد باہمی کے ذریعہ دوسرے گھرانوں کی دراز دستیوں سے اپنی مدافعت.. کرنے لگے، اس طرح قبیلے بن گئے، زن، زمین، اور زر کی چاہت نے انھیں ناحق اور ناروا پر اکسایا، اس لئے ردِ عمل سے بچنے کے لئے قبیلوں کو بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک دوسرے کو حلیف بنائیں۔

اب زمانہ آگیا کہ لوگ خانہ بدوشی اور بدویت کے تلخ تجربوں کے باعث جہاں جغرافیائی سہولتیں ملیں بستیوں کی مستقل زندگی بسر کرنے لگیں، چنانچہ کئی کئی رشتہ دار حلیف قبیلے مل کر شہری مملکتوں کی بنیاد ڈالنے لگے۔
اسی طرح شہری مملکتوں کی باہمی ضرورتوں اور آپس کی معاشی مدافعتی اور سیاسی ضرورتوں نے سفارت کاری (Diplomacy) کی بنا رکھ دی، اس لئے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سفارت کاری کی تاریخ بھی اسی قدر قدیم ہے، جس قدر انسان کی مدنیت پسندی کی تاریخ!

سفارت کاری کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسا طریق کار ہے جس کے ذریعہ مملکتیں آپس میں تعلقات اور روابط قائم کرتی اور بڑھاتی ہیں ـــــ برائس (Bryce) کے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سفارت کاری ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے خود مختار مملکتوں کے درمیان میل ملاپ کے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔

"Diplomacy is the Science of conducting the intercourse of independent political communities."

سفارت کاری دراصل وہ ذریعہ ہے جس سے قانون بین الممالک ظہور پذیر ہوتا ہے، عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ قانون بین الممالک کے ایک شعبہ کی حیثیت سے سفارت کاری کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ واقعات کے لحاظ سے سفارت کاری کے تحت قانون بین الممالک کا ذکر کیا جانا چاہیئے، اس لئے کہ وہ اصول و قواعد جن سے مملکتوں کی جماعت عالمہ کے باہمی برتاؤ کے قاعدے اور اصول معین ہوتے ہیں، وہ سفارت کاری ہی کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں اور آپس کی رضامندی اور باہمی پسندیدگی کی بنا پر یہ قاعدے اور اصول مملکتوں کے درمیان قابلِ قبول تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ سفارت کاری اور قانون بین الممالک دونوں میں بہت گہرا تعلق ہے، اس قانون کا ترقی یافتہ حصہ تمام تر سفارت کاری کی عقل و دانش اور محنت کی پیداوار ہے۔ کانٹ (KENT) ورج (VERG) لارنٹ (LAWRENT) اور بعض دیگر مصنفین کا یہ خیال ہے کہ قانون بین الممالک زمانہ جدید کی تخلیق ہے اور قدیم زمانہ میں قانون بین الممالک کا صحیح تصور نہیں پایا جاتا تھا، لیکن یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی، قدیم زمانہ میں بھی قانون بین الممالک کا وجود ملتا ہے، البتہ اس زمانہ میں اس کا تعلق محض مذہب اور اخلاق سے تھا اب زمانہ جدید میں قانون بین الممالک کی حیثیت معروضی ہو گئی ہے اور مملکتیں آپس کے معاہدات کی بنا پر اس کی پابندی قبول کرتی ہیں۔

## قدیم زمانہ میں!

بین الممالک تعلقات اور معاہدات کے تذکرے یونان و روما سے بہت قبل کے

تمدنوں کی تاریخوں میں بھی ملتے ہیں، مصر کے فرعون رعمسیس دوم (۱۲۹۲ تا ۱۲۲۵ ق۔م) نے شمالی شام کے ایک بادشاہ سے جنگ کے بعد جو صلح کی اُس کی اصل دستاویز دستیاب ہو چکی ہے، جو چاندی کی تختی پر کندہ ہے، اس میں صراحت سے اس کا اقرار ہے کہ دونوں بادشاہ نہ صرف باہم دوست رہیں گے (یعنی ایک دوسرے کی خود مختاری کو تسلیم کریں گے) بلکہ اجنبی حملہ آوروں کے خلاف حلیف رہیں گے، تاجر اور کاریگر ایک کے ملک سے دوسرے کے ملک میں امن وسلامتی کے ساتھ آجا سکیں گے، ایک کے ملک سے جو مُلزم فرار ہو کر دوسرے کے ملک میں روپوش ہوجائیں گے ان کے سلسلہ میں تحویلی کارروائیاں عمل میں آیا کریں گی، ان تاریخی دستاویزوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کے لوگوں میں قانون بین الممالک کا شعور پیدا ہو چکا تھا، شام اور دیگر ہمسایہ ممالک سے ان کے سفارتی تعلقات تھے، فدیے اور تحویلی کارروائیوں سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے۔ تل آیل مارنا (Tel-el-Amarna) اور بوغازکیو (Boghazkoy) کی منقش دستاویزیں، اس دعوے کی تائید کرتی ہیں، اسی طرح مسٹر مارٹن کی کتاب (Traces of International law) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں عیسائیت کے ظہور سے بہت قبل قانون بین الممالک کا تصور پیدا ہو چکا تھا اور وہاں کی مختلف شہری مملکتوں میں سفارتی تعلقات قایم تھے۔

فلسطین کے فرمانروا حضرت داؤدؑ (حکومت ۹۹۹ءسنہ تا ۹۵۹ءسنہ قبل مسیح) اور حضرت سلیمانؑ (حکومت ۹۵۹ءسنہ تا ۹۲۹ءسنہ قبل مسیح) نے بھی ہمسایہ بادشاہوں مثلاً فنیفیا کے شہر ٹائر کے بادشاہ حرام سے دوستی کے معاہدے کئے — اسی طرح بحیرہ روم کے ساحل پر آباد مختلف ملکوں — فنیقیا، مصر، شام، کنعان، کریٹ، قرطاجنہ، اور یونان وروما میں بھی آپس کے تعلقات قائم تھے اور سیاسی معاشی ضروریات کے پیش نظر مدافعتی اور تجارتی معاہدات ہوا کرتے تھے۔

یونان کے حالات ہمیں نسبتاً زیادہ معلوم ہیں، وہاں بکثرت ہم نسل، ہم رواج، ہم زبان اور ہم مذہب خودمختار سلطنتیں نظر آتی ہیں، ڈیلفی میں جو مندر تھا اور اولمپیا میں جو میلہ لگتا اور کھیل کود کے مقابلے ہوتے تھے، اس میں یونان کی ہر مملکت سے لوگ آتے تھے، اور آپس میں سیاسی اور معاشی میل ملاپ قایم کرتے تھے، ان خود مختار شہری مملکتوں نے باہمی تعلقات قایم رکھنے کے لئے چند قواعد بنائے تھے جو نوامیس یونان (لاز آف دی ہیلے نیز) کہلاتے تھے، ان مملکتوں میں "حلیفیاں" بھی قایم ہوتی تھی، جن میں سے بعض تاریخ میں بہت مشہور ہیں، چنانچہ شہر ڈیلفی کی امیفک ٹیونی (ہمسایوں کی مجلس) میں بارہ قبیلے اپنے جملہ مقبوضہ شہروں اور مقبوضات کے ساتھ شریک ہوتے تھے، اس "یونانی مجلسِ اقوام" میں ہر شریک قبیلہ کے دو دو نمائندے سال میں دوبارا جلاس کرتے تھے، سردیوں میں تھرماپولی اور گرمیوں میں ڈیلفی میں! اس امیفک ٹیونی حلیفی میں شرکت کے لئے یہ اقرار کرنا پڑتا تھا کہ۔

"ہم کسی امیفک ٹیونی (یعنی ہمسایہ معاہد) شہر کو نہ تو تباہ کریں گے اور نہ اُسے بہتے پانی سے کاٹ دیں گے، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے، خواہ حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ — تو ہم خلاف ورزی کرنے والے

پر حملہ کرکے اُس کے شہر کو تباہ کردیں گے، اگر کوئی خدا کی جایداد کو لوٹے یا لٹتا دیکھے اور چپ رہے یا ڈیلفی کے مندر کی خدائی جائداد کے خلاف غدارانہ مشورے سُنے تو اُس کو سزا دینے میں نہ صرف قدمے اور سخنے بلکہ ہر اُس چیز کے ذریعہ حصہ لیں گے جو ہمارے مقدور میں ہو۔"

سکندر اعظم کی عالمگیر حکومت کے زوال کے بعد روما کا عروج شروع ہوا، ایک مدّت تک روما کی حیثیت ایک شہری مملکت کی سی رہی اور جب تک یہ صورت باقی رہی، رومیوں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی اُن کے سیاسی اور شہری حالات یونان سے ملتے جلتے تھے، تیسری صدی قبل مسیح کے شروع میں رومیوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کرلی، اس سلطنت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بہت سی مختلف قومیں رہتی تھیں اور قوموں کے تعلقات سرحدوں سے ملے ہوئے ممالک (ایران وغیرہ) سے قایم تھے، سلطنتِ روما سے باہر کے ممالک سے تعلقات کو "قانون جنگ" اور "قانونِ مجلس خارجہ" کہتے تھے، اور دراصل روما کا قانون بین الممالک انھی قوانین کے مجموعہ کا نام تھا۔

قدیم ہند کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ذیلی برعظیم میں بھی بے شمار خود مختار سلطنتیں قائم تھیں، ان تمام سلطنتوں کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں، سیاسی اور تجارتی ضرورتوں نے آپس کے برتاؤ کے لئے چند ایسے قاعدے پیدا کردیئے تھے جو باہمی معاہدات کی بنا پر تمام مملکتوں کے لئے قابلِ قبول قرار پائے۔

کوٹلیہ نے اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں بہت سے ایسے قواعد اور معاہدات کا تذکرہ کیا ہے جن سے قدیم ہند میں قانون بین الممالک کے وجود کا پتہ چلتا ہے، فوجوں اور سپاہیوں کو جو ہدایتیں مملکتوں کی جانب سے دی جاتی تھیں، ان سے بین الممالک قانون کے حصہ جنگ کا بہت کچھ اتا پتا ملتا ہے:-

(۱) فوجوں کو ہمیشہ آبادی سے باہر ٹھہرایا جائے (۲) فوجوں کو مفتوحہ علاقوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہ دی جائے (۳) اُن کو جبر و تعدی سے روکا جائے (۴) گاؤں کے اندر اُن کا داخلہ اجازت کے بغیر ممنوع قرار دیا جائے۔

مشہور سیاح میگاس تھینز (MAGESTHENS) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہندوستان میں جنگ کے دوران میں بھی غیر متحارب لوگوں کی جان اور اُن کے مال کی حفاظت کی جاتی تھی، کھیتوں کو لوٹنے اور ہرے بھرے درختوں کے کاٹنے کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔

جنوبی ہند کی سلطنتیں پانڈیا، چولا اور چیرا باہمی تعلقات کے لئے مشترک قواعد عمل کی پابندی کرتی تھیں، تامل زبان کی مشہور کتاب کورال (Kural) میں امن و جنگ اور سفارت کاری سے متعلق قواعد پائے جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں ایک شہری مملکت قایم کی، یہ مملکت یونان و روما مصر و شام اور ایران و ہند کی مملکتوں اور بادشاہتوں کی طرح نہ تھی، اس کی بنیاد اللہ کے قانون اور اس تصور پر رکھی گئی کہ حقیقی شاہنشاہ "خدائے واحد" ہے، اُسی کا حکم دنیا میں چلنا چاہئے، جو اللہ کی حکومت کے چلانے والے، اللہ کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے کام

کرتے ہیں وہ قوم اور رعایا کے مخدوم نہیں خادم ہوتے ہیں۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف دس سال زندہ رہے، لیکن اس عرصہ میں آپ نے ایک " [illegible] " یعنی سیاسی[1] اُمت کی بنا ڈال دی اور ایک ایسی مملکت قایم کی جو دس سال کی قلیل مُدّت میں جزیرہ نمائے عرب سے لیکر جنوبی فلسطین تک پھیل گئی، رسول اللہ کے بعد اسلامی سلطنت کی سرحدیں مصر و طرابلس، فلسطین وشام، عراق و آرمینیا اور ایران و ترکستان سے جا ملیں اور ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ مسلمانوں نے اسپین، فرانس، ترکستان، اٹلی اور ہندوستان کو بھی اپنا مسکن بنالیا، اور صدیوں تک اُن کی حکومت کا پرچم لہراتا رہا۔ تاریخ عالم کا یہ سب سے زیادہ بابرکت اور امن و عافیت کا دور تھا۔

عرب مسلمانوں کے جب دوسری حکومتوں سے تعلقات قایم ہوئے تو "بین الممالک قانون" لازمی طور پر وجود میں آگیا، عربوں نے اس قانون کا نام "سیر" رکھا تھا، ابن ہشام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالت ہی سے کم سے کم "جنگ میں برتاؤ" کے متعلق استعمال ہونے لگا تھا، اور ابن حبیب کی رائے ہے کہ یہ لفظ نہ صرف جنگ بلکہ امن کے زمانہ میں بھی غیر ممالک کے ساتھ "سرکاری تعلقات اور معاملات" کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، علامہ سرخسی نے "سیر" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ لفظ "سیر" سیرت کی جمع ہے، اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مشرک، حربیوں، معاہد مستامنوں، مرتدوں اور باغیوں کے ساتھ مسلمانوں کے برتاؤ کا ذکر ہوتا ہے (انٹرنیشنل لا ڈاکٹر حمید اللہ)

آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے سپہ سالاروں کو روانگی کے وقت جو... ہدایتیں دیں وہ تاریخ میں محفوظ ہیں، مشہور مستشرق دخوئے (ہالینڈ) کو اعتراف ہے کہ فاتح عربوں کے برتاؤ کو دیکھ کر مفتوح ممالک کے باشندے بے اختیار اُن کی طرف مایل ہوگئے، اور واکر مذہبی اور قومی عصبیت کے باوجود، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگیا کہ یہ وحشی فاتح (عرب) اپنے ابتدائے خروج ہی میں اپنے متمدن مفتوحوں یعنی ایرانیوں اور رومیوں سے زیادہ مہذب تھے۔

اسلامی قانون بین الممالک اور موجودہ قانون کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں بنیادی نظریوں کے لحاظ سے بہت بڑا فرق تھا، اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، اس میں قانون بین الممالک کو عارضی طور پر صرف اس وقت تک قبول کیا گیا ہے، جب تک ساری دُنیا اسلام[2] کی آغوش میں نہ آئے ــــ ہمارے زمانہ میں اسی نظریہ کے تحت روس میں بھی قانون بین الممالک کو عارضی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

**قانون؟** اوپر دیئے ہوئے تمام مباحث کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ قانون بین الممالک عہد جدید کی پیداوار نہیں ہے، وہ بھی سفارت کاری کی طرح انسانیت کے عہدِ طفولیت کے بعد ہی جبکہ انسان شہروں اور بستیوں میں جمع ہوکر رہنے لگے، اور مدنیت کی داغ بیل پڑی، شروع ہوا، اور جس طرح انسان کا انسان کے ساتھ مل کر رہنے کا واقعہ تمام قانون اور رواج کا ماخذ و مبدا اور ان سب کی وجہِ تکوین ہے، اسی طرح شہری مملکتوں اور ریاستوں کے باہم مل کر رہنے سے ان کی خود مختاری اور آزادی کے تحفظ کے ساتھ

[1] یہ حقیقت میں ایک دینی نظام ہے جس میں سیاست بھی شامل ہے۔ م
[2] فٹ نوٹ صفحہ ۱۵ پر

ساتھ باہمی تجارت اپنی اور اپنے باشندوں کی غیر ملکی جائداد، معاہدات کی صیانت، جارحانہ اقدام کرنے والے ممالک کے خلاف حلیفوں کے ذریعہ تحفظ اور جنگ کی صورت میں جنگ اور غیر جانبداری کے طریقے، یہ سب امور رائج اور قایم ہوگئے۔"

اس نوبت پر ایک اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا سفارت کاری ( Diplomacy ) کے قواعد و اصول کو "قانون" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے، یا نہیں؟ اور کیا ان قواعد کو کسی قسم کی تہدید ( Sanction ) حاصل ہے یا نہیں!

قدیم زمانہ سے کہ آج تک سفارت کاری کو قانون بین الممالک کا ایک شعبہ مانا جاتا ہے اور سفارت کاری کے قواعد کو قانون بین الممالک کی وجہ سے ساری دنیا میں ابتدا سے لیکر آج تک تسلیم کیا جاتا رہا ہے، اس لئے ہم کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ قانون بین الممالک کو خود "قانون" متصور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ -

قدیم زمانہ میں قانون بین الممالک کی حیثیت تحکمی اور موضوعی نہ تھی بلکہ مذہبیت اور اخلاق کا عنصر غالب تھا اور دوسرے قوانین کی طرح بین الممالک برتاؤ کے رسوم و رواج کو بھی مذہب اور اخلاق کی بنا پر نہ صرف بمنزلہ قانون سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کی پابندی کو بھی آخرت کے خوف کی وجہ سے ضروری تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد جدید میں بھی اس مسئلہ پر مختلف مکاتیب خیال کے لوگوں نے مختلف نقطہ ہائے نظر سے بحث کی ہے۔ ہابس اور پوفنڈ کی رائے ہے۔ قواعد بین الممالک واجب التعمیل نہیں ہیں، انیسویں صدی میں۔۔ آسٹن ( Austin ) اس کے مویدین نے بھی اسی نظریہ کے تائید کی' ان کا یہ خیال تھا کہ "قانون۔۔۔ انسانوں کے ظاہری عمل کا ایک عام قاعدہ ہے جس کو ایک سیاسی مقتدر اعلیٰ نافذ کرتا ہے"۔۔۔۔ اگر قانون کی اس تعریف کو صحیح اور مکمل مان لیا جائے۔ تو قانون بین الممالک کو "قانون" نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ قانون بین الممالک سے مرادوہ قاعدے ہیں جو متمدن ملکوں کی جماعت عامہ کے باہمی برتاؤ میں ان کے طرز عمل کا تعین کرتے ہیں، ان قواعد عمل کو نافذ کرنے والا سیاسی مقتدر اعلیٰ نہیں ہوتا جو مقتدر حکومتوں کو ان کی پابندی پر جبراً مجبور کر سکے۔۔۔۔ غور طلب امر یہ ہے کہ کیا جبر قانون کی لازمی خصوصیت ہے اور یہ کہ بغیر جبر کے کوئی قواعد عمل قانون متصور نہیں ہو سکتے ـــــ تحلیلی اساتذہ بینتھم اور آسٹن کا یہی نقطۂ نظر تھا۔

لیکن اب اس کو عام طور پر یک رخی اور غیر مکمل تعریف تسلیم کیا جاتا ہے، اور جبر کو بقول کرکوناف نہ تو قانون کی اساسی خصوصیت تصور کیا جاتا ہے اور نہ عام خصوصیت ـــــ اساسی خصوصیت وہ خصوصیت ہوتی ہے جس پر تمام دوسرے صفات مبنی اور اسی سے مستنبط ہوتے ہیں، جبر قانون کی ایسی خصوصیت نہیں ہے، کیونکہ قانون کا تصور بغیر جبر کے بھی ممکن ہے، اگر سب انسان نیک ہوں اور ہر شخص دوسرے کا حق دے دے اور اپنے فرایض کو پورے طور پر ادا کردے، تو جبر کی ضرورت ہی نہ ہوگی، لیکن قانون کا وجود پھر بھی حقوق و فرایض کی حدبندی اور تعین کے لئے ضروری ہوگا، اس سے ظاہر ہے کہ قانون کا تصور بغیر جبر کے ممکن ہے ـــــ لیکن سب انسان نیک نہیں ہوتے، جیسا کہ موجودہ سماج میں ہے سو اس میں بھی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون کی پابندی کرانے کے لئے بالعموم

Laws of war & peace in Islam page 120 FEB, 1935 ؎

جبر کی ضرورت نہیں ہوتی، قانون کا وہ تصور ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا جس میں اس کی تعمیل صرف جبراً ہی کرائی جاتی ہو اور کوئی شخص اپنے فرائض بغیر جبر کے ادا نہ کرتا ہو اور ہر شخص کے خلاف جبر استعمال کرنے کی ضرورت داعی ہوتی ہو۔۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لارڈ رسل آف کلورن نے ۱۸۹۶ء میں امریکن بار ایسوسی ایشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ قانون بین الاقوام میں قانون کا لفظ صحیح طور پر استعمال ہوا ہے، کیونکہ قانون کا بڑا حصہ روایات پر مبنی ہوتا ہے اُن کی تعمیل پسندیدگی سے ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قانون بین الممالک بھی قانون ہے، اس میں بھی جبر کا صرف وہی پہلو موجود ہے جو صحیح معنیٰ میں قانون ملک میں موجود ہے گو کسی قدر کم نمایاں طور پر ہے ——— اور چونکہ سفارت کاری اور قانون بین الممالک کا تعلق بہت گہرا اور قدیم ہے اور اس کے نمایاں خط و خال سفارت کاری کے دستِ حسن کار کے مرہون منت ہیں، لہٰذا مندرجہ بالا دلائل و براہین کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قواعد سفارت کاری کو بھی قانون کا درجہ حاصل ہے۔

## بھارت ورش میں!

قدیم ہند میں سفارت کاری کو نظام مملکت میں مرکزی ستون کی سی اہمیت حاصل تھی، منوجی نے اپنی سمرتی میں ایک موقع پر اس کا ذکر کیا ہے کہ پائدار امن کا قیام اور جنگ کے خطرات سے نجات دلانے کا کام سفرا کے ذمہ ہوتا ہے ——— بھارت ورش کے پراچین کال میں بھی ہم کو سفارت کاری سے مشابہ اداروں کے آثار ملتے ہیں، رگ وید اور دوسرے ویدوں کی روایت کے مطابق خود اگنیؔ نے کئی موقعوں پر ایک محدود مفہوم میں سفارت کے فرائض انجام دیئے۔

"He is used as the medium of communication between the supreme and sacrificer"

اس دور میں سفارتی نمایندوں کی حیثیت ایسے بین الاقوامی خبر رساں نمایندوں کی سی ہوتی تھی جو دوسرے ملکوں کی فوجی اور دفاعی حالت سے اپنے ملک کے اربابِ متعلقہ کو وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہتے، ایسے نمایندوں کو۔۔۔ " دوت " سے موسوم کیا جاتا تھا، سائنا نے اپنی شرح ردودرا دھیا ( Rudra Adhya ) میں ایسے خبر رساں نمایندوں کو دو گروہوں میں منقسم کیا ہے، پہلی قسم کے لوگ وہ ہوتے جو کھلے بندوں دوسرے ملکوں میں خبر رسانی کا کام انجام دیتے اور اسی غرض کے لئے اپنے اقتدار اعلیٰ کی طرف سے دوسرے ملکوں میں متعین کئے جاتے، وہ ایک محدود مفہوم میں اپنے اقتدار اعلیٰ کی نمایندگی بھی کرتے، اس قسم کے نمایندے " دوت " یعنی جاسوس ( open spy ) کہلائے جاتے، دوسرے وہ لوگ جن کو پراہت یا خفیہ جاسوس۔۔۔ ( Secret Spy ) سمجھا جاتا، گو وہ اپنے بادشاہ کی طرف سے مامور کئے جاتے لیکن ان کی کوئی مسلمہ حیثیت نہیں ہوتی تھی، بس وہ ایسے بین الاقوامی جاسوس ہوتے تھے جو ملکوں کی سیاحت کرتے رہتے اور اپنے ملک کو طرح طرح کی واقفیت بہم پہونچاتے رہتے، تاریخ کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارت کے عام مفہوم سے مشابہ کوئی ادارہ اس عہد ( Age of hunters ) میں نہ تھا، یہ ترقی بعد میں،

ہوئی جب سفراء ( Envoy ) کے مفہوم میں نمایندے مقرر کئے جانے لگے جو ملکوں کے آپس کے معاملات اور نزاعی امور کے تصفیہ کے کاروبار انجام دیتے۔

موریا خاندان کے راجاؤں کے زمانہ سے ایسی مثالیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں میگاستھینز کو چندر گپت موریا کے دربار میں یونان کے ایک فرمانروا سلیوکس ( Seleucus Nikator ) نے بہ حیثیت سفیر کے متعین کیا اور ڈائونیس کو بندسار موریا کے دربار میں شاہ ٹولیمی نے مامور کیا تھا۔

ہندوستان کی سفارت کاری کی تاریخ میں ہم کو بتدریج ترقی نظر آتی ہے، جوں جوں ہم ویدک دور سے گزر کر تاریخی دور میں آتے جاتے ہیں، اسی قدر سفارتی نمایندوں اور اُن کے حقوق و فرائض میں بھی ترقی کے آثار ملتے ہیں۔

سفیروں کے تقرر کے سلسلہ میں اُن کی موزونیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، منوجی نے بھی اپنی سمرتی کے ساتویں باب کے چونسٹھویں اشلوک میں سفارتی نمایندوں کی وفاداری، دیانت داری، دانشمندی بے خوفی اور قوت گویائی پر بہت زور دیا ہے ـــــــ اگنی پران میں بھی انھی شرطوں اور خصوصیات کا زیادہ وضاحت اور اضافہ کے ساتھ اعادہ کیا گیا ہے۔

قدیم ہند میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ سفارتی نمایندوں کا کام صرف اپنے اقتدار اعلیٰ کی نمایندگی ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ بادشاہ اور اپنے ملک کے تزک و احتشام اور قوت و جبروت کا اظہار مناسب طریقہ سے کرتے رہیں چنانچہ رامائن کے سُندر کھنڈ میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے ـــــــ کوٹلیا کا بھی یہی خیال تھا کہ سفارتی نمایندے اپنے حکمران کے ترجمان ہوتے ہیں۔

( "Messengers are the mouthpieces of Kings" )

سفارتی نمایندوں کی روانگی سے قبل بادشاہ کی جانب سے ان کو تعارفی مراسلے اور سرکاری دستاویز و اسناد حوالے کئے جاتے تاکہ غیر ملک میں پورے احترام و اہتمام کے اُن کا استقبال کیا جائے اور اُن کی آسایش کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

## یونان و روما

قدیم یونان و روما کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح مستقل سفارتوں کا رواج تو نہ تھا، لیکن سفارتی تعلقات اپنی اہمیت کے باعث اچھی طرح نشو و نما پا چکے[۵] تھے سفارت کاری سے متعلق جو قواعد اور اصول تھے وہ مملکتوں کی باہمی گفت و شنید سے کہیں زیادہ وقت کے مسلمہ رسم و رواج پر مبنی تھے، یونان کی شہری مملکتوں میں جنگ و امن کے معاملات اور دیگر تجارتی و معاشی معاہدات نیز تحویلی کارروائیاں ایلچیوں کے توسط سے طے ہوا کرتی تھیں، یونان میں عام طور پر دو قسم کے سفارتی نمایندے ہوتے تھے ـــــــ سفیر بحالت جنگ اور سفیر بحالتِ امن ـــــــ طبعی اور جغرافیائی حالات کے لحاظ سے یونان کی شہری مملکتیں آپس میں دفاعی، سیاسی اور معاشی معاہدات کرنے پر مجبور تھیں ایسے معاہدات کی بنا پر "حلیفیاں" قایم ہوتی تھیں وہ یونانی زبان میں امفکٹیونیز ( Amphictyonic ) کہلاتی تھیں، ان میں امداد باہمی کا اصول کارفرما رہتا تھا، اس لئے ناگزیر طور پر قریبی سفارتی تعلقات قایم ہو جاتے تھے۔

[۵] ملاحظہ ہو فلپسن جلد اول باب ۱۳۔

سفراء کی آمد سے پہلے یونان کے رواج کے مطابق نقیب ( Heralds ) آیا کرتے تھے، اور یہ پیام پہونچاتے تھے کہ ہمارے سفیر گفت و شنید کے لئے آتے ہیں، ان نقیبوں کا بھی عزت و احترام کیا جاتا تھا۔

ادھر روما کی تاریخ سے بھی عیاں ہے کہ سلطنت روما کے ابتدائی دور میں مذہبیت کا عنصر ہر چیز پر غالب تھا، سلطنت کے خارجی تعلقات میں بھی اس کو بہت اہمیت حاصل تھی روما کی سفارت کاری کی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے وہ فیشلیس ( Fetials ) کا ادارہ ہے جو "College of fetials" کے نام سے موسوم تھا، جس کو سلطنتِ روما کی خارجہ پالیسی کی نگرانی تفویض تھی، اس ادارہ کے اراکین نہ صرف خارجہ پالیسی متعین کرکے اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے بلکہ جنگ سے پیدا ہونے والے بعض معاملات اور تحویلی کارروائیوں کی تکمیل کے سلسلہ میں بہ حیثیت سفارتی نمایندے کے دوسرے ممالک کو بھی بھیجے جاتے تھے۔

سلطنت روما کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا، جب سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی، اس دور میں سلطنت روما میں مختلف حکومتیں شامل تھیں جن میں قرطاجنہ، شام اور مصر بہت شہرت رکھتی تھیں اس طرح جوں جوں سلطنت وسیع تر ہوتی گئی، غیر ممالک اور غیر نسلوں کے لوگ اس میں شریک ہوتے گئے قیدیوں کے لئے تبادلے، فدیہ اور تاوانِ جنگ وغیرہ معاملات اور حلیفوں کے معاہدات کے سلسلہ میں سفارتی نمایندوں کی ضرورت روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔

جب سلطنت روما انتظامی وجوہ سے مشرقی و مغربی دو حصوں میں منقسم ہو گئی تو مشرقی روما کا پایۂ تخت استنبول قرار دیا گیا جو اس زمانہ میں بازنطین کہلاتا تھا، اور مغربی سلطنت کا پایہ تخت بدستور روما کا شہر رہا، اس تقسیم کے باوجود کچھ دنوں تو روما کی مرکزیت باقی رہی، لیکن پھر مرکز میں کمزوری آنا شروع ہو گئی، نئی نئی خود مختار سلطنتیں قایم ہوتی گئیں اور ان نومولود خود مختار سلطنتوں کے سفارتی نمایندے مرکز میں متعین کئے جانے لگے۔

یونان کی ساری شہری مملکتوں میں قانون بین الممالک کا یہ اصول تسلیم کیا جاتا تھا کہ سب مملکتیں خواہ ان کا طرزِ حکومت کسی قسم کا ہو، رقبہ اور طاقت کتنی ہی ہو، ان سب کا درجہ مملکت کی حیثیت سے قانون بین الممالک کی نظر میں بہت سے اعتبارات کی بنا پر برابر سمجھا جاتا تھا، ہر مملکت کو اس کا پورا حق تھا کہ وہ اپنے بیرونی معاملات کا تصفیہ سفارتی نمایندوں کے ذریعہ اپنے عوام یا اقتدار اعلیٰ کی مرضی کے مطابق کرے، اس میں دوسری مملکتوں کی مداخلت کو جائز قرار نہیں دیا جاتا تھا ـــــ یہ تھے وہ رجحانات جنھوں نے سفارت کاری کو یونان کے اندر نظامِ حکومت کا ایک نہایت اہم شعبہ بنا دیا تھا۔

سفارتی عہدہ داروں کا انتخاب مملکت کے ایسے ممتاز اور معزز شہریوں کے طبقہ سے کیا جاتا تھا، جن کی وجاہت خاندانی، دیانت داری، شجاعت، قابلیت، خطابت، اور علوم و فنونِ متداولہ کی واقفیت مسلّم ہو، اکثر اوقات ملک کے ایسی فوجی سورماؤں اور نامور عہدیداروں کو چُنا جاتا تھا، جو متذکرہ بالا اوصاف سے آراستہ ہوں۔

روما میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں، جب بہ یک وقت دس دس ( Fetials ) کو بہ حیثیت سفیر کے بھیجا گیا، لیکن معمولی حالات میں زیادہ سے زیادہ چار پانچ ارکان، سفارتی فرائض کی انجام دہی کے لئے روانہ کئے جاتے۔

ادبیاتِ یونان کے اندر ہومر اور ہیروڈوٹس نے پیغام رساں کا لفظ "Envoy" اور

" Legatus " کے معنی میں استعمال کیا ہے، روما میں " Legatus " کا لفظ عام طور پر سفیر " Ambassador " کے معنی استعمال ہوتا تھا۔ " Legatus " کو آج کل کے سفارتی نمایندوں کے سے اختیارات و اعزازات حاصل ہوتے تھے۔

خطابت کو چونکہ روما کی عوامی اور قومی زندگی میں بڑا دخل تھا، اس لئے نہ صرف خطابت سفارتی نمایندے کا لازمی وصف سمجھی جاتی تھی بلکہ لفظ "خطیب" ( Orator ) کو سفیر ( Legatus ) کے مترادف استعمال کیا جاتا تھا، لیکن " Orator " کی قسم کے جو سفارتی نمایندے دوسرے ملکوں کو روانہ کئے جاتے تھے، ان کا مقصد عموماً دوسرے ملکوں میں جا کر منت سماجت کے ذریعہ کچھ مراعات حاصل کرنا ہوتا تھا ــــ لیو ی ( Livy ) اور ورجل ( Vergil ) دونوں نے ( Orator ) کے لفظ کو سیاسی وسفارتی نمایندوں کے معنی میں استعمال کیا ہے، جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ بعض حالات میں اس قسم کے سفارتی نمایندوں سے سیاسی امور کی مثالیں بھی ملتی ہیں، سینیٹ ( Senate ) کے ارکان، جب پرائیویٹ طور پر اپنے وطن واپس جایا کرتے تو اُن کو محض رسمی اور ظاہری طور پر سفیر کی حیثیت دے دی جاتی، لیکن ان کو سفارتی امور یا اُن کی انجام دہی سے قطعاً دور کا تعلق بھی نہ ہوتا تھا، لاطینی زبان میں ان کو ( Legatio Libera ) یعنی آزاد سفیر کہا جاتا تھا۔

**عَرب میں اور ....** بعثتِ نبوی سے قبل عرب میں متعدد شہری مملکتیں قایم ہو چکی تھیں، ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں جزیرہ نمائے عرب میں قبائلی حلیفوں کے باعث، بے شمار سیاسی وحدتوں کا وجود پایا جاتا تھا، یہ ساری چھوٹی بڑی مملکتیں اپنے ماخذ کے لحاظ سے عرب تھیں۔

یہی وجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی عرب کی تاریخ میں سفارت کاری کے اداروں کے آثار پائے جاتے ہیں، عربی ادب میں ایسے بہت سے تذکرے موجود ہیں جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے، عرب قبائل کے شیوخ نہ صرف آس پاس کی شہری مملکتوں سے ذاتی آمد و رفت کے ذریعہ سفارتی تعلقات قایم کیا کرتے تھے، بلکہ بیرونی ممالک کی سفارتیں بھی عرب کی شہری مملکتوں کے درباروں میں آیا کرتی تھیں، مملکت یمن نے حبش سے جنگ کے دوران میں سفیروں کو ستی سی فان ( Catisphan ) نامی شاہِ فارس کے پاس بھیجکر امداد کی درخواست کی تھی[1] یمن میں مآرب کے پل پر جو پتھر کندہ ہے اس کی عبارت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے مختلف ممالک کے سفارتی نمایندوں کو جن میں بازنطین کا سفیر بھی شامل تھا اپنے دربار میں ایک خاص موقع پر باریاب کیا[2] ــــ قرب و جوار کی شہری مملکتوں اور مختلف قبائل کے درمیان سفارتوں کے تبادلہ کی مثالیں تاریخ عرب میں بکثرت نظر آتی ہیں، مکہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے حبش کو ہجرت کر جانے پر وہاں کے بادشاہ نجاشی کے پاس دوبارا اپنے سفرا روانہ کئے۔

جاہلیت کے زمانہ میں مکہ کے کشوری نظام میں ایک بہت اہم عہدہ "سفیر و منافر" کا ہوا کرتا تھا یہ عہدہ موروثی طور پر بنی عدی یعنی حضرت عمرؓ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا، ابن عبد ربہ نے مختصر و جامع و مانع الفاظ

[1] ارض القرآن [2] ابن ہشام

میں اس کی یوں تشریح کی ہے :-

" جب کوئی جنگ چھڑی تو وہ عمر کو اپنا سفیر مختار بنا کر بھیجتے، اور جب کوئی بیرونی قبیلہ قریش کی اولیت کے شرف کو چیلنج دیتا تو اس وقت بھی عمر ہی کو بطور " منافر " بھیجا جاتا تاکہ قریش کی طرف سے جواب دیا جائے "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جس پر قرنوں سے جہل چھایا ہوا تھا، سفارت کاری کے آثار اس کے یہاں پائے جاتے تھے ـــــــــ عرب مؤلفین کے یہاں اس قسم کے تذکرے بھی ملتے ہیں کہ مکہ اور دیگر اقطاع عرب کے معززین قیصر روم، کسرائے ایران اور نجاشی کے درباروں میں باریاب ہوا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت کے بعد عرب قوم کے سامنے اسلام کے نام سے ایک ملکی ضابطۂ حیات پیش کیا، شروع شروع میں عربوں کی جہالت دینِ اسلام کو قبول کرنے سے گریز کرتی رہی، بت پرستوں کو " صدائے توحید " نامانوس محسوس ہوتی تھی، آخر کار اسلام کی فطری کشش غالب آکر رہی اور عربوں نے اللہ کے دین کو قبول کر لیا۔

اسلام نے سالمانہ اور دوستانہ تعلقات، انسانیت کی چاہت، امن و آشتی اور صلح جوئی کی جو تعلیم دی اُس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقعہ نہیں لیکن اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ مذہبِ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ یوں کہئے " معجزہ " یہ ہے کہ عرب جیسی وحشی اور مغلوب الغضب قوم کو ایک پُرامن اور منظم قوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور ان کو آئین و قانون کی پابندیوں کا خوگر بنا دیا، وہ جو ذرا سی بات پر کٹ مرتے تھے، پُرامن، باوقار اور نیک شہری کی طرح زندگی بسر کرنے لگے، زندگیوں، سیرتوں اور ذہنیتوں کا اتنا عظیم الشان انقلاب تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارت کاری کے سلسلہ میں جو ترقی یافتہ اور اعلیٰ اصول دُنیا کے سامنے پیش کئے، وہ اِس زمانہ میں بھی اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ہدایت کا چراغ دکھا رہے ہیں۔

(۱) اپنے مقصد اور مشن کی تبلیغ کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھا، اس کے حصول کے لئے کبھی ناجائز اور ناروا ذرائع اختیار نہیں کئے۔ ذاتی اور مالی منفعت اور جذبہ انتقام کو ہمیشہ نظر انداز کیا ـــــــــ چنانچہ عرب کا کلیدی شہر اور اُن کا سب سے بڑا مرکزِ تمدن و عقیدت مکہ جب فتح ہوا تو ہر طرح کی لالچ، پیش کش، اور مشورے کو ٹھکرا کر آپ نے عام معافی کا اعلان کر دیا، اور اس طرح خون کے پیاسے دُشمنوں کے دلوں کو موہ لیا۔

(۲) باہمی اختلافات کو فراست کے ساتھ روکنا اور اندرونی اختلافات کو مٹا کر اپنی قوت میں اضافہ کرنا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دینی سیاست کے اہم بالشان کارنامے ہیں جس وقت آں حضرت نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مدینہ کے مسلمان اوس اور خزرج دو رقیب قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، شہری مملکت کا توذکر کیا، مدینہ میں چاروں طرف نراج کا دور دورہ تھا، بعض قبائل مسلمان ہو گئے تھے، اور بعض قبیلوں میں اسلام کا نفوذ پوری طرح نہیں پھیلا تھا، دوسری طرف ہزاروں یہود مدینہ میں آباد تھے جو زراعت، تجارت اور صنعت غرض پوری معاشی زندگی پر حاوی تھے۔ ان میں بھی آپس میں بڑی زور کی رقابتیں اور عداوتیں تھیں اور اسلام کے خلاف دشمنی کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مہاجرین آئے تھے، اور ان کے لئے مدینہ کا ماحول اور وہاں کی فضا نئی اور اجنبی سی تھی ـــــــــ ان متضاد عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا یہ ابتدائے سیاستِ خارجہ کے مسایل تھے، جن کو رسول اکرم ؐ نے اپنے سفارتی اقدامات

کے ذریعہ کمالِ حسن و فراست کے ساتھ طے فرمایا ـــــــ یہاں تک کہ آگے چل کر یہود و منافقین چھٹ گئے اور مدینہ میں خالص خدا پرستوں کی اکثریت رہ گئی!

(۳) مدینہ کی شہری مملکت کے اندرونی استحکام کے بعد ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ بیرونی خطرات سے نجات حاصل کرنے کے لئے آس پاس کے قبایل سے رشتۂ مودت استوار کیا جائے، چنانچہ ہجرت کے چند ماہ بعد رسول اللہ نے مدینہ کے جنوبی مغربی اور ساحلی علاقوں کا بار بار دورہ فرمایا اور اس کے بعد ینبوع میں رہنے والے قبائل سے اس شرط پر "حلیفی" قایم کی کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان اُن کی مدد کریں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہوگا تو وہ مدد کو آئیں گے، بعض معاہدات میں رسُول اللہ نے اپنے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط کو بھی پیش کیا تھا، بعض میں یہ صورت تھی کہ قبایل کو غیر جانب دار رہنے کی اجازت تھی، ایسے معاہدات بھی کئے گئے جن میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں دوست قبائل اور حلیف گروہوں کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا-

(۴) اسلام نے انسانی خون کی عزت کی جو مثالی تعلیم دی ہے وہ آج بھی انسانیت کی تاریخ کا طغرائے امتیاز ہے- عہد نبوی میں دس سال کی قلیل مدت میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا، جس میں لاکھوں کی آبادی تھی، اس حساب سے رسول اللہ کی ہجرت سے وفات تک روزانہ تقریباً (۲۷۴) دو سو چوہتر مربع میل کے اوسط سے فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، ان فتوحات میں دشمن کا ہر مہینہ صرف ایک آدمی قتل ہوا، اور اسلامی افواج کا نقصان اس سے بھی کم رہا، ایک بار حضور اکرم نے یہ عہد آفریں اعلان فرمایا "میں رحمت کا پیغمبر ہوں، جنگ کا پیغمبر نہیں ہوں" رسول اللہ کی امن پسندی، صلح جوئی اور انسانی خون کے احترام کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ میں دشمن کے ہزاروں شکست خوردہ سپاہیوں میں سے صرف ستر آدمی ہلاک ہوئے، عہد نبوی کے غزوات کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ جنگ پر امن و دوستی کو ترجیح دی مسالمانہ تعلقات کے ذریعہ اپنے نیک مقصد کے حصول کی سعی فرمائی اور اگر جنگ کرنا ہی پڑی تو انسانیت کے تمام جزوی لوازم تک کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا-

(۵) دشمن کے دلوں کو ہمدردی اور لطف و کرم کے ذریعہ موہ لینے کو رسول اللہ کی دینی سیاست میں بہت خاص اہمیت حاصل تھی، جس سال مکہ میں بڑا سخت قحط پڑا، اس وقت رسول اللہ نے انسانی ہمدردی کے طور پر قریش کے خلاف جو ناکہ بندی کر رکھی تھی اسے اٹھالیا اور یمامہ کی سب سے بڑی منڈی سے غلہ لے جانے کی اجازت دیدی؛ اس رعایت کے علاوہ پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان سردار مکہ کو روانہ کی کہ مکہ کے فقرا معذورین اور اہل حاجت میں تقسیم کر دی جائے ـــــــ کفار قریش اس طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوئے!

(۶) جو لوگ دورِ جاہلیت میں اسلام کے شدید ترین دشمن اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف رسُولِ اکرم نے ان کے سابقہ اعزاز و اکرام کو برقرار رکھا بلکہ عام مسلمانوں نے بھی ان کی توقیر اور آؤ بھگت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، فتح مکہ کے وقت ابوسفیان کے گھر کو "دار الامن" قرار دے دیا، عمرو بن العاص رضؓ اسلام لائے تو ان کو "السابقون الاولون" کا سردار بنا کر فوجی مہمات پر روانہ کیا، خالد بن ولید کو مسلمان ہوتے ہی "سیف اللہ" کا قابلِ رشک خطاب عطا فرمایا اور اس بات کو مرے سے بھلا دیا کہ جنگ اُحد میں محض ان کی

ذات مسلمانوں کی ہزیمت کا سبب تھی (حضور کی) حدیث ہے ــ "معزز غیر مسلم، اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے، بشرطیکہ وہ اسلامی قوانین سے واقف اور اُن پر عامل ہو جائیں" ــــــ تاریخ اسلام کا دامن ایسی بے شمار شالوں سے بھرا ہوا ہے جن میں غیر مسلموں کو قبولِ اسلام کے بعد فوجوں کی کمان اور صوبوں کی گورنریوں سے سرفراز کیا گیا۔

یہ تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے وہ زرین اصول (جن میں سفارت کاری بھی شامل ہے)، جن کے سبب زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا، اور جو آج ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی، قانونِ بین الممالک اور اُس کے شعبہ سفارت کاری کے لئے چراغ ہدایت بنے ہوئے ہیں۔

ایلچیوں اور سفیروں کے تذکرے سے عہدِ نبوی کی تاریخ لبریز ہے، فوجی ضروریات کے لئے جاسوس اور اسکاؤٹ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم روانہ فرمایا کرتے تھے، مکہ میں حضرتِ عباسؓ طائف میں حضرت انسؓ اور نجد میں اعتق خبر رساں نمایندوں کے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر تھے۔

حدیبیہ کی صلح کے بعد قریش کی فتنہ پردازیوں کا اندیشہ جب کسی حد تک کم ہوگیا، تو رسول اللہ نے قیصر روم شہنشاہ عجم، عزیز مصر شاہ حبش اور دوسرے رؤسار عرب کے درباروں میں اپنے نامہ ہائے مبارک کے ساتھ سفرا روانہ فرمائے، قیصر روم کے دربار میں دحیہ کلبی نے حضور کا نامہ مقدس، سفیر کی حیثیت سے پیش کیا، قیصر نے فرمانِ رسالت پڑھوا کر سُنا، اور اُسے سُن کر اس قدر متاثر ہوا کہ اہلِ دربار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "میں اگر وہاں (عرب) جا سکتا تو خود اُس (رسول اللہ) کے پاؤں دھو کر پیتا"

خسرو پرویز کے نام عبداللہ بن قدامہ نامہ مبارک لے کر گئے، اُس بدبخت نے نامۂ مبارک چاک کر دیا اور غصہ میں آکر درشت کلمے زبان سے نکالے، مگر تاریخ نے اُس سے انتقام لیا، بہت تھوڑی مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ اُس کی حکومت کا شیرازہ پُرزے پُرزے ہوگیا ــــــ عزیز مصر کو جو خط آپ نے بھیجا تھا، اُس کے جواب میں اُس نے آپ کی خدمت میں تحفے روانہ کئے۔

## سفارتیں اور وفود

سفارتیں جو دربار نبوت سے روانہ کی جاتی تھیں یا دربارِ نبوت میں آتی تھیں اُن میں عربوں کی قومی خصوصیات کے باعث ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جاتا تھا جو اپنی دیانت، شرافت شجاعت اور خطابت کے لئے یگانہ روزگار ہوں، خطابت اور شاعری کو عربوں میں قبولیتِ عام حاصل تھی اسلئے اس وصف کو بھی اہمیت دی جاتی تھی، دوسرے قدیم ممالک کی طرح عہدِ نبوی میں بھی سفارتی وفود روانہ کئے جاتے تھے، ایک ایک وفد میں کئی کئی لوگ شریک ہوا کرتے تھے، دربار نبوت میں جو وفود اور سفارتیں آئیں وہ دو حیثیتوں کی تھیں ایک وہ جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ رسول اللہ کے ساتھ بہ حیثیت فاتح کے معاہدہ کریں، دوسرے وہ جو اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر، خود بھی اُس کے حلقہ میں داخل ہو جائیں اور واپس جاکر اپنی قوم اور قبیلہ کو بھی اس سعادت کا اہل اور مشتاق بنا دیں۔

خود رسول اللہ بعض اوقات سفیروں کا استقبال فرماتے، اور مہمانداری کے فرائض بہ نفس نفیس انجام دیتے ــــــ سفارتی نمایندوں کے احترام اور اُن کی سہولتوں اور آسائشوں کا لحاظ جناب رسالت مآب کو اس قدر تھا کہ آپ نے وصال سے قبل جو نصیحتیں فرمائیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی "جس طرح میں وفود

کو عطیے دیا کرتا تھا، تم بھی اسی طرح دیا کرنا"

دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں اور مذہبوں میں دین اور سیاست کو دو بالکل الگ الگ اور جدا جدا چیزیں سمجھا جاتا، یہودیوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو جس کو ساتھ لے کر ہم خدا کی راہ میں جنگ کر سکیں، اس طرح نبوت و بادشاہت یعنی مذہب و سیاست کو جدا رکھا گیا، حضرت مسیح کا بھی یہ قول انجیل مقدس میں ملتا ہے کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دیدو اور کلیسا کی کلیسا کو، بدھ مت اور ہندو دھرم میں بھی ترکِ دنیا انسانیت کا کمال قرار پایا، لیکن دینِ اسلام نے ایک ایسا ضابطۂ حیات پیش کیا جس میں ایسی کسی صریح تقسیم کی گنجائش نہیں ہے۔ دین کا وسیع مفہوم یہی ہے کہ اس کے اندر پورا اسلامی تمدن اور دنیا و آخرت کے مسائل شامل ہیں ——— لیکن محدود معنیٰ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ میں مذہب اپنے وسیع ترین مفہوم میں جلوہ گر ملتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی زندگی میں تبلیغ اسلام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی، اس تفصیل کے بعد یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ دینِ اسلام اور اسلامی سیاست چونکہ دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں، اور اقتدار کامل کا سرچشمہ خدائے واحد کی ذات ہے، اس لئے مذہبی اور مملکتی سفارتوں میں کوئی فرق نہ کیا گیا اور نہ ہوسکتا تھا، اس لئے اسلامی عرب میں سفارت کاری کے واسطے اس خیال کے لئے کوئی جگہ ہی نہ تھی کہ "وہ صرف آزاد مملکتوں کا حق ہے"، بلکہ قبائل اور دوسرے جماعتی گروہ بھی سفرا بھیجنے کے مجاز تھے۔

اسلامی اور عربی تہذیب کے مطابق سفیروں کی روانگی کے وقت تکلفات کا مظاہرہ نہ ہوتا تھا، انتہائی سادگی ملحوظ خاطر رہتی تھی خود سفراء بھی اس خدمت کو لذتِ نفس کے لئے نہیں بلکہ دین کی خدمت انجام دینے کی غرض سے قبول کرتے تھے، حسنِ ظاہری سے زیادہ سفراء کے حسنِ باطنی اور جوہر ذاتی کو اہمیت دی جاتی تھی۔

جب رسول اللہ عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے، صحابۂ کرام کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوکر مکہ کی سرحد پر پہنچے، تو قریش نے مزاحمت کی اور فتنہ و فساد کا ارادہ ظاہر کیا، تو حضور نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنی جانب سے سفیرِ مختار کی حیثیت سے اہلِ مکہ کے پاس روانہ فرمایا اور مکہ والوں نے بھی سہیل کو سفیر بنا کر بھیجا، سہیل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دیر تک صلح کی شرائط پر گفتگو ہوتی رہی، بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور اس طرح جنگ ٹل گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت سعد بن ابی وقاص کو فتح ایران کی مہم پر روانہ فرمایا، حضرت سعد نے دربارِ خلافت کی ہدایت کے مطابق شراف سے بڑھ کر قادسیہ میں مورچہ جمایا، اور نعمان بن مقرن کے ساتھ چودہ اشخاص کو منتخب کر کے دربارِ ایران میں سفیر بنا کر بھیجا کہ شاہِ ایران اور اس کے رفقاء کو اسلام کی ترغیب دیں۔

شام کی فتح کے موقعہ پر بھی اسلامی شعار کے مطابق مسالمانہ طور پر معاملات طے کرنے کی کوشش

کی گئی، لیکن رومی دمشق کی شکست سے سخت برہم تھے، اُنھوں نے ہر طرف سے فوجیں جمع کر لی تھیں اس زعم میں اُنھوں نے معقول بات نہ سُنی ... ... عیسائیوں کی درخواست پر مسلمانوں کی جانب سے حضرت معاذ بن جبل سفیر بن کر گئے۔

معرکہ صفین میں کے موقعہ پر حضرت علی کرم اللہ وجہ نے جنگ شروع کرنے سے قبل اتمام حجت کے لئے ایک بار بشیر بن عمر سعید بن قیس ہمدانی اور شیث بن ربعی کو امیر معاویہ کے پاس سفیر کی حیثیت سے بھیج کر مصالحت کی آخری کوشش کی، لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

**سادگی** جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا مطالعہ کیا ہے، اُن کو اندازہ ہوگا کہ دربارِ نبوت میں سُفرا کا کس طرح استقبال کیا جاتا تھا، رسول اللہ کا دربار نقیب وچاؤش، تخت وتاج اور خدم وحشم کا دربار نہ تھا، دروازے پر دربان تک نہ ہوتے تھے تاہم نبوت کے بلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا، دربارِ رسول میں نسل ورنگ، حسب ونسب، ناموری و شہرت اور منصب و دولت کی بناپر کسی دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی، حقیقی فضیلت کا معیار صرف نیکوکاری اور خدا ترسی تھی (کما قال اللہ تعالیٰ" اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)

مسجدِ نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا، عموماً رسولِ اکرم وہیں نشست فرماتے تھے، رسول اللہ کی محفل میں آنے والوں کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، صحرا کے بدوی اور اعرابی آزادی کے ساتھ چلے آتے اور خود رسول اللہ سے بعض اوقات بے باکی کے ساتھ گفتگو کرتے، رسولِ اکرم مجلس میں صحابہ کرام کے ساتھ اس طرح ملے جُلے بیٹھتے کہ کوئی اجنبی آتا تو رسول اللہ اور صحابہ کرام میں امتیاز نہ کرسکتا، ایک بار ایک اجنبی آدمی دربارِ نبوت میں آیا اور اُس نے لوگوں سے پوچھا "محمدؐ کون ہیں!" صحابہ نے بتایا "یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اُس نے کہا "اے محمدؐ ابن عبد المطلب" میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا، خفا نہ ہوجانا" آپؐ نے خوشی کے ساتھ سوال کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کے زمانہ قیام میں سُفرا کو مسجدِ نبوی میں باریاب فرمایا کرتے تھے، جہاں اسطوانۃ الوفود (Pillar of Embassies) آج بھی اس خاص مقام کی نشاندہی کرتا ہے، جب فتح مکہ کے بعد اطرافِ مُلک سے بکثرت ملکی ومذہبی وفود آئے تو آپؐ نے بہ نفسِ نفیس اُن کی خاطر و مدارات میں حصہ لیا اور اُن کے لئے حسب ضرورت وظائف اور اور سفر کے مصارف ادا فرمائے، سفیروں کے استقبال کے وقت خود آنحضرت اور صحابہ کرام بھی خوش وضع پوشاک زیبِ تن فرمالیا کرتے تھے، سفرا بھی بارگاہِ نبوت میں باریابی کے وقت لباس اور وضع قطع کی صفائی کو ملحوظ رکھتے تھے، بحرین کے لوگوں نے چودہ اشخاص کی ایک سفارت رسول اللہ کی خدمت میں روانہ کی، جس کے لیڈر منذر بن الحارث تھے، اُن کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بے تاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے ... ... لیکن مُنذر کو پاسِ ادب ملحوظ تھا اُنھوں نے قیام گاہ

پر جا کر کپڑے بدلے، پھر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اس طرح جب مسلمان سفرا دوسرے درباروں کو روانہ کئے جاتے تو وہ بھی خوش لباسی کا خیال رکھتے، حضرت عبداللہ بن عباس جب حروریہ کے پاس سفیر ہو کر گئے تو یمن کے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھے، حروریہ نے کہا کیوں عباس یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو میں نے رسول اللہ کو بہتر سے بہتر لباس میں دیکھا ہے[1]

جناب رسالت مآب علیہ التحیات والثنا اور آپ کے چاروں خلفاء کے زمانہ میں استقبال کے موقعوں پر کوئی خاص تکلف کیا جاتا تھا، نہ کسی طمطراق اور آرائش و زینت کا ظہور ہوتا تھا خلافت کے تعلق سے فاروقِ اعظم کی عظمت و جلالت کی کوئی حد نہ تھی، لیکن مساوات اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ کے سفرا آتے تو انھیں یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ ان میں شاہ کون ہے اور گدا کون ہے؟

ملک بازنطین کے سفیر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے خلیفۂ وقت حضرت عمر کو زمین پر، تکئے اور بستر کے بغیر دھوپ میں سوتا ہوا پایا ——— لیکن یہ سادگی اور تصنع سے بیزاری اور دوری خلافت راشدہ ہی تک باقی رہی، بنو امیہ اور عباسی فرمانرواؤں کے دربار اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے قیصر و کسریٰ کے درباروں کو مات کرتے تھے، اسی بازنطینی سلطنت کا سفیر جب عباسی خلیفہ المقتدر باللہ کے دربار میں حاضر ہوا تو وہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

عباسی دور کے مشہور ادیب و کاتب ہلال بن محسن صابی نے کتاب الوزراء میں اُس (خلیفۃ المقتدر باللہ) کی شان و شوکت کے نہایت مفصل حالات لکھے ہیں، اس کا ایک دربار ۳۰۵ھ میں رومی سفیروں کی آمد کے سلسلہ میں منعقد ہوا بغداد میں ابتدا ہی سے بہ کثرت شاہی محلات تھے، اور مقتدر کے زمانہ میں ان کی تعداد اور بڑھ گئی، اس دربار کے موقع پر ۲۳ محل آراستہ کئے گئے، اُن کا کوئی گلی کوچہ اور بام و در ایسا نہ تھا جو زینت و آرائش سے خالی ہو، فرش فروش کی تعداد ۲۲ ہزار اور صرف پردوں کی تعداد جو دروازوں اور دوسرے مقامات پر آویزاں کئے گئے تھے ۳۸ ہزار تھی، یہ تمام پردے کارچوبی اور زرنگار تھے جن پر حیوانات اور پرندوں کی تصویریں اور نقش و نگار بنے تھے، خاص قصرِ خلافت کے آستانہ پر پانچ پانچ سو زرین پوش سوار ایستادہ تھے جن کے گھوڑوں کے ساز نقرئی و طلائی اور جن پر حریر و دیبا کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں ..... ...... خود مقتدر نہر دجلہ کے کنارے قصر التاج میں فرد کش تھا، اس کی زینت و آرائش حدِ وصف سے باہر ہے، آبنوس کے مرصع تخت پر بیٹھا تھا اس کے دائیں بائیں اٹھارہ ہار آویزاں تھے، یہ جواہر گراں بہا اور سب کے سب ایک ہی جوف او جسامت کے تھے، ان کی جوت سے رات کو دن کا عالم نظر آتا تھا ——— یہی وہ دورِ ملوکیت تھا جس کے عجمی تمدن نے مسلمانوں سے اسلام کی روح کو سلب کر لیا۔ قصر و ایوان، شبستانوں اور مکانوں میں بلوریں فانوس اور کافوری شمعیں جھلاتی تھیں مگر دلوں کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔

## امن وسلامتی کا قانون

اسلامی قانون بین الممالک اور سفارت کاری کے بنیادی تصورات بھی یہی ہیں، البتہ اد جنگ کے لئے مسالمانہ تعلقات پر بہت زور دیا گیا ہے

[1] سیرۃ النبی جلد دوم

اور سفراء کے فرائض کو اس مقصد سے بہت کچھ وابستہ کیا گیا ہے ـــــــ تحویل ملزمان کی کارروائیاں بھی سفراء کے ذریعہ ہوا کرتی تھیں، صلح حدیبیہ میں ایک شرط قریش کی جانب سے یہ لگائی گئی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص رسول اللہ کے پاس فرار ہو کر آجائے تو اُسے قریش کو واپس کر دیا جائے گا، لیکن مسلمانوں کے ساتھ یہ رعایت نہ ہوگی، صلح حدیبیہ کا معاہدہ جس وقت لکھا جا رہا تھا، اُس وقت سُہیل جو کفار مکہ کے سفیر تھے، ان کے صاحبزادے ابو جندل جو مسلمان ہو چکے تھے، کسی طرح بھاگ کر رسول اللہ کی خدمت میں پہونچ گئے سُہیل نے کہا اے محمدؐ! صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، چنانچہ رسول اللہ نے ابو جندل کو واپس بھیج دیا، یہی صورت عتبہ بن اُسید کے وقت بھی ہوئی، وہ بھاگ کر مدینے آگئے تھے، قریش نے اپنے سفرار کے ذریعہ اُن کو واپس بلوا لیا۔

دور حاضر کے "قوانین امن" کو بہت کچھ ترقی یافتہ کہا جاتا ہے، مگر جنگی قوانین نہ تو معین ہیں اور نہ منظم! حربی قوانین کا زیادہ تر دارومدار کمانڈروں اور فوجی افسروں کے اختیار تمیزی پر ہوتا تھا ـــــــ برخلاف اس کے اسلامی نظامِ قانون میں جنگی قواعد کو ہم نہایت معین اور منظم طور پر موجود پاتے ہیں، اعلانِ جنگ دشمنوں کے ساتھ برتاؤ، مالِ غنیمت، قیدیوں کے ساتھ سلوک، جاسوسوں، یرغمال، عارضی صلح، اور التوائے جنگ کی گفت و شنید، ان سب کے تعلق سے مکمل قواعد اسلام کے قانونِ جنگ میں ہم کو ملتے ہیں۔

قیدیوں کے قتل کئے جانے، لوٹ مار اور عام تباہی کے خلاف اسلام نے سخت احکام انسدادی و امتناعی دئے ہیں، یہاں تک کہ کھیتوں اور ہرے بھرے درختوں کو کاٹنے کی بھی شدت سے ممانعت کی گئی ہے، اور عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کی حفاظت کو بھی اسلامی فوجوں کا فریضۂ اولین قرار دیا گیا ہے ـــــــ ایسے انسانیت نواز قوانین کی موجودگی میں "سفراء" کے ساتھ اسلام کا برتاؤ ظاہر ہے کہ بہتر سے بہتر ہی ہو سکتا ہے! نہ صرف حالتِ امن میں سفیروں کی حرمت کا خیال رکھا جاتا تھا بلکہ جنگ کے دوران میں بھی اُن کی "حرمت" پر حرف نہ آنے دیا جاتا تھا، حالتِ جنگ میں بھی دشمنوں کو تجارتی سہولتیں بہم پہونچائی جاتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حفاظت و صیانت کے پروانے اغیار کو بھی دئے جاتے تھے، چنانچہ اسی زمانہ میں جاآن (Sealog) اور عقبہ کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی اور تجارتی سہولتیں بہم پہونچائی گئیں۔

پچھلے اوراق میں دوسری سلطنتوں اور مذہبوں کی "سفارت کاری" اور قانون بین الممالک کا ذکر کیا جا چکا ہے، ان میں بلاشبہ بعض باتیں مفید اور کارآمد ہیں ـــــــ لیکن اسلام کے قانون، دستور، منشور اور طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن قوانین میں انسانی دماغ کام کر رہا تھا اور اسلامی دستور میں خود فطرت، مشیت، قدرت اور خالقِ ارض و سمٰوٰت کا حکم کارفرما ہے! جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اسلام کی اسپرٹ سے آشنا ہو گیا!

**حرفِ آخر!** ریڈیو، تار، بجلی، ہوائی جہاز اور دوسری سائنس کی ایجادات نے آج کی دنیا میں زمین و مکان کے فاصلوں کو کم کر دیا ہے، اس لئے مملکتوں کے تعلقات اور بین الاقوامی مسائل میں بھی بڑی وسعتیں اور نزاکتیں پیدا ہو گئی ہیں، "سفارت کاری" آج ایک مستقل فن بن گیا ہے، سلطنتوں کے باہمی تعلقات کو اُستوار بنانے کے لئے آئے دن طرح طرح کے کمیشن، وفد، انجمنیں اور

اور مشاورتی بورڈ تشکیل پاتے رہتے ہیں، یہ ٹڈیوں اور مچھلیوں کی بین الاقوامی کمیٹی ہے ـــــــ اس انجمن میں روئی کی پیداوار اور نکاسی کے مسائل پر غور ہو رہا ہے ـــــــ یہ خیر سگالی کا مشن ہے ـــــــ یہ عالمی صحت کا وفد ہے ـــــــ یہ انٹرنیشنل میڈیسن بورڈ ہے ـــــــ یہ ارباب سیاست انسدادِ جنگ کی تدابیر پر غور و خوض کر رہے ہیں ـــــــ اور پھر "مجلس اقوام متحدہ" میں کیا کیا دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں ـــــــ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور ہو رہا ہے مگر دکھائی یہ دیتا ہے کہ بین الاقوامی مسائل کی الجھن روز بروز بڑھ رہی ہے، معاملات اُلجھتے اور پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں، ایک جنگ ختم ہوتی ہے اور دوسری عظیم تر جنگ کی داغ بیل پڑنی شروع ہو جاتی ہے، آج دنیا فتنوں اور شورشوں کے کوہِ آتش فشاں پر کھڑی ہوئی ہے، نہ جانے کب کیا ہو جائے؟

گزشتہ زمانہ کے مقابلہ میں "سفارت کاری" نے جہاں تک ظاہری رسوم و رواج کا تعلق ہے یقیناً بہت ترقی کی ہے، سفیروں کے یہ عالی شان ایوان، جگمگاتے دفتر، صبا رفتار موٹریں جن پر حکومتوں کے جھنڈے لہراتے رہتے ہیں ـــــــ شاندار دعوتیں، لچھے دار تقریریں، اسناد (credentials) پیش کرنے کی تقریبیں، حکومتوں کی باہمی مراسلت کا طریقِ کار، خط و کتابت کی محتاط عبارت ـــــــ پھر ہر مملکت میں وزارت خارجہ" کا قیام اور اُس کی سرگرمیاں! سب سے بڑھ کر "مجلسِ اقوامِ متحدہ" کے شاندار جلسے کہ جس کی کارروائیوں کا ایک ایک لفظ دنیا کے طول و عرض میں نشر کیا جاتا ہے ـــــــ مگر ان کوششوں کا نتیجہ؟ نہ پوچھیے، اور پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے، ہم سب اسی ناوکِ ناز کے زخم خوردہ ہیں۔ ہر زبان "امن، امن" کے نعرے لگاتی ہے اور "امن" ہے کہ اُڑتا اور مٹتا چلا جا رہا ہے ـــــــ آج کی برابر دنیا "امن" کی محتاج شاید کبھی نہیں رہی، جن کے دھرم میں "جیو ہتھیا" بہت بڑا پاپ ہے اور جو "شانتی" کے بہت بڑے دیوتا ہیں، سیاست و اقتدار کی دنیا میں انسانیت نے انھیں بھی آزما کر دیکھ لیا۔

اس خرابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تمام مملکتوں کے مفاد ایک دوسرے سے متصادم ہیں، اُن کے نظریے مختلف ہیں، دل میں کچھ ہے، زبان پر کچھ ہے ـــــــ معاہدوں اور صلحناموں کی عبادت میں جان کر سیاسی نزاکتیں سموئی جاتی ہیں کہ ضرورت کے وقت ایک ہی جملہ سے مختلف معنیٰ اخذ کئے جا سکیں۔۔۔ حالانکہ تاریخ میں حُدیبیہ کا صلح نامہ بھی ہمیں ملتا ہے جس کی عبارت سیدھی سادی، سچی اور بے لاگ ہے۔

اربابِ سیاست خود اپنے بنائے ہوئے قانون کے طوق اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں، افکار و نظریات میں "وحدت" باقی نہیں رہی، کثرتِ تعبیر ہی سے خوابِ امن و سلامتی پریشان ہو کر رہ گیا ہے، سفرا اپنے کو مملکت اور اپنی قوم کے سامنے ذمہ دار سمجھتے ہیں، یہ خیال دلوں سے تریب قریب نکل چکا ہے یا نکلتا جا رہا ہے کہ ہر انسان اپنے خالق کے سامنے ذمہ دار ہے، اور اللہ نے بندوں کو پیدا کر کے یوں ہی آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ جس طرح چاہو زندگی بسر کرو، جس نے گھانس کے ایک تنکے کے لئے بھی ایک ضابطہ اور وظیفہ حیات مقرر کیا ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کے واسطے اُس نے کوئی دستورِ حیات نازل نہ فرمایا ہو!

جب تک دنیا "کلمہ حق" پر جمع نہ ہوگی، دینِ فطرت کو پورے کا پورا قبول نہ کیا جائے گا، اور زندگیاں رسول اللہ کے "اُسوۂ حسنہ" کے معیار کے تحت تشکیل نہ پائیں گی ـــــــ دُنیا کی یہ ہولناک بے چینی اور

حشر انگیز اضطراب دُور نہیں ہو سکتا ہرگز نہیں ہو سکتا! سیاست و تمدن کا یہ ظاہری طمطراق "غیر فطری" ہے اسے زندگی سے کوئی ربط نہیں ہے، دُنیا کے درد کا مداوا "اسلام" اور صرف "اسلام" ہی سے ہو سکتا ہے۔ کہ یہی سچائی کی متوازن راہ ہے!

# زکوٰۃ کا صحیح مَصرف

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کثرت سے ایسے نادار طلبہ ہیں جن کے طعام و لباس کی کفالت اہلِ خیر حضرات کرتے ہیں، آپ اپنی زکوٰۃ کا کوئی حصہ ان غریب طلبہ کے لئے بھیجکر عند اللہ ماجور ہو جیئے ـــــ یہی وہ طلبہ ہیں جو فارغ التحصیل ہو کر بندگانِ خدا کو حق کی راہ دکھائیں گے اور ہدایت کا سبب بنیں گے:

مولانا مناظر احسن گیلانی

# دینِ اسلام

## جس میں جبر اور زبردستی نہیں!

ایک خطرناک بدگمانی اور افسوس ناک غلط فہمی کی تردید ـــــــ فلسفہ و کلام اسلامی رنگ میں!
دو ٹوک باتیں، کھلی ہوئی حقیقتیں ـــــــ علم جس میں فراستِ ایمانی اور سوزِ باطن بھی شریک ہے!

کیسی عجیب بات ہے، مسلمانوں کی آخری اساسی کتاب "القرآن" میں تو اعلان کیا گیا ہے، کہ

وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ ویجعل اللہ الرجس علی الذین لا یعقلون (یونس)

اور نہیں ہے کسی کے بس میں کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کی اجازت سے، اور گندگی کو اللہ ان پر ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ رضامندی اور خوشی کے ساتھ بھی اگر کوئی ایمان لانا چاہتا ہے اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا خواہش مند ہو، تو جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن اور اجازت نہ ملے، وہ اپنے دل کی اس آرزو کو یعنی مومن ہونے کی آرزو کو پوری نہیں کر سکتا،

ذرا خیال کیجئے، اسی قرآن کے ماننے والی اُمت پر یہ الزام لگایا جاتا ہے، کہ جو مومن ہونا نہیں چاہتے تھے ان کو زبردستی جبر کر کے مسلمان بنانے کی کوشش اسی امت نے کی، اور اپنی اس کوشش کو اس نے دین کا کام یقین کیا۔ تاریخ اس الزام کا جو کچھ جواب دے سکتی ہے، یا دے چکی ہے، اس وقت میرے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے، اور نہ میں ان قرآنی نصوص اور آیات کو دہرانا چاہتا ہوں جن میں بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ دین یا مذہب ایسی چیز ہی نہیں ہے جس کے ماننے پر زبردستی لوگوں کو مجبور کیا جائے۔ جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ یہ واقعی دین کے ماننے والوں میں اضافہ نہ ہوگا، بلکہ نہ ماننے والوں کے انکار کو جس کی قرآنی تعبیر کفر ہے اسی کفر

کو کفر ہی کی مہیب ترین شکل میں منتقل کرنے کی مجرمانہ اندالیسی کوشش ہوگی، جس سے بجائے فائدے کے اسلام اور خود مسلمانوں کے لئے طرح طرح کے خطرات کے دروازے کھل جاتے ہیں، آخر زبردستی مسلمان بنانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ دل سے اسلام کی سچائی کو جس نے نہیں قبول کیا اور قبول کرنا نہیں چاہتا، اسی کو ڈرا دھمکا کر مال اور جان عزت و آبرو کے خطروں میں مبتلا کر کے اس پر مجبور کیا جائے کہ زبان، صرف زبان سے اسلام کی صداقت کا اقرار کر لے۔

خود سوچیئے کہ دل کے انکار کے ساتھ زبان صرف زبان سے اسلام کے اسی لفظی اقرار ہی کا نام تو "**نفاق**" ہے، اور کون نہیں جانتا کہ نفاق کو قرآن نے کفر کی بدترین قسم قرار دیئے ہوئے "الدرک الاسفل من النار" (یعنی جہنم کے سب سے نچلے حصے کو اس کا آخری انجام بتایا ہے پھر کفر کو کفر ہی کی بدترین شکل میں منتقل کر دینے کی کوشش: یہ دین کی راہ کی کوشش ہوئی یا بے دینی کو، کوشش ہوئی یا بے دینی کو آگے بڑھانے کی سرگرمی صحیح معنوں میں یہ ہوگی،

دل کے انکار، زبان کے اقرار کے ساتھ مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہونے کی اجازت لوگوں کو اگر دے ہی جائے گی، تو مسلمانوں کی زندگی کا کوئی راز کیا راز باقی رہ سکتا ہے؟ مسلمانوں کی جان کو مال کو بلکہ عزت و ناموس کو اس قسم کے لوگوں کے گھل مل جانے سے طرح طرح کے نقصانات کے جو اندیشے پیدا ہو سکتے ہیں، کیا اس کے لئے بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے؟

عہد جدید کے "سیاسی لغت" میں "ففتھ کالم" کی اصطلاح کے پیچھے جن خطرات کی دھمکیاں سمجھی جاتی ہیں کر چھپی ہوئی ہیں، کیا زبردستی مسلمان بنا کر مسلمانوں کی جماعت میں جن لوگوں کو شریک کیا جائے گا۔ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ان ہی خطرات کی توقع ان سے نہ کی جائے۔

دین نہ سہی، تو کہتا ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے عقل بھی کسی حیثیت سے مسلمانوں کو بلا وجہ ان خواہی نخواہی خطروں کے خریدنے کا مشورہ دے سکتی ہے؟

پھر الزام کے تراشنے والوں نے مسلمانوں کو آخر کیا قرار دے رکھا ہے، دین کے تحت زندگی گزارنے والی قوم اگر مسلمان سمجھے جاتے ہیں، تو آپ دیکھ چکے کہ زبردستی مسلمان بنانے کی ممانعت ان کے دین ہی میں کی گئی اور دین پھیلانے کا شوق سمجھا جاتا ہے کہ ان پر مسلط تھا، تو جس فعل سے دین میں نہیں بلکہ بے دینی اور کفر میں اضافہ ہوتا ہو، دین پھیلانے کا شوق رکھنے والی قوم اسی فعل کے ارتکاب کی جرأت کیسے کر سکتی ہے؟

اور دین نہ سہی بلکہ خیال کر لیا جائے کہ عقل کے تقاضوں پر یہ قوم عمل کرتی رہی ہے، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اپنی جماعت میں "ففتھ کالم" کے لوگوں کو شریک کرنے کی اجازت کیا کسی حیثیت سے عقل بھی دے سکتی ہے؟

بہر حال جس پہلو سے بھی دیکھا جائے، بالجبر سینوں پر چڑھ چڑھ کر لوگوں سے کلمہ پڑھوانے، اور زبردستی مسلمان بنانے کی تہمت جس عہد کے مسلمانوں پر جوڑی جاتی ہے، اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن دوست ہوں یا دشمن اتنی بات تو سب ہی مانتے ہیں اور ان کو ماننا ہی چاہیئے کہ نہ اپنے دین کے مطالبوں کی تکمیل سے وہ لاپروائی برتتے تھے اور دین کے ساتھ ساتھ سوجھ بوجھ عقل و دانش میں بھی دنیا کی کسی قوم سے وہ پیچھے نہ تھے، بلکہ

یہی بات تو یہ ہے کہ ان کی عقل کے آگے قوموں نے کم ازکم اس خاص زمانے میں اپنی سپر ڈال دی تھی، ہوش وگوش میں ان سے ہم سری کا دعویٰ کوئی مشکل ہی سے اس زمانے میں کر سکتا تھا،

یہ ایک تمہیدی بات تھی، ذکر آگیا، اس لئے کچھ اشارے اس مسئلہ کے متعلق بھی مجھے کرنے پڑے، ورنہ آج جس چیز کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، یہ ایک قرآنی حقیقت ہے اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ اس کی تاریخ اسی قدر پرانی ہے، جتنی پرانی قرآن کی تاریخ ہے مگر مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ جس توجہ کا مستحق قرآن کا یہ دعویٰ تھا، اتنی توجہ اس کی طرف نہیں کی گئی، پڑھنے والے پڑھتے رہے اور گزرتے رہے حالانکہ اسی دعویٰ کو شروع ہی میں اچھی طرح اگر منقح کر لیا جاتا، اور خود قرآن میں اس دعویٰ کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس کو کماحقہٗ سمجھ لیا جاتا اور سمجھا دیا جاتا تو شاید زور و زبردستی کے ان خود تراشیدہ افسانوں کے گھڑنے کی ہمت ہی لوگوں کو پیدا نہ ہوتی،

قرآن کے بجنسہ الفاظ نقل کر چکا ہوں، یہ سورۂ یونس کی مشہور آیت ہے حاصل اس کا وہی ہے کہ جبر و زبردستی تو خیر دور کی بات ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خوشی سے بھی ایمان کے قبول کرنے یا مسلمان ہونے پر کوئی آمادہ ہو، تو اس دولت سے سرفرازی کا شرف مسلمان ہونے کی خواہش رکھنے والوں میں سے صرف ان ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے، جسے قدرت کی طرف سے ایمان لانے کا اجازت نامہ یا لائسنس اذانی ہو چکا ہو، ورنہ اس لائسنس یا اجازت نامے کے بغیر کوئی لاکھ مومن بننا چاہے، مومن نہیں بن سکتا،

خیر یہ تو مندرجہ بالا آیت کا حاصل اور خلاصہ ہوا، رہا اس کا مطلب تو جس مقام پر قرآن میں اس دعویٰ کو ہم پاتے ہیں، اس کے آگے پیچھے جو کچھ بیان کیا گیا ہے، مناسب یہ ہے کہ پہلے اس کو سمجھ لیا جائے، چند مقامات کی شکل میں ان باتوں کو میں پیش کرتا ہوں، غور سے ان کو پڑھئے، انشاء اللہ نتیجہ آپ کے سامنے خود بخود آجائے گا۔ باہم دو آدمی مثلاً زید و عمرو ایک دوسرے سے شفاہی ملاقات کرتے ہیں، زید کے سامنے عمرو آتا ہے اور عمرو کے سامنے زید، اور اس وقت یہ سمجھا جاتا ہے، کہ زید عمرو کا مشاہدہ کر رہا ہے اور عمرو زید کا، مشاہدے کی اس قطعی کیفیت کے متعلق سوچئے، کہ درحقیقت واقعہ کی نوعیت اس وقت کیا ہوتی ہے؟

کیا زید کے سامنے عمرو کا سب کچھ اور عمرو کے سامنے زید کا سب کچھ آجاتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ ان دونوں شخصیتوں کا وجود مستقل دو جزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی ایک جسم، اور دوسری جان، اتنی بات تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کی جان یا روح دوسرے کے سامنے نہیں آتی، حالانکہ اسی کے ساتھ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ ان دونوں کے وجود کا حقیقی جوہری جز جان اور روح ہے، جو ان میں سے کسی کے ایک کے سامنے نہیں آتی، سامنے جو چیز آتی ہے وہ دونوں کا جسم یا جسد ہے۔ مگر ذرا اور غور کیجئے۔ جسم اور جسد جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ دو شخصیتوں کے شاہداتی تعلق میں وہی سامنے آتا ہے، کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہے؟ ہوا بھی ایک جسمانی وجود ہے، لیکن آنکھ اس کے وجود کو محسوس نہیں کرتی، کیوں محسوس نہیں کرتی؟ ظاہر ہے کہ بینائی کی قوت کا تعلق دراصل رنگ اور روشنی سے پیدا ہوتا ہے رنگ سے ہوا کا جسم چونکہ خالی ہوتا ہے، اس لئے آنکھوں کے سامنے وہ نہیں آتی،

پس زید و عمرو کے جسم یا جسد کے متعلق جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہی دیکھنے والے کے سامنے آتا ہے کسی حیثیت سے بھی درست ہے، حقیقت یہ ہے کہ زید ہو، یا عمرو باہم ان میں کوئی ایک نہ کسی کے جسم کو دیکھتا ہے اور نہ جسد کو بلکہ جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ ان کے جسم کے کھال یا جلد کا رنگ و روغن اور ان کی مقدار وہی شکل و صورت جیسی چیزیں ہوتی ہیں، بالفاظ دگر یوں کہئے کہ روشنی کے توسط سے آنکھیں زید و عمرو کے جسم کو نہیں بلکہ جسم کے فقط رنگ و روغن شکل و صورت ڈیل ڈول کو پاتی ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ جان تو خیر جان ہی ہے جسم اور ڈھانچے کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو زید کے لئے عمرو کے وجود کا اکثر و بیشتر حصہ "مغیب " اور "ناپدید" ہی رہتا ہے، بہرحال اپنی اس پیش کردہ.. مثال سے میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ عموماً جن چیزوں کے متعلق مشاہدے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مشاہدہ کرنے والوں کے لئے اس قسم کی چیزوں کے وجود کا بھی اکثر و بیشتر حصہ "مغیب " اور نظروں سے پوشیدہ ہی رہتا ہے، کائنات کی کار فرما طاقت یعنی حق تعالیٰ جل مجدہ کے وجود کو "غیبی وجود" عموماً مانا جاتا ہے، خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ قرآن بار بار دہرا دہرا کر کائنات کے موجودہ نظام کو جو ہم سب کے سامنے ہے اسی کو ...... "**آیات اللہ**" کا نام دے کر جیسا کہ ظاہر ہے لوگوں پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اللہ نہ سہی، مگر اللہ کے آیات اور اس کی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں، قرآن کے اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ذرا اس مثال پر غور کیجئے

یعنی زید و عمرو کے درمیان مشاہدے کا جو تعلق پیدا ہوتا ہے، بتایا گیا تھا کہ مشاہدے کی اس شکل میں بھی نہ زید ہی کی ذات عمرو کے سامنے آتی ہے اور نہ عمرو ہی کی ذات زید کے سامنے، یعنی جان اور روح ہی نہیں بلکہ دونوں کے جسم اور جسد کا بھی یہی حال ہے کہ صرف ان کی نشانیاں اور آیات، بالفاظ دگر رنگ و روغن شکل و صورت بس یہی چیزیں مشاہدے کی اس شکل میں مشاہدہ کرنے والوں کے سامنے آتی ہیں، ورنہ ذات کے حساب سے عمرو بھی زید کے لئے اور زید بھی عمرو کے لئے غیب ہی غیب رہتا ہے۔ جان کے حساب سے بھی، اور جسد و جسم کے اعتبار سے بھی، مگر باوجود اس کے جب یہ سمجھا جاتا ہے کہ زید نے عمرو کا مشاہدہ کیا اور عمرو نے زید کا،

تو ایسی صورت میں "آیات اللہ" کا مشاہدہ جن لوگوں کو میسر آ رہا ہے، وہ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ اپنے مشاہدے سے "اللہ" نے ان کو محروم کر رکھا ہے۔ یہی وہ لاہوتی نکتہ ہے جب فطرتِ انسانی پر واضح ہوتا ہے تو "لا احب الآفلین" (اوجھل ہو جانے والے کو میں پیار نہیں کر سکتا) اس وجدان کا پانے والا چیخ اٹھتا ہے۔ بلکہ ذرا اور سوچئے ایک خطاط اور خوش نویس خطاطی کا دعویٰ کرتے ہوئے آپ کے سامنے آتا ہے، مگر اس کے ہاتھ میں نہ اس کی لکھی ہوئی وصلیاں نہ رقعے، اسی کے برعکس دوسرا خطاط بھی خطاطی کے دعوے کو پیش کرتے ہوئے آپ کے آگے اس شان کے ساتھ آتا ہے کہ از سرتا بقدم ان ہی کاغذوں میں لپٹا ہوا ہے، جو اس کے لکھے ہوئے حروف و قطعات وغیرہ سے بھرے ہوئے ہیں، خود غور کیجئے کہ خطاطی کے دعوے کے ساتھ خطاط کے ظہور و نمود کی کامل ترین شکل مذکورہ بالا دو شکلوں میں سے کون سی ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ خطاطی کے کمالات میں اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے جو خطاطی کے دعوے کے ساتھ آپ کے آگے آیا ہے، خطاطیت کے ظہور کی یہی بہترین شکل ہو سکتی ہے اس مثال کو سامنے رکھ کر غور کیجئے — کہ کائنات کی کار فرما طاقت کے ظہور کی ایک شکل تو وہ ہے جو اس وقت آپ کے سامنے ہے، یعنی کار فرمائی کے کمالات کو پتہ پتہ، ذرہ ذرہ سے وہ نمایاں کر رہا ہے، اس کے ظہور و نمود کی کامل ترین شکل یہ ہے؟ - یا ان کمالات

کے بغیر صرف اپنی ذات کو آپ کے آگے وہ نمایاں کر دیتا، یہ اس کے ظہور کی شناخت کی کامل ترین شکل ہو سکتی تھی۔ یقیناً حق تعالےٰ کے ظہور و نمود کا موجودہ قالب یعنی اپنے گوناگوں، بوقلموں، کمالات کے ساتھ اس وقت ہمارے آگے اپنے آپ کو جو اس نے نمایاں کیا ہے یہی اس کے ظہور و نمود کا سب سے بہتر سب سے زیادہ موثر طریقہ ہو سکتا تھا۔ اور اسی طریقہ کو اس نے اختیار بھی کیا، اسی صورت میں اس کی باتیں کہ اس خدا کو ہم کیسے مانیں جو ہماری نظروں سے ہمیشہ اوجھل اور غائب رہا وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ اپنے پیدا کرنے والے مالک رحمٰن و رحیم کے سامنے آنا چاہتے ہیں اور شاید ان کا پیدا کرنے والا بھی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے وہ نہ آئیں،

(۴)

اب میں آپ سے ایک اور بات پوچھتا ہوں کہ زید کے سامنے فرض کیجئے کہ عمرو بھی آگیا، اور عمرو کے سامنے زید بھی، دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے یا بیٹھے ہیں، زید عمرو کو دیکھ رہا ہے اور عمرو زید کو، مگر باوجود ان تمام باتوں کے نہ زید ہی عمرو سے کچھ کہتا ہے اور نہ عمرو ہی زید سے کچھ بولتا ہے دونوں گم چپ صرف آمنے سامنے بیٹھے یا کھڑے ہیں فقط اس کی توقع رکھتے ہیں کہ رنگ و روغن، شکل و صورت ڈیل ڈول چال ڈھال کو دیکھ کر ہر ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے واقف ہو جائے گا۔ مگر بجائے ان کے دو آدمی اور ہیں، جو ایک دوسرے کے سامنے آنے کے بعد اس میں گفتگو کرتے ہیں، یہ اس کو اپنی سُناتا ہے اور وہ اس کو اسی گفتگو بات چیت کی راہ سے اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کرتا ہے یقیناً اپنے منشا اور مافی الضمیر سے مطلع کرنے کی بہترین شکل یہی دوسری صورت ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت جس میں صرف رنگ و روغن شکل و صورت جیسی چیزوں کی مدد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ باہم ایک دوسرے کے مطلب سے واقف ہو جائیں گے۔ حد سے زیادہ مشتبہ اور ایسی شکل ہے جس سے غلط فہمیوں بلکہ گمراہیوں تک میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور بہت زیادہ اندیشہ ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کو بھی ذرا سوچتے چلئے کہ یہ ملنے والے دو آدمی جو ملنے کے بعد گفتگو کر کے باہم ایک دوسرے کو اپنے دل کی باتوں سے مطلع کرتے ہیں، تو اس وقت کیا کیا جاتا ہے؟

جسدی نظام جس سے ہر ایک کام لیتا ہے۔ اسی نظام کا ایک جز جس کا نام زبان ہے، اس کو اپنے زیر قابو اور زیر اثر لا کر جو کہنا مقصود ہوتا ہے، وہی کہہ دیا جاتا ہے، یہی واقعہ ہے جس کا روزمرہ ہم تجربہ کر رہے ہیں۔ اب اگر کوئی خواہ مخواہ کا نکتہ چین یہ نکتہ نکالے کہ زید نے جو گفتگو کی، جو کہ خود نہیں کی بلکہ ہم نے جو کچھ سنا، زید کے جسدی نظام کے ایک جز یعنی زبان سے سُنا، اس لئے زبان سے سُنی ہوئی باتوں کو ہم کبھی نہیں مان سکتے، کہ وہ درحقیقت زید ہی کی کہی ہوئی بات ہے۔ تو اس قسم کے نکتہ نوازوں کے متعلق آپ کیا خیال کریں گے؟ اگر یہ نکتہ نوازی ہے، تو مجنونوں اور پاگلوں کی ہرزہ سرائیوں کو بھی نکتہ نوازی ہی کی ایک قسم کیوں نہ قرار دی جائے؟ خیر جنون و ہذیان کے قصوں سے مجھے بحث نہیں، میں تو صرف ادھر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ باوجود غیب ہونے کے "اللہ" جب "آیات اللہ" کی راہ سے اپنا مشاہدہ کرا رہا ہے، اور مشاہدہ بھی کیسا؟ کارفرمائیوں کے کمالات کے ساتھ مشاہدہ کرا رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہیں اور ہم ان کے سامنے ہیں، اور صرف سامنے ہی نہیں ہیں، بلکہ عالم کے جس نظام سے بھی کارفرما قوت جو کام لے رہی ہے، وہی ہر زمانے میں اسی عالم میں سے برگزیدہ ترین سیرت وہ کردار

دیکھنے والی اعتمادی ہستیوں کا انتخاب کرتی رہی اور ان ہی کو ذریعہ بنا کر جیسے اپنے پوشیدہ مقاصد و اغراض کو اپنے جسدی نظام کے ایک حصہ یعنی زبان سے لوگ ظاہر کرتے رہتے ہیں، اسی طرح نظام عالم سے چنی ہوئی ان انتخابی ہستیوں کو ذریعہ بنا کر ہمارا خالق ہم سے جب ہمیشہ گفتگو کرتا رہا اور اس گفتگو کی راہ سے بتاتا رہا کہ پیدا کر کے اپنی پیدا کی ہوئی خلقت، یعنی خود ہم سے وہ کیا چاہتا ہے؟ تو سوچنا چاہیئے کہ اپنی مخلوق کو اپنے منشاء سے آگاہ کرنے کی اس سے زیادہ فطری، محتاط، استوار راہ اور کیا ہو سکتی تھی؟

پھر جیسے دیکھنا، اس وظیفہ کا نام ہے جس کا تعلق ہماری آنکھوں سے ہی، اور کان سے جس غرض کا تعلق ہے ہم اس کی تعبیر شنیدن یا سننے کے لفظ سے کرتے ہیں، اسی طرح پیدا کرنے والا خالق اپنے منشاء سے بندوں کو جن انتخابی ہستیوں کو ذریعہ بنا کر آگاہ فرماتا ہے، ان کی باتوں پر بغیر کسی شک و شبہ کے بھروسہ اور اعتماد کرنا نفس انسانی کے اسی فعل کا نام اردو میں ماننا ہے، اور عربی زبان میں "ایمان" کا لفظ ماننے کے اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے اور جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بینائی کی قوت روشنی اور روشنی کے توسط سے رنگ و روغن شکل و صورت کو پکڑ لیتی ہے، اور شنوائی کی قوت آواز کو اپنی گرفت میں لاتی ہے، اسی طرح یہ واقعہ ہے کہ سیرت و کردار گفتار و رفتار، چال ڈھال کا ایک خاص مجموعہ فطرتِ انسانی کی ایمانی قوت کی قدرتی خوراک ہے، اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ یہی خوراک جب ایمانی قوت کے سامنے آتی ہے، تو بغیر کسی جھجک کے اسے وہ نگل لیتی ہے، اور ان خصوصیتوں سے جو خالی ہو، اسے اگل دیتی ہے، ٹھیک دانت کے نیچے کنکریاں لقمے کے ساتھ مل کر جب آتی ہیں، تو اچانک کام و دہن لب و دندان کے نظام میں کھل بلی مچ جاتی ہے اور تھو تھو کی آواز سے دستر خوان گونج اٹھتا ہے، کچھ اس قسم کی نسبت انسانی نفسیات کی ایمانی قوت سیرت کردار کے اس خاص مجموعہ کے ساتھ رکھتی ہے، اس خوراک کا صحیح جزو جو چیز نہیں ہے خواہ وہ بال ہی کیوں ہو، اسے وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی، لیکن اسی ایمانی قوت کی جو قدرتی خوراک ہے، بغیر کسی مخمصہ اور دغدغہ کے اسے نگلتی چلی جاتی ہے، بشرطیکہ ایمان کی اس فطری قوت کے ساتھ کوئی خارجی روگ نہ شریک ہو گیا ہو، کیونکہ ایمان کی یہی قوت کیا؟ بینائی کی قوت ہو، یا شنوائی کی، روگی ہونے کے بعد دیکھا گیا ہے کہ جہاں روشنی نہیں ہے وہیں بیمار آنکھوں کو چمک معلوم ہوتی ہے اور کان بجنے لگتے ہیں حالانکہ آواز کا پتہ بھی نہیں ہوتا، لذیذ ترین گوارا غذائیں ذائقہ کے لئے بسا اوقات دارو کے تلخ سے زیادہ کڑوی بن جاتی ہیں،

بہرحال احساس و ادراک کی تمام قوتوں کے صحیح استعمال کے لئے جانوروں میں جبلت اور انسانوں کو عقل دی گئی ہے، اسی طرح یہ اختیاری وجود جس کا نام "الانسان" ہے، اس کی "ایمانی قوت" کے صحیح استعمال کی فطری راہ یہی ہے، کہ وہ عقل سے کام لے، اس قوت کے استعمال میں عقل سے جب کام لیا جاتا ہے، تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عقل سے اسی کام لینے والے کو ایمانی اجازت نامہ عطا کر دیا جائے وہ اب مستحق ہو جاتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے منشاء اور مقصد سے آگاہی حاصل کر کے اسے ملنے اور اسے مان کر خالق کے عائد کئے ہوئے مطالبات کو اپنی زندگی میں شریک کرے، مگر اپنی عقل سے جو کام نہیں لیتے، ان کا باطن بجائے ایمان کی روشنی کے صرف ظلمت اور تاریکی کی گندگیوں سے بھر جاتا ہے ان ہی عفونتوں اور گندگیوں کا یہ نتیجہ ہے، کہ جس اللہ کا مشاہدہ اس کے لاہوتی کمالات یا - "آیات اللہ" کے ذریعے کرایا جا رہا ہے، ان کو تاہ نصیبوں کو اس مقدس مشاہدے کی حقیقت ہی

سمجھ میں نہیں آتی، گویا ان کی حالت اس شخص کی ہے جو اپنے سامنے مثلاً زید کو کھڑا پا رہا ہے، لیکن فلسفہ بگھارتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم تو صرف روشنی کو اور روشنی کے ذریعہ رنگ و روغن شکل و صورت جیسی چیزوں کو دیکھ رہے ہیں، جن میں کوئی زید نہیں ہے ان میں بعض خدا کو تو پاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ خدا کیا چاہتا ہے؟ اس کے لئے وہ ضرورت نہیں سمجھتے کہ اپنے منشا سے وہ خود آگاہی حاصل ہو جاتی ہے وہی کافی ہے اور اسی لئے جس انتخابی وجود کو ترجمان بنا کر بندوں کو اپنے منشا سے خدا واقف بناتا ہے ان کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کی حالت اسی دیوانے کے مانند ہوتی ہے جو زید کی زبان سے سُنی ہوئی بات کو اس لئے زید کی بات ماننے کے لئے آمادہ نہ تھا کہ زید کی زبان خود زید نہیں ہے، درحقیقت اسی عقلی قوت کو دیوانوں کا یہ گروہ معطل بنا کر بیٹھ جاتا ہے، اور اپنے ہذیانی وسوسوں کو عقلی نتائج قرار دے کر ان ہی کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے، آخر عقل سے اگر وہ کام لیتے تو کیا اتنی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک آدمی بھی دوسرے آدمی کے سامنے خاموش بن کر اگر کھڑا رہے تو صرف اس آدمی کی شکل و صورت رنگ و روغن کی مدد سے اس کے ما فی الضمیر اور دل کی باتوں سے صحیح معنوں میں آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی، حالانکہ دونوں آدمی ہوتے ہیں نفسیاتی تقاضوں میں کم از کم نوعی اشتراک دونوں ہی کے اندر ہوتا ہے، پھر مخلوق خالق کے منشا سے محض آثار و قرائن کی مدد سے اس وقت تک کیسے واقف ہو سکتی ہے جب تک کہ اپنے ما فی الضمیر سے خالق ہی اسے آگاہ نہ فرمائے - یہی وہ طبقہ ہے جو پیغمبروں سے باغی ہو کر بدعقلی کے ان ہی وسوسوں کو عقل کا تقاضا قرار دیتا ہے، خدائی ہدایتوں سے وہ محروم ہو جاتے ہیں اور جو کچھ ان کے دل میں آتا ہے اسی کو خدا کی مرضی قرار دے کر بجائے ہدایت کے گندگیوں میں گندگیوں کا اضافہ اپنے اندر مسلسل کرتے چلے جاتے ہیں،

عقل سے نہ کام لینے والوں کے اسی گروہ میں وہ بھی شریک ہیں جو خدا کے منشا سے آگاہی کے لئے اگرچہ ضروری سمجھتے ہیں کہ خدا اس سے خود آگاہ کرے - لیکن جن اعتمادی صفات و کمالات سیرت و کردار کا مجموعہ ایمانی قوت کی قدرتی خوراک ہے، اس کے متعلق بدتمیزی سے کام لیتے ہیں، ان کے دانتوں کے نیچے کنکریاں پر کنکریاں آتی چلی جاتی ہیں، مگر وہ ان ہی کو چبائے چلے جاتے ہیں، اور ذائقہ کی قوت جسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی، اس کے تقاضوں سے اندھے گونگے بن جاتے ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کا انتخاب اپنی گفتگو کے لئے قدرت کی طرف سے نہیں ہوتا، اسی کو انتخابی ہستیوں میں شریک کر کے جو باتیں خدا کی نہیں ہیں، ان کو خدا کی باتیں مان کر اپنے ظاہر و باطن کو یہ رجس اور گندگی میں لت پت کر دیتے ہیں،

اور اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ

| | |
|---|---|
| وما کان لنفس ان تومن الا باذن الله ویجعل الله الرجس علی الذین لا یعقلون | اور نہیں ہے کسی کے بس میں کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کی اجازت سے اور گندگی کو اللہ ان پر ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ |

قرآن کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہے

ذہنی معکوسیت کے یہ کیسے عجیب و غریب تماشے ہیں، قدرت کے اذن اور اجازت کے بغیر ایمان کی جس

دولت کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا، خواہ وہ اس دولت کا کتنا ہی آرزومند کیوں نہ ہو، کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اسی ایمان پر مسلمانوں نے جبر اور زبردستی سے کام لیا۔ ؛ وہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ عقل کے صحیح استعمال کے بغیر جس دین میں اعلان کیا گیا ہو کہ "رجس" اور گندگی" کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آسکتا، کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی دین میں عقل سے کام لینے کی ممانعت کی گئی ہے، بلکہ اسی آیت سے پہلے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| ولو شاء ربک لآمن من فی الارض | اور اگر چاہے تیرا رب تو ایمان لے آئیں |
| کلہم جمیعًا افانت تکرہ الناس | وہ سب کے سب جو زمین پر ہیں اکٹھے، کیا تو زبردستی |
| حتیٰ یکونوا مومنین - (یونس) | کرے گا لوگوں پر تا ایں کہ وہ مومن ہو جائیں؟ |

اس کا بھی یہی مطلب ہے، کہ زور اور زبردستی سے قدرت اگر کام لیتی، تو جس نے درختوں کو جانور، اور جانوروں کو آدمی بننے نہ دیا۔ وہی اگر چاہتا تو انسانوں میں بھی "مومن" کے سوا کسی کو "غیر مومن" بننے نہ دیتا، یہ اس کے لئے کتنی دشوار بات تھی، مگر سوال یہ ہے کہ خلیفہ بن کر جو پیدا ہوا ہے، "اگر اختیار" اور فیصلے کے اقتدار سے بھی اس کو محروم کر کے مومن بننے پر مجبور کر دیا جائے گا تو کیا پھر بھی وہ خدا کا خلیفہ باقی رہے گا، یا دوسرے جانداروں، چوپاؤں پرندوں جیسا ایک جانور بن کر وہ بھی رہ جائے گا۔؟ جن کے اعمال و افعال اختیار کے کمان سے نہیں نکلتے،

خدا میں جو کچھ ہے، حیات ہے، علم ہے، سماعت ہے، بصارت ہے یہ اور اس قسم کے سارے کمالات خلیفہ ہونے کی حیثیت سے الانسان کو جب عطا ہوئے ہیں، تو اقتدار و اختیار کی صفت سے وہ کیسے محروم رہ سکتا تھا، اختیار و اقتدار کے اسی کمال کے استعمال صحیح کے لئے آدمی کو عقل عطا کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ مجبور کر دینے کے معنی ہی تو ہیں کہ آدمی سے اختیار کی قوت چھین لی گئی، اور جب وہی چھین لی جائے گی، تو اس عقل کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے، جو دی ہی گئی ہے اسی اقتداری قوت کے استعمال صحیح کے لئے، عقل و اختیار میں بھی چولی دامن کی نسبت ہے، یہی وجہ تو ہے کہ عقل کو کھو کر جو پاگل اور دیوانہ ہو جاتا ہے، اختیار و اقتدار کی قوت سے بھی وہ محروم ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد شکلاً وہ آدمی ہی باقی رہتا ہے، لیکن درحقیقت پاگل آدمی نہیں بلکہ ایک زندہ جانور سے زیادہ اور کچھ باقی نہیں رہتا، پس یہ مطالبہ کہ اختیار و اقتدار کی قوت سلب کر کے مومن ہونے پر بنی آدم کو مجبور کیوں نہیں کر دیا گیا، اس مطالبہ کا دوسرا مطلب یہی ہوا کہ زمین کے اس کرے کو آدمی یعنی خلیفۃ اللہ سے خالی کر دیا جائے۔

قرآن جن پر نازل ہو رہا تھا، ان کی فہمائیش کی گئی ہے، کہ مومن بننے کے لئے آپ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتے، کہ اکراہ و مجبوری کے بعد تو انسانی وجود کا سارا خصوصی سرمایہ "اختیار و عقل" دونوں ہی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ہدایت کی گئی ہے کہ قدرت نے جس حال میں لوگوں کو چھوڑ دیا ہے آپ بھی چھوڑ دیجئے۔ پھر جو عقل سے کام لیں گے، ان کو مومن بننے کی اجازت دی جائے گی، اور اس قدرتی عطیہ کو صحیح استعمال کرنے میں جو بے پروائی اختیار کریں گے اور غفلت برتیں گے، قدرت کی طرف سے ان کو یہ سزا ملتی رہے گی کہ بجائے ایمان کے اُن کے اندر گندگی اور رجس پیدا ہو جائے گی اور عفونتوں کے سوتے اُن کے اندر پھوٹتے رہیں گے!

ویجعل اللہ الرجس علی الذین لا یعقلون - اور ڈالتا ہے اللہ گندگی ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے -

گر بدعقلی، یا عقل سے کام نہ لینے کی اس گندگی میں دنیا جب اپنے آپ کو مبتلا کر بیٹھتی ہے، تو جس کی یہ پیدا کی ہوئی دنیا ہے اپنی دنیا کو ان ہی غلاظتوں، اور نجاستوں، گندگیوں، اور ناپاکیوں کے طوفان میں بہنے اور غوطے کھانے کے لئے اسے چھوڑ دیتا ہے یا چھوڑ سکتا ہے ؟

" ایمانی اجازت نامہ" کے مذکورہ بالا قدرتی قانون کے بعد آگے ارشاد فرمایا گیا ہے،

قل انظروا ماذا فی السمٰوات و الارض وما تغن الایات والنذر عن قوم لا یومنون - بول! دیکھو! کیا کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں - اور نہیں آتی ہیں نشانیاں، اور "نذر" (دھمکیاں)، ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے -

جس کا مطلب یہی ہے، کہ آسمانوں اور زمین بلندی و پستی، علویات و سفلیات کا چپہ چپہ ان آیات اور ان نشانیوں سے بھرا ہوا ہے جن کو دیکھ کر عقل سے کام لینے والے اپنے آپ کو " اللہ" اور کائنات کی کارفرما قوت کے سامنے پا سکتے ہیں، اپنے آپ کو اس کے آگے، اور اس کو اپنے آگے پا کر اس کے اس کھلے ہوئے مشاہدے سے لذت گیر ہو سکتے ہیں، مگر انھوں نے عقل سے کام لینا چھوڑ دیا، اور جیسے زید کو اپنے سامنے کھڑا پاتے ہوئے بدعقلی کے ساتھ یہ کہا جائے کہ ہمارے سامنے زید نہیں، بلکہ صرف خط و خال رنگ و روغن، شکل و صورت جیسی چیزیں ہیں، جن میں کوئی زید نہیں ہے - اسی قسم کی بےعقلیوں میں مبتلا کر جس کے سامنے وہ کھڑا ہوا تھا اس کے مشاہدے سے انھوں نے اپنے آپ کو خود محروم ٹھہرا لیا، بہرحال یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ کے مشاہدے کے لئے " آیات اللہ" یا اللہ کی نشانیاں کام نہ آئیں، کیونکہ انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ خواہ کچھ بھی دکھایا جائے ہم نہ مانیں گے ،

بس اللہ کے مشاہدے کے لئے " آیات اللہ" کی نمائش و ظہور جب ان کے لئے بیکار ہو کر رہ جاتی ہے، تب اسی کے بعد " نذر" کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، نذر نذیر کی جمع ہے، جس چیز سے دھمکی کا کام لیا جائے اسی کو " نذیر" کہتے ہیں، اسی لئے " نذر" کا ترجمہ میں نے " دھمکیاں" کیا ہے،

بہرحال نذر یا دھمکیوں سے غرض یہی ہوتی ہے کہ عقل کے صحیح استعمال کا خوابیدہ سلیقہ لوگوں میں ... بیدار ہو جائے، یہ " نذر" یا دھمکیاں کیا ہیں ؟ آج جن حوادث و واقعات کی بدولت کسی خاص ملک اور علاقے ہی کے باشندوں کے لئے نہیں، بلکہ تقریباً کرہ زمین کی اکثر آبادیوں کے لئے خواب و خور، ڈراؤنے خواب اور تلخ ترین لقموں کی شکل اختیار کر چکے ہیں، یہی وہ دھمکیاں اور نذر ہیں، جن سے آدم کی اولاد کو قدرت چونکانا چاہتی ہے، دکھ اور عذاب ہونے کی کیفیت اگرچہ ان میں بھی پائی جاتی ہے لیکن " آخری فیصلہ" ان دھمکیوں اور نذر کی روح نہیں ہوتی، یہ اوپر سے بھی آتی ہیں، اور نیچے سے بھی، اور قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے کہ انہی کی ایک شکل یہ بھی ہے - کہ

یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض ( الانعام ) یعنی ٹکڑوں ٹکڑوں میں قدرت تمہیں بانٹ دے اور بعض کی چوٹ بعض کو چکھائے ،

اوپر اور نیچے کے ساتھ خود بنی آدم کے اندر سے ان نکلنے والے شعلوں کا ذکر جس وقت نزول قرآن کے سلسلے میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے آگے آیا، تو بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے عذاب اور دکھ کی اس تیسری کیفیت کو جو الیس یا اھون یعنی نسبتاً آسان اور سہل قرار دیا، جس کا مطلب یہی ہوا کہ نذر اور دہمکیوں کی موجودہ عمومی شکل جس میں ہم سب مبتلا ہیں، شاید اس میں بھی کچھ رحم کا کوئی پہلو پوشیدہ ہے، پچھلی نسلوں کی قدرتی کمزوریوں کی رعایت کی گئی ہے چاہیئے تو یہی تھا کہ ان نذر اور دہمکیوں کا جو قدرتی منشار ہے اسے سمجھا جاتا تھا، اور بدعقلیوں کا ہودوہ انسانیت پر پڑا ہوا ہے، ان سے نجات پانے کی تدبیروں کی طرف توجہ کی جاتی، عقل کے استعمال کا صحیح سلیقہ لوگوں میں جاگ اٹھتا۔ مگر کیا کیجئے کہ وہ تو ذہنی جال بازیوں یا قرآنی زبان میں "مکر فی آیات اللہ" سے کام لے رہے ہیں، ٹکڑیوں میں جو بانٹے گئے ہیں اور ایک کی چوٹ اس تقسیم سے دوسرے کو جو چکھائی جارہی ہے، تو ان میں بعض بڑبڑا اٹھتے ہیں کہ یہ ساری مصیبت دنیا میں "مذہب" کی لائی ہوئی ہے، حالانکہ یہ بڑ "جن سے سیکھنے والوں نے سیکھی ہے"، دیکھ چکے، دیکھ رہے ہیں، کہ ایک ہی مذہب ایک ہی دین کی طرف منسوب ہونے کے باوجود مصیبت کا کون سا پہاڑ تھا، جسے خود اپنے ہی ہم مذہبوں پر انہوں نے نہیں توڑا، سنہ ۱۹۱۴ء سے ایک کو دوسرے کی چوٹ مسلسل لگ رہی ہے، مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ اندھے بنے ہوئے ہیں، خود بھی اندھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کی آنکھوں پر وہی پٹیاں چڑھ جائیں جو ان کی آنکھوں پر چڑھائی گئی ہیں، ان میں بعض نشیب فراز کے حصوں میں ان آسمانی دھمکیوں کا راز زمین پر تاش کرتے ہیں طنبورہ کچھ گارہا ہے اور طنبورہ بجانے والے دوسرا گانا گارہے ہیں۔

بہرحال "الآیات" کے بعد "نذر" کا سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہتا ہے لیکن جب دیکھ لیا جاتا ہے کہ نذر کی یہ دھمکیاں بھی بیکار ثابت ہوتی چلی جارہی ہیں، تب قدرت اپنی دنیا کو بدعقلی کی پیدا کی ہوئی عفونتوں اور گندگیوں سے پاک کرنے کا آخری فیصلہ کرتی ہے، یہ فرماکر کہ جو ماننا نہیں چاہتے ان کے لئے آیات (نشانیاں) اور نذر (دھمکیاں) جب بیکار ثابت ہوتی ہیں، قرآن میں جو ارشاد ہوا ہے۔ کہ

فھل ینتظرون الامثل ایام الذین خلوا من قبلھم قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔
(یونس)

پھر کیا وہ راہ دیکھ رہے ہیں ان لوگوں کے دنوں کی جو ان سے پہلے گذرے بول! کہ تم بھی راہ دیکھو میں بھی راہ دیکھنے والوں میں شریک ہو جاتا ہوں،

حاصل جس کا یہی ہے کہ آخری فیصلہ کی اس منزل پر پہونچنے والی قوموں کا جو انجام پہلے ہوا کہ وہ نہ خود رہیں اور نہ ان کی تاریخ، اسی انجام کے لئے تم بھی تیار ہو جاؤ،

"کلی تطہیر" یعنی "قطعی صفائی" کے اس آخری جلالی فیصلہ کے ساتھ اسی کے بعد ایک "گوشہ" ان لوگوں کے لئے بھی کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، جو قدرت کے اس مہیب فیصلے کی زد سے بچ کر نکلنا چاہتے ہیں،

ثم ننجی رسلنا والذین اٰمنوا، کذلک حقا علینا ننج المومنین

پھر ہم نکال لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، واقعہ کی حقیقی شکل یہی ہے، ہم پر لازم اور ضروری ہے کہ ایمان والوں کو نکال لیں۔

کچھ نہیں تھوڑی سی عقل سے کام لے کر ایمان کا اجازت نامہ آج بھی اگر حاصل کر لیا جائے تو یقین مانئے کہ چاہے ساری دنیا ہی کیوں نہ ڈوب جائے لیکن جیسے نوح کی کشتی کے معدودے چند نفوس کو قدرت نے بچا لیا تھا، ایمان لانے والوں کو قدرت بہرحال بچالے گی۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ ؛

ماہرالقادری

# اقبال کے قصیدہ گو

اقبال کے کلام میں فکر و نظر، تجربہ و مشاہدہ اور اظہار و بیان کی تدریجی ترقی پائی جاتی ہے۔ "بانگِ درا" کا اقبال، "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں بلند تر نظر آتا ہے، یہاں تک کہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ وہ پکارتا ہے بلکہ پیام دیتا ہے ؎ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ ــــــ یہ اس کے طلب و جستجو کی آخری منزل اور فکر کی منتہا ہے، شکر و حیرت کی منزلیں گردِ کارواں بن کر اڑ گئیں، اب تو یقین ہے اور اس کی جلوہ آرائیاں! اسی سوزِ یقین نے اقبال کے کلام کو سدرہ و طوبیٰ کی بلندیاں عطا کیں اور ایک "برہمن زادے" کو "رمز آشنائے روم و تبریز" بنا دیا۔

یہ دنیا ہر بڑے آدمی کے ساتھ ظلم کرتی ہے، چنانچہ اقبال بھی اہلِ دنیا کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ رہ سکا ــــــ اقبال کے ساتھ اور ظلم! اس جملہ کو پڑھ کر شاید لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ اقبال کی زندگی میں اسے غالباً جسمانی تکلیف دی گئی ہوگی، اس کے خلاف جھوٹے مقدمے عدالتوں میں دائر کئے گئے ہوں گے، اس کے پڑوسیوں نے اسے ستایا ہوگا یا اقبال کی روزی کی وسعتیں حاسدوں اور سازشیوں نے تنگ کر دی ہوں گی ــــــ نہیں یہ کچھ نہیں ہوا، مگر پھر بھی اقبال مظلوم ہے!

کسی آدمی کے قول، ارشاد، پیام اور مفہوم کو مسخ کر کے پیش کرنا، بہت بڑا ظلم ہے؟ چنانچہ اقبال کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا اور آرہا ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کو اس مفہوم میں پیش نہیں کرتے جس مفہوم کا وہ حامل ہے، لوگوں نے اپنے معتقدات اور نظریوں کے کچھ سانچے بنا لئے ہیں، اور انہی خود ساختہ سانچوں میں اقبال کے کلام کو توڑ مروڑ کر ڈھال رہے ہیں، کوشش یہ ہے کہ ان کے سانچے ثابت اور صحیح سلامت رہیں، چاہے اقبال کا مفہوم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، ان کی غرض اقبال کے کلام کے محاسن پیش کرنا نہیں بلکہ خود اپنے نظریوں کی تبلیغ مقصود ہے ــــــ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے زیادتی نہ کہیں تو آخر اور کیا کہیں؟

وطن پرستوں اور قومیت کے شیدائیوں نے اقبال کی اس نظم کو:-

؎ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

پیش کر کے دعویٰ کیا کہ اقبال "وطن پرست" تھا، اور اس کے تمام کلام کو چھوڑ کر، انہی چند شعروں پر اقبال کے "وطن پرستانہ نظریہ" کی ایک عمارت کھڑی کر دی ــــــ اسی طرح کمیونسٹوں نے دیکھا کہ اقبال کے کلام کو غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے تو وہ کہنے لگے کہ اقبال کے یہاں اشتراکی رجحانات پائے جاتے ہیں ــــــ اس شعر کا:-

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ــــ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس شد و مد کے ساتھ ڈھنڈورا پیٹا کہ بعض کم فہم اور گراں گوش سمجھنے لگے کہ اقبال گویا اشتراکیت کا پرچار کر رہا ہے یہ اشتراکیت زندہ اعلا بچی، اقبال کی اس تنقید کو بھول گئے جو اشتراکیت کے باوا آدم، ہیگل پر اُس نے کی تھی کہ ؎ ہیگل کا صدف گُہر سے خالی۔

علامہ اقبال کے کلام کو لوگ بازار کا چلتا ہوا سکّہ سمجھ کر، اپنی ضرورت اور غرض کے استعمال کرتے ہیں، دنیا میں شاید ہی کسی شاعر کے کلام کی اتنی مختلف تعبیریں کی گئی ہوں ——— یہاں تک کہ اب بعض نقادوں نے اقبال کے کلام کو اپنے خود ساختہ "دینی معتقدات" کے جواز کے لئے سند کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا ہے؟

## معیارِ حق "اسلام" ہے!

اقبال نے یقیناً اردو شاعری کے زمین و آسمان بدل دئے، اُس کی فکر اچھوتی اور اُس کا اسلوب سب سے جُدا ہے، اقبال پیدا نہ ہوتا تو اُردو شاعری کو یہ عظمت نصیب نہ ہوتی کہ آج ہم دنیا کی ہر زبان کی شاعری کے مقابلہ میں اُردو شاعری کو سرِ افتخار بلند کر کے پیش کر سکتے ہیں۔

اقبال نے ہمیں "نئی فکر" عطا کی اور ساتھ ہی جدید اسلوب بھی!

؎ اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

بڑھ کر، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کا قافلہ دفعتاً ایک نئی شاہراہ پر مڑ گیا، اقبال نے شعر و ادب کے قصر و ایوان میں جو آئینہ بندی کی ہے اُسے دیکھ کر "سحر" کا اور بعض اوقات "معجزے" کا گمان ہوتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اسلوب، طرز، انداز، اظہار اور پیرایۂ بیان کی خوبیاں اور جدتیں بھی اقبال کی شاعری کا طُغرائے امتیاز ہیں، مگر جس چیز نے اقبال کی شاعری کو "جزو لیست از پیغمبری" بنا دیا ہے، وہ اُس کی صحیح اسلامی فکر ہے، "اسلام" ہی کے ارد گرد اُس کے افکار گردش کرتے ہیں، اور یہی مقدس اور فعّال روح اُس کے کلام میں رواں دواں نظر آتی ہے۔

اقبال اس اعتبار سے مجتہد ہے کہ اُس نے شاعرانہ فکر کو اسلامی پیکر عطا کیا اور کتاب و سنت پر اپنے تصورات کی بنیاد رکھی مگر اس "شاعرانہ اجتہاد" کے ساتھ وہ "مقلد" بھی ہے، نکٹشے اور ڈارون کا نہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جن پر قرآن نازل ہوا تھا، جن کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا اور جن کے اسوۂ حسنہ کو معیارِ سعادت قرار دیا تھا۔

لوگ اپنی ناسمجھی اور کم ظرفی کے سبب تحسین و ستائش میں حد سے گزر جاتے ہیں، اس مبالغہ آمیزی نے بہت سی حقیقتوں کو مجروح کر دیا ہے ——— اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اقبال "اسلام" کی جو تعریف کرتا ہے تو اُس کی اس مدح و ستائش کے سبب "اسلام" معزز نہیں ہو گیا، اسلام اپنی ذات سے معزز مکرم اور مقدس واقع ہوا ہے، کوئی اُسے نہ بھی سراہے تو بھی اسلام کی عزت اور تقدیس میں کمی نہیں آسکتی

؎ کارل مارکس نے ہیگل کے "تصور جدلیات" کو مادی شکل عطا کر دی۔

اور کوئی اُس کی بارگاہ میں منقبت آمیز قصیدے پیش کرے، تو ایسا کرنے سے اسلام کے وقار میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔

"اسلام" کی تعریف کر کے خود اقبال کے کلام کو عزت حاصل ہو گئی، اور اسلام کے طفیل میں اس کی شخصیت اور افکار کو سعادت اور سربلندی مل گئی ——— لہٰذا وہ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں جو اقبال کے افکار کی روشنی میں دین قرآن اور اسلام کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں حالانکہ ہمیں قرآن اور اسلام کی روشنی میں اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ہر شاعر سے بعض اوقات حقیقت کے اظہار میں بھول چوک بھی ہو جاتی ہے، اقبال بھی انسان تھا اور خطا و نسیان سے منزہ نہ تھا، اُس کے یہاں شوخیٔ افکار بھی پائی جاتی ہے جو کہیں شدید بھی ہو گئی ہے، مگر کتاب و سنت اور دین میں انتہائی سادگی اور کمال درجہ کے وقار اور سنجیدگی کا وجود ملتا ہے، بس پڑھنے والے کی نگاہ و فکر اسلام سے اس قدر آشنا ہونی چاہیئے کہ وہ شاعر کی شوخیٔ فکر اور دین کی سادگی میں امتیاز کر سکے۔

سوچنے اور اظہار کرنے کا یہ طریقہ غلط ہے کہ اقبال نے چونکہ یہ کہا ہے، اس لئے دین اسلام کا حکم اور کتاب و سنت کا بھی مفہوم یہی ہونا چاہیئے، ہم ابوحنیفہ، جنید بغدادی اور شیخ عبدالقادر جیلانی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے اقوال کو بھی کتاب و سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھتے ہیں، کسی انسان کی "فکر و رائے" کو جوازِ اصابت اور سندِ صحت عطا کرنے کے لئے اسلام کے احکام میں کتر بیونت نہیں کی جا سکتی، جو شخص اس قسم کے خیالات رکھتا ہے وہ شخصیتوں سے عقیدت ہی نہیں رکھتا، بلکہ انہیں پوجتا ہے ——— اقبال خود اس طرزِ فکر کا انتہائی مخالف تھا!

شعر و افسانہ میں کچھ "زیب داستاں" کے لئے بھی بڑھانا پڑتا ہے، شعر میں شوخی اور رنگینی نہ ہو تو تاثیر کہاں سے آئے ——— اس لئے مولانا روم کی مثنوی بھی تمام کی تمام "دین" نہیں ہے اگرچہ اس میں دین و تصوف کے حقائق کی ترجمانی کی گئی ہے، اسی طرح علامہ اقبال کا سب کا سب "کلام" "دین" نہیں کہا جا سکتا!

**فتنہ!** اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اس زمانہ میں اقبال کے کچھ ایسے "قصیدہ گو" پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے اپنے ذاتی افکار اور خود ساختہ معتقدات کی نشر و تبلیغ اور انھیں سندِ جواز عطا کرنے کی غرض سے اقبال کو شاعری نہیں "دین کے پیغمبر" کا مقام عطا کر دیا ہے۔

اقبال کے یہ "قصیدہ گو" اقبال کے مفہوم کو مسخ کر کے پیش کر رہے ہیں، اُن کی اب یہ روش ہو گئی ہے کہ اپنے "مزعومہ دین" اور "مفروضہ اسلام" کی خطیبانہ انداز میں شرح کی اور اُس کے بعد اقبال کا ایک شعر درج کر دیا، گویا اقبال کا یہی عقیدہ تھا، جو یہ لوگ ظاہر کر رہے ہیں ——— اگر یہ صحیح ہے کہ مرنے کے بعد بھی روح کا اس عالمِ کون و فساد کے حالات سے تعلق رہتا ہے تو اقبال کی روح کو برزخ میں کتنی اذیت ہوتی ہو گی کہ اس کے کلام کے ساتھ کتنا دردناک ظلم کیا جا رہا ہے۔

اقبال کہتا ہے، اور کہتا کیا ہے یہ اُس کا عقیدہ اور ایمان تھا:-

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

رسول اللہ کی ذات کو اقبال "دین ہمہ اوست" سمجھتا ہے، مگر اقبال ہی کے مقلد، نام نہاد شاگرد اور نادان قصیدہ گو ایسے بھی ہیں جو اس مشن کی تبلیغ کر رہے ہیں کہ رسول اللہ کی ذات کو لوگ "دین" سمجھنا چھوڑ دیں، حضور کی سنت کی اطاعت کا تصور ذہنوں سے نکل جائے اور آپ کی "حدیثوں" کی "تاریخ" سے زیادہ وقعت نہ رہے، اور حیرت تو یہ ہے کہ قرآن کی حمایت کے نام پر یہ "بوالعجبی" ہو رہی ہے۔

اقبال کا یہ عالم کہ رسول اللہ کا مقدس نام سن کر آنکھوں کی گریہ سامانی پر قابو نہیں رکھ سکتا، قرآن کے بعد سب سے زیادہ شغف اسے رسول کی "احادیث" ہی سے تھا، اپنی شاعری میں جگہ جگہ رسول کی حدیثوں کو وہ پیش کرتا ہے ——— اور اس کے "قصیدہ خوانوں" کی یہ روش کہ رسول اللہ کی احادیث کے خلاف باقاعدہ محاذ قایم کر رکھا ہے ——— اور اقبال کے اشعار اپنی تحریر میں پیش کرکے وہ ایسی فضا قایم کر دینا چاہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اقبال کا بھی یہی عقیدہ اور یہی خیال تھا۔

علامہ اقبال کی "عقیدت" کے نام پر یہ بڑی ہی نازک اور پرپیچ چال چلی جا رہی ہے، اس کی خطرناکی سے لوگوں کو باخبر کرنا چاہیئے، یہ زہر قاتل کی شیشی ہے جس پر "شہد خالص" کا لیبل لگا دیا ہے، ہر کوئی تو اہل نظر نہیں ہوتا بہت سے بے چارے لیبل کو پڑھ کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ شیشی میں وہی ہو گا اور ہونا چاہیئے، جو کچھ لیبل پر لکھا ہوا ہے۔

یہ گمراہ قصیدہ گو جو اپنی "خدائی" قایم کرنے کے لئے اقبال کو "پیمبر" بنا دینا چاہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں کہ ان کو ہاتھ لگایا اور دین میں رخنہ پڑا (معاذ اللہ) کوئی دوسرا رسول اللہ کی احادیث کو حجت بناتا ہے تو اس پر تقلید؟ پارستی اور قرآن سے دور ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم سنی سنائی باتوں کو دین میں اہمیت کیوں دیتے ہو ——— مگر اقبال کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے، ان کو اس بات کا خیال نہیں رہتا، کہ ہم نے ابھی ابھی حدیث نبوی پیش کرنے والوں پر "تقلید" کا الزام لگایا تھا، اور ہم خود اسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں ——— تو اس طرح "احادیث رسول" پر "اشعار اقبال" کو ترجیح دی جاتی ہے! جو شخص رسول اللہ کی احادیث ہی کو نہیں مانتا، اُس کے دل میں اقبال کے اشعار کا کیا احترام ہو سکتا ہے، یہ سب کھیل اس لئے کھیلا جا رہا ہے، کہ اقبال کے اشعار کا حوالہ دینے سے خود ان کے قول کو وقعت حاصل ہو جاتی ہے۔

## غلط تعبیریں

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "دنیا کے لوگ سدا سے خود غرض اور سفلہ پرور رہے ہیں ———" تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دنیا کے ان لوگوں میں انبیاء کرام اور صلحاء امت بھی شامل ہیں؛ ایک دہریہ اور بے دین تو اس قسم کی طنز کر سکتا ہے، مگر ایک مسلمان سے اس کا تصور بھی ممکن نہیں! پس اقبال جب یہ کہتا ہے:-

احکام ترے حق ہیں مگر تیرے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اقبال تمام مفسرین پر طنز کر رہا ہے اور اس میں عبد اللہ ابن عباس

اور ابن کثیر بھی شامل ہیں! کوئی ایسا خیال کرتا ہے تو اقبال پر وہ بدبخت اور کم نظر تہمت جوڑتا ہے، اقبال کا یہ شعر اُن مفسرین سے متعلق ہے جو اپنی "رائے" سے تفسیر کرتے ہیں اور اس طرح اللہ کی کتاب کچھ سے کچھ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اقبال کا یہ شعر اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جو احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ سے بے نیاز ہو کر، اپنے زعم میں قرآن کے معارف بیان کرتے اور صدیوں کے پڑے ہوئے حجابات اٹھاتے چلے جاتے ہیں، اللہ کی کتاب کو اُنھوں نے کھیل سمجھ رکھا ہے، جو خیال ذہن میں آیا، بس اُسے کاغذ پر منتقل کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ چند دن میں ایک ضخیم کتاب تیار ہو گئی اور پورے اہتمام کے ساتھ چھپ چھپا کر بازار میں آ گئی۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی تفسیر قرآن پر سچ مچ "ژند باژند" کا گمان ہوتا ہے، یہ قرآن کی تفسیر کرتے ہی اس لئے ہیں کہ پچھلے مفسرین نے جو کچھ کہا ہے اُس کو غلط ٹھہرایا جائے گا، اور فکر و خیال کی نئی راہ نکالی جائے گی، ان لوگوں کو اپنی عقل و فہم کا بڑا زعم ہے کہ قرآن کو جیسا ہم نے سمجھا ہے، اُس طرح نہ صحابہ نے سمجھا اور نہ تابعین نے! یہاں تک کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں رسول اللہ کی احادیث کو بھی ناقابل اعتنا خیال کرتے ہیں۔

ہم تک باوثوق ذرائع سے اطلاعیں پہونچی ہیں کہ کراچی کے بعض جلسوں میں کہا گیا کہ اقبال نے قدامت پرستی، تقلید اور آباپرستی کے خلاف جہاد کیا دین میں فکر و نظر کے نئے دروازے کھولے اور اجتہاد کے رُکے ہوئے قافلہ کو پھر سے گرم سفر بنایا ــــــ یہ تنقید درست بھی ہو سکتی ہے اگر "قدامت"، "تقلید" اور "آباپرستی" سے اللہ کی راہ سے بھٹکے ہوؤں کی تقلید مُراد ہو اور آباپرستی کا یہ مفہوم ہو کہ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں آباؤ اجداد کی روش کو مقدم اور مُرجح سمجھا جائے۔

مگر اقبال کے یہ منقبت خواں اور قصیدہ گو اقبال کی مدح و ستائش کے پردے میں اپنے افکار کا زہر لوگوں کے دلوں میں اُتار دینا چاہتے ہیں اُن کے اس "قدامت" "تقلید" اور آباپرستی کے تصوّر میں تمام گزشتہ فقہا، محدثین، مفسرین، تابعین اور صحابہ کرام تک شامل ہوتے ہیں، اور اس سے ان تمام نفوس قدسیہ کی تکذیب و استہزا اور اپنی بڑائی مقصود ہوتی ہے کہ پچھلے فقیہوں مفسروں اور اہل خبر کی تقلید چھوڑ دو، لکیر کے فقیر نہ بنو، وہ پُرانی باتیں آج کی دنیا میں نہیں چل سکتیں، ہماری طرف آؤ کہ ہم نے اجتہاد و فکر کے دروازے کیا پھاٹک کھول رکھے ہیں، ہماری بات سُنو کہ ہم زمانہ کے تقاضوں کے مطابق دین و قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔ یہ عبداللہ ابن عباس، ابوقتادہ اور ابن کثیر کا نہیں جمشید و پرویز کا دور ہے!

حالانکہ اقبال تقلید کا مخالف نہیں ہے، اور کوئی صاحبِ عقل اور اہل ایمان تقلید کا مخالف ہو بھی کس طرح سکتا ہے، جو نیک لوگ حق کی راہ میں گامزن ہوئے ہیں، اُن کے نقشِ پا آنے والوں کے لئے یقیناً چراغِ راہ ہوتے ہیں، اقبال تو مسلمانوں کی اس "جدت پرستی" اور "غفلت" پر ماتم کرتا ہے کہ اُنہوں نے رسم اذاں کو تو باقی رکھا مگر رُوحِ بلالیؓ کو کھو دیا اور فلسفہ میں تلقینِ غزالیؒ سے استفادہ

۵ فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
رہ گئی، رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

اقبال اپنے شعر میں "صنفِ نازک" کو مخاطب کرکے کہتا ہے:-

بتولے باش وپنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

تو کیا اس میں حضرتِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تقلید کا رجحان نہیں پایا جاتا ــــ اور "رجحان" ہی نہیں، بلکہ "پیام"، "دعوت" شدت کے ساتھ اصرار کہ ایسا ہونا اور کرنا چاہیئے!

اقبال اپنے شعروں میں صدیق، فاروق، علی، خالد (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے نام اور کارنامے بیان کرتا ہے، رومی و تبریزی کا ذکر کرتا ہے، تو اس سے اُس کی آخر مراد کیا ہے! یہی کہ ان نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں میں بصیرتیں اور سعادتیں ہیں، اہلِ ایمان کے لئے! یہاں بھی تقلید ہی کا تصور کارفرما ہے!

اقبال کے یہ قصیدہ گو اور منقبت خواں اچھی طرح سُن رکھیں کہ وہ اقبال کے نام پر دُنیا کو زیادہ دن تک دھوکا نہیں دے سکتے، ان کے چہروں کی ایک ایک نقاب نوچ کر دُنیا کو دکھا دیا جائے گا۔ کہ "اصل چہرے یہ ہیں"

نازش پرتاب گڈھی

# فاروقِ اعظمؓ

نہ وہ غنچوں کی رنگت ہے نہ شاخِ گل کے وہ سائے
گلستانِ جہاں میں آج صدہا خار اُگ آئے

سبھی نظریں ہیں کجلائی سبھی چہرے ہیں سنولائے
اسی کا نام ہے جینا تو ہم جینے سے باز آئے

کہیں باقی نہیں عدل و مساوات آج دنیا میں
کوئی ایسا نہیں جو قسمتِ جمہور چمکائے

ستاروں کی تنک تابی کو حد سمجھا ہے دنیا نے
رُخِ خورشید سے ظلمت کی چادر کون سرکائے

جھلس کر راکھ ہوتا جا رہا ہے عالمِ امکاں
ضرورت ہے کہ اب رحمت کا بادل پھر سے گھر آئے

زمانہ منتظر ہے آج اُس مردِ مسلماں کا
جو ظلم و جور کے مارے ہوؤں پر لطف فرمائے

یہ دنیا ڈھونڈھتی ہے آج ایسا پاسباں اپنا
جو دے اس وقت پہرا اُٹھ کے جب یہ ہر سو جائے

اک ایسا شاہ جو گردانے مجرم خود اپنے کو
قلمرو میں کسی جانب جو کوئی اونٹ کھو جائے

اک ایسے عادل و منصف کی حاجت ہے زمانے کو
پسر کی پشت پر خود اپنے ہاتھوں دُرّے برسائے

قدم انصاف کی مسند پہ جب رکھے تو یوں رکھے
کہ بدلہ مصر کے عامل سے اک نادار پا جائے

مساواتِ بشر کا جس کے دل میں ہو خیال اتنا
قصاص اک مفلس و نادار کو شاہوں سے دلوائے

دیانت دار ایسا ہو، امینِ قوم ایسا ہو
کہ بیت المال کی دمڑی نہ استعمال میں لائے

علالت میں ذرا سے شہد کی جب آپڑے حاجت
تو لوگوں کو اکٹھا کر کے استفسار فرمائے

امیر ایسا کہ روم و شام دیتے ہوں خراج اس کو
خود اُس کے تن پہ لیکن خلق بوسیدہ عبا پائے

شدید اتنا کہ حق کے واسطے لڑ جائے اپنوں سے
اور ایسا رحمدل جو اپنے قاتل پر ترس کھائے

ہو ایسی سادگی کہ اپنے کپڑے خود ہی دھوتا ہو
اور ایسا رعب ہو سارا جہاں ہیبت سے تھرائے

عروجِ آدمیت کی اُس اک منزل کا رہرو جو
بٹھا کر اونٹ پر نوکر کو چلنے سے نہ شرمائے

اگر ہو بھوک سے بیتاب کوئی شہر سے باہر
تو اپنے دوش پر غلہ اُٹھا کر خود ہی پہنچائے

پئے تسکینِ شوہر خیمے سے باہر ہو خود آتا
اور اندر شاہ بانو بیوی کی خدمت بجا لائے

سفر میں ساتھ ہو سامانِ آسائش نہ کوئی بھی
ببولوں پر پھٹی چادر کو تانے اور سو جائے

ہو اتنا بے تکلف لیٹ جائے صحنِ مسجد میں
مگر کسریٰ کا قاصد اُس کو دیکھے تو لرز جائے

کوئی دیکھے جو اُس کا گھر تو ساماں ہو نہ کھانے کا
اُٹھے کشور کشائی کو تو نصرت سر کے بل آئے

سبق آزادیٔ انساں کا یوں دے اِس زمانے کو
کہ اک نادار ٹوکے اور نہ ماتھے پر شکن آئے

جہاں کو مل سکے ایسا ہی کوئی راہبر نازشؔ
کوئی اے کاش پھر فاروقیت کی شان دکھلائے

شفیق صدیقی جون پوری

# سوزِ ناتمام

کس نے کہا ہمارے گل و یاسمن نہیں
کہہ دو کہ ہم نہیں تو بہارِ چمن نہیں

نغموں کا شوق بھی ہے ترانوں کا ذوق بھی
اور امتیازِ بلبل و زاغ و زغن نہیں

پیغام زندگی ہے مجاہد کی آن بان
سوز خم کھا چکا ہے جبیں پر شکن نہیں

آئی تھی میرے ساتھ مساوات کی شعاع
یہ آفتابِ وقت کی پہلی کرن نہیں

منقارِ طائرانِ چمن تیز ہو تو کیا
اے ہمصفیر! کوئی حریفِ چمن نہیں

اتنا بھی نظمِ نو میں اضافہ نہ کیجئے
تہذیب چیخ اُٹھے یہ ہمارا چلن نہیں

جلوؤں کو دیکھ دل کی بصیرت کے ساتھ ساتھ
یہ ذوقِ انتخاب نگاہوں کا فن نہیں

دامن بچائے پھرتی ہے پھولوں سے بادِ صبح
پروردۂ چمن ہے مگر حسنِ ظن نہیں

کہتے نہ تھے کہ رُخ سے نہ سرکائیے نقاب
اب وہ نگاہِ شوق کا دیوانہ پن نہیں

مشرق میں اے شفیق یہ مغرب کے زمزمے
محفل ہے اپنی اور کوئی ہم سخن نہیں

شوکت کھنڈوی

# "اَے خُدا!"

رات کی تاریکیوں میں اک ستارہ بھی نہیں
تند طوفانوں میں تنکے کا سہارا بھی نہیں

فصلِ گل میں بھی کلی دل کی ہے مرجھائی ہوئی
ہر سحر بجھتی ہوئی ہر شام کجلائی ہوئی

اپنی نظریں جانبِ غارت گری پھیرے ہوئے
آشیاں کو اب بھی برق و باد ہیں گھیرے ہوئے

سر پہ صبحوں کے ابھی تک ظلمتوں کے تاج ہیں
زندگی کے ولولے پامال ہیں تاراج ہیں

بجھ گئے ہیں ماہ و انجم راہ ہے تاریک و تار
ہر قدم پر کشمکش، خطرہ، قیامت، انتشار

اُٹھ رہا ہے برق کے تودوں سے بل کھاتا دھواں
خود گلوں کی آگ ہی میں جل رہے ہیں آشیاں

جاہ و نخوت کے دیئے روشن ہیں اک اک بام پر
آدمیت کھا رہی ہے ٹھوکریں ہر گام پر

دام ہمرنگ زمینِ دل بچھائے ہر طرف
اب بھی کتنے ظلِّ سبحانی کھڑے ہیں صف بہ صف

دورِ جمہوری میں بھی کتنے ستم ایجاد ہیں
آج بھی نمرود ہیں قارون ہیں شدّاد ہیں

لیکے مژدہ قربِ منزل کا سخن اندر سخن
رہنما کے بھیس میں پھرتے ہیں کتنے راہزن

بجلیاں بیتاب ہیں شعلے اُگلنے کے لئے
زلزلے بے چین ہیں کروٹ بدلنے کے لئے

رل رہی ہے عظمتِ کردارِ انساں خاک میں
آدمی بیٹھا ہوا ہے آدمی کی تاک میں

مضطرب ہر آنکھ ہے بیتاب ہے ہر دل ابھی
کس سے پوچھیں اور کتنی دُور ہے منزل ابھی

دھار پر تلوار کی کب تک چلائے جائیں گے
تیرے بندے اور کب تک آزمائے جائیں گے

بسمل سعیدی (ٹونک)

# کہاں کہاں

ہیں کشتگانِ دل کے ٹھکانے کہاں کہاں
بکھرے پڑے ہوئے ہیں فسانے کہاں کہاں

تیرِ نگاہِ ناز کی اللہ ری زد میں
تاکے ہیں ناوکوں نے نشانے کہاں کہاں

خوابیدہ دشت و در کی ہے بیدار خامشی
گونجے ہوئے ہیں تیرے ترانے کہاں کہاں

مل بھی گیا ہو اُن کو پتا تیرا کیا خبر
پہنچے ہیں اپنی دُھن میں دوانے کہاں کہاں

اِس آسمان نے چھین کے ہم سے زمین میں
جانے چھپا دیے ہیں خزانے کہاں کہاں

ہوں گے کبھی ختم ترے مقامات نامراد
ہم کو لئے پھرے گا زمانے! کہاں کہاں

دام آئیں یا نہ آئیں نظر تو یہ دیکھ لے
بکھرے پڑے ہیں باغ میں دانے کہاں کہاں

بسمل ہزاروں زندۂ جاوید جستجو
پہونچے ہیں اِس اَجل کے بہانے کہاں کہاں

مختار مالیگانوی

# اے دوست

ہو اگر تیری نگاہوں کا اشارا اے دوست
ذرۂ خاک ہو گردوں کا ستارا اے دوست

زندگی ہی میں نہ تھا مجھ کو سہارا تیرا
مرتے مرتے بھی تجھے میں نے پکارا اے دوست

اک تری یاد کہ ہر درد میں کام آتی ہے
کون دیتا ہے یہاں ورنہ سہارا اے دوست

غنچہ غنچہ ہے مرے خونِ جگر کا شاہد
کس نے اس گلشن ویراں کو سنوارا اے دوست

اس کی راہوں میں خوشی کی تو خوشی کیا؟ مختار
اس کا ہر غم ہے مجھے جان سے پیارا اے دوست

بشیر مرزا جاوید

# ......... اور وہ بدل گیا!

نواب زادہ رفعت ہاشمی اور اُن کی نوجوان بیوی ثروت اپنی کوٹھی کے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ میز پر دو آدمیوں کا پُرتکلف کھانا چنا ہوا تھا۔ ثروت سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنی نرم و نازک انگلیوں کے دائرے سے بنانے لگی۔ رفعت نے جیکٹ کو بے دلی سے ایک طرف پھینکا اور ثروت کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹوں تک وہ بڑی گہری نظر سے ثروت کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، پھر کچھ کہنے کے لئے لب ہلائے لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے الفاظ اُس کے ہونٹوں تک آ کر رُک گئے ہیں۔ وہ قدرے جھجک کر بولا:—

"بیگم! آج شام کو آپ کرنل ملک کے ساتھ کلب میں خوب چہک رہی تھیں! ثروت نے اپنی آنکھیں مسٹر رفعت کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اُس کے چہرے میں فتحمندی کی خوشی جھلک رہی تھی۔ اُس نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

"جی ہاں! یقیناً!"

"لیکن اس وقت میری حالت بڑی مضحکہ خیز ہو رہی تھی! رفعت نے پلیٹ میں سے مُرغ کی ران اُٹھاتے

"معاف کیجئے! آپ کسی ڈرامے کا پارٹ تو نہیں یاد کر رہے؟ ثروت نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کیا آپ میرے چال چلن پر تنقید کرنا چاہتے ہیں"

"اوہ بیگم! یہ بات نہیں! بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ کرنل ملک کی نظریں بڑی غیر سنجیدہ اور ہوسناک تھیں اور اگر میرا بس چلتا تو میں کبھی بھی اس حرکت کو برداشت نہ کرتا!"

"معلوم ہوتا ہے آپ کے خیالات میں شاید انقلاب آچکا ہے" ثروت نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ایک سال پہلے آپ نے مجھے چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر گھر سے باہر نکالا۔ پھر کلب کی سرور انگیز فضاؤں میں چند روز بسر کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ آپ مس ہائی لینڈ پر فریفتہ ہیں۔ میں نے آپ کو اشارتاً اس بات کا احساس دلایا اور بتایا کہ اس کے سامنے میری حالت بڑی "مضحکہ خیز" بن جاتی ہے، لیکن اُس وقت آپ کو یاد ہے آپ نے کیا جواب دیا تھا؟ یہی کہ "تم بالکل آزاد ہو۔ جو جی میں آئے کرو! عورت اور مرد کی شادی دراصل ایک معاشرتی بندھن کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہ دونوں اپنے اپنے معاملات میں مختارِ کل ہوتے ہیں"۔ کیا یہ درست نہیں؟ پھر آپ نے مجھے بتایا کہ آپ کی محبوبہ مجھ سے کئی گنا خوبصورت تھی۔ اُس میں مجھ سے زیادہ نسوانیت تھی۔ اور اس کی باتوں میں مجھ سے کہیں زیادہ لوچ اور دلکشی تھی——"

"اور اس کے بعد ہم دونوں نے عملی طور پر علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے، لیکن ہم میں سینکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا۔ لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا رکھنے کے لئے ہم دونوں ایک ساتھ

کلب جاتے رہے، پی پارٹیوں میں شریک ہوتے رہے اور سینما دیکھنے جاتے رہے تاکہ ہماری علیحدگی کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ لیکن چند دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کچھ کچھ حسد کرنے لگے ہیں؟"

"میں حسد بالکل نہیں کر رہا بیگم! لیکن مجھے خطرہ ہے کہ تم جیسی خوبصورت اور حسین عورت کہیں لوگوں کی انگشت نمائی کا نشانہ نہ بن جائے۔"

"آپ کی باتوں پر مجھے ہنسی آتی ہے مسٹر رفعت! بہتر ہوتا کہ آپ مجھے ایسی باتوں کی تلقین نہ کرتے، جن پر آپ خود عمل نہیں کر سکتے۔"

"خدا کے لئے میری باتوں کی ہنسی نہ اڑاؤ بیگم! میں ایک مخلص دوست کی طرح باتیں کر رہا ہوں — خدا جانے آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کیا ہو گیا ہے؟؟ لیجئے سنئے۔ جب آپ نے مس ہائی لینڈ سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کی تھیں کیا میں نے آپ کو منع کیا تھا؟ کیا آپ نے خود ایک غیر عورت سے محبت کر کے مجھے تقلید کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ آپ ایکٹریسوں اور سوسائٹی گرلز کے ساتھ ملتے رہے لیکن میں نے اُف نہ کی۔

اور آج ... ... ... ..."

"لیکن بیگم! ... ... ... ..."

"اور آج آپ کرنل ملک سے چند باتیں کر لینے پر مجھے ٹوک رہے ہیں۔ ابھی تو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر میرا یہ پہلا قدم ہے۔ میں نے تو ابھی تک اپنا کوئی چاہنے والا بھی نہیں ڈھونڈا لیکن خیال ہے کہ جلد از جلد کوئی ایسا شخص ڈھونڈ لوں جس کی باتوں میں آپ سے زیادہ ملائمت ہو، جس کا چہرہ آپ سے زیادہ خوبصورت ہو اور جس کی محبت میں آپ سے زیادہ پختگی ہو۔"

"بیگم! میں تو بھر پایا ایسے مذاق سے۔"

"جی یہ مذاق نہیں! ثروت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "مذاق کا وقت جا چکا، یہ بالکل سنجیدہ اور متین گفتگو ہے۔"

"بیگم آج تو بہت تلخ کلامی سے پیش آ رہی ہو، اس سے پہلے تو کبھی آپ نے ایسی سخت گفتگو نہیں کی۔!"

"جی ہاں یقیناً! لیکن میں نے یہ سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ یہ آپ ہی کا بتایا ہوا سبق ہے جسے میں دہرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ کیسے؟؟ کیا آپ کو وہ دن یاد نہیں جب میں نماز پڑھ رہی تھی اور آپ پلنگ پر بیٹھے میرا مذاق اُڑا رہے تھے۔ جب میں رکوع کرتی تو آپ کہتے "گیٹ آن یور نیز" اور جب کھڑی ہوتی تو آپ کاشن دیتے "اٹنشن" جب میں نماز ختم کر چکی تو آپ نے ریمارک پاس کیا "کیوں ڈارلنگ! پریڈ ختم کر دی؟" یہ باتیں میرے دل پر تیر کی طرح لگیں اور میں کئی گھنٹے تک آپ کے ساتھ جھگڑتی رہی لیکن بالآخر آپ کی ضدی طبیعت کے سامنے مجھے خاموش

Attention ۞ Caution ۞ Get on your knees

ہو جانا پڑا۔ پھر آہستہ آہستہ آپ مجھے اکساتے رہے اور اس طرح کچھ عرصہ کے بعد میں "رونق محفل" بن گئی۔ اس کے بعد سینما ـــ تھیٹر ـــ بال روم ـــ ڈانس ـــ ڈنر ـــ ٹی پارٹیاں اور اسی قسم کی دوسری مصروفیات میری زندگی کا جزو بن کر رہ گئیں۔ یہی نہیں آپ نے مجھے یہ سبق بھی دیا کہ "میاں بیوی اپنی دل لگی کے لئے پرائیویٹ دوست" بھی رکھ سکتے ہیں"۔ میں نے شروع شروع میں تو اس میں جھجک محسوس کی لیکن رفتہ رفتہ بے باک ہوتی گئی اور کرنل ملک سے ربط ضبط پیدا کر لیا۔ لیکن آج مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ اپنے دئے ہوئے سبق کی تردید کیوں کر رہے ہیں حالانکہ میں نے تو اس سبق کی ا۔ ب بھی آج سے شروع کی ہے"۔

"بیگم خدا کے لئے ان باتوں کو چھوڑ بھی دو! آخر کیا رکھا ہے ان باتوں میں؟"

"ان باتوں میں آپ جیسے غیر مستقل مزاج انسانوں کے لئے درس عبرت پوشیدہ ہے جو ایک کام کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔" رفعت نے ثروت کی بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا بلکہ ایک مسکراہٹ سے لبریز نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"بیگم! غصّے کی حالت میں تو آپ کا حُسن اور بھی چمک اٹھتا ہے۔ خدا جانے وہ کس کا شعر ہے ؎

ان کو آتا ہے پیار پر غصّہ ہم کو غصّے پہ پیار آتا ہے"

رفعت اپنی کرسی سے اُٹھا اور ڈائننگ ٹیبل کے گرد چکر لگاتا ہوا ثروت کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں ہاتھ ثروت کے کندھوں پر رکھ کر جھکنا چاہا لیکن ثروت بجلی کی طرح اچھل کر دور جا کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"آپ کو یاد ہونا چاہیئے مسٹر رفعت کہ میرے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔" رفعت نے ثروت کے لفظوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا وہ ملتجی نگاہوں سے ثروت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:۔

"بیگم آج تو آپ معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہیں۔"

"کیا یہ الفاظ آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں؟"

"سنجیدگی سے نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں سے!"

"کیا میں آپ کی مس ہائی لینڈ سے زیادہ خوبصورت ہوں؟"

"اُس سے بہت زیادہ! وہ تو تمہارے آگے کنیز معلوم ہوتی ہے"

"کیا میں یہ دریافت کر سکتی ہوں کہ گزشتہ ۶ ماہ کے عرصے میں آپ نے اُس کے زیورات کپڑوں اور سینما وغیرہ پر کتنا خرچ کیا۔؟"

"بیگم! میں بھلا کھاتے میں تھوڑا ہی لکھتا رہا ہوں"

"اچھا اندازاً ہی سہی۔"

"یہی کوئی چار یا پانچ ہزار"

"بہت خوب! تو لایئے پانچ ہزار روپیہ۔"

"کیا مطلب؟؟"

"مطلب یہ کہ آپ نے مس ہائی لینڈ پر پانچ ہزار روپیہ صرف کیا اور پانچ چھ ماہ تک گلچھرے اُڑاتے

ہے۔ یہی روپیہ اگر مجھے دے دیں تو مجھے پانچ ماہ کے لئے خرید سکتے ہیں۔"
"اُف بیگم یہ کتنی غیر فطری اور مہمل باتیں ہیں۔ بھلا، آج تک کسی نے روپوں کے عوض اپنی بیوی کو خریدا ہے۔"
"مجھے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اپنے رستے پر چلنا زیادہ مناسب سمجھتی ہوں۔ اگر آپ کو میری شرط منظور ہے تو بہتر ورنہ مجھے اجازت دیجئے میرے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر ثروت اک حسین انداز سے بازو سیکڑ کر واپس مڑی اور اپنی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ سامنے مسہری بچھی ہوئی تھی وہ اس پر بیٹھ کر اپنی جرابیں اُتارنے لگی۔

رفعت بھی خراماں خراماں اُس کے کمرے میں پہونچ گیا اور ثروت کی دودھ جیسی سفید پنڈلیوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے اس کے پلنگ کے قریب آ گیا۔

"بیگم آخر یہ ناراضگی کب تک رہے گی؟" وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

" ثروت نے غیظ و غضب سے بھری ہوئی نگاہ رفعت کے چہرے پر ڈالی اور بولی۔

"مسٹر رفعت! اگر آپ اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو مجھے مجبوراً اس کا جواب دینا پڑے گا جس سے آپ کو شاید تکلیف ہوگی، اس لئے بہتر ہے کہ آپ چپکے سے اپنے کمرے میں واپس چلے جائیں۔

"اور اگر میں بارگاہِ حُسن میں مطلوبہ نذرانہ پیش کردوں تو کیا مجھے باریابی کی اجازت عطا فرمائی جائے گی؟" ——— رفعت نے یہ الفاظ ڈرامائی انداز میں کہے۔

"ہاں! اس صورت میں آپ کو اجازت ہے، لیکن یاد رہے کہ پانچ ماہ کے لئے! اچھی طرح سے سن لیجئے صرف پانچ ماہ کے لئے! اس مدت کے گزر جانے کے بعد آپ کا دل چاہا اور آپ کی مرضی ہوئی تو دوسرے پانچ مہینوں کے لئے آپ کو اتنی ہی رقم اور دینا پڑے گی ——"

"تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر بار پانچ ہزار کی رقم دے کر، آپ کو خریدنا پڑے گا"

"یقیناً۔ ... میرے اور آپکے تعلقات اب "ــــــــ" بن کر رہ گئے ہیں"

"لیکن یہ تو سراسر زیادتی ہے"

"اگر زیادتی ہے تو سہی! آپ کو مجبور تو نہیں کیا جا رہا ہے، یہ تو خوشی کا سودا ہے، یہ تو جذبات اور پسندیدگی کی تجارت ہے!

رفعت کا دماغ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، بار بار سوچتا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، اُس کی مردانہ غیرت پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی، وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ ... مگر خیالات کا طوفان جس کی تمام موجیں دل خراش تھیں اُس کے دل و دماغ سے ٹکرانے لگیں! کئی بار وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر رہ گیا

ثروت نے اپنے کپڑے اُتار کر شب خوابی کا لباس پہنا، بالوں کو کھولا اور بستر پر دراز ہو کر ریشمیں چادر اوڑھ لی ——— تھوڑی دیر میں رفعت بھی دبے پاؤں وہاں آن پہونچا سلک کا سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی ——— اُس نے آتے ہی پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں ثروت کے سامنے پھینک دیں اور بولا۔ .. "لو بیگم! آپ کی شرط پوری ہوگئی نا! یا ابھی کچھ کسر باقی ہے؟"

ثروت نے اس کے جواب میں ایک محبت آمیز نگاہ رفعت کے چہرے پر ڈالی، اس کی نظر میں فتح کی خوشی بھی تھی اور محبت کا خلوص بھی! وہ اوپر کی طرف کھسک کر دیوار کے سہارے تکیہ لگا کر بیٹھ گئی، اور شوہر کو آنکھوں کے اشارے سے پلنگ پر بیٹھنے کو کہا۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے، آنکھیں کچھ کچھ بول رہی تھیں"۔۔ ۔۔ ۔۔ رفعت ہی نے بات چیت میں پہل کی۔ "شرط تو پوری ہو چکی، مگر! ابھی کچھ پوچھنا ہے آپ سے! وہ بھی شرط ہی کا ایک جزو ہے۔"

"جی پوچھئے! فرمایئے! ارشاد گرامی! آپ بڑی "وہ" ہیں"

"آپ نے اپنے گزشتہ تجربوں کی بناء پر، عورت کی موجودہ آزادی کے متعلق کیا رائے قایم کی؟"

"یہ تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہیں...." "جی ہاں! میں تو جانتی ہوں لیکن آپکے منہ سے سنا چاہتی ہوں۔"

"ایک آدمی، جب شرمسار ہو جائے، تو اُسے اور زیادہ شرمسار نہیں کیا کرتے"

"یہ جذباتی جواب ہے مسٹر رفعت! میں واضح لفظوں میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں، آپ کا جو بھی خیال ہو صاف صاف کہہ دیجئے۔

"بتاؤں، کہوں! (رفعت سر ہلاتی ہے) فحاشی اور آوارگی کے اس دور میں جبکہ ہر آنکھ ہوسناک اور آوارہ ہے، عورت کی بے نقابی کو کوئی غیرت مند انسان گوارا نہیں کر سکتا، اگر گھروں کی چاردیواری "جیل خانہ" ہے تو خدا کی قسم یہ "جیل خانے" کلب گھروں، پارکوں، بازاروں اور سیر گاہوں کی آزاد فضاؤں سے زیادہ مقدس مفید اور قابل احترام ہیں،

"کیا ان لفظوں میں آپ کا دل بھی شامل ہے؟

"اس میں رتی بھر بناوٹ نہیں ثروت! یہ میرے دل کی آواز ہے اور میرے تمام تجربات کا نچوڑ!"

"مبارک! مسرت کا ہدیہ! صبح کا بھولا، شام کو گھر آگیا".. .. میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ہر قسم کی سوسائٹی میں رہی، لیکن خدا جانتا ہے کہ میرا دامنِ عصمت ذرا سا بھی داغدار نہیں ہوا، کرنل ملک کے ساتھ میری دوستی بالکل بناوٹی تھی! میں آپ کی اس طرح سوئی ہوئی غیرت کو جگانا چاہتی تھی، میں نے ایک ڈرامہ کھیلا تھا، آپ کی اصلاح کے لئے! سو اللہ نے اُس میں مجھے کامیاب کر دیا—— ہر عورت ایسا نہیں کر سکتی، ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے، جھوٹے ڈرامے بھی اصل بن جایا کرتے ہیں!—— یہ پانچ ہزار روپیہ کسی کار خیر میں دیدیجئے، اب میں آپ کی خادمہ ہوں، محبوبہ نہیں.. .. ..!

رفعت کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا، اس کی پلکیں بے اختیار بھیگ گئیں، یہ خوشی کے آنسو تھے، جن میں احساسِ ندامت بھی گھل مل گیا تھا، آج کی برابر وہ زندگی میں کبھی مسرور نہیں ہوا، خوشیاں اُس کے گدگدی کر رہی تھیں اور مسرتیں اُسے چھیڑ رہی تھیں[1] ——!

[1] موپساں کے افسانے "A Crisis" سے ماخوذ!

# روح انتخاب

قرآن حکیم اصل دین، شریعت اور قانون ہے۔ اس امر میں کوئی مسلمان شبہ نہیں کر سکتا لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب معانی اور حکمتوں کا ایک بے پایاں سمندر ہے ایک طرف تو اس کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ عرب کے اَن پڑھ بدو تک اس کو سُن کر اس کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ جاتے تھے اور دوسری طرف اس کی پُرکاری کا یہ حال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواص صحابہ جو اعلیٰ درجہ کی فہم و فراست رکھتے اور اسلام کے زندہ نمونہ کو دن رات اور صبح شام دیکھتے تھے ان کو بھی ایک ایک سُورۃ کے مطالب پر برسوں غور کرنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ اِس سمندر کے احاطہ سے عاجز ہیں۔ سطح سے دیکھو تو ایک نظر میں سب کچھ دیکھ سکتے ہو مگر تفصیل کے ساتھ اُس کی گہرائیوں کو ناپنا چاہو تو جس قدر گہرائی میں جاؤ گے اُس سے آگے اور زیادہ گہرائیاں ملتی چلی جائیں گی۔ یہ اُسی خدائے بزرگ و برتر کا کلام ہے جس کا علم تمام کائنات کے ظاہر و باطن پر حاوی اور تمام حقیقتوں پر مُحیط ہے۔ اِسی بناء پر لوگ اس کے مطالب کو سمجھنے کے لئے ایک ایسے معلِم کے محتاج تھے جس کو خود اللہ تعالےٰ ہی نے اپنے کلام کی ساری گہرائیوں سے واقف کیا ہو۔ اگر ایسا مُعلِم موجود نہ ہوتا تو لوگ اس کتاب کے مطالب و مقاصد متعین کرنے میں نہ معلوم کس قدر بھٹکتے اور یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً کے مصداق اپنے ذہن کی جُولانیاں دکھاتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔ علاوہ بریں لوگ اس بات کے بھی محتاج تھے کہ شریعت کے جو احکام اس کتاب میں اجمال کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان کی تفصیل معلوم کرنے کا کوئی مستند و معتبر ذریعہ اُن کے پاس ہو۔ اور کوئی ایسا ہو جو اُنھیں تفصیلی صُورت میں یہ بتائے کہ یہ کتاب انسان کی زندگی کو کس نقشہ پر مرتب کرنا اور کس ڈھنگ پر چلانا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس علم کا ذریعہ اُس پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا جس کے ذریعہ سے خدا نے اپنی یہ کتاب ہمارے پاس بھیجی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا واسطہ ذاتِ باری سے تعلیم پا کر اعلان فرمایا علمت علم الاولین والاخرین یہ کیا چیز تھی؟ یہ صرف قرآن حکیم کا علم تھا۔ الٰہی اسرار و حکم کی واقفیت تھی نہ کہ کچھ اور کلام الٰہی کی رفعت معنوی و لفظی کا خیال کرو تو کوئی ذات ایسی نہیں ہو سکتی جو منشاء الٰہی کو قطعی طور پر متعین کر سکے بجز اُن نفوس قدسیہ کے جن کو اللہ نے خود ہی اپنے کلام کا پورا علم بخشا ہو۔ یعنی انبیاء علیہم السلام۔ اسی لئے کلام الٰہی کی تعلیم، تشریح اور تبیین کا حق انہی حضرات منعم علیہم کو پہونچتا ہے اور ان کی تشریح مستند و معتبر ہے۔ الرحمٰن علم القرآن الخ وغیرہ آیات سے اسی جانب اشارہ ہے۔

(ترجمان القرآن) شعبان ۱۳۵۸ھ (از مولوی نجم الدین اصلاحی)

# ہماری نظر میں

"دیارِ عرب میں" از:—— مولانا مسعود عالم ندوی۔

**دیارِ عرب میں** ضخامت ۳۹۰ صفحات، مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ، قیمت ساڑھے چار روپے، ملنے کا پتہ مکتبہ چراغِ راہ، ۹ ڈٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ، کراچی۔

علمی اور اسلامی دُنیا کے لئے مولانا مسعود عالم ندوی کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، مولانا مسعود عالم ندوی ۲۸ راپریل ۱۹۴۹ء کو اپنے رفیق محمد عاصم صاحب کی معیت میں پاکستان سے بحری جہاز کے ذریعہ روانہ ہوئے اور ۱۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو واپس تشریف لائے ساڑھے سات مہینوں کی اس مدت میں، انھوں نے عراق کے مختلف مشہور شہروں کے علاوہ کویت اور نجد کے پایۂ تخت ریاض کی بھی سیاحت کی، حج بیت اللہ کی سعادت بھی میسر آئی، اور دیارِ حبیبؐ کا بھی دیدار نصیب ہوا، دیارِ حبیبؐ مدینۃ النبیؐ روضۂ اقدس، جسؐ کے بارے میں حالی پانی پتی نے خلوص و عقیدت کے ساتھ کہا تھا:—

کعبہ سے کشش جس کی ہر اک دل میں سوا ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی کا یہ سفر کوئی تفریحی سفر نہ تھا، اور نہ اس کی غرض "عتبات عالیہ" کی رسمی آستاں بوسی تھی —— موصوف کا یہ سفر اس لئے تھا کہ عرب ممالک کے ذہین افراد، قیام نظامِ اسلامی کی تحریک سے آشنا اور اس دعوت سے متعارف ہو جائیں، "تاریخ کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ جس قوم (عرب) نے دنیا میں نظامِ اسلامی کی داغ بیل ڈالی تھی اور جس کے ہاتھوں اللہ کی حکومت کی تعمیر ہوئی تھی، آج اُس پر نظامِ اسلامی کے قیام کی ضرورت اور اہمیت واضح کی جارہی ہے —— آہ! وہ مسیحا نفس جو خود دوا کے ایک گھونٹ کے لئے دوسروں کا محتاج ہو۔

مسلمان فرمانرواؤں اور کلمہ گو حاکموں کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے مگر یہ جمہوریتیں، حکومتیں اور بادشاہتیں اپنے مزاج اور فکر و عمل کے اعتبار سے "غیر اسلامی" ہیں، اور تو اور خود حجاز مقدس میں ملوکیت کا بلند پرچم اڑ رہا ہے اور جہاں سے صدق و صفا کا چشمہ کبھی اُبلا تھا، وہاں کی زمین آج پیاسی نظر آرہی ہے —— "کعبۃ اللہ" پر اور "سلطان النجد والحجاز و ملحقاتہا" کی بادشاہی اور فرماں روائی

لفو بر تو اے چرخِ گردوں لفو۔

یہ کتاب مولانا مسعود عالم ندوی کے اس مبارک سفر کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہے —— صفحہ ۱۲ پر صاحبِ تصنیف لکھتے ہیں :—

"دنیا میں خوشی اور مسرت کے مختلف نظریے ہیں، ہماری خوشی اسی میں ہے کہ اللہ کے بندے دعوتِ حق کو سمجھیں اور اُس پر لبیک کہیں"
جس شخص نے اس نیک جذبہ اور عزم صالح کے ساتھ رختِ سفر باندھا ہو، اُس کے حالاتِ سفر اور مشاہداتِ راہ ابن بطوطہ کے مشہور سفرنامہ سے یقیناً مختلف ہونے چاہئیں۔

"دیارِ عرب میں"——— اس سفرنامہ کی امتیازی خصوصیت مشاہدات کی صحیح ترجمانی اور حالات کی سچی اور واقعی عکاسی ہے، اندازِ نگارش بناوٹ اور غیر معمولی تکلف سے پاک ہے، سادہ سادہ باتیں بے تکلفی کے ساتھ بیان کردی ہیں، مصنف کا "مرکزی تخیل" ہر سطر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔
مولانا مسعود عالم ندوی نے عرب ممالک کے علماء اور ذہین افراد کو "جماعتِ اسلامی" کا مقصدِ دعوت اور طریق کار سمجھایا، عربی زبان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامی کی جو کتابیں ترجمہ ہوچکی ہیں پڑھنے کے لئے دیں، اللہ کا شکر ہے کہ دعوتِ حق کے لئے ہر جگہ سمع قبول اور گوشِ شنوا میسر آگئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کی تحریک جس کی بنیاد حق اور تقویٰ پر ہے اب کسی کے روکے رُک نہیں سکتی، اس بیج کے لئے دلوں کی زمینیں شاید پہلے ہی سے تیار ہوچکی ہیں۔
اس سفرنامہ کو پڑھ کر، عرب ممالک کی بہت سی مشہور شخصیتوں اور اداروں سے بالواسطہ تعارف ہوجاتا ہے، بصرہ، زبیر، بغداد، موصل، ریاض، مکہ اور مدینہ کے نامور علماء کے نام اور کہیں کہیں مختصر حالات اور اُن کے رجحانات بھی درمیان میں آگئے ہیں ——— مثلاً ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی سے اُردو داں طبقہ اس کتاب کے ذریعہ شاید سب سے پہلے متعارف ہوسکے گا، ڈاکٹر ہلالی صاحب "ادب و لغت اور اُس کے متعلقات میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، حدیث پر بھی گہری نظر ہے، صحاح ستہ کا بیشتر حصہ نوکِ زبان ہے، قرآن مجید کے بے مثال حافظ اور تجوید و علمِ قرآت کے بہترین ماہر ہیں، انگریزی، جرمن، فرنچ اور اسپینی زبانوں سے بھی واقف ہیں...... (صفحہ ۱۱۱)
عراق کے مشہور شاعر و ادیب محمد رضا الشبیبی کا بھی ذکر ہے، جن کو مصنف نے عراق ہی نہیں بلکہ پوری عربی دنیا کا مشہور شاعر اور ادیب لکھا ہے، شبیبی بارہا وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، عراقی پارلیمنٹ... (مجلس النواب) کے رُکن اب بھی ہیں، بہت زیادہ بااخلاق ہیں اور مذہباً شیعہ ہیں۔
اس سفرنامہ میں ایک انشاپرداز قصیمی کا بھی ذکر آتا ہے، جس نے "ھذی ہی الاغلال" نام کی ایک کتاب لکھی، جس میں جگہ جگہ الحاد و زندقہ اور اسلام سے بیزاری کی تعلیم ملتی ہے، اور سب سے بڑی جیرت تو اس پر ہے کہ سلطان ابن سعود کے نام یہ کتاب معنون کی گئی اور شاہ نجد و حجاز کے دربار سے ۴۰ پونڈ ماہانہ وظیفہ بھی جاری ہوگیا ——— علمائے نجد نے جب احتجاج کیا تو کہیں جاکر یہ وظیفہ بند ہوا، اُردو زبان کے ملحد شاعروں اور ادیبوں ہی تک یہ لعنت محدود نہیں ہے، ابلیس کے چیلے چانٹے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔
"دیارِ عرب میں" بعد سیاسی تنقیدیں بھی اشاراتی طور پر آگئی ہیں، جو بعض اہم مسائل کی پردہ

کشائی کرتی ہیں ــــ "عرب لیگ دو گروپ میں بٹ گئی ہے، مصر، سوریا اور مملکتِ سعودیہ ایک ساتھ ہیں، دوسری طرف عراق، اور شرق اردن ہیں، لیکن انگریزوں کو جتنا اعتماد شرق اردن پر ہے اتنا عراق پر نہیں، عراق میں کبھی کبھی بکر صدقی اور رشید عالی بھی پیدا ہو جاتے ہیں، مگر شرق اردن کا عبداللہ انگریزوں کا وفادار وظیفہ خوار ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ــــ جنگ کے دوران میں توقع ہوگئی تھی کہ اب لیبیا (طرابلس الغرب) آزاد ہو جائے گا، انگریزوں نے یہی وعدہ کیا تھا، اسی پر محمد ادریس سنوسی (جو مشہور سنوسی مجاہد احمد شریف السنوسی کے چچا زاد بھائی ہیں) نے ان کی امداد کی، رومل کی شکست میں اُن کی اور اُن کے ماننے والوں کی کوشش کا بھی دخل ہے ــــ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طرابلس الغرب کی تقسیم[1] یاروں نے طے کر لی ہے، سرِدست تو مجلس اقوام متحدہ میں ان کی تجویز کامیاب نہ ہو سکی، لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ برقہ پر امیر محمد بن ادریس سنوسی کو حاکم رکھا جائے گا، فزان، فرانس کے زیر اقتدار رہے گا اور اصل طرابلس پر اٹلی کا ظالمانہ اقتدار پھر عود کر آئے گا ــــ ہوا کا رُخ یہی بتا رہا ہے، امیر سنوسی کی لندن کی زیارت بھی اسی کی تائید میں ہے، افسوس محمد بن ادریس سنوسی نے طرابلس الغرب کی وحدت اور تینوں صوبوں کے متحدہ نظم پر زور نہیں دیا اور اور اپنی لنگڑی حکومت پر راضی ہوگئے ورنہ یہ صورتِ حال نہ ہوتی (صفحہ ۱۲۰، و ۱۲۱)

اس سفر نامہ کے بعض حالات ایک مسلمان کے لئے انتہائی تکلیف دہ بھی ہیں ــــ عراق کے مسلمانوں کا تہذیبِ مغرب سے انتہائی شغف، بداخلاقی کا چلن، لہو و لعب سے دلچسپی، عورتوں کا ذوقِ عریانی، جو طبقہ مذہبی کہلاتا ہے، وہ مشرکانہ رسوم اور طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہے ــــ سلطان ابن سعود اور اُن کے اہلِ خاندان کے شاہانہ مصارف جو اسراف و تبذیر کی حدود سے بھی شاید کچھ آگے پہونچ چکے ہیں ــــ حجاج کے ساتھ معلموں کا نازیبا برتاؤ ــــ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حاجیوں کی آپادھاپی کے افسوسناک مظاہرے! ــــ بے ذوق سجدے، اور بے دلی کی نمازیں، حرم کی محرابیں ابوبکرؓ و علیؓ جیسے نمازیوں کی پیشانیوں کو ڈھونڈتی ہیں ــــ مگر نہ وہ سودا رہا اور نہ وہ سر رہے!

مصر کی مشہور دینی تحریک "اخوان المسلمون" کا "دیارِ عرب میں" بار بار ذکر آیا ہے، اس مقدس تحریک کو ہر جگہ شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ... مگر یہ "خود ساختہ خدائیاں" آخر کب تک! ان طلسموں کو تو ایک نہ ایک دن ٹوٹ جانا ہی پڑے گا ــــ انتہا ہے، مصنف لکھتا ہے:-

بصرہ میں ایک مرتبہ مغرب کے وقت ہمارے ملنے والے بھی بیٹھے رہے، راقم نے دریافت کیا تو بولے "گھر پر پڑھ لیں گے، یہاں نماز پڑھنے میں "اخوان المسلمون" کا شبہ ہوگا" (صفحہ ۱۴۴) یہ بزدلی اور ایمان، کیا ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں!

حج کتنی بڑی سعادت ہے، اُس کے بعد مسلمان کی زندگی بدل جانی چاہیئے" مگر ... یہ دردناک

[1] اور ہمیں اپنا "کشمیر" بیساختہ یاد آرہا ہے "م"

داستان بھی مصنف کی زبان سے سن لیجئے :-

شنبہ ۱۹ صفر ۶۹ھ = ۱۰ دسمبر ۴۹ء

سمندر جھیل کی طرح ساکن ہے، کل سے رفتار کچھ تیز ہو گئی ہے، منگل کی صبح کو کراچی پہونچنے کی توقع ہے، مسافر اپنے گھروں، عزیزوں اور دوستوں کو لاسلکی پیغام بھیج رہے ہیں! حج اپنی معنویت کھو چکا، بس اب تار بازیاں رہ گئی ہیں، دعوتوں اور خوشنما ہاروں کی توقع الگ چٹکیاں لے رہی ہے اس جہاز کے اکثر حجاج اپنے کو عام مسلمانوں سے کچھ بلند اور گناہوں سے پاک و صاف خیال کرتے ہیں کسی سے نام پوچھئے "حاجی" کا دُم چھلا ضرور لگائے گا، حاجی محبوب، حاجی نبی بخش، حاجی جمن سنتے سنتے جی اُکتا گیا۔ حج کی کیا خصوصیت ہے، "نمازی اور صیامی" بھی کہنا شروع کر دیا جائے، حج کیا ادا کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں پر کوئی احسان کیا ہے۔

"ایک طرف یہ فخر و غرور، دوسری طرف ساتھیوں کے مال و اسباب پر بھی ہاتھ ڈالنے والے موجود ہیں، قانون کے خلاف طرح طرح کی چیزیں خرید کر لائے ہیں اور کسٹم والوں سے بچنے کے لئے ہر حیلہ اور جھوٹ کے لئے تیار بیٹھے ہیں، جوں جوں کراچی قریب ہو رہا ہے اس قسم کے "حجاج" گھبرا رہے ہیں، کل ایک صاحب میرے پاس آئے اور بڑی رازداری سے کہا "غلطی سے کچھ سونا لے آیا ہوں، کوئی تدبیر بتاؤ" عاجز نے عرض کیا "کسٹم والوں سے سچ سچ کہہ دو" ظاہر ہے کہ یہ مشورہ قابل قبول نہیں تھا، مایوس واپس ہوئے، ایک دوسرے صاحب فتویٰ لینے کے لئے آئے اُس موقع پر جھوٹ بولنا جائز ہوگا؟ مکہ مکرمہ میں ایک عالم نے جواز کا فتویٰ دیا تھا چونکہ سونا خریدنا اور تجارت کرنا شریعت کی رو سے ناجائز نہیں؟ عاجز نے کہا "جرأت سے صاف صاف کہیئے، اور پھر جو گھاٹا آئے اُسے برداشت کیجئے، جھوٹ بولنا تو کسی حالت میں جائز نہیں ہو سکتا" دن بھر اسی قسم کے سوال و جواب میں گزرا (صفحہ ۳۲۵، صفحہ ۳۲۶)

زبان اور اندازِ بیان کی سادگی و پُرکاری کے باوجود بعض مقامات مولانا عبدالماجد دریابادی کے "سفر نامے" کی شگفتہ نگاری کا مطالبہ کرتے ہیں، دو چار جگہ اشہبِ قلم ذرا کاواک بھی ہو گیا ہے —— "آج سے راقم نے "غربۃ الاسلام فی الہند" میں ہاتھ لگا دیا ہے" —— (صفحہ ۴۰) یہاں "میں ہاتھ لگا دیا ہے" "آغاز" کے معنیٰ میں ٹھیک استعمال نہیں ہوا —— بہر حال یہ اللہ کا دین ہے" (صفحہ ۲۶۲) "دَین[1]" مؤنث نہیں مذکر بولا جاتا ہے —— صفحہ ۱۸۹ پر کاتب نے "سنگریزدل" کو "انگریز دل" لکھ کر بڑی ذہانت اور شوخی کا ثبوت دیا ہے، انگریز کا دل، سنگریزوں سے کم سخت نہیں ہوتا —— بعض غلطیاں "حسین" بھی ہوتی ہیں!

"دیارِ عرب میں" —— اپنے موضوع پر کامیاب ترین پیش کش ہے، مصنف اور ناشر دونوں .. مبارکباد کے مستحق ہیں، یہ روزنامچہ اپنی نوعیت کا پہلا سفر نامہ ہے جس کا مطالعہ مفید ہی نہیں موجبِ سعادت ہے، اہلِ علم اور عوام دونوں بقدرِ ذوق اس سے مستفید ہو سکتے ہیں! ✧

[1] بمعنی "عطا"

ماہنامہ

# فاران

ماہر القادری

جلد ۲ ——— نمبر ۶

——— ماہنامہ ———

# فاران

ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ——— فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندوستانی) ——— فی پرچہ ۱۱ آنے

مقامِ اشاعت

"فاران" کیمبل اسٹریٹ
کراچی

## نظم و ترتیب

صفحہ



## حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

# نقشِ اوّل

اس رنگ برنگی دنیا میں بہت سی تحریکیں، بہت سے مقصد اور بہت سے کام آدمی کے سامنے آتے ہیں، یہاں مسلکوں، مذہبوں اور طریقہ ہائے کار کی کمی نہیں ہے، زندگی کی منزل میں ہر موڑ پر ایک نیا ہاتھ اشارہ کرتا ہوا ملتا ہے کہ "ادھر جائیے"! اس عالم اسباب میں آدمی یہ تو کر نہیں سکتا کہ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور زندگی بھر یہی سوچا کرے کہ کس راستہ پر چلوں اور کس پر نہ چلوں، اُسے بہر حال چلنا تو پڑیگا، اور اب اس کی ہوشمندی کا بڑا امتحان ہے کہ وہ اپنے لئے ایسی راہ منتخب کرے جو واقعی "صراطِ مستقیم" ہو، یہ نہ ہو کہ اندھوں کی طرح جس راستے کی طرف قدم اٹھ جائیں اُسی پر چل پڑے ——— اور ہر راہ میں لوگوں کا چلتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر راستہ سعادت اور ہر راہ سلامتی کی راہ ہے۔

جب راہ متعین ہو گئی تو اُس پر چلتے رہنا ہی کامیابی ہے، ہو سکتا ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں موت آ جائے، یا پہلے قدم ہی پر آسمان سے بجلی ٹوٹ کر گر پڑے یا ٹھوکر لگتے ہی دم نکل جائے، لیکن مسافر کامیاب ہو چکا، اس لئے کہ اس کی ہمت و قوت سے جو کچھ بن آ سکتا تھا اس میں کوتاہی نہیں ہوئی، اور حوادث کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی ——— رہی کامیابی! تو جس وقت اس نے "صراطِ مستقیم" کا انتخاب کیا تھا، اُسی لمحہ کامیابی خود اُسے مبارکباد دے رہی تھی۔

ہم نے خدا کے فضل سے اسلام کو صراطِ مستقیم سمجھ کر اختیار کیا ہے، راستہ میں لالہ و گل کے تختے ملیں گے تو بھی ہم چلتے ہی رہیں گے اور غزالوں کو منزلِ مقصود سمجھ کر ان کی رعنائیوں میں کھو نہ جائیں گے اور اگر کانٹوں کی نوکوں، تلواروں کی دھاروں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنا پڑا، پھر بھی ہم اس راستہ کو چھوڑ کر دوسری

طرف کا رُخ نہ کریں گے! حق کو جو کوئی اس توقع کے ساتھ قبول کرتا ہے کہ جب تک آسانیاں، فراغتیں اور راحتیں میسر آئیں گی وہ حق کے ساتھ رہے گا، اور جب مشکلوں پریشانیوں اور کڑی آزمائشوں کا وقت آئے گا، تو وہ حق کا ساتھ چھوڑ دے گا، اس ذہنیت کا شخص کم ظرف ہے، تنگ نظر ہے، بزدل اور کمینہ فطرت ہے، اور اُس کی وفاداری اور خلوص پر ایک لمحہ کے لئے بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

حق تو ایسے مردانِ وفاشعار کو چاہتا ہے، جو پھولوں کی سیجوں ہی پر نہیں پھانسی کے تختہ پر بھی حق ہی کا ساتھ دیں، جنھوں نے حق کو حق کے لئے قبول کیا ہو، جو سچائی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرتے ہوں، جن کی مسرتوں کی غایت اللہ کی رضا اور خوشنودی ہو، جو حق بات کہتے ہوئے یہ نہ سوچیں کہ لوگ کیا کہیں گے اور عوام میں ہماری ہر دلعزیزی کہیں مجروح تو نہ ہو جائے گی! کلمۂ حق کہنے پر چاہے عوام انھیں ذلیل کریں یا حکومت کے قہر و عتاب کا نشانہ بننا پڑے، مگر وہ تبلیغِ حق و صداقت سے باز نہ آئیں

اسلام اس کی ذمہ داری نہیں لیتا اور نہ سچائی اس کا وعدہ کرتی ہے کہ اُس کے قبول کرتے ہی آسمان سے مَن برسنے لگے گا، زمین سونا اُگلنے لگے گی، بھوکوں کے سامنے حلوے کے طباق رکھ دیئے جائیں گے، اور ننگوں کے جسم حریر و دیبا کی قباؤں میں ملبوس نظر آئیں گے، دنیا آن کی آن میں جنت بن جائے گی، نہ کسی کو کوئی دکھ ہوگا، نہ کوئی کسی قسم کے غم میں مبتلا ہوگا، ہر گوشۂ کائنات اور ہر قطعۂ ارض میں عیش و مسرت کے ساز چھڑے ہوں گے، لوگوں کو اپنی ضروریات اور روزی مہیا کرنے کے لئے زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑے گی ——— جو شخص ان تمناؤں آرزوؤں اور خوش خیالیوں کے ساتھ اسلام کی آواز پر لبیک کہتا ہے، وہ اسلام کا نہیں اپنے نفس کی خواہشوں کا ساتھی ہے، اُس نے اسلام سے نہیں اپنے نفس سے پیمانِ وفا باندھا ہے، اسلام کے ساتھ ایسے شخص کی وفاداری کا کوئی اعتبار نہیں ہر حادثہ اُسے پیمانِ وفا توڑنے پر آمادہ کر سکتا ہے، اس شخص کا حال اُس فوج کا سا ہے، جو کسی حکومت کی طرف سے صرف مال لوٹنے کی نیت سے لڑ رہی ہو اور حکومت کا بناؤ اور بگاڑ جس کے پیش نظر نہ ہو، ایسی فوج ہر آن دغا دے سکتی ہے بلکہ دشمن کی طرف ہو کر جنگ کرنے میں اگر مالِ غنیمت زیادہ مقدار میں ملنے کا امکان ہو تو یہ فوج دشمن سے ساز باز کرنے میں بھی تامل نہیں کر سکتی۔

اسلام کو تو ایسے وفادار اور مضبوط کیریکٹر کے سپاہی چاہئیں جو شکست کی حالت میں بھی اسلام کا جھنڈا پوری طاقت کے ساتھ تھامے رہیں، ایک ہاتھ کٹ جائے تو دوسرے ہاتھ میں پرچم کو لے لیں، دوسرے ہاتھ پر بھی تلوار کی کاری ضرب پڑے تو رانوں میں پرچم کو دبا لیں، رانیں بھی زخمی ہو جائیں تو دانتوں سے ہاتھوں کا کام لیں، جب تک جسم میں سکت باقی رہے، پرچمِ اسلام کو جھکنے نہ دیں۔

حق و صداقت کی تاریخ میں جہاں حضرت داؤد، سلیمان، اور یوسف (علیہم السلام) کی بادشاہتوں کے سنہرے ورق اور ضربِ کلیمی کا حوصلہ افزا واقعہ ملتا ہے، وہاں اُن رسولوں اور نبیوں کے اساطیر بھی پائے جاتے ہیں جن کو انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، سچائی کی تاریخ میں قیصر و مدائن کی شاندار فتح کے ساتھ، حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے خون کی سُرخی بھی نظر آتی ہے!

حق آزمائش چاہتا ہے، ایمان لانے کے بعد لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑ دیا جاتا، ان کو آزمایا جاتا ہے، یہ آزمائش سخت سے سخت بھی ہو سکتی ہے، مالوں اور کھیتوں کی بربادی سے لے کر جانوں کے نقصان تک! اس امتحان کی مدت کا تعین کوئی نہیں کر سکتا، یہ مختصر بھی ہو سکتی ہے اور طویل سے طویل بھی! اس راہ میں تبلیغ حق کے لئے آتشکدے بھی بھڑکائے جاتے ہیں، یہ دوسری بات ہے، کہ اللہ کا فضل آگ کو گلزار بنا دے، مگر خدا پرست اور حق آگاہ آگ کو آگ سمجھ کر ہی کودتا ہے ——— اور یہ بھی قطعاً ضروری نہیں ہے، کہ ہر بار آگ کو گلزار بنا دیا جایا کرے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کبھی آزمائش اتنی عجیب اور شدید نوعیت اختیار کر جائے کہ پانی کے دھارے آگ کے شعلے بن جائیں۔

اسلام یقیناً عالم انسانیت کے لئے بہترین ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی ہے مگر مشیتِ تکوینی کو یہ بھی منظور ہو سکتا ہے کہ کوئی ملک اسلام کے دستور کو قبول کر لے، اور مسائلِ معاش کی اُلجھنیں پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ بڑھ جائیں ——— یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ معاشی

اقتصاد کے مسائل نے انسان کو عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے، آخرت کا تصور ذہنوں سے نکلتا جا رہا ہے، ہر طرف نفس کی بندگی اور پیٹ پوجا کے سامان ہو رہے ہیں، آدمی سچائی کو بھی روٹی اور کپڑے کے پیمانے سے ناپنا چاہتا ہے۔

ہمارا خطاب اُن لوگوں سے نہیں ہے جو خدا، رسول اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اس دُنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں ہمارے مخاطب وہ افراد ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے ایمان و یقین کی دولت سے نوازا ہے اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مردِ مومن کی سوئی بھی گم ہو جاتی ہے اور چراغ بھی گُل ہو جاتا ہے تو اس ذہنی کوفت کا صلہ اللہ تعالےٰ آخرت میں اُسے عطا فرمائے گا۔

اس طویل تمہید کو ذہن میں رکھ کر، اس مضمون کے اُس حصّہ کو پڑھئے جو اب آپ کے سامنے آ رہا ہے، ہم مطالعہ کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں!

## دیکھنا کیا چاہئے؟

کسی تحریک، کام، انسٹی ٹیوشن اور حکومت کا چل جانا اور جمے رہنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے، خوبی اور عمدگی اس میں ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ جو چیز چل رہی ہے، وہ کس مقصد کے تحت چل رہی ہے، اگر مقصد نیک ہے تو کام کا چلتے رہنا قابلِ مبارکباد ہے اور اگر غرض فاسد اور مقصد غیر صالح ہے تو یہ سب کیا کرایا بیکار اور اکارت ہے، نگاہ کمیت پر نہیں کیفیت پر ہونی چاہیئے کہ اصل اعتبار کیفیت ہی کا ہے۔

جہاں تک چلتے رہنے کا تعلق ہے، شریفوں کے گھروں کی طرح زنانِ بازاری اور طوائفوں کے گھر بھی چلتے ہی رہتے ہیں بلکہ زیادہ سلیقہ، ترتیب اور طمطراق کے ساتھ چلتے ہیں، تو کیا اس "چلتے رہنے" کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان دونوں قسم کے گھروں کی ایک ہی جیسی حیثیت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، نہ عقل اس کے ماننے کے لئے تیار ہے اور نہ وجدان! شرافت اور ذلت، عصمت اور بے آبروئی میں زمین آسمان کا فرق ہے!

انگریز کے زمانہ میں بھی ہندوستان کی حکومت کا کوئی کام بند نہ تھا، گورنمنٹ کی پوری مشنری حرکت میں تھی، مگر اہلِ ہند نے حکومت کے اس طرح چلتے رہنے کو گوارا نہ کیا، اس لئے کہ وہ چلتے رہنا ایک غلط مقصد کے تحت تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، اس لئے حکومت پاکستان کو اسلامی احکام کے تحت چلنا چاہیئے کہ اسی غرض اور اسی مقصد کے لئے مسلمانوں نے اتنی بھاری قربانیاں دی ہیں کہ جن کے تصور سے دل کا لہو آنکھوں کی جانب کھنچنے لگتا ہے۔

اگر دفتروں کے نظم و نسق، فوجوں کی پریڈ، پولیس کے احتساب، ریلوں کے چلنے، جہازوں کے اُڑنے، ڈاک کے آنے جانے، بجٹ کے ترتیب پانے اور غیر ممالک میں سفیروں کے بھیجنے کا نام حکومت کا چلتے رہنا ہے تو اس کے لئے متحدہ ہندوستان کیا بُرا تھا، وہاں یہ سب کچھ چلتا اور ہو تا رہ سکتا تھا اس پُر آشوب زمانہ میں بھی دُنیا کی ہر حکومت چل رہی ہے، یہاں تک کہ یمن، شرقِ اردن، بحرین اور مسقط تک کی حکومتوں کا بھی کوئی کام بند نہیں ہے ——— پاکستان بھی یقیناً چلنے اور قائم رہنے کے لئے ہی بنا تھا، مگر پاکستان بنانے والوں نے اس کے چلنے کی سمت معین کر دی تھی ——— یعنی یہ کہ پاکستان کی حکومت کا رُخ اسلام کی سمت ہوگا!

اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنا تھا، کیا وہ مقصد پُورا ہو گیا، یا پُورا ہو رہا ہے، یا اس کے پُورا ہونے کے آثار و علائم پائے جاتے ہیں، ہم اس فرصت میں اسی پر محاکمہ کرنا چاہتے ہیں، اب ہی قصیدہ گوئی اور منقبت خوانی تو کسی کو قصیدے ہی سننے کا شوق ہو تو ہم بھی ظہیر فاریابی کی طرح "نہ کرسیِ فلک" کا زینہ لگا کر، اپنے گرامی قدر ممدوحین کی رکابوں کو چومنے کی کوشش کریں اور کہیں کہ حضور! آپ کے زمانہ میں ریل کا کتنا اچھا معقول انتظام ہے (حالانکہ انگریز کے دور میں اس سے کم اچھا انتظام نہ تھا) اور غریب پرور! پاکستان میں غلّہ کی کتنی بہتات ہے (حالانکہ عہدِ انگریز میں بھی اُن علاقوں میں غلّہ کی پیداوار کا یہی حال تھا) اور سرکار! سکھر بیراج آپ ہی کے دم قدم کی بدولت لاکھوں ایکڑ زمین کو سیراب کر رہا ہے (حالانکہ اس کی تعمیر انگریز ہی کی فراست کی رہینِ منت ہے) اور آقائے ولی نعمت! دہ آپ کی حکومت کا بجٹ، اسمبلیوں کے گرما گرم اجلاس، کالج، مدرسے، بجلی کی روشنی، آب رسانی کے لئے محکمۂ واٹر ورکس کا انتظام (حالانکہ انگریز کے

زمانہ میں یہ سب چیزیں موجود تھیں) اور "یہ "...... "یہ"...... یہاں تک کہ اس "یہ" اور "وہ" کو پھیلاتے اور ایک دوسرے سے ضرب دیتے ہی چلے جائیے!

حکومت کی گاڑی دو پہیوں سے چلا کرتی ہے، ایک ہے (۱) قوت قانون ساز (Lagislation power) اور دوسرے پہیہ کا نام ہے قوت نافذہ (Exxaersisung power) جب تک یہ دونوں پہیے صحیح توازن کے ساتھ ٹھیک کام نہ کریں گے، حکومت کی گاڑی اُس طرح نہیں چل سکتی جس طرح اُسے چلنا چاہیئے اور بول عرفِ عام میں جسے چلنا کہتے ہیں، تو اس طرح بچوں کی گاڑی بھی ہم نے چلتی ہوئی دیکھی ہے جسے وہ سرکنڈے کی تیلیوں سے بنا کر دوڑاتے پھرتے ہیں۔

انگریز کے زمانہ میں قانون سازی کا ماخذ انسانی دماغ تھے، پاکستان نے اپنے کو اسلامی حکومت کہہ کر اس بات کا اعلان کر دیا کہ اُس کے دستور اور قانون کا ماخذ کتاب اور سُنت ہوگی، قرار دادِ مقاصد کی بدولت یہ حقیقت چمکتی ہوئی دھوپ کی طرح اور زیادہ روشن اور واضح تر ہوگئی۔

اس اعلان کے بعد دستور ساز اسمبلی میں نمایاں اور موثر تبدیلی کی ضرورت تھی، ارکانِ دستوریہ کے انتخاب کا معیار ہی بدل جانا چاہیئے تھا، پاک دستوریہ میں جو ارکان شامل ہیں اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جو کتاب و سنت پر نگاہ رکھتے ہیں، دستور کے ماخذ سے بے خبر و آگہی کے بغیر، صحیح طور پر دستور سازی ہو کس طرح سکتی ہے ——— شاعر، ادیب اور وکلا یقیناً بہت ذہین ہوتے ہیں مگر انھیں "فارمی کوپیا" تیار کرنے کے لئے دیدی جائے تو اُن کی ذہانت کی تگ و تاز معلوم! اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے علماء کی ایک کمیٹی مقرر تو کر دی ہے، جی، بجا، درست، حضور کا شکریہ! جزاکم اللہ فی الدارین خیرا، مگر اُس کمیٹی کی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں تو کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ کمیٹی تو بس مشورہ دے سکتی ہے، دستوریہ کو اس مشورے کے قبول کرنے اور نہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

یہ دستور سازی کا حال ہوا اب رہی قوتِ نافذہ، تو اُس کے سلسلہ میں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ابھی دستور اور قانون کہاں بنا ہے جو اُس کے نفاذ کی ضرورت پیش آئے، ہم جیسے نا سمجھ اس سلسلہ میں عرض کرتے ہیں کہ "معروف" و "منکر" سب کو معلوم ہیں، دستور ساز اسمبلی نہ یہ کر سکتی ہے اور نہ اُس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ دین میں جو چیزیں حلال ہیں اُن کو حرام اور جو حرام ہیں اُن کو حلال قرار دیدے، ——— اس لئے شراب، زنا، قمار بازی اور اسی قبیل کے دوسرے "منکرات" کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دیدیا چاہیے تھا، مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں پاکستان کی قوتِ نافذہ نے کچھ نہیں کیا، انگریز جس قانون کو یہاں چھوڑ گیا ہے، بس وہی قانون نفاذ پا رہا ہے ——— پاکستان بنے اسلام کے نام پر اور وہاں نفاذ ہو، انگریزی قانون کا! آخر اُسے کیا کہیں اور کیا سمجھیں!

قرار داد مقاصد میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کی سعی کی جائے گی، سو اُس کا یہ حال ہے کہ بعض کلب گھروں میں عورتیں تک شراب پیتی ہیں۔ عورتیں، جی ہاں! مسلمان عورتیں جن کی غیرت کی کبھی قسم کھائی جاتی تھی! گھوڑ دوڑ میں آج بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں، انگریز ڈیڑھ سو سال کی مدت میں جس بے حجابی اور بے حیائی کو فروغ نہ دے سکا، وہ تین برس کی مدت میں پروان چڑھ گئی، رقص و موسیقی کے جلسوں کی سرکاری عہدیداروں کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے، نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ سرپرستی! انگریز اپنے دورِ حکومت میں عورتوں کا ایک بھی مینا بازار نہ لگا سکا، اور پاکستان کے ارد گرد شہیدوں کا خون ابھی خشک بھی نہ ہوا تھا کہ یہاں مینا بازار کے نام سے مہذب عورتوں نے ایک جشن برپا کیا جس کی یاد نہ جانے کس کس کے دل کو اب تک برما رہی ہوگی۔

ایران اپنی ہمسایہ مسلمان حکومت ہے، اُس کے ساتھ ہمارے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور مستحکم تر ہونے چاہئیں، شہنشاہِ

ایران نے کرم فرمایا تھا تو اُن کی میزبانی بھی لازمی تھی، مگر ان سیاسی روابط اور دوستانہ تعلقات کے لئے یہ کیا ضروری تھا کہ پاکستانی عورتیں سینے تان تان کر شہنشاہ کو گارڈ آف آنرپیش کریں اور ہر دعوت میں اُن کے آس پاس عورتوں کو بٹھایا جائے۔

انگریز نے جس نہج پر حکومت کے نظم و نسق کو چھوڑا تھا، اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کرسیوں پر بیٹھنے والے بدل گئے ہیں مگر وہ رُخ کارفرما نہیں بدلی، نیچے سے لیکر اوپر تک سب کا ایک ہی حال ہے، انگریز جس انداز کا غذ میں پن لگایا کرتا تھا، ٹھیک اُسی طرح آج بھی کاغذ میں پن لگائی جاتی ہے، انگریز کی نقالی اور اُس سے نیاز مندانہ وابستگی کا یہ حال ہے کہ تین سال ہو گئے مگر اردو غریب کو دفتر دل میں بار نہ مل سکا، پاکستان کی یہ "قومی زبان" سرکاری حلقوں اور دفتری ماحول میں اجنبی سی ہے ——— جس نے انگریز کا زمانہ دیکھا ہے، وہ پاکستان میں آکر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ یہاں کوئی تبدیلی واقع بھی ہوئی ہے ؟

انگریز کے زمانہ میں عدالتیں جس اسلوب پر چل رہی تھیں، آج بھی اُسی طرح چل رہی ہیں ——— نظامِ تعلیم بھی جوں کا توں ہے، تبدیلی کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی گئی، انگریز نے اپنے مفاد اور مقاصد کی تکمیل کے لئے نظامِ تعلیم بنایا تھا، انگریز چلا گیا، پاکستان بن جانے کے بعد اب ہمارے مقاصد وہ نہیں ہیں جو انگریز کے تھے، لہٰذا نوجوانوں کے شعور و فکر کی تربیت کے لئے ایک دوسرا نظامِ تعلیم وجود میں آنا چاہیئے تھا، اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم و تربیت کا نظام انگریز ہی کی "بے" بول رہا ہے، اور لوگ اس لئے میں لَے ملائے چلے جا رہے ہیں ——— اس سلسلہ میں حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی ملی جلی تعلیم کو رواج دے کر "رومانس" Romance کے لئے آسانیاں ضرور پیدا کر دی ہیں، اکبر الٰہ آبادی نے کس دردمندی کے ساتھ پیش گوئی کی تھی۔

> پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
> حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

تو کالجوں میں غلمان اب تنہائی محسوس نہیں کرتے، حوروں کے حسین نظارے ہر آن انھیں میسر ہیں۔

غیرت مند آنکھ ان مناظر کو دیکھتی ہے، اور خون کے آنسو روتی ہے، کس زخم کو چھپائیں اور کس داغ کو دکھائیں یہ وہ باتیں ہیں جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا، دیکھتے ہیں اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

بارش ہونے سے پہلے "ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، بادل اور گھٹائیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، تھوڑا بہت ترشح ہوتا ہے، اور دیکھنے والوں کو یقین اور اطمینان ہو جاتا ہے کہ مینہ برسنے والا ہے ——— مگر یہاں پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے آثار تک نہیں پائے جاتے، اور جو کچھ آثار نظر آتے ہیں، وہ اس کا پتا دیتے ہیں کہ خداوندانِ نعمت کے ارادے کچھ اور ہیں۔

جب یہ صورت اور ایسے حالات ہیں کہ پاکستان اسلام کی لائنوں پر نہیں چل رہا ہے ورنہ اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں، تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے کہ صورتِ حال کو بدلا جائے، ——— صالح قیادت کی شدید ضرورت ہے۔

**پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ہے، اقتدار و قیادت کی کرسی پر وہی بیٹھ سکتا ہے اور اُسی کو بیٹھنے دیا جائے گا جس میں اہلیت ہو گی ——— اور اس اہلیت کا معیار ہے صالح زندگی، نیک سیرت فراستِ مومن، خوفِ خدا اور اتباعِ رسول ؐ! جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اُترتے ہوں اُن کو چاہیئے کہ اپنے کو بدل کر معیار کے مطابق بنا لیں۔ پاکستان کی زمامِ اقتدار متقیوں ہی کو سونپی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہی معزز و مکرم ہیں!**

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "تبدیلی ناگزیر ہے" تو اس سے اگر کوئی شخص یہ مفہوم اخذ کرتا ہے کہ ان خیالات کو پھیلا کر اور اس طرح لوگوں کے

جذبات کو اُبھار کر، ملک میں انتشار پیدا کیا جا رہا ہو، تو اس خیال کا آدمی یا تو بدنیت ہے، یا اُس کے دماغ میں فتور ہو! "تبدیلی" کو "انتشار" نہیں کہتے، جمہوری ملکوں میں انتخابات کے بعد وزارتیں بدلتی بدلتی رہتی ہیں، تو اس تبدیلی کی غرض و غایت کیا انتشار ہوتی ہے؟ تبدیلی بگاڑ کے لئے نہیں، بناؤ کے لئے چاہی جاتی ہے، ہم اپنے گھر کی چیزوں کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں، تو اس تبدیلی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم اپنے گھر کو برباد اور تباہ کر دینا چاہتے ہیں، جو شخص ایسا سمجھتا ہو اُس کے دل و دماغ پر شاید عقل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔

پاکستان کا سچا دوست اور حقیقی وفادار تو وہ ہے جس کے دل میں خدا کا خوف ہو جسے اسلام سے محبت ہو جو رسول اللہؐ کے اتباع کو اپنے لئے ذریعہ سعادت سمجھتا ہو، اور جس کا دل ان جذبات سے اور جس کا کردار ان خوبیوں سے خالی ہو، اُس کی وفاداری پاکستان سے ذاتی غرض اور شخصی منفعت کی بنا پر ہو۔

پاکستان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو یہاں خونیں انقلاب چاہتے ہیں اور جو "سرخ سویرے" کی آس لگائے بیٹھے ہیں، یہ طبقہ دراصل اُس دستورِ حیات ـــــ اسلام ـــــ کا دشمن ہو جس کے نام پر پاکستان بنا ہے، ان افراد کو چونکہ اسلام سے بیر ہے، اس لئے پاکستان دشمنی اس کا لازمی نتیجہ ہو، یہ لوگ ہر اُس تحریک اور ہر اُس جماعت کے ساتھ ہو جاتے ہیں جو حکومتِ پاکستان سے کچھ شکایتیں رکھتی ہے، ان لوگوں کو اس سے غرض نہیں کہ عوام کی شکایتیں دور ہوتی اور اُن کے مطالبے پورے ہوتے ہیں کہ نہیں ـــــ بلکہ وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ عوام کے مطالبے پورے نہ کئے جائیں تاکہ حکومت کے خلاف نفرت اور عداوت عام ہو جائے، اور یہ اُن کے ہمدرد بن کر، عوام کی حمایت اور امداد سے بغاوت پھیلا دیں، انتشار اور برہمی پیدا کرنے کے لئے "سرخوں" کی یہ ٹولی بیگنا ہوں کے کسی مجمع پر بم بھی پھینک سکتی ہے ـــــ تو وہ نیک لوگ جو اسلام کی بنیاد پر ملک میں تبدیلی چاہتے ہیں، اُن کو اور ان اشتراکیت زدہ انقلابیوں کو ایک ہی جیسا سمجھنا پرلے درجے کی نادانی اور جہالت ہے، جو شخص اس قسم کے خیالات رکھتا ہو۔ اُس کی قوتِ تمیز اور فیصلہ کی طاقت بیمار ہو گئی ہے کہ خوب و ناخوب، اپنے اور پرائے میں وہ امتیاز نہیں کر سکتی۔

ایک گروہ کے پیش نظر "کارل مارکس" کی رہنمائی ہے اور دوسری جماعت کے سامنے محمد رسول اللہؐ کی ہدایت ہے، کیا ان دونوں کو ایک ہی جیسا سمجھ لیا جائے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، اُن دونوں گروہوں کی راہِ عمل اور جادۂ فکر جدا جدا ہے اُس کے اور اُن کے "انقلاب" میں بھی زمین، آسمان کا فرق ہے! ایک طرف تخریب ہے اور دوسری طرف تعمیر!

پاکستان کے اربابِ حل و عقد اپنے ہی ہیں، کوئی غیر نہیں ہیں، اور اپنوں پر تنقید کرتے ہوئے دل دُکھتا ہے، تنقید کوئی تفریحی شغلہ نہیں یہ ایک ناگوار فرض ہے، جس طرح جسم کے متاثرہ حصہ پر، جسم کی حفاظت اور زندگی کی بقا کے لئے، نشتر لگانا گوارا کر لیا جاتا ہے اگرچہ اُس سے تکلیف ہوتی ہو، اسی طرح اپنوں پر تنقید بھی ایک تکلیف دہ فریضہ ہے ـــــ دل چاہتا ہے کہ کاش! اس کی نوبت ہی نہ آتی اور جب آ گئی ہو تو پھر کوئی طاقت اعلانِ حق سے ہمیں باز نہیں رکھ سکتی، ہم اللہ تعالیٰ سے استقامت کی توفیق طلب کرتے ہیں!

ماہر القادری

پروفیسر ضیا احمد
بدایونی - ایم - اے

# تصوّف ـــــ قرآن کی روشنی میں

آج جب کہ دنیا اپنی مادیت کے ہاتھوں خود مجروح ہوچکی ہے۔ موجودہ تہذیب نزع کے عالم میں گرفتار ہے۔ علوم، نوعِ بشر کے لئے راحت رسانی کی جگہ تباہ کاری کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ انسانیت تیسری جنگ عظیم کے دروازے پر کھڑی ہے اور کوئی مفر سمجھ میں نہیں آتا۔ ولات حین مناص۔ تمدن کے ایک ایک مرکز[1] کا یہ حال ہے کہ ایک سال میں خودکشی کا اقدام کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ۔ اور اِس ارادے میں کامیاب ہونے والوں کی گنتی دس ہزار تک پہونچ جاتی ہے۔ قتل، سرقہ، زنا اور دوسرے جرائم روز بہ روز ترقی پر ہیں۔ امراض اور حادثات کا کوئی شمار نہیں۔ انسانی آبادی کے ساتھ ساتھ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ اور غذا کی پیداوار گھٹ رہی ہے۔ فوڈ منسٹریاں بنتی ہیں اور ملکی اور بین الممالکی غذائی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی تشفی بخش حل نہیں نکلتا۔ کہیں محنت و سرمایہ کی کشمکش ہے۔ کہیں فرقہ وارانہ چپقلش۔ غرض ایک عالم گیر ہیجان ہے جس سے کوئی قطعۂ ارض محفوظ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج سے زیادہ دُنیا سکون کی کبھی محتاج نہ تھی۔ اِن حالات میں ہر جگہ اہلِ تدبیر اپنی سی تدبیریں سوچ رہے ہیں جن سے حالات کو بہتر بنایا جاسکے۔

دنیا میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جو اپنے کو دنیا کے خالق کا آخری اور کامل پیام بتاتی ہے۔ آیئے دیکھیں اُس میں اِن مشکلات کا کوئی حل ملتا ہے۔ مادیت کے اِس مُہلک مرض کے لئے علاج بالضد کے طور پر قرآن نے جو نسخہ تجویز کیا ہے وہ روحانیت[2] یا دوسرے الفاظ میں تصوف ہے۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ یاد رکھو خدا ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہی ذکرِ خدا روحانیت کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

جو مضطرب ہے اُس کو اُدھر التفات ہے ؛ آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے (اکبر)

یہ سچ ہے کہ اِس نسخے سے اُس قسم کا فوری اثر تو نہ ہوگا جو دنیا چاہتی ہے۔ اور نہ روزگار کی زیادتی اور غذا کی افراط ہوگی۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ افراد و اقوام کا نظامِ حیات۔ طرزِ فکر اور اقدارِ عمل بدل جائیں گی۔ انسان انسان بن کر رہ سکے گا۔ اور عالمِ انسانیت کا اضطراب سکون سے مبدل ہوجائے گا۔

بعض مُستشرقین[3] اور اُن کے کاسہ لیسوں نے اپنے نزدیک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآنی تعلیمات خشک توحید اور سخت گیر ضابطۂ حیات کے عِلاوہ کچھ نہیں۔ اُن میں روحانیت کے عناصر داخلی ہی ہیں اور وہ بھی آریائی یا ایرانی۔ مسیحی یا یونانی رمزیت سے مستعار لیکن اگر قرآن مجید واقعی روحانی زندگی کو انسان کا اصل مقصود ٹھیراتا اور اُس کے متعلق صریح رہنمائی کرتا ہے تو مستشرقین کا دعویٰ خود بہ خود باطل ہوجاتا ہے۔

قرآن کے ارشادات پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت یا تصوّف کا مفہوم واضح کردیا جائے۔ جس سے ہم کسی

---

[1] امریکہ [2] ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ اسلام مادی زندگی سے تعرّض نہیں کرتا اور اُس کی بہبود کا ذمہ دار نہیں۔ البتہ اُس میں روحانیت کو اوّلی اور مادیت کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ یعنی امام غزالیؒ کے الفاظ میں، "دنیا منزلے است از منازل راہ دین" [3] نکلسن۔ وِن فیلڈ۔

صحیح نتیجے پر بہ آسانی پہونچ سکیں۔

اس سلسلہ میں خود اکابر تصوف کی تصریحات بکثرت ملتی ہیں جن میں سے چند یہاں پیش کی جاتی ہیں:-

حضرت جنید بغدادی سے کسی نے تصوف کی تعریف پوچھی۔ آپ نے جواب دیا التصوف ھو تصحیح الخیال تصوف خیال کی درستی کا نام ہے۔ یعنی اکثر اعمال جو دوسرے لوگ کرتے ہیں وہ صوفیہ بھی کرتے ہیں۔ البتہ زاویۂ نگاہ کا فرق ہوتا ہے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ کسی شخص نے ایک عمدہ عمارت بنوائی، جب تیار ہوچکی تو کسی اہل دل بزرگ کو وہاں مدعو کیا اور اُن کو اس عمارت کی سیر کرائی۔ اُن بزرگ نے دریافت کیا۔ بھئی یہ دیوار میں روزن کیوں رکھے ہیں۔ جواب دیا۔ حضرت روشنی اور ہوا کی غرض سے۔ فرمایا۔ افسوس اگر تم یہ نیت کرتے کہ اِن روزنوں سے اذان کی آواز آکر نماز کے لئے بیدار کردیا کرے گی تو مفت میں اجر بھی ملتا رہتا۔ رہی روشنی اور ہوا۔ وہ تو بہرحال ملتی ہی۔

ابن السماکؒ کا ارشاد ہے۔ التصوف ترک التکلف۔ یعنی بناوٹ ترک کرکے خلوص اختیار کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔ اعتقاد و عمل کے اِسی خلوص کو حدیث میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ابوسہل صُعلوکی کا قول ہے التصوف الاعراض عن الاعتراض۔ یعنی تصوف اعتراض سے روگردانی کا نام ہے۔

جنید بغدادیؒ کا دوسرا قول ہے کہ تصوف یہ ہے کہ حق تجھے تیرے وجود سے فنا کرکے اپنے ذریعہ سے بقا عطا فرمائے۔

معروف کرخیؒ کے نزدیک تصوف حق کو لے لینے اور ماسوا کو ترک کردینے سے عبارت ہے۔

شیخ ابوعلی قزوینی نے تصوف کی تعبیر اخلاق رضیہ سے کی ہے۔

ابومحمدؒ فرماتے ہیں اخلاق حسنہ سے اتصاف۔ اور اخلاق سیئہ سے انحراف صوفی کی شان ہے۔

ابوالحسن احمد نوریؒ کہتے ہیں تصوف یہ ہے کہ انسان کوئی کام نفس کی خاطر نہ کرے۔ اور صوفی وہ ہے کہ جو نہ کسی چیز کا مالک ہو نہ کوئی اُس کا مالک ہو۔ ہمارے زمانے کے ایک بڑے صوفی عالم نے تصوف کی ایک جامع تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ھو تعمیر الظاھر والباطن"، اِن تعریفوں سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تصوف کے دو پہلو ہیں تصفیۂ قلب۔ اور تزکیہ نفس۔ ایک کا تعلق دل کو ماسوا کے خیال سے پاک کرکے خدا کی یاد سے معمور کرنے سے ہے۔ اور دوسرے کا اخلاق ذمیمہ سے اجتناب کرکے اخلاق حمیدہ اختیار کرنے سے ہے یہ اور بات ہے کہ اکابر صوفیہ نے اپنے ماحول کی رعایت سے کبھی ایک پہلو پر زیادہ زور دیا ہے کبھی دوسرے پر۔ ورنہ دراصل قلب اور نفس دونوں کی درستی تصوف کا مقصود ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ خود ہمارے اکثر اہل فکر جب اس مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو افراط یا تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اصحاب ہیں جو ہر رطب و یابس کو جو صوفیہ سے منقول ہو آیت و حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ حضرات ہیں جو سرے سے تصوف ہی کو اسلام سے خارج ٹھہرلتے ہیں۔ حالانکہ حق ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کی تعریفات کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآن سے کہاں تک صوفیہ کے مسلک کی تائید نکلتی ہے۔

تصوف کے سلسلے میں جو دلائل پیش کی جاتی ہیں وہ یا نقلی ہیں یا عقلی یا کشفی۔ یہاں عقلی دلائل سے تعرض مقصود نہیں۔ کیونکہ فلسفے کے اساتذہ و تلامذہ کے روبرو ایسی کوشش تحصیل حاصل کا حکم رکھتی ہے۔ رہا کشف۔ سو راقم اِس میدان کا مرد نہیں۔ یہاں صرف نقلی دلائل۔ خصوصاً قرآن حکیم کی تصریحات پر اکتفا کرنا مدِ نظر ہے۔ آپ سب واقف ہیں کہ تصوف ایک خاص نظامِ حیات اور ایک مخصوص طرزِ فکر کا داعی ہے جس میں بعض عقائد و اعمال کی تحصیل اور تکمیل پر زور دیا جاتا ہے۔

ان عقائد میں سب سے اہم و اقدم عقیدۂ توحید ہے۔ دراصل توحید ہی وہ محور ہے جس کے گرد تصوف بلکہ اسلام کی تمام تعلیمات گھومتی ہیں۔ توحید سیدھے سادے الفاظ میں تو یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک جانے اور ایک مانے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس

کے لزومات اور تعبیرات کافی تفصیل طلب ہیں۔ شاہ[1] عبدالعزیز محدث دہلویؒ امام غزالی اور صاحبِ ملتقط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ صرف زبان سے لا الہ الا اللہ کہے۔ یہ منافقوں کی توحید ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب بھی شامل ہو۔ یہ عامۂ مسلمین کی توحید ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کائنات کی کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آئے۔ یہ مقربین کی توحید ہے۔ اور چوتھا یہ ہے کہ کثرت نظر سے اوجھل ہو جائے اور وحدت ہی وحدت رہ جائے۔ یہ صدیقین کی توحید ہے۔ تیسرے درجے کو صوفیہ کی اصطلاح میں توحید شہودی اور چوتھے کو توحید وجودی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر۔ وحدة الوجود سقوطِ شعورِ ماسوی اللہ است از علم و نظرِ سالک؛ وحدة الشہود سقوطِ شعورِ ماسوی اللہ از نظر سالک۔ نہ از راہِ علم۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں توحید کے بارے میں وحدة الوجود کے مشہور حامی مولانا جامیؒ۔ اور وحدة الشہود کے نامور مؤید شیخ مجددؒ کی چند سطور نقل کر دی جائیں۔ مولانا لکھتے ہیں:-

توحید یگانہ گردانیدن دل است یعنی تخلیص و تجرید او از تعلق بماسویٰ حق سبحانہٗ ہم از روئے طلب وارادت، وہم از جہتِ علم و معرفت، یعنی طلب وارادت او از ہمہ مطلوبات و مرادات منقطع گردد و ہمہ معلومات و معقولات از نظر بصیرت او مرتفع شود۔ از ہمہ روئے توجہ بگرداند و بغیر از حق سبحانہٗ آگاہی و شعورش نماند۔ (لوائح)

شیخ فرماتے ہیں:-

توحید عبارت از تخلیص قلب است از توجہ ما دون او سبحانہٗ۔ تا زمانے کہ دل را گرفتاری بماسوی متحقق اگرچہ اقل قلیل باشد از ارباب توحید نیست۔ بے تحصیل ایں دولت واحد گفتن و واحد دانستن نزد ارباب اصول از فضول است آرے از واحد گفتن و دانستن کہ در تصدیق ایمان معتبر است لابد است امابمعنیٰ دیگر است۔ (مکتوبات)

یہاں[2] یہ سوال اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ صوفیہ کے ان دو دبستانوں میں اختلاف حقیقی ہے یا لفظی؟ اور اس کی بنیاد عقلی ہے یا ذوقی۔ یہ بہرحال مسلّم ہے کہ توحید دونوں کے نزدیک اساس کار قرار دی گئی ہے۔ اب اس سلسلے میں قرآن کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

اللہ تعالےٰ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم۔ تمھارا معبود ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ وہ رحمان و رحیم ہے۔

دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے:- اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم۔ سورۂ اخلاص میں حکم ہوتا ہے۔ قل ھو اللہ احد کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔

دو تین۔ یا زیادہ خداؤں کی نفی۔ وقال اللہ لا تتخذوا الٰھین اثنین۔ خدا نے فرمایا ہے کہ دو خدا نہ ٹھیراؤ۔ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ۔ بیشک وہ لوگ کافر ہوگئے جو کہتے ہیں کہ خدا ثالث ثلاثہ ہے۔ ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار۔ بھلا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اکیلا زبردست خدا۔

اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے۔ لو کان فیھما الٰھۃ الا اللہ لفسدتا فسبحٰن اللہ رب العرش عما یصفون۔ اگر آسمان و زمین میں زیادہ خدا ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔ سو عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں سراسر پاک ہے۔ لو کان معہٗ الٰھۃ کما یقولون اذا لابتغوا الی ذی العرش سبیلا۔ اگر خدا کے ساتھ جیسا کہ یہ لوگ

---

[1] فیصلہ شاہ صاحب دہلوی رحمہ [2] اگر تفصیل مطلوب ہو تو کلید مثنوی معنوی۔ مصنفہ مولانا تھانویؒ ملاحظہ کیجئے۔

کہتے ہیں اور معبود بھی ہوتے تو اُس صورت میں انہوں نے کبھی کا مالک عرش تک پہونچنے کا رستہ ڈھونڈھ نکالا ہوتا۔

تمام پچھے مذاہب اور خدا کے پیمبر دنیا کے سامنے توحید ہی لے کر آئے ہیں۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔ ہم نے تم سے پہلے کوئی پیمبر نہیں بھیجا جس کو یہ حکم نہ دیا ہو کہ میرے سوا کوئی کوئی معبود نہیں۔ اس لئے میری ہی پرستش کرو۔

خدا کا کوئی مثل نہیں۔ لیس کمثلہٖ شئیٔ۔ اس سے صاف ثابت ہوا کہ نہ وجود میں اور نہ صفات وجود میں کوئی اس کا ہمسر ہے۔ اس لئے اُس کا وجود حقیقی ہے۔ دوسروں کا غیر حقیقی۔ اُس کی صفات وجودی اور کامل ہیں۔ ماسوا کی صفات عدمی اور ناقص صفات وجودیہ میں سب سے مقدم حیات ہے۔ ھو الحی القیوم۔ وہ زندہ اور کارخانۂ عالم کا سنبھالنے والا ہے یہی نہیں بلکہ یحیی ویمیت دوسروں کو زندگی اور موت دینا بھی اُسی کا کام ہے۔ اُس کے مقابلہ میں کائنات کی یہ حیثیت ہے۔ کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم۔ تم بے جان تھے خدا نے تم میں جان ڈالی پھر وہی تم کو موت دے گا۔ اور دوبارہ زندہ کرے گا۔

حیات کے بعد علم کا نمبر ہے۔ وھو بکل شئیٔ علیم۔ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ انما العلم عند اللہ۔ علم صرف خدا کے پاس ہے۔ لہٗ غیب السمٰوات والارض۔ آسمان و زمین کے اسرار غیب اُسی کو معلوم ہیں۔ عندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو۔ غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں اُس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ علم کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ الا یعلم من خلق۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جس نے دنیا کو پیدا کر دیا اُس کو دنیا کا علم نہ ہو۔ اُس کے علم کے روبرو مخلوق کے علم کا کیا ذکر۔ جب بہترین مخلوق یعنی انبیا علیہم السلام عرض کریں گے۔ لا علم لنا انک انت علام الغیوب پروردگار ہمیں کچھ علم نہیں۔ تو ہی غیب کا جاننے والا ہے۔ ملائکہ مقربین گزارش کرتے ہیں۔ سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں کچھ علم نہیں بجز اُس کے جو تو نے عطا فرمایا۔ بیشک تو علیم و حکیم ہے۔

تیسری صفت ارادہ ہے۔ حق تعالےٰ کوئی (Blind force) نہیں جس سے بے ارادہ و مشیت افعال صادر ہوں۔ اُس کی صفت مُرید ہے۔ اور اُس کا ارادہ سب کے ارادوں پر غالب ہے۔ قل فمن یملک لکم من اللہ شیئا ان اراد بکم ضرا او اراد بکم نفعا۔ ان سے کہدو کہ اگر خدا تم کو نقصان یا نفع پہونچانا چاہے تو کون ہے جو خدا کے مقابلے میں کچھ بھی کر سکے۔ قل فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم وامہ ومن فی الارض جمیعا۔ اے پیغمبر عیسائیوں سے کہہ دیجئے کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ مسیح ابن مریم کو۔ اور اُن کی ماں کو اور تمام روئے زمین کے بسنے والوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جس کا خدا کے آگے کچھ بھی زور چل سکے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کو بھی قوتِ ارادی دی گئی ہے۔ مگر اُس کی حقیقت اِس سے زیادہ نہیں کہ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔ تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ خدا چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ ارادہ کے بعد صفتِ قدرت آتی ہے۔ فعال لما یرید۔ خدائے پاک جو چاہتا ہے کرتا ہے کوئی اس کا روکنے والا نہیں۔ بلکہ اُس کی صفات میں قَبل و بَعد کی گنجایش ہی نہیں۔ جہاں اُس نے کسی چیز کا ارادہ کیا وہیں وہ وقوع میں آ گئی۔ انما امرہٗ اذا اراد شیئا ان یقول لہٗ کن فیکون۔ اس کی تو یہ شان ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس وہ اُس سے اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو۔ اور وہ ہو جاتی ہے۔ ان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہٗ الا ھو وان یمسسک بخیر فھو علیٰ کل شئیٔ قدیر۔ اگر خدا تمہیں کوئی نقصان پہونچانا چاہے تو اُس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں اور اگر وہ کوئی

نفع پہونچائے تو وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ وھو القاھر فوق عبادہ وھو الحکیم الخبیر۔ وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ اور وہی حکمت والا اور باخبر ہے۔ تمام نفع ونقصان اُسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اُس کے حکم کو پیچھے ڈال سکے وہی خالق ہے۔ وہی رازق ہے۔ اور آسمان وزمین کی کنجیاں اُسی کے قبضے میں ہیں جس کو چاہے رزق میں وسعت دے۔ جس کو چاہے تنگی دے۔

اُوپر کی آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ استقلالاً حیات۔ علم۔ ارادہ۔ قدرت خدائے پاک ہی سے مخصوص ہیں۔ اور اُس کے مقابلے میں مخلوق موت۔ جہل۔ عدم ارادہ۔ اور عجز سے متصف ہے۔ صفات سمع۔ بصر۔ اور کلام کا بھی یہی حال ہو کہ یہ بھی مستقلاً اُسی ذاتِ اقدس سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ اُس کی دوسری صفات کمال مثلاً قرب۔ معیت۔ احاطہ۔ نور ہونا وغیرہ ہیں۔ جن پر متعدد آیات قرآنی ناطق ہیں۔ جیسے۔ ان ربی قریب مجیب۔ بے شک میرا خدا قریب ہے اور دعائیں سنتا ہے (حضرت صالحؑ کی زبان سے) اذا سألک عبادی عنی فانی قریب۔ جب میرے بندے میرے متعلق تم سے دریافت کریں تو اُن سے کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔ ھو معکم اینما کنتم۔ تم جہاں کہیں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔ الا انہ بکل شئ محیط۔ خبردار رہو وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ ھوالاول والآخر والظاھر والباطن۔ وہی سب سے پہلے ہے وہی سب کے بعد رہے گا۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض۔ اللہ ہی آسمان وزمین کی روشنی ہے۔ آیات قرآنی کا استقصا کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہر شخص معمولی کوشش سے ایسی نصوص تلاش کرسکتا ہو جو صاف شہادت دے رہی ہیں کہ مخلوق کی زندگی اور موت۔ نفع وضرر حق سبحانہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ وہی پیدا کرتا۔ پرورش کرتا۔ رزق دیتا۔ بیماری اور شفا بھیجتا مصیبت میں کام آتا۔ حی وقیوم۔ قادر وقاہر۔ علیم وحکیم۔ رحیم وکریم۔ خود بے نیاز۔ اور جہان کا کارساز مالک وحاکم۔ حاضر وناظر۔ سمیع وبصیر۔ فاعلِ حقیقی اور موثر واقعی ہے۔ اور اُس کے مقابلے میں بڑی سے بڑی مخلوق عاجز وبے مقدار اور مجبور و ناچار ہے۔

جب مومن کو اس کا کامل یقین ہو جاتا ہے تو وہ سب سے توڑ کر اپنا رشتہ اُسی خدا سے جوڑ لیتا ہے۔ اُسی کی عبادت کرتا۔ اُسی سے مدد مانگتا۔ اُسی سے ڈرتا اور اُسی سے اُمید باندھتا ہے۔ اُسی کو اپنا معبود ومسجود ومقصود مانتا۔ اور اُسی کی ذات کو اپنا محبوب ومطلوب ومرغوب جانتا ہے۔ توحید کے اِس مقام پر فائز ہونے کے بعد انسان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اور وہ عام انسانوں سے بالکل جُدا اور ممتاز ہستی ہو جاتا ہے۔ خدا کے سامنے جُھکنے کے بعد اس کا سر اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ پھر کسی کے آگے نہیں جُھکتا۔ اُس کا آستانہ مل جانے کے بعد وہ ہر آستانے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم لا معبود الا اللہ سے اب اس کے حق میں لا موجود الا اللہ (لا موثر فی الوجود الا اللہ) قرار پاتا ہو۔ پتھر۔ دریا۔ درخت۔ جانور۔ کواکب۔ عناصر۔ انسان۔ اِن میں سے آخر وہ کس کے حضور سر ارادت خم کرے۔ سب سے سر بلند تو وہ خود ہے کہ ان سب کو مسخر کر کے اُن سے اپنی خدمت لینے کی استعداد رکھتا ہے۔ البتہ اُس سے بلند تر اگر کوئی ہے تو وہ ذات جس کو وہ پہلے ہی اپنا قبلۂ اُمید ٹھیرا چکا ہے اِس کیفیت کے پیدا ہونے کی اصل یہ ہو کہ اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور بڑائی کا اذعان ہونے کے ساتھ ہی اُس کا جلال اور محبت دل میں گھر کر لیتی ہے۔ یہ تو اِس کیفیت کا سلبی پہلو ہوا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ محبت انسان کے تمام وجود پر چھا جاتی ہو۔ جس کے اثر سے غلامانہ اطاعت نہیں۔ بلکہ فدویانہ نیازمندی[1] پیدا ہوتی ہے۔ اور محب رفتہ رفتہ محبوب کے اخلاق سے تخلق

---

[1] شریعت کی بہ دل تعمیل ہو بس یہ تصوف ہے (اکبر)

ہو کر اُسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغہ۔ اہل ایمان خدا کے رنگ میں
رنگ جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اُس سے بڑھ کر کس کا رنگ ہوگا۔ اور جس کی نگاہ کے سامنے اتنا بڑا نصب العین ہو اُس سے اونچا
کس کا نصب العین ہوگا ؂ پسلی پھڑک اُٹھی نگہ انتخاب کی۔

محبت الٰہی پر صوفیہ کرام نے جس قدر زور دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت کے محرکات متعدد ہیں۔ مثلاً جمال
کمال۔ نوال (احسان) اور یہ سب حضرت حق سبحانہ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لئے اس کی شان محبوبیت بھی سب سے اتم و اکمل
اور اعلیٰ و افضل ہے۔ جس کو جس قدر اُس کی محبوبیت کی معرفت و یقین ہوگا وہ اُسی قدر محبت میں کامل ہوگا۔ والذین اٰمنوا
اشد حبا للہ۔ ایمان والوں کو تو سب سے بڑھ کر خدا کی محبت ہوتی ہے۔ اس محبت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی وقت دل فکر محبوب سے
اور زبان ذکر محبوب سے فارغ نہیں رہتی۔ یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علیٰ جنوبہم۔ خدا کو کھڑے۔ بیٹھے۔ اور کروٹ
کے بل یاد کرتے ہیں۔

غیر مناسب نہ ہوگا اگر یہاں محبت کے بارے میں چند نکات جو صوفیہ[۱] کرام نے بیان کئے ہیں پیش کر دئیے جائیں چونکہ تصوف کے
تمام احوال کی بنیاد محبت پر ہے اور محبت موہبت آلہی (خدا کی دین) ہے۔ اسی بنا پر احوال کو مواہب[۲] کہا جاتا ہے۔ اب محبت کی چند
علامتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ محب کے دل میں محبوب حقیقی کے سوا دنیا و آخرت میں کسی کی محبت نہ ہو۔ کیونکہ ایک دل میں دو محبتیں (خالق کی
اور مخلوق کی) جمع نہیں ہوتیں ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ۔ سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔ یہاں رسول
مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی یا جائز دنیا کی محبت پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ اول الذکر یعنی حبیبؐ خدا کی محبت[۳]، خدا ہی کی محبت اور آپ
کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اور آخر الذکر در اصل محبت نہیں بلکہ شفقت ہے۔

مشہور ہے کہ کسی عارف سے اُن کے فرزند نے جو خود بھی عارف تھے سوال کیا ابا جان کیا آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں جواب دیا
ہاں۔ عرض کی دو محبتیں تو ایک قلب میں جمع نہیں ہوتیں۔ اس پر وہ بزرگ بے اختیار رونے لگے۔ تب صاحبزادے نے کہا اگر آپ کو میری زندگی
اور ایمان کے درمیان اختیار دیا جائے تو آپ کس کو ترجیح دیں گے۔ فرمایا ایمان کو۔ کہا اس سے معلوم ہوا کہ وہ محبت ہے اور یہ شفقت ہے۔
اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اپنے محبوب کو چھوڑ کر اُس کی طرف التفات نہ کرے۔ اوپر آپ نے ملاحظہ کیا
کہ جمال یا کمال محبت کا محرک ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ جمیل حقیقی کو چھوڑ کر دنیا کے حسن پر گرویدہ ہوتے ہیں وہ پانی کی جستجو میں سراب کے پیچھے
ہو لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے عاشق کو فارسی میں فریفتہ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ جو حقیقت سے محروم رہ کر مجاز کے فریب میں
آ گیا ہو۔ ہندی کا لفظ موہت بھی اسی مفہوم پر شاہد ہے۔ عربی میں ایسے موقع پر مفتون استعمال کرتے ہیں۔ جس کے معنی آزمائش میں
ڈالا ہوا ہیں۔ یعنی قدرت انسان کی جانچ کرتی ہے کہ وہ نقلی ملمع کی طرف راغب ہوتا ہے یا اصلی کندن کی طرف۔

دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب سے ملنے کے وسائل کو دوست رکھے۔ اور موانع سے اجتناب کرے۔ تیسری یہ کہ دل میں ہر وقت
دوست کی یاد اور زبان پر اُس کا ذکر رکھے۔ حضرت رابعہؒ[۴] کے سامنے کچھ درویش دنیا کی بُرائی کر رہے تھے۔ رابعہؒ نے کہا افسوس دنیا
ترک کرنے پر بھی تمہیں اتنا لگاؤ دنیا سے باقی ہے۔ کسی نے ان سے پوچھا آپ شیطان پر لعنت نہیں کرتیں۔ جواب دیا دوست کی یاد سے
اتنی فرصت نہیں کہ دشمن کا ذکر کیا جائے۔ چوتھی یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کرے اور اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھے

---

[۱] مصباح الہدایت [۲] احوال کے مقابل میں مقامات ہیں جن کو مکاسب سے تعبیر کیا جاتا ہے [۳] حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ احبونی لحب اللہ۔ خدا کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت رکھو۔ [۴] ہے ہم کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ✦ ہرچند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو۔ (غالب)

کسی نے سیدنا امام حسنؓ کے روبرو کہا کہ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں فقر کو دولت پر اور مرض کو صحت پر مقدم سمجھتا ہوں۔ امام رضؓ نے ارشاد کیا بندے کی اپنی مرضی کیا۔ اُس کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ دوست کی طرف سے راحت پہونچے یا رنج وہ اپنا سر تسلیم خم کردے۔ پانچویں یہ کہ دوست کی ادنیٰ توجہ کو بہت جانے اور اپنی بڑی سی بڑی قربانی کو ہیچ سمجھے۔

غرض آمدم برسر مطلب۔ توحید کے صحیح اور کامل ادراک کا یہ لازمی اثر ہے کہ فرد یا قوم کی قلب ماہیئت ہو جائے۔ اور یہ کیفیت اس کے تمام وجود پر چھا جانے کے بعد اس کو حقیقی معنی میں انسانیت کا پیکر۔ بلکہ ملکوتیت کا مظہر بنا دے۔ جس میں توحید کا استحضار جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر وہ انسانیت میں کامل ہوگا۔ رسولؐ پاک کی مقدس زندگی میں ہم پڑھتے ہیں کہ رہنے سہنے۔ چلنے پھرنے کھانے پینے میں انتہائی انکسار و سادگی ملحوظ خاطر عاطر تھی۔ یہاں تک کہ اجنبی شخص جب آپ کو اصحاب میں ملا جلا دیکھتا تو پہچاننا دشوار ہوتا اور مجمع سے دریافت کرتا ایکم محمد! آخر اس کی کیا وجہ تھی۔ یہی کہ دین و دنیا کی بادشاہی کے باوجود حضورؐ کو ہر وقت اپنی عبدیت۔ اور حق تعالیٰ کی عظمت کا استحضار اس قدر تھا کہ ظاہری نام و نمود کی گنجائش ہی نہ تھی۔

با وجودت زمن آواز نیامد کہ منم

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اسلام سے بڑھ کر توحید پر زور کسی مذہب نے نہیں دیا۔ اور اسلامی جماعتوں میں حضرات صوفیہ سے زیادہ توحید کا اہتمام کسی نے نہیں کیا۔ انسان کلمۂ توحید کے اقرار کے بعد دنیا کی ہر طاقت سے جو خدائی اختیارات سے ٹکر لیتی ہو انحراف کا اعلان کرتا ہو۔ اپنا صحیح مقام جو انسانیت کبریٰ اور حق تعالےٰ کی خلافتِ عظمیٰ کا مقام ہے پہچانتا ہے اور بقول اقبالؔ قہاری و غفاری قدوسی و جبروت کا مظہر کامل بن جاتا ہے۔ قرآن نے توحید ذات و صفات کو اُس مذہب اور شرک کو ناقابل مغفرت جو بتایا ہو اُس کا راز یہی ہے کہ یہی گرُ افراد و اقوام کی سربلندی کا ہو۔ یہ تو تھا تصوف کا اعتقادی پہلو۔ جس میں تمام اعتقادات توحید کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اب ذرا عملی پہلو پر نظر ڈالئے۔ یوں تو توحید کے گلے سے اُتر جانے کے بعد آدمی خود بخود اخلاق رذیلہ سے محترز۔ اور اوصاف جمیلہ سے متصف ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی سے طمع رکھتا ہو نہ کسی کا خوف۔ موحد چہ برپائے ریزی زرش ٭ چہ شمشیر ہندی نہی برسرش ٭ اُمید و ہراسش نباشد زکس ٭ ہمین است بنیاد توحید و بس۔ نہ وہ ضعیف پر جبر کرتا ہے نہ قوی سے دبتا ہے۔ نہ تونگری پر اتراتا ہو۔ نہ ناداری میں خودکشی پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسلک کو صحیح سمجھتے ہوئے بھی دوسروں پر بہ جبر اپنا مسلک یا نظریہ عائد کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ حقوق سے زیادہ فرائض کا احساس رکھتا ہے اور تعظیم لامر اللہ کے ساتھ ساتھ شفقۃ علیٰ خلق اللہ پر کاربند رہتا اور امن عالم کا ضامن ہوتا۔ اصل یہ ہو کہ جب انسان نفسانیت ترک کرکے للہیت اختیار کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اپنی خودی کو فنا کرکے ذاتِ حقیقی کا مشاہدہ کرنے لگتا اور ہر شے کو اسی کا مظہر سمجھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ رذائل اخلاق مثلاً:۔ کبر۔ ریا۔ شہوت۔ حسد۔ ظلم۔ باقی رہیں اور فضائل مثلاً:۔ تواضع۔ اخلاق۔ تقویٰ۔ قناعت۔ رحم ان کی جگہ نہ لے لیں۔ لیکن حضرات صوفیہ نے مستقلاً چند اعمال و اشغال کی تاکید کی ہے جو تہذیب نفس کے بنیادی عناصر ہیں۔ اور جن پر کاربند ہونا ہر صوفی کا اولین فرض ہو۔ ہم بخوف طوالت اُن کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہیں۔ یہاں صرف ان کے اجمالی بیان اور قرآن مجید سے ان کے اثبات پر اکتفا کی جائے گی۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے فرائض و ارکان اسلام کا نمبر آتا ہو۔ جو صراحۃً قرآن سے ثابت ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہو۔

---

لہ کہ غم کی طرح عشق میں راحت بھی گوارا ٭ یہ بھی تو ہے آخر دہش داد کسی کی (ضیا) لہ توحید کی نسبت ایک صوفی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے:۔ التوحید غریم لا یقضیٰ دینہ وغریب لا یودّیٰ حقہ۔ توحید ایک ایسا قرض خواہ ہو جس کا قرض کوئی ادا نہیں کرتا اور ایسا مسافر ہے جس کی کوئی مراعات نہیں کرتا (شیخ ابو علی دقاق) لہ ملاحظہ ہوں آیات کریمہ۔ ذروا ظاهر الاثم وباطنہ۔ کھلے اور چھپے سب گناہ چھوڑدو۔ ھو یتولی الصلحین۔ خدا نیک بندوں سے محبت کرتا ہو۔ ایمان اور عمل صالح سے متعلق بہ کثرت نصوص وارد ہیں

شلاً :- (۱) خوش خلقی۔ یہ تصوف کی پہلی منزل ہے۔ اگرچہ یہ عموماً تمام خصائل حسنہ پر حاوی ہے مگر خصوصاً نیک مزاجی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ خدائے پاک اپنے رسولؐ کی مدح کے موقع پر فرماتا ہے۔ انک لعلیٰ خلق عظیم۔ بیشک تم اعلیٰ اخلاق کے حامل ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ فبما رحمۃ من اللہ الخ۔ یہ بھی اللہ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ تم اُن کو نرم دل ملے ہو۔ اور اگر تم مزاج کے سخت، اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ کبھی کے تمہارے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے۔

(۲) صدق :- ظاہر و باطن کا یکساں ہونا جو اخلاص کے لوازم سے ہے۔ اس کی اہمیت کون نہیں جانتا۔ ارشاد الٰہی ہے کونوا مع الصادقین۔ سچے لوگوں میں شامل ہو۔ نیز فرمایا کہ قیامت میں صادقین کو ان کا صدق کام آئے گا۔

(۳) ایثار :- حق تعالےٰ اہلِ صلاح کی مدح میں فرماتا ہے۔ یوثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ وہ لوگ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گو خود ضرورت مند ہوں۔ جس سے ظاہر ہے کہ اِس قسم کی جماعت خود عہدِ رسالت میں پیدا ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عباسی خلیفہ کے سامنے کچھ صوفی پیش کئے گئے جن پر زندقہ کی تہمت لگائی گئی تھی۔ خلیفہ نے اُن سب کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک بزرگ ابوالحسن نوری نے سب سے پہلے اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کیا۔ جس پر لوگوں نے وجہ پوچھی۔ جواب دیا کہ میں اپنے رفقا کے حق میں ایثار کرنا چاہتا ہوں گو وہ ایک ساعت کی زندگی کے بقدر ہی کیوں نہ ہو۔ خلیفہ نے جب یہ سُنا تو سب کو رہا کر دیا۔

(۴) قناعت :- ولا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ الخ۔ ہم نے جو لوگوں کو دنیاوی زندگی کی رونق کے سامان دے رکھے ہیں تم اپنی نظر اُن پر نہ دوڑانا۔

(۵) تواضع :- نفس کی سرکشی کو زیر کر کے پندار اور کردار میں اپنے آپ کو حقیر گردانا بڑے مجاہدے اور (self discipline) کا کام ہے۔ جس کی تعریف حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے۔ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علے الارض ھوناً۔ خدائے رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

(۶) عفو و احسان :- احسن کما احسن اللہ الیک۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی مخلوق پر احسان کر۔ واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔ تم احسان کرو کیوں کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

رہے مقاماتِ تصوف۔ یعنی توبہ۔ ورع۔ زہد۔ فقر۔ صبر۔ شکر۔ خوف۔ رجا۔ توکل۔ رضا۔ سب کا یہی حال ہے۔ طوالت کے ڈر سے اُن کی وضاحت اور ارشادات الٰہی سے اُن کی صراحت ترک کی جاتی ہے۔

اوپر کے بیانات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ تصوف یا روحانیت عین تعلیم اسلام ہے۔ اور یہی اخلاص فی الاعتقاد والعمل جس کو اکابر صوفیہ تصوف کی اصل بتاتے ہیں قرآن کی رو سے ایمان کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید مادی زندگی کی اصلاح پر بھی زور دیتا ہے۔ مگر یہ مقصود بالغیر ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ وہ اگر اہلِ ایمان سے خلافت فی الارض کا وعدہ کرتا ہے تو اس لئے کہ یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ نہ اس لئے کہ وہ اختیار و اقتدار کی بھوک میں دنیا کو ہضم کر لیں گے۔ اپنی پارٹی کو تقویت پہونچا کر دوسروں کو ستائیں گے۔ اور بہ جبر اپنا تمدن اور مذہب دوسروں پر لوگوں پر عائد کریں گے اگر وہ پیسہ حاصل کرنے اور خرچ کرنے کے جائز طریقے سکھاتا ہے تو اس غرض سے کہ رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے نہ اس واسطے کہ بغی و طغیان کا ذریعہ بن جائے۔ رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ نیک لوگوں کی یہ شان ہے کہ ان کو خرید و فروخت ذکر الٰہی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اگر اپنے موضوع سے ہٹ جانے کا خیال نہ ہوتا تو حضرت رسول مقبولؐ اور آپؐ کے آل و اصحاب کی مقدس زندگی سے کہ وہی

حضرات قرآن کے مخاطب اول ہیں اخلاص واحسان[1]۔ تسلیم ورضا۔ صبر وشکر۔ فقر و توکل۔ دنیا اور مال دنیا سے بے رغبتی۔ آخرت و لقائے الٰہی کے شوق کی بکثرت مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے جس کے بغیر یہ بحث تشنہ رہ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مانا نفس تصوف قرآن پاک سے ثابت ہے۔ لیکن کیا اُس کی "ہیئت کذائی" بھی ثابت ہے۔ اِس کے متعلق اس قدر یاد رکھنا چاہیئے کہ خود لفظ تصوف۔ اور اس کی سیکڑوں اصطلاحات۔ مثلاً حال ومقام۔ جمع۔ تفرقہ۔ جمع الجمع۔ محو واثبات۔ تلوین وتمکین وغیرہ بعد کی چیزیں ہیں۔ لیکن اِس سے تصوف پر کوئی حرف نہیں آتا۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ اور دوسرے علوم دینی کی اصطلاحات بھی تو آخر قرون مابعد میں وضع کی گئی ہیں۔ اور اُن کا کلام الٰہی یا ارشاد نبوی سے ثبوت کوئی طلب نہیں کرتا۔

البتہ اِس حقیقت کا سچائی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیئے۔ کہ متاخرین صوفیہ کے یہاں عقیدہ وعمل میں متعدد چیزیں ایسی ملتی ہیں جن کا قرآن سے اثبات تو درکنار۔ وہ قرآنی تعلیمات سے ٹکراتی ہیں۔ مثال کے طور پر۔ اتحاد۔ حلول۔ احکام شرع میں باطنیت۔ شریعت و طریقت کی باہم منافات دیر وحرم کی مساوات۔ بندے سے کسی خاص حالت میں سقوط فرائض کا اعتقاد۔ یا تصور شیخ۔ پیر پرستی۔ قبر پرستی۔ صلوٰۃ الرغائب۔ نماز معکوس۔ رہبانیت۔ ترک حیوانات۔ حبس دم۔ متعارف سماع اور رقص اور اسی قبیل کے اشغال کو لے لیجئے۔ ان میں سے ہر جزئیہ کو جدا جدا لے کر اُس پر بحث کرنا منظور نہیں۔ صرف اول الذکر کے متعلق چند جملے عرض کروں گا۔ یہ اعتقاد کہ حق وخلق ایک ہی ہیں سراسر قرآن مجید۔ بلکہ اکابر صوفیہ کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ شیخ ابن عربی[2] فرماتے ہیں۔ الحق حق وان تنزل والعبد عبد وان ترقیٰ۔ حق حق ہی ہے اگرچہ تنزل کرے۔ اور بندہ بندہ ہی ہے اگرچہ ترقی کر جائے۔ مولانا جامیؒ نے اِس فرق کو بڑی خوبی سے سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ فرض کرلو کہ ایک شخص نے پہلے کبھی آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اب اگر وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے تو اُس کو گمان ہوتا ہے کہ یا تو میری صورت عین آئینہ ہے۔ یا آئینہ عین صورت ہے۔ اِن میں پہلی شکل کا نام اتحاد ہے دوسری کا حلول۔ اور دونوں باطل ہیں۔ نہ وہ خود آئینہ بن گیا ہے اور نہ آئینے میں سما گیا ہے۔ اِس سلسلے میں حضرت شیخ[3] شہاب الدینؒ سہروردی کا فیصلہ سننے کے قابل ہے[4]۔ لیکن جمع بے تفرقہ بے دینی اور تفرقہ بے جمع تعطیل ہے۔ اِس کے برعکس جمع با تفرقہ حق صریح واعتقاد صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بقول حافظ ابن قیم[5] نہایت "مزلۃ الاقدام" ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔ کچھ مسئلے کی مابعد الطبیعی نزاکت۔ کچھ تعبیرات کی عدم مساعدت۔ کچھ بعض ناقص مدعیان تصوف کی ناروا مسامحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گتھی سلجھنے کی بجائے زیادہ اُلجھتی ہی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وجودی اکابر صوفیہ نے خلق وحق کی عینیت کا اظہار کیا وہاں ناواقف لوگ (جن میں صوفی وغیر صوفی دونوں شامل تھے) عینیت محض سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ ذات خلق وذات حق میں من حیث الاندراج عینیت تو کہی جاسکتی ہے ورنہ من حیث الذات غیریت ہے۔ کیونکہ اول الذکر صفات عدمیہ سے موصوف ہے۔ اور آخر الذکر صفات وجودیہ سے۔ فشتان مابینہما۔ دوسرے عقائد کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے رہے وہ اشغال جن کا ذکر اوپر ہوا اُن کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ قرآن سے اُن کی مطلق تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ سرور عالم اور آپ کے اصحابؓ۔ نیز سلف صالحینؒ کی حیات مبارکہ میں اُن کی سندِ جواز ڈھونڈھنا ہی بے سود ہے۔ الٹی ممانعت ہی نکلتی ہے۔ اسی لئے شیخ عبد الحق[6] محدث دہلویؒ کو لکھنا پڑا۔

---

[1] حدیث میں تصوف کی بجائے اس معنی میں احسان ہی کا لفظ آیا ہے۔ [2] فصوص الحکم [3] عوارف المعارف [4] طریق الہجرتین وباب السعادتین لابن القیم [5] تعجب ہے کہ اِس کے باوجود محدث دہلویؒ کو نواب صدیق حسن خاں "مستیٔ سست وصوفیٔ چست" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

نسبت صوفیہ غنیمت کبریٰ ست - اما رسوم ایشاں بہ ہیچ نمی ارزد۔

اُوپر کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ نفسِ تصوف عین ارشاداتِ قرآن و تعلیمات اسلام پر مبنی ہے۔ اور نیز یہ کہ دنیا کے موجودہ مادّی بحران کے لئے تصوف کے روحانی نسخے سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ درحقیقت اِس نسخے کے استعمال سے ہماری ہزاروں خود تراشیدہ تکلیفیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اور جو واقعی اور ناگزیر تکلیفیں پیش آتی ہیں اُن کی کلفت بھی یہ خیال آکر زائل ہو جاتی ہے۔ کہ "ہرچہ از دوست می رسد نیکوست"۔

---

فاضل مضمون نگار نے جس ژرف نگاہی، فکر و تعمق اور احتیاط کے ساتھ، "تصوف" جیسے بسیط اور نازک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے، مبالغہ اور افراط سے دامن بچانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

جو حضرات "فاران" کو پابندی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں، اُن کی نگاہ سے ہمارا وہ شذرہ ضرور گزرا ہوگا، جو تصوف کے سلسلہ میں ہم نے قلمبند کیا تھا، ہم اللہ کے فضل سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ ہماری زبان اور قلم پر حق جاری ہوگیا ہے، اور جو کچھ ہم کہتے ہیں سو فی صدی ٹھیک کہتے ہیں، اور ہماری رائے سے اختلاف گمراہی ہے!

ہم سے اظہار رائے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، مسائل کے استنباط اور استخراج میں ہم سے بھول چوک کا بھی امکان ہے، اور ہم اپنے ناظرین کو مجبور نہیں کرتے کہ ہر بات میں وہ ہماری ہاں میں ہاں ملائیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں خود اعتمادی، اور ذاتی غور و فکر کا جذبہ پیدا ہو، اور جو کچھ اُن کے سامنے پیش کیا جائے اُس پر نیک نیتی کے ساتھ غور کر کے کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں۔

تصوف پر ہم نے انتہائی نرم اور محتاط انداز پر اظہار خیال کیا تھا، مگر بعض بزرگوں کو وہ نرمی اور احتیاط بھی ناگوار گزری، اس برہمی کو ہم نے شکریہ کے ساتھ گوارا کیا، اور اس سلسلے میں بعض تحریریں جو ہمیں وصول ہوئیں، اُن سے ہم نے فائدہ اُٹھایا۔

تمام اکابر صوفیہ (اللہ کی اُن پر رحمت ہو) یہی فرماتے ہیں کہ "تصوف شریعت کے عین مطابق ہے، اور جو تصوف شریعت سے ہٹا ہوا ہے، وہ تصوف نہیں ضلالت و زندقہ ہے۔ ۔۔۔"

حقائق کے جانچنے اور پرکھنے کا اصل معیار "شریعت" ہے اور اس بات کو سب جانتے ہیں کہ شریعت سے کتاب و سنت مُراد ہے کہ اسی پر دین کا مدار ہے ــــــــ پس کوئی شخص چاہے وہ باطن کے کتنے ہی باریک نکتے کیوں نہ بیان کرتا ہو، اُس کا قول و عمل اگر شریعت کے مطابق نہیں ہے تو اُسے رَد کر دیا جائے گا، اس معاملہ میں شخصیتوں سے مرعوب ہو کر، ادھر اُدھر سے بات نہیں کرنی چاہیئے، سچائی دو ٹوک ہوتی ہے، اور دل میں سب سے زیادہ خوف اللہ ہی کا ہونا چاہیئے۔!

عبادات اور معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ معیار ہے، اسی معیار پر ہر آن نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے؟ جن کی نگاہ میں اُسوۂ رسول ؐ تھا، اُنھوں نے اپنے مقدس پیروں اور بزرگ اُستادوں تک کی پروا نہیں کی ــــــــ امام ابو یوسفؒ نے اپنے اُستاد امام ابو حنیفہؒ کے بعض اجتہادات کو اسی لئے قبول نہیں کیا کہ اُن کے مقابلہ میں کتاب و سنت سے زیادہ قریب چیز اُن کو مل گئی!

---

نوٹ:- مضمون ہذا کی تحریر کے وقت کتب ذیل پیش نظر تھیں۔ قرآن مجید۔ مختلف فہارس الفاظ و مطالب قرآنی۔ متعدد تفاسیر مثلاً نسفی۔ بیان القرآن وغیرہ۔ فصوص الحکم۔ مکتوبات امام ربانی۔ لوائح۔ مراۃ المثنوی۔ کلید مثنوی۔ قرآن اور تصوف۔ تصوف اسلام۔ موجودہ تصوف۔ سوانح مولانا روم۔ کتاب مرقوم۔ مصباح الہدایت۔ عوارف۔ احیاء۔ تفہیمات۔ فیصلہ دہلوی۔ طریق الہجرتین۔ اسرار محبت۔ نکلسن وغیرہ۔

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ سماع سنا کرتے تھے اور حضرت امیر خسروؒ کو تو موسیقی سے خاص شغف تھا، لیکن حضرت مولانا نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا یہ عمل تھا کہ جب سماع شروع ہونے لگتا تو وہاں سے اُٹھ جاتے اور اس مسلک میں حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے شیخ کامل کی اتباع نہ کرتے ـــــــ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب سید احمد شہیدؒ بریلوی کو بیعت کیا تو "تصورِ شیخ" کی بھی تلقین فرمائی، سید صاحبؒ نے کہا کہ میں یہ عمل نہ کروں گا، اس پر شاہ صاحب نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا:-

به مے سجاده رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
که سالک بے خبر نہ بود ز راه و رسم منزلها

یہ شعر سُن کر حضرت سید احمد شہیدؒ نے جواب دیا کہ حضرت میں شراب پی لوں گا تو پھر تو یہ بھی کر لوں گا مگر "تصورِ شیخ" کو تو میں شرک سمجھتا ہوں، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ جواب سُن کر سید صاحب کو گلے لگا لیا اور فرمایا کہ تم پر توحید و سنت کا غلبہ ہے۔

تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کا کون منکر ہو سکتا ہے، سیرت و کردار کی تشکیل میں بنیادی چیز یہ تزکیۂ نفس ہی تو ہے، معروف و منکر بتا دیئے گئے ہیں، بھلائی اور بُرائی میں حدِ فاصل کھینچ دی گئی ہے (قد تبین الرشد من الغی) پس جو کوئی قیامِ معروف میں جتنی زیادہ سرگرمی دکھائے گا اور منکر سے جس قدر زیادہ دُوری اختیار کرے گا، اُتنی ہی اُس کے نفس میں تزکیہ کی کیفیت پیدا ہوگی۔

وحدت میں کثرت کا یا کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کرنا، یہ کوئی دینی ضرورت نہیں ہے، نہ اس کے لئے اہلِ ایمان کو مکلف بنایا گیا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز پر صحابہ کو تعلیم دی، اس نہج پر سوچنا اور اُس پر گفتگو کرنا بہت خطرناک ہے ـــــــ اور میں یہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں "قل الروح من امر ربی" کی تعلیم اس پر شاہد ہے کہ بسائط اور کیفیات پر گفتگو کرنے سے روکا گیا ہے کہ اس میں ہر آن اُلجھن پیدا ہونے کا خطرہ ہے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ حضرت شیخ اکبرؒ محی الدین ابن عربی جن کو فنِ تصوف کا موجد کہا جا سکتا ہے، اُن کی کتابوں کے بارے میں اربابِ نظر اور بعض اہلِ باطن کی یہ رائے ہے کہ شیخ کی ان کتابوں کا عام کرنا خطرے سے خالی نہیں اور افادیت سے زیادہ مضرت کا اندیشہ ہے۔

جہاں تک تصوف کتاب و سنت کی رکاب تھام کر چلتا ہے، وہاں تک ہم بھی اُس کے ساتھ ہیں، مگر جس جگہ "سکر و غلبہ" کے سبب یہ رکاب ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے، اُسی مقام سے ہم بھی تصوف کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اسی لئے ہم حسین بن منصور حلاج کے "انا الحق" سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ـــــــ تصوف کا سب سے زیادہ کمزور یہی پہلو ہے کہ ایک طرف تو شریعت اور کتاب و سنت کی اتباع کا دعویٰ اور دوسری جانب "انا الحق" کی طرح طرح سے تاویلیں ہی نہیں بلکہ تائید بھی!

کہاں وہ تعلیم اور بار بار تاکید کہ "محمد عبدہٗ و رسولہٗ" اور کہاں یہ "انا الحق" کا نعرہ بار کاش تصوف کے دامن پر یہ داغ نہ ہوتا۔

(ماہر القادری)

شہیدِ ملت شیخ حسن البنا

ترجمہ:- محمد عاصم

# "الاخوان المسلمون" کی بنیادی تعلیمات!

## جہاں

تلوار اور قرآن ساتھ ساتھ رہتے ہیں ـــــ جہاں منبر و محراب بھی ہیں اور رزم گاہیں بھی، جس تحریک نے مصر کے نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کیلئے اُبھارا، جس منشور کا ایک ایک لفظ اخلاص و صداقت کا نیم ربانی شاہ کار ہے ـــــ آسمانوں سے آواز آرہی ہے کہ تم خالدؓ و حیدرؓ نہیں بن سکتے تو حسن البنا ہی بن جاؤ' !

"الاخوان المسلمون" نہ صرف مصر بلکہ موجودہ عربستان کی واحد اسلامی تحریک ہے، جس کا مقصد دنیا میں پُورے اسلام کا نفاذ اور نظام اسلامی کا اس کی اصلی شکل میں احیاء ہے۔ یہ دعوت آج سے تقریباً ۲۲ برس پہلے مصر میں اُٹھی اور اس نے مصر جیسے مغرب زدہ ملک کی معاشرتی اور تمدنی حالت میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا، جس کا موافق و مخالف سب کو اعتراف ہے۔

اس تحریک کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا؟ بیس بائیس برس میں دعوت کن کن مراحل سے گزری؟ اور آج سے دو ڈھائی برس پیشتر برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے اشارے پر اسے کس طرح کچلنے کی کوشش کی گئی؟ اس کے بانی اور قائد و مرشد شیخ حسن البنا ـــــ رحمۃ اللہ علیہ ـــــ کی شہادت کا دردناک واقعہ کن حالات میں پیش آیا؟ نیز یہ کہ یورپ اور امریکہ کے مختلف اخباروں اور رسالوں نے اس خالص اسلامی تحریک کو بدنام کرنے اور اس پر بہتان باندھنے کی شرم ناک کوششیں کس کس طرح کیں؟ ـــــ یہ ایک مستقل داستان ہے، اور اس کا ہر باب ایک مستقل مضمون اور صحبت کا طالب ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں ہمارے ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں "اخوان" کی دعوت اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہوئے، جن سے یہاں کا لکھا پڑھا طبقہ اس تحریک سے کافی حد تک متعارف ہوا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس "اسلامی تحریک" کا ہم پر جو قرض ہے، وہ اب تک پورا پورا ادا نہیں ہو سکا اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس قرض سے اب تک ہم سبکدوش نہیں ہو سکے ہیں اور اس کا ادا کرنا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے، خصوصاً ان لوگوں پر جو اس ملک میں اسلام کی دعوت کو لیکر اُٹھے ہیں اور اقامتِ دین کی راہ میں سرگرم عمل ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمارا ارادہ ہے اور اللہ کے حضور التجا کہ وہ ہمیں اس کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، کہ "اخوان" اور ان کی "دعوت" کے متعلق مستند اور معلوماتی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ذیل میں قارئین کی خدمت میں شیخ حسن البنا مرحوم کے قلم سے لکھے ہوئے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو اُنھوں نے خاص طور سے اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی ہدایت

کے لئے لکھا تھا۔ توقع ہے کہ قارئین کو اسی مضمون سے "اخوان" کی دعوت کی بنیادی اور اساسی تعلیمات معلوم ہو سکیں گی۔ دراصل یہ مضمون ہمارے مذکورہ سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔

ترجمہ کے بارے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگرچہ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ مقدور بھر اصل کے مطابق ہو، پھر بھی ہر جگہ الفاظ کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ "اصطلاحات" کے باب میں معذوری تھی۔ ان کے ترجمے سے مطلب ہی خبط ہو جاتا۔ (مترجم)

---

ہماری بیعت کے کل دس ارکان ہیں، جنہیں زبانی یاد رکھئے:۔

(۱) فہم (۲) اخلاص (۳) عمل (۴) جہاد (۵) قربانی (۶) اطاعت (۷) ثابت قدمی (۸) یکسوئی (۹) اخوت اور (۱۰) اعتماد

فہم سے مراد یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس بات کا یقین ہو کہ ہماری فکر (idealogy) ایک خالص اسلامی فکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذیل کے بیس اصولوں کا سمجھنا بھی ضروری ہے، جن میں مختصراً پورے اسلام کو سمجھایا گیا ہے:۔

(۱) اسلام ایک مکمل نظام ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبے ایک ایک کر کے آ جاتے ہیں، گویا وہ ایک اسٹیٹ اور وطن بھی ہے، اخلاق اور قوت بھی ہے، تہذیب و قانون بھی ہے، مالیات و دولت بھی ہے، جہاد و دعوت بھی ہے ——— یا اسی کو یوں کہئے کہ وہ حکومت و اُمت بھی ہے، رحمت و عدل و انصاف بھی ہے، علم و قضا (judiciary) بھی ہے، کسب و غنا بھی ہے، لشکر و فکر بھی ہے ——— بالکل اسی طرح جیسا کہ وہ ایک سچا عقیدہ اور صحیح طریق عبادت ہے۔

(۲) اسلامی احکام کے سمجھنے کے لئے قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا ہر مسلمان کا کام ہے۔ فہم قرآن کے لئے ضروری ہے کہ اسے بلا کسی اینچ پینچ اور تکلف کے عربی زبان کے قواعد کے مطابق سمجھا جائے۔ سنت نبوی کے جاننے کے لئے ایسے اصحاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، جو فن حدیث پر گہری نظر رکھتے ہوں۔

(۳) سچے ایمان، صحیح عبادت اور مجاہدہ (ریاضتیں) میں ایک نور اور حلاوت ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کے دل میں چاہتا ہے، ڈال دیتا ہے۔ البتہ الہام، افکار و خیالات، اوھام، کشف اور خواب قطعاً ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے شرعی احکام معلوم کئے جا سکیں۔ ان کا اعتبار محض اسی وقت تک ہوگا، جب تک ان کا تصادم دین کے واضح اور منصوص احکام سے نہ ہو۔

(۴) گنڈے، تعویذ، کوڑیاں، رمل، نجوم، کہانت، علم غیب کا دعویٰ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ناروا اور باطل ہیں جن کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے، الا ما کان اٰیۃ من قراٰن او رقیۃ ماثورۃ (البتہ ایسی چیز اس سلسلے میں نہیں آتی، جو یا قرآن کی آیت ہو یا ماثور تعویذ یا جھاڑ پھونک (حدیث)

(۵) ایسے مسائل جن میں کوئی شرعی نص موجود نہ ہو، اور جن میں ایک سے زیادہ صورتوں کا امکان ہو، ان میں اور وقتی طور پر پیش آ جانے والے مصالح میں امام اور اس کے نائب کی رائے پر عمل کیا جائے گا، تا وقتیکہ اس کا تصادم کسی شرعی قاعدے اور اصول سے نہ ہو۔ اس میں حالات، عرف اور عادات کے مطابق رد و بدل ہو سکتا ہے ——— عبادات میں اصل چیز اللہ تعالیٰ کی بندگی اور پرستش ہے، نہ کہ معانی میں غور و فکر۔ اور روزمرہ کے احکام میں ان کے اسرار، مقاصد اور حکمتوں کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

(۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر انسان کے کلام کو قبول اور رد کیا جا سکتا ہے۔ ہر وہ چیز جو قرآن و سنت کے مطابق سلف صالح سے ثابت ہو، ہم اسے قبول کریں گے، ورنہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی اتباع کے لئے کافی ہے، ہم مختلف فیہ مسائل میں اشخاص و افراد کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ ان کا معاملہ ان کی نیتوں پر ہے اور وہ اللہ کے ہاں اپنے کئے کا پورا پورا حساب پائیں گے۔

(۷) ہر وہ مسلمان جو فروعی و جزئی مسائل میں درجۂ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو، اس کے لئے ائمہ دین میں سے کسی ایک کی پیروی ناگزیر ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے امام کے دلائل کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور ہر اس ہدایت و رہنمائی کو قبول کرلے، جس کے ساتھ واضح دلیل موجود ہو، اور جس کے کہنے والے کی صداقت و قابلیت پر اسے یقین ہو، اگر وہ اہل علم میں سے ہے، تو اسے درجۂ اجتہاد تک پہونچنے کے لئے اپنے علم کی کمی کو پورا کرنا ضروری ہے۔

(۸) فروعی و جزئی مسائل میں فقہی اختلافات دین میں فرقہ پرستی، جھگڑے اور باہمی بغض و نفرت کا سبب نہیں بننا چاہیئے۔ ہر مجتہد کو اپنے اپنے اجتہاد کا اجر ملے گا۔ اختلافی مسائل میں خالص علمی تحقیق سے کوئی چیز مانع نہیں ہے، بشرطیکہ اس تحقیق کے پیچھے اللہ تعالےٰ کی محبت اور حقیقت تک پہونچنے کا جذبہ کام کر رہا ہو، اور اس سے کسی ناجائز تعصب اور کج بحثی کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۹) وہ مسائل جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، ان میں بحث و جدال کا دروازہ کھولنا اس "تکلف" میں شمار کیا جائے گا، جس سے ہمیں شرعاً منع کیا گیا ہے، مثلاً جو احکام اب تک واقع نہیں ہوئے، ان میں شاخ درشاخ مسائل کی تفریع کرنا، اور ان قرآنی آیات کے معانی میں غور و خوض کرنا جن تک کسی کا علم اب تک نہیں پہنچا، اسی طرح صحابہ کرام کے باہمی فرقِ مراتب اور ان کے سیاسی اختلافات پر بحث و جدال کا دروازہ کھولنا بھی اسی تکلف میں شامل ہے، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کو صحبتِ رسول کی فضیلت حاصل ہے، یوں ہر ایک کی رائے کے لئے گنجائش ہے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کی معرفت، وحدانیت اور پاکیزگی اسلام کے اولین اور بنیادی عقاید میں سے ہیں، صفات کے بارے میں جو قرآنی آیات اور صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، اور ان میں جو تشابہ نظر آتا ہے، ہم ان پر اسی طرح ایمان لائے ہیں، جیسا کہ وہ وارد ہوئی ہیں، بلا اس کے کہ ہم کسی چیز کی خواہ مخواہ تاویل یا تعطیل کریں۔ علماء سلف کے مابین ان مسائل میں جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں، ہم ان سے تعرض نہیں کرتے۔ (دراصل جس چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے کافی سمجھا، ہمارے لئے اسے ناکافی سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جیسا کہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:- وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا جو لوگ علم میں پختگی رکھتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب پر سیدھا سیدھا ایمان لاتے ہیں۔ دراصل اس کی ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے آئی ہے)

(۱۱) ہر وہ بدعت جس کی اللہ کے دین پاک میں کوئی اصل نہیں ہے، اور لوگوں نے اسے اپنی خواہشات کے مطابق، اس میں زیادتی یا کمی کرکے، اچھا سمجھ رکھا ہے، سراسر گمراہی و ضلالت ہے، جس کے خلاف جہاد کرنا اور بہتر سے بہتر ذرائع ـــــــ جن سے کسی بدتر چیز کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو ـــــــ سے اسے ختم کرنا ضروری ہے،

(۱۲) اضافی یا ترکی بدعت (جو کسی سنت میں اضافہ یا کمی کرکے بنائی جائے) اور ایسی مطلق عبادات کو اپنے اوپر مستقل طور پر لازم قرار دے لینا، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کوئی پابندی نہیں رکھی، فقہ کا ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اس میں مختلف رایوں کی گنجائش ہے۔ البتہ دلیل و برہان کے ذریعے حقیقت کی جستجو اور چھان بین میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۱۳) صالحین سے محبت، ان کا احترام اور ان کے نیک اعمال کی تعریف و ستائش اللہ تعالےٰ کے حضور تقرب کا باعث ہے۔ اصلی اولیاء وہ ہیں، جن کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہوا ہے:- الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا) ان کی کرامت اپنے شرعی شرائط کے ساتھ ثابت ہے۔ ساتھ ساتھ یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ اولیاء کرام خود اپنے لئے زندگی میں اور نہ موت کے بعد کسی طرح کے نفع و نقصان کے مجاز نہیں ہیں، کجا کہ وہ دوسروں کو کسی طرح کا فائدہ یا نقصان پہونچا سکیں۔

(۱۴) ہر قسم کی زیارتِ قبور اپنی شرعی حیثیت کے ساتھ جائز ہے لیکن اہلِ قبور سے مدد چاہنا ـــــ خواہ وہ کوئی ہوں ـــــ انہیں اس غرض کے لئے پکارنا، ان سے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے پورا کرنے کی التجا کرنا ـــــ خواہ قریب سے یا دور سے ـــــ ان پر نذر منت ماننے چڑھاوے، ان کی قبروں کو پختہ کرنا، ان پر چادر ڈالنا، چراغاں کرنا، چھوکر برکت حاصل کرنا، غیر اللہ کا حلف اٹھانا اور اسی طرح کی دوسری بدعات وہ کبیرہ گناہ ہیں، جن کے خلاف جہاد کرنا نہایت ضروری ہے۔ انہیں ختم کرنا برائی کے ختم کرنے کی حیثیت رکھتا ہے، جسے کسی حالت میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۵) اگر دعا کے ساتھ کسی مخلوق کا توسل شامل ہو جائے، تو اس کی حیثیت "دعا مانگنے کی کیفیت" میں ایک جزئی اختلاف کی ہے۔ توسل کا مسئلہ عقائد کے بنیادی مسائل میں سے نہیں ہے۔

(۱۶) غلط رسم و رواج یا عادات سے شرعی الفاظ کی حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی، بلکہ ضروری ہے کہ ان کے صحیح صحیح حدود معلوم کر کے ان سے تجاوز نہ کیا جائے، جس طرح کہ دین و دنیا کے تمام شعبوں میں الفاظ کی شعبدہ گری سے بچنا ضروری ہے۔ دراصل اعتبار حقائق کا ہوتا ہے، نام اور الفاظ کا نہیں،

(۱۷) عقیدہ عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ دل کا عمل ہاتھ پاؤں کے عمل سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، شرعاً مطلوب دونوں ـــــ دل اور ہاتھ پاؤں کے عمل ـــــ کا کمال ہے، اگرچہ دونوں کے مرتبے میں فرق ہے۔

(۱۸) اسلام عقلِ انسانی کو آزادی بخشتا اور کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، علم اور علماء کی قدر افزائی کرتا اور ہر مفید اور کار آمد چیز کا خیر مقدم کرتا ہے۔ حکمت و دانائی مومن کی گم شدہ چیز ہے، جہاں اسے ملے، دوسروں کی نسبت وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

(۱۹) کائنات میں غور و فکر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک شرعی دوسرے عقلی۔ ان دونوں کے دائرے اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن کسی قطعی چیز کے بارے میں دونوں کا اختلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک خالص صحیح علمی حیثیت کا کسی ثابت شدہ شرعی قاعدے سے تصادم ناممکن ہے۔ اگر قطعی اور ظنی تحقیق میں اختلاف ہو، تو ظنی کی تاویل کی جائے گی۔ لیکن اگر دونوں ظنی ہوں، تو شرعی حقیقت کی اتباع کی جائے گی، یہاں تک کہ عقلی حقیقت یا تو ثابت ہو جائے یا باطل۔

(۲۰) ہم کسی ایسے مسلمان کی کسی خاص رائے یا معصیت کی بنا پر تکفیر نہیں کرتے جو کلمہ طیبہ کا اقرار کرتا ہو، اس کے تقاضوں پر عمل کرتا اور فرائض کی ادائیگی میں سرگرم ہو، الّا یہ کہ وہ کلمہ کفر کا اقرار کرے یا دین کے کسی کھلم کھلا اور بنیادی رکن کا انکار کرے، یا صریح قرآن کی تکذیب کرے، یا اس کی تفسیر اس طور سے کرے کہ عربی زبان کے کسی اسلوب سے بھی اس کی گنجائش نہ ہو، یا وہ کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے، جس کی تاویل سوائے کفر کے ممکن ہی نہ ہو۔

جب کوئی "اخ"[1] اپنے دین کو مندرجہ بالا بیس اصولوں کے مطابق سمجھے گا، تو اسے اپنے نعرے کے اس حصے کی حقیقت معلوم ہو جائے گی:- "القرآن دستورنا والرسول قدوتنا" (قرآن ہمارا دستور ہے اور رسولؐ ہمارے رہنما ہیں)

(۲) **اخلاص** سے مراد یہ ہے کہ ہر "اخ" اپنے قول و عمل اور جہاد و قربانی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی اور اس کے حضور کامیابی کے علاوہ کسی اور چیز کی نیت نہ رکھے، ہر طرح کے مالِ غنیمت، نمود و نمائش، جاہ طلبی، دنیاوی ترقی کے لالچ یا تنزل کے خوف سے اس کی نیت صاف ہو۔ اس طرح وہ "فکر و عقیدہ" کا سپاہی بنے گا، نہ کہ "غرض و منفعت پرستی" کا۔ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ (آپ اعلان کر دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی (اور دوسری عبادات) میری زندگی اور میری موت سب جہانوں کے رب اللہ ہی کے لئے ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور مجھے اسی بات (پر قائم رہنے) کا حکم ملا ہے۔)

[1] "اخوان" کے ایک فرد کو "اخ" کہہ کر پکارا جاتا ہے (مترجم)

اس طرح ایک "اخ" اپنے نعرے کے اس حصّے کا مطلب جان لے گا۔ اللّٰہ غایتنا واللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد (اللہ ہی ہمارا مقصود ہے۔ اللہ بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے حمد وستائش ہے۔)

(۳) عمل سے مراد علم و اخلاص کا لازمی ثمرہ ہے۔ وقل اعملوا فسیری اللّٰہ عملکم ورسولہ والمؤمنون و ستردون الیٰ عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون (اور آپؐ کہہ دیجئے کہ تم لوگ عمل کرتے رہو، عنقریب تمہارے "عمل" کو اللہ، اس کا رسول اور تمام مومنین دیکھیں گے۔ اور پھر تمہاری واپسی اللہ عالم الغیب والشہادۃ کی طرف ہوگی اور وہ تمہیں بتائے گا کہ (دنیا میں) تم کیا کرتے رہے ہو)

عمل کے مندرجہ ذیل مراتب ہیں، جو ایک سچے "اخ" سے مطلوب ہیں:-

(ا) خود اپنی اصلاح، یہاں تک کہ اس کا جسم قوی، اخلاق مضبوط اور فکر تربیت یافتہ ہو جائے۔ وہ محنت کرنے اور اپنی روزی کمانے پر قادر ہو، اس کا عقیدہ واضح اور طریق عبادت صحیح ہو، وہ اپنے نفس سے جہاد کرنے والا، اپنے اوقات کو بہترین مصرف میں لانے والا، اپنے ذاتی امور میں نہایت منتظم اور دوسروں کے کام آنے والا ہو۔ ہر "اخ" پر یہ چیز انفرادی حیثیت سے ضروری ہے،

(ب) اپنے گھر کو ایک مسلمان کا گھر بنائے، یعنی وہ اپنے گھر والوں کو اپنی "فکر" کے احترام کرنے اور گھریلو زندگی کے ہر پہلو میں اسلامی آداب پر کاربند ہونے کی دعوت دے۔ اپنی شریک زندگی کا مناسب انتخاب کرے اور اسے بتلائے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا؟ بچوں اور ملازمین کی اچھی طرح تربیت کرے اور انھیں اسلامی اصولوں پر پروان چڑھائے، یہ بھی ہر "اخ" کا انفرادی فرض ہے،

(ج) سوسائٹی کی اصلاح، اور وہ اس طرح کہ اس میں دعوت خیر کے پھیلانے، برائیوں کے خلاف جہاد کرنے فضائل، امر بالمعروف اور ہر نیک عمل کی طرف پیش قدمی کرنے کی ترغیب دی جائے، اپنی "اسلامی فکر" کے حق میں زیادہ سے زیادہ رائے عامہ کو ہموار کیا جائے، اور روزمرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی اسی فکر کے رنگ میں رنگا جائے۔ یہ چیز جس طرح ہر "اخ" کا انفرادی فریضہ ہے، اسی طرح جماعت کا بھی اجتماعی فریضہ ہے۔

(د) وطن کی آزادی یعنی اسے ہر غیر اسلامی سیاسی یا اقتصادی یا روحانی اجنبی (foreign) تسلط سے نجات دلائی جائے۔

(س) حکومت (government) کی اصلاح تاآنکہ وہ صحیح معنوں میں اسلامی حکومت بن جائے، اور اس طرح اپنے فرائض قوم کی خادم اور مزدور کی حیثیت سے اس کی مصلحت کے مطابق انجام دے۔ اسلامی حکومت وہ ہے جس کے کارکن ایسے مسلمان ہوں جو اسلامی فرائض کی ادائیگی کرتے ہوں، اور کھلم کھلا معصیت کا اظہار و اعلان نہ کرتے ہوں۔ نیز یہ کہ یہ حکومت اسلامی احکام و تعلیمات کو عملاً نافذ کرتی ہو،

اس چیز میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ضرورت کے وقت حکومت اپنے ان عہدوں کے لئے غیر مسلم عناصر کی خدمت حاصل کرے، جن کا تعلق جنرل پالیسی سے نہ ہو، اب حکومت اپنے لئے خواہ کوئی بھی شکل یا نوعیت اختیار کرے، جب تک وہ اسلامی نظام حکومت کے عام بنیادی قواعد کے مطابق ہو، حکومت کے اسلامی ہونے میں اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حکومت اسلامی کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا شعور رکھتی ہو، رعایا سے اس کا تعلق مشفقانہ ہو، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا اس کا کام ہو، اور عوام کے مال کو بے جا صرف کرنے کی بجائے اس میں کفایت شعاری سے کام لیتی ہو۔

حکومت اسلامی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ امن و امان کی نگہداشت کرے، قانون اسلامی کا نفاذ کرے، تعلیم کو رواج دے، قوت و طاقت کے اسباب مہیا کرے، حفظان صحت کا اہتمام کرے، عوام کی بھلائی کی دیکھ بھال کرے، ملکی مال و دولت کی حفاظت کرے

اور اُسے نشوونما دے، لوگوں کے اخلاق کو مضبوط بنائے اور دعوتِ اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے کوشش کرے۔

اگر وہ اپنے فرائض انجام دیتی ہو، تو لوگوں پر اس کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی وفاداری اور اطاعت کریں اور جان و مال سے اس کی ہر ممکن امداد کریں۔

لیکن اگر وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے، تو پہلے اسے نصیحت کرنا اور صحیح مشورہ دینا ضروری ہے، اور پھر اس سے بیزاری اور کنارہ کشی۔ جہاں خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو، کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

(س) امتِ اسلامیہ کی گزشتہ شان و شوکت کا احیاء، یعنی ملک علاقوں کو آزاد کرایا جائے، انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ ان کی تہذیب اور روایت کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ ان کوششوں کا نتیجہ گزشتہ نظامِ خلافت اور وحدت کے اعادہ کی شکل میں ظاہر ہو۔

(ص) روئے زمین کے مختلف خطوں میں اسلامی دعوت کو پھیلا کر دنیا کی زمامِ قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینا بھی ایک مسلمان کے بنیادی فرائض میں داخل ہے، حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله (یہاں تک کہ فتنہ (غلبہ کفر) باقی نہ رہے اور اطاعت و فرمانبرداری اللہ کے لئے خاص ہو جائے) ویأبی الله الا ان یتم نوره (اللہ تعالیٰ بہرحال اپنے نور کی تکمیل چاہتا ہے)

یہ آخری چار مراتب جماعت پر بھی مجموعی حیثیت سے ضروری ہیں اور جماعت کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے ہر "اخ" پر علیحدہ علیحدہ بھی۔ درحقیقت یہ ذمہ داریاں بہت بڑی اور مہتم بالشان ہیں۔ عام لوگ انہیں وہم و خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، مگر ایک "اخ" انہیں مسلم و ثابت حقیقت سمجھتا ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ ہے، اور انشاء اللہ ہم اپنے اندر مایوسی کو کبھی راہ نہ پانے دیں گے۔ والله غالب علیٰ امره ولکن اکثر الناس لا یعلمون (اللہ تعالیٰ خود مختار اور اپنی مرضی کے پورا کرنے پر ہر آن قادر ہے، مگر اکثر لوگ اتنا بھی علم نہیں رکھتے)

(۴) **جہاد** سے مراد وہ فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا، اور جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من مات ولم یغز ولم ینو الغزو مات میتة جاهلیة" (جس شخص کی موت اس حال میں ہوئی کہ نہ اس نے کبھی جہاد کیا اور نہ جہاد کی نیت رکھی، اس کی موت جاہلیت کی موت ہے)

جہاد کے بہت سے درجے ہیں، جن میں پہلا یہ ہے کہ دل بُرائی پر نفرین بھیجے، اور آخری یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں تلوار اُٹھائی جائے۔ ان دونوں کے درمیان زبان، قلم، ہاتھ اور ظالم بادشاہ کے روبرو کلمۂ حق کہنے کے مختلف درجے ہیں۔ جہاد کے بغیر دعوت کا احیاء ناممکن ہے۔ جس قدر دعوت کا معیار بلند اور اس کا دائرہ وسیع ہوگا، اسی قدر اس کی راہ میں جہاد کی عظمت، قربانی کی قدر زیادہ اور کارکنان کے ثواب کی زیادتی ہوگی۔ وجاهدوا فی الله حق جهاده (اللہ کی راہ میں صحیح معنوں میں جہاد کرو)

یہی مطلب ہے اخوان کے نعرے کے اس حصے کا۔ "الجهاد سبیلنا" (جہاد ہماری راہ ہے)

(۵) **قربانی** سے مراد یہ ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جان، مال، وقت، زندگی، الغرض ہر چیز کو صرف کیا جائے۔ دنیا میں قربانی کے بغیر کوئی جہاد نہیں ہے، اپنی فکر "کو بروئے کار لانے کی راہ میں ہماری کوئی قربانی رائگاں نہیں جا سکتی، بلکہ اس کا نتیجہ اجرِ عظیم اور ثواب جمیل کی صورت میں ظاہر ہوگا، جو شخص ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے قربانی سے جی چرائے گا، وہ گنہگار ہوگا۔ ان الله اشتری من المؤمنین انفسهم واموالهم (اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں) فان تطیعوا یؤتکم اجراً حسناً (پس اگر تم فرماں برداری کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں اچھا بدلہ دے گا)

یہی مطلب ہے اخوان کے نعرے کے اس حصے کا "والموت فی سبیل الله اسمیٰ امانینا (اور اللہ کی راہ میں موت ہماری

سب سے بڑی تمنا ہے)

(۶) اطاعت سے مراد یہ ہے کہ جو حکم ملے، اسے تنگی وخوش حالی، مشکل وآسان ہر حال میں بلا تامل بجا لایا جائے۔

(۱) تعارف :- یعنی اپنی فکر اور نظریے کو عام کیا جائے اور لوگوں کے درمیان اسے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔
اس مرحلے میں جماعت کا نظام دوسری انتظامی جماعتوں کا سا ہوگا۔ اس کا مشن رفاہ عام کے لئے جد وجہد، ہوگا۔ اس غرض کیلئے کبھی وہ وعظ وارشاد کو اپنا ذریعہ بنائے گی، کبھی اصلاحی اور مفید اداروں ( institutions ) کے قیام سے کام لے گی اور کبھی اسی طرح کے دوسرے ذرائع استعمال میں لائے جائیں گے۔ اس وقت "اخوان" کے جو مختلف شعبے قائم ہیں وہ گویا اس جماعتی مرحلہ کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ اس مرحلے میں جماعت کا نظم ونسق "قانون اساسی" کے مطابق ہوگا اور اس کی تشریح "اخوان" کے مختلف رسالے اور اخبار کریں گے۔
اس مرحلے میں جماعت کی دعوت "عام" ہوگی، اور اس میں ہر وہ شخص حصہ لے سکے گا، جو اس کی کاروائیوں میں عملی حصہ لینا پسند کرے اور اس کے بنیادی اُصولوں پر چلنے کا وعدہ کرے۔ جو لوگ اس دَور میں جماعت میں شامل ہوں گے، اگرچہ ان پر ضروری نہیں ہوگا کہ وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں، لیکن پھر بھی اس کے نظم وضبط اور اس کے عام اصولوں کی نگہداشت اور احترام ان پر ضروری ہے۔

(ب) استحکام - ( consolidation ) :- یعنی عام مسلمانوں میں سے صالح عناصر کو چھانٹ کر الگ کیا جائے، انہیں جہاد کی ذمہ داریوں کے برداشت کرنے کے قابل بنایا جائے، اور پھر سب کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
اس مرحلے میں جماعت کا نظام روحانی پہلو سے "خالص صوفیانہ" اور عملی پہلو سے "خالص فوجی" ہوگا۔ ان دونوں پہلوؤں کا شعار ہمیشہ بلا کسی تردد، ایچ پیچ، شک وشبہ یا دلی کرہن کے "حکم واطاعت" ہوگا۔ "اخوان" کے فوجی دستے اس مرحلہ کے نمایندہ ہوں گے، اس کی تنظیم پہلے رسالہ "المنهج" کے مطابق تھی اور اب اس رسالہ کے مطابق ہوگی۔
اس مرحلے میں دعوت کا دائرہ عام نہیں ہوگا، بلکہ اس میں صرف وہی لوگ حصہ لے سکیں گے، جو کٹھن اور مسلسل جہاد کی پیہم ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کی حقیقی استعداد رکھتے ہوں گے۔ سب سے پہلی چیز جس سے اس استعداد کا مظاہرہ ہوگا، وہ ہے "مکمل اطاعت"

تنفیذ :- اس مرحلے دعوت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلا کسی نرمی یا گرمی کے سراسر جہاد، مقصد تک پہونچنے کے لئے پے در پے جد وجہد اور امتحان وآزمائش ہو۔ اس آزمائش وامتحان میں صرف صحیح معنوں میں سچے افراد ہی پورے اتر سکیں گے۔ اس مرحلے میں بھی دعوت کی کامیابی کا انحصار "مکمل اطاعت" ہی پر ہوگا۔ ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۹ھ کو "اخوان" کی پہلی صف نے اسی کے مطابق بیعت کی تھی۔
آپ کے اخوان کے فوجی دستے میں شامل ہو کر دعوت کو قبول کرنے اور اس بیعت پر کاربند رہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دعوت کے دوسرے مرحلے میں ہیں اور تیسرے دور سے قریب ہیں، اب آپ خود ہی اپنی ذمہ داریوں کا اندازہ لگائیے اور اپنے اندر انہیں پورا کرنے کی استعداد پیدا کیجئے۔

(۷) ثابت قدمی سے مراد یہ ہے کہ ایک "اخ" اپنے مقصد کی راہ میں پیہم اور لگاتار کوشش میں مصروف رہے۔ خواہ اس حال میں اس پر کتنی مدت گزر جائے اور سالہا سال تک اسے اپنی کوششوں کا کوئی نتیجہ نظر نہ آئے، حتیٰ کہ جب وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہو، تو وہ دو میں سے ایک بھلائی سے وہ سرفراز ہو، یعنی یا تو مقصد تک پہونچ چکا ہو یا اس تک پہنچنے کی راہ میں شہادت پا چکا ہو۔ "من المومنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا"
(مومنین میں کچھ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالےٰ سے جو عہد کیا، اسے پورا کر دیا۔ اب ان میں بعض اپنی زندگی کے دن پورا کر چکے ہیں اور بعض منتظر ہیں، اور (دُکتا کر) اُنھوں نے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک وقت خود بڑی تربیت گاہ ہے۔ راہِ حق اگرچہ نہایت طویل، دشوار گزار، کٹھن اور خار دار ہے، لیکن ہمیں بہر حال اسی راہ پر چلنا اور چلتے رہنا ہے، اس لئے کہ اس کے سوا کوئی دوسری راہ ہے ہی نہیں، جو ثوابِ عظیم اور اجر کثیر کے ساتھ ساتھ مقصد تک پہنچاتی ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جن وسائل ـــــ یعنی فہم، اخلاص، عمل، جہاد، قربانی اور اطاعت ـــــ کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے ہر ایک صحیح تیاری، مناسب وقت کے انتخاب اور عمدہ تنفیذ کا محتاج ہے۔ بہر حال ہر چیز اپنے وقت ہی پر انجام پاتی ہے۔ ویقولون متیٰ ھو، قل عسیٰ ان یکون قریباً (یہ کافر دریافت کرتے ہیں کہ عذاب کا وقت کونسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ ہوسکتا ہے وہ قریب ہی ہو)

(۸) یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے غلط نظریوں، اصولوں اور شخصیتوں سے کنارہ کش ہو کر محض اپنے نظرئے اور فکر کے لئے وقف ہو جائیں، اس لئے کہ اسلام ہی کا نظریہ سب سے بلند، اعلیٰ، پاکیزہ اور جامع نظریہ ہے۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے) ایک سچا "اخ" تمام بنی نوعِ انسان کو چھ حصوں میں تقسیم کرتا ہے:۔

مسلم مجاھد، مسلم بے عمل، مسلم عاصی، ذمی یا معاہد، غیر جانبدار، محارب۔ انہی چھ قسموں کے اعتبار سے شخصیتوں اور جماعتوں کو پرکھا جائے گا اور ان سے دوستی یا دشمنی کا معاملہ کیا جائے گا۔

(۹) اخوت سے مراد یہ ہے کہ آپ کے دل اور روحیں عقیدہ کی وحدت کی بنا پر ایک مضبوط تعلق اور رابطے میں منسلک ہو جائیں۔ عقیدہ ہی سب سے مضبوط اور پائیدار رابطہ ہے اور ہو سکتا ہے۔ جس طرح ایمان کا لازمہ اخوت اور بھائی چارہ ہے، اسی طرح کفر کا لازمی نتیجہ تفرق و انتشار ہوتا ہے۔ قوت کی ابتدا وحدت اور یک جہتی سے ہوتی ہے، اور یک جہتی بلا باہمی محبت کے ممکن نہیں ہے۔ محبت کا ادنیٰ درجہ دلوں کا آپس میں صاف ہونا ہے، اور اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے بھائی کے لئے ایثار اور قربانی کا جذبہ پایا جائے۔ ایک سچا "اخ" اپنے رفیقوں کو ہمیشہ اپنے آپ پر مقدم رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنی جگہ یہ جانتا اور یقین رکھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے، انہی کے ساتھ مل ہی کر کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اس کی رفاقت سے بے نیاز ہیں۔ ان کا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ بھیڑیا صرف اسی بھیڑ کا شکار کرتا ہے، جو اپنے ساتھیوں سے الگ نکل گئی ہو۔ والمومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً (مومن ایک دوسرے کے ساتھ مل کر عمارت کا کام کرتے ہیں، جس کا ایک حصہ دوسرے کے لئے سہارا ہوتا ہے) والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض (مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور ساتھی ہیں) یہی کیفیت اپنے اندر پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔

(۱۰) اعتماد سے مراد یہ ہے کہ ہر سپاہی کو اپنے قائد کی صلاحیت اور اخلاص پر اس قدر اطمینان حاصل ہو، کہ اس کا دل اپنے اندر اس کے لئے محبت واحترام، عزت اور اطاعت محسوس کرے۔ فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم، ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (پس تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ تجھے اپنے مابین پیدا ہونے والے تمام جھگڑوں میں حکم نہ مان لیں اور پھر تیرے فیصلے سے ان کے دلوں میں کسی طرح کی کڑھن یا تنگی نہ پیدا ہو اور وہ تمہارے فیصلے کو سر آنکھوں پر تسلیم کریں)

قائد اور اس کی اطاعت دعوت ہی کا ایک حصہ ہے، کیونکہ بلا قائد کے کوئی دعوت چل ہی نہیں سکتی۔ قائد اور اس کے سپاہیوں کے باہمی اعتماد ہی پر جماعت کے نظم وضبط، طریق کار کی پختگی، مقصد میں کامیابی و کامرانی، راہ کی مشکلات پر غلبہ کی قوت کا انحصار ہے۔ اخوان کی دعوت میں قائد کی حیثیت دلی تعلق کی بنا پر باپ کی، علمی فائدے کی رو سے استاد کی روحانی تربیت کے سبب پیرومرشد کی اور جماعت کی عام پالیسی اور سیاست کو چلانے کی بنا پر لیڈر اور رہنما کی ہے۔ ہماری دعوت میں یہ تمام چیزیں ایک ایک کر کے شامل ہیں۔ دعوت خواہ کسی طرح کی ہو، اس کی کامیابی کا دارومدار قیادت پر اعتماد" پر ہوتا ہے، لہٰذا ہر سچے" اخ " کے لئے ضروری ہے کہ اپنے دل میں ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے، تاکہ اسے معلوم ہوسکے کہ اسے اپنے قائد پر کہاں تک اعتماد حاصل ہے؟ :-

(۱) کیا جماعت میں آنے سے پہلے وہ اپنے قائد اور اس کے حالاتِ زندگی کو پوری طرح سمجھ چکا تھا؟

(۲) کیا اسے اس کی صلاحیت اور اخلاص پر اطمینان ہے؟

(۳) کیا وہ اس بات کے لئے تیار ہے کہ قائد کی طرف سے اسے جو احکام ملیں ـــــ جن میں طبعی طور پر خالق کی معصیت نہ ہوگی ـــ انہیں قطعی قرار دے اور اپنے لئے ان میں کسی قسم کی گفتگو، ردوکد اور بحث کی گنجائش نہ پائے؟ ہاں اسے مشورہ دینے اور صحیح رائے کی نشان دہی کرنے کا حق ہر وقت حاصل ہے۔

(۴) کیا وہ اس بات کے لئے تیار ہے کہ اگر غیر منصوص علیہ مسائل میں اس کا اجتہاد قائد کے حکم سے متعارض ہو، تو وہ اپنی رائے سے دستبردار ہو کر قائد کے حکم کو ترجیح دے؟

(۵) کیا وہ اس کے لئے تیار ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات کو جماعت کے تصرف میں دے دے؟ کیا اس کی نظر میں قیادت کو اتنا حق حاصل ہے کہ اس کے ذاتی مفاد پر دعوت کے عام مفاد کو مقدم رکھ سکے؟

انہی اور انہی جیسے دوسرے سوالات کے جواب سے ایک " اخ " یہ معلوم کرسکتا ہے کہ اس کا اپنے قائد سے کتنا اور کس قسم کا تعلق ہے؟ اور اسے اس پر کتنا اعتماد حاصل ہے؟ اللہ تعالےٰ مقلب القلوب ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے، دلوں کو پھیرتا ہے۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم
ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم

(جو کچھ بھی زمین میں ہے، اگر آپ سب خرچ کر دیتے، تو بھی ان کے دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے تھے، مگر اللہ نے ان کے درمیان محبت ڈال دی واقعی وہ غالب، حکمت والا ہے)

---

محمد امین زبیری

# بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

"دیدہ ور پیدا بھی ہوچکا، مگر دُنیا نے اُسے پُوری طرح دیکھا نہیں!"

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شاعری ان کے پیغام اور فلسفہ پر گزشتہ چند سال میں جو پُرجوش اور قابلانہ تبصرے ہوئے ہیں وہ سب مجموعی طور پر اقبالیات کا ایک ایسا لٹریچر ہے کہ اب ہماری نوجوان نسل کو اس پر ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے لیکن اقبال کے منازلِ زندگی اور محرکات شاعری پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، مثلاً اقبال کو مسلم سیاست سے طالبعلمی کے زمانہ میں ہی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور سنہ ۱۹۰۸ء میں جب لندن میں سید امیر علی کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے برٹش کمیٹی قایم کی تو وہ اُس کے رُکن تھے،

وہ سنہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس سالانہ کے جب صدر منتخب ہوئے تو اس وقت مسلم لیگ کی حالت کیا تھی؟ اُنہوں نے اسی اجلاس میں پاکستان کا خیال ظاہر کیا تھا اس کا پسِ منظر کیا تھا، اس کے بعد اُنہوں نے قومی سیاست میں کیا حصّہ لیا؟

ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء میں ان کو دوسری گول میز کانفرنس میں رُکن مقرر کیا گیا، یہ کانفرنس بڑی اہم تھی اس میں اُنہوں نے کیا حصّہ لیا وہ صوبہ کونسل میں کئی سال ممبر رہے اس دوران میں اُنہوں نے کن معرکۃ الآرا امور و واقعات پر زوردار بحثیں کیں شاعری کے سلسلہ میں یہ دکھانا چاہیئے کہ انگلستان اور ہندوستان کے کن کن واقعات نے انکو متاثر کیا تھا اور وہ تغزل اور قومی شاعری سے فلسفہ کی طرف کیوں متوجہ ہوگئے۔

آخر زمانہ میں ہز ہائینس نواب محمد حمید اللہ خاں (بھوپال) کی فرمایش اور کفالت سے فلسفۂ قرآن لکھنے پر توجہ کی تھی اور یقیناً کچھ نوٹس اور یادداشتیں بھی لکھی ہوں گی ان کے تلامذہ اور معترفین کا فرض ہے کہ جو کچھ موجود ہو اس پر کام کریں۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے بعض مضامین کا سید راس مسعود مرحوم نے انگریزی ترجمہ کیا تھا، اس کی اشاعت کی جائے مسعود مرحوم کے کل کاغذات امتہ الرشید صاحبہ کے پاس محفوظ ہیں جو اب نواب زادہ راحت سعید خاں صاحب کی بیگم ہیں اور پاکستان میں مقیم ہیں غرض ڈاکٹر اقبال مرحوم کی زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر منزل پر کام کی ضرورت ہے صرف اس قسم کے تبصرے جیسے کہ ہوتے ہیں کافی نہیں

صنعت شاعری میں تاریخ گوئی کو عذاب شاعری کہا گیا ہے، بحر قافیہ ردیف الفاظ سب قبضہ سے باہر ہوتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ اقبال نے کچھ تاریخیں بھی کہیں یا نہیں لیکن ایک تاریخ راقم کی نظر سے گزری ہے اور اس میں ایک خاص اور قابلِ مثال جدت ہے امید ہے کہ اس کو پڑھ کر ناظرین محظوظ ہوں گے۔

جسٹس میاں محمد شاہ دین المتخلص بہ ہمایوں کا انتقال سنہ ۱۹۱۸ء میں ہوا اقبال نے حسب ذیل قطعہ لکھا:-

در گلستانِ دہر ہمایون نکتہ سنج — آمد مثال شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جُست عندلیب خوش آیندسال فوت — "علامہ فصیح" ز ہر چار سو شنید
(۳۳۴)

۳۳۴ کے عدد کو چار سے ضرب دے کر ۱۳۳۶ ہجری اعداد ہو جاتے ہیں جو سالِ وفات ہے۔

ماہر القادری

# تلفّظ کی غلطیاں

اُردو دُنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے مگر دلکشی اور جامعیت میں دنیا کی کسی زبان سے کم نہیں ہے، اس کے میٹھے بول لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں، اس کی گھلاوٹ اور سلاست میں قیامت کی تاثیر ہے، اس زبان میں بڑھنے اور پھیلنے کی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے، حرکت اور ترقی اس کے خمیر میں شامل ہے۔

فطری زبانیں خود رو پودوں کی طرح پیدا ہوتی اور نشو و نما پاتی ہیں، لوگ انھیں جان کر اور کوشش کر کے نہیں بناتے، بلکہ یہ خود بن جاتی ہیں، اُردو بھی فطرت کے اسی اُصول کے تحت وجود میں آئی، قوموں کے فطری تقاضوں نے اسے پیدا کیا، اور جب زبان بن گئی تو اہلِ علم نے اس کو طرح طرح سے سنوارا، اور یہ گھریلو زبان مدرسہ و خانقاہ اور تاریخ و فلسفہ کی زبان بھی بن گئی۔

اُردو پر بڑی نازک اور سخت امتحان کی گھڑی آئی ہے، پاکستان، جہاں اس کی سرپرستی کی زیادہ سے زیادہ توقع تھی، وہاں یہ حال ہے کہ اربابِ اقتدار ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکے کہ آیا اُردو زبان میں دفتری زبان بننے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟ اگر یہ لوگ جان بُوجھ کر ایسا کہتے ہیں تو یہ ظلم ہے اور اگر نہیں جانتے تو یہ نادانی بہت افسوسناک ہے!

بھارت ورش میں بے چاری اُردو زبان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، وہ سب پر روشن ہے، وہ تو اُردو سخت جان ہے یا یوں کہئے کہ عوام کے دلوں میں اُس نے گھر کر لیا ہے کہ دیس نکالا دینے پر بھی وہ بدستور جمی ہوئی ہے ــــــ اُردو کے مقابلہ میں ایک زبان کو گھڑا جا رہا ہے، اور وہ "نئی زبان" ــــــ بس نہ پوچھئے کان اور زبان دُہائی دینے لگتے ہیں کہ خدا کے لئے ہمیں اس اذیت سے بچاؤ، تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی زبان کے ساتھ اس قدر دردناک اور تعصب آمیز سلوک کیا گیا ہو! مگر سدا یہی حالت نہ رہے گی، رُت بدلے گی، دن پھریں گے، اور تعصب کے بادلوں کو چھٹ جانا پڑے گا، سچائی اور پریم کی دُھوپ جب نکلے گی تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی کہ وہ کتنے اندھیرے میں تھے، اُس وقت اُردو زبان کی قدر پہچانی جائے گی، اور فطرت، غیر فطری کوششوں پر غالب آ جائے گی، یہ ہو کر رہے گا اور کیا عجب ہے کہ ہماری زندگی میں ہی یہ ہو جائے۔

کہنا کچھ چاہتا تھا، اور بات کچھ اور نکل آئی، کبھی کبھی اس بے ربطی پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے، دردِ دل جب ظاہر ہونا چاہتا ہے تو وہ مصلحت اور موقعہ کی پروا نہیں کرتا، فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی، مجھے بھی اس اظہارِ غم پر معذور سمجھا جائے۔

اُردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے لفظوں کو لیکر اُس کے معنیٰ بدل دیئے ہیں، اُردو کا حال کانِ نمک جیسا ہے کہ جو اس میں گیا نمک بن کر رہ گیا ــــــ

عربی میں "غلیظ" گاڑھے کو کہتے ہیں جو "رقیق" کی ضد ہے مگر اُردو میں غلیظ ناپاک کے معنیٰ میں مُستعمل ہے "غصہ" عربی میں گلے میں کسی چیز کے اٹک جانے کو کہتے ہیں، "اُچھو" کو بھی "غصہ" بولتے ہیں مگر اُردو میں اس معنیٰ کے علاوہ اس کے ایک اور معنیٰ بھی ہیں جس کا میں کھُل کر ذکر کر دوں گا تو شاید کہا جائے گا کہ مضمون نگار بہت زیادہ شوخی پر اُتر آیا، اس اشارے کے بعد وضاحت کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، اجمال اور اشارت میں جو لُطف ہے وہ تفصیل اور وضاحت میں کہاں!

مشاعرہ (باہم شعر پڑھنا) خالص عربی لفظ ہے، مگر اُردو داں طبقہ میں جس انداز پر مشاعرے ہوتے ہیں، اہل عرب اُس سے قطعاً نا آشنا ہیں، یہ "مصرعہ طرح" پھر اُس پر گرہ، اور طرح پر غزلیں! پھر شاعروں کا غزلیں پڑھنا، لوگوں کا شورِ تحسین و ستائش! یہ خالص ہندستان کی ایجاد ہے، عرب میں شعر و سخن کی محفلوں کو "مشاعرہ" کوئی نہیں کہتا اور نہ شعر سننے کیلئے اس طرح جمگھٹے ہوتے ہیں۔

عربی میں "تنبیہ" چونکانے کو کہتے ہیں مگر اُردو میں یہ " warning " کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، فارسی میں "مُرغ" پرند کو کہتے ہیں، ہر پرند "مُرغ" ہے مگر اُردو میں "مرغ" ایک خاص پرند کو کہتے ہیں، یعنی فارسی میں جسے "خروس" کہتے ہیں اُسے اُردو میں "مُرغ" اور جسے فارسی میں "ماکیان" بولتے ہیں اُسے اُردو میں "مُرغی" بولا جاتا ہے۔

انگریزی میں " front " "سامنے" اور "محاذِ جنگ" کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے، مگر اُردو میں "خلاف ہو جانے" اور "پھر جانے" کے معنیٰ میں نہ صرف مستعمل ہے بلکہ روزمرہ بن گیا ہے۔ مثلاً:- "ارے صاحب! وہ تو مجھ سے فرنٹ ہو گیا"۔ ——— انگریزی میں " Rail " "پٹری اور لوہے کی کڑی کو بھی کہتے ہیں جو عمارت میں استعمال کی جاتی ہے اور اُردو میں ٹرین کے معنیٰ میں "ریل" بولا جاتا ہے۔ .. .. "میں پلیٹ فارم پر پہونچا ہی تھا کہ ریل چھوٹ گئی" "ٹرین" میں ایک طرح کا تکلف اور انگریزیت پائی جاتی ہے اور "ریل" سلیس ہے اور روزمرہ ہے!

## چند مثالیں

اُردو نے نہ صرف دوسری زبانوں کے لفظوں کے معنیٰ اور مفہوم کو بدل دیا اور اپنا لیا بلکہ دوسری زبانوں کی ترکیبوں، مصادر اور مُشتقات کو بھی اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیا۔ .. .. .. .. مثلاً "فوق البھڑک" "ڈاک خانہ" .. .. .. اور "خواہش" کی جمع عربی قاعدے سے "خواہشات" بنائی، "نازکی" کو "نزاکت"[1] کر لیا۔

پھر اُردو اور فارسی کے لفظوں میں اضافت دی جیسے "لبِ سڑک" "پسِ چلمن" غرض یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا گیا، بیگناہ کے انداز پر "بے آس" اور "بے آسرا" بنایا، عربی کے "لا" سے "لاچار" کی ترکیب وضع کی۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ "فوق البھڑک" کی ترکیب غلط ہے، یقیناً غلط ہے، مگر اُردو زبان کے روزمرہ میں یہ ترکیب داخل ہو گئی ہے اس لئے اس کا استعمال جائز ہے، "فوق البھڑک" کے مفہوم کے لئے اس سے زیادہ بہتر اور مفہوم کی صحیح ترجمانی کرنے والا لفظ ہمارے یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس قسم کی غلط ترکیبیں جو کثرتِ استعمال سے چل پڑتی ہیں، یہاں تک کہ وہ روزمرہ بن جاتی ہیں اُن کو سامنے رکھ کر دوسری ترکیبیں بنانا جائز نہیں، مثلاً "فوق البھڑک" کے وزن پر کوئی "فوق الچمک" کہنے لگے تو یہ ہرگز درست نہ ہوگا۔

اسی طرح خواہش کی جمع "خواہشات" اس لئے غلط ہے کہ فارسی لفظ کو عربی انداز پر جمع بنایا گیا ہے مگر اُردو زبان میں یہ "جمع" اس طرح شامل ہو گئی ہے کہ اُسے اب نکالا نہیں جا سکتا، لیکن خواہشات کے وزن پر جو کوئی "فرمودات" اور "گزارشات" بولتا ہے وہ غلطی کرتا ہے، یہ لفظ سننے میں تو کبھی کبھی آتے ہیں مگر ابھی روزمرہ نہیں بنے ہیں اور اس غلطی کو روکا جا سکتا ہے۔

"نازکی" فارسی لفظ ہے عربی انداز پر اُسے "نزاکت" بنا لینا غلط ہے، لیکن اُردو میں یہ لفظ شامل ہو چکا ہے اور نہ صرف زبان اور روزمرہ میں بلکہ یہ لفظ اُردو شاعری کی جان ہے۔

---

[1] اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا۔

یار کا پاسِ نزاکت دلِ ناشاد رہے
نالۂ تھمتا ہوا، رکتی ہوئی فریاد رہے

اب کوئی "نازکی" کے وزن پر تازگی سے "تازگیت" یا چاشنی سے "چاشنیت" بناتا ہو تو وہ اردو زبان کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ لفظوں کی ترکیب اور اشتقاق کے سلسلہ میں بعض غلطیاں جو زبان میں قبول کر لی گئی ہیں یا خود بخود بار پا گئی ہیں اُن کو کلیہ اور قاعدہ بناکر، اُسی انداز پر دوسرے لفظ وضع کرنا اور "ترکیبیں" بنانا حماقت آمیز غلطی ہو۔

**تلفظ کی تبدیلی**

اُردو زبان نے جس طرح دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنایا ہو، اسی طریقہ سے دوسری زبان کے لفظوں کے تلفظ کو بھی بدل دیا ہو، مثلاً "Report" کو اردو میں "رپوٹ" بولتے ہیں اور تھانہ میں جو کسی حادثہ اور واقعہ کی اطلاع دی جاتی ہو، اُسے اُردو میں "رپٹ" کہتے ہیں، اکبر الٰہ آبادی کا بہت مشہور شعر ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجاکے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خُدا کا اِس زمانے میں

"MACHINE" کو اُردو میں "مشین" بہ وزن "حسین" اور "متین" بولتے ہیں، "ENGINE" "(انجن)" "بندھن" اور "اچکن" کے وزن پر بولا جاتا ہو، اس "بولے جانے" سے اُن افرنگ زدہ لوگوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہو جو اپنی گردن میں انگریزی کی طرح خم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عربی میں "میت" "کثرت" اور "نفرت" کے وزن پر بولا جاتا ہو———— اوپر جو کچھ کہا گیا ہو وہ تو تمہید تھی، اصل میں یہ مضمون اسی اُردو "تلفظ" کے لئے لکھا گیا ہو، اور یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کی داستان بھی سُن لیجئے!

اس آتشیں انقلاب نے جس سے ہم سب گزرے ہیں، قصر نشینوں کو خاک نشین بنا دیا، جو لوگ اشرفیوں سے کھیلتے تھے اور دن رات سونا اُچھالتے تھے، آج فٹ پاتھ پر بیڑیاں بیچتے ہیں، زندگیاں کچھ سے کچھ ہوگئیں قوموں اور انسانوں کے حالات اتنے دگرگوں تو کبھی کاہیکو ہوئے ہوں گے!

کراچی میں بنس روڈ کے چوراہے سے عیدگاہ کو جو سڑک آتی ہو، اُس کے فٹ پاتھ پر، میرے ایک حیدرآبادی شناسا نے لکڑی کا کیبن لگاکر اُس میں کچھ کتابیں رکھ لی ہیں، یہ دنیا ہو کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں ؎

گہے بر فراز وگہے بر نشیب!

ایک دن شام کو میں اُن کے کیبن پر گیا، مقصود استفسارِ حال تھا، وہاں کتابیں دیکھیں تو جی بے قرار ہوگیا، مجھ سے پھر ضبط نہ ہوسکا، میں اس مرض میں اُس زمانے سے گرفتار ہوں جبکہ مجنوں دیوارِ دبستاں پر لام، الف لکھا کرتا تھا ———— ہاں! تو میں کتابیں دیکھنے لگا، کتابوں کے ڈھیر میں ایک چھوٹی سی کتاب نظر آئی، اِدھر اُدھر سے دو چار صفحے پڑھے، کتاب پسند آگئی، اس لئے کہ کتاب اچھی تھی اور دوسری بات یہ کہ دام بھی زیادہ نہیں دینے پڑے۔

کتاب لیکر سیدھا گھر آیا۔ جلدی سے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگی، ٹوپی پلنگ پر پھینکی اور میں کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگیا، اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی، دروازہ کھولا، دیکھا تو تین چار جاننے والے کھڑے ہیں، دل نے کہا "آپ لوگ بہت نا وقت آئے" مگر زبان "تشریف لائیے آیئے" "آیئے" کہتی رہی، اسے آپ "منافقت" کہہ سکتے ہیں مگر اس کے بغیر چارہ کار کیا ہے، معاشرت میں یہ چیز ناگزیر ہو— جو کچھ دل میں ہو اُسے آدمی جوں کا توں ہر کسی سے کہہ دیا کرے تو معذرت اٹھایا ہوا کریں۔

بار ہا کا تجربہ ہے، کہ جب آدمی کا دل چاہتا ہے کہ اس وقت کوئی جنسے بولنے کے لئے ہوتا تو اس وقت کوئی خدا کا بندہ نہیں آتا، بس اکیلے پڑے رہئے اور سوچا کیجئے اور جب کوئی کام اور مصروفیت ہوتی ہے تو وا دبدا کر کوئی نہ کوئی آدھمکتا ہے۔

یہ آدھ گھنٹہ، ایک دن کے برابر گزرا، کتاب میرے ہاتھ میں تھی اور اُن دوستوں سے باتیں کر رہا تھا، انھوں نے جانے کی اجازت چاہی تو میں خود اُٹھ کھڑا ہوا، اگر وہ لوگ ذہین ہوتے تو بُرا مان جاتے کہ یہ ہمیں ٹالا جا رہا ہے، بعض وقت آدمی کا کم عقل مند ہونا مفید ثابت ہوتا ہے۔

کتاب ایک نشست میں پڑھ کر دم لیا، معلومات حاصل ہونے سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ اپنا پندار ہمہ دانی بار بار ٹوٹا، اور بہت سے لفظوں کے "اعراب" میں اپنی جہالت کا اعتراف کرنا پڑا۔

کتاب کا نام ہے "رسالہ "تصحیح اللغات" موسوم باسم تاریخی "اصلاح ضروری"، "اصلاح ضروری" کے ۱۳۴۶ عدد ہوتے ہیں، لہذا یہی سالِ تصنیف (۱۳۴۶ھ ہجری یعنی ۱۹۲۹ء) میں یہ کتاب نظامی پریس بدایوں میں چھپی ہے۔

جناب مولوی رفیع احمد عالی اس کتاب کے مؤلف ہیں، حضرت مولانا احسن مارہروی نے "تعارف" لکھا ہے جو معلومات آفریں اور پُر مغز ہے، مولوی رفیع احمد عالی مرحوم بدایوں کے رہنے والے تھے ضلع بدایوں ہی کی ایک تحصیل گنور میں وکالت کرتے تھے، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (اُستاد شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) جن کا ایک بلند پایہ مضمون فاران کے اسی شمارے میں شریک ہے، جناب عالی کے لائق فرزند ہیں، دوسرے بیٹے جناب آفتاب احمد بدایونی ہیں، جوان دنوں یو۔پی کے کسی ضلع میں سشن جج ہیں، سشن جج ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے، آجکل تو بلاشان گمان کے لوگ بیٹھے بٹھائے وزیر ہو جاتے ہیں، آفتاب صاحب کا ذکر اس لئے درمیان میں آگیا کہ وہ اتنی پاکیزہ اور شستہ غزل کہتے ہیں کہ ایسی غزلیں کم سُننے اور دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا گھرانا ہی شعر و ادب اور علم و فن کا گہوارہ ہے۔

"تصحیح اللغات" کی ضخامت سو صفحوں کی ہے، فاضل مولف نے لکھا ہے کہ ان چند صفحوں کے لئے صراح، منتخب اللغات، منتہی الارب، برہانِ قاطع، فرہنگ جہانگیری، غیاث اللغات، اور چراغ ہدایت وغیرہ لُغات سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے، اور لغات میں جہاں اختلافات نظر آئے، وہاں زیادہ مشہور اور مستند تر کتابوں کو ترجیح دی گئی۔ صاحبِ تالیف کی کوشش ہر آئینہ ستایش و قدردانی کی مستحق ہے، یہ کتاب اُردو زبان میں ایک مفید اضافہ ہے، اور اگر میری معلومات صحیح ہیں تو اس موضوع پر شاید "تصحیح اللغات" پہلی کتاب ہے۔

"تصحیح اللغات" میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں، جن کو عوام تو کیا خواص بھی صحیح اعراب کے ساتھ نہیں بولتے، اور نہ صرف یہ بلکہ اُن لفظوں کے اعراب کی صحت اور عدم صحت سے واقف بھی نہیں ہیں، یعنی اس منزل میں سوار اور پیادے اور عوام و خواص ایک ہی جیسے ہیں!

میں نے "تصحیح اللغات" سے اُن لفظوں کو چُنا ہے، جو عام طور پر بول چال اور لکھنے پڑھنے میں استعمال کئے جاتے ہیں، مگر اُن کا صحیح تلفظ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، کتاب میں یہ لفظ جس طرح لکھے ہیں، اُن کی ہو بہو نقل کی جاتی ہے۔

| الفاظ | معانی | کیفیت صحت و غلطی |
|---|---|---|
| آخَر | اور، دیگر | بہ فتح خائے معجمہ ہے، بکسر خا اس معنی میں غلط ہے |
| آدَمی | انسان، منسوب بہ آدم | بہ فتح دال صحیح ہے، بہ سکون غلط ہے |
| آصَف | نام وزیر حضرت سلیمان علیہ السلام | بہ فتح صاد مہملہ، بکسر صاد غلط ہے |

| الفاظ | معانی | کیفیت صحت و غلطی |
|---|---|---|
| اِخوان | بھائی، برادران، جمع اَخ کی ہے | بکسر اوّل ہے، بفتح اوّل غلط ہے |
| ارجمند | صاحب مرتبہ (ارج یا ارز + مند) | بسکون جیم ہے، بضم جیم غلط ہے |
| اَزرَق | نیلگوں | بفتح اوّل و سکون زائے معجمہ مقدم بہ رائے مہملہ ہے، رائے مہملہ کو زائے معجمہ پر مقدم استعمال کرنا غلط ہے[۵] |
| اِقلیم | ہفتمیں حصّہ ربع مسکوں، یعنی زمین آباد | بکسر اوّل ہے، بفتح اوّل غلط مستعمل ہے |
| بَرادر | بھائی | بفتح اوّل، بکسر صحیح نہیں ہے |
| بَرّاق | چمکدار | بفتح اوّل و تشدید رائے مہملہ ہے، بضم اوّل غلط ہے |
| بَشَرہ | ظاہر پوست انسان | بفتح اوّل و ثانی و ثالث ہے، بضم اوّل و سکونِ ثانی غلط ہے |
| بَقراط | نام حکیم مشہور | بفتح اوّل ہے، بضم اوّل غلط ہے |
| بَکارت | دوشیزگی | بفتح اوّل ہے، بکسر اوّل غلط مستعمل ہے |
| بَلخ | نام مشہور شہر | بفتح اوّل و سکونِ ثانی ہے، بفتح ثانی غلط ہے |
| بَنان | سرہائے انگشتان یعنی پورے | بفتح اول ہے، بضم اوّل غلط مستعمل ہے |
| پَروردگار | خالق | بہ سکون دال ہے، بکسر دال غلط ہے |
| پَشّہ | مچھر | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط مستعمل ہے |
| پَلاؤ | طعام معروف | بفتح اول ہے بکسر غلط ہے |
| پَنجرہ | پرندوں کا گھر، جو چیز جالی دار ہو | بفتح اول ہے، بکسر اوّل غلط ہے |
| تَرِکہ | مال متروکہ مُردہ | بفتح اول و کسر ثانی ہے، اس معنی میں بسکون ثانی غلط مستعمل ہے |
| تَفتہ | گرم | بفتح تائے فوقانی ہے، بالضم غلط ہے |
| ثَقالت | گرانی، بوجھ | بفتح اوّل ــــ بکسر غلط مستعمل ہے |
| ثَمَرہ | پھل | بفتحات ثلثہ ہے، بہ سکون میم صحیح نہیں |
| جَدَل | لڑائی، جنگ | بہ فتحتین ہے، بکسر اوّل غلط ہے |
| جِدّ | کوشش | بہ کسر جیم، و تشدید دال، بہ فتح غلط ہے جد بفتح جیم بہ معنی دادا نانا، نصیب، دریا کا کنارہ وغیرہ صحیح ہے |
| جُدّہ | نام مقام بر ساحلِ عرب | بضم اوّل و دال مشدد ہے، عوام بہ فتح اوّل بولتے ہیں |
| جِراحت | زخم | بہ کسر جیم ہے، بہ فتح غلط ہے |
| جَرح | اعتراض کرنا | بالفتح ہے، بکسر غلط ہے |
| جِزیہ | وہ رقم جو اہلِ ذمہ سے لی جائے | بکسر اوّل و سکون ثانی و فتح ثالث، بفتح اوّل غلط ہے |
| چِکاں | ٹپکنے والا | بہ کسر اوّل بہ فتح غلط ہے |

[۵] ارزق غلط ہے، ازرق صحیح ہے۔

| الفاظ | معانی | کیفیت صحت و غلطی |
| --- | --- | --- |
| چنار | درخت ہے، جس کے برگ پنجۂ انسان کی شکل ہوتے ہیں | بفتح اول ہے، بکسر اوّل غلط ہے |
| حاتم | نام مرد سخی مشہور | بکسر تائے فوقانی، بفتح صحیح نہیں ہے |
| حقارت | خواری، ذلیل سمجھنا | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط مشہور ہے۔ |
| حماقت | بے عقلی | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط ہے |
| حنوط | خوشبو جو مُردے کے جسم پر ملتے ہیں | بفتح اوّل ہے، بضم غلط مستعمل ہے |
| خاوند | خداوند، صاحب | بفتح واوَ ہے، بکسر غلط مستعمل ہے |
| خدیجہ | نام زوجۂ مطہرہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم | بروزن "کریمہ" ہے بروزن "زُبیدہ" غلط مستعمل ہے |
| خرقہ | جامہ کہنہ، گدڑی | بکسر اوّل ہے، بفتح غلط ہے |
| خزاں | معنی معروف۔ موسم سرد[1] | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط ہے |
| خزانہ | گنجینۂ مال خانہ | بکسر اوّل ہے، بفتح اوّل غلط ہے، البتہ "خزینہ" بفتح اوّل ہے کسی ادیب نے لکھا ہے "الخزانۃ لا یفتح" |
| خوگر | عادی، مخفف خوگیر | بکسر کاف فارسی ہے، بفتح غلط ہے |
| دجلہ | دریا جو بغداد کے نیچے بہتا ہے | بکسر دال مہملہ ہے |
| درجہ | مرتبہ، پایا | بفتح اوّل ودوم وسوم ہے، سکونِ دوم غلط مستعمل ہے |
| درخشاں | روشن، لرزاں | بضم اوّل ودوم ہے، بفتح دوم غلط ہے |
| دروغ | جھوٹ، بہتان | بضم اوّل ہے، بفتح غلط مستعمل ہے |
| درون | اندر، درمیاں | بفتح اوّل وضم دوم ہے، بضم اوّل غلط مستعمل ہے |
| دہش | سخاوت | بکسر اوّل وثانی ہے، بفتح ثانی غلط ہے |
| ذوالفقار | نام حضرت علی (کرم اللہ وجہ) کی تلوار کا ہے | بفتح فا ہے، بکسر غلط مستعمل ہے |
| ربودن | زبردستی اور جلدی کسی چیز کو لے جانا | بضمتین ہے، بفتح اول غلط مستعمل ہے |
| رخشاں | روشن | بضم اول ہے، بفتح اول غلط ہے |
| رستاخیز | قیامت | بفتح رائے مہملہ ہے، بضم غلط مستعمل ہے |
| رعایا | جمع رعیت کی | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط مستعمل ہے کیونکہ اس وزن کی کوئی جمع بکسر اوّل |
| رمل | نام علم مشہور | بفتح اوّل وسکون ثانی ہے |
| رمضان | نام ماہ | بفتح اوّل ودوم ہے، بہ سکون میم خطا ہے |
| رواج | دستور | بفتح اوّل ہے، بالکسر غلط رواج ہے |
| رؤسا | جمع رئیس، سردار | بروزن "عُلما" ہے، عوام "رُؤسا" بروزن "ظہورا" بولتے ہیں |
| زمرد | جوہر سبز رنگ مشہور | بہ ضم اوّل ودوم وتشدید رائے مہملہ مفتوح ہے، ضم رائے مہملہ بھی صحیح ہے لیکن بفتح اوّل |

[1] اردو میں تو "پت جھڑ" کے معنی میں بولتے ہیں　(م۔ق)

| لفظ | معنی | کیفیت |
| --- | --- | --- |
| سائس | نگہبان، خصوصاً گھوڑوں کا | بروزن قاصر صحیح ہے، سائیس غلط ہے |
| سِرِشت | طینت، خمیر | بکسر اول وثانی ہے، بفتح غلط مستعمل ہے |
| سِرِشک | آنسو | بکسر تین ہے، بفتح اوّل غلط ہے |
| سَرِقہ | چوری | بفتح اوّل وکسر ثانی ہے، بہ سکون ثانی غلط ہے |
| سُرُود | نغمہ، راگ | بضم اول و دوم ہے اور واو معروف یا مجہول دونوں طرح صحیح ہے، بفتح اوّل غلط مستعمل ہے |
| سُرُوش | نام جبرئیل علیہ السلام، اور ہر فرشتہ پیغامِ خدا لانے والا | بضم اوّل و دوم ہے، بفتح اول غلط مستعمل ہے |
| سُفارِش | شفاعت | بہ ضم اوّل، وکسرِ "را" ہے، بہ کسر اوّل غلط ہے |
| سِفید | سپید، ابیض | بہ کسر اوّل و دوم ہے، بفتح اول و دوم غلط ہے |
| سَقراط | نام حکیم مشہور | بفتح اوّل ہے، بہ ضم اوّل غلط ہے |
| سُکینہ | نام دُختر سیدنا امام حسین علیہ السلام | بروزن زبیدہ ہے، بروزن "کریہ" غلط ہے |
| شَعبَدہ | بازی سحر | بہ فتح شین معجمہ و فتح بائے موحدہ ہے، بہ ضم اول و سکون با غلط ہے |
| شِکَرہ | مُرغ شکاری | بہ کسر شین معجمہ و بہ فتح کاف عربی، بہ سکون کاف غلط ہے۔ |
| شُکوہ | شان و شوکت | بہ ضم اوّل و دوم ہے، بہ کسر اوّل بہ معنی مذکور غلط مستعمل ہے اُس کے معنے بیم و ترس کے ہیں۔ |
| صَدَقہ | خیرات | بہ فتح اول و ثانی و ثالث ہے، بہ سکون ثانی غلط ہے |
| ضَرورت | حاجت | ہر دو بہ فتح اوّل ہیں، بضم غلط مستعمل ہیں۔ |
| ضَروری | منسوب بہ ضرورت | |
| طُحال | مرض تلی کا | بہ ضم اوّل ہے، بہ کسر اوّل غلط مستعمل ہے، اُس کے معنے تلی کے ہیں نہ تلی کی بیماری کے! |
| طَعام | کھانا | بہ فتح اوّل ہے، بالضم غلط ہے |
| طَلایہ | فوج جو شب کو حفاظتِ شہر کرے | بہ فتح اوّل ہے، بہ کسر اول غلط مستعمل ہے |
| طُمانینت | سکونِ قلب | بہ ضم اوّل وکسر نون اوّل و یائے تحتانی معروف و فتح نون ثانی ہے، بہ فتح اوّل و بہ یک نون "طمانیت" غلط ہے۔ لیکن صُراح میں بہ حذف یک نون ہے۔ |
| ظُلُمات | ظلم کی جمع | بہ ضمتین ہے، بہ سکون لام صحیح نہیں |
| عَجَلَت | جلدی کرنا | بضم غلط مستعمل ہے، بفتح اوّل و دوم و سوم ہے نیز بہ کسر اوّل ہے |
| عُشرِ عَشیر | حصہ دہم از دہم یعنی $\frac{1}{100}$ | لفظ اوّل بوزن "شکر" و لفظ دوم بروزن "فقیر" ہے، لفظ اوّل بہ فتح عین غلط مستعمل ہے۔ |
| عِیادت | بیمارپُرسی | بہ کسر اوّل ہے، بہ فتح اوّل غلط ہے |
| عِیاں | آنکھ سے دیکھنا، مجازاً ظاہر | بہ کسر اوّل ہے، بہ فتح اوّل غلط مستعمل ہے۔ |

| الفاظ | معانی | کیفیت صحت و غلطی |
|---|---|---|
| قرار | بھاگنا | بہ کسر فا ہے، بالفتح غلط ہے |
| فرشتہ | ملک، اصل فرشتہ تھا یعنی خدا کا بھیجا ہوا | بہ کسر اوّل و کسر دوم ہے، بہ فتح اوّل غلط مستعمل ہے |
| فریب | مکر، عشوہ، طلسم، دغا | بکسرتین و یائے مجہول ہے بفتح فا غلط ہے |
| فریفتہ | زیب کھانا مجازاً عاشق ہونا زیب خوردہ عاشق | ہر دو بکسر اول و دوم و یائے مجہول ہیں، بہ فتح اوّل غلط ہیں |
| فریدوں | نام بادشاہ جس نے ضحاک کو قتل کیا تھا | بکسرتین ہے، بفتح اوّل غلط ہے |
| قبرستان | گورستان | بکسر رائے ہے، بضم[1] غلط ہے |
| قبول | ماننا | بفتح اول ہے، بضم اول اس معنی میں غلط مستعمل ہے اس کے معنیٰ آگے آنا۔ ملحوظ رہے قبول کے علاوہ اس قبیل کے تمام مصادر بضم اوّل مستعمل ہیں جیسے دخول، ظہور، شروع، جنون، عموم۔ |
| کابک | آشیانہ عموماً و خانہ کبوتراں خصوصاً | بضم بائے موحدہ ہے، بفتح غلط ہے |
| کلیسا | پرستش گاہ کفار | بکسر اوّل و کسر ثانی و یائے مجہول ہے، بفتح اوّل یائے معروف غلط مستعمل ہے۔ |
| محبّت | دوستی، الفت | بفتح اوّل ہے، بضم اوّل غلط مستعمل ہے۔ |
| مزدور | اجیر | بضم میم ہے، بفتح غلط مستعمل ہے۔ |
| مشاعرہ | باہم شعر پڑھنا | بضم میم و فتح عین بروزن مفاعلہ ہے بفتح میم و کسر عین غلط ہے، اسی وزن پر ہیں، مقابلہ، محاکمہ، مناظرہ وغیرہ جن کو عوام غلط بولتے ہیں۔ |
| مشورہ | صلاح پرسی | بفتح میم و سکون شین معجمہ و ضم واؤ ہے، بفتح واؤ یا بالکسر واؤ غلط ہے، نیز فتح میم و ضم شین و سکون واؤ آیا ہے، |
| مصرف | جگہ خرچ کرنے کی | بفتح میم و کسر رائے مہملہ ہے، بفتح رائے غلط مستعمل ہے |
| مع | ساتھ | بہ فتحتین ہے "مع" "ہا" کی زیادت کے ساتھ صحیح نہیں |
| معدن | کان یعنی کھان | بفتح میم و کسر دال ہے بفتح دال غلط ہے، یہی حال مخزن کا ہے۔ |
| مقصد | جائے قصد | بفتح اوّل و کسر صاد ہے، بفتح صاد غلط ہے |
| ملول | غمگین | بفتح اوّل ہے، بضم اوّل غلط ہے |
| ممالک | مقامات سلطنت؛ جمع مملکت کی | بفتح اوّل ہے، بضم اوّل غلط مستعمل ہے |
| مہبط | جگہ نیچے آنے کی | بفتح میم و سکون "ہائے" مہملہ و کسر "بائے" موحدہ و "طائے" مہملہ ہے، بفتح "بائے" موحدہ غلط ہے۔ |

[1] مگر عام طور پر قبرستان کی "ر" کو زبر کے ساتھ بولتے ہیں۔ "م"

| الفاظ | معانی | کیفیت صحت وغلطی |
|---|---|---|
| مُہیب | مرد سہمناک جس سے لوگ خوف کریں | بفتح میم وکسر "ہائے" مہملہ ہے، بضم میم غلط ہے |
| نِسریں | پھول سپید خوشبودار سیوتی | بکسر نون ہے، بفتح غلط مستعمل ہے |
| نِشتر | آلۂ فصد، مخفف نیشتر | بکسر اوّل ہے، بفتح غلط مستعمل ہے |
| نَشو ونما | اُگنا اور بڑھنا | لفظ "نما" بفتح نون نمو سے ہے بضم "نون" غلط مستعمل ہے |
| نُمرود | نام بادشاہ کافر | بضم نون ہے، بفتح غلط مستعمل ہے |
| نَوار | نواڑ چار پائی بُننے کی | بفتح اول نیز بضم اول صحیح ہے، بکسر اوّل غلط ہے |
| نِوشت / نِوشتن | تحریر، لکھائی، اور لکھا ماضی / نوشتن لکھنا (مصدر) | بکسر نون، بفتح نون غلط مستعمل ہیں، بفتح نون بمعنے بیٹھنے کے ہیں۔ |
| نَیام | تلوار کا میان | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط مستعمل ہے |
| وَالِدہ، والِدین | ماں ۔ ماں باپ | بہ کسر لام ہے، سکون لام غلط ہے |
| ہَجر | جُدائی | بفتح اوّل ہے، بکسر غلط مستعمل ہے |
| ہِراوُل | فوج میں جو سب سے آگے ہو | بکسر اول وضم واؤ ہے، بفتح واؤ غلط مستعمل ہے۔ |
| ہَندَسہ | علم مشہور | بفتح اول وثالث ہے معرب اندازہ بالکسر غلط مشہور ہے |
| یُورُش | دُشمن پر حملہ کرنا | بضم "یا" و "واو" غیر ملفوظ وضم "رائے" مہملہ ہے، بکسر رائے مہملہ غلط مستعمل ہے۔ |

## حرفِ آخر

میرا گمان نہیں یقین ہے کہ ان لفظوں کو (جن کے اعراب کی تصحیح اُوپر درج کی گئی ہے) پڑھ کر بہت سوں کو اپنی لاعلمی کا احساس ہوگا، اور بعض الفاظ کے ہجے تو عجیب معلوم ہوں گے، نہ صرف عجیب وناما نوس بلکہ ایسے بھی کہ کانوں نے جنھیں کبھی سُنا ہی نہیں!

اعراب وتلفظ، معانی وبیان اور زبان ومحاورہ کے سلسلہ میں پہلا اُصول تو یہ ہے کہ جو چیز غلط ہے، اور اُس نے چاہے "غلط العام" کی حیثیت ہی کیوں نہ اختیار کر لی ہو، اُس کے استعمال میں اگر کوئی احتیاط برتتا ہے، تو اُسے "وہمی" نہیں کہا جائے گا، احتیاط بہرحال اولیٰ ہے ——— مگر اس کے ساتھ ہی جو لفظ بول چال اور لکھنے پڑھنے میں اس طرح شامل ہوگئے ہیں کہ اُن کی حیثیت "جزو لاینفک" کی ہوگئی ہے، تو اُن کے استعمال کرنے والوں کو غلط کار نہ کہیں گے، کوئی بہت زیادہ شدید احتساب سے کام لے تو زیادہ سے زیادہ اس کو بے احتیاطی کہا جا سکتا ہے!

بعض الفاظ مثلاً "سید" اور "میت" ایسے ہیں کہ جن کی "ی" کو زیر ہے اور نہ صرف عوام بلکہ بڑے بڑے علماء (جن کی مادری زبان اُردو ہے) ان کو "زبر" کے ساتھ "بہتر" اور "برتر" کے وزن پر بولتے ہیں، اس قسم کے الفاظ اسی طرح بولے جانے چاہئیں جس طرح ہم سُنتے اور بولتے آئے ہیں، بلکہ ہم تو یہاں تک وسعت دینے کو تیار ہوں کہ اگر "بیجد" اور "محبت" کے قوافی میں نظم، غزل یا رُباعی کہی جا رہی ہو، اور کسی نازک اور دلنشین مفہوم کے لئے "سید" اور "میت" کی ضرورت محسوس ہوتی ہو، تو ان لفظوں سے قافیہ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

"سید" اور "میت" کی طرح "پلاؤ" اور "پنجرہ" جیسے لفظ ہیں کہ ان کو اگر صحت کے ساتھ بولیں یعنی پُلاؤ کو "پلاؤ"

(پ" بالفتح) اور "پنجرہ" کو "پَنجرہ" ("پ" زبر کے ساتھ) کہیں تو سُننے والے ہنسیں گے اور پہلے تو خود بولنے والے کی گویائی سماعت اور وجدان کو یہ تلفظ نامانوس بلکہ گراں معلوم ہوگا۔

"اخ" کی جمع "اخوان" ہے، اس کے "الف" کو بالفتح بولنا جہالت کی دلیل ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے، اور یہ لفظ روزمرہ میں بھی داخل نہیں ہوا ہے، یہی حال "قَبول" "سِرِشت" "محبت" "چِنار" جیسے لفظوں کا ہے کہ ان کو صحیح تلفظ ہی کے ساتھ بولنا چاہیئے، اور اہلِ علم ان کو صحیح اعراب کے ساتھ ہی عموماً بولتے ہیں، ایسے لفظوں کے لئے "روزمرہ" کی بولی ٹھولی کی صحت کرنی ہوگی، اور عوام کی تقلید نہ کی جائے گی!

گزشتہ چند سالوں میں ہم[1] نے بعض لفظوں کی اصلاح کی ہے، اور یہ اصلاح مقبول ہوئی ہے... مثلاً "فِضا" کو لوگ اب "فَضا" (ف بالفتح) اور "شِکوہ" کو "شَکوہ" ("ش" بالفتح) بولنے لگے ہیں، اسی طرح "خِزاں" کو "خَزاں" ("خ" زبر کے ساتھ) بولنا چاہیئے، وجدان، زبان اور سامعہ بڑی آسانی کے ساتھ اس تبدیلی اور صحت کو قبول کرلیں گے۔

"معدن" اور "مخزن" کی "د" اور "ز" کو "بالکسر" بولنا بھی اُردو زبان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے، ایسے لفظ اسی طرح بولے جانے چاہئیں، جس طرح بولے جاتے ہیں، بلکہ شعراء "معدن" اور "مخزن" کو "چندن" اور "آنگن" کے قوافی کے ساتھ بھی نظم کرسکتے ہیں، اور ضرورت کے وقت شعراء کو اس کا بھی لائسنس حاصل ہے کہ ان لفظوں کو صحیح اعراب کے ساتھ (بروزن "باطن") استعمال کریں۔

اضطراب، انتظار، اختصار، وغیرہ لفظوں کا تیسرا حرف (ط، ت) اگر اعراب کے جبر کے ساتھ پڑھا جائے تو ان حرفوں کو بالکسر پڑھنا چاہیئے، ورنہ پھر اس طرح پڑھیں اور بولیں جیسے اُردو میں عام رواج ہے، اس صُورت میں ان حرفوں کے اعراب ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، مثلاً "اضطراب" کی "ط" پر نہ تو "زبر" وارد کریں اور نہ "زیر" قریب قریب سکون کا تلفظ! جو لوگ ان حرفوں کو بالفتح بولتے ہیں، وہ جہالت کا ثبوت دیتے ہیں، ہم نے بعض مشاہیر شعراء کو اس غلطی میں مبتلا پایا ہے۔

اُردو تحریر میں عام طور پر اعراب لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر کہیں ضرورت پڑ جائے تو صحیح اعراب لگانے چاہئیں اعراب لگانے میں اس کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ وہ لفظ اُردو میں کس طرح بولا جاتا ہے، جس زبان کا لفظ ہے، اُسی زبان کے اعراب کو ظاہر کیا جائے گا ——— "مُشاعَرہ" کو اشتہاروں اور پوسٹروں میں "مُشاعِرہ" ("ع" بالکسر) پڑھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

آپ اس خشک بحث سے اُکتا گئے ہوں گے، مگر اس کا مجھے اعتماد ہے کہ "فاران" کے ناظرین بازاری اور فلمی لٹریچر کے خوگر نہیں ہیں، اسی اعتماد کی بنا پر یہ مضمون رسالہ میں شامل کیا گیا۔

مذہب اور اخلاق چاہتے ہیں کہ چیزیں صحیح طریقہ پر استعمال کی جائیں، یعنی جو چیز جس مقصد اور جس غرض کے لئے بنی ہے اُس سے ٹھیک وہی کام لیا جائے، تلوار سے اگر کوئی نادان ترکاری کاٹنے لگے، تو یہ تلوار کا غلط استعمال ہے اور اس طرح ترکاری کے ساتھ اُنگلیاں کٹ جانے کا بھی احتمال ہے ——— "الفاظ" بھی صحیح استعمال چاہتے ہیں، بولنے میں، لکھنے میں، تقریر میں، شعر و افسانہ میں، فلسفہ و منطق میں، حکایت و مزاح میں، غرض ہر صنف میں اور ہر محل پر لفظوں کو صحیح برتنا چاہیئے، اس لئے لفظ و بیان کی صحت کی کوشش، نماز، روزے کی طرح دینی ضرورت نہیں ہے، مگر اس

---

[1] "ہم" سے مُراد ہیں ادیب، شعراء اور مقررین!

کی اباحت اور استحباب کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور پھر جب یہ نیت اور یہ ارادہ ہو کہ لفظوں کی صحت کو۔ "مثنوی زہرِ عشق" میں نہیں۔ "مثنوی چراغِ کعبہ"[۵] میں اور "لیلیٰ کے خطوط" میں نہیں، "الجہاد فی الاسلام" میں صرف کیا جائے گا، تو یہ کوشش اور زیادہ نیک اور مفید بن جاتی ہے، حق کے اظہار اور صداقت کی تبلیغ کے لئے دل نشین انداز اور صحیح زبان کام میں لانی چاہیئے، اس لئے کہ حُسنِ صحت حق کی بہت بڑی خصوصیت ہے!



[۵] محسن کاکوروی کی نعتیہ مثنوی

# جسؓ پر انسانیت کو ناز ہے!

مولانا شبلی نعمانی

افلاس سے تھا سیدۂؓ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکّی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اَٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جنابِ رسولِ خداؐ کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے — کل کس لئے تم آئیں تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — (حیدرؓ) نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن — جن کا کہ صفّۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں — میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانامؐ تھا

عاصی کرنالی

# اذانِ بُتکدہ

وہی ریا، وہی تسبیح و خرقۂ سالوس
میں خانقاہ سے افسوس ہو چکا مایوس

شعور و ذہن سے ٹکرا کے جو گزرتی ہیں
خدا کرے کہ وہ چیخیں تجھے بھی ہوں محسوس

مرے شعور کو اے دوست مُعتبر نہ سمجھ
میں کر رہا ہوں ستاروں کی دھڑکنیں محسوس

جمالِ دوست ابھی دل کی رہگزر میں کہاں
کہ اس مقام سے گزرے ہیں رنگ و بو کے جلوس

مری نظر میں ہیں فریاد و اشک کے طوفاں
تمھاری موجِ تبسّم سے میں نہیں مانوس

کلی کا رنگ پریدہ، گلوں کے دامن چاک
بہار کیا ہے، چمن کا لُٹا ہوا ناموس

یہ محفلیں، یہ شبستاں، یہ عشرتوں کے محل
بھڑک نہ جائے کسی رات شعلۂ فانوس

اذانِ بُتکدہ ہے میری شاعری عاصی!
کہ میں نے توڑ دیا سحرِ نالۂ ناقوس

ذہین بے پدی

# محبت

میں سچ کہتا ہوں اے یارانِ محفل
مرا مقصد دل آزاری نہیں ہے

محبت میں دوا کا ڈھونڈنا کیا؟
محبت کوئی بیماری نہیں ہے

وہ دل کا زخم جو ہو جائے اچھا
یہ مانا زخم ہے کاری نہیں ہے

محبت عینِ دیں ہے عینِ ایماں
خرد کے بُت کی زنّاری نہیں ہے

محبت میں ہو سب کچھ لیکن اے دوست!
خرد کی مصلحت کاری نہیں ہے

چھپانے سے نہیں چھپتی محبت
یہ انگارا ہے چنگاری نہیں ہے

محبت دل کا کہنا ماننا ہے
محبت دل سے غدّاری نہیں ہے

محبت میں زمانہ سازیاں کیا؟
محبت میں ریاکاری نہیں ہے

محبّت سے سدا ہارا زمانہ
محبت آج تک ہاری نہیں ہے

فضل احمد کریم فضلی

# واردات

یہ اچھی پردہ دارِ خامیٔ کوشش نکل آئی
بہت ہی خوب شے تقدیر کی گردش نکل آئی

دلِ ناداں ہی پر الزام تھا میری اسیری کا
مگر اُن کی نگاہوں کی بھی کچھ سازش نکل آئی

عجب کچھ بے ضرورت سی، عجب کچھ صبر کی دشمن
عجب یہ شے جسے کہتے ہیں آرایش نکل آئی

مٹا دیتا ہے کیا یوں ہی خوشی سے جان و دل کوئی
مگر کیا کیجئے اُن کی یہ فرمایش نکل آئی

مجھے ہر ہر قدم پر وہ سہارا دیتے جاتے ہیں
بڑے ہی کام کی یہ پاؤں کی لغزش نکل آئی

کرم ہی سے ترے پھولوں سے دامن بھر گیا میرا
کرم ہی سے ترے کچھ اور گنجایش نکل آئی

سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کی طرف سے آزمایش ہے
مصائب میں بھی فضلیؔ شکلِ آسایش نکل آئی

نظر سیہوری

# افکار!

منظر شباب و شعر بداماں ہے اور ہم
حدِ نگاہ تک یہی طوفاں ہے اور ہم

مٹتا ہوا سا نقشِ جوانی ہے اور وہ
اُڑتا ہوا سا رنگِ گلستاں ہے اور ہم

فرصت ملے تو ساغر و مینا سے کام لیں
پھر انتقام گردشِ دوراں ہے اور ہم

ہر لمحہ ہے گزشتہ زمانہ کی یادگار
ہر سانس ایک عمرِ گریزاں ہے اور ہم

دنیا میں اب کہاں وہ مذاقِ جنوں نظرؔ
کہنے کو صرف چاکِ گریباں ہے اور ہم

---

شفقت کاظمی

# محسوسات

تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہی اے دوست
کہ یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے اے دوست

ربطِ ماضی کا فسانہ مرے آگے مت چھیڑ
شوق اُس دور کو اب بھول چکا ہے اے دوست

تیرے بیمار کو اللہ پہ سب چھوڑ چکے
اب تو مدت سے دوا ہے نہ دعا ہے اے دوست

تیری بیدادِ مسلسل کی شکایت کیوں ہو
اپنی برگشتہ نصیبی سے گلا ہے اے دوست

تجھ کو لازم ہے کبھی اُس پہ عنایت کی نظر
وہ جو اک شفقتِ بے برگ و نوا ہے اے دوست

---

قمر جلالوی

# سُوز وسَاز

یہ مے ہے ذرا سوچ لے اے شیخ حرم اور
تو پہلے پہل پیتا ہے کم اور ارے کم اور

وہ پوچھتے ہیں دیکھئے یہ طرفہ ستم اور
کس کس نے ستایا ہے تمھیں ایک تو ہم، اور

مجھ پر ہے ابھی نزع کا عالم کوئی دم اور
پھر سوچ لو باقی تو نہیں کوئی ستم اور

اب دیکھئے وعدے بھی ہیں پھر اس پہ قسم اور
جب وقت نکل جائے گا ہو جائیں گے ہم اور

اب قبر ہی کیا دور ہی جاتے ہو جو واپس
جب اتنے چلے آئے تو دو چار قدم اور

بے وقت عیادت کا نتیجہ یہی ہو گا
دو چار گھڑی کے لئے رک جائے گا دم اور

اچھا ہوا ہم رک گئے آکر تہہ تربت
پھر آگے قیامت تھی جو بڑھ جائے قدم اور

ہوتا ہے قمر کثرت و وحدت میں بڑا فرق
بت خانے ہزاروں ہیں، نہیں ہے تو حرم اور

---

کسی کا نام لو بے نام افسانے بہت سے ہیں
نہ جانے کس کو تم کہتے ہو دیوانے بہت سے ہیں

جفاؤں کے گلے تم سے خدا جانے بہت سے ہیں
مگر محشر کا دن ہے اپنے بیگانے بہت سے ہیں

تمھیں کس نے بلایا میکشوں سے یہ نہ کہہ ساقی
طبیعت مل گئی ہے ورنہ میخانے بہت سے ہیں

لکھی ہے خاک اڑانی ہی اگر اپنے مقدر میں
ترے کوچے پہ کیا موقوف ویرانے بہت سے ہیں

سنائے دے رہی ہیں اجنبی ناداریاں مجھ کو
تری محفل میں ورنہ جانے پہچانے بہت سے ہیں

رکھی رہ جائے گی پابندیٔ زنداں جواب چھیڑا
یہ دربانوں کو سمجھا دو کہ دیوانے بہت سے ہیں

قمر اللہ ساتھ ایمان کے منزل پہ پہونچا دے
حرم کی راہ میں سنتے ہیں بتخانے بہت سے ہیں

---

ماہر القادری

# ان کو پہچانیئے؟

رقص کے جلسوں کے یہ امام
قوم کو دیں گے کیا پیغام

دل میں بت خانے پنہاں
لب پر ہے "اسلام، اسلام"

ان کے گھر کیوں آئے گا
یہ بے چارہ ماہِ صیام

کوئی مرے مر جانے دو
ان کو اپنے عیش سے کام

ان کی بوتل قوسِ قزح
ان کے ساغر ماہِ تمام

روح کہاں بس ڈھانچے ہیں
تیغیں کیسی صرف نیام

بیوی شوہر کے آگے
نامحرم سے گرمِ کلام

راج محل میں ناچ اور رنگ
پر جا کے گھر میں کہرام

جام و سبو اور قوم کا غم
پھول کی سیجیں فکرِ عوام

جشنِ آزادی کی قسم
فکر و نظر ہیں اب بھی غلام

---

# اشارے!

بدر و حنین آج بھی دیتے ہیں یہ پیام
مکّہ نہ ہو جو فتح تو ہجرت ہے ناتمام

یہ معرکہ عجیب قیامت سرشت تھا
زندوں پہ بھی درود شہیدوں پہ بھی سلام

---

بشیر مرزا جاوید

# موت دروازے پر

سینی ٹوریم کی ٹیڑھی ترچھی پگ ڈنڈیوں پر سے گزرتا ہوا، میں جنرل وارڈ کے سامنے پہنچ گیا میرے ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی تھی جس پر طرح طرح کے نقوش بنے ہوئے تھے۔ پہاڑی راستوں کو طے کرنے کے لئے اس قسم کی چھڑیاں بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

سامنے دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ برآمدے کے درمیان سیڑھیاں تھیں جن کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے پلاٹ تھے جن میں طرح طرح کے خوبصورت پھول کھل رہے تھے۔ برآمدے کے اختتام پر دائیں طرف موٹے موٹے حروف میں "ڈسپنسری" لکھا ہوا تھا اور بائیں طرف اوپر والی منزل کو جانے کے لئے ایک زینہ بنا ہوا تھا۔

میں چھڑی گھماتا ہوا برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا، سامنے سے ایک بوڑھی نرس آتی دکھائی دی، میں نے بڑھ کر پوچھا "مسٹر طاہر اسی وارڈ میں ہیں؟"

"جی ہاں! وہ دیکھئے کونے میں اُن کا بیڈ ہے۔" اُس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا اور چلی گئی۔

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا وارڈ میں داخل ہو گیا اور طاہر کی چارپائی کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وارڈ میں ایک عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ گو ڈاکٹری اصول کے مطابق کمرہ نہایت روشن، ہوادار اور صاف تھا، لیکن پھر بھی خدا جانے وہ بدبو کہاں سے آرہی تھی۔ مریضوں کی چارپائیاں قطاروں میں بچھی ہوئی تھیں اور بعض مریض سو رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی اور موت کے درمیان وارڈ کا وہ کمرہ ایک پل کا کام دیتا تھا، اور قطاروں میں پڑے ہوئے وہ مریض اس پل کو عبور کرنے کے لئے اپنی اپنی "باری" کے منتظر تھے۔ زندگی جن انسانوں سے روٹھ جاتی تھی وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر یہاں پہنچ جاتے تھے اور ایک موہوم سی اُمید پر زندگی کے باقی دن گزار دیتے تھے۔

طاہر اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ دق کے مریضوں کے لئے نیند کے دو چار گھنٹے "نعمتِ عظمیٰ" سے کم نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان لمحوں میں انھیں مختلف قسم کے بھیانک خیالات آ آ کر تنگ نہیں کرتے اور وہ دنیا کے آلام سے بے خبر ہو کر ایک پُرسکون فضا میں پہنچ جاتے ہیں ــ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے طاہر کو جگانا مناسب نہ سمجھا ــ اُس کا رنگ بالکل زرد ہو چکا تھا، چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں، ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔ سانس لیتے وقت اُس کے سینے سے "خرر۔ خرر۔ خرر" کی سی آواز نکل رہی تھی۔ اسی قسم کی آواز بعض دوسرے مریضوں کے سینوں سے بھی نکل رہی تھی۔ یہ آوازیں بڑی دردناک تھیں!

میں نے تمام وارڈ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ فرش شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہر چارپائی کے ساتھ ایک شیلف اور ایک تھوک دانی پڑی ہوئی تھی۔ آہنی چارپائیوں پر سُرخ رنگ کے سرکاری کمبل بڑے سلیقے سے تہ کئے رکھے تھے بعض مریض کمبل اوڑھ کر سو رہے تھے اور بعض یوں ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے تھے۔ کسی کسی وقت کوئی مریض اچانک

کھانسی اٹھتا اور وارڈ کی خاموش فضا میں ایک بے ہنگم سا شور مچ کر رہ جاتا ــــ

منظر بڑا درد انگیز تھا ـ جابجا نوجوان "لاشیں" سی بکھری پڑی تھیں ـ سوائے ایک دو مریضوں کے باقی تمام نوجوان تھے ـ سامنے کونے میں بھورے بالوں والا ایک سرخ سفید لڑکا سو رہا تھا جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی ـ اسے دیکھ کر تو مجھے بے حد ترس آیا ـ لیکن میں خیالی طور پر ترس کھانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا!

طاہر کی چارپائی کو جنبش ہوئی اور "چوں ـ چرر ـ چرر" ہونے لگی ـ میں موت اور زندگی کے فلسفیانہ تصورات سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا ـ اس نے سرخ کمبل سینے سے ہٹایا اور میں نے اس کے کھلے ہوئے گریبان کے اندر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ دیکھا ـ بازوؤں کا گوشت ہڈیوں سے جا ملا تھا اور گوشت کی جگہ رگیں ہی رگیں نظر آرہی تھیں ـ اس نے آنکھیں ملیں اور پھر قدرے تیزی کے ساتھ میری طرف کروٹ بدلی ؛

"اوہ تم!!" وہ ایک دم بڑبڑا اٹھا ـ اس کے زرد چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک اور خوشی پھیل گئی ـ اس نے اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کھانسی کا ایک شدید دورہ اٹھا اور اس نے چلو بھر تازہ تازہ خون اگل دیا ـ میں نے نہایت احتیاط سے اسے پھر جوں کا توں لٹا دیا ـ اس کی ٹھوڑی پر خون اور بلغم کی ایک لکیر سی بن گئی تھی جسے میں نے پونچھ دیا ـ اس نے تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ـ

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے؟"

میری نظروں کے سامنے آج سے دو سال پہلے کا طاہر آگیا ــــ وہی طاہر جو کالج کی جان تھا ـ مضبوط و توانا جسم ــــ چمکیلے اور گھونگریالے بال ـ جو بیک وقت ایک بہترین کھلنڈرا (Cricketer) ایک بے مثل مقرر اور ایک ذہین ترین طالب علم تھا ـ جس کی ہر جلسہ اور ہر صحبت میں قدر کی جاتی ـ اگر ہنسانے پہ آتا تو ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دیتا ، اور کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی تو اس کی دلیلوں کے آگے بڑے بڑوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑتے ـ جب وہ اپنے پرخلوص قومی جذبات کو جچے تلے الفاظ میں منظوم کرتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس نے اپنا دل کاغذ پر سجا کر رکھ دیا ہو ـ اس کے جذبات اتنے پاکیزہ ہوتے تھے ، کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ـ ایک مرتبہ کالج کے سالانہ جلسہ میں اس نے قومی نظم اس قدر پرسوز لہجہ میں پڑھی کہ ساری محفل جھوم جھوم گئی ، اس کی نظم میں قوم کے نام ایک زندہ پیام تھا ، اس نے اپنے شعروں میں جون جگر حل کر دیا تھا ، کسی کسی سننے والے کی تو آنکھیں نمناک ہوگئیں اور صاحب صدر نے اپنے گلے سے ہار اتار کر طاہر کی گردن میں ڈال دیا ــــ ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا ــــ لیکن وقت کی گردش نے آج اسے کتنا تبدیل کر دیا تھا ؛

"بھائی گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے ـ" اس نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا ـ اور میں فوراً اس کی طنز کو سمجھتے ہوئے خفیف سا ہو کر بولا ـ "یوں ہی ذرا دھیان کالج کے دنوں کی طرف چلا گیا تھا ــ" میرا جواب سن کر وہ مسکرایا ـ اتنی شدید بیماری کے باوجود اس کی زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ؛

"ہاں! کالج کی زندگی ـ" اس نے لمبا سانس لیا ـ "کالج کی زندگی واقعی پُر بہار اور دلفریب ہوتی ہے ــــ یہی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں انسان کی زندگی بنتی بھی ہے اور بگڑنے پر آئے تو ایسی بگڑتی ہے کہ پھر سنبھالے نہیں سنبھلتی ـ" پھر وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گیا ـ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ یاد کر کے بول اٹھا ــ

"میرا خط مل گیا تھا تمہیں؟"

" ہاں کل ملا تھا۔ اس سے پہلے تمام دوستوں سے تمہارا حال میں نے پوچھا تھا مگر کسی نے کوئی ٹھکانے کی بات نہیں بتائی "۔ میں نے جواب دیا۔

" ہاں کالج چھوڑنے کے بعد میں نے کسی دوست سے خط و کتابت نہیں کی۔"

اتنے میں ایک وارڈ بوائے ادھر سے گزرا۔ طاہر نے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں دیا اور بیکری سے ایک کیک لانے کے لئے کہا۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا لیکن اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ " بھائی کھانے والے کے لئے میں اس لئے اصرار نہیں کرتا کہ اُس سے ( infection ) ہوجانے کا ڈر ہے۔ ہاں چائے پینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں اُس کے خلوص و نیک نیتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بات کرتے ہوئے یا کھانستے ہوئے رومال منہ پر رکھ لیتا تھا تاکہ اُس کا سانس مجھ تک نہ پہونچ سکے اور میں دق کے جراثیم سے محفوظ رہوں۔ عام طور پر بیمار اتنے محتاط کہاں ہوتے ہیں۔

" زندگی کیسے گزر رہی ہے۔؟ " میں نے پوچھا۔

" الحمدللہ! جو وقت گزر جائے غنیمت ہے۔" اُس نے یہ الفاظ صرف رسمی طور پر نہیں کہے تھے اُس کے ایک ایک لفظ میں خلوص تھا، ہمدردی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شدید علالت کے زمانہ میں بھی اُس کی باتوں میں حوصلہ تھا، زندگی تھی اور بے پناہ استقلال تھا۔

" یہاں تو لکھنے لکھانے کے لئے تمھیں کافی وقت مل جاتا ہوگا" میں نے بغیر سوچے سمجھے سوال کر ڈالا۔

" ہاں شروع شروع میں جب میری صحت نسبتاً اچھی تھی، میں نے بہت کچھ لکھا۔ اتفاق سے مجھے صحبت بھی اچھی مل گئی تھی ——— مسٹر نسیم انصاری ——— مسٹر ادریس لکھنوی اور مسٹر افتخار میرے خاص دوستوں میں تھے ——— لیکن تم آخر یہ باتیں پوچھ کیوں رہے ہو ——— " اِس فقرے پر آ کر وہ کچھ جھلا سا گیا ——— یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یکایک کوئی تلخ خیال اُس کے ذہن میں آ گیا ہے۔ میں اُس کی اچانک تبدیلی پر حیران رہ گیا اور میں کچھ سوچے بغیر بول اُٹھا:۔

" مجھے تمہارے اشعار سے عشق ہے ——— " اُس نے آنکھوں کو رومال سے ڈھانپ لیا تھا، میں نے رومال اُس کی آنکھوں سے ہٹایا تو اُس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں، آنکھوں کے نیچے رخساروں کے اُبھار پر نمی دکھائی دے رہی تھی تکیہ پر بھی کچھ بُوندیں گر چکی تھیں۔

" تم نے میری دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا " ——— وہ ایک آبلہ کی طرح پھوٹ پڑا۔ " میں موت سے قطعاً نہیں ڈرتا، موت تو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے، مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میری زندگی نہ تو میرے ہی کام آئی اور نہ اسلام اور قوم کے! جوں جوں موت سے قریب ہوتا جاتا ہوں اس احساس کی شدّت بڑھتی چلی جاتی ہے ——— اور (اُس کے منہ سے کئی بار " ہائے اور " آہ " نکلا) وہ سرزمین جس کو لاکھوں انسانوں کو موت کی بھینٹ چڑھا کر ہم نے حاصل کیا اُس کے نوجوان آج بھی مستی و غفلت کا شکار ہیں، اس خونیں انقلاب سے بھی وہ نہ چونک سکے ...... کاش ...... !

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے بائیں طرف کروٹ بدلی اور شیلف میں سے ایک کاپی نکالی۔ یہ اُس کی بیاض تھی۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تمام نظمیں میرے ہاتھ پر رکھ دیں ——— میں نے ایک ایک نظم کو پڑھا۔ بعض بعض نظمیں تو اس درجہ اثر انگیز تھیں کہ ایک دو بار میرے بدن میں جھرجھری سی آ گئی ایک ایک لفظ میں زندگی تھی ——— ایک ایک شعر میں جادو تھا ——— اُس کا خلوص نظموں میں صاف طور پر جھلک رہا تھا ———

"شاعر عموماً بے عمل ہوتے ہیں ـــــ" وہ خود بخود بول اٹھا ـ "لیکن اگر مجھے اللہ تعالےٰ نے زندگی دی تو سب سے پہلے میں عمل کا نمونہ پیش کروں گا ـ اگر کبھی حق و باطل کی جنگ چھڑ گئی تو تم مجھے گوشۂ عافیت میں نہیں بلکہ گولیوں کے سامنے پاؤگے۔ کاش ! میری یہ حسرت پوری ہو سکتی،

مجھے معاً کسی ڈاکٹر کا فقرہ یاد آ گیا ـ "ٹی بی عموماً ذہین ترین انسانوں کو ہوا کرتی ہے" ـ اس فقرہ میں کتنی صداقت تھی ؟ اُس کی مثال میرے سامنے موجود تھی ـ اگر میں اُس سے پہلے سے شناسا نہ ہوتا، تو ممکن تھا میں اُس کے متعلق ایک غلط اور حقیر قسم کا نظریہ قایم کر لیتا اور اس کی باتوں کو مبالغہ سمجھتا، لیکن شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی ـ طاہر میرے ساتھ پورے چار سال کالج میں گزار چکا تھا اور میں اُس کی رَگ رَگ سے واقف تھا ـــــ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھا ـــــ وہ واقعی ایک ذہین ترین انسان تھا ـــــ !!

تھوڑی دیر کے بعد وارڈ کا اَردلی چائے اور کیک لیکر آ گیا میں نے طاہر کی دل دہی کے لئے کیک کے کئی ٹکڑے چائے کے ساتھ کھائے، میرا جی چاہتا تھا کہ میں طاہر کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر اُس کا دل بہلاتا رہوں، لیکن ایک تو ملاقات کا وقت ختم ہونے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا، دوسرے طاہر نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے خود ہی کہا :-

جب یہاں آئے ہو تو جاتے جاتے مشتاق سے بھی مل لو، وہ بے چارہ بھی بیمار ہے"

" مشتاق ؟؟" میں متحیر ہو کر چونک پڑا ـ

" ہاں ہاں ! وہی ہمارا پرانا کلاس فیلو ـ وہ کاٹیج نمبر "۴" میں ہے ! میں نے طاہر سے ہاتھ ملایا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے مشتاق کے کاٹیج کی طرف چل پڑا،

مشتاق ہمارا پرانا کلاس فیلو تھا ـ حد سے زیادہ شریر اور اوباش لڑکا تھا ـ عورت اُس کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئی تھی پروفیسر اُس سے پناہ مانگتے، پرنسپل عاجز تھا، لیکن اُس کی تمام شرارتیں محض اس لئے برداشت کر لی جاتی تھیں، کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا ـــــ

مجھے اُمید تھی کہ مشتاق اب بالکل متین، سنجیدہ اور شریف ہو گیا ہوگا ـ اُس کی عیش پسند طبیعت اس نامراد مرض کی وجہ سے نیک اور محتاط بن گئی ہوگی، لیکن جونہی میں نے اُس کے کاٹیج میں قدم رکھا، اُس کے پہلے فقرے نے ہی میری تمام توقعات کا خاتمہ کر دیا ـ

" اخاہ بھائی فیمیل وارڈ (Female Ward) کی طرف سے آ رہے ہو، کہو کوئی مال پسند آیا ـــــ ؟" وہ ہنستے ہوئے اپنے پرانے انداز میں بولا ـ

چونکہ مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی، اس لئے میں نے اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا بلکہ کرسی کھینچ کر اطمینان سے بولا ـ

" ابھی تک تمھاری پرانی عادتیں نہیں بدلیں "

" بھائی یہ تو ناممکن ہے کہ انسان، قعر دریا، میں رہے اور اُس کا دامن تر، نہ ہو ـ یہاں فیمیل سیکشن میں تمام دنیا کا حُسن سمٹ کر جمع ہو گیا ہے، تم ہی بتاؤ ایسے ماحول میں رہ کر انسان کیسے بچ سکتا ہے ؟

میں جواب دینے ہی کو تھا کہ ایک نرس کاٹیج میں داخل ہوئی ـ اُس کی عمر پچیس کے لگ بھگ تھی ـ رنگ اگرچہ سانولا سا تھا، لیکن نقوش دل کش تھے ـ وہ بال بہت خوبصورتی سے سجائے ہوئے تھی ـ اُس نے آ کر ٹمپریچر چارٹ اٹھایا، اور ٹمپریچر پوچھنے لگی :

" ٹمپریچر تو نارمل ہے ـــــ لیکن " دل " کو ایک سو تین بخار ہو رہا ہے ـ" مشتاق نے شرارت آمیز نظریں نرس کے چہرے

پر ڈالتے ہوئے کہا، لیکن وہ ٹمپریچر لکھ کر بغیر کچھ کہے سُنے باہر نکل گئی، پھر وہ میری طرف مخاطب ہوا اور بولا:-

"دراصل میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بہت کچھ مذہبی قسم کے آدمی ہیں، لہٰذا فیمیل (FEMALE) اور میل (male) آپس میں مل جل نہیں سکتے، اس لئے مجبوراً نرسوں ہی سے دل بہلا لیتے ہیں، "کہو یار، "مال کیسا ہے؟" میں نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا، اُس کی باتوں سے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی، وہ پھر بولا:-

"اِس نرس کو بھی بڑی مشکل سے قابو میں کیا ہے۔ ایک روز میں نے اسے 'ڈارلنگ' کہہ کر پکارا اور یہ ناراض ہو گئی۔ لیکن تم جانتے ہو جہاں منت، سماجت اور خوشامد نہ چل سکے وہاں بعض اوقات دولت کام دے جاتی ہے اور ویسے بھی یہ قوم ذرا لالچی ہی واقع ہوئی ہے ——" اَب جاکر یہ ذرا راہِ راست پر آئی ہے۔

میں نے باتوں کا رُخ پھیرنے کے لئے کہا۔

"اچھا یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ .. .. .. یہ تو بتاؤ تمھاری بیماری کا کیا حال ہے؟ اس فقرے پر تو وہ بستر سے ایک دم اُچھل کر بیٹھ گیا۔ .. "یار! تم نے تو میرا موڈ ہی خراب کر دیا، میں جنت کی باتیں کر رہا تھا اور تم نے دوزخ کا ذکر چھیڑ دیا۔ .. .. میں اپنی زندگی کے ان مدقوق لمحوں کو رومان اور محبت کی فضا میں سمو دینا چاہتا ہوں۔ .. .. یہ دیکھو (میز کی دراز کھینچتے ہوئے) میرے نئے رومان کی داستان! اس نے یہ کہتے ہوئے چند خطوط میری طرف بڑھا دیئے!

میں نے یکے بعد دیگرے وہ تمام خطوط پڑھے۔ فیمیل سیکشن میں کوئی لڑکی فہمیدہ تھی جس نے وہ تمام خطوط لکھے تھے۔ اُس نے مشتاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ جابجا اپنی سچی اور پُر خلوص محبت کا یقین دلایا تھا اور بعض بعض جگہ مشتاق کی بے وفائی کا شبہ بھی ظاہر کیا تھا۔ خطوط ویسے تو شستہ زبان میں لکھے ہوئے تھے لیکن کسی کسی جگہ بعض الفاظ بے محل استعمال ہوئے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھنے والی ان لفظوں کا صحیح مفہوم نہیں جانتی۔

"دیکھا دوست! کس قدر دلچسپ انداز ہے اس لڑکی کے لکھنے کا! مگر ہماری محبت اس کاغذی بھاگ دوڑ ہی تک محدود ہے، اس قل آعوذی قسم کے مُلّا ٹائپ سپرنٹنڈنٹ نے اتنی سخت پابندیاں لگا دی ہیں کہ "male" اور "FEMALE" آپس میں مل جل نہیں سکتے —— اگر میں صحت یاب ہو گیا تو سب سے پہلے یہ کام کروں گا کہ اس سینی ٹوریم میں والد صاحب کے ذریعہ ایک مخلوط کلب (mixed) کھلواؤں گا، جہاں مرد اور عورتیں آپس میں ملا کریں گے اور مدقوقوں کا یہ ہسپتال زمین کی جنت بن جائے گا۔

مشتاق کہتا ہی رہا، قینچی کی طرح اُس کی زبان چل رہی تھی، بیچ میں بولنے کا اُس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا، یہ اُس کی پُرانی عادت تھی، وہ ضرورت سے زیادہ باتونی اور چرب زبان تھا، اُس کی گفتگو کا موضوع —— رومان، عشق، محبت —— ہی ہوا کرتے تھے۔

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو چھ بج رہے تھے، اس خیال سے کہ کہیں آخری موٹر بس بھی نہ نکل جائے میں چھڑی لیکر اُٹھ کھڑا ہوا، مشتاق نے گرمجوشی کے ساتھ میرے ہاتھ کو تھاما اور سنجیدہ انداز میں کہنے لگا، "بھئی! میری کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف کر دینا" —— یہ بھی اُس کی پُرانی عادت تھی کہ بے تکی

باتیں کرتے کرتے جب تھک جاتا تو آخر میں معافی مانگ لیتا، میں نے بڑی مشکل سے اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھُڑایا!

میں سینی ٹوریم کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے چھڑی کا سہارا لیکر اُتر رہا تھا، میرے کانوں میں ابھی تک اُن دونوں کے فقرے گونج رہے تھے ——— "اگر کبھی حق و باطل کی جنگ چھڑ گئی تو میرا سینہ سب سے پہلے چھلنی ہوگا ——— اور "اگر میں صحت یاب ہوگیا تو اس سینی ٹوریم میں ایک مخلوط کلب کھلواؤں گا، جس میں مرد اور عورتیں . . . . . .

پگ ڈنڈی کے ایک موڑ پر میں گرتے گرتے رہ گیا . . . . . . اس تصوّر نے "کتنا تضاد ہے اُن دونوں مریضوں کے خیالات میں جو موت کے عین دروازے پر کھڑے ہیں . . . . مجھے گردوپیش سے بیگانہ بنا دیا تھا:

---

# روحِ انتخاب

## مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

انسان[1] اور حیوان کا مقابلہ کرو۔ حیوان اپنے ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے جو موسم کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجے، ناخن، ڈنک، کے ہتھیار اس کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ جن غذاؤں پر اُس کی زندگی کا مدار ہے، پیدا ہونے کے ساتھ اُس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ خشکی ہو یا دریا۔ ویرانہ ہو یا آباد، ہر جگہ مہیا ملتی ہیں؛

انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اُس کے پاس نہیں ہوتا اس کی جلد نازک ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے، اس کے ساتھ عالم فطرت کی جتنی چیزیں اس کے گرد و پیش ہوتی ہیں، سب کی سب اُس کی دشمن نظر آتی ہیں، آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ۔ جاڑوں کی ٹھنڈ؟ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو تباہ کردے؛

ان مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی جسمانی ہتھیار نہیں دیا، کیونکہ جن بے شمار اور پُرزور دشمنوں کا اُس کو سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی جسمانی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا، قدرت نے اُس کو ان ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی ہے جس کے ذریعہ سے اُس نے ہر قسم کے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جدا سامان تیار کئے دھوپ۔ گرمی، جاڑے، سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ و خنجر تیار کئے۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے، لوہا پگھلایا، برق کو مسخر کیا، ہوا کو تھاما، غرض تھوڑے عرصہ کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اُس کے پنجۂ اقتدار میں تھی؛

اس عام قوت کا نام عقل کلی یا عقل انسانی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہونچکر ٹھیرنے نہ پائیں، اس لئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی، وہ اُس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے جس سے انسان پر نئے نئے طرح کے حملے کئے جاتے ہیں، جن بیماریوں کا علاج معلوم ہوچکا تھا، ان کے علاوہ نئے نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر معلوم ہوچکا تھا، اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے اور وہاں نئے ضروریات

---

[1] اس موقع پر یہ جتادینا ضروری ہے کہ اس حصہ میں ہم نے جا بجا یورپ کے حکما اور علما کے اقوال نقل کئے ہیں لیکن ہم نے ان کی اصلی تصنیفات کے دیکھنے کی زحمت نہیں اُٹھائی ہے بلکہ مصر کے ایک فاضل مصنف کی تصنیفات پر اعتماد کیا ہے جس کا نام فرید وجدی بک ہے۔ اس بحث میں اس کی دو تصنیفیں ہیں "تطبیق الدیانۃ الاسلامیۃ" اور "الحدیقۃ الفکریۃ"۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جن یورپین فاضلوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں اُن میں اکثر جرمن اور فرنچ کے علما ہیں۔ ہمارے نئے تعلیم یافتہ احباب کو جو انگریزی زبان کے سوا، اور کوئی زبان نہیں جانتے اُن کے ناموں کے متعلق غلطی کرنی

پیش آتے ہیں۔ آرام و آسایش کے جو سامان مہیا ہو چکے تھے راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بیکار ہو جاتے ہیں، مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی تیاریاں کرتا ہے، اور ترقی کی جس حد تک پہونچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے؛
عالم کون اور انسان کی یہ باہمی کشمکش ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے اور جس کی بدولت آج سیکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قایم ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے، لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ سخت اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک اور گروہ ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جن سے اس کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں۔ طمع اس کو آمادہ کرتی ہے، کہ عزیز و بیگانہ دوست و دشمن دور و نزدیک کے تمام دولت و مال پر قبضہ کر لیا جائے۔ کینہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ جاہ طلبی کہتی ہے کہ جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں، آرام نہ لے، خواہش نفس مجبور کرتی ہے کہ دنیا میں کسی کا پردۂ عصمت محفوظ نہ رہنے پائے، ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کروگے تو وہ بھی کرے گا۔ تم کسی کو برباد کرنا چاہوگے تو وہ بھی چاہے گا۔ تم دوسروں کی عزت نہ کروگے تو وہ بھی نہ کریں گے، لیکن اولاً تو اس قسم کی پیش بینی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ حکومت کا خوف۔ جاسوس کا ڈر۔ بدنامی کا احتمال۔ انتقام کا خطرہ۔ ایک چیز بھی نہیں۔ ان موقعوں پر عقل ان دشمنوں اور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے، جو سینہ سپر ہوتی ہے اور انسان کو ان دشمنوں کے حملے سے بچاتی ہے اس قوت کا نام **نور ایمان**، کانشنس، حاسۂ اخلاقی۔ ہے اور یہی چیز مذہب کی بنیاد ہے؛
یہ قوت، انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل۔ رذیل و شریف۔ شاہ و گدا۔ افریقہ کا وحشی، اور یورپ کا تعلیم یافتہ، سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں اور یہی معنی ہیں۔ قرآن کی اس آیت کے:۔

| فاقم وجهك للدين حنيفاً فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون ؛ | اپنا منہ سب طرف سے موڑ کر دین کی طرف کر، یہ وہ خدا کی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو مخلوق کیا ہے، خدا کی خلقت میں تغیر نہیں ہوتا۔ یہی ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں |
|---|---|

جرمن کا ایک حکیم گسلر لکھتا ہے "مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ مذہب جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا" فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان جو مذہب کا پابند نہ تھا اپنی کتاب تاریخ مذہب میں لکھتا ہے، کہ یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے، وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دیگا کہ مادی مذہب (میٹریسٹ) بالکل غلط ہے جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے؛
پروفیسر سبیتر (SABATER) فلسفۂ دینیہ میں لکھتا ہے: "میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے، لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت، یا مزاج کا اثر ہے۔ میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا۔ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے، اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے۔ مذہب کے شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے ہیں لیکن جڑ ہمیشہ قایم رہی ہے اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو

[1] یہ دونوں قول تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ صفحہ ۲۴ و ۲۵ میں مذکور ہیں؛

کبھی زائل نہیں ہوسکتی مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قایم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی"

دنیا کے اخلاقی نظم ونسق کو اسی حاسۂ مذہبی ہی نے تھام رکھا ہے، ورنہ اگر تعلیم و تمدن پر مدار ہوتا تو یورپ کا اخلاقی پلہ اسی قدر تمام دنیا سے بھاری ہوگیا ہوتا جس قدر تعلیم و تمدن میں اس کا پایہ بلند ہے ؛

دنیا میں افرادِ انسانی کے خاص خاص مختصات یعنی زبان۔ قوم۔ ملک۔ صورت رنگ کو حذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں قدرِ مشترک رہ جائیں گی، ان میں ایک مذہب ہوگا اور یہ بہت بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ مذہب، فطری چیز ہے۔ جن چیزوں کو ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں مثلاً اولاد کی محبت۔ انتقام کی خواہش۔ کمال کی قدردانی، وغیرہ وغیرہ ان کی فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم۔ ہر نسل، ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ خدا کا وجود اس کی پرستش کا خیال حیات بعد الموت۔ اعمال کی جزا وسزا، رحمدلی۔ ہمدردی۔ عفت کا اچھا سمجھنا۔ جھوٹ۔ دغا۔ زنا۔ چوری کو برا جاننا، دنیا کے تمام مذہبوں کا اصل اصول ہے۔

فطرت نے افرادِ انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے۔ دولت و مال۔ جاہ وحشم۔ فضل وکمال، ذہن وذکا۔ عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتی، سکندر و تیمور۔ ارسطو و افلاطن۔ ہومر و فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں۔ دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے کہ ڈاروِن کو نظر تک نہیں آتا۔ بایں ہمہ جو باتیں شرطِ زندگی اور مدارِ حیات ہیں وہ تمام افرادِ انسانی کو یکساں عطا کی ہیں۔ افریقہ کا جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا پیتا۔ چلتا۔ پھرتا۔ سوتا۔ جاگتا۔ بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے،۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے لازمۂ انسانی تھا۔ اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا، ارسطو، اور منتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، حلم، اچھی چیزیں ہیں، لیکن افریقہ کا ایک وحشی۔ بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا اور اچھا سمجھتا ہے ؛

" الکلام حصہ دوم "

(از علامہ شبلی نعمانی)

# ہماری نظر میں

## حقایق الاسلام

"حقائق الاسلام" (حصّہ اول) (حقیقت حسن الاعمال والاخلاق اور حقیقت الایمان)
از :- حافظ محمد سرور قریشی، ضخامت ۳۲۴ صفحے، کتابت و طباعت نظر افروز، قیمت تین روپیہ، ملنے کا پتہ :- دفتر جماعتِ اسلامیہ نزد محلہ جمعہ خاں، کوہاٹ (سرحد)

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، وہ بڑی شدید آزمائش اور فتنہ و ابتلا کا دور ہے، شیطان نے قدم قدم پر دام بچھا دیے ہیں، زندگی کے ہر موڑ پر لغزش کا خطرہ ہے، ایک طبقہ تو سرے سے خدا کے وجود ہی سے انکار کرتا ہے اور جو مذہبی گروہ ہے، اُن میں بہت سے ایسے ہیں جو صرف زبانی اقرار ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور ایمان و عمل میں تطبیق دینے کی کوشش نہیں کرتے، اس اعتقاد نے مسلمانوں کی زندگیوں میں جاہلیت کا رنگ پیدا کر دیا ہے، مسلمان زبان سے ایمان اور اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر اُن کا عمل اس اقرار کی نفی کرتا ہے، زبان و اظہار کی یہ دورنگی اور قول و عمل کا یہ نفاق بہت عام ہے، اور یہی بدعملی مسلمانوں کی تباہیوں کی ضامن ہے ؛

جناب مولوی حافظ سرور قریشی نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ مرتب فرمائی ہے، اس میں انھوں نے ایمان و عمل کی حقیقت کو پیش کیا ہے، مومن اور کافر کی پہچان بتائی ہے، اخلاق و اعمال کی اہمیت سے بحث کی ہے اور پوری قوت کے ساتھ اس بات پر نہ صرف یہ کہ زور دیا ہے بلکہ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ایمان اور عمل کا ایک دوسرے کے ساتھ اتنا گہرا ربط ہے کہ ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا ؛

"حقایق الاسلام" میں جگہ جگہ قرآنی آیات، احادیثِ رسول ؐ اور صحابہ کرام کے اقوال کے دلنشین ترجمے درج ہیں، جو اس کتاب کی جان ہیں، مصنف نے بڑی دردمندی اور خلوص کے ساتھ مضامین ترتیب دئے ہیں۔ "سیرت و عمل" کا جہاں جہاں ذکر ہے، وہاں بعض مقامات پر نفسیاتی نکتے بھی درمیان میں آگئے ہیں ؛

"ایمان کی کمی اور زیادتی" ——— یہ علمِ کلام کی ایک بحث ہے جو مدت سے چلی آرہی ہے، اسی طرح "عمل، ایمان کے لئے لازمی شرط ہے یا نہیں؟" ——— اس مسئلہ پر بھی علمائے اسلام اور اربابِ فکر و نظر میں ردوکد رہی ہے ——— یہ بحث جہاں آئی ہے، وہاں حافظ محمد سرور صاحب نے اپنی اس کتاب میں دوسرے مکتبۂ خیال والوں پر چوٹیں کی ہیں اور بعض مقامات پر یہ کوشش اصلاح "کلامی بحث" بن کر رہ گئی ہے ؛

"عمل، ایمان کے لئے لازمی شرط ہے، یا نہیں؟" اس مسئلہ میں اعتدال اور اقتصاد کا مسلک ہی مناسب ہے، ورنہ اس میں افراط یعنی "رجائیت"[1] کا غلو مسلمانوں میں بےعملی بلکہ گناہوں پر اُبھارنے کا سبب بن جاتا ہے اور یہ "مُرجئین" کا مذہب ہے، اسی طرح اس میں تفریط[2] "قنوطیت" اور "یاسیت" پیدا کرتی ہے جو

---

[1] "ارجا" [2] گناہ کبیرہ کے مرتکب کی تکفیر

" خارجیت " کی بنیاد ہے ، ہم ان دونوں عقیدوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ، گناہ گار مسلمان کو ہم " کافر " اور " غیر مومن " نہیں سمجھتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کبیرہ گناہ پر جمے رہنا یہاں تک کہ قلب میں گناہ کی برائی کا احساس تک باقی نہ رہے ، " ایمان " کے منافی ہے ـــــــ جس طرح ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح اعمال ہی سے ایمان کی پختگی اور ناپختگی کا پتہ چلتا ہے ؛

" حقایق الاسلام " میں افسوس ہے کہ ادب و انشاء کی کمی محسوس ہوتی ہے ، ضرورت ہے کہ حق کا اظہار زیادہ سے زیادہ دل نشین اور " موثر انداز " میں کیا جائے ، زبان ، روزمرہ ، محاورہ اور لفظوں کے استعمال میں صحت کا پایا جانا ضروری ہے ، استدلال میں بھی زور ہو ، اظہار میں بھی قوت ہو ، اور زور و قوت کے ساتھ شگفتگی بھی ! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں اس کی زندہ مثال ہیں ؛

موجودہ زمانہ میں خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ " حق " لوگوں کے سامنے آئے تو خوب نکھر کر آئے ، ادب و انشاء کی تمام خوبیوں کے ساتھ ! سپاٹ تحریریں قرآن اور حدیث کے حوالوں کے باوجود زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتیں ۔ ( صفحہ ۳۱ ) " ہوسکتا ہے کہ ہم نے بھی کہیں غلطی کھائی ہو " ـــــــ " غلطی کھانا " یا " غلطی لگنا " دونوں روزمرہ کے خلاف ہیں ، " لگنا " اور " کھانا " " ٹھوکر " کے ساتھ آتا ہے ، غلطی کے ساتھ نہیں بولتے ـــ ( صفحہ ۳۵ ) " طوفانہائے بدتمیزی کے انسانیت سوز و ہلاکت آفریں سیلاب نہ آتے " ـــــــ " طوفان کے سیلاب نہ آتے " یہ عجیب انشاء ہے ؟ " طوفانی سیلاب " تو بولتے ہیں ! پھر " جلانا " طوفان و سیلاب کی صفت ہرگز نہیں ہے ، اس لئے " انسانیت سوز " کا استعمال یہاں درست نہیں ـــــــ ( ۴۷ ) " گویا تمام اسلامی محاسن اعمال کی گٹھڑی باندھ کر خود ساختہ و سطحی عقاید کی چکی میں پیس کر پائمال کردی " ـــــــ " محاسن کی گٹھڑی باندھ کر چکی میں پیس ڈالنا " تحریر و نگارش کا مضحکہ خیز انداز ہے ـــــــ ( صفحہ ۱۳۰ ) " عمل و اخلاق میں اپنا جائزہ اور احتساب نفس کریں " ـــــــ " اپنے عمل و اخلاق کا جائزہ لیں " لکھنا چاہیئے تھا ـــــــ ( صفحہ ۱۳۵ ) " ماحول کا خرِ شہوت ، زیورِ اخلاق سے معرا ہوکر ، نہایت برق رفتاری سے اخلاقِ مغرب میں مدغم ہورہا ہے " ـــــــ ایک ادیب اور انشاپرداز اس خیال کو ان لفظوں میں اس انداز سے کبھی ظاہر نہ کرے گا ـــــــ ( صفحہ ۱۵۴ ) " قرآن کے نزدیک ایمانی مرگ کی نسبت اسلامی موت زیادہ قابلِ قدر و وقیع ہے " ، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب موت آئے تو آدمی اسلام پر قایم ہو مگر " ایمانی مرگ " اور " اسلامی موت " نے مفہوم کو عجیب بھول بھلیوں میں ڈال دیا ـــــــ ( صفحہ ۱۸۸ ) " چاندنی چوک کا گھنٹہ گھر دھڑام کرکے گرگیا " ـــــــ " دھڑام سے گرگیا " لکھنا چاہیئے تھا ـــ

مصنف کی نثر ہی کے شاہکار ( ؟ ) لطف کے لئے کیا کم تھے ، چہ جائے کہ اس نے اپنی شاعری سے بھی ناظرین کو محروم رکھنا گوارا نہیں کیا ۔ ۔ ۔ ۔

ؔ تو للہ ! دیدۂ دل سے کبھی خلوت گزیں ہوکر
پڑھ اس مجموعہ اخلاق کو اہلِ یقیں ہوکر

ان دو مصرعوں میں بندش کی " سستی اور تعقید " پائی جاتی ہے ، صرف لفظوں کو جوڑ دیا گیا ہے ، شعریت مفقود ہے ! قریب قریب اسی انداز کے مصنف کے دوسرے اشعار ہیں " خودشناسی بھی فراست مومن میں شامل ہے یعنی اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ! جس مسلمان اور خاص طور سے مذہب سے

شغف رکھنے والے مسلمان میں ہم اسے نہیں پاتے تو ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے۔

**"رحیل"** ماہنامہ "رحیل" ادارۂ تحریر :- آبادشاہ پوری، عاصی ضیائی رام پوری، قیمت فی پرچہ ۸/، ملنے کا پتہ دفتر ماہنامہ "رحیل" یعقوب خاں روڈ، کراچی۔

ماہنامہ "رحیل" کا یہ دوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے، اس مجلّہ کی اشاعت کی غرض تفریح و تجارت نہیں بلکہ حق وصداقت کی تبلیغ ہے، اس لئے علمی مقالوں اور نظموں سے لیکر افسانوں تک یہی رنگ ہر جگہ نظر آتا ہے، اللہ کا بڑا فضل ہے کہ لوگوں کے دلوں میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہوتی جارہی ہے، جاہلی ادب کا غبار رفتہ رفتہ چھٹ رہا ہے، وہ زمانہ انشاء اللہ آکر رہے گا کہ تمام ماحول پر اسلامی ادب چھا جائے گا۔

"رحیل" کا سائز بھی خوب ہے، طباعت وکتابت بھی اچھی ہے، مضامین میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے، اور ادارتی مقالہ کا عنوان "حُدی" رسالہ کے نام کی مناسبت سے پسندیدہ اور بہت دلکش ہے، ضرورت ہے کہ یہ "حُدی خوانی" تیز تر ہوتی چلی جائے یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ غالب ہو جائے۔ "فاران" پڑھنے والوں کو "رحیل" کے مطالعہ سے بھی محروم نہ رہنا چاہیئے!

**الاعتصام عید نمبر** ہفت روزہ "الاعتصام عید نمبر" مدیر :- محمد حنیف ندوی، بڑا سائز، ضخامت ۴۰ صفحے، (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ :- دفتر ہفت روزہ "الاعتصام" گوجرانوالہ (مغربی پنجاب)

ہفت روزہ "الاعتصام" پر یہ ضرب المثل صادق آتی ہے کہ "جیسا نام ویسا کام" اس کے مضامین میں "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس کا "عید نمبر" بھی اسی رنگ میں نکلا ہے، شروع سے آخر تک ایک ہی آہنگ ہے یعنی اللہ کے پیغام کی تبلیغ!

"فلسفہ عید" ---- احکام ومسائل عید الفطر" ---- قبر پرستی کیونکر پھیلی" ---- حدیث علماء امت کی نظر میں" ---- "نویں صدی ہجری کا تاجدار اقلیم حدیث" بصیرت افروز اور معلوماتی مضامین ہیں،

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ پر جو مضمون ہے اس کا عنوان (نویں صدی ہجری کا تاجدار اقلیم حدیث) البتہ کھٹکتا ہے، اول تو عنوان ذرا طویل ہے، پھر یہ کیا ضرور ہے کہ علم وتقویٰ کا جہاں ذکر ہو، وہاں بھی تاجداری اور شہنشاہی کا تصور ہم رکاب رہے۔

"عید نمبر" کی نظمیں دوسرے مضامین کے مقابلہ میں پست ہیں، کاش! یہ پستی نہ ہوتی اور نظمیں منتخب کر لی جاتیں ---- "عید صیام" فارسی نظم ہے، جس نے پورے دو صفحے گھیر لیئے ہیں، نظم بے مزہ ہے، "فارسیت" نام کو نہیں پھر "ضامر" "ضمور" "سنباک" "اطریہ" "جُنّہ" جیسے لفظوں کے لئے قاموس و صراح کی ورق گردانی کرتے رہیئے۔ اگر لغت دانی کا اظہار مقصود تھا تو اس کے لئے نثر سے کام لیا جا سکتا تھا، شاعری کے دوش نازک پر یہ پہاڑ کیوں رکھ دیئے گئے!

جناب مولانا حنیف ندوی کی دینی مساعی بہر حال ستائش کی مستحق ہیں کہ "الاعتصام" کو دین کا آرگن بنا کر تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

**ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح** "ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح" مرتبہ محمد منظور نعمانی، کتابت و طباعت دیدہ زیب، ضخامت ۱۶۸ صفحات،

مجلّد گردپوش کے ساتھ، قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- کتب خانہ "الفرقان" گوئن روڈ، لکھنؤ (بھارت)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے "نام" ہی سے نہیں "کام" سے بھی دیندار طبقہ پوری طرح متعارف ہے، اُن کی ذات علم وتقویٰ کا مجمع البحرین تھی، تبلیغی جماعت کے وہ موسّس اور بانی تھے، مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی تبلیغی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ علاقہ میوات کے جاہل، اُجڈ اور مذہب سے بیگانہ لوگوں میں اس درجہ دینی شعور پیدا ہوگیا کہ اُن میں کے بہت سے مسلمان خود اپنی جگہ مبلغ اور اسلام کے مناد بن گئے۔

یہ کتاب مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جن کو مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" نے بڑی محنت، انتہائی خلوص اور کمال شغف وعقیدت کے ساتھ مرتب فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ مولانا نعمانی کو اس کوشش کے لئے اجرِ جزیل عطا فرمائے گا کہ ہم جیسے تہی دستوں تک دین وحکمت کے یہ انمول موتی بن مانگے پہونچ گئے، حضرت مولانا محمد الیاس نور اللہ مرقدہٗ کو اپنے تبلیغی مشن سے اس درجہ شغف تھا، کہ بیماری کی حالت میں بھی یہی دُھن اپنا کام کرتی رہی —— فرماتے ہیں:-

"میں اگر کسی طبیب کو بھی علاج کے لئے بلاتا ہوں تو دراصل تبلیغی کام کو پیش نظر رکھ کے بلاتا ہوں اور اُس سے اپنا علاج کرانے کو، اس کو اللہ کے کام میں لگانے کا بہانہ بنانا چاہتا ہوں، اس لئے صرف انھی اطبا کو بلانے کی اجازت دیتا ہوں، جن سے اس دینی دعوت کے سلسلہ میں کوئی توقع اور گنجایش ہو" (صفحہ ۷۱)

تبلیغی جماعت خالص دینی جماعت ہے، اُس کا کام ہر آئینہ تبریک وتحسین کا مستحق ہے، محکمۂ پولس کے حالات سب پر روشن ہیں مگر ہم نے دیکھا ہے کہ تبلیغی جماعت سے تعلق قائم ہوجانے کے بعد پولس کے بعض افسروں کی زندگیوں میں اس قدر انقلاب پیدا ہوگیا ہے کہ اُن کے دینی شغف اور اسلامی کردار کو دیکھ کر ہمیں رہ رہ کے رشک آتا ہے تبلیغی جماعت والوں میں انکسار، فروتنی، تواضع، خشیت، اور دین سے خاص شغف ورغبت اور لگاؤ پایا جاتا ہے جو اس خدا ناشناس ماحول اور فرعون ساز دور میں، بہت غنیمت ہے اور اُن کی نمازوں کی درستی تو ضرب المثل بن گئی ہے۔

مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ تبلیغ کا فرض صرف اسی حد پر پہونچ کر پورا نہیں ہوجاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی ادائگی ہی پر اکتفا نہیں فرمایا اور آپ نے صحابہ کرام کے دلوں میں خشیت اور گداز پیدا ہونے ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ حضور نے اہلِ باطل کی سیادت اور خدا ناشناس قریش کی قیادت کو مٹا کر اسلامی نظام کو برپا کردیا —— اور آپ کے جانشین صحابہ نے بھی تبلیغ کے جامع فریضہ کو منبر ومحراب ہی تک محدود نہیں رکھا، یہ فریضہ یرموک اور اجنا دین کی لڑائیوں میں تلواروں کی دھاروں پر ادا ہوا، یہاں تک کہ روما کے دھوئیں اُڑ گئے، مداین کا شکوہ سرنگوں ہوگیا اور قیصر وکسریٰ کے تخت روند دیئے گئے "قیامِ معروف" اور "نہی عن المنکر" کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا "تبلیغِ حق" کا عین، منشا، ہے، مردِ مومن کی پوری زندگی نماز اور عبادت ہے۔

اللہ کی راہ میں باطل سے تصادم ناگزیر ہے اور اس کے لئے راتوں کے "راہبوں" اور دن کے "شہسواروں" کی ضرورت ہے، "آسان اور بے ضرر تبلیغ" کے خوگر اُس دشواری اور سختی کے لئے بھی اپنے کو تیار کریں جہاں بدر واحد کے معرکوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جس جگہ کلمۂ حق کہنے پر امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کی طرح بیٹھوں پر کوڑے کھانے ہوتے ہیں ؎

اکتوبر

# فاران

ماہر القادری
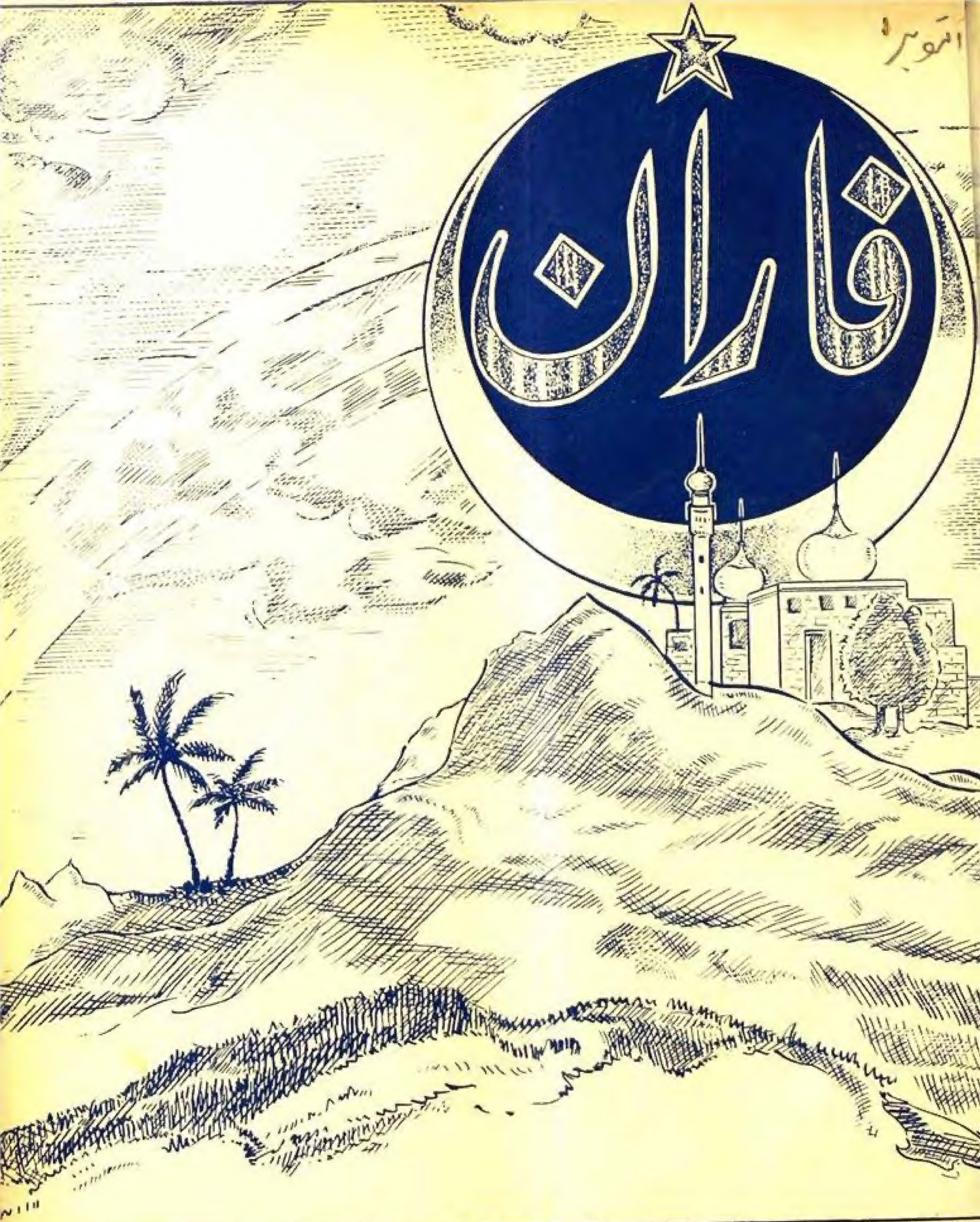
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقشِ اوّل

زندگی کے وہ مسائل جن کو ہم "فطری" کہہ سکتے ہیں ذرا بھی اُلجھے ہوئے نہیں ہیں، لیکن نفس کی ناروا خواہشوں نے نزاکتیں اور باریکیاں پیدا کر کے اُن کو خواہ مخواہ اُلجھا دیا ہے ——— آدمی کی تخلیق اور اس کی جبلت کی تشکیل فلسفہ کی بنیادوں پر ہرگز نہیں ہوئی، مگر اس کو کیا کیجئے کہ عقلِ مصلحت شناس نے سیدھی سادی زندگی کو خود "فلسفہ" بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں ہر طرف بکھیر دی ہیں، اگر آدمی چشمِ حقیقت بیں سے کام لیکر ان نشانیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے تو بہت کچھ عبرتیں اور بصیرتیں حاصل ہو سکتی ہیں، سچائی کی راہ دشوار گزار ہو تو ہو مگر پیچیدہ نہیں ہے، آدمی راستہ کی ان فطری اور ناگزیر دشواریوں سے گھبرا کر صراطِ مستقیم میں کچھ پگڈنڈیاں (SHORT-CUTS) نکالنا چاہتا ہے اور بس یہیں سے گمراہی شروع ہو جاتی ہے۔

آج کی صحبت میں ہم جس مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں وہ معاش یا اقتصاد اور روٹی اور بھوک سے کم اہم نہیں ہے، معاشرے کی شہ رگ کو ہم آج چھیڑ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بات خوب کھل کر سامنے آجائے، یقین ہے کہ پوری توجہ اور کامل احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہماری گزارش کو پڑھا جائے گا۔

ہم اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بدیہی طور پر یہ نظر آتا ہے کہ ہر چیز کے کچھ مخصوص صفات متعلق ہیں اور نہ صرف صفات بلکہ ہر شے کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے، آگ کی جو خصوصیتیں ہیں وہ پانی کی نہیں ہیں اور پانی

سے جو کام لیا جا سکتا ہے، وہی کام مٹی سے نہیں لیا جا سکتا، ببول، سیسم اور دوسرے تناور درختوں کی لکڑی عمارتوں کے کام آتی ہے مگر گلاب کے پھول کی ڈالیاں اس کے لئے کارآمد نہیں ہیں، میتھی اور پالک کی پتیاں پکائی جاتی ہیں اور لوگ انھیں خوب شوق سے کھاتے ہیں، لیکن نسترن ونسترن، سیوتی، چنبیلی اور بیلے کی پتیاں اس کام کے لئے موزوں نہیں ہیں، کوئلہ اور ہیرے کے کیمیاوی اجزاء ایک ہی ہیں مگر کوئلہ کو لوگ آتش دانوں میں جلاتے ہیں اور ہیرے سے یہ کام نہیں لیا جاتا۔

بکریاں اور گائیں دودھ دیتی ہیں اور گھوڑوں اور بیلوں سے باربرداری اور زمین جوتنے کا کام لیا جاتا ہے، اب کوئی بکریوں اور گایوں سے بھی یہی کام لینے کی کوشش کرے تو اس کوشش میں اُسے تھوڑی بہت کامیابی تو ضرور ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ چند دن کی مشق کے بعد بکریوں اور گایوں کو ہل جوتنے اور بوجھ اٹھانے کی تھوڑی بہت عادت ہو جائے مگر اُن کے دودھ میں یقیناً کمی ہو جائے گی، بلکہ ممکن ہے کہ کچھ بکریاں اور گائیں سرے سے دودھ دینا ہی بند کر دیں، اور یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔

خود انسان کے جسم کے اعضا کا بھی یہی حال ہے کہ ہر عضو سے ایک خاص صفت اور امتیازی کام متعلق ہے، پاؤں سے چلتے ہیں، ہاتھوں سے چیزوں کو چھوتے اور پکڑتے ہیں، ناک سے سونگھتے، آنکھ سے دیکھتے اور دماغ سے سوچتے ہیں، تمام کائنات میں اشیاء کی صفات اور عمل (function) کی ٹھیک یہی نوعیت پائی جاتی ہے، اس وچار سے بے چارگی یا غلامی کہیے، اسے جبر اور محکومیت سے تعبیر کیجئے یا اس کو قسمت کا نظام اور فطرت کا داعیہ سمجھئے، بہرحال اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سو فی صد درست ہے، یہ واقعات ہیں، حقائق ہیں، تجربے اور مشاہدات ہیں، اور جس کسی کے پاس فہم و دانش کی ایک رمق بھی موجود ہے، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اب اگر تمام اشیاء میں "مساوات" کے نام پر جنگ چھڑ جائے کہ ہم اپنی امتیازی صفات اور مخصوص وظیفہ اور عمل (mission) کی محکومی گوارا نہیں کر سکتے، آگ کہے کہ مجھ سے چیزوں کے گرم کرنے اور جلانے ہی کا کام کیوں لیا جاتا ہے، میں پانی کی طرح لوگوں کی پیاس کیوں نہ بجھایا کروں —— مولسری، بیلے، گلاب اور چنبیلی کی پتیاں مطالبہ کریں کہ ہم صرف سونگھنے، گلدانوں میں رکھے جانے اور ہاروں میں پروئے جانے ہی کے کام کیوں آئیں میتھی، پالک اور خرفہ کی طرح ہمیں پکایا کیوں نہ جائے —— آدمی کے پاؤں احتجاج کریں کہ آنکھوں کی طرح ہم میں دیکھنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے تھی، اور معدہ کہے کہ میں صرف غذاؤں کے ہضم کرنے ہی کا فرض کیوں انجام دوں، دماغ کی طرح مجھ سے سوچنے کا بھی کام لیا جانا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ اور احتجاج اور مطالبوں کا یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا جائے!

"مساوات" "انقلاب" اور "برابری" کا یہ نعرہ ظاہری طور پر بڑا جاندار، دلکش اور ہنگامہ آفریں معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز، ایک یا چند صفات ہی کی پابند ہو کر کیوں رہے، ان حد بندیوں کو ٹوٹ جانا چاہیئے، آنکھ دیکھتی ہے تو اُسے پاؤں کی طرح چلنا بھی چاہیئے، پاؤں چلتے ہیں تو اُن میں دیکھنے کی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ رہے، ساگوان اور بلند کی طرح صنوبر و گلاب کی ڈالیاں بھی مکانوں کے شہتیروں میں استعمال ہونی چاہئیں، اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز کسی سے گھٹ کر کیوں رہے، مساوات ہو تو پوری پوری مساوات ہو آزادی ہو تو کامل آزادی ہو —— کیونکہ ؎

ایک تنکا بھی نہیں صحنِ گلستاں کا غلام

مگر عمل اور تجربہ کی دنیا میں "آزادیِ کامل" اور "مساواتِ کل" کا یہ مطالبہ قدم قدم پر ناکام ہوگا، چیزوں کی ترتیب

ہی اُلٹ جائے گی، نظامِ کائنات میں انتشار پیدا ہو جائے گا، اور قیامت کا شاید وہی دن ہو گا جس دن کائنات کا ہر ذرہ "مساوات" کا دعویٰ کرے گا۔

حقیقتِ واقعہ اور نظامِ کائنات کی ترتیب یہ ہے کہ جو صفت جس چیز سے متعلق کر دی گئی ہے، اس صفت کا اظہار ہی اُس چیز کا کمال ہے، جسم کے لئے جس طرح دیکھنا ضروری ہے اسی طرح چلنا بھی ضروری ہے، آنکھیں اور پاؤں دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، تناور درختوں کی لکڑی عمارت کے کام کی ضرورت کو پورا کرتی ہے، اور گل و لالہ سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اور اُن کے رنگ بو سے انسان کی قوتِ شامہ اور قوتِ باصرہ استفادہ کرتی ہیں ——— کوئلہ اور ہیرے کے کیمیاوی اجزا ایک ہی ہیں اور یہ دونوں "نیک گوہر اند" کے مصداق ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ کوئلوں کو بے ترتیبی کے ساتھ پھٹی پرانی بوریوں میں بھر دیا جاتا ہے اور ہیرے کو لوگ مخمل و دیبا کی خوشنما صندوقچیوں میں رکھتے ہیں مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئلہ کا کام، ہیرے انجام نہیں دے سکتے، پانی گرم کرنے اور روٹی پکانے کی ضرورت ہو تو قیمتی سے قیمتی ہیرے، بھی بیکار ہیں اس ضرورت کو کوئلے ہی پورا کر سکتے ہیں ——— شیخ سعدیؒ نے بڑی حکمت آمیز حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بیابان میں بھوکا تھا، اور اس کے پاس سچے موتیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں موجود تھیں مگر وہ افسوس کرتا تھا اور چیختا تھا کہ کاش! ان سچے موتیوں کی جگہ میرے پاس بھنے ہوئے جو ہوتے کہ میں انہیں پھانک کر اور چبا کر اپنی بھوک دور کر لیتا، یہ موتی میرے کس کام کے؟

واقعہ یہ ہے کہ جس مقام پر جس چیز کی ضرورت ہے وہاں وہ "ممتاز" ہے، "معزز" ہے "ضروری" ہے، اور "مفید" ہے، ایک پیسہ کی ادنیٰ سی سوئی جس ضرورت کو پورا کرتی ہے، اُس ضرورت کی تکمیل ہزاروں روپیہ کی قیمتی تلوار کے بس کی بات نہیں جہاں نوکِ سوزن کام کرتی ہے، وہاں نوکِ شمشیر بیکار ہے، اور جہاں تلوار اپنے جوہر دکھاتی ہے وہاں سوئی کچھ نہیں کر سکتی ——— تو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جس چیز سے جو کام متعلق ہے اُسی کا پورا کرنا اُس چیز کا فریضہ ہے تو یہ نہ تو "مساوات" کی نفی ہے اور نہ اس کا نام "غلامی" کی تعلیم ہے، یہ تو قدرت کا مطالبہ اور فطرت کا داعیہ ہے۔

## مرد و عورت

ان نکتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت پر اگر غور کیا جائے تو جس طرح دو اور دو (۲ + ۲ = ۴) چار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حقیقت بھی کسی ابہام اور تشکیک کے بغیر فوراً سمجھ میں آجائے گی کہ مرد اور عورت کا وظیفۂ حیات بالکل ایک جیسا نہیں ہے، اُس میں امتیاز ہے، تخصیص ہے بلکہ تفریق ہے۔

مرد اور عورت (لڑکے اور لڑکی) کے بلوغ کے آثار و علائم میں بہت کچھ فرق ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جسے ہم بدوِ شعور کے دورِ ثانی سے تعبیر کر سکتے ہیں، مرد قوت فاعلہ کا مالک ہے اور عورت کو قوتِ منفعلہ دی گئی ہے، مرد و عورت کے اقتران کے بعد مرد کسی جھمیلے میں گرفتار نہیں ہوتا، برخلاف اس کے عورت کو ذرا تک ذمہ داری کے ایک نازک دور سے گزرنا ہوتا ہے، آخری ڈھائی تین مہینے تو مریضوں کی طرح کٹتے ہیں، سچ پوچھئے تو وضعِ حمل کے بعد عورت کو نئی زندگی ملتی ہے، بہت ممکن ہے کہ سائنس کے ذریعہ یہ مدت کم کر دی جائے یا کچھ اور تبدیلیاں ظہور میں آجائیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت کے "عورت" پن کو نہیں بدلا جا سکتا۔

ہم اس سلسلہ کو پھیلا کر اپنے مضمون کو "تشریح الابدان" کا "باب" بنانا نہیں چاہتے، ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے وہ کوئی "انکشاف" نہیں ہے، یہ باتیں تو سب کو معلوم ہیں، ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی اس بات کو جانتا ہے

کہ بچہ کو دودھ ماں[1] ہی پلا سکتی ہے، باپ[1] میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی، مرد اور عورت کی جسمانی ساخت کا اختلاف اور دونوں کے وظیفۂ عمل کی تفریق اس قدر بدیہی ہے کہ اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

اطبائے مرد و عورت کے مخ اور تلافیفِ دماغ کو تول کر اور ناپ کر دیکھا ہے تو اُن میں تفاوت پایا ہے، عورت خلقی طور پر نازک اور مرد سخت اندام واقع ہوا ہے، عورت کی سرشت میں رفق و ملائمت اور انفعالیت پائی جاتی ہے اور مرد کی جبلت اُس درشتی فعال سے عبارت ہے جو ایک نگہبان اور محافظ کے لئے ضروری ہے! آپ اُس کو انفعالیت سے تعبیر کیجئے، نازکی کہئے یا شرم وحیا کا نام دیجئے، بہرحال، "نسوانیت" عورت کا مخصوص وصف ہے، جو اُسے مرد سے ممیز کرتا ہے۔

اسلام جو دینِ فطرت ہے اُس نے عورت کے حق کو پہچانا اور معاشرت میں اُس کے مقام کا تعین کیا، اسلام نے عورت کی عصمت، عفت اور پاکیزگی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھا کہ عورت کی سیرت و کردار اور اُس کی تمام صفات اور خوبیوں کا مرکز یہی وصف ـــــ "عصمت" ہے، اسلام نے نفس و خواہش کے ان فتنوں کی نشان دہی کی جہاں عورت کی عفت و پاکیزگی پر آنچ آنے کا امکان ہے، اسلام نے صنفِ نازک پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ اُس کی عصمت و آبرو کی حفاظت کے لئے احتیاط کی جائز اور فطری حدیں قایم کر دیں، عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی "زینت" کو چھپائیں، نامحرم مردوں کی نگاہوں سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے چہروں پر "جلباب" ڈال لیا کریں، اسلام نے اجنبی اور غیر محرم مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کو شدت کے ساتھ روکا کہ نفس و خواہش کا یہ بہت بڑا فتنہ ہے، ضرورت کے وقت اس کی تو اجازت دی کہ عورت، غیر محرم مرد سے بات چیت کر سکتی ہے مگر ساتھ ہی عورتوں کو اس کی بھی تاکید کر دی کہ اس طرح ہرگز گفتگو نہ کی جائے کہ اندازِ کلام اور طرزِ گفتگو سے مخاطب (مرد) کو ذرا سا بھی سہارا ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت عطر لگا کر باہر نکلتی ہے وہ بدکار (زانیہ) ہے، خاندان کے وہ نامحرم رشتہ دار جن کے سامنے عام طور پر عورتیں آ جاتی ہیں اُن میں شوہر کے بھائی یعنی "دیور" کے بارے میں فرمایا کہ "دیور، تو عورت کے لئے موت ہے"

دنیا نے عورت کو "ذاتی ملکیت" سمجھ رکھا تھا معاشرت میں اُس کے حقوق نہ تھے، اور تو اور یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ عورت کو ایک ناچیز مخلوق سمجھتے تھے، یہ اسلام تھا، جس نے عورت کو ذلت کی پستی سے اُٹھا کر شرف واجتبا کے تخت پر بٹھا دیا، انسانی معاشرے میں عورت کے فطری اور جایز حقوق کا تعین کیا، اور شوہروں سے خاص طور پر کہا بلکہ حکم دیا کہ جس طرح تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح تم پر بھی عورتوں کے حقوق ہیں، شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی تسکینِ قلب کا سبب بتایا کہ یہی قلبی رابطہ ہی زندگی کی جان ہے۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لئے اسلامی نظام میں نہ تو افراط پائی جاتی ہے اور نہ وہاں تفریط ملتی ہے، وہ تو اعتدال کی راہ ہے، صراطِ مستقیم، جادۂ راستی کہ جہاں قدم قدم پر احتیاط کے نشانات لگے ہوئے ہیں تاکہ رہرو بھٹکنے نہ پائے، اسلام اس کو جائز قرار دیتا ہے کہ ضرورت کے وقت عورت گھر سے باہر جا سکتی ہے، مگر عورت کا گھر سے یہ باہر جانا اپنے حسن و زینت کی نمایش کے لئے نہ ہو، وہ گھر سے طرح بن سنور کر نہ نکلے کہ حسن و زیبائی کی قیامتیں اُس کے جلو میں ہوں، اسلام عورت کو یقیناً "گڑیا" بنا کر رکھنا نہیں چاہتا، مگر ساتھ ہی اسلام عورت کو "ایکٹریس" بننے کی اجازت بھی دینے کیلئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہے، اسلام کی نگاہ میں عورت کا سب سے بڑا وصف عصمتِ کردار، عفتِ زندگی اور پاکیزگیٔ سیرت ہے، جہاں جہاں اس پر حرف آتا ہے، وہاں اسلام عصمت و استقامت اور بے راہ روی کے درمیان دیوار بنکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

---

[1] ماں، باپ سے یہاں مرد اور عورت مراد ہیں۔

## معاشرت کی تقسیم

معاشرت کی صحیح تقسیم یہ ہے کہ مرد معیشت کا بادشاہ ہے اور عورت تدبیر منزل کی ملکہ ہے، اُس پر ان بچوں کی غور و پرداخت کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ جن کو بڑے ہوکر قوم کا معمار بننا ہے، یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے، یہ فریضہ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے معاشرے کی روح اور جان ہے، آج کا بچہ، کل کا باپ ہوتا ہے، جس کو بچپن میں صحیح تربیت نہ ملی وہ بڑے ہوکر بھی ناتراشیدہ ہی رہتا ہے، جس قوم کے بچے بگڑے ہیں اُس قوم کی بنیاد ہی کھوکھلی ہو گئی، بگڑے ہوئے بچے بڑے ہوکر معاشرے کے لئے ایک مستقل لعنت اور زندہ عذاب بن جاتے ہیں، جس باغ کی نئی پود ہی نکمی ہو، اُس کے مستقبل کو بہار کی شگفتہ سامانیوں سے مایوس ہو جانا چاہیے جن پودوں کی جڑوں میں خرابی پیدا ہو گئی ہو، اُن کی شاخوں اور پتیوں پر آبِ حیات چھڑکنے سے بھی تر و تازگی نہیں آسکتی۔

گھریلو معاشرت میں بچوں کی زندگیوں پر عورتیں، مردوں سے بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ "گھر" بچہ کی پہلی تربیت گاہ ہے، اُس کی زندگی کی عمارت کی پہلی اینٹ اسی گھریلو یونیورسٹی میں رکھی جاتی ہے، غلط تربیت اور بُرے ماحول کے سبب خشتِ اوّل اگر کہیں ٹیڑھی رکھ دی گئی تو یہ عمارت چاہے زہرہ و پروین سے بھی زیادہ بلند کیوں نہ ہو جائے مگر رہے گی ٹیڑھی اور خم کھائی ہوئی۔

ماں کا فرض ہے کہ وہ شرافت، غیرت اور خودداری کو اولاد کی گھٹی میں ملا کر پلادے، شریف، غیرت مند اور خوددار اولاد معیشت و معاشرت کی منزل میں جب قدم رکھے گی تو عزتیں اور کامرانیاں اُس کا استقبال کریں گی، ایسے بچے جوان ہوکر بہترین شہری ہوں گے، انسانیت کو اُن کے وجود سے فائدہ پہونچے گا وہ خود بھی نیک ہوں گے اور دوسروں کو بھی نیکی کی طرف لائیں گے۔ جن بچوں کی شرافت اور نیکی کے نہج پر تربیت ہوئی ہوگی، وہ فقر و فاقہ کی حالت میں بھی خود فروشی نہ کریں گے اور راحت و آسودگی اُن کو خودنما نہ بنائیں گی۔

## عورت پر ظلم

آج کی دنیا میں "عورت" مزدور اور کسان سے کم مظلوم نہیں ہے، نئی تہذیب نے بیچاری عورت کو "آزادی" کے نام پر خواہشوں کی خوشنما زنجیروں میں جکڑ دیا ہے، عورت سے اُس کا "عورت پن" چھینا جا رہا ہے، اس سے بڑھ کر اور ظلم عورت کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟

ترقی پسند اور تہذیب زدہ مرد، عورت کی آبرو کا دشمن ہے، وہ اپنے ذوقِ ہوس کو تسکین دینے کے لئے عورت کو ہر جگہ لئے پھرتا ہے، اسمبلی ہالوں میں، سینماؤں میں، کلب گھروں میں، رقص خانوں میں، کالجوں میں، دانش گاہوں میں ——— وہ عورت کو لیکر تالابوں میں تیرتا ہے، گھوڑوں پر چڑھا کر "پولو" کے میدان میں دوڑاتا ہے، اُس نے عورت کو دفتر میں لیجا کر بٹھا دیا ہے، ہوٹلوں میں عورت سے ساقی گری کا کام لیتا ہے، مشاعروں کے اسٹیج پر اُس سے شعر پڑھواتا ہے، وہ عورت کو اپنی دوکان، ہوٹل اور تماشا گاہ پر اس لئے بٹھاتا ہے کہ گاہک زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوں، گویا مرد نے عورت کی آبرو، عصمت اور حُسن و جوانی کو ذریعہ تجارت بنا رکھا ہے ——— اور عورت کی نادانی اور سادہ لوحی کا یہ عالم ہے کہ وہ مرد کی خواہشوں کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے چل رہی ہے، جسے تاریخ عہدِ جاہلیت کہتی ہے اور جس دور میں عورت کی مظلومیت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، وہ دور اس تہذیب زدہ دور سے پھر اچھا تھا کہ عورت کو کسی نہ کسی حد تک اپنی گراوٹ، ذلت اور مظلومیت کا احساس تو تھا، اور تہذیبِ حاضر کی شعبدہ گری کا یہ عالم ہے کہ عورت نے مرد کے ظلم کو عینِ انصاف اور کمالِ ہمدردی سمجھ رکھا ہے، مرد خدا اشارہ کرتا ہے، اور عورت اُس سے بغل گیر ہوکر بھری محفل میں ناچنے لگتی ہے، اُس کے ایک اخباری، اعلان پر بیسیوں

کنواری لڑکیاں "نیشنل گارڈ" میں بھرتی ہونے کے لئے کشاں کشاں چلی آتی ہیں، مرد کی مرضی پاکر عورت خوشی کے ساتھ مخلوط کالج اور اسکول میں پہونچ گئی! مرد نے عورت کی غیرت کو نہ جانے افیون کھلادی ہے یا عملِ تنویم (            ) کردیا ہے کہ اُسے اپنی پستی اور ذلت کا احساس تک نہیں ہوتا وہ یہ تک نہیں سمجھتی کہ اُس سے کیا چیز چھین کر، اُس کے بدلے کیا چیز دی جارہی ہے ——— اور مرد کی ہوسنا کی اپنی جیت اور کامیابی پر قہقہے لگا رہی ہے۔

## اور یہ ماحول ———؟

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات یا پوشیدہ راز نہیں ہے، یہ واقعات ہیں، مشاہدات ہیں اور کھُلے ہوئے آثار و علایم ہیں، جن کو ہر شخص دیکھتا، سمجھتا اور جانتا ہے ——— وہ یہ کہ آج کی سوسائٹی میں گناہ پوری قوت کے ساتھ رواج پاچکے ہیں، فسق و فجور کا دور ہے، پاکبازی اور عصمت و نیکو کاری کی کہیں کہیں بس پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں، دل چور، آنکھیں لٹیری، جذبات شعلہ فشاں اور تصورات ہوس پرور وہ! عصمتِ کردار کا نام ہی نام رہ گیا ہے، برائیوں کا ہر جگہ چلن ہے، فحش لٹریچر، عریاں تصاویر، نفسانی جذبات کو اُبھارنے والی موسیقی، جدھر جائیے یہی گندہ ماحول جنسی معاملات میں آدمی حیوانوں سے بھی دو قدم آگے پہونچ گیا ہے، لڑکے اور لڑکیاں ابھی بالغ نہیں ہونے پاتے کہ جنسی رجحانات شروع ہوجاتے ہیں، بے غیرتی اور بے حیائی کا عالم یہ ہے کہ لوگ مجلسوں اور محفلوں میں اپنی بدکاری کے افسانے فخر و مباہات کے ساتھ سناتے ہیں، ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر فواحش و معاصی کے جال بچھے ہوں، کیا کوئی غیرت مند انسان عورت کے "آزادانہ میل جول" کا تصور بھی کرسکتا ہے؟ جن برائیوں کی روک اور جن بے احتیاطیوں اور لغزشوں سے بچنے کے لئے "پردہ" ضروری قرار دیا گیا ہے، اُن برائیوں کی جب پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ کثرت ہو، تو سوال ڈھیل اور رخصت کا پیدا ہوتا ہو یا "شدت" کا!

ماحول کی بڑھتی ہوئی برائیوں کا ذکر آتا ہو تو بعض لوگ جھٹ سے بول اُٹھتے ہیں کہ "صاحب! ساری دنیا اسی روش پر جارہی ہو، ہم ان برائیوں کو کس طرح روکیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس ذہنیت کے آدمی زمانہ کی روش اور دنیا کی رفتار پر تہمت رکھ کر اپنے نفس کی کمزوری کو درست ثابت (              ) کرنا چاہتے ہیں ——— ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ تم اگر کسی ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں طاعون پھیلی ہوئی ہو، اور گھر کے گھر اس وبا سے متاثر ہوں، تو کیا تم اپنے نفس کو یہ سمجھا کر اُسے مطمئن کردوگے اور جب طاعون عام ہو تو لاؤ ہم بھی مرجائیں ——— ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم ایسا ہرگز نہیں کرسکتے طاعون سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جائے گی، بلکہ وبا کی جتنی زیادہ شدت ہوگی، اتنا ہی احتیاطی تدابیر میں شدت سے کام لیا جائے گا۔

سوال یہ نہیں ہو کہ زمانہ کیا کررہا ہے، اور دنیا کس روش پر جارہی ہو؟ دنیا غلط روش پر بھی جاسکتی ہے اور بارہا جاچکی ہو، یہاں تو خود تمھاری شرافت و غیرت کی موت اور زندگی کا مسئلہ درپیش ہو، تم فیصلہ کرو کہ تمھیں اپنی غیرت کی موت پسند ہے یا زندگی! اگر مرگِ غیرت پسند ہو تو ہم تم سے خطاب ہی کرنا نہیں چاہتے کہ تمھاری اور ہماری راہ جُدا جُدا ہے، اور اگر غیرت کی زندگی پر تم رضامند ہو تو اس کی حفاظت کے لئے تمھیں احتیاط، دفاع اور اقدام کی ہر تدبیر کو کام میں لانا ہوگا۔

مردوں کا آج یہ عالم ہے کہ اُن کی نگاہیں بھوکوں کی طرح عورتوں کی سمت اُٹھتی ہیں، اُن کی آنکھیں نیچی اور

جھکے رہنے کی عادت کو شاید بھول گئی ہیں، عورت چاہے تو مرد کی اس ہوسناکی کو ناکام بنا سکتی ہے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ مرد کی ہوسناک نگاہوں کی پذیرائی کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب میسر ہیں مرد چہرہ پر نگاہ ڈالتا ہے تو عورت گردن کے نیچے کی سپیدی بھی سامنے کر دیتی ہے، وہ ناخنوں اور انگلیوں کو دیکھتا ہے تو عورت شانوں تک برہنہ ہو جاتی ہے کہ لیجئے اچھی طرح سیر ہو جائیے، عورت کا لباس کوتاہ ہوتا چلا جارہا ہے، شاید اس لئے کہ مرد کی آتش شوق تیز تر ہوتی رہے ——جہاں نقابیں اور برقعے ہیں، وہاں کشش نگاہ کے لئے کافی آرائشیں موجود ہیں۔

یہ نیم باز سے برقعے، یہ دیدہ زیب نقاب
جھلک رہا ہے جھلا جھل قمیص کا ریشم

چوریوں کی جب کثرت ہو، روزانہ قفل ٹوٹتے ہوں، نقب لگتے ہوں اور جیبیں تراشی جاتی ہوں، تو کون ایسا بیوقوف ہوگا کہ اپنے مال کو چوراہہ پر ڈال آئے، ایسی حالت میں تو مال کی اور زیادہ حفاظت کی ضرورت ہے، جن صندوقوں کو اب تک کھلا چھوڑ دیا تھا، ان میں قفل ڈال دیئے جائیں گے، جو چیزیں آج تک برآمدے میں رکھی تھیں ان کو مکان کے محفوظ ترین حصہ میں رکھ دیا جائے گا، بس اسی پر معصیت زدہ ماحول اور عورت کے حجاب و غیرت کے مسئلہ کا قیاس کر لینا چاہیئے، حقیقتِ حال روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو جائے گی۔

## لغزش و ہوس

برائی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ عورت، غیر مرد کی نگاہوں کو سب سے پہلے گوارا کرتی ہے، اس "گوارائی" میں پھر لطف آنے لگتا ہے، چہرے پر سرخی دوڑنے لگتی ہے، اس احساس کے ساتھ کہ دیکھنے والی نگاہیں ہماری خوبصورتی اور دیدہ زیبی کی ستائش کر رہی ہیں، اور قدر شناس نگاہوں کو ٹھکرا دینا ایک طرح کا ظلم ہے، اور اس بے ضرر اور معصوم دلچسپی میں کیا ہرج ہے ——مگر ہوس نظارہ بازیوں ہی تک محدود ہو کر کس طرح رہ سکتی ہے، معاملہ بڑھتا، اور پانی پھیلتا ہی چلا جاتا ہے، دلچسپیاں اپنے لئے ہر طرح کی آسانیاں تلاش کرتی ہیں یہاں تک کہ بڑی سے بڑی لغزش کا امکان ہو سکتا ہے۔

غیرت کا احساس، انتہائی نازک اور لطیف ہوتا ہے، اس کو بار بار ٹھیس پہونچتی ہے تو یہ احساس کمزور ہو جاتا ہے، مرد جب عورت کی بے حجابی کے سلسلہ میں ایک بار بے غیرتی کو گوارا کر لیتا ہے اور ضمیر کی ملامت کی کوئی پروا نہیں کرتا تو یہ "لے" بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی بیوی، ماں بہن کی خوبصورتی ناز و ادا اور عشوہ و تبسم کی تعریفیں رسالوں اخبارول اور کتابوں میں شائع ہوتی ہیں اور اس کی غیرت کو جنبش تک نہیں ہوتی۔

درسگاہوں، دفتروں، کمپنیوں، ہوائی جہازوں، ہسپتالوں اور کلب گھروں میں —— غرض جہاں جہاں مرد و عورت کا اختلاط پایا جاتا ہے، اس کے نتائج ہر کسی کو معلوم ہیں، یہ بات اب راز نہیں رہی، جو کوئی اس معصیت آلود ماحول میں عورت کو (چاہے وہ معیشت ہی کی ضرورت سے کیوں نہ ہو) بے کانہ اختلاط اور مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول کی اجازت۔۔ احتیاطیں مقرر کی ہیں، ان سے جہاں کہیں جس قدر بھی تجاوز ہوگا بے اعتدالی پیدا ہو کر رہے گی۔

مغربی ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، "آزادی" کے نام پر وہاں جس درندگی اور حیوانیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے، وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے بہت کافی ہے، ہوس کاری نے وہاں اخلاق کی قدروں کو بدل دیا ہے اور زندگی سرتاپا لغزش و گناہ بن کر رہ گئی ہے، مغربی ملکوں کی معاشرت کے بارے میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے یہ "ملاؤں" اور "مولویوں" کا پروپیگنڈا نہیں ہے یہ کھلی ہوئی حقیقت اور بدیہی واقعات ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا، مغرب آج کی دنیا میں

عصمت فروشی، اور بداخلاقی کی سب سے بڑی منڈی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کو "گڑیا" بنا کر نہیں رکھا جائے گا، تو اُسی کے ساتھ یہ بھی سُن لیجئے کہ عورت کو ہم "تتلی" کی طرح آزادی بھی نہیں دے سکتے کہ جو نئے نئے پھولوں کی تلاش میں گھومتی رہتی ہو اور ہوا کا ہر جھونکا جس کے رُخ کو بدل دیتا ہے۔

عورت کو آلاتِ حرب کا استعمال بھی سکھایا جاسکتا ہے، مگر فوجی تربیت دینے سے پہلے اخلاق و پاکیزگی کی تربیت ضروری ہے، "عسکریت" اور "Self Defence" کے نام پر بے حجابی اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کو گوارا نہیں کیا جاسکتا، جو عورت غیر مردوں کے سامنے سینہ تان کر سلامی دیتی ہے، اُس کی بندوق اُسکی عصمت و آبرو کی حفاظت کا فرض انجام دینے سے قاصر رہتی ہے، کہ نیکوکاری پاکبازی اور غیرت کی خود اُس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، جس چیز کو آدمی اہمیت ہی نہیں دیتا ہو اُس کا بچاؤ وہ کیوں کرنے لگا؟

عورت ضرورت کے وقت معیشت میں بھی مرد کا ہاتھ بٹا سکتی ہے، فوجی تعلیم بھی اُس کو دی جاسکتی ہے، مگر یہ سب کچھ اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر رہ کر ہونا چاہیئے، یہ حدود جہاں ٹوٹتے ہوئے نظر آئیں یا ٹوٹنے کا امکان ہو، وہاں عورت کا ان فتنوں سے دور رہنا ضروری ہے۔

جو عورتیں بے پردہ ہوکر گھر سے باہر نکلتی ہیں، پارکوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں جاتی اور مخلوط پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں، اُن کو لباس اور اسباب آرائش پر اُن عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے جو پردے میں رہتی ہیں اور جن کی زندگی میں اختلاط و بے حجابی شامل نہیں ہے، تو بے حجابی اور بے نقابی اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک وبال ہے ـــــــ بے حجاب عورت کے شوقِ آرائش اور ذوقِ نمود کی تسکین اور تکمیل کے لئے یقیناً اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آمدنی کو بڑھایا جائے، اضافہ آمدنی کی تین صورتیں ہیں (۱) مرد اپنی حقیقی اور اصلی آمدنی (Permanent income) کو بڑھائے اور اس کے لئے مرد کو کام اور محنت کے اوقات میں اضافہ کرنا ہوگا یا پھر وہ ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرے گا (۲) اپنے مصارف کو پورا کرنے کے لئے عورت خود کمائے، اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کپڑوں کی سلائی تو کرنے سے رہی، اُسے لامحالہ معیشت گاہوں میں جانا ہوگا، جہاں غیر مردوں سے قدم قدم پر سابقہ پڑے گا اُن سے اختلاط کی نوبت آئے گی ـــــــ اور وہ فتنہ جو عورت کی عصمت و عفت کا دشمن ہے، اُس میں مبتلا ہوئے بغیر وہ بچ نہیں سکتی، ہوسکتا ہے کہ کوئی نیک بخت اس طوفان سے سوکھی ہی نکل آئے، مگر امکان تردامنی کا زیادہ ہے، اور یہ ہم بہت احتیاط کے ساتھ واقعہ کی شدت کو گھٹا کر بات کہہ رہے ہیں، ورنہ سچ تو یہ ہے ؎

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار ـــــــ (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ عورت بڑھے ہوئے مصارف کی تکمیل کیلئے غیر مرد کی امداد کو گوارا کرلے اور اُسے "Presents" قبول کرنے کی چاٹ پڑ جائے، اس میں تو عورت کی سو فی صدی تباہی ہے۔

**پاکستان میں!** پاکستان میں بے حجابی اور بے غیرتی کا یہ فتنہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے، جن کے آنچلوں پر کبھی مہر و ماہ کی بھی نگاہ نہ پڑتی تھی، اُن کے کھلے ہوئے گریبان اور ننگی پنڈلیاں نظر آرہی ہیں، پاکستان بے حجابی کے لئے نہیں، حجاب و غیرت اور شرم و حیا کے لئے بنا تھا، بے حجابی، عُریانی اور بے غیرتی پاکستان کے ساتھ ایک طرح کی دشمنی اور اُس کے اساسی اصول کے ساتھ کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

بے حجابی کے اس فتنہ کو قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے، ہم اپنے شہروں کو بغداد، قاہرہ اور طہران ہرگز نہیں بننے دیں گے، وہ جو علامہ اقبال نے مسلمان عورت کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

تو پاکستان کو ایسی ہی غیرت مند خاتونوں کی ضرورت ہے کہ جو سیدہ فاطمہؓ کی طرح "حسینؓ" جیسے جانبازوں کو جنم دیسکیں، قوم، بربط نواز، نغمہ ساز اور موسیقار عورتوں سے پناہ مانگتی ہے، اُسے تو ایسی "مخدرات" چاہئیں جن کا سوزِ قرأت مردوں کی تقدیر کو بدل دے۔

تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو
دگر گوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

ہمیں تدبیرِ منزل کی ملکہ اور خانہ داری کی شہزادیاں چاہئیں، اسٹیج کی ایکٹریس نہیں چاہئیں، اسلام کے نقطۂ نگاہ سے "ملکہ نور جہاں" بھی معیاری عورت نہیں ہے کہ جس کا نقشِ قدم مسلمان عورتوں کے لئے دلیلِ راہ ہوسکے، اسلام کی نگاہ میں نسوانی کردار کا معیار خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، حفصہؓ، زینبؓ، صفیہؓ، خولہؓ، اسماءؓ اور رابعہؒ بصری (اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں) کی زندگیاں ہیں۔

وہ ـــــ کہ جن کی غیرت مفلوج ہوگئی ہے اُن سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے، اور ہم اُن سے کچھ کہیں گے تو وہ ہماری بات توجہ کے ساتھ سننے کیوں لگے! وہ تو اُلٹا ہمارا مذاق اُڑائیں گے کہ تم بڑے ہی قدامت پرست اور دقیانوسی واقع ہوئے ہو جو ایسی باتیں کرتے ہو ـــــ ہمارا خطاب غیرت مند مسلمانوں سے ہے، اُن مسلمانوں سے جو آج بھی آن پر جان دے سکتے ہیں، جن کے سینوں میں اسلامی حمیت بیدار ہے اور جن کی آنکھوں میں شرم و غیرت کے آتش فشاں بند ہیں۔

جو شخص جو کچھ بھی کرسکتا ہے اس فتنہ بے حجابی کے روکنے میں کوتاہی نہ کرے ورنہ اللہ کے یہاں اس کوتاہی کی اُسے جوابدہی کرنی ہوگی، معیشت و سیاست اور مذہب و ادب کے ہر اسٹیج سے یہی آواز بلند ہونی چاہیئے ـــــ کہ ـــــ

"نسوانیت اور حجاب لازم و ملزوم ہیں"

ماہر القادری

لارڈ ایوبری

تسنیم مینائی

# سیرت یا کردار!

> سر والٹر اسکاٹ جب بستر مرگ پر تھا تو اُس نے اپنے داماد لاکھارٹ کو بُلا کر کہا:-
> **نیک بنو نیک، مذہب کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور اچھا انسان بننے کی برابر کوشش کئے جاؤ ـــــــــ**

لارڈ ایوبری (Lord Avebury) کی معرکہ آرا تصنیف "مصرفِ حیات" "THE USE OF LIFE" کے ایک باب کا آزاد ترجمہ ـــــــــ فاضل مترجم نے مفہوم کی وضاحت اور افہام و تفہیم کی سہولت کے لئے شعروں کا اضافہ کیا ہے!

اگر
خدا کا خوف
نہیں
تو پھر آدمی، آدمی ہی نہیں!

محض دنیوی فلاح و بہبود کے لئے بھی، دانائی کے مقابلے میں کردار و استقامتِ نفس کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں، مخفی مباد کہ کردار کی اہمیت کا مدار صرف اسی قبیل کے کسی صلے یا لالچ کی اُمید پر نہیں، تاہم یہ کم و بیش درست ہے کہ اس عالمِ اسباب کے اندر بھی دانائی کی نسبت سیرت کے ہاتھوں انسان کو زیادہ کامیابی نصیب ہوتی ہے، نیکی کی محض سوجھ بوجھ رکھنا زیادہ مفید نہیں، افادیت اور اہمیت ہے نیکی کرنے کی، ہم نیکی کے طلبگار ہوں یا خوش حالی اور شادمانی کے سیدھا راستہ ایک ہے، یعنی خوفِ خدا کی منزل جس کو سچائی اور اچھائی کی شاہراہ کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، دراصل اچھے اعمال ہی اچھی جزا کی بشارت دے سکتے ہیں۔

زندگی کی قدر و قیمت کا اصلی معیار صرف اس کی اخلاقی حیثیت اور اس کا روحانی مرتبہ ہے، ایک بار اگر اس کا ہم تہیّہ کر لیں کہ ضمیر کی آواز جدھر بلائے گی، تو توقف یا تامّل کے بغیر ہم اُدھر ہی جائیں گے تو یہ جان لو کہ سراپا عصیاں

وخطائے مجسم انسان کو اپنی تقدیر کا خزانہ، مسرتوں اور برکتوں کی شکل میں مل گیا۔

ہماری مسرتیں کبھی دیرپا یا دائم ہو ہی نہیں سکتیں اگر ہم ادائے فرض سے جی چراتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ دانا ہوں یا دردمند، سب اچھے انسانوں کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ

"اُن کے نشاط خانۂ امروز میں نہیں — وہ بزدلی کہ خطرۂ فردا، کہیں جسے"
رکھتے ہیں سوئے منزل مقصود فرض وعشق — ایسی نگاہ، دیدۂ بینا، کہیں جسے
لبیک کہہ کے دوڑ رہے ہیں اسی کی سمت — اس شان سے ودیعت کبریٰ کہیں جسے

خوف وخطر ہزار ہوں منزل کی راہ میں
لاتے نہیں کسی کو وہ اپنی نگاہ میں

کبھی یہ بھی تو سوچو کہ یہی کامیابی کے لئے کیا درکار ہے؟ کیا سیم وزر، قوت واقتدار، شہرت ومنزلت، دانائی اور آزادی ..... نہیں ان میں سے ہر چیز بے سود ہے، یہاں تک کہ محض تندرستی بھی کارآمد نہیں ——— حقیقی کامیابی کا ضامن حسن سیرت اور صرف حسن سیرت ہے، انسان کی یہی وہ تنہا صفت ہے جو "مکمل ضبط نفس" کی صورت میں جلوہ گر ہوکر، اُس کو فوز وکامرانی کی حقیقی منزل پر پہونچاتی ہے ——— صرف یہی ایک ایسی صفت ہی جو پورے طریقہ سے انسان کی محافظت کا فرض انجام دے سکتی ہے، اور اگر اس انداز پر ہماری محافظت نہ ہوئی یا نہ ہوسکی تو پھر العیاذ باللہ!

؎ اب اپنا یہ عالم ہے کہ دُنیا ہے نہ دیں ہے

سیرت یا کردار کی ہم جس طرح تعمیر کریں گے ویسی ہی عمارت بنے گی، اس باب میں تقدیر کا شکوہ کرنا بے محل اور بے جا ہے ؎ تو خود تقدیر یزداں، کیوں نہیں ہے، سب کے سب آدمی تو اعلیٰ درجہ کے صاحبانِ کمال ہو نہیں سکتے کہ وہ شاعری میں اقبال[۱] اور موسیقی میں تان سین[۲] بن جائیں یا حکمت وفلسفہ میں مہارت تامہ حاصل کرلیں، آخر اور بھی تو بہت سی شقیں زندگی کی ایسی ہیں جن کے تعلق سے انسان اپنی فطرت کے جوہر نمایاں کرسکتا ہو ہاں یہ ضرور ہے کہ شاعروں موسیقاروں کی سی شہرت نصیب نہ ہوگی لیکن مقصد تخلیق کو فوت ہوتے دیکھنے کا تو وہ گنہ گار نہ ہوگا، ہم کو ان چھپے رہے جوہروں پر صیقل کرنے کی کوشش وسعی کرنی چاہئے یا ان میں سے کم سے کم ایسوں پر جن پر ہم کو کامل دسترس ہو، اخلاص، بُردباری، محنت کشی، ترکِ تعیش، دردمندی، حقگوئی، کشادہ دلی، فراخ حوصلگی، فضول باتوں سے اجتناب یہ اور کتنے محاسن ایسے ہیں جن کی خدمت کرکے ہم اپنی فطری صلاحیتوں کو اُجاگر کرسکتے ہیں، اور جن کے تعلق سے کسی نااہلیت یا ناموزونیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، کتنے تاسف وافسوس کا مقام ہے کہ پھر بھی ہم پستیوں میں پڑے رہنے پر قانع اور خوش ہیں۔

اگر ہر معاملہ میں شکوہ سنجی ہی کو شعار بنائیں، اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے نقائص ہی کا رونا روتے رہیں اور دوں کے آگے جھکنے، اُن کی خوشامدیں کرنے اور صرف اُنھیں کو خوش کرنے کی تدبیریں سوچنے اور کرتے رہیں، ظاہری ٹیپ ٹاپ پر جان دیتے رہیں ——— تو کیا ایسا کرنے سے دل ودماغ کی اُلجھن سے نجات مل سکتی ہے؟ نہیں، واللہ نہیں؟

اگر ہم چاہیں، ہمت اور بلند نظری سے کام لیں تو پلک مارتے میں اس مصیبت سے نجات مل سکتی ہے! تو پھر ہمیں آخر یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہم اس قسم کی خواہش اور کوشش کے لئے اپنے کو آمادہ نہیں کرتے! اگر ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہو، ہماری عقل موٹی ہے، ہم غبی ہیں ——— تو اس صورت میں ہم کو اور زیادہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس کو جھوٹ ثابت کردیں، ہم کو

---

۱و۲؎ ناموں کی تبدیلی مترجم نے کی!

زیادہ جدوجہد کرنی چاہئے نہ کہ اس سے غفلت برتیں یا ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائیں اور اسی میں فخر و مباہات محسوس کریں۔
جس کام پر بعد کو ندامت ہو یا افسوس، وہ کرنا ہی نہ چاہئے، ضمیر سے بڑا رہبر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ــ (Sameea) کے بقول "ضمیر پاک ایک ہمہ گیر اور مستقل لذت ہے"
فرینکلن جیسے فلسفی اور مفکر کے مشورے عموماً ٹھیک ہوتے ہیں، لیکن اس باب میں اُس کا جو نظریہ تھا اس کی تائید اور پیروی دشوار معلوم ہوتی ہے، نیکی کی تعریف اور اُس کا واضح اور جامع خلاصہ پیش کرنے کے بعد اُس نے یہ رائے ظاہر کی ہے ـــــ "مقصدِ اصلی کیا ہے؟ تمام بنیادی نیکیوں کا حصول، یعنی اپنے تئیں اُن سب کو اختیار کرنے پر آمادہ کرنا اور پھر قادر بنانا، بیک وقت تمام بنیادی نیکیوں پر قدرت و اختیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جانا خالی از دشواری نہیں پھر کیوں نہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ ایک ایک کرکے اُن پر قدرت حاصل کی جائے پہلے سب سے اہم اور اعلیٰ کو لیا جائے، جب اُس پر مکمل دسترس ہو جائے تو اہلیت اور بلندی کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر جو نیکی ہو اُس کے اختیار میں، اسی طرح کوشش کی جائے تاآں کہ سب کے سب (جو اُس کی دانست میں گنتی میں تیرہ[۱۳] ہیں) جزوِ سیرت اور جوہرِ کردار بن جائیں" ـــــ فرینکلن نے اس طریقہ کو اختیار کرکے کامیابی کا منہ دیکھا ہو، اس کا تصور اور یقین محال ہے، کیونکہ ایک دانشور نے کہا ہے :-
"ابلیس کے چیلے چانٹوں میں سے کسی کی ضیافت اور آؤ بھگت کی، اور پھر یہ سارے کا سارا ٹانڈا دھنا دے بیٹھا"
عیسائی اسقف ولسن نے اپنے ایک وعظ میں کہا تھا کہ "کسی کو خیرات دے کر یہ مشورہ دینا کہ جاؤ اس رقم سے شراب پی لو یا جوا کھیلو، یا کسی دوسرے گناہ کے ذریعہ اپنی تشنگیٔ ہوس بجھالو ـــــ کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، خود تو کارِ خیر کیا اور اُس کارِ خیر سے جس کی اعانت کی اُس کو شر کی تعلیم دی ـــــ ہر چہ خود نہ پسندی، بر دیگراں مپسند۔
نگاہِ بلند، اور پیش بینی، یہ انسان کی وہ سعادتیں ہیں جن کا دامن کبھی نہ چھوڑنا چاہئے، پست ہمتی کو پاس نہ پھٹکنے دینا، کامیابی کے تعلق سے رازِ حیات ہے، ایک فرنگی فلسفی نے کہا ہے کہ جو اوپر نگراں نہیں رہتا، آگے کی طرف نہیں دیکھتا، وہ ایک نہ ایک دن مڑ کر پیچھے دیکھنے لگے گا یا جھک کر نیچے دیکھے گا، اس طرح جس کی منزل، مقامِ محمود ہے، وہ تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے،

ہمت بلند دار، کہ پیش خدا و خلق باشد بقدرِ ہمتِ تو، اعتبارِ تو،

انسان اور کائنات کی مادی منزل آخر پر نظر کرتے، بظاہر محض دنیوی فلاح و بہبود، ترقی اور تیز گامی، کے اعتبار سے بلند نظری، اور علو ہمتی، بے معنی سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، مگر کیا مشاہیر نے (وہ چاہے ادب سے متعلق ہوں یا رشد و ہدایت سے) اس بنیاد پر کسی حال میں بھی ان خصائص سے قطع نظر کی یہی وجہ ہے کہ مشاہیر میں سے کوئی بھی شہرت یا قابلیت کے جوہر چمکنے کے لئے حکومتوں یا درباروں کا محتاج نہیں رہا، شیکسپیر، سعدی، ڈاروِن، گیٹے، ان میں سے کوئی بھی نواب ہے نہ درباری، یہ نام آور ہستیاں :-

؎ جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

اگر محض دنیوی ترقی کے اعتبار سے حوصلہ مندی پائی جاتی ہے تو اس کے اندر ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی منزلِ آسودگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، جس طرح پہاڑوں کی سیر کرتے ہوئے ایک چوٹی پر پہنچو تو دور، آگے، اُس سے بلند چوٹی نظر آتی ہے، اس لئے فاتحینِ عالم کے زمرے میں ایک نام بھی ایسا نہیں ملتا کہ فوز و کامرانی اور رفعت و ترقی کے بعد جسے آسودگی اور جمعیتِ خاطر نصیب ہوئی ہو۔ ـــــ تاریخ اس باب میں خاموش ہے، ان سب کا یہ مسلک تھا ؎ راہوں کے بعد منزل، منزل کے بعد راہیں ـــــ

---

۱۳؎ تزکیہ[۱]، کم سخنی[۲]، نظم و ضبط[۳]، عزم[۴]، سادگی[۵]، جفاکشی[۶]، اخلاص مندی[۷]، عدل گستری[۸]، اعتدال[۹]، صفائی[۱۰]، پاکیزگی[۱۱]، انکساری[۱۲]، اور اطمینانِ قلب[۱۳]۔

بیکن نے غالباً انہیں افراد کو سامنے رکھ کہا ہے کہ جو آگے بڑھنے جانے کا خوگر ہو جائے وہ رُکا یا رو کا گیا تو خود اپنی نظروں سے بھی گر جاتا ہے اور ساری جولانی اور اُمنگ رفوچکر ہو جاتی ہے۔"

یہ ہے اصل پوزیشن علو ہمتی اور بلند نظری کی، سیرت یا کردار کے خاکے میں کون ہو جو اس پوزیشن سے اختلاف کر سکے، اسی لئے کسی گم کردہ منزل شاعر نے کہا ہے:۔

ناموری کا لمحہ بہتر گمنامی کی عمر ابد سے

غرض مندانہ عالی حوصلگی یا اُس کی بنیاد پر حاصل کی ہوئی سستی شہرت، حقیقت میں ایک سراب ہے، ایک قسم کا شعلۂ مستعجل ایک طرح کا دلفریب دھوکا، جس کی وقتی جاذبیت اور دلکشی فکر کو کچھ اس طرح موہ لیتی ہے کہ ادراک کی آنکھیں پل بھر کے لئے بند ہو جاتی ہیں، اور انسان بہ تقاضائے بشری، دلفریبی کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہو، شاعر نے اسی لئے کہا تھا۔ .. .. ..

ع یہ ہے ایک دلفریب سا دھوکا

"اور یہ دھوکا نوجوانوں کے ذہن وفکر میں نقب لگا کر اپنے داخل ہونے کے لئے ایک دریچہ سا بنا لیتا ہے۔"

"کچی دیواریں ڈھے جاتی ہیں، مٹی کی کٹیا، شاہی محل بن جاتی ہے، اور یہ قصر فلک بوس اپنے مکین" پر ناز کرتا ہے۔۔۔ لیکن ایسی زندگی کا کیا حاصل جس کی نمود عارضی اور سیمیائی ہو۔ .. .. اور شہرت ۔۔ مگر ۔۔ افسوس ع گوش شنوا کو بھی دوام نہیں، اور مال و دولت، تو یہ بھی کب تک؟ اور لالۂ و گل، ان کی زندگی، "خود پل بھر کی ہے ۔۔۔ اور نشۂ ساغر و مل تو اس نے زندگی کو تلخیوں کے سوا اور کیا دیا ۔۔۔ یہ سب دھوکے" ہیں، فریب، طلسم بندیاں!

"غم ہستی کے کرب پیہم کو ذرا دیر کے لئے اگر ہم بھول سکتے ہیں، تو اس کی قوت صرف ایک چیز میں ہے" اور وہ ہے محبت"! مگر یہ دلفریب دھوکا سچے پریم کے امرت سے دور رہتا ہے، اس دھوکے کی بدولت چاہے " راج پاٹ مل جائیں مگر محبت کی دولت نہیں مل سکتی۔ .. .. .. یہاں تک کہ اسی عالم میں موت کا فرشتہ آن" پہونچتا ہے اور پھر جب یہ بنجارہ چل بنتا ہے۔ تو سارا ٹھاٹ باٹ، پڑا ہی رہ جاتا ہے۔ .. .. .. آہ یہ دھوکا ۔۔۔؟"

محض رُتبے اور اعزاز سے حاصل؟ ملکہ میری ڈی میڈ ی سز، جو ملکۂ فرانس، کارپرداز و نائب شاہ فرانس، بادشاہ فرانس، مادر ملکۂ ہسپانیہ، ملکۂ انگلستان، ڈچز سوائے، غرض سبھی کچھ بالا بدتر تھی، اس کا حشر چشم عبرت آگیں کے لئے پند و نصائح کا ایک مستقل درس ہو، دس برس تک سخت مصائب و افلاس میں مبتلا رہ کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے بالکل بے کسی اور بے یاری کی حالت میں، غربت و جلاوطنی کے عالم میں موت اُس کو آئی تو بمقام کولون، جرمنی کی سرزمین پر، جہاں، تمام اولاد کے گھروں سے دھتکارے جانے کے بعد، دل شکستہ ہو کر اُس نے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی، یہ ہے مراتب و اعزاز کا انجام۔

کج کلہی اور شاہنشہی، کانٹوں بھرا تاج ہو، فرق پر ہوتا ہے لیکن غیور اور دردمند انسانوں کے شانے بار محسوس کرتے ہیں خصوصاً جس کی غیرت مندی اور ذی حسی کو یہ تردد ہمیشہ بیدار اور تازہ رکھے کہ ذرا سی چوک سے، خفیف سی غلطی سے، ہزاروں لاکھوں افراد کی سرنوشت تقدیر بدل جائے گی، دکھ درد کے چشمے اُبل پڑیں گے اور تاریخ کا دھارا خدا جانے کدھر سے کدھر مُڑ جائے،

تنوع اور ارتقا زندگی کی روح ہیں، اُن کی رفتار زندگی کے دھارے میں چاہے کتنی ہی سست کیوں نہ ہو، اگر یہ چیزیں پائی جاتی ہیں تو پھر زندگی کے اندر دل پذیری اور جاذبیت باقی رہتی ہے، ورنہ تنوع کے بغیر جینا ایک وبال ہے ع

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ہر ذی رُوح کو ترقی کرنے کی لگن ہوتی ہے، اور اس باب میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے، انسان کی تخلیق ہی اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھا کرے، اور نوعی ارتقا ہو یا ارتقائے ملی، اُن کے درجات طے کرتا ہے، رُکنے کے واسطے وہ بنا ہی نہیں ہے، نہ وہ رُک جائے تو رک سکتا ہے ——— اس لئے کہ رکنے کا نام موت ہے، فنا ہے، اس لئے آگے بڑھنا، جادۂ ترقی پر گامزن رہنا، خاصۂ انسانی ہے ——— مگر اس جد و جہد میں منزل و جادۂ منزل کی راستی اور سعی و حاصل کی صالحیت کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹنا چاہیئے، برائی کر کے کسی کو کچل کر، پیس کر اور ٹھکرا کر ہم کسی بلندی تک پہونچے بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ فراز نہیں نشیب ہے۔

ایسی شکل میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کیوں کر اپنی فطرت کے ان دونوں تقاضوں کو مربوط رکھ سکتا ہے؟ ——— دراصل ہمارے تمام حوصلوں کا منتہا ہونا چاہیئے، کامل ضبطِ نفس، اور یہی ہم میں سے ہر ایک کی اصل بادشاہت ہے، اس لحاظ سے سچی ترقی نام ہوا، طلبِ علم، سعیٔ پیہم اور حصولِ خودی کے مجموعے کا! یہی ترقی پذیری ایسی ہے کہ جس منزل میں کہیں روک ٹوک نہیں، اس راہ میں جو قدم اُٹھتا ہے، منزل کو قریب تر لاتا اور ساتھ ہی جادۂ منزل کو ہموار بناتا ہے۔ لئے سب سے اعلیٰ قسم کی حوصلہ مندی ہے، ادائے فرض کا عزم :-

نہ کوئی دھوم دھڑکا، نہ کوئی نام و نمود ——— نہ قدر دانوں کے نعرے، نہ آفریں کا وجود
ادائے فرض کا سینہ میں سیلِ تیز رواں ——— اُسے جو موت بھی آئی تو وہ مر سکے گا کہاں

ڈیوک آف ولنگٹن کا نام عالمی سپہ سالاروں کی فہرست میں سرعنوان پایا جاتا ہے، اس نے جو مکاتیب یا مراسلے میدانِ جنگ سے صدر دفتر کے نام روانہ کئے تھے ان کی بابت مشہور ہے کہ "سرخروئی" کا لفظ اُن میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتا، صرف "فرض" کا تذکرہ ہے، اور دراصل ڈیوک کی کامیابی کا راز اسی اصرار میں پنہاں ہے!

مگر آج اس کو بھی دنیا بھلا بیٹھی ہے، اسی لئے ہماری مساعی کا منتہا ہونا چاہیئے، قلندرانہ حوصلہ مندی، تاریخ جن کی عظمتوں کی آج بھی شاہد ہے ــ وہ دومی فنا ہوا حبشیؓ کو دوام ہے۔

ہم غریب ہوں یا امیر، بادشاہ ہوں کہ فقیر، سو برس یا پچاس برس کے بعد یہ امتیازات کسی کو یاد نہ رہیں گے، دنیا صرف اس کو یاد رکھے گی کہ جیتے جی ہمارا جو عمل تھا وہ حق تھا کہ ناحق، اور اُسی سے ہمارے نام کے ساتھ بھلائی یا بُرائی کی نسبت اور اس کا سلسلہ ابدالاباد تک باقی رہے گا۔

رسکن جیسا صالح الخیال مفکر کہتا ہے کہ :- جو کچھ ہم نے سوچا ہے یا جانا ہے یا یقین کیا ہے بدرجہ آخر اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے، اہمیت اگر دراصل ہے کسی شے کی تو صرف اس کی کہ ہمارا عمل کیا تھا، ہم نے کیا کیا، ہم کس مسلک پر کاربند رہے،" اور اس حقیقت کا صحیح ادراک ہی مشکل ہے، عاقل انسان اسی کا اگر ادراک پیدا کر لے تو بیڑا پار ہے۔

کسی شاعر نے خوب کہا :-

"کاش انسان کو سمجھ سکتا کہ تقویٰ اور فراست ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، آدمی کتنا ہی دانا اور صاحبِ علم و فراست کیوں نہ ہو، اگر خدا کا خوف نہیں ہے تو وہ آدمی ہی نہیں ——— تقویٰ اور خوفِ خدا جنس گراں مایہ ہے، سمندر کی گہرائیوں اور پہاڑوں کی اونچائیوں میں یہ دولت نہیں مل سکتی ... عقیق و زمرد، اور لعل و گہر روپہلی اور سنہری سکّے بھی اُس کی قیمت نہیں ہو سکتے

فراست ہے تقوے ہی کا ایک نام
بچے جو بُرائی سے اُس پر سلام

تدین اور راستبازی ہمیشہ ہمارا شعار رہنا چاہیئے، پال ایکٹر نامی مفکر کی تو یہ دریافت ہے کہ "صفحہ ہستی پر اولین گناہ

جو سرزد ہوا، وہ تھا دروغ گوئی کا گناہ، بہ تعلق ذکر شجر ممنوعہ ابلیس جس کا مرتکب ہوا" ــــ دیانت اور ایمانداری نہ صرف بہترین مسلک و مشرب ہیں بلکہ واحد صحیح مسلک،

چاسر جس کو انگریزی شاعری میں فارسی کے رودکی (اور اُردو کے دکنی سے) نسبت دی جا سکتی ہے، اپنی ایک مشہور عالم نظم میں کہتا ہو " انسان اور انسانیت کا عزیز ترین سرمایہ ہے راستبازی" کلرینڈن نے اپنے ہیرو لارڈ فاک لینڈ کے لئے لکھا ہے کہ وہ راستبازی کے مسلک پر اس قدر سختی سے کاربند تھا کہ چوری کرنے کے خیال پر خود کو آمادہ کرنے سے قبل وہ خودکشی پر تیار ہو جاتا ــــ جادۂ صداقت سے تجاوز یا انحراف یا اجتناب کرنے کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا پر بھروسہ نہیں رہا اور بندوں سے وہ خائف ہو چلا ہے۔

ہم اگر غلطی پر ہیں تو شرمندہ ہو کر اس کا اعتراف کر لینا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اعتراف کرنے میں شرمایا جائے۔

بہت سے صفات حسنہ ہیں جو مل جُل کر انسان کو انسان بناتے ہیں، اور کارزارِ حیات میں مقصد تخلیق کی تکمیل کے راستے میں چراغِ راہ کا کام دیتے ہیں، وہ دراصل انسان کے اندر، "طلب صحیح" کی استعداد کو بیدار کرتے اور بڑھاتے ہیں، ان سب کے منجملہ ایک اور صرف ایک صفت، "حُسنِ کردار" ایسی ہے جو ہر آئینہ ناگزیر ہے، وہ مفقود ہو تو انسان، جوہر انسانیت سے عاری ہو جائے، کسی "مردِ بزرگ و دانا" کی جھولی اس سے خالی نہیں اور کوئی اہم بالشان کام اس کے بغیر نہ تو پایۂ تکمیل کو پہونچا اور نہ پہونچ سکتا ہے ــــ حُسنِ کردار کی رُوح ہے، راستبازی اور صداقت شعاری، چاہے وہ داخلی ہو یا خارجی، کائنات کے کسی مردِ شہید اور عبد جلیل کی زندگی پر نگاہ کرو، راستبازی کو اُن کے کیریکٹر کا سب سے نمایاں جوہر پاؤ گے، اُن کے اندر راستبازی کی تمام جُرأتیں بیدار ہوں گی وہ خود بھی سچے نکلیں گے اور دوسروں کے معاملات میں بھی اُن کی سچائی ظاہر ہو گی۔

جو سدا راستباز رہتا ہے　　صاحبِ امتیاز رہتا ہے
زیست ہی پہ نہیں ہو کچھ موقوف　　اُس پہ رب کو بھی ناز رہتا ہے

شاعر فطرت ورڈزورتھ کی رائے ہے کہ " انسان کی دو صفتیں جو بظاہر متضاد المزاج ہیں، کائنات کے اندر ہمیشہ اور ہر جگہ شانہ بہ شانہ ملتی ہیں، اعتمادِ مردانہ اور آزادی، اعتمادِ مردانہ اور خود اعتمادی ــــــــ مطیع بننا سیکھو، حاکم بننا خود بخود آجائے گا، دل و دماغ دونوں کے لئے، نظم و ضبط کا سبق بہت عمدہ اور کارآمد ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک ناقص سپاہی اچھا جنرل ہو ہی نہیں سکتا۔

اکثر لوگ غلطی یا کم فہمی سے قوائے غضبی کی حرکت کو عمل سے اور استقامت و قناعت کے وجود کو بے عملی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ استقامت و قناعت قوت اور طاقت کا مظہر ہیں، اور غصہ نشانی ہے ضُعف کی کمزوری کی اور ضبط کی کمی یا خامی کی، عمر کے ساتھ ساتھ غضبی قوتیں کمزور ہوتی جاتی ہیں مگر عادتوں میں پختگی آجاتی ہے۔

اقتدار مل جائے تو معدلت گستری اور خوش اخلاقی کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا چاہیئے، سعدیؒ نے گلستاں میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے کسی بے گناہ کے قتل کا حکم صادر کر دیا بے گناہ نے تختۂ دار پر بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اے بادشاہ تو اپنی خیر منا، ــــ میں تو دم بھر میں تکلیف سے نجات پا جاؤں گا، مگر تو عمر بھر حسرت و افسوس کی آگ میں جلا کرے گا۔

جو لوگ صاحبانِ دل ہیں اُن کو جب اقتدار ملتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی خوفِ خدا بھی اُن کے کاشانۂ دل میں پہونچ جاتا ہے یا یوں سمجھئے کہ جاگ اُٹھتا ہے، اس باب میں صحیح مسلک یہ ہے کہ اس تصور کو دل میں کبھی جگہ نہ دی جائے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں، سوچا یہ جایا کرے کہ ہمیں کرنا کیا چاہیئے، حقیقی مسرت کی منزل کو صرف یہی ایک راستہ جاتا ہے۔

اگر کبھی تذبذب ستائے کہ فرائض جو بہ یک وقت درپیش ہیں اُن میں سے کس کو ترک اور کس کو اختیار کیا جائے، تو جو فرض اقرب ہو اُس کی رسّی کو مضبوط تھام لو بعض نیک لوگ بھی اصلاحِ طغیان کے جوش میں قرابت داروں اور عزیزوں کی اصلاح سے غافل ہو جاتے ہیں، درانحالیکہ

دردمندی بھی، خیرات کی طرح گھر ہی سے شروع ہوتی ہے ـــ

اس عالم کے ہر ستری و معنوی تقاضے کا رُخ منزلِ حق کی جانب ہے، روزمرہ کی زندگی میں ہم اس کا مشاہدہ اور اطمینان کرسکتے ہیں، ہم سزا وجزا پر ایمان رکھتے ہیں، مگر سزا و جزا کا مجاز و مختار کون ہے؟ اور وہ مجاز و مختار کن ذرائع اور اسباب کی وساطت سے سزا و جزا کے متعلق اپنی مشیت کو بروئے کار لاتا ہے، سنو اور سمجھو کہ مجاز اور مختارِ کل ہے، باری تعالےٰ، اور اُس کی مشیت کی تکمیل کے لئے انسان ہی کی ذات استعمال ہوتی ہے، نظمِ فطرت ہی کچھ اس طرح سے ہے کہ نیکی کرو تو مسرت حاصل ہوگی، بدی کروگے تو حسرت و یاس سے پالا پڑے گا اس نے یہ سمجھنا کہ گناہ کرکے بھی ہم مکافات سے بچ سکتے ہیں، نظامِ فطرت کے مقررہ اور معینہ قاعدے قانون پر دسترس رکھنے اور اُس میں دخل دینے کے مرادف ہے۔

گناہ کی معافی چاہنے، یا گناہ سے توبہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا کہ پاداش کی حیثیت ختم ہوگئی، یہ نا ممکن ہی نہیں نامناسب بھی ہے بلکہ ایک بڑی کم نصیبی، کیونکہ آلودۂ گناہ رہ کر پنپنا کیا اس سے بڑھ کر کم نصیبی ہوسکتی ہے؟ ہم اگر باطل سے توبہ نہ کریں تو یقین جانو کہ ماضی کا دلخراش تصور ہمارے مستقبل کے لئے ہمیشہ سوہانِ روح رہے گا، ہماری نیندیں اُچاٹ اور ہمارے خواب بھیانک ہوں گے ہم نے جن لوگوں کے ساتھ بُرائی کی ہے وہ ممکن ہے ہماری خطا سے درگزر کریں ہم کو معافی دیدیں، مگر ان کی اس کشادہ دلی ہی کے اندر ہمارے جہنم کے شعلے پنہاں ہیں، کیونکہ اُن کی اس عالی ظرفی سے ہماری پچھلی بُرائیوں کی ظلمتیں زیادہ گہری اور زیادہ سنگین ہوجاتی ہیں۔

زندگی نام ہے عمل کا اور مسلسل عمل کئے جانے کا، جہدِ مسلسل اور جہدِ پیہم کا،

ع عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی

اور بالآخر مسرت و خوشحالی کا مدار اسی عمل پیہم پر ہے، خارجی واقعات کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن صرف اُسی حد تک جو چنداں اہم نہیں، ہمارے ماحول کی زیادہ اہمیت نہیں، اہمیت اس کی ہے کہ ہم خود کیا ہیں؟ اس لئے ہم کو اپنے پر بڑی سخت نظر رکھنی چاہیے کیونکہ عادت پہلے طبیعت اور پھر فطرت بن جاتی ہے، بورڈمین جیسے اہلِ قلم نے کتنی سچی بات کہی ہے :-

کشتِ حیات میں تخمِ عمل بکھیرو تو عادتوں کی فصل پکے گی
عادتوں کے بیج بُوؤ تو سیرت کی فصل تیار ملے گی
سیرت کی تخم ریزی کرو تو قسمتوں کی فصل کاٹنی ہوگی

انسان ہر روز کچھ نہ کچھ بڑھتا ہی رہتا ہے، خواہ اچھائی کی طرف یا بُرائی کی طرف، روزانہ سوتے وقت بستر پر لیٹ کر اس امر کا جائزہ لینا چاہیئے کہ ہماری یہ ترقی معکوس ہے یا صحیح؟ ایمرسن جیسے مفکر کی رائے ہے :-

"عالمِ انسانیت اپنی جبلت کے اعتبار سے دو صنفوں میں تقسیم ہے، محسنینِ عالمِ انسانیت اور مجرمینِ عالمِ انسانیت.."

ہم میں سے جس کا تعلق بدقسمتی سے دوسرے گروہ میں ہے، اس کے دوست دیر سویر اُس کے دشمن ثابت ہوتے ہیں، حافظہ اور یاد کرب و دوام کی صورت اختیار کرلیتے ہیں، وجود غم و الم کی تقریب تن کرتا ہے اور یہ عالم کون و فساد اور خوفِ مرگ ایک بدی ہیبت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے ـــــ ہم اگر کسی ایک اچھے اور سچے خیال کو بھی دل کے اندر بسا لینے میں کامیاب ہوجائیں اور کسی ایک فرد کی زندگی کے حقیر ترین لمحہ کو بھی اُمید و شادمانی کی کرنوں سے تابناک کرسکیں تو ہمارے فرشتہ دامن سے فرشتے وضو کرنے کو اپنے لئے وجہِ سعادت اور باعثِ افتخار سمجھیں گے۔

کیا ہی اچھا ہو اگر ہم میں سے ہر شخص تفکر و عرفان کے لئے روزانہ تھوڑا سا وقت نکال لیا کرے، اس طرح انسان شمائل اور سکون سے نزدیک ہوتا ہے، اس خصوص میں کم فرصتی اور تنگیٔ وقت کا عذر کسی طرح قابلِ پذیرائی نہیں ہوسکتا، بڑے بڑے وزیر اور ارکانِ ایوانِ عوام

تو ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ مصروف اور کم فرصت رہتے ہیں، بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ سر رابرٹ پیل، باتمرہ، پارلیمان سے واپسی پر انجیل مقدس کے ایک سبق کا مطالعہ کرتے تھے (اور نواب صاحب چھتاری حیدرآباد دکن کی صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں تراویح میں قرآن کریم سناتے تھے۔ مترجم)

ایک طریقہ اور بھی ہے، — اچھائی اور سچائی کا ہر وقت خیال کیا جائے اور انھیں کے متعلق سوچا جائے تو برے خیالات پاس نہیں پھٹک سکتے، شاعر نے کہا ہے:-

"جو موت کا یقین رکھتا ہے، روزِ قیامت پر جس کا ایمان ہے، دوزخ و جنت جس کے نزدیک حقیقتیں ہیں ؎

اُس کو بدی سے کیا غرض اسکو خدا کا خوف ہو　　اُس کو جزا کی ہے اُمید اُس کو سزا کا خوف ہو

اُس کی جزا سکونِ دل ہے، نفس اُس کا محکوم ہے جسے اطمینان بھی حاصل ہے، اُس کی زیست کمالِ بندگی ہے اور موت وصالِ باطنی ہے ؎

اُس کی جگہ بہشت ہے، باغِ اِرم مقام ہے　　اُس پہ مرا سلام ہو، اُس کو مرا سلام ہے

اس کلیہ پر عمل کرنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے، تاخیر روا نہیں، آج ہی سے، ابھی سے اس کو اختیار کر لو، گناہ سے بالکل مبرّا تو انسان اُسی وقت ہو سکتا ہے، جب گوشۂ قبر میں وہ ہمیشگی کی نیند سو رہا ہو —— پھر بھی جوانی کے جوش کے زمانے میں طبیعت کی جولانی کے لمحات میں، اپنے رَب، اپنے آقا، اپنے خالق کو یاد رکھنا تقویٰ کی بلند ترین منزل ہے، مرنا تو ایک دن سبھی کو ہے، موت کس کو چھوڑ دے گی جو بطنِ مادر سے پیدا ہوا ہے اُسے آغوشِ لحد میں جانا ہے اور —— ضرور جانا ہے۔

سرائے فانی کی اس سے بڑھ کر نہیں ہے اے دوست کچھ حقیقت
کسی کا گھر تھا کسی کا گھر ہے، کسی کا لیکن یہ گھر نہیں ہے

مگر موت کا فرشتہ جب آئے تو صرف بدن کو چھو سکے، مرکزِ وجود سے بالکل دور رہے، دم آسانی اور اطمینان سے نکلے، اِس منشا اور اس خواہش کی تکمیل کے واسطے ہم کو اپنے تئیں نیک اور اپنی زندگی کو مثالی بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے نیک نسالوں کو موت کے خیال سے ہیبت نہیں ہوتی، ایک عیسائی راہب تھا، تھرواں نامی، جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب نہ بچے گا تو بستر مرگ پر پڑے پڑے اس نے اپنے آخری لمحوں میں انجیل مقدس کی اس آیت کا سات زبانوں میں ترجمہ کر کے قلمبند کر دیا۔

"نیند خوابِ مرگ کی سہیلی ہے (النوم اُخت الموت) سُلانے والے کی سپردگی میں اپنے تئیں دیتے وقت احتیاط سے کام لے، تاکہ جب بید اری کی گھڑی آن پہونچے تو مرگِ خواب اور خوابِ مرگ دونوں سے جاگ سکے"

سنسرو نے لکھا ہے کہ سقراط کا محاکمہ اپنے تہمت تراشوں اور الزام لگانے والوں کے روبرو کسی مجرم یا گنہگار کی عاجزانہ تقریر یا معذرت نہ تھی بلکہ ایک ایسی اعلیٰ و ارفع ہستی کا فرمان تھا جو جنت الفردوس کے اعلیٰ علیین کی طرف مائل پرواز ہو"

Seneca پوچھتا ہے۔ اگر ہم فرائض حیات کو نیکی، سچائی اور بہادری کے ساتھ مرحلۂ اتمام تک پہنچا دیں تو آخر ہمارا صلہ کیا ہوگا؟

آپ ہی جواب دیتا ہے کہ:- ؎ خود حُسنِ عمل ہی صلۂ حُسنِ عمل ہے * یعنی صلۂ حسنِ عمل، مل نہیں سکتا

ہمیں حق کی حمایت یا حق کا اتباع محض اجر کی اُمید پر یا صرف مکافات کے ڈر سے نہیں کرنا ہے اس جذبہ حمایت حق میں حق سے فطری محبت و حق سے طبعی لگاؤ، حق سے جبلی اُنس کو دخل ہوتا ہے، کیونکہ صرف ایسے ہی جذبات خوشنودیٔ خالق کا سبب اور مغفرت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

اس لئے سمجھ لو اور جان لو کہ نیکی آپ اپنا بدل ہے (اور صاحب مضمون نے اس پر زور دیا ہے کہ آتش جہنم کے خوف کے بغیر بھی بدی سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ... ... ... ... (اسپینوزا کے قول کے حوالہ کے ساتھ ... ... ...)

جو فی الواقع دانا ہے وہ حسن عمل کے صلے سے بے نیاز ہے ـــ حسن عمل کی منزل دشوار گزار ہے، اس کا راستہ پر پیچ خار دار مگر یاد رکھو کہ ہر منزل اعلیٰ وارفع، اپنی منزلت و رفعت کے تناسب سے دشوار اور دیریاب ہوا کرتی ہے،

کمال مطلق یا اکملیت تو محالات ہی نہیں ناممکنات میں سے ہے لیکن سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ہم کو پھر بھی برابر جدوجہد کرتے رہنا چاہئے کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کے اندر رہبر کامل پہلے سے بیٹھا ہوا ہے ـــ ضمیر[۱] ـــ وہ برابر آواز دیئے جاتا ہے،

قدم جب ہٹے جادۂ بندگی سے  اک آواز آئی کہ ہم دیکھتے ہیں،

ہم اگر اسی کے کہے پر چلتے رہیں تو نہ بھٹک سکتے ہیں نہ بہک سکتے ہیں، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ جو تہیہ کرلے وہ نیکی کی زندگی گزارنے میں بالیقین کامیاب ہوگا۔

پس بلند سے بلند نصب العین ہی ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے، اسی طرح اور غالباً صرف اسی طرح ہم نفس پر قابو پا سکتے ہیں اور ایسے فرد بن سکتے ہیں، جو مرد ہوں تو اُن کے لئے شیکسپیر نے انطونی کی زبان سے بروٹس کے واسطے کہلوایا ہے۔ کہ:۔

وہ متقی تھا، اس کے نظام حیات میں  ترتیب اس طرح سے عناصر نے پائی تھی
قدرت نے کتنے فخر و مباہات سے کہا  وہ بندہ جیسے میری مکمل خدائی تھی

اور عورت ہو تو پھر ؎

جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقش قدم

سر والٹر اسکاٹ جب بستر مرگ پر تھا اُس نے اپنے داماد لاکھارٹ کو بلا کر وصیت کی کہ

"نیک بنو، نیک" ـــ مذہب کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہو ـــ اور اچھا انسان بننے کی برابر کوشش کئے جاؤ ـــ جب اُس مرحلے پر پہنچو گے جہاں اس وقت میں کھڑا ہوں، ان کے سوا دنیا کی اور کسی شے کو وجہ تسلی نہ پاؤ گے" ـــ

حتیٰ کہ وقت آخر، بلعم نے بھی کہہ دیا کہ:۔

؎ "مرگ مومن نصیب ہو، اے کاش"!

کس قدر خوب اور کتنا ٹھیک کہا ہے:۔

کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیر
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

[۱] مگر ضمیر سے زیادہ کامل، مفید اور قابل اعتماد رہنمائی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیا کی ہے، (م، ق)

# داغ اور امیر

## اردو ادبیات کا ایک باب

پُرانی کہاوت ہے ــــــ بن مانگے موتی ملیں، مانگے ملے نہ بھیک، سو یہ کہاوت میرے حق میں حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی اور وہ اس طرح کہ ایک دن عزیز گرامی قدر جناب اسرائیل احمد مینائی نے فرمایا ــــــ "امیر مینائی کے مسودات اور کاغذات صحیح سلامت آ گئے ہیں، آپ بہت دنوں سے ان چیزوں کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کر رہے ہیں کسی دن ہمارے یہاں آکر دیکھ لیجئے" ــــــ یہ خبر میرے لئے انتہائی مسرت انگیز تھی، کوئی اور کام ہوتا تو شاید اس کیلئے بڑی دقت نہ نکال سکتا، مگر یہ میرا اپنا شوق تھا اور شوق بھی ایک مدت کا، جو اگر زیادہ دن تک پورا نہ ہوتا تو شاید "عشق" بن جاتا۔

آدمی جب کوئی کام کرنا چاہے تو پھر ساری مصروفیتیں اور ضرورتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں ــــــ ہاں! تو میں ایک دن، اتوار کو صبح سویرے بہت سے ضروری کاموں کو چھوڑ چھاڑ کر اسرائیل احمد صاحب مینائی کی قیام گاہ پر پہونچا، اور انہوں نے بلا تکلف تمام چیزیں میرے سامنے لاکر رکھ دیں، اسرائیل صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ان جواہر پاروں کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا، مگر انہوں نے اس قدر وسعتِ ظرف کا ثبوت دیا کہ جن خطوں کی میں نے نقلیں مانگیں، انہوں نے ان کی نقلیں بھی لاکر دیدیں، اس غرض پرست دنیا میں اس خلوص و محبت کے لوگ ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہیں ــــــ میرے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔

؎ چہ کند بے نوا ہمیں دارد

جن ادبی نوشتوں اور علمی تحریروں کو میں نے دیکھا، ان کی تفصیل کیلئے ایک فرصت کی ضرورت ہے، یہاں سرسری طور پر دو چار چیزوں کا ذکر کئے دیتا ہوں۔

(۱) مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کا ایک دیوان اور ایک نسخہ بیاض، جن کے بارے میں مجھ سے کہا گیا کہ یہ دونوں مسودے غیر مطبوعہ ہیں اور خود حضرت اسیر کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں (۲) امیر اللغات "ب" کی تختی مکمل، جس کا ایک ورق بھی کہیں شائع نہیں ہوا (۳) سحر، سفیر، جوش، حسین، موحد اور طور کے دواوین خوشخط لکھے ہوئے، نہ جانے یہ شعراء حضرت امیر مینائی کے ہم عصر تھے یا ان کے تلامذہ میں تھے، یہ کچھ نہیں کھلتا ــــــ میں نے اسی ایک نشست میں مجموعہ ہائے کلام سے چند شعر بھی منتخب کر لئے "فاران" کے پڑھنے والے اس لطف سے کیوں محروم رہیں۔

سفیر :-

دلا! زمانۂ ناپائدار دیکھ چکے ــــ چلو اب اور کہیں یہ دیار دیکھ چکے

---

پیغامِ یار سوت کا پیغام ہوگیا ــــ قاصد کے لب ہلے تو مرا کام ہوگیا

جوشؔ:-

صبا نے کیا کہا گلشن میں جا کر　　　کہ غنچے ہنس پڑے ہیں کھل کھلا کر

---

گر میں ایسا جانتا تجھ کو نہ دیتا دل کبھی　　　ابتدا کی مہربانی نے تری دھوکا دیا

حسینؔ:-

اس کی چتون پہ ادا لوٹ گئی　　　تیغ تولی تو قضا لوٹ گئی

---

آج مجھ کو مشورہ کرنا ہے عقل و عشق سے　　　درد کو ٹھہرایئے یا فکرِ درماں کیجئے

---

موجدؔ:-　اُس ماہ کو چھڑا کے تُو لائے گا کب تلک　　　بس او فلک! کہ دل متحمل نہیں رہا

---

قاتل وہ کاٹ ہے تری تیغِ نگاہ کا　　　بسمل کی ہچکیوں میں ہے، غل واہ واہ کا

---

رحم آیا ہے اُسے کیا مری تنہائی پر　　　غم کسی وقت نہیں مجھ سے جدا ہوتا ہے

سحرؔ:-

پوچھنے آئے نہ جیتے جی کبھی　　　قبر پر اب کیا کریں گے آن کر

---

ملتے ہیں راستہ میں تو ہوتا ہے یہ کلام　　　تشریف لایئے گا کسی دن مکان پر

---

کٹ جائے زباں نام محبت جو لیا ہو　　　تحقیق تو فرمائیں جب ارشاد کریں آپ

---

غصّہ میں کوئی دیکھے دندان و لب کا عالم　　　موتی سے پس رہے ہیں یاقوت کی کھرل میں

---

طورؔ:-　زندگی کا سبب نظر آیا　　　جان آئی کہ نامہ بر آیا

---

ان علمی و ادبی نوادر میں "خطوط" خاص اہمیت رکھتے ہیں، یہ اُس دور کے ادبی اور شاعرانہ رجحانات کے آئینہ دار ہیں، ان میں اُس زمانہ کے تمدن و تہذیب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، ان لکیروں سے افسانے بن سکتے ہیں ؎ بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے، تو کیا ان موتیوں سے ایک مالا بھی تیار نہیں ہو سکتی ——— یورپ میں کسی کے یہاں متقدمین شاعروں اور ادیبوں کے ایسے نوشتے ہوتے اور کسی کے کان میں بھنک بھی پڑجاتی، تو ایک شور مچ جاتا اور پبلشرز چیک بکیں لے کر پہونچتے ۔۔۔ کہ

؎ اس دولتِ سرمد کے خریدار ہمیں ہیں

## خطوط

ان خطوط میں شاد عظیم آبادی کا ایک منظوم خط امیر مینائی کے نام ہے، سرنامہ پر لکھا ہے:-

"این قطعہ بطریق نیاز زمانہ ۲ر ستمبر ۱۸۹۶ء۔۔۔ "خدمت اکمل الکملا افصح الفصحا مخدومی و محترمی جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی دام لطفہ العالی۔۔۔ ۔۔۔ اس منظوم خط میں شاد عظیم آبادی نے شعر، محاورہ، زبان اور اس کی نزاکتوں پر خوب خوب تبصرہ کیا ہے، اور بڑی باریکیاں پیدا کی ہیں، قطعہ کے اول اور آخر کے چند شعر ہیں:-

کمینہ آپ کا خادم علی محمد شاد — جوابِ نامہ نامی میں یوں ہے نغمہ سرا
کہ خط کے ساتھ امیر اللغات بھی پہونچی — زبان و دل سے بجالا رہا ہوں شکر عطا
مرے زمانہ میں اب آپ سا کہاں شاعر — کہ فن میں بھی ہو کسے اس قدر ید طولے!
جوابِ خط میں یہی سوچ کر کیا اطناب — کہ اپنی رنگ کا اظہار آپ سے اچھا

معاف کیجئے خط میں جو ہو گئی تطویل
وقد ختمت کتابی بالتماس دُعا[1]

خطوط کے اس دفتر میں ایک خالی لفافہ دستیاب ہوا ہے، جس پر یہ عبارت لکھی ہے:-

"جناب مکرم منشی امیر احمد صاحب دام مجدکم۔ خط مُرسل ہے، چاہیئے تو کہیں کہیں حک و اصلاح بھی فرما دیجئے"
"شبلی"

علامہ شبلی نعمانی رام پور میں مولانا ارشاد حسین سے "معقولات"[2] پڑھا کرتے تھے، اُسی زمانہ میں علامہ موصوف نے امیر مینائی کو یہ لفافہ بھیجا ہے، لفافہ پر امیر مینائی نے اپنے قلم سے "نگہداشتنی است" لکھا ہے، جس طرح آجکل کسی خط، کاغذ، یا مسل پر کچھ غور کرنا یا کچھ سوچ کر لکھنا ہوتا ہے، تو اُس پر "To be seen" یا "under consideration" لکھ دیا کرتے ہیں۔

ان خطوط میں سب سے زیادہ اہم امیر اور داغ کے مکتوب ہیں، جن میں سے چند خطوط یہاں درج کئے جاتے ہیں، ان خطوط میں باہمی ربط و اخلاص کا ثبوت بھی ملتا ہے، معاصرانہ چشمکیں بھی ہیں، ادبی نکتے اور شعر و سخن پر محاکمہ بھی ہے۔

شاد عظیم آبادی جیسے قادر الکلام شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد کو امیر مینائی کی ذات سے جو عقیدت تھی، اُس کا ثبوت اُن کے منظوم خط سے ملتا ہے، علامہ شبلی کے لفافہ پر لکھی ہوئی عبارت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی خط، درخواست یا ادبی تحریر پر انھوں نے حضرت امیر مینائی سے "حک و اصلاح" کی استدعا کی ہے ــــــ اور اُردو دنیا کے سامنے شاید سب سے پہلی مرتبہ یہ بات آ رہی ہے اور اس حقیقت مستور سے آج پہلی بار پردہ اُٹھ رہا ہے کہ داغ نے امیر مینائی کے پاس اپنی غزلیں انتخاب کے لئے بھیجی تھیں، اور امیر مینائی نے نہ صرف یہ کہ شعروں کا انتخاب کیا بلکہ مشورہ بھی دیا۔

جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ داغ کے رنگ و جبول [illegible] امیر مینائی نے اس کا اتباع لیا وہ جب داغ اور امیر کے ان خطوں کو پڑھیں گے تو اُن کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جائے گی۔

حضرت داغ کے خط سے یہ بات ہمیں پہلی بار معلوم ہوئی کہ اُن کے زمانہ میں "اشانہ" "شریک" اور "ساتھ" کے معنیٰ میں بولا جاتا تھا، ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ یہ لفظ اس معنیٰ میں صوبہ بہار کی پیداوار ہے، جب کوئی بہاری کہتا ہے کہ "میں

---

[1] یعنی میں اپنے خط کو دُعا پر ختم کرتا ہوں۔ [2] بعض حضرات نے فرمایا کہ "فقہ" پڑھتے تھے۔

پٹنہ سے اُس کے شامل آیا ہوں" تو وجدان مسکرانے لگتا ہے۔ ــــــــ مگر داغ کا خط پڑھ کر پتہ چلا کہ دہلی میں یہ لفظ اس معنیٰ میں مروج اور مستعمل تھا، بعد میں جاکر اہل دلّی نے تو متروک کردیا مگر بہار میں اُس کا چلن آج تک جاری ہے۔

تمہید ذرا طویل ہو گئی، مگر ان باتوں کے کہنے کی ضرورت بھی تھی، بہرحال امیر اور داغ کے خطوط آپ کے سامنے آرہے ہیں، اور میں درمیان سے ہٹا جارہا ہوں۔

(ماہر القادری)

# داغ کے خط امیر کے نام

میرے دل کو تسلی دینے والے سلامت رہو۔ تعزیت نامہ آیا اور بھی مجھکو رلایا۔

ایک طوفان ہے غم ہجر میں رونا کیا ہے نہیں معلوم کہ انجام کو ہونا کیا ہے

تمام عمر کا رفیق اور عاشق زار مجھ سے چھوٹ گیا۔ کس سے کہوں کیا کروں۔ سخت صدمہ ہے۔ کوئی عزیز اپنے پاس نہیں۔ خانہ داری کے کام کرنا پڑتے ہیں جو تمام عمر کبھی نہ کئے تھے۔ نوکری اُس کام کی جس کے واسطے عیش اور فرصت لازم ہے۔ دل و دماغ کا صحیح ہونا لابد ہے اگر یہی حال رہا تو نوکری کہاں۔ مرحومہ زبان اردو پر بہت قابض تھیں اکثر محاوروں میں مجھکو مدد ملتی تھی۔ برخوردار لطیف احمد کا تعزیت نامہ بھی آیا اُس میں غزل کی بھی چھیڑ تھی اُس بچے کی فرمایش سے سخت پریشانی ہوئی۔ آج یہ چند شعر کہے ہیں اُن میں سے منتخب کرکے دو چار شعر چھپوا دیجئے گا۔ ایک میں ایک مثل بندھ گئی ہے مگر مقدم موخر جملوں میں شبہ ہے لکھ ہیں پوچھ کر لکھئے گا یا جس طرح آپ کو یاد ہو۔ گھر جاتی میزبانی مجھکو یاد ہے کاتب نے مقدم میزبانی لکھدیا ہے اُس پر میں نے م۔ خ بنادی ہیں۔ کہئے منشی صاحب میری حیات کے جو نفس باقی ہیں کیونکر گزر سکتے ہیں کوئی تدبیر تو بتائیے ؎

مل جائے کوئی عاشق دیرینہ تو پوچھوں کس طرح بسر کرتے ہیں ایام جدائی

برخوردار محمد احمد کا خط بھی آیا۔ سینکڑوں خط چلے آتے ہیں میں گھلا جاتا ہوں سقوط اشتہا ہے بہت یاد کروگے بچوں کو دعا۔ احباب کو سلام پہونچے۔ راقم فصیح الملک داغ دہلوی

۱۴ شعبان سنہ ۱۳۱۶ ہجری۔ وقت ۹ بجے شب۔ چہار شنبہ

حضرت سلامت۔ آپ کا عنایت نامہ مدت کے بعد مدت سے آیا ہوا ہے۔ جنرل مرحوم کا واقعہ واقعی حیرت افزا ہے۔ میرے روزوں کا حال شب بیدار تہجد گزار خدا شناس جانتے ہیں۔ آپ نے تو نہ کبھی پڑھی نہ قضا کی۔ میں نے آسمان و زمین کے چودہ طبق ڈھونڈھے۔ امیر اللغات کا کہیں پتہ نہ لگا۔ اتنا سنا کہ مولوی سیف الحق صاحب ادیب نے ایک جلد منگوائی ہے میں نے مستعار طلب کی معلوم ہوا کہ مستعار گئی ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب آلم نے گولکنڈے سے آپ کو لکھا کہ دیو. پی۔ ذیل۔ بھیجدو اُس کا جواب اب تک نہ ملا، آج وہ شاکی تھے۔ امیر اللغات کے عیب و صواب کو دیکھنا میرا فرض منصبی ہے۔ شاید شاگردوں کو بھی اس کی خریداری کے واسطے لکھوں۔ اسی شہر میں چند نسخے آتے تو چرچا ہوتا۔ آپ نے کتنے چھپوائے کتنے بک گئے کتنے باقی ہیں۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا آپ کو خدا نے توفیق نہ دی برابر ہوئے کہیں نہ کہیں سے کوئی نسخہ دیکھنے کو آہی جائے گا مگر اب میرے نام نہ بھیجنا ورنہ میں واپس کردوں گا۔ اعلیٰ حضرت حضور پرنور کی نوکری بجا رہا ہوں۔ غزلیں اصلاح ہو رہی ہیں۔ فرمان سلطانی بوعدہ پرورش بقلم خاص میرے نام صادر ہے۔ سنتا ہوں کہ حسب دستور جاگیر کی تجویز در پیش ہے اور یہی باعث تعویق کا ہے۔ الطاف

خسروانی تحریری و زبانی بہت کچھ اُمید دلا رہے ہیں عمل خوانوں سے چارہ نہیں۔ حکم آلہٰی کی دیر ہے۔ مگر تم عمل پڑھنا چھوڑ دو تو اجرائے کار جلد ہو۔ آپکے طرفدار ضیغم صاحب وغیرہ وغیرہ اہلِ لکھنؤ آپ کی تعریف میری ہجو چھاپ رہے ہیں۔ ایک گلدستہ جاری کیا ہے یقین کہ وہ آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ بر سرِ فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد۔ دیواروں پر انگاروں پر۔ اس زمین میں مجھ پر سخت فرمائش ہے۔ آتش کی غزل تو میں نے دیکھی کیا عجب اسیر مرحوم کی بھی غزل ہو۔ آپ کی بھی غزل ہو۔ سُنتا ہوں کہ بہت اہلِ لکھنؤ کی غزلیں ہیں دو چار کی نقل بھجوا دو تو مہربانی ہوگی۔ دو غزلیں ملفوف حاضر ہیں۔ برخوردار محمد احمد کو دیدینا۔ زیادہ نیاز۔ بچوں کو دُعا۔

نواب خلد آشیاں کا اردو کلام یعنی سب دیوان میں نے حضور میں نذر کر دیئے۔ مدعا یہ تھا کہ آپ کی فضیلت ظاہر ہو۔ یہ کتابیں مجھکو منگانی ہیں انکی قیمت دریافت کرکے اطلاع دیجئے۔ لفظ چٹی بمعنی ڈنڈ یا دھتاک عین دلی کی زبان ہے آپکو اس کی سند کہیں ملی یا نہیں۔ لفظ لیلوٹ جو لیکر نہ دے اس معنی میں آپکو کہیں ملا۔ فقط راقم فصیح الملک داغ

۶ ذی قعدہ سنہ ۱۳۱۸ ہجری۔ حیدرآباد دکن محبوب گنج

جناب منشی صاحب ارسطو تدبیر شاعری کی لکیر بفقیر منشی امیر احمد صاحب امیر دام عنایتکم۔ اس اوچھے کالنباچوڑا اسلام قبول ہو۔ جہاب داغ کی تاریخ کا ممنون ہوا۔ تخرجہ کا معترف۔ شکر ہے سب سے پہلے آپ ہی نے حوصلہ نکالا۔ اگرچہ یہ دیوان بے حوصلہ ٹھہرا۔ یہ تخرجہ نہیں بلکہ تعمیہ اتحاد ہے۔

میں تحریر سخت کا جواب بدنفرمی لکھتا ہوں مگر اُلٹی شکایت سُنتا ہوں یہ میرا مقدر۔ مجھکو آپکی استدعا کی کیا خبر مُسنی سُنائی پر کیا وثوق آپکا فائدہ ہو اور میرا کچھ نقصان نہ ہو۔ اس میں دریغ کرنا کسی کافر ہی کا کام ہوگا۔ کاش اسکا تذکرہ مجھسے بھی آئے جب سے شکار سے معاودت فرمائی ہے شعر و سخن کی طرف مکمل متوجہ ہیں ہر روز لفافہ مع غزل اصلاح کو آتا ہے مگر نوبت حضوری نہیں آتی۔ نواب عماد الملک سید حسین صاحب جو پرائیویٹ سیکریٹری ہیں وہ ہی تلاشئے وقت رہتے ہیں۔ انگریزی چٹھیوں کا جواب لکھنا اور بات ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری جانب خیال سلطانی یوماً فیوماً اچھا ہے۔ یہ فن تو مرچکا تھا اتنی قدر بھی غنیمت جانئے اگر انصاف کرتے تو اہل حسد کوتاہ اندیش مجھکو بخوبی یاد کرتے آج برخورداروں کی اور شاگردوں کی تاریخیں پہنچیں۔ سُبحان اللہ کیا کیا تاریخ کہی ہے۔ میری طرف سے دعا سلام پہنچے۔ راقم آثم داغ دہلوی مہدی علی صاحب کو سلام پہنچے۔

۱۶ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۹ھ

چند زمینوں میں تتمہ باقی ہے مقدم الف میں اگر کوئی زمین نئی خیال میں آئے تو مصرعہ بھجوا دو بلکہ پانچ سات۔

مکرم و مفخم۔ وعلیکم السلام۔ ہاں ہاں میں اپنے ہاتھوں کے قربان کہ صحیفہ مینائی ہاتھ آیا، اشعار متفرق پہنچے ؎
"جو بیٹھی آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں" یوں درست ہے یہ مصرعہ آپ نے غلط لکھوایا دونوں جگہ پلکیں لکھدیا ہے۔ تبدیل الفاظ خیال کرکے لکھونگا۔ بندہ پرور تیھرا اپنی ہی جگہ بھاری ہے یہ محاورہ میں نے باندھا آپسے داد طلب ہوں یہ خیال تھا کہ میرا کوئی حریف پہلے ہی لے اُچکا ہو۔ میری نظر سے نہیں گزرا۔ چند شعر ادہر کہکر غزل گورکھپور بھیجدی ہے ملاحظہ ہوگی۔ جو قصائد اُستاد کے نئے دیوان میں چھپے ہیں وہ ایک شخص کے پاس یہاں بھی ہیں۔ آزاد نے بطور خود بعض جگہ بڑا تصرف کیا ہے میری کیا مجال کہ دخل دوں اور اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ یار ہم نوکر تو ہو گئے مگر دُعا کرو کہ اجرا بھی جلد ہو سخت پریشان ہوں یہ دو برس آخر عمر کے بہت بے مزہ گزرے کہ مجھکو عزیز تر تھے۔ انشاءاللہ جس وقت سند ہاتھ آئی نقل خدمت میں مرسل ہوگی۔ بچوں کی ناسازی سُنکر دعائے صحت کرتا ہوں خدا قبول کرے۔ جلد جلد کیفیت لکھتے رہیئے۔

یہاں مفصلات اور صیغہ جات میں غریب الوطن کو نوکری ملنی عنقا صفت ہے قطعی ممانعت ہے۔ آپ کے قصیدہ کی کیفیت بھی معلوم ہے۔ یہاں کے لوگ اہلِ ہند کے مٹانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ خدا نے حضور پر نور کو میرا قدر دان بالذات کر دیا کہ تین برس کی جانفشانی اور دس ہزار کے خرچ کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی ہے خدا کرے کرشمہ بھی جلد ہو۔ آمین ثم آمین، نہایت مقروض ہو گیا ہوں دیکھئے کیا صرف پڑے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس تاریخ سے دستخط ہوئے ہیں۔ میرے معاملے میں اب صدر المہام بہادر تک کو دخل نہ رہا۔ یہ بھی یقین ہے کہ بعد نذر کے اور آمد و رفت دربار کے انشاء اللہ اور بھی فیض یاب ہوں گا۔ تمام ہندوستان سے مبارکباد چلی آتی ہے حالانکہ ابھی سر رشتہ میں حکم بھی نہیں آیا۔ دوست کیا میرے دشمنوں کو بھی مبارک ہو سنتا ہوں کہ منصب ہوا اتنا بڑا منصب یہ تائید الٰہی ہے منشی احمد حسن صاحب کی پچاس روپیہ پنشن مقرر ہوئی۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اگر زندگی مستعار باقی ہے کہ بہت کم رہ گئی ہے میں ضرور انشاء اللہ تعالیٰ رام پور کے علاوہ آپ سے ملوں گا۔ آپ کے توہمات نے مراد آباد نہ آنے دیا۔ میں اس سرکار کا چور یا غی نہیں ہوں۔ میرا تنوہ سے لوٹ آنا پردیسیوں کے واسطے سند ہے۔ مہدی علی خاں کو سلام پہونچے۔ ہمارا دیوان نہ لکھوا دیا یہ شکایت ہے۔ برخورداروں کو دعا کہئے۔ میری پیدائش سنہ ۱۲۴۶ھ ۱۲ ذی الحجہ ہے مطابق سنہ ۱۸۳۱ء۔ آپ اپنی ولادت کی تاریخ بھی لکھ بھیجئے کہ دیکھوں کس قدر تفاوت ہے۔ راقم داغ دہلوی۔ سنہ ۱۳۱۸ھ روز چہارشنبہ

سنتا ہوں کہ نیا دیوان آپکا چھپا ہے۔ وہ کہاں ہے کیا قیمت ہے۔ ہماری تاریخ سے داغ لگتا اس واسطے اطلاع نہ کی۔ یہ باتیں دل پر نقش ہوتی جاتی ہیں۔

# مکتوب امیر مینائی

۷؍ جولائی سنہ ۱۸۹۶ء روز یکشنبہ

کرم قدیم۔ سلام مسنون۔ نوازش نامہ آیا، ممنون یاد آوری فرمایا، غزلیں بھی پہونچیں دیگر اُن کی نسبت جو احکام آپنے صادر کئے ہیں، وہ ایسے مجمل اور باہم متناقض ہیں کہ تعمیل کرنا بن نہیں پڑتا، پہلے تو آپ نے لکھا ہے کہ "ان غزلوں کی نقل وسیم کے پاس فوراً بھجوا دیں" پھر آپ لکھتے ہیں کہ "آپکی کمیٹی اس کو انتخاب کر کے میرے پاس وہ انتخاب جلد تر بھیجدے" ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس میں رطب دیابس سبھی کچھ ہے اس کو آپ ملاحظہ کر کے اطلاع دیں" ایک جگہ لکھا ہے کہ "نہیں معلوم کون شعر لڑا، اطلاع ہو تو دور کر دیا جائے۔ اب میں حیران ہوں کہ بعینہ اُن غزلوں کی نقل وسیم کو بھیجدوں تو پھر انتخاب کا کیا فائدہ۔ اور اگر انتخاب کر کے آپ کے پاس بھیجوں اور اُس کا جواب آپکے بعد وسیم کو بھیجوں تو وسیم کے پاس جلد پہنچا کیونکر ہو سکتا ہے۔ گلچین کا آخری پرچہ یہاں آچکا جو صفحہ ۴۰ تک چھپا ہے۔ اب تو تمھاری غزلیں آئندہ کسی پرچے میں چھپیں گی، پھر کیا ضرورت ہے کہ وسیم کو بھیجنے میں جلدی کی جائے لہذا میں یہی شق اختیار کرتا ہوں کہ پہلے منتخب کر کے آپ کو بھیجوں اور جو شعر میرے نزدیک ہر طرح عیب سے پاک اور آپکے رتبے پر پھبتے ہوئے ہیں اُنکو انتخاب میں لوں، اور جو شعر کہ اُن میں مضامین تو تازہ ہیں مگر نظر دقیق اُن کو کسی عیب سے پاک نہ دیکھے اُن کو انتخاب سے چھوڑ دوں اور کچھ اشارہ ان عیوب کا لکھکر آپ کو مطلع کروں۔ یہ مجھے یقین ہے کہ اتحاد قدیمانہ کی نظر سے آپ برا نہ مانیں گے اور بطور خود اُس کی اصلاح کر لیں گے، میری عادت ہے کہ کسی کا اچھا شعر جو اندک تصرف سے درست ہو سکے، بیدردی سے اُس پر چھری نہیں پھیرتا، اور آپ کی عادت مجھے معلوم ہے کہ بہ نظر استغنا ذرا سے شبہ میں شعر یا تو بنالیں یا کاٹ دیں۔ اکثر شعروں میں بنا دینا تو مجھ سے ہو سکتا ہے، مگر دو وجہوں سے میں اپنے بنانے پر اعتماد نہیں کرتا۔ ایک یہ کہ مہاجرت کو زمانہ دراز گزر گیا ہے خدا جانے زمانے کے انقلاب نے آپ کی طبیعت میں کیا انقلاب

پیدا کئے ہوں، میرا دخل دینا اور تصرّف کرنا مبادا گراں گزرے، تو اُدھر آپکو رنج ہوا ادھر مجھے ملال ہو اور مفت کی بحث آپڑے، میں کہوں یوں چاہیئے، آپ کہیں نہیں یوں درست ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید آپ جو تصرف کریں وہ اُس تصرف سے بہتر ہو جو میرے خیال میں آئے میں دو ایک جگہ اپنے خیال کے موافق نسخہ لکھدوں گا، آپ کو اختیار ہے چاہے وہی رکھئے گا چاہے اور طرح بنا لیجئے گا۔

نواب مرزا خاں صاحب اُس ملک میں رہ کر اور پورا وقت فرصت پاکر آپ کی مشق کو تو بہت ترقی ہوگی، مگر اپنے کلام میں عیوب پر نظر کم جاتی ہے، اور آپ پر کیا موقوف ہے جو ایسی جگہ پہونچے گا، جہاں پرکھنے والا نہ ہو، جو کچھ کہے آپ ہی اُسکا دیکھنے والا ہو سُننے والے ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ اُن کے سامنے پڑھا جائے واہ وا کریں اُس کو یہی دقت پیش آئے گی، بلکہ آفریں ہے آپ کے حُسن طبیعت کو کہ باوصف تنہائی بہت سے محاسن آپ کے کلام میں رہتے ہیں اور بہت ہی کم معائب ہوتے ہیں۔

ان غزلوں میں البتہ خدا جانے زیادہ کد کی گئی یا اور کوئی سبب ہوا کہ کئی شعر معیوب نظر آئے، کئی شعر رسمی معلوم ہوئے، بہر کیف طبیعت ایک رنگ پر رہتی نہیں، اس میں آپکا کیا قصور، میں چونکہ آپ کا خیر خواہِ قدیم ہوں مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ عیب دیکھوں اور آپکو مطلع نہ کروں خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ مجھے دیکھنے اور انتخاب کرنے اور چھپوا دینے کے واسطے بھیجیں۔ اب اس خط کو درخواست عفو گستاخی و بے تکلفی پر ختم کرتا ہوں۔

تسلیم یہاں ہیں عند الملاقات آپ کا سلام کہونگا۔ اپنے تو تالیف دونوں سالے مدت ہوئی آپ کو بھیج چکا، خدا جانے کیا ماجرا ہے کہ پہلی بار امیر اللغات بھیجا وہ نہ پہنچا، ابکی بار یہ دونوں رسالے تلف ہوگئے۔ اب بذریعہ رجسٹری روانہ کرونگا۔

محمد احمد مع اخوان اور جلیل دآہ جنہوں نے اپنا تخلص بدل کر آہ کی جگہ اب دوست تخلص قرار دیا ہے اس لئے کہ آہ ایک بدنمیں لفظ ہے، اور ان کے علاوہ سب عزیز و احباب بطور جب گزار ہیں۔ گھڑی عطا ہونے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقیات روز افزوں عطا فرمائے اور اُس سرکار فیض آثار کو دیرگاہ قایم رکھے اور امیر اللغات کی طرف متوجہ کرے۔ فقط

امیر احمد عفی عنہ

## غزل نمبر ۱ :-

شعر ۴۔ نقشِ محفل اجنبی ہے، نہ اُس کا استعمال فارسی میں نظر سے گزرا نہ اُردو میں۔

اور باعث ہونے کا یہ مقام نہیں ہے۔ دوسرے مصرع کی ترکیب یوں ہونا چاہیئے کہ "جمنے میں یہ ہے اُڑنے میں یہ ہے"

۱۰- بھاگا کیا۔ ہے کو نہیں چاہتا، بلکہ "بھاگتا ہے" ہو تو ردیف ٹھیک اُترے۔

۱۵- ایک چیز کی نسبت کہتے ہیں، جب وہ دونوں کام دے، مثلاً تلوار کی تلوار ہے اور عصا کا عصا ہے، شاید آپ کے یہاں اس صورت سے محاورہ ہو تو اُس صورت میں مجھے کچھ تامل نہیں ہے، مگر میرے نزدیک جگہ اس کی ہے کہ یہی ہمارا رستہ ہے یہی ہماری منزل ہے اور شوق کی جگہ درد مناسب ہے۔

۱۸- اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۹- قسم مشکل کشا کی بھرتی ہے، یہ ترکیب۔ یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے، قسم کو نہیں چاہتی۔

## غزل نمبر ۲ :-

۱- عجب اس میں ذرا بے محل معلوم ہوتا ہے، کیا قرینے سے محفل آراستہ ہے، یا عجب آراستہ محفل ہونا چاہیئے۔

۷- جس چیز کا دھوکا ہو اس کا بیان دھوکے کے ساتھ ہوتا ہے، اصل چیز بیان میں نہیں آتی، دل ایسا کہ مجھے دھوکا

ہوا پہلو میں تکیہ ہے، اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ چاہے یوں بنا لیجئے۔ نہیں کھلتا کہ پہلو میں مرے تکیہ ہے یا دل ہے، یا اور جو صورت آپکے خیال میں آئے۔

۹۔ آپ کا مقصود غالباً یہ ہے کہ دوست کا قاتل ہے اور دوست کے دشمن کا بسمل ہے، مگر پیدا یہ ہوتا ہے کہ اپنے دوست کا قاتل ہے، اپنے دشمن کا بسمل ہے۔

۱۲۔ رشک نے مارا کے ساتھ کیوں کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا، یوں چاہیئے "مجھے اس رشک نے مارا کہ وہ عالم کا قاتل ہے"

۱۹۔ میرے نزدیک شامل کی جگہ شریک چاہیئے۔ شاید دلّی میں اس جگہ شامل بولتے ہوں، اگر ایسا ہو تو رہنے دیجئے۔

## غزل نمبر ۳:-

۳۔ یا تو بھی نہ ہو یا دوسرا نہ ہو (یہ اشارہ کس طرف ہے میں نہیں سمجھا)

۵۔ اس کا مغز میری سمجھ میں صاف نہ آیا حاصل کیا ہوا۔

۹۔ دوسرے مصرع میں کہ بہت بے محل ہے چاہیئے یوں بنا لیجئے، چرانا اپنے دم کا بھی نہاں چوری میں داخل ہے۔

۱۰۔ دُھن بندھنا اس جگہ مناسب نہیں ہے۔

۱۶۔ دوسرے مصرع میں ورنہ غش میں غافل ہے، کی جگہ ورنہ غش ہے سے مطلب حاصل ہے۔ غافل ہے کی ضرورت نہیں قافیہ بیکار ہے۔ فقط

مکرما۔ مطالب کے لکھنے میں آپکی غزل کی تعریف لکھنے سے رہگئی اب لکھتا ہوں کہ جن شعروں کو میں نے منتخب کیا ہے، انکا مزا میرا ہی جی جانتا ہے، خصوصاً یہ شعر ؎

بڑھا دیتا ہے کیا کیا طالب دیدار ہو ہو کر ۔۔۔ مرے پاس نگہ پر بھی گمان دوست سائل ہے،

باعتبار تازگی مضمون کے بیمثل ہے، خداوند تعالیٰ سرزمین سخن کو آپ کی ذات سے سرسبز و شاداب رکھے۔ فقط

بندہ نواز۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اس کا جواب جو آئے گا وہ ملاحظہ سے انشاءاللہ ضرور گزریگا، اس لئے مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں حضور میں پیش کرنے کے قابل دوسرا خط بھیجوں، اسلئے کہ یہ خط تو بہ نظر اپنی اور آپ کی بے تکلفی کے بے لکھا ہے۔ دوسرے خط کو اگر آپ پیش کیجئے گا تو امید ہے کہ لغت والا مضمون بھی ملاحظہ بندگان اقدس سے گزر جائے

شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال۔ عنقا گردد!

# مکتوب داغ

جناب مکرم۔ وعلیکم السلام۔ نیازنامہ کا جواب اس توجہ اور عنایت و عرق ریزی سے آپنے لکھا کہ میں پانی پانی ہوگیا۔ بارے آپ کے دل میں محبت قدیم کا لگاؤ ابھی ہے، اَللّٰھُمَّ زِدْ۔ میں نے یہ غزلیں مجبوراً ڈھائی گھنٹے میں کہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے میں دو غزلیں اور ایک گھنٹے میں ایک غزل۔ منشی فریدالدین صاحب ملازم سرکار گھڑی رکھکر اشعار لکھتے جاتے تھے، خدا جانے یہ کیا امتحان تھا اور کیوں تھا۔ آپ کے انتخاب سے میں خوش نہ ہوا۔ بہ سبب مہاجرت کے مذاق میں مغائرت ہوگئی، آپ کے شبہات پر میں نے غور کرکے، بجا اور بیجا کا لحاظ رکھ کر، ملفوف رقیمہ نیاز کیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مکرر ملاحظہ فرما کر جواب

[1] یہ نوٹ داغ کے قلم کا ہے۔ (م ۔ ق)

جلد لکھئے۔ لفظ نقشِ محفل واقعی اجنبی ہے، پہلے میں نے یہی لکھا تھا اُس کے بعد لفظ حُسن بنایا تھا، مگر نقل میں پہلا ہی مصرع آپکی خدمت میں پہنچا، یہ محض تائید الٰہی تھی کہ ایسے خبگل جھاڑی گرمی۔ نوکری میں اِتنے جلدی ایسے شعر موزوں ہو گئے، وہ بھی آپ کے گلدستہ سے علاحدہ کر کے لکھے گئے۔ اور ہاتھوں ہاتھ حضور میں پہنچتے رہے۔ اس شکار میں گویا ٹیلی گراف پر شاعری ہوئی ہے، ورنہ شیر کے شکار میں شعر سے کیا بحث۔ اس زمانے میں اکثر گلدستہ نکلے ہیں، تمام ہندوستان کی شاعری معلوم ہو تی جاتی ہے، خوشی سے زیادہ افسوس ہوتا ہے، میں نے بیگانہ وار ہو کر اپنی غزل پر صاد کر دیئے ہیں اُن پر پھر نظر توجہ سے ملاحظہ کیجئے، چونکہ اس کی نقل سرکار عالی میں پہونچ گئی ہے، زیادہ تصرف میں مناسب نہیں جانتا، یقین ہے اس نکتہ کو آپ بھی پسند کریں گے۔ الحمد للہ کہ جدت مضامین و لطف زبان سے خالی نہیں ہے، یہ آپکا ارشاد بہت بجا ہے کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا نظر نہیں آتا، مگر یہ بھی خیال رہے کہ جو ذریات لکھنؤ کی یہاں جمع ہیں مجھ پر چھری تیز کئے ہوئے ہیں، یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے، سنتا ہوں کہ آزاد لکھنوی اور شحنۂ ہند میرٹھ ایڈیٹر یا مالک مجھ پر یا میرے شاگردوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں، لوگ بغیر میری اطلاع جواب بھی دے رہے ہیں، اعتراض بھی لغو اور جواب بھی پوچ۔ یہ اُمور خلل انداز روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہو سکتے۔ نہ ایسے حاسد فروغ پا سکتے ہیں۔ داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ داغ کی مشق بڑھی ہوئی ہے۔ مہتاب کو چھپے دو برس کا زمانہ گزرا۔ اس دو برس میں بیس غزلیں کہی ہیں۔ کیا اس کا نام مشق ہے۔ ہر مہینے میں دو چار نئے خط باستدعائے شاگردی آتے رہتے ہیں۔ دوہائی دیتا ہوں کہ مجھے فرصت نہیں، صحت نہیں۔ نوکر ہوں آزاد نہیں۔ مصنف امیر اللغات کے پاس کلام بھجواؤ، وہ اُستاد مسلم الثبوت ہیں۔ کوئی کمبخت نہیں سنتا۔ غزلوں سے قصیدوں کا نمبر بڑھا، قصیدوں سے دیوان کا نمبر آیا اب دیوان کے دیوان چلے آتے ہیں۔ چھ مہینے کے سفر میں تین سو غزلیں میں نے بنا کر بھیجی ہیں، ہزار آٹھ سو اسو ابھی باقی ہیں، اگر آپ کو فرصت ہو تو بھیجدوں مگر آپ کے پاس کیا اس سے کم ہونگی، آپ کی نازک دماغی کب متحمل ہو سکتی ہے۔ آپ نے جو خط جداگانہ بھیجا اس میں جو تعداد زر لکھی ہے، وہ نہایت نامناسب ہے۔ نواب خلد آشیاں کی کیفیت جو مفصل ارقام فرمائی ہے وہ حاوی ہے سب اُمور پر اور کافی ہے مدعائے خاص کے لئے۔ مجھے نوکر ہوئے ساتواں برس ہے۔ عند الطلب کبھی کبھی حضوری نصیب ہوئی تھی۔ اس شکار میں شب و روز حاضر رہنے کا اتفاق ہوا، تو اپنے ذہن کے موافق کچھ کچھ مزاج کے رنگ سے آگاہی ہوئی وہ گہرا دریا ہے کہ تھاہ نہیں، تیاس کام نہیں کرتا۔ آپ جب میری غزل پر مکرر نقطۂ انتخاب کر کے بھیجیں گے تو اُس غزل کے ساتھ آپ کی تحریر بھی انشاء اللہ تعالیٰ ضرور پیش ہوگی کہ اُس انتخاب کا انتظار ہے، کئی بار خان علی صاحب آکر تقاضا کر چکے ہیں، اسی لحاظ سے آپکے ذخیرہ کو واپس کرتا ہوں کہ مکرر سوچ سمجھکر بھجوایئے۔

حضرت بندگان عالی متعالی دام اقبالہٗ کو اپنے ملازم کے اعزاز کا نہایت پاس ہے۔ داغ ناچیز کا جو اعزاز بعنایت الٰہی یہاں ہوا کسی پردیسی کو کہاں نصیب اکثر اُمرا اور رؤسا ملکی بھی ہنوز محروم ہیں۔ ادنیٰ خطاب خان بہادر، اس کے بعد جنگ اُس کے بعد دولہ اُس کے بعد ملک۔ ملک سے اعلیٰ تر ملازم کے لئے کوئی خطاب نہیں ہے، چنانچہ سرور جنگ، محبوب جنگ، افسر جنگ وغیرہ وغیرہ ابھی جنگ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور بہت لوگ سو سو برس سے اس تنا میں ہیں، بلکہ مر گئے۔ مجھکو خداوند عالم نے ایک ہی بار سب خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ خطاب کے لحاظ سے کم و بیش اعزاز میں ضرور فرق ہوتا ہے خصوصاً دربار کے موقع پر، مغلی دربار میں سالہائے دراز سے آج تک بجز آٹھ نو سرداروں کے، یعنی خاندان امیر کبیر شمس الملک وپیشکار خانخاناں ان کے سوائے کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ بڑے بڑے راجہ، بڑے بڑے نواب دست بستہ کھڑے رہتے ہیں

مجھکو ایسے دربار میں بھی بیٹھنے کی اجازت ہوئی، جو محسود عالم ہونے کا باعث ہوا - جس کو جنگ کا خطاب بھی ہوتا ہے، ضرور ہے کہ اُس کے خطاب کے ساتھ لفظ نواب و بہادر لکھا جائے - دولہ اور ملک کا رتبہ تو بڑا ہے - علاوہ منصب جلیلہ اُستادی کے اب میں اسٹاف خاص میں بھی داخل ہوا اس کی تنخواہ دو ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی، لوگ مبارکباد دے رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ملا ہے یہی میری لیاقت سے زیادہ ہے، مجھ میں تو دس روپے ماہوار کی بھی لیاقت نہیں، اس تحریر سے مراد یہ ہے کہ سرکاری ملازم، خطاب یافتہ کو آپ اپنی تحریروں میں یہاں کے دستور کے موافق لکھا کریں، ورنہ سرنامہ دیکھکر باعثِ کبیدگی و آشفتگی سرکار ہوگا - اعلیٰحضرت کو ان باتوں کا بہت خیال ہے، مگر یہ کہ آپ نازک مزاج بہت ہیں، ورنہ باوصف نحیف الجثہ ہونے کے، خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار ہیں -

یہ نہ جانئے گا کہ داغ نے میری ہدایتوں سے بُرا مانا اور میرے شبہات کا غیر واجب جواب لکھا، میں نہایت ممنون ہوا، آج دونوں کتابیں دفتر امیر اللغات سے میرے پاس پہنچیں - کل سے انشاء اللہ دیکھنا شروع کرونگا - مجھکو یہ فکر ہے کہ آپ کو میرے بخشوانے کا اتنا کیوں خیال ہے - بچوں کو دُعا، دوستوں کو سلام پہنچے - آج اتوار کا دن ہے، رجسٹری نہیں ہو سکتی، کل انشاء اللہ ضرور روانہ کروں گا -

راقم آثم فصیح الملک داغ دہلوی

مرقومہ ۱۱ محرم شریف ۱۳۱۲ھ یکشنبہ

واقعی نقشِ محفل اجنبی ہے، میں نے اول یہی کہا تھا، اس کے بعد لفظ حُسن بنایا تھا، پہلا ہی مصرع لکھا گیا - جب ڈھائی گھنٹہ میں اس قدر شعر کہے جائیں تو کیا ہو، خصوصاً شیر کے شکار میں شعر سے کیا واسطہ ——— لفظ باعث مجھکو نہیں کھٹکتا تھا ؎

تمھاری بزم میں ہر بات کا باعث مرا دل ہے     جمے تو رنگ محفل ہے، اڑے تو حُسن محفل ہے

اس مصرع میں "تو" کا اشباع ہوا ہے، ورنہ یونہی یہ مصرع ہو سکتا تھا - میری رائے ناقص میں ترکیب پہلے ہی مصرع کی اچھی ہے -

یہ جمکر رنگ محفل ہے یہ اوڑ کر حُسن محفل ہے

مگر اپنی رائے سے اطلاع دیجئے ورنہ میں کاٹ دونگا، ہر چند کہ سرکار میں نقل غزل کی پہنچ گئی ہے -

مقام امن سایہ سے مرے بھاگا کیا کوسوں     کہ پیچھے پیچھے میں ہوں، میرے آگے آگے منزل ہے

یہ حاوی دونوں زبانوں پر، یعنی یہ حال تھا اور ہے ——— فریاد فریاد کہ ایسا شعر ناپسند ہو -

اُٹھایا شوق نے اوٹھے، بٹھایا ضعف نے بیٹھے     یہی رستہ کا رستہ ہے یہی منزل کی منزل ہے

جو آپ چاہتے ہیں وہ خاص اس ترکیب میں پیدا ہے، بلکہ یہی محاورہ ہملوگوں کا اور یہی مُدعا ہے ——— داد بیداد کہ یہ شعر بھی معیوب ہو -

قسم مشکل کشائی کی یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے

واللہ یہ ترکیب قسم کو ضرور چاہتی ہے - داغ گھبرا رہا ہے، تسلی دینے والا قسم کھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ کیا مشکل ہے، اب آسان ہو جائے گی، عین زبان ہے، ہائے افسوس کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے اور کوئی ذکی والا لائق آپ کے پاس نہیں -

یہ اے صیاد اک پہلو نکل آیا رہائی کا     اسیر دل میں ترے جو چھوٹ جائے وہ مرا دل ہے

جی چھوٹ جانا، دل چھوٹ جانا، دونوں میری زبان پر ہیں، اب تو خیال فرمائیے کہ یہ شعر کیسا ہے

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے

یہاں عجب کیوں برا ہوا - قرینہ سے جملہ الگ ہے، عجب آراستہ دوسری صنعت ہے - وائے تقدیر کہ یہ شعر تین عمادوں سے محروم رہ

بڑھا دل اس قدر فرطِ خوشی سے وصل کی شب کو　　　مجھے دھوکا ہوا پہلو میں یہ تکیہ ہے یا دل ہے

آپ کا لکھنا تو ہر طرح سے ہدایتاً اور دوستانہ ہے، مگر میں نے خوب فکر و غور کی، تو اس کا عیب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس دھوکے میں شک میں رہا کہ یا اب یہ تکیہ ہے پہلو میں یا دل ہے چونکہ پہلے دل کا ذکر آچکا ہے، اُس کا اعلان۔ "یا" کے ساتھ ضروری تھا، آپکا مصرع بھی بہت خوب ہے۔ مگر جب عیب کو نہ سمجھوں تو سرکار میں بھیجی ہوئی غزل کا مصرع کیوں بدلوں۔ یہ بھی تقدیر کہ اس تازہ مضمون کا میں داد طلب تھا اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔

یہ نیرنگِ محبت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جو اپنے دوست کا قاتل ہے، وہ دشمن کا لبمل ہے میں نے اس کے معنی یہی رکھے ہیں کہ معشوق اپنے دوست کا قاتل اور اپنے دشمن کا لبمل ہے، یعنی جس کو وہ دوست اپنا جانتا ہے اور اُس پر مائل ہے، وہ فی الحقیقت اس کا دشمن ہے۔ میرے خیال میں۔

ستم بھی ہو تو مجھ پر ہو، جفا بھی ہو تو مجھ پر ہو　　　مجھے اس رشک نے مارا وہ کیوں عالم کا قاتل ہے

منشی امیر احمد صاحب میرے ہوتے جلالؔ پر کیوں عنایت فرماتے ہیں، مجھے تو یہ رشک مارے ڈالتا ہے۔ اس رشک نے مارا کیا یہ خلاف محاورہ ہے۔ لفظ "کیوں" میری رائے میں اُچکا ہوا ہے۔

سُنا بھی تو نے اے دل کیا صدا آتی ہے محشر میں　　　یہی دن امتحاں کا ہے ہمارے کون شامل ہے

اہلِ دہلی کی زبان پر شامل شریک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کسی کا شریک ہوتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کس کے شامل ہوتا ہے۔

شہادت میری فریادوں کی اُس سے بڑھ کے کیا ہو گی　　　فرشتے لکھتے ہیں بیٹھی ہوئی آواز شامل ہے

معشوق کی فریادوں کا یقین نہیں آتا، حالانکہ درج نامۂ اعمال ہو رہا ہے، آواز بیٹھنے کی یہ بڑی شہادت ہے، یہاں مُراد فریادِ سائلِ وصل سے ہے، نہ بھیک مانگنے والے سے۔ کیا یہ شعر برا ہے، بے معنی تصور فرمایا۔ براہ مہربانی مطلع فرمائے گا۔ میں اس کو بہت اچھا سمجھے ہوا ہوں۔

یہ کیوں تیغِ ادا سے مضطرب مانندِ لبمل ہے　　　الٰہی کیا کلیجے کے بھی اندر دوسرا دل ہے

اس کو یوں سمجھیے۔ دوسرا دل کیا کلیجے کے اندر بھی ہے۔ میں نہیں سمجھا کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ یہ باتیں تو جب طے ہوں کہ صحبت میسر آئے۔ تحریر سے یہ شبہات مٹ نہیں سکتے۔ میری رائے میں شعر بہت اچھا ہے اور نیا پہلو ہے۔

ستم دیکھو وہ مشکیں باندھتے ہیں اپنے لبمل کی　　　کہ اپنا دم چرانا بھی وہاں چوری میں داخل ہے

کاف علت کا یہاں بے محل مجھکو نہیں معلوم ہوتا، عین زبان کے محاورہ میں ڈھلا ہوا ہے۔ آپ کا مصرع بھی خوب ہے، مگر دم کے چُرانے سے دم چرانا فصیح تر معلوم ہوتا ہے۔ انصاف تو کرو کیا شعر کہا ہے۔

کیا دیوانگی میں قید، جب سے چارہ سازوں نے　　　مجھے یہ دُھن بندھی ہے، میرے پھندے میں سلاسل ہے

لفظ دُھن خاص اپنے محل پر بندھا ہے۔ خدا جانے آپ کس وجہ سے بے محل سمجھے۔ میں اس کو بے محل نہیں سمجھتا۔

یقین آتا نہیں اُس بدگماں کو مرگ عاشق کا　　　کوئی مرجائے تو سکتا ہے، ورنہ غش ہے غافل ہے

غش میں غلط لکھا گیا۔ میں۔ کی جگہ ہے۔ تصور کیجیے ٭

---

ترجمہ:- اعظم ادیب (گوجرانوالہ)

# ایک علمی و اسلامی شہر جیل کی چار دیواری میں

اس وقت ہم لوگ قاہرہ کے ایک جیل گھر میں ہیں، یہ قلعہ محمد علی کے وسیع دامن میں واقع ہے۔ اس کی تعمیر آج سے پچاس پچپن برس پہلے ہوئی تھی۔ عوام الناس اپنے قیدی عزیز و اقارب کی خبروں کی ٹوہ میں جیل کی دیواروں کے پاس منڈلاتے پھرتے ہیں! کیونکہ اندر جانے کے لئے صبر آزما تلاشی کی خلیج کو عبور کرنا پڑتا ہے۔

اگر آپ اپنے عزیزوں کی ملاقات کے لئے جیل میں داخل ہونا چاہیں تو سب سے پہلے آپ کو ایک گیٹ پر گھنٹی بجانا ہو گی۔ چوکیدار تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر یوں جھانکے گا جیسے کسی خورد بین میں سے تاک رہا ہو۔ اور آپ کی زحمت فرمائی کی وجہ دریافت کریگا۔ اسی اثنا میں اگر وہ یہ دیکھ پائے کہ آپ فوجی لباس زیب تن کئے ہیں تو بڑی تیزی سے دروازہ کو چوپٹ کھول دیگا اور اتنی بلند آواز سے سلامی پیش کریگا کہ آپ کے کان سن سنا جائیں، اور اگر آپ عام کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو یہ سمجھئے کہ آپ بہت بدنصیب ہیں، جیل کے چوکیداروں کے منہ سے ایک خوش گوار جملہ بھی اب آپ نہیں سن سکتے...... اور اگر آپ اتنے خوش قسمت ہیں کہ ان دبیز آہنی دیواروں کی گزرگاہ میں آپ کو بار مل جائے تو سب سے پہلے جیلر کے کمرے کے سامنے آپ کو کھڑا کیا جائے گا یہاں آپ کے جسم کا ایک ایک مقام، اور آپ کے لباس کا ایک ایک حصّہ ٹٹولا جائے گا، نہایت گہری تلاشی کے بعد آپ کو جیلر کے پڑوس میں ایک دوسری جگہ اسی گھاٹی کو دوبارہ عبور کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ایک دروازہ کھلے گا اور آپ جیل کی اتھاہ اور مہیب فضاؤں میں کھو جائیں گے۔ یہاں کمروں کے تین بلاک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عنبر[1] کہلاتا ہے۔ عنبر الف میں ایسے اشتراکی مزاد پہلے سے سزا یافتہ لوگ شامل ہیں جن کے مقدمات ابھی زیر سماعت ہیں۔

دوسرے بلاک کو عنبر ب اور تیسرے کو عنبر ج کہتے ہیں۔ موخر الذکر میں اشتراکی عورتیں، بداطوار مستورات اور عام اخلاقی مجرم ہیں۔ لیکن ہمیں صرف عنبر ب کا ذکر کرنا ہے اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصّہ میں مسکرات سے متعلق مشتبہ اور ملزم لوگ ہیں۔ ان کے معاملات ابھی زیر تفتیش ہیں، اور جو دوسرا حصہ ہے، تو وہ حیرت و استعجاب کا مقام ہے۔

اے قارئ محترم! آیئے اب باب العنبر پر تیسری تلاشی سے نبٹ کر میرے ساتھ اس مبارک بلاک کی طرف قدم بڑھایئے۔ یہاں آپ ایک چلتی پھرتی یونیورسٹی کی زیارت کر سکیں گے ——— یہ جامعہ، یہ انسٹی ٹیوشن" ——— علم و عرفان کا سر چشمہ! یہاں جیل میں بند ہے! اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایسا عجیب واقعہ ہے کہ جیلوں کی پوری تاریخ میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے! شاید حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد جیل کے اندر علم و عمل کا ایسا مرقع دیکھنے میں نہ آیا ہو۔ اور ان میں سے ہر ایک کمرہ، اخوان[2] مجاہدوں سے پٹا پڑا ہے۔

---

[1] مخزن، گودام

[2] "اخ" (بہ معنی برادر) اور مصر کی اسلام پسند جماعت کے ارکان کا اصطلاحی نام!

اے قاریٔ عزیز! آیئے ذرا آگے بڑھ کر ہم اس علمی نوآبادی کے احوال کا جائزہ لیں۔ ابھی پو نہیں پھٹی، رات کا پچھلا پہر ہے۔ عوام الناس میٹھی نیند سے ہم آغوش ہیں، یہ مجاہد نماز کی تیاری میں مگن ہیں۔ ان کا محترم مؤذن نغمۂ سحری الاپ رہا ہے:-

| | |
|---|---|
| "یا عباد اللہ ھبوا | اے اللہ کے بندو اُٹھو! |
| لیس غیر اللہ رب | اللہ کے سوا کوئی آقا نہیں |
| اھجروا النوم طویلا | لمبی نیند تیاگو |
| واعبدوا المولی الجلیلا | اور آقائے جلیل کی بندگی کرو |
| واسألوا اللہ القبولا | اور قبول کرنے والے خداوند کے سامنے |
| فی خشوع الصلوات | نمازوں کی نوری و حضوری کے ساتھ اپنی حاجات پیش کرو! |

تمام ساتھی اکیلے اکیلے یا جماعت بندی کے ساتھ، عاجزی و انکساری ——— اور دل سوزی و دل گیری کی نمازوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کی دُعائیں، رات کی تاریک پہنائیوں سے گزرتی ہوئی، آسمان کی طرف پرواز کرتی ہیں۔

اگر آپ ان کے کمروں کے پاس سے گزریں تو نمازوں اور دُعاؤں کی کثرت سے آپ کو یوں سُنائی دے گا جیسے شہد کی مکھیاں سرگوشی کر رہی ہیں۔ اچانک تاریخ اپنے اوراق پلٹ دے گی، پردہ اُٹھے گا اور آپ کی نگاہوں میں ایک ہزار تین سو ساٹھ برس پہلے کے نقوش مسکرائیں گے۔ آپ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم ساتھیوں کی قیام گاہوں پر موجود ہیں، آپ کے کانوں سے وہی شیریں آواز ٹکرا رہی ہے جو ابھی آپ کو شہد کی مکھیوں کی سرگوشی معلوم ہو رہی تھی۔ اور فجر سے پیشتر جیل کا ایک وارڈر ان کے کمروں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے تاکہ وہ اذان کی تیاری کریں۔ اور وہ اپنی نمازوں کو پورا کرنے میں زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں۔ پھر مؤذن کی بلند و باوقار اذان گونجتی ہے جو رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے:-

| | |
|---|---|
| اللہ اکبر اللہ اکبر | اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے |
| .. .. .. .. | .. .. .. .. .. |
| الصلاۃ خیر من النوم | نماز نیند سے بہتر ہے |
| الصلاۃ خیر من النوم | نماز نیند سے بہتر ہے |

آپ نے سچ فرمایا اے خدا کے رسولؐ! واقعی نماز نیند سے بہتر ہے، لیکن نیند ان مجاہدوں کے پاس کہاں پھٹکتی ہے یہ تو اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں یہ مشہور ہے:-

رھبان باللیل وفرسان بالنھار!

رات کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار!

جونہی اذان ختم ہوتی ہے، آپ ان کمروں سے تلاوتِ قرآن کی آواز سنتے ہیں۔ تمام حاضرین رقت آمیز دلوں اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ کلامِ خداوندی کے لئے ہمہ تن گوش ہو بیٹھتے ہیں۔ کیا حقیقت مآب ارشاد ہے:-

اِن قرآن الفجر کان مشھودا

بلاشبہ! فجر کی تلاوتِ قرآن فرشتوں کو کھینچ لاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد نماز قایم ہو جاتی ہے۔ تمام ساتھی اپنے

اپنے کمرہ کے امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر نماز میں محو ہو جاتے ہیں، اور نماز ہو چکنے کے بعد تمام حضرات، مختلف حلقوں میں بٹ کر، "ماثورات" کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ ماثورات حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا مجموعہ ہے جسے ان کے مرشد (مرحوم[1] لیڈر) نے مرتب فرمایا تھا۔ اس کے آخر میں اُنہوں نے مرحوم کے لئے ایک دعا شامل کر لی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

اے ہمارے خدا
ہمارے مرشد اور ہمارے شہیدوں پر رحم فرما۔
اور اُنہیں اپنی جنتوں کی وسعت میں جگہ دے
اور اُنہیں پیغمبروں، صدیقوں، شہیدوں اور صالح حضرات کے ساتھ اُٹھانا
کتنے اچھے ہیں وہ رفیق!

دُعاؤں سے فارغ ہو کر وہ اپنا لباس تبدیل کرتے ہیں۔ ورزش کی وردیاں پہن کر مختلف قسم کے ورزشی کھیلوں میں لگ جاتے ہیں۔

ساڑھے چھ بجے صبح کے قریب ان کی بارکوں کے دروازے کھلتے ہیں اور وہ لوگ ورزش کے بعد، نہانے کے لئے پانی کے حوض پر جمع ہو جاتے ہیں، کیا حیرت خیز نظارہ ہے، اسلامی غسل کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ ایک رفیق دوسرے رفیق کو سرزنش کرتا ہے، کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے ہوئے اُنہوں نے اپنے سر پر کوئی کپڑا کیوں نہیں رکھا، اور ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو یاد دلاتا ہے کہ بیت الخلاء میں بائیں پاؤں سے داخل ہونا مسنون ہے، اور اس ضمن میں انہیں حدیثِ پاک سناتا ہے۔ چنانچہ یہاں جو صاحب غسل کے لئے آئیں ان کے لئے ضروری ہے کہ شرعی قواعد ملحوظ رکھیں، اگر کوئی شخص غسل خانہ میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے ہوئے مخصوص دعائیں نہ پڑھے تو اس کا ساتھی اسے بروقت یاد دلا دیتا ہے۔ بلاشبہ! خداوند قدیر کا یہ ارشاد ان پر صادق آتا ہے:-

"انهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى۔" "بے شک یہ وہ نوجوان ہیں جو اپنے آقا پر ایمان لے آئے اور ہم نے اُنہیں مزید ہدایت سے نوازا"

اور وہ سماں بندھتا ہے کہ اے قاریٔ عزیز! آپ یہ محسوس کریں گے کہ ہم رسُولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے دروازوں کے پاس ایستادہ ہیں۔

اب صبح کے آٹھ بج رہے ہیں، ہر شخص چاشت کی نماز کے بعد کھانا کھا رہا ہے۔ اور مشکل سے آدھ گھنٹہ گزرتا ہے کہ وہ سب اپنے اپنے مدرسہ یا کالج کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اے قاریٔ عزیز! ذرا دیکھئے، ان کے اسکول اور کالج یہیں کھل رہے ہیں۔ اور معمولی کالج ہی نہیں بلکہ ایسی یونیورسٹی بھی جہاں قانون اقتصادیات اور سیاسیات میں ڈاکٹریٹ کے درجے شامل ہیں۔

برادر محترم! شاید آپ اس عجوبہ روزگار سے انگشت بدنداں ہوں گے، مگر صبر کیجئے، میں ابھی عرض کئے دیتا ہوں کہ قاہرہ کے جیل کی چہار دیواری میں ان اسکولوں، کالجوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا وجود کیونکر ممکن

---

[1] تحریک، اخوان المسلمون کے بانی حضرت شیخ حسن البنا شہید

ہو گیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ وارڈ نمبر ۶ کے قیدیوں کی تعداد ۸۰ ہے۔ وہ سب "اخوان" ہیں۔ ان میں سے پانچ اصحاب ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے ہیں، پہلے صاحب قانون میں، دوسرے سیاسی اقتصادیات (Political economy) میں، تیسرے طبقات الارض کے اعلیٰ علوم میں، چوتھے بجلی کی سائنس میں اور پانچویں صاحب لاسلکی شعاعوں میں، بیس طلبہ ایسے ہیں جو انجینئرنگ، زراعت، طب، تجارت، قانون، اصولِ دین، آرٹ اور اجتماعی خدمت (Social Service) کے مختلف کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اور اس سال کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ صرف یہی نہیں ہیں، بلکہ اٹھارہ اور ہیں جو مختلف درجوں کے ثانوی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ حیرت خیز بات یہ ہے ان میں آٹھ افراد ایسے بھی ہیں جو بچپن میں تعلیم سے محروم ہو گئے تھے، اب تعلیم بالغان کے ادارہ میں پڑھ رہے ہیں اور اس سال پرائمری کے امتحان میں شرکت کریں گے۔

اے قاریٔ مکرم! کیا اب مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ یونیورسٹی والے اس اسلامی شہر کا مزید تعارف کراؤں۔ اس سال کے امتحانات میں پچاس طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ کیا تعجب خیز بات ہے! انہوں نے ہر ایک طالب علم کی علمی استعداد کے مطابق ایک تقسیم کر رکھی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی طلبہ کے گئے مدرسین کا ایک گروہ مخصوص ہے اور ایک نگراں ان کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں جو طلبہ کے اسباق، ان کی جماعتوں سے متعلق دوسرے امور کے علاوہ اساتذہ کی نگرانی بھی کرتے ہیں تاکہ وہ طلبہ کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ اور اسی طرح ثانوی تعلیم کے طلبہ کی ایک پارٹی ہے، ان کے لئے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل چار استاد ہیں، انھوں نے مختلف علوم کے لئے مختلف گھنٹے مخصوص کر رکھے ہیں۔ ایک نگراں ان پر بھی متعین ہیں۔ کالج کے طلبہ کے لئے ایک الگ نظام تعلیم ہے! کیونکہ انہیں پڑھانے والے حضرات کی تعداد کم ہے۔ مثلاً انجینئرنگ کے طلبہ کو ایک سند یافتہ انجینئر پڑھاتے ہیں، اور قانون کے طلبہ کو ایک ایسے صاحب تعلیم دیتے ہیں جو خود قانون کی ڈاکٹریٹ کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہیں۔ اور جہاں تک ڈاکٹریٹ کی تیاری کرنے والوں کا تعلق ہے، تو وہ ذاتی طور پر تیاری کرتے ہیں، ان کے تعلیمی گھنٹے ناشتہ سے ظہر کی اذان تک جاری رہتے ہیں۔ اور ان کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ایک عجیب واقعہ یہ بھی ہے کہ قاہرہ کے اس جیل میں، اور وہ بھی اخوان ہی کے وارڈ نمبر ۶ میں، ایک ایسے ملزم داخل ہوئے ہیں جو اپنے تحفظ کے سلسلہ میں ایک قتل کے مرتکب بتائے جاتے ہیں، انہیں جرمن، انگریزی، اور فرانسیسی زبانوں کی لغت پر عبور حاصل ہے، چنانچہ اب وہ یونیورسٹی اور ڈاکٹریٹ کے طلبہ کو انگریزی لغت کی، ثانوی اسکولوں میں فرانسیسی لغت کی اور یونیورسٹی کے بعض سند یافتہ حضرات کو جرمن لغت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اے میرے دوست! تعجب نہ کر، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی دین اور اسی کی توفیق ہے کہ ایسے پاکیزہ نفس گروہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے جانا نصیب ہوا۔

آیئے اب ہم علم و ایمان سے لبریز ان کمروں کا معائنہ کریں۔ دیکھئے! وہ ہمارے رفیق نگراں صاحب ایک ابتدائی مدرس صاحب سے محاسبہ کر رہے ہیں، کہ انہیں نہانے میں تاخیر کیوں ہوئی جس سے طلبہ کی تعلیم میں ہرج ہوا، اور ادھر دیکھئے! ہمارے ایک رفیق اپنے کمرے میں فرش زمین پر پڑے قانون میں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے ہیں، دوسرے رفیق ایک دیوار سے ٹیک لگائے، لاطینی زبان کے سبق کی بعض غلطیاں درست کر رہے ہیں۔ یہ دیکھئے! حضرت ترجمانِ کریم ایک رفیق کو جرمن زبان کا درس دے رہے ہیں، اور دونوں استاد شاگرد ایک ٹوٹی بنچ پر بیٹھے ہیں۔ ان کا اسکول لکڑی کے ڈبوں کا ایک ڈھیر ہی تو ہے۔ یہاں پوری زندگی ــــــ جفاکشی اور جہد و جہاد کی زندگی ہے،

دنیا بھر کی سلطنتوں میں علم و فضل کی قدردانی ہے، تاہم مصر کا ذکر نہ چھیڑیئے کہ یہاں تمام باتیں عجیب سے عجیب تر ہوتی ہیں اور یہ عجائبات کا گھر ہے۔

اس وقت ڈھائی بج رہے ہیں، قیلولہ کی گھنٹی بج رہی ہے، ہمارے اخوان نماز ظہر اور راحتِ قیلولہ کے بعد شام کے پروگرام کے لئے اپنے اپنے ٹھکانوں سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ خاص پروگرام ایک گھنٹہ پر محیط ہے جس سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی قیام گاہوں میں لوٹ جاتے ہیں تاکہ عصر کی اذان سنیں اور نماز کی تیاری کریں۔

شام کے پانچ بجے کے قریب کواڑ بند ہو جاتے ہیں، وہ مغرب تک سر بزانو رہ کر اپنے اپنے سبق یاد کرتے ہیں۔ مغرب کی اذان گونج اٹھتی ہے، اذان کے بعد وہ سب ایک وظیفۂ خاص ادا کرتے ہیں، جس کا نام "وردُ الرابطہ"[1] ہے۔ اور یہ وِرد خاص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص دعاؤں میں سے ہے۔ آخر کار وہ تفکر اور مراقبہ کے لئے جُدا جُدا ہو بیٹھتے ہیں، جس جس کے کوئی رفیق مشرق یا مغرب کے کسی گوشہ میں ہوں گے، انہیں تصوّر میں لاکر اور اپنی رُوح کو ان کی روحوں سے ہم آہنگ کر کے وہ ماثورات میں سے یہ دُعا پڑھتے ہیں:-

خداوندِ پاک! تو جانتا ہے کہ یہ تمام دل تیری محبت پر مرتکز ہوئے ہیں،
—— تیری اطاعت پر مجتمع ہوئے ہیں —— اور تیری ہی دعوت پر متحد ہوئے ہیں، —— تیری
شریعت کا نظام برپا کرنے کا عہد کر چکے ہیں،
اے اللہ! ان کا رابطہ و رشتہ پختہ تر کر دے —— ان کی محبت پائیدار کر دے —— اور ان کے
—— دلوں کو اپنے غیر فانی نور سے بُقعۂ انوار بنا دے۔

اس دعا کے بعد وہ فرداً فرداً یا جماعت بندی کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کرتے ہیں، اور عشاء کی اذان تک علمی و مذہبی بات چیت میں لگے رہتے ہیں، عشاء کی نماز کے بعد ایک طویل مذاکرہ شروع ہو جاتا ہے جو آدھی آدھی رات تک، بلکہ بسا اوقات سپیدۂ صبح نمودار ہونے تک جاری رہتا ہے، اور یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ مومن کا ہر ایک کام حیرت ناک ہے۔ اُنہوں نے اس کے لئے جیل کی کال کوٹھری تجویز کی، اور خداوندِ جمیل نے اسی کو مردِ مومن کے لئے رنگ و نور کی وادی بنا دیا، وہ لوگ بھول گئے کہ

—— مومن کی سعادت اس کے ایمان میں ہے —— اس کا ایمان اس کے دل میں ہے۔
—— اور اس کے دل پر خداوند قدیر کے سوا کسی کی حکمرانی نہیں ——

اس سے پہلے کہ اے قاریٔ عزیز! میں آپ کے ساتھ اس علمی بستی کا دورہ ختم کر کے رخصت طلب ہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ جان لیں کہ یہ علمی شہر اپنے ماحول پر کہاں کہاں اور کس کس حد تک اثر انداز ہوا:-

(۱) مصر کے جیلوں کی پوری تاریخ ایسے بابرکت واقعہ سے خالی ہے کہ ان میں کوئی ایسا گروہ داخل ہوا ہو جس نے جیل کی کوٹھڑیوں کو کالجوں اور مسجدوں میں تبدیل کر دیا ہو۔

(۲) مصر کے جیلوں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کی کسی جیل کی بے روح اور جامد چہار دیواری میں آج تک کوئی اذان نہ گونجی تھی،

(۳) اس جماعت کے داخلہ سے پہلے وہاں آج تک کوئی نماز جمعہ ادا نہیں ہوئی۔ اور اے قاریٔ محترم! اگر آپ کو

---

[1] رابطہ قایم کرنے کا وظیفہ،

موقع ملے تو آپ جمعۃ المبارک کے خطیب کا خطبہ بھی سنتے جائیے۔ آپ اُستاذ فاضل شیخ فرغلی ہیں جو جیپ کار کے کسی مقدمہ میں زیر حراست ہیں، دیکھئے! اپنے مخصوص عمامہ و لباس میں ملبوس، نورانی ڈاڑھی کے ساتھ، خطاب فرما رہے ہیں، اگر آپ ان کا خطبہ سنیں تو آپ یوں محسوس کریں گے گویا صدر اوّل کے کسی اسلامی ہیرو کے سامنے کھڑے ہیں، خطبہ جمعہ ہی کا ہے لیکن ایسا رسمی اور رواجی خطبہ نہیں جو عام طور پر مسجدوں میں دیا جاتا ہے، یہ ایک عالمگیر اسلامی خطبہ ہے، اس میں ادارۂ اقوامِ متحدہ (یو، این، او) پر تبصرہ بھی ہے اور عرب حکومتوں کے لئے مشورے بھی۔ مصری حکومت کے لئے خاص ارشادات بھی شامل ہیں اور اصلاح کی جامع دعوت بھی! غیر اسلامی نظریات اور تخریبی خیالات کی بیخ کنی بھی ہے اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی خوش گوار ترغیب بھی،

کیا آپ نے میرے ساتھ یہ بات نوٹ نہیں فرمائی کہ نمازِ جمعہ اللہ کی زمین میں بہر کیفیت ایک اسلامی کانفرنس ہے، بے شک حقیقت یہی ہے، اور اسلامی ماحول کے دایرہ میں واقع ہونے والی کوئی شے، خواہ وہ جیل کی سنگین دیواریں ہوں یا ان دیواروں کے اندر آباد ہونے والے بدکردار نفوس، اسلام کے ہمہ گیر تاثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

یہاں ایک اور عجیب واقعہ یوں رونما ہو چکا ہے کہ اس وارڈ میں بعض ایسے طلبہ آئے جو خدمتِ خلق کے کالج میں تعلیم پا رہے تھے اور یہ چیز ان کے کورس میں شامل تھی کہ وہ بعض آوارہ منش اور بگڑے ہوئے لڑکوں کا مطالعہ کریں تاہم ایسی صورت میں کہ وہ طلبہ نظر بند ہوں، اپنا یہ مطالعہ جاری رکھنے کے ذرائع نہیں رکھتے تھے۔ ان کے حال پر خداوند کارساز کا یوں فضل ہوا کہ انہیں اسی ماحول میں مطلوبہ قسم کے بیس لڑکے مل گئے،

چنانچہ طلبہ نے ان لڑکوں کے حالات کا مطالعہ شروع کر دیا، اور رفتہ رفتہ اُنہوں نے ایک ایسی تھیوری مرتّب کر لی جسے امتحان سے پہلے تیار کرنا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ انہی کے مطالعہ و مشاہدہ کا اثر تھا کہ وہ بچے جن کی اصلاح سے حکومت مایوس ہو چکی تھی، خدا کے فضل و کرم سے بخوبی سدھر گئے، اب وہ اپنی نمازیں ٹھیک ادا کرنے لگے ہیں، اور ایسے راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جسے صراطِ مستقیم کہہ سکیں،

بلاشبہ! ایک مومن مجاھد کی یہی
شان ھے کہ جہاں کہیں وہ جائے اس کا
مشن اس کے ساتھ ساتھ ھو

---

("منبر الشرق" (قاہرہ) سے براہِ راست ترجمہ)

---

نازش پرتاب گڑھی

# ضرورت ہے رجز خوانی کی

تن پہ بوسیدہ عبا، پاؤں پہ تاج کسریٰ
شان اے دوست عجب تھی تری سلطانی کی

کھو گئی جرأتِ پرواز ہی تیری ورنہ
اب بھی ہے عرش کو حسرت تری دربانی کی

چونک اس خواب سے اے کرب و بلا کے میداں
پھر ہے ملت کو ضرورت اُسی قربانی کی

دل میں بیدار کریں جذبۂ ایمانِ خلیلؑ
آگ کو رسم سکھانی ہے گلستانی کی

سیرتِ پاکِ نبیؐ پیشِ نظر ہو جس کے
کیوں شکایت ہو اُسے بے سروسامانی کی

سیکھے اُس مرد سے آدابِ حکومتِ دنیا
بیٹھ کر بورئیے پر جس نے جہاں بانی کی

کس کو ہے فرصتِ نغماتِ طرب اے نازش
قوم کو آج ضرورت ہے رجز خوانی کی

ناصر مالیگانوی

# جذبِ دروں

وہی تیرہ دلی، تیرہ نگاہی
وہی انساں کی ہے گم کردہ راہی

یہ دنیا اب بھی بن سکتی ہے جنت
اگر نافذ ہوں قانونِ الٰہی

مٹا سکتے نہیں دینِ مبیں کو
یہ ہنگامے، یہ شورش، یہ تباہی

بدل جائے فضا امن و اماں سے
اگر دل میں ہو کچھ خوفِ الٰہی

کہیں گم کردۂ منزل نہ کر دے
تری سادہ دلی و کم نگاہی

ابھی دیکھی کہاں ہے تو نے اے دوست
مرے جذبِ دروں کی بے پناہی

قابل اجمیری

# "واردات"!

کل ستارے تھے جلو میں کہکشاں تھی ہمرکاب
آج گردِ کارواں بھی ہم سفر ہوتی نہیں

عشق کی دیوانگی پر کیا بھروسہ کیجئے
حُسن کی فرزانگی بھی معتبر ہوتی نہیں

پھر کوئی کم بخت کشتی نذرِ طوفاں ہوگئی
ورنہ ساحل پر اُداسی اسقدر ہوتی نہیں

تیرا اندازِ تغافل ہے جنوں میں آج کل
چاک کر لیتا ہوں دامن اور خبر ہوتی نہیں

میری نظریں جرأتِ نظارہ کی مُجرم سہی
احتیاطِ حُسن تم سے بھی مگر ہوتی نہیں

تیری ہستی بے نہایت تیرے جلوے بے شمار
ہر نظر لیکن کلیمانہ نظر ہوتی نہیں

کیا کہوں اُن کیف زا نظروں کا عالم کیا کہوں
فصلِ گل بھی اسقدر دیوانہ گر ہوتی نہیں

ہائے کس عالم میں چھوڑا ہے تمھارے غم نے ساتھ
جب قضا بھی زندگی کی چارہ گر ہوتی نہیں

حسرتِ دیدار ہی معیار ہو کر رہ گئی
اب کسی عنوانِ تسکینِ نظر ہوتی نہیں

نظمِ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

حیدر دہلوی

# رُباعی

زندہ ہیں تو تصویرِ محن ہیں ہم لوگ
مردہ ہیں تو بے گور و کفن ہیں ہم لوگ
جن کو نہ کرے دوزخِ غربت بھی قبول
وہ راندۂ فردوسِ وطن ہیں ہم لوگ

# غزل

نالہ ہوا ہے سرِ دلِ شوریدہ سر سے کیا
اب دیکھئے ظہور میں آئے اُدھر سے کیا

باہر حریمِ حُسن کے پردوں سے آئے کیوں
اب تم نکل سکو گے گرفتِ نظر سے کیا

یہ ہجر ہجر لا متنا ہی ہے ہم نشیں
ہو بھی گئی سحر تو نتیجہ سحر سے کیا

اللہ رے! راہِ شوق کہ اک نقشِ پا نہیں
پہنچے ہیں لوگ منزلِ مقصد پہ سر سے کیا

دل میں کیا ہے گھر تو کبھی سامنے بھی آ
دل سے نہیں حجاب تو پردہ نظر سے کیا

حیدر یہ شامِ دشت بڑھی جا رہی ہے کیوں
دیوانے چھین لیں گے گریباں سحر سے کیا

# قوسِ قزح

**جگر مرادآبادی:۔**

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے زُلف و مژہ کے سائے سائے

---

**بسمل ٹونکی:۔**

کہاں میں اور کہاں تیری محبت اس طرح لیکن دیا ہے اپنی ہستی کو فریبِ زندگی میں نے
چمن سے بے تعلق رہ کے بھی دل پر گری بجلی چمن کی سمت دیکھی برق جب گرتی ہوئی میں نے
اگر دیکھا ہے اپنے غم پہ دشمن کو بھی خوش ہوتے تو اپنے غم میں بھی محسوس کی ہے اک خوشی میں نے
زمانہ ہنس رہا ہے آج بسمل میرے رونے پر
نہ جانے کس کے رونے کی اُڑائی تھی ہنسی میں نے

---

**عالم اکبرآبادی:۔**

مرجاؤں گا کروں گا نہ اظہارِ آرزو اپنی خودی کی موت گوارا نہیں مجھے

---

بدگماں تو کہ تجھے کوئی ستم گر نہ کہے میری خواہش کہ تجھے طرزِ ستم آجائے

---

**اشک رام پوری:۔**

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ آپ للّٰہ چلے جائیے میخانے سے

---

**پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی:۔**

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہے کوئی اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

---

**اکبر گنوری:۔**

آنکھ جس ڈالی پہ جھپکالی سویرا ہوگیا

---

ماہر القادری

# کورٹ مارشل

دسمبر کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا، سرحدی علاقوں میں شدید برفباری ہو رہی تھی، پہاڑیاں، ندی، نالے، راستے، پگڈنڈیاں، در و دیوار سب کے سب سفید براق نظر آ رہے تھے، گویا قدرت نے تمام ماحول کو دھنکی ہوئی روئی میں لپیٹ دیا تھا ہریالی کہیں نام کو بھی دکھائی نہ دیتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زمین سے سبزے کی جگہ برف اُگ رہی ہے، تناور درختوں کی شاخیں بالکل ننگی ہو چکی تھیں، ایک پتہ بھی اُن میں نہ رہا تھا، کوہسار سچ مچ برفستان بن گیا تھا۔

پھلوں کے باغ برف کی شدت سے ٹھٹھر کر رہ گئے تھے، جن بیلوں پر انگور کے خوشے جھومتے تھے اور جن شاخوں میں شفتالو، سیب، انار اور انجیر کی ترو تازگی دکھائی دیتی تھی اب وہاں سوکھے تنکے بھی نہ رہے تھے، ہرے بھرے پودوں اور درختوں کو برف نے جھلسا دیا تھا۔

پہاڑیوں کے دامن میں اہلِ قبائل کے کچے مکان برف سے بالکل ڈھک گئے تھے، ان مکانوں میں وہی لوگ رہ سکتے تھے، جن کو برف کی بے رحمانہ یورش سے مقابلہ کرنے کی جرأت خاندانی طور پر ورثہ میں ملی ہو ـــــ دُنبوں اور بھیڑوں کی کھالیں، گرم چولھے، جلتی ہوئی انگیٹھیاں، سلگتے ہوئے الاؤ ـــــ آگ ہی سب کچھ تھی، آگ نہ ہوتی تو یہ لوگ زندہ کس طرح رہتے!

یہ برف باری کے دن تھے، سرحدی لوگوں کی جرأت و سخت جانی کے امتحان کا زمانہ، ان دنوں کے لئے بیچارے کھانے پینے کی چیزیں جمع کر کے نہ رکھیں تو بھوکے مر جائیں، آگ بدن کو گرم رکھ سکتی ہے مگر اس سے بھوکے کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا ـــــ وہ تو انھی لوگوں کی ہمت اور دل گردہ ہے کہ پورا خاندان سوکھے ہوئے گوشت کے چند بھنے ہوئے ٹکڑے کھا کر شکرِ نعمت ادا کرتا ہے اور پیشانی پر بل تک نہیں آتا ـــــ ان کے جسموں پر کھال نہیں شاید لوہے کی چادر چڑھی ہوتی ہے، عام آدمی اتنی سختیاں کہاں اُٹھا سکتے ہیں ـــــ فولادی انسان مگر دل کے نرم، متواضع، مہمان نواز، غیرت و خودداری کے زندہ مجسمے! سیدھے سادے، تہذیب و تمدن کی رنگ آرائیوں سے ناآشنا اور تمدن و سیاست کی فسوں کاریوں سے بے خبر!

ایک خس پوش مکان میں جس کی دیواروں کو دھوئیں نے سیاہ کر دیا تھا، چند لوگ الاؤ پر بیٹھے ہوئے تاپ رہے تھے، ان لوگوں میں قبیلہ کا سردار بھی تھا، لانبا قد، بھاری جسم، خوب گھنی ڈاڑھی، ماتھے پر زخم کا گہرا نشان، اور کنپٹیوں پر اُبھرا ہوا گوشت، سر کے بال سفید ہو چکے تھے، ننگے سر باہر نکلتا تو دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ سردار کے سر پہ برف کی تہ جمی ہوئی ہے، اُلجھی ہوئی ڈاڑھی آدھی کالی اور آدھی سپید تھی، جُٹی بھویں، موٹا ناک نقشہ، چہرہ بہت زیادہ بارُعب اور پُروقار تھا۔

"میجر صاحب کو زیتون کے تیل کی ضرورت ہے، کئی بار تقاضا کر چکے ہیں، تم میں سے کوئی ہمت کریگا اُن کے بنگلہ

تک جانے کی؟ ـــــــ سردار نے الاؤ کی آگ کو کریدتے ہوئے کہا۔

ـــــ جی ہاں! میں حاضر ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں جا سکتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی۔ ۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ کئی آدمیوں نے بہ یک وقت جواب دیا۔

سردار نے احساسِ مسرت کے ساتھ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، خوشی اس بات کی کہ اُس کے مُنھ سے بات نکلتی ہے اور لوگ بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں، قبائلی زندگی اور کوہستانی معاشرت کے لئے اسی ڈسپلن کی ضرورت تھی، قبیلہ والے اپنے سردار کا صرف ادب ہی نہیں کرتے بلکہ اُس سے عقیدت رکھتے ہیں، یہ بات نہ ہو تو خالی اوپری رُعب داب اور مارے باندھے کی ادب شناسی سے قبائلی تنظیم قایم نہیں رہ سکتی۔

برفباری میں گھر سے نکلنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا، اور آج تو اتنی شدید برفباری ہوئی تھی کہ زمرد خاں جب زیتون کے تیل کی بوتل لیکر گھر کے دروازے پر آیا ہے تو چار پٹھانوں نے زور لگا کر دروازے کو دھکا دیا، جب کہیں جا کر برف کی سلیں ہٹیں اور باہر جانے کا راستہ ملا۔

زمرد خاں کی عمر کوئی تیس برس کے لگ بھگ ہوگی، خوب تنومند جوان تھا، رنگت گندمی مگر سر کے بال بھورے تھے سُتواں ناک، ٹھوڑی ذرا آگے کو نکلی ہوئی، آنکھیں چمکیلی اور لانبے کان ذرا ذرا خم کھائے ہوئے ـــــــ اُس نے پوستین پہن رکھی تھی، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا، اسی کو ٹیک ٹیک کر اس برفستان سے وہ گزر رہا تھا۔

حدِ نگاہ تک برف ہی برف، آدمی نہ آدم زاد، سنسان فضا، اُجاڑ ماحول، پرندہ کیسا، گھانس کی ایک پتی تک دکھائی نہ دیتی تھی، کسی کا دل بجھا ہوا ہو تو اُس کو چاروں طرف کفن کی چادریں پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں اور طبیعت اُمنگ پر ہو تو پھر یہ محسوس ہوتا تھا کہ قدرت نے کوری سفید چاندنی ہر طرف بچھادی ہے۔

برف پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے بڑی مشق درکار ہے اور کوہستانی علاقہ تو یُوں بھی ہموار نہیں ہوتا گرمی کے موسم میں جبکہ راستے صاف ہوتے ہیں اور ایک ایک چیز نظر آتی ہے، ان راہوں سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں اور اب تو ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور ہر یخ بستہ تودے کے نیچے کسی خندق، کھڈ، گڑھے اور غار کے ہونے کا امکان تھا، اس پر طُرفہ قیامت یہ کہ نہ کہیں منزل کا نشان، نہ کوئی موڑ، نہ کسی جگہ لیکھ اور نہ کسی آنے جانے والے کا نقش پا! اس میدان سے گزرنا سچ مچ جان جوکھوں کا معاملہ تھا، ہر غلط قدم موت کو دعوت دے سکتا تھا ـــــــ مگر زمرد خاں اطمینان کے ساتھ چلا جا رہا تھا، برفستان ہی میں وہ پیدا ہوا! اور یہیں پل کر اور بڑھ کر تیس سال کا جوان آدمی ہوگیا، اُس نے برف باری کے ایسے مناظر بارہا دیکھے تھے، اُس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی ـــــ پٹھان یوں بھی خطروں سے گھبرایا نہیں کرتا، جفاکشی اور سخت آزمایشوں میں اُسے لطف آتا ہے۔

چڑھائی کا راستہ تو آسانی سے طے ہوگیا، مگر جب ڈھلوان جگہ آئی تو زمرد خاں برف کی سلوں سے اُترتے ہوئے دشواری محسوس کرنے لگا، ایک جگہ اُس کی لکڑی پھسل ہی گئی اور لکڑی کے ساتھ ہی وہ بھی پھسل گیا، نیچے جا کر دم کا سانس پھولی ہوئی تھی، پنڈلیوں کی رگوں کا ہو جم سا گیا تھا، زیتون کے تیل کی شیشی اُس کی گردن میں لٹک رہی تھی اور یہی شیشی اُس کی سب سے زیادہ قیمتی متاع تھی۔

اب فوجی حدود شروع ہو چکے تھے، سپاہیوں کی بارکیں دکھائی دے رہی تھیں چمنیوں سے دُھواں نکل رہا تھا، پُرانی اور ناکارہ لاریوں کے ڈھانچے دُور تک بکھرے ہوئے پڑے تھے زمرد خاں ان کے پاس سے گزرتا ہوا ایک بنگلے کے دروازے پر پہنچا، پھاٹک

کے قریب کی دیوار پر ایک تختی لگی تھی جس پر "میجر ڈاسن" لکھا تھا، زمرد خاں اس بنگلہ میں کئی بار آچکا تھا، قبیلوں کے سرداروں سے فوجی افسروں کو تعلقات قایم رکھنا پڑتے ہیں، ان کی مدد اور تعاون حاصل نہ ہو تو فوج کی بعض ضرورتیں بڑی دشواری سے پوری ہوں، یہ تعلقات اور روابط سہولتیں پیدا کرتے ہیں، آدمی کا بہر حال آدمی سے کام نکلتا ہے، بستی ہو یا جنگل، سمندر ہو یا پہاڑ آدمی آدمی کی امداد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

بنگلہ کے برآمدے میں سنتری کندھے پر رائفل لئے ہوئے ٹہل رہا تھا، زمرد خاں نے اُسے بتایا کہ ہمارے سردار نے میجر صاحب کے لئے زیتون کے تیل کی شیشی بھیجی ہے، سنتری نے کہا کہ میجر صاحب تو کھانا کھا رہے ہیں، تم شیشی یہاں میز پر رکھ جاؤ، میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ فلاں سردار صاحب نے آپ کے لئے یہ تیل بھیجا ہے ——— زمرد خاں نے جواب دیا کہ میں میجر صاحب کے ہاتھ میں یہ شیشی دوں گا سردار نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

——— تو پھر تمھیں کچھ دیر ٹھیرنا ہوگا ——— سنتری نے کہتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا اور زمرد خاں بنگلہ کے اُس حصہ میں چلا گیا، جہاں اردلی، خانساماں اور باورچی رہتے تھے، وہاں بھی آگ سلگ رہی تھی اور اس برفباری میں کسی مہمان کی سب سے بڑی خاطر و مدارات یہی تھی کہ اُس کے تاپنے کا انتظام کر دیا جائے، چاہے پینے کا پانی نہ ہو مگر آگ کا ہونا ضروری تھا، جہاں برف پڑ رہی ہو وہاں "آبِ حیات" کی نہیں "آتشِ حیات" کی ضرورت ہوتی ہے۔

گھنٹہ پون گھنٹہ تک زمرد خاں انگیٹھی پر تاپتا رہا، اور نوکروں سے اِدھر اُدھر کی بات چیت ہوتی رہی، یہ نو وارد لوگ تھے، زندگی بھر میں یہی پہلی برفباری انھوں نے دیکھی تھی، جاڑے کے مارے اُن کے ہوش و حواس گم تھے، پٹھان اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا اور یہ آگ کے شعلوں کو چھو رہے تھے مگر "سی سی" کرتے جاتے تھے ——— زمرد خاں سے ان کے سوالات!

——— جاڑے میں پٹھان لوگ سنا ہے کوئی گرم دوا کھاتے ہیں۔

——— میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ خان صاحبوں کو کوئی جلالی وظیفہ یاد ہے، برفباری میں اُسے پڑھتے ہیں اور گرم رہتے ہیں۔

——— آپ جیسے ہزار دو ہزار جوان اللہ کا نام لیکر دھاوا بول دیں تو سارا کفرستان، عربستان بن جائے،

——— جن لوگوں کی خوراک پھل، میوہ، شہد اور دُنبے کا گوشت ہو، اُن کو ایسا ہی بھاری بھرکم ہونا چاہیئے۔

——— خاں صاحب! تم نے شادیاں کتنی کی ہیں؟ اور یار! سچ بتاؤ کہ اس برفباری میں گاؤں سے یہاں تک آئے ہو تو آخر گھر سے کیا کھا کر چلے تھے؟

زمرد خاں اُن کی باتوں پر ہنستا رہا، اتنے میں سنتری نے آواز دی، زمرد خاں پوستین جھاڑتے ہوئے اُٹھا اور لمبی لمبی ڈگیں بھرتا ہوا سنتری کے پاس پہنچا اور اس کے اشارہ کرنے اور دروازے کھولنے پر کمرے میں داخل ہو گیا، میجر صاحب کو زیتون کے تیل کی شیشی دی، میجر نے شیشی ہاتھ میں لیکر سردار کے اخلاق کی تعریف کی اور زمرد خاں کو چلتے وقت دو روپیہ کا نوٹ دیا، اُس نے انکار کیا، میجر اصرار کرنے لگا، زمرد خاں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور پردیسی ہیں، پردیسیوں اور مہمانوں کو تحفے دے کر ہم اُس کے بدلے میں انعام اکرام قبول نہیں کر سکتے"۔

زمرد خاں میجر کے بنگلہ سے چل کر اپنی بستی میں آگیا اور سردار سے کہا کہ صاحب تیل کی شیشی لیکر بہت خوش ہوئے، آپ کو سلام کہا ہے، سردار کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں، صاحب بہادر نے سلام بھیجا تھا اور شکریہ بھی! اور دو عنایتیں اور ایک ساتھ! جن کی راجدھانی میں سورج نہ چھپتا ہو، اُن کی طرف سے پیام سلام آنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ قبیلہ کے سردار سے میجر صاحب کے تعلقات بڑھتے ہی گئے، تحفوں کی اُس نے بھرمار کر دی، شہد، سمور،

میوے، خشک بھی اور تازہ بھی! تیتر، بٹیر، چکور ... اور وہ سب کچھ بھیجا، جو اُس کوہستان میں میسر آسکتا تھا، میجر نے سردار کو فوج میں ایک دو چیزوں کے ٹھیکے بھی دلوا دیئے، تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ـــــ زمرد خاں کا اس سلسلہ میں وہاں آنا جانا رہتا، سردار کا وہ خاص آدمی تھا، بھروسہ کا آدمی، ایماندار، بات کا پکّا اور زبان کا سچا!

برفباری رُکی، تو بارش ہونے لگی ـــــ مگر آخر کب تک! سدا ایک سی رُت تو نہیں رہتی، جاڑے کم ہونا شروع ہوئے، یہاں تک کہ گرمی کا موسم آگیا، یہ کوہستانی علاقہ کا موسم بہار تھا، چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ، جیسے قدرت نے ہری بانات کا فرش بچھا دیا ہے، چٹانوں کی دراڑوں سے بھی سبزہ پھوٹ نکلا، جنگل میں منگل ہوگیا، پہاڑیوں پر ہریالی لہلہانے لگی، اُجاڑ اور بے برگ و گیاہ کوہسار دُلھن بن گیا تھا جس کی پور پور سنوری ہوئی تھی

اسی موسم بہار میں ناصر اُس برگیڈ میں سب لفٹننٹ ہو کر آیا، لمبا تڑنگا دیدارو نوجوان تھا، تعلیم یافتہ بھی اور ساتھ ہی ذہین بھی! خوش مزاجی سے زیادہ اُس میں سنجیدگی پائی جاتی تھی، بعض اوقات دیکھنے والے سنجیدہ آدمی کو مغرور سمجھنے لگتے ہیں! ناصر کو بھی اُس کے ماتحت سپاہیوں، نائیکوں، حوالداروں اور جمعداروں نے مغرور اور متکبر ہی سمجھا، لیکن یہ انکی غلط قیاسی تھی، ان لوگوں نے اب تک زیادہ تر ھنسوڑ، کھلنڈرے اور زود آمیز افسروں کو دیکھا تھا، ایک سنجیدہ افسر سے ان کا یہ شاید پہلا سابقہ تھا۔

شروع شروع میں ناصر کم آمیز رہا، مگر یہ وضع زیادہ دن تک نبھ نہ سکی! اُسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے تکلف ہوجانا پڑا ـــــ ناصر مذہب کے معاملہ میں "جوہر" اور "روح" کا قایل تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ رسموں پر میں ایمان نہیں رکھتا اصل چیز "روحِ عمل" ہے مثلاً "نماز" آدمی کو نیک بناتی ہے، تو اگر کوئی آدمی نماز نہیں پڑھتا مگر وہ نیک ہے تو اُس سے نماز نہ پڑھنے کی بازپرس نہ کی جائے گی کہ نماز کے مقصد کو اُس نے پورا کر دیا ـــــ اُس کا کہنا تھا کہ روزہ کا "جوہر" ہے بندگانِ خدا کی بھوک پیاس کا احساس! اگر کوئی شخص روزے کے زمانے میں بھوکے کو کھانا کھلا دیتا ہے اور محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کرتا ہے تو چاہے ماہِ صیام میں وہ روزہ نہ رکھے مگر وہ ہے "روزہ دار" ہی! کہ روزہ کے مقصد کی اُس نے تکمیل کر دی ـــــ ان خیالات پر وہ سختی کے ساتھ جما ہوا تھا، کہیں بحث مباحثہ ہوتا تو وہ پوری قوت اور جوش کے ساتھ اُس میں حصہ لیتا، انگریزی تہذیب سے بھی وہ بہت کچھ مرعوب تھا، ایک محفل میں بحث ہو رہی تھی، ناصر بھی وہاں موجود تھا، اُس نے زوردار لہجہ میں یہاں تک کہہ دیا ـــ کہ میں تو انگریزوں کو اُن "صالحین" میں سے سمجھتا ہوں، جن سے اللہ تعالیٰ نے زمین کی بادشاہت دینے کا وعدہ کیا ہے ـــــ اس پر ایک آواز آئی ـــــ ناصر صاحب! اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی ڈھیل بھی دیدیا کرتا ہے.... ... اور ناصر سُنی کو ان سُنی کرنے کے لئے گلے کی ٹائی میں پیچ دینے لگا۔

چند ماہ کے بعد ناصر کی شادی ہوگئی، بیوی کو وطن سے لیکر وہ اپنے فوجی مستقر پہ آگیا، ہر جوان شوہر اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور ناصر کو توان بہشت آفریں مناظر میں ایک رفیقۂ حیات کی از بس ضرورت تھی ـــــ چاندنی راتوں کی تنہائی میں چاند کی طرف چکوروں کی بے تابانہ پرواز وہ کب تک دیکھتا رہتا ـــ

ناصر کی بیوی ـــــ شاہ بانو ـــــ شباب کی اُس منزل میں تھی جہاں کالی کلوٹی عورت پر بھی جوبن اور بہار آجاتی ہے اور شاہ بانو تو چندے ماہتاب چندے آفتاب تھی! شگفتگی کا یہ عالم کہ اُس کے بندلبوں پر دیکھنے والوں کو مُسکراہٹ کا دھوکا ہوتا، حُسن و رعنائی کی دل کشی تصویر! نازک ناک نقشہ اور اُس پر قیامت سرو قامتی!

شاہ بانو کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی، میٹرک اُس نے پرائیویٹ امتحان دے کر پاس کر لیا، کالج میں ایک سال تک ایف۔ اے میں تعلیم پائی، مگر شادی ہو جانے کے سبب یہ سلسلہ قایم نہ رہ سکا، مطالعہ کی وہ بچپن ہی سے شوقین تھی کورس کی کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھتی رہتی، ناولوں سے لیکر فلسفہ کی کتابوں بلکہ ریلوے کے ٹایم ٹیبل تک!

شاہ بانو کے گھرانے میں پردے کی پابندی ہوتی تھی مگر یہ بھی ہوتا کہ جوان لڑکیاں نامحرم ماسٹروں سے بے پردہ ہو کر پڑھتیں، شاہ بانو کو بھی اس "نیم بے پردگی" کی منزل سے گزرنا پڑا، شادی کے بعد وہ اپنے گھرانے کے دستور کے مطابق پردے میں رہنے لگی۔

فوجی مستقر میں آئے ہوئے اُسے چند دن ہوئے تھے، شروع شروع میں ناصر نے شاہ بانو کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا، مگر ایک دن باہر ٹہلتے ہوئے اُس نے بیوی کی نقاب جھٹکا دیکر اُٹھا دی اور طنز آمیز انداز میں کہنے لگا ——— شاہ بانو! میں نے مذہبی کتابیں تم سے کہیں زیادہ پڑھی ہیں، خدا کی قسم چہرہ "ستر عورت" میں داخل نہیں ہے، یہ سب ان کٹھ ملاؤں کی حاشیہ آرئیاں ہیں۔ ... ... "

شاہ بانو بے نقاب ہو گئی اور ہو کیا گئی کر دی گئی، بے نقابی کی یہ رسمِ افتتاح شوہر کے ہاتھوں سے ادا ہوئی، اب وہ دونوں کھلے بندوں سڑکوں پر گھومتے، شاہ بانو نے پہلے پہلے تو جھجک محسوس کی مگر رفتہ رفتہ جھکی ہوئی آنکھیں اونچی ہوتی چلی گئیں ——— پھر یہ ہوا کہ ناصر بیوی کو دعوتوں اور پارٹیوں میں لے جانے لگا شاہ بانو غیر معمولی حسین تھی، ہر محفل میں اُس کی پذیرائی ہوئی اور وہ جو پہلے دن بیوی کے چہرے سے نقاب سرکاتے ہوئے ناصر نے کہا تھا کہ "چہرہ "ستر عورت" میں داخل نہیں ہے .... .. " اب وہی ذہن نکتہ آفریں نامحرم مردوں کے ساتھ میل جول کے لئے بھی بہانے تراشنے لگا، اور اپنی کمزوری اور بے غیرتی کے جواز کے لئے دین اور اسلام کے نام پر رخصتیں پیدا کی جانے لگیں، وہ آنکھیں جو پہلے اُسوۂ رسولؐ اور مسلکِ صحابہ کو معیارِ انسانیت سمجھتی تھیں اب شاہان بنوامیہ کی زندگی میں "مثالیں" اور "نظیریں" تلاش کرنے لگیں۔

ایک پارٹی میں شاہ بانو کا تعارف خود ناصر نے میجر داٹسن سے کرایا، اُس دن کے بعد میجر نے ناصر سے ملنا جلنا شروع کر دیا، ناصر بہت ذہین تھا مگر اُس کی ذہانت نہ جانے اب کہاں چلی گئی تھی کہ میجر کی اس عنایتِ بے غایت کو اُس نے سمجھنے اور جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، ربط ضبط بڑھنے لگا، دعوتیں، پارٹیاں، پک نک، سیر و تفریح ——— یہاں تک کہ ناصر لفٹنٹ ہو گیا، اور یہ سب کچھ طفیل تھا شاہ بانو کے حُسن فتنہ ساز اور شباب دیوانہ گر کا! ورنہ اسی بریگیڈ میں ناصر سے پرانے پرانے سب لفٹنٹ موجود تھے، جو ناصر سے بہت زیادہ کارگزار بھی تھے مگر اُن کو ترقی نہیں ملی، ان بیچاروں کے پاس خوبصورت بیویاں کہاں تھیں، اور جن کے پاس تھیں وہ اس بے غیرتی کیلئے کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔

اب ایسا بھی ہونے لگا کہ شاہ بانو میجر داٹسن کے ساتھ سینما بھی چلی جاتی قبیلوں کے سردار میجر کے پاس تحفے بھیجتے اور اُن کا زیادہ یا یوں کہیے منتخب حصہ لفٹنٹ ناصر کے بنگلہ پر پہونچ جاتا، ایک بار اتمان زئی خیل کے سردار نے اُسی ذمردخاں کے ہاتھ ایک درجن چکوریں میجر کے پاس بھیجیں اور میجر نے ان میں سے دو رکھ کر باقی چکوریں شاہ بانو کے شوہر کی خدمت میں گزران دیں۔

میجر داٹسن بہت ہوشیار اور جہاں دیدہ تھا، اس منزل میں وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا، کوئی اناڑی ہوتا تو جلد بازی کر کے معاملہ کو بگاڑ لیتا، میجر کو دیر یا سویر اپنی کامیابی کا یقین تھا، شاہ بانو اُس سے کافی مانوس ہو چکی تھی اور ناصر کی آنکھوں پر تمدن و آزادی کی بوقلمونیوں اور حرص و ترقی کی خوش خیالیوں نے پردے ڈال دیئے تھے،

اُسے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

میجر کے درپردہ اشارے اور بعض آزاد خیال عورتوں کی تائید سے یہ تحریک شروع ہوئی کہ عورتوں کو فوجی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے، عورت کو اپنی عصمت آبرو کی حفاظت اور ملک کی پاسبانی کے لئے فوجی ٹریننگ حاصل کرنا ضروری ہے، کلب گھر میں بڑی بڑی دھواں دار تقریریں ہوئیں، اُن میں چیخ چیخ کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا گیا کہ عورتوں کو فوجی تربیت سے دور رکھنا، صنفِ نازک کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہے، اس ترقی یافتہ دور میں اس ناانصافی کو اب برداشت نہیں کیا جا سکتا، زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت اب مرد سے پیچھے نہیں رہ سکتی، وہ زمانے لد گئے جب عورت کو نازک اندام، ناقص العقل اور کمزور کہہ کر بے چاری کو گھر کے قید خانہ میں بند کر کے رکھا جاتا تھا، اب عورت آزاد ہے، ہر طرح آزاد ہے، اُس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر کی مشینوں سے لیکر بندوقوں، بموں اور توپوں تک کو حرکت میں لانے کے لئے آزاد ہیں ——— "عورت زندہ باد" کے پُرجوش نعرے! جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج گونج گیا، اور عورتیں خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھیں جیسے اُن کی غلامی اور محکومی کی آخری زنجیر بھی آج مجاہدوں نے کاٹ کر رکھ دی۔

عورتوں کے لئے فوجی تربیت گاہ کھول دی گئی، نامحرم مرد اُن کے "انسٹرکٹر" تھے! حالانکہ گھروں میں رہ کر باپ بھائی اور شوہروں سے بھی فوجی تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی۔ ۔ ۔ مگر غیر مردوں کے ہاتھوں کے ٹہوکے کہاں سے ملتے! اور وہ ملنے جلنے کے بے باکانہ موقعے! عورت پریڈ کر رہی ہے اور مرد انسٹرکٹر نے شانے اور گردن چھو کر کہا "سیدھی کھڑی رہو" کسی نے ٹھوڑی کو اُکسا دیا، کسی نے عُریاں پنڈلیوں اور برہنہ باہنوں کو تھپکتے ہوئے بتایا کہ "اس مانگ (موافق) تناؤ پیدا کرو" ——— اور بندوق کی نشانہ بازی سکھاتے ہوئے وہ شانوں کا تصادم اور رُخساروں کے گداز کا لطف احساس ——— گھریلو زندگی میں یہ مزے کہاں! کلب گھروں اور رقص گاہوں میں پھر لوگ انگشت نمائی کرتے ہیں اور یہاں کس ہمت تھی جو ایک حرف بھی زبان سے نکال سکتا، یہ قوم کی خدمت تھی اور وطن کی حفاظت اور عصمت و آبرو کے بچاؤ کے لئے سعیٔ تدبیر!

شاہ بانو کو اب میجر سے ملنے جلنے کی بہت کچھ آسانیاں میسر آگئیں، ناصر بہت خوش تھا کہ اس کی بیوی وطن کی حفاظت کے لئے لائق سپاہی بنی جا رہی ہے ——— یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی، اور کیوں نہ بڑھتی جبکہ شعلوں اور خسخانوں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔

میجر ایک دن چاندماری کر کے اپنے بنگلے کی طرف گھوڑے پر واپس آ رہا تھا، راستہ میں زمرد خاں کا گاؤں پڑتا تھا، گاؤں کے آس پاس میووں کے باغ تھے، پہاڑی کے ڈھلواں حصہ میں پانی کا ایک چشمہ تھا، جو باغوں کے بالکل قریب سے گزرتا تھا، گاؤں کی عورتیں یہاں پانی بھرنے کے لئے آئی تھیں، خوب ڈھیلے ڈھالے نیچے نیچے کرتے، سروں پر دوپٹے، اوڑھنیاں اور چادریں! گاؤں کے مرد پنگھٹ کی طرف نہ آتے تھے، یہ اُن کی غیرت بھی تھی شرافت بھی اور پاک بازی بھی!

میجر کی نگاہ ایک عورت کے چہرے پر پڑی، اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا، عورت نے چادر میں چہرے کو جلدی سے چھپا لیا، میجر محسوس کر رہا تھا کہ چودھویں رات کا چاند بدلی میں چھپ گیا، یہ کوہستانی حُسن تھا، شگفتگی کی جنت اور شادابی و صحت مندی کی فردوس ——— میجر وہاں سے گزرنے کو تو گزر گیا لیکن ہوس قدم قدم پر تقاضا کر رہی تھی کہ "ایک نگاہ اور ۔ ۔ ۔ !

کئی دن کے بعد وہی عورت میجر کو زمرد خاں کے ساتھ ایک باغ میں نظر آئی ——— یہ زمرد خاں کی بیوی تھی، جوان اور خوبصورت بیوی! گاؤں کی شاید سب سے زیادہ حسین عورت ——— میجر نے بہت دیر تک سوچا، وہ سوچتا ہی رہا، ہوس نے بہت سی راہیں سمجھا دیں، کبھی کبھی تو کامیابی اور خطرے کے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا، میجر پائپ میں کش لگا کر مسکرانے لگا، مٹھیاں بھینچ کر اس نے انگڑائی لی اور جماہی بھی ——— شاہ بانو اور لفٹننٹ ناصر کے واقعات اس کے سامنے تھے، ہوس نے کہا کہ جب تہذیب، خوشحالی اور علم و ہوشمندی رام ہو سکتی ہے تو افلاس و جہالت کو قابو میں لانا کونسی بڑی بات ہے!

زمرد خاں کبھی کبھار کسی کام سے میجر کو سلام کرنے اور سردار قبیلہ کا پیام پہونچانے کے لئے بنگلہ پر آ جایا کرتا تھا، مگر اب میجر نے خود پہل کی، زمرد خاں کو وہ اپنے یہاں بلانے لگا، فوج میں ایک لکڑیوں کی سپلائی کا ٹھیکہ بھی زمرد خاں کو مل گیا، قبایل کے تمام لوگ حیران تھے کہ میجر صاحب زمرد پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ گاؤں میں اس بات کے چرچے ہونے لگے۔

میجر سے زمرد خاں کا ربط ضبط بڑھتا ہی جا رہا تھا، میجر نے آہستہ آہستہ تمام باتیں معلوم کر لی تھیں کہ وہ گاؤں میں کن اوقات میں رہتا ہے، باہر کب جاتا ہے، اس کی بیوی پنگھٹ اور باغوں میں کب اور کس طرح جایا کرتی ہے، دو چار بار ایسا بھی ہوا کہ راستہ میں زمرد خاں کی بیوی میجر کو نظر آئی اور اس نے گھوڑا تھام کر کہا کہ زمرد خاں سے یہ کہہ دینا وہ کہہ دینا۔

ہوس جتنی چالاک ہوتی ہے، بعض وقت اتنی ناسمجھ اور فریب خوردہ ثابت ہوتی ہے، میجر تنہائی میں سوچتا تو ہوس بڑھاوے دیتی کہ زمرد خاں کی بیوی اس سے متاثر ہے، اس دن شہتوت کے درختوں کے نیچے وہ ملی تھی تو اس نے نقاب کی آڑ سے کس قدر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا ——— اور چشمہ پر وہ اس کا گھڑا اٹھاتے ہوئے گردن کو معنی خیز انداز میں جنبش دینا، اور وہ اس کا رُک رُک کر کہنا ———

"وہ شکار کھیلنے گئے ہیں، جب آئیں گے تو آپ نے جو کچھ کہا ہے، اُن سے کہہ دیا جائے گا"

ہوس کہہ رہی تھی کہ نزاکتوں اور احتیاطوں سے کام نہ چلے گا، اس منزل کو سر کرنے کے لئے ہمت کرنی پڑے گی، بس پھر بیڑا پار ہے، کوئی ناگوار بات درمیان میں آ بھی گئی تو فوج کے ایک انگریز میجر کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، بات بنانے کیلئے لاکھ بہانے اور ہزار طرح کی تدبیریں ہیں!

ہوس موقعہ کی تلاش میں تھی، اور موقعہ مل گیا ——— زمرد خاں کی بیوی دو لڑکوں کے ساتھ جن کی عمر دس دس بارہ بارہ سال کی ہوگی، سیب کے باغ میں تھی، میجر کا وہاں آنا ہو گیا، اس کی کرنجی آنکھوں میں ہوس تلملانے لگی، میجر نے لڑکوں کو ایک ایک روپیہ کا نوٹ دے کر کہا کہ میں اپنے بنگلہ کے برآمدے میں کارتوس کی پیٹی بھول آیا ہوں، تم جا کر لے آؤ، لڑکے تیزی کے ساتھ چل پڑے، اب تنہائی تھی، سیب کے پودوں کا خنک سایہ، ٹھنڈی ہوا، پرندوں کے نغمے، ہریالی اور ایک حسین عورت کی موجودگی ——— میجر نے ہوس آمیز گفتگو کا سلسلہ شروع کیا، عورت سنتی رہی، عورت کی خاموشی نے میجر کی ہمت بڑھائی کہ "نیم رضا" والا معاملہ ہے، وہ عورت کی طرف بڑھا ——— عورت نے اس پر کہا۔

"آپ حقہ تو پیتے ہوں گے ———"

میجر نے خوش ہو کر جواب دیا ——— "حقہ کیا، تم زہر بھی پلا دو تو میں اُسے آبِ حیات سمجھ کر نوش جان کرنے کے لئے

تیار ہوں۔ ۔ ۔ "میجر نے پشتو زبان سیکھ لی تھی، بلکہ اُس میں مہارت پیدا کر لی تھی، اُس نے پشتو میں بڑی میٹھی، دل نشین اور سلیس باتیں کیں،

زمرد خاں کی بیوی جھونپڑی میں پہونچی، اور وہاں سے بندوق اُٹھا کر، اُس نے دَن سے فیر کر دیا گولی نشانہ پر پڑی، میجر واٹسن خاک و خون میں تڑپنے لگا، بندوق کی آواز اور پھر اُس کی بازگشت سے پہاڑیاں گونج اُٹھیں، زمرد خاں کی بیوی گاؤں میں چلی آئی، اُس کا چاند سا ماتھا پسینہ میں ڈوب گیا تھا، غیرت، خوف اور شرافت و عصمت کے ملے جلے جذبات کی نمود! ـــــــ فوج کے انگریز میجر کا قتل کوئی معمولی حادثہ نہ تھا!

بات چھپ کہاں سکتی تھی، بندوق کا اس طرح چلنا ہی بہت بڑا واقعہ تھا، فوجی حلقوں میں بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی، قبائلی گاؤں محاصرے میں لے لئے گئے، میجر کی لاش باغ میں پڑی تھی، گولی ناف سے ذرا اوپر لگی تھی اور جسم سے پار ہوگئی تھی، لاش کے آس پاس خون ہی خون پڑا تھا، میجر کے پتلون سے ایک خط برآمد ہوا ـــــــ یہ شاہ بانو کا خط تھا، میجر واٹسن کے نام :۔

"۔ ۔ ۔ کل میں کلب گھر کے لان میں آپ کا انتظار کرتی رہی، مگر آپ نہیں آئے، بڑی تکلیف ہوئی! ایسا نہ کیا کیجئے، پرسوں میرے کندھے پر رائفل رکھتے ہوئے آپ نے میرے رُخسار کو جو ٹھوکا دیا تھا، اُس کی لذت اب تک دل پر نقش ہے، بندوق کی نشانہ بازی سکھانے سے پہلے آپ نے میرے نازک دل کو نشانہ بنا دیا۔ ۔ ۔"

ناصر گرفتار کر لیا گیا، اس خط کو پڑھ کر یہی قیاس کیا گیا کہ "یہ خونیں حادثہ رقابت کا سبب ہے! مقتول واٹسن سے شاہ بانو کی آشنائی تھی، اور اُسے ناصر کی غیرت برداشت نہ کر سکی، ناصر کا کورٹ مارشل ہوا، اُس نے فوجی عدالت میں ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں نہیں کہا، اُس کے لبوں پر مُہر سی لگ گئی تھی، وہ دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر در و دیوار کو دیکھتا تھا۔ اُس کا غم لفظوں میں بیان کہاں ہو سکتا تھا ـــ!

فوجی عدالت میں شاہ بانو کا پیش ہونا تو سب سے زیادہ ضروری تھا، وہ آئی، شرمائی اور سہمی ہوئی، ناصر کٹہرے میں کھڑا تھا، بیوی کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، غیرت و غضب اور غم و عتاب نے اُس میں غیر معمولی طاقت اور جُرأت پیدا کر دی تھی، وہ سپاہیوں کی صف کو چیرتا ہوا حلقہ سے باہر آگیا، اور ہتھکڑی اس زور سے شاہ بانو کے منہ پر ماری کہ اُس کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا اور ایک کیل نے سیدھے نتھنے کو صاف کر دیا، سپاہیوں نے اُسے دبوچ لیا، شاہ بانو زخموں کے اثر سے چیخنے لگی، آج کا اجلاس اس حادثہ کے سبب ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن صُبح جب قید خانہ کا دروازہ صفائی کے لئے کھولا گیا، تو ناصر کو مردہ پایا گیا، آہنی سلاخیں اُس کی گردن میں پیوست تھیں ـــــــ جس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا، وہی ختم ہو گیا تو مقدمہ کس پر چلتا۔

شاہ بانو کا زخم تو بھر گیا مگر ناک کا بانسہ خم کھا گیا، وہ سیدھا نہ ہو سکا اور ناک کا نتھنا بھی نہ جُڑ سکا، نکٹی شاہ بانو جس کے چہرے کا جغرافیہ ہی بدل گیا تھا، اُس سڑک سے گزر رہی تھی، جس کے ایک احاطہ پر یہ تختی لگی تھی :۔

"عورتوں کی فوجی تربیت گاہ غیر معین مُدّت کے لئے بند کر دی گئی۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

# روحِ انتخاب

## قربانی کی شرعی حیثیت

کچھ مدت سے اخبارات میں یہ غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے کہ بقر عید کے موقع پر جانوروں کی قربانی کرنے کا کوئی حکم اسلام میں نہیں ہے۔ یہ محض ایک رسم ہے جو ملاؤں نے ایجاد کر لی ہے، اور اس فضول رسم پر ضایع کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس روپیہ کو اجتماعی مفاد کے کسی کام پر خرچ کیا جائے۔ ان خیالات کی تبلیغ اب سے کئی سال پہلے بعض منکرین حدیث نے شروع کی تھی۔ اور اسی زمانہ میں میں نے رسالہ ترجمان القرآن میں قرآن و حدیث کی سند اور عقلی دلائل سے ان کی مفصل تردید کر دی تھی۔ لیکن اب دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان میں پھر یہ فتنہ اٹھایا جا رہا ہے، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ کے متعلق اسلامی احکام واضح طور پر بیان کر دوں تاکہ محض ناواقفیت کی وجہ سے کوئی شخص اس فتنہ سے متاثر نہ ہو جائے۔

### قربانی کا حکم قرآن میں

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قربانی کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ کیا وہ قربانی کو صرف حج اور متعلقات حج تک محدود رکھتا ہے، یا دوسرے حالات میں بھی اس کا حکم دیتا ہے؟ اس باب میں دو آیتیں بالکل صاف ہیں جن کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے، پہلی آیت سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے:-

قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العٰلمین، لا شریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین "اے نبی! کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللّٰہ رب العٰلمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت خم کرنے والا میں ہوں۔"

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ نہ حج فرض ہوا تھا نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے اور نہ اس میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے نسک کا جو لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے اسے خود قرآن مجید میں دوسری جگہ قربانی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے فمن کان منکم مریضاً او بہ اذیً من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک۔ "تم میں سے جو شخص سفر حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوا لے تو فدیہ میں روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔" (البقرہ-۲۴) اس نظیر سے معلوم ہوا کہ سورۂ انعام کی مذکورہ بالا آیت میں بھی نسک کے معنی قربانی کے ہیں، تاہم اگر اس لفظ کو عام عبادت کے معنی میں بھی لیا جائے تو قربانی کا مفہوم اس میں ضرور شامل مانا جائے گا۔

دوسری آیت سورہ کوثر میں ہے: فصل لربک وانحر۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔

یہ آیت بھی مکی ہے اور اس میں بھی کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کے لئے خاص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اہل لغت نے "نحر" کے معنے سینے پر ہاتھ باندھنے، اور قبلہ رخ ہونے، اور اول وقت نماز پڑھنے کے بھی بیان کئے ہیں، لیکن یہ سب دور کے معنی ہیں۔ عام فہم عربی میں اس لفظ کا مفہوم قربانی کرنا ہی لیا جاتا ہے چنانچہ،

"احکام القرآن" میں علامہ جصاص لکھتے ہیں :-

"جن لوگوں نے اس کے معنی اونٹ ذبح کرنے کے بیان کئے ہیں انہی کی بات صحیح ہے کیوں کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم یہی ہے اور مطلق لفظ نحر سن کر ایک عرب اس مفہوم کے سوا اور کوئی مفہوم نہ سمجھے گا کہ اس نے آج اونٹ ذبح کیا، نہ یہ کہ اسلئے آج بائیں ہاتھ پر سیدھا ہاتھ باندھا" جلد ۳ - صفحہ ۵۸۵)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام مترجمین، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب، ڈپٹی نذیر احمد صاحب وغیرہم نے بالاتفاق اس لفظ کا ترجمہ قربانی ہی کیا ہے

## قربانی کا حکم حدیث میں

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے اس حکم کا منشا کیا سمجھا اور اس پر کیا عمل فرمایا کیا آپ نے صرف حج ہی میں قربانی کی ہے، یا مدینہ طیبہ میں بھی آپ عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرتے رہے؟ اور کیا آپ نے بقرعید پر قربانی کبھی کبھار کی ہے یا بالالتزام کرتے رہے؟ اور کیا آپ نے محض بہ ذات خود اس پر عمل کیا یا مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا؟ اس باب میں جو مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں، میں انھیں بے کم و کاست یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔

(۱) عن البراءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوّل ما نبدء به فی یومنا هذا ان نصلی ثم نرجع فننحر - من فعله فقد اصاب سنتنا ومن ذبح قبل فانما هو لحم قدمه لاهله لیس من النسک فی شیئ -

(۲) وفی روایة من ذبح بعد الصلوٰة تم نسکه واصاب سنة المسلمین (بخاری - کتاب الاضاحی)

براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - سب سے پہلا کام جس سے ہم آج کے روز ابتدا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں - پھر واپس جاکر قربانی کرتے ہیں[1] - جس نے اس پر عمل کیا اس نے ہمارے طریقہ کے مطابق کیا، اور جس نے نماز سے ذبح کر لیا تو اس کا شمار قربانی میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے مہیا کیا -

دوسری روایت میں ہے کہ جس نے نماز کے بعد ذبح کیا - اس کی قربانی پوری ہوئی اور اس نے مسلمانوں کا طریقہ پایا"

ظاہر ہے کہ یہ روایت بقرعید ہی سے متعلق ہے اور اس کا کوئی تعلق حج سے نہیں ہے، کیونکہ حج میں کوئی خاص نماز ایسی نہیں ہے جس سے پہلے قربانی کرنا سنت مسلمین کے خلاف اور بعد قربانی کرنا اس سنت کے مطابق ہو -

(۳) قال یحییٰ بن سعید سمعت ابا امامة بن سهل قال کنا نسمن الاضحیة بالمدینة وکان المسلمون یسمنون (بخاری - کتاب الاضاحی) یحیٰی بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ بن سہل انصاری سے سنا، وہ کہتے تھے کہ ہم لوگ مدینہ میں قربانی کے جانور کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرتے تھے اور عام مسلمانوں کا یہی طریقہ تھا -

(۴) عن انس بن مالکؓ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضحی بکبشین وانا اضحی بکبشین (بخاری - کتاب الاضاحی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص انس بن مالک کہتے ہیں کہ حضور دو مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے اور میں بھی دو ہی مینڈھوں کی قربانی کرتا ہوں"

(۵) عن عائشة قالت الضحیة کنا نملح منه فنقدم به الی النبی صلی اللہ علیه وسلم بالمدینة (بخاری، کتاب الاضاحی)

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ ہم مدینہ میں قربانی کے گوشت کو نمک لگا کر رکھ دیا کرتے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے -

(۶) عن ابی عبید مولیٰ ابن ازهر انه شهد العید یوم الاضحیٰ مع عمر بن الخطاب فصلّی قبل الخطبة ثم خطب الناس

---

[1] صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ فصل لربک وانحر اور ان صلوٰتی ونسکی کی تفسیر ہے نبی صلعم نے ٹھیک ٹھیک قرآن کی ہدایت کے مطابق یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ پہلے نماز پڑھی جائے پھر قربانی کی جائے -

فقال ایھا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد نھاکم عن صیام ھذین العیدین اما احدھما فیوم فطرکم من صیامکم واما الآخر فیوم تاکلون من نسککم (بخاری کتاب الاضاحی)

ابو عبید مولی ابن ازہر کہتے ہیں کہ انہوں نے بقرعید کے روز حضرت عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے پہلے نماز پڑھائی۔ پھر خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ان دونوں عیدوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک عید تو تمہارے لئے افطار کا دن ہے۔ رہی یہ دوسری عید تو اس میں تم اپنی قربانی کا گوشت کھاتے ہو۔"

یہاں یہ بات مان لینی چاہیئے کہ حج میں بقرعید کی نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ خطبہ یقینی طور پر مدینہ طیبہ میں ہوا ہے اور جو حکم انہوں نے بقرعید کی قربانی کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس کا تعلق بھی لازماً مکہ سے باہر دوسرے مقامات سے ہے۔"

(۷) قال ابو الزبیر انہ سمع جابر بن عبد اللہ یقول صلی بنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم النحر بالمدینۃ فتقدم رجال فنحروا وظنوا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد نحر فامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان نحر قبلہ ان یعید بنحر آخر ولا ینحروا حتی ینحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (مسلم باب وقت الاضحیۃ)

ابو الزبیر کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یوم النحر کو مدینہ میں نماز پڑھائی پھر بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ حضور قربانی کر چکے ہیں آگے بڑھ کر اپنے جانور قربان کر لئے۔ اس پر حضورؐ نے حکم دیا کہ جس نے مجھ سے پہلے قربانی کر لی ہو اسے پھر دوسری قربانی کرنی چاہیئے اور آئندہ کوئی شخص اس وقت تک قربانی نہ کرے جب تک کہ میں نہ کر لوں۔

(۸) عن جابرؓ قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ فلما انصرف اتی بکبش فذبحہ فقال بسم اللہ واللہ اکبر اللھم ھذا عنی وعمن لم یضح من امتی (مسند احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی)

جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بقرعید کی نماز پڑھی۔ پھر جب آپ پلٹے تو آپ کی خدمت میں ایک مینڈھا پیش کیا گیا۔ اور آپ نے اسے ذبح کرتے ہوئے فرمایا "اللہ کے نام پر اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ خدایا یہ میری طرف سے اور میری امت کے ان سب لوگوں کی طرف سے ہے جنہوں نے قربانی نہ کی ہو۔"

(۹) عن علی بن الحسین عن ابی رافع ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا ضحی اشتری کبشین سمینین اقرنین املحین فاذا صلی وخطب الناس اتی باحدھما وھو قائم فی مصلاہ فذبحہ بنفسہ بالمدیۃ (مسند احمد) علی بن حسین رضی اللہ عنہ ابو رافع سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقرعید کے موقع پر دو مینڈھے خریدتے تھے خوب موٹے تازے بڑے سینگوں والے اور چت کبرے۔ پھر جب آپ نماز پڑھ چکتے اور خطبہ سے فارغ ہو لیتے تو ان میں سے ایک مینڈھا پیش کیا جاتا اور آپ اپنے مصلے ہی پر کھڑے کھڑے اس کو ذبح فرما دیتے۔

(۱۰) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وجد سعۃ فلم یضح فلا یقربن مصلانا (مسند احمد۔ ابن ماجہ) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص استطاعت رکھتا ہو پھر قربانی نہ کرے، وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

(۱۱) عن ابن عمر قال اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی (ترمذی)

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال مدینہ میں رہے اور ہمیشہ قربانی کرتے رہے۔

یہ گیارہ روایتیں مختلف صحابیوں سے حدیث کی ۶ معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مذکورۂ بالا احکام کا منشا یہ سمجھا تھا۔ کہ قربانی صرف حاجیوں کے لئے مخصوص نہ ہو بلکہ عام

ذی استطاعت مسلمان بھی اپنی اپنی جگہ بقرعید کے موقع پر قربانی کرتے رہیں۔ اس طریقہ پر حضور خود عامل رہے۔ دوسرے مسلمانوں کو حکم دیا۔ اور اسے سنتِ اسلام کے طور پر مسلمانوں میں جاری کیا۔

### فقہاءِ اُمت کی آرار

قرآن اور حدیث کے ان دلائل کی بنا پر فقہاء اُمت نے بقرعید کی قربانی کے متعلق بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ یہ ایک مشروع فعل ہے اور سننِ اسلام میں سے ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس میں کہ یہ واجب ہے یا نہیں۔ مگر اس کا مشروع اور سنت ہونا متفق علیہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں مذاہب فقہاء کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بقرعید کی قربانی شرائع دین میں سے ہے۔ شافعیوں اور جمہور کے نزدیک یہ سنت مؤکدہ ہے۔ بطریق کفایت اور شافعیہ میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ فرض کفایہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ مقیم اور خوش حال آدمی پر واجب ہے۔ امام مالک کی رائے بھی ایک روایت کی رو سے یہی ہے۔ مگر انہوں نے مقیم کی قید نہیں لگائی ہے۔ اوزاعی۔ ربیعہ اور لیث کی بھی یہی رائے ہے۔ حنفیوں میں سے ابو یوسفؒ اور مالکیوں میں سے اشہب نے جمہور کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ قدرت کے باوجود قربانی نہ کرنا مکروہ ہے۔ اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی واجب ہے۔ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ قربانی ایک ایسی سنت ہے، جسے چھوڑ دینے کی اجازت نہیں ہے۔" (جلد ۱۰۔ صفحہ ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک قربانی کے سنت اور مشروع ہونے کا تعلق ہے۔ یہ مسئلہ ابتدا سے امت میں متفق علیہ ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔

### اُمت کا متواتر عمل

سب سے بڑا ثبوت اس کے سنت اور مشروع ہونے کا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر آج تک مسلمانوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل اس پر عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ دو چار یا دس پانچ آدمیوں نے نہیں بلکہ ہر پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے اپنے سے پہلی پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے اس طریقہ کو اخذ کیا ہے اور اپنے سے بعد والی پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں تک اسے پہنچایا ہے۔ اگر تاریخ اسلام کے کسی مرحلے پر کسی نے اس کو ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ تو کس طرح ممکن تھا کہ تمام مسلمان بالاتفاق اس کو قبول کر لیتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا؟ اور کس طرح یہ بات تاریخ میں چھپی رہ سکتی تھی کہ اس طریقہ کو کب کس نے کہاں ایجاد کیا؟ آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے۔ کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑ دی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسولِ خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہماری پچھلی نسلیں ایسی ہی منافق تھیں تو معاملہ قربانی تک کب محدود رہتا ہے۔ پھر تو نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ بلکہ خود رسالتِ محمدیہ اور قرآن تک سب ہی کچھ مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جس تواتر کے ساتھ پچھلی نسلوں سے ہم کو قربانی پہنچی ہے اُسی تواتر کے ساتھ اپنی نسلوں سے یہ سب چیزیں بھی پہنچی ہیں۔ اگر اُن کا متواتر عمل اس معاملہ میں مشکوک ہے۔ تو آخر دوسرا کونسا ایسا معاملہ رہ جاتا ہے جس میں اسے شک سے بالاتر ٹھیرایا جا سکے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ میں بعض لوگ نہ خدا کا خوف رکھتے ہیں نہ خلق کی شرم۔ علم اور سمجھ بوجھ کے بغیر جو شخص جس دینی مسئلے پر چاہتا ہے۔ بے تکلف تیشہ چلا دیتا ہے پھر اسے کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس ضرب سے صرف اسی مسئلہ کی جڑ کٹتی ہے۔ یا ساتھ ہی ساتھ دین کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے۔

### معاشی اعتراض

دراصل اس وقت قربانی کی جو مخالفت کی جا رہی ہے۔ اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ کسی نے علمی طریقہ پر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہو اور اس میں قربانی کا حکم نہ پایا ہو۔ بلکہ اس مخالفت کی حقیقی بنیاد صرف یہ ہے کہ اس مادہ پرستی کے دور میں لوگوں کے دل و دماغ پر معاشی مفاد کی اہمیت بری طرح مسلط ہو گئی ہے۔ اور معاشی قدر کے سوا کسی چیز کی کوئی دوسری قدر ان کی نگاہ میں باقی نہیں رہی

ہے۔ وہ حساب لگا کر دیکھتے ہیں کہ ہر سال کتنے کروڑ مسلمان قربانی کرتے ہیں۔ اور اس پر اوسطاً فی کس کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس حساب سے ان کے سامنے قربانی کے مجموعی خرچ کی ایک بہت بڑی رقم آتی ہے۔ اور وہ چیخ اُٹھتے ہیں کہ اتنا روپیہ محض جانوروں کی قربانی پر ضائع کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اگر یہی روپیہ قومی اداروں یا معاشی منصوبوں میں صرف کیا جاتا۔ تو اس سے بے شمار فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ایک سراسر غلط ذہنیت ہے۔ جو غیر اسلامی اندازِ فکر سے ہمارے اندر پرورش پا رہی ہے اگر اس کو اسی طرح نشو ونما پانے دیا گیا تو کل ٹھیک کہ ہر سال اتنے لاکھ مسلمان اوسطاً اتنا روپیہ سفرِ حجاز پر صرف کر دیتے ہیں جو مجموعی طور پر اتنے کروڑ اسی طریقہ سے ایک شخص حساب لگا کر حج کے معاشی نقصانات کا ایک مہیب تخمینہ پیش کریگا اور کہے گا روپیہ بنتا ہے۔ محض چند مقامات کی زیارت پر اتنی خطیر رقم سالانہ صرف کر دینے کے بجائے کیوں نہ اسے بھی قومی اداروں اور معاشی منصوبوں اور ملکی دفاع پر خرچ کیا جائے۔ یہ محض ایک فرضی قیاس ہی نہیں ہے۔ بلکہ فی الواقع اسی ذہنیت کے زیرِ اثر ترکیہ کی لادینی حکومت نے ۲۵ سال تک حج بند کئے رکھا ہے۔ پھر کوئی دوسرا شخص حساب لگائے گا کہ ہر روز اتنے کروڑ مسلمان پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں اور اس میں اوسطاً فی کس اتنا وقت صرف ہوتا ہے جس کا مجموعہ اتنے لاکھ گھنٹوں تک جا پہنچتا ہے اس وقت کو اگر کسی مفید معاشی کام میں استعمال کیا جاتا تو اس سے اتنی معاشی دولت پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن بُرا ہو ان ملاؤں کا کہ انہوں نے مسلمانوں کو نماز میں لگا کر صدیوں سے انہیں اس قدر خسارے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ بھی کوئی فرضی قیاس نہیں ہے۔ بلکہ فی الواقع سوویٹ روس میں بہت سے ناصحین مشفق نے وہاں کے مسلمانوں کو نماز کے معاشی نقصانات اسی منطق سے سمجھائے ہیں ــــــ پھر یہی منطق روزے کے خلاف بھی بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہے۔ اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان نِری معیشت کی میزان پر تول تول کر اسلام کی ایک ایک چیز کو دیکھتا جائے گا اور ہر اس چیز کو "ملاؤں کی ایجاد" قرار دیکر ساقط کرتا چلا جائے گا جو اس میزان میں اس کو بے وزن نظر آئے گی۔ کیا فی الواقع اب مسلمانوں کے پاس اپنے دین کے احکام کو جانچنے کے لئے صرف یہی ایک معیار رہ گیا ہے؟

# ہمارِی نظر میں!

## اسلام کا تمدنی و سیاسی نظام

"اسلام کا تمدنی اور سیاسی نظام" از :- نکہت شاہ جہاں پوری، کتابت وطباعت دیدہ زیب، خوبصورت جلد گرد پوش کے ساتھ، ضخامت ۴۰۸ صفحے (بڑا سایز) قیمت مجلد پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ :- کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور

یہ کتاب وقت کی ضرورت اور زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مُرتب کی گئی ہے، اس میں بتایا گیا ہو کہ اسلام صرف پُوجا پاٹ کا مذہب اور رکوع و سجود کا دین نہیں ہو۔ بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اُس کا تمدنی اور سیاسی نظام انسانیت کے لئے بہترین نظام ہے اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لئے اسلامی آئین فطرت کے عین مطابق ہو۔

جناب نکہت شاہجہاں پوری نے انتہائی خلوص، کمالِ دردمندی و کاوش کے ساتھ کتاب کو مُرتب فرمایا ہے، کتاب کا ایک ایک ورق بول رہا ہو کہ لکھنے والا اسلام کی صداقت پر نہ صرف یقین ہی رکھتا ہو بلکہ پُوری طرح مطمئن بھی ہے، فاضل مصنف کا مطالعۂ فکر و نظر بھی وسیع ہے اور موجودہ مسائل سے نہ صرف یہ کہ وہ باخبر ہے بلکہ اُسے بصیرت حاصل ہو ——————

"اشتراکیت" پر یہ چند جملے کتنے حقیقت آفریں ہیں :-

> "سیلاب جب آتا ہو تو تباہی کے ساتھ ساتھ بہت سے کھیتوں اور بنجر زمینوں کو نشو ونما بھی بخشتا ہے، مگر بذاتِ خود اُس کے استحسان کا کوئی قایل نہیں ہوسکتا، بالکل یہی حال اشتراکی اُصولوں کا ہو، جو غریب انسانوں کو ایک دورِ مصیبت سے نکال کر، مجبوری و غلامی کی دوسری مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہیں، تمام دنیا کی دولت کو ایک مرکز پر جمع کر کے لوگوں کو مشینوں کی طرح مجبور و معذور بنا کر اُن کی قوتِ آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں..."

کتاب کے ابتدائی حصّہ میں "آورد" کا رنگ غالب ہو لیکن آگے چل کر "آمد" پیدا ہو گئی ہو اور مصنف کی طبیعت کا "قبض" بسط و انشراح میں تبدیل ہو گیا ہو، کتاب کا موضوع "تمدن و سیاست" ہو مگر "وحی کی نوعیت" "ملائکہ جزوِ ایمان کیوں ہیں؟" نمازوں میں یکسوئی کس طرح پیدا کی جائے" .. .. .. .. اس قسم کے مسایل بھی درمیان میں آگئے ہیں جن میں قلبِ مومن کے لئے سکینت و اطمینان کے داعیات موجود ہیں۔

کتاب کا آغاز جناب نکہت شاہجہاں پوری کی خود اپنی ایک نظم "مصحفِ مبارک" سے ہوتا ہے، اس نظم کا ایک شعر ہے :-

مسجد و محراب و ممبر تک ہی کیوں مسدود ہو
جو تجلی اپنی تابانی سے عالمگیر ہے

"منبر" کا املا "ممبر" غلط ہے، اور شعر میں "مسدود" کا نہیں "محدود" کا محل ہے، مصرعہ اس طرح ہونا چاہیئے تھا۔

ے مسجد و محراب و منبر تک ہی کیوں محدود ہو

"مصحفِ مبارک" یعنی قرآنِ کریم سے مخاطبت اس انداز میں کی ہو جیسے کسی انسان کو مخاطب کیا جا رہا ہے ——
—— فقر تیرا تاجدارِ ملک و ملت کیوں نہ ہو —— پھر ذرا جلوہ نما ہو ظلمتِ اوہام پر —— پھر ذرا صبر آزما بن کر بلائے

زلیست ہیں ـــــ پھر ذرا شیرازۂ عالم کو مستحکم بنا ـــــ کو پڑھ کر ذہن محسوس کرتا ہے کہ یہ مسلمان سے خطاب ہے، ان مصرعوں میں "ذرا" بھی کھٹکتا ہے، نکہت صاحب کی یہ نظم شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے۔

(صفحہ ۲۴) "واتقوا اللہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون" کا ترجمہ "عقل والے تو فلاح و نجات کی خاطر خدا سے ڈرتے رہتے ہیں" صحیح نہیں ہے، حیرت ہے کہ "اتقوا" کو "یتقون" کس طرح سمجھ لیا گیا ـــــ اسی طرح صفحہ ۳۴۸ پر "ان انکر الاصوات لصوت الحمیر" کا ترجمہ "سب سے مکروہ آواز "سی پوں سی پوں" ہوتی ہے" کیا گیا ہے، جو شخص عربی زبان نہیں جانتا، اُس کے ذہن کو ترجمہ پڑھ کر تشویش لاحق ہو سکتی ہے، اس لئے کہ جس طرح "دھاڑنا" شیر کی آواز کو کہتے ہیں اس طرح "سی پوں سی پوں" گدھے کی آواز کے لئے عام طور پر نہیں بولا جاتا، ترجمہ میں وہی لفظ استعمال کئے جانے چاہئیں جن کا عام رواج ہو، اور قرآن پاک کے ترجمہ میں تو خاص احتیاط کی ضرورت ہے، جو مصنف اور مولف عربی میں کافی مہارت نہیں رکھتا اُسے چاہیئے کہ شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب کے ترجموں سے استفادہ کرے۔

(صفحہ ۲۳) "جو رقم وہ صرف کر رہا ہے سود و حرام، اوباشی و عیاشی، غارت گری و قتل و غارت، چوری و سینہ زوری سے تو حاصل نہیں کی گئی ہے" ـــــ "عیاشی" کا یہاں استعمال بالکل غلط ہوا ہے، "عیاشی" سے تو دولت ضائع ہوتی ہے حاصل نہیں ہوا کرتی، "غارت گری" جب پہلے کہا جا چکا تو پھر "قتل" کے ساتھ "غارت" کہنا زاید ہے، چوری اور سینہ زوری میں "واو عطف" کا لانا درست نہیں، اور یہ غلطی مصنف نے جگہ جگہ کی ہے "اچھائی و برائی" "چاند و سورج" "مچھلی و گوشت" بلا تکلف لکھا ہے ـــــ (صفحہ ۴۲) "رات کو عیاشی و اوباشی اور لنچ و ڈنر پر موج مناتا ہے" "موج منانا" غلط ہے، "موج کرنا" بولا جاتا ہے ـــــ (صفحہ ۶۶) "سائنس دانوں کے نظریے اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں" ـــــ "ادلتے بدلتے رہتے ہیں" زیادہ موزوں ہے ـــــ (صفحہ ۱۴۲) "انسانی سائیکلوجی یا علم النفسیات" ـــــ "یا تو "نفسیات" لکھتے یا "علم النفس" ـــــ (صفحہ ۲۵۳) "اور من چلی روح سے ہر شعبۂ عمل کو ہر دور میں احترام بخشا" ـــــ "من چلی روح سے احترام بخشنا" عجیب کا اِک قسم کا طرزِ نگارش ہے! ـــــ (صفحہ ۲۹۸) "وہ شراب و کباب اور ناجائز منہیات کو چھو نہیں سکتا" خوب! گویا کہ "منہیات" جائز بھی ہوتے ہیں" یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے "فلاں شخص "ناجائز گناہوں" سے پرہیز کرتا ہے" ـــــ (صفحہ ۳۰۱) "بلکہ روحانی اور ابدی عروج کا تاجدار بنا سکیں" "عروج کا تاجدار بنانا" کیا بات ہوئی! یہاں "حامل" یا "سزاوار" کا محل تھا ـــــ (صفحہ ۳۱۷) "خوف سے نڈر ہو کر جان و مال کو قربان کرنا" "خوف سے نڈر ہو کر" پہلی بار سننے میں آیا ـــــ (صفحہ ۳۱۷) "اسلام کی یہ سنگین تعلیم" "محکم تعلیم" کہنا چاہیئے تھا (صفحہ ۳۲۰) "خمار فقر کے مصائب کو دو آتشہ بنا سکتے ہیں" پورا جملہ ہی بے ڈھنگا ہے۔

دوسرے ایڈیشن میں فاضل مصنف کتاب پر نظر ثانی فرما کر زبان و بیان کی غلطیوں کو درست کر دیں تو کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو جائے گا، اور وجدان کو کتاب پڑھتے میں جو ٹھوکریں سی لگتی ہیں، وہ بات جاتی رہے گی!

جناب نکہت شاہجہان پوری پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُن کا زاویہ نگاہ اور سوچنے کا انداز اسلامی ہے، ڈاکٹر برق اور مسٹر پرویز کی طرح وہ اسلام کو "ایجاد بندہ" کی خراد پر چڑھا کر، دین کو مسخ کرنا نہیں چاہتے، زیر تنقید کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کا مطالعہ پڑھنے والوں کو فائدہ پہونچائے گا۔

## جہنم کے دروازوں پر

"جہنم کے دروازوں پر" از :- اسعد گیلانی ضخامت ۲۳۶ صفحے، مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے، ملنے کا پتہ :- مکتبہ افکار نو، یعقوب خاں روڈ، کراچی۔

جناب اسعد گیلانی کی ادبی شہرت بوئے گل کی طرح پھیلتی جا رہی ہے، افسانہ اور ناول کی دنیا میں اُنھوں نے نئی راہ نکالی ہے،

انکا اپنا انداز ہے، ان کی طرزِ نگارش میں امتیازی شان پائی جاتی ہے، اور سب سے زیادہ تعریف کی بات یہ ہے کہ اسعد صاحب کی تمام ادبی کاوشیں اسلامی تصورات کے اردگرد گھومتی ہیں، "افسانہ اور ناول" کو جواب تک جاہل اور نامسلمان تھا، "مسلمان" بنانے کا بیڑا اسعد صاحب نے اُٹھایا ہے۔

زیرِ تنقید ناول میں اخلاق و صداقت کی روح کارفرما ہے، یہ ایک اصلاحی ناول ہے، مصنف نے کھلی ہوئی تبلیغ اور مولویانہ پند و نصائح کے مقابلہ میں رمز و اشاریت کو ترجیح دی ہے، افسانہ اور ناول کی خوبی اسی میں ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ مصنف کسی خاص نظریہ کی تبلیغ کر رہا ہے، بلکہ مضمون میں خود اتنی جاذبیت، دلکشی اور تاثیر ہونی چاہیئے کہ مطالعہ کرنے والے کی روح صاحبِ تصنیف کے بنیادی تصور اور مرکزی خیال سے ہم آہنگ ہو جائے۔

اسعد صاحب کے قلم میں، زور ہے، روانی ہے اور طوفان کا سا خروش ہے، ان چیزوں نے اُن کے ناول میں انقلابی شان پیدا کر دی ہے ——— چند نمونے :—

(صفحہ ۴۶) "تم ریت کے تودے کو خوبصورت مجسمے کی صورت میں تراشنا چاہتے ہو، اور شبنم کے موتیوں کا ہار پرونے کی کوشش کرتے ہو، تم جگنو سے اُجالا نا چاہتے ہو۔ .. .. .. تم ناممکنات کے ساتھ یوں کھیلتے ہو جیسے بچے کوڑیوں کے ساتھ۔ .. .." ——— (صفحہ ۹۰) "جو نظام کمزوروں کو آہنی پنجے دے وہ ان سے دعاؤں کی توقع کیسے رکھ سکتا ہے ——— (۱۰۳) "حادثات اور تلخ واقعات کے پہاڑ جب بیچ میں آجاتے ہیں تو ندیوں کے رُخ بدل جاتے ہیں ——— (۱۲۳) "آج ظلم و جباری کے اس مکروہ دور میں مظلوم انسانیت کی اصل کمی روٹی، روپیہ یا سونا نہیں ہے بلکہ اخلاق کا وہ جوہر ہے جو انسانوں کے گروہ کو حیوانی درجے سے نکال کر انسانی درجہ پر لاتا ہے ——" (صفحہ ۱۸۲) "زخموں کا علاج ڈھانپ دینے سے اور بھوک کا علاج بھول جانے سے کرنا چاہتے ہو تمہارے نسخے کتنے سستے ہیں" ——— (صفحہ ۲۱۱) "دام کے حلقوں کی سختی اُن میں پھنس کر معلوم ہوتی ہے، دور سے بکھرے ہوئے تو دانے ہی نظر آتے ہیں" (صفحہ ۲۳۸) "اب تک ہمارے ہاں سب سے زیادہ اشاعت اسی ادب کی ہے جو چھپ کر پڑھا جاتا ہے"

دوسرا رُخ ——— (صفحہ ۱۶) "پیپل کے بے بس خشک پتے کی قوتِ ارادی اسے کب تک فنا کی بلندی سے بچا سکتی ہے ——— "بلندی" یہاں بالکل غلط استعمال ہوا ہے، "فنا کی دست برد" یا اسی انداز کے کسی دوسرے لفظ کا یہاں محل تھا —— (صفحہ ۳۸) "ایک وسیع ہوس کے ساتھ پاسنگ شو کے سگریٹ خریدے گئے" یہاں "وسیع" وجدان کو اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے (صفحہ ۴۲) "بمبئی کی فضا پنجاب کی سردی سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی" "بے نیاز" نے پُورے جملے کو اَن مل بے جوڑ بنا دیا ——— (صفحہ ۴۶) "ایک لا انتہا کھولاؤ، ایک اتھاہ پژمردگی" یہاں "کھولاؤ" کے ساتھ "لا انتہا" کا جوڑ اچھا نہیں لگتا ——— (۶۰) "اور اس لفظ کے ساتھ ہی ایک طویل خاردار راہ ہمارے قدموں کی منتظر نظر آتی تھی اور اس میں خوفناک ممکنات سر نکالتی تھیں" خوفناک ممکنات سر نکالتی تھیں" یہ عجیب طرزِ بیان ہے، یہ عبارت ایک تکلیف دہ قسم کا گورکھ دھندا ہے۔ ——— (صفحہ ۶۱) "آسمان پر بادلوں کا گہرا غلاف ایک خوفناک تاریکی کو زمین کی طرف انڈیل رہا تھا۔ .." "تاریکی کو انڈیلنا" آج تک نہ آنکھوں نے پڑھا نہ کانوں نے سُنا، ایسی باتیں تو نام نہاد "ترقی پسندوں" ہی کو زیب دیتی ہیں ——— (صفحہ ۶۳) "میری مکروہ بغاوت پر اطاعت کا پھاہا رکھنا شروع کر دیا"۔ .. .. .. تو بہ! آخر یہ بات کیا ہوئی؟ ——— (صفحہ ۷۳) "ایک دکان سے جا کر کھانا نکلا" "سے" یہاں غلط ہے "پر" لکھنا چاہیئے تھا (صفحہ ۷۷) "تانگوں میں پھڑ پھڑاتی ہوئی ساریاں" "پھڑ پھڑانا" تو جاندار کی صفت ہے "ساریوں کا پھڑ پھڑانا" کیفیت اور مشاہدہ کی عجیب سی ترجمانی ہے "پھڑ پھڑانا" میں گھٹن اور کرب و انقباض کی کیفیت پنہاں ہے، اور جس مقام پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں نشاط و تفریح کا منظر پیش کیا گیا

ہے، زبان وبیان کے علاوہ اظہار واقعہ کے اعتبار سے بھی اس لفظ کا یہاں اس طرح استعمال صحیح نہیں، اسعد گیلانی صاحب کو یہ انداز یک قلم ترک کر دینا چاہیئے۔

(صفحہ ۸۵) "خوابوں کو توڑ پھوڑ کر پریشان نہ کردیں" "خوابوں کو پریشان نہ کردیں" ہی کافی تھا، "خوابوں کا توڑنا پھوڑنا" حشو قبیح ہے، ـــــ (صفحہ ۹۲) "اور جس کے سمل خانوں کے طالب علم۔۔ ۔۔" "سمل" "ظرفِ مکان" ہے، اُس کے ساتھ "خانہ" بالکل غلط ہے! ـــــ (صفحہ ۱۰۰) "مونچھوں کو خیالی بل دیتے ہوئے کہا" آخر یہاں "خیالی بل" سے کیا مراد ہے، کیا لیڈر کے مونچھیں نہیں ہیں، اور اس نے خیال ہی خیال میں بل دیا ہے، اور اگر اُس کے مونچھیں ہیں تو "خیالی بل" دینا بے جوڑ بات ہے ـــــ (صفحہ ۱۰۱) بیوقوت کی دُم" ـــــ "اُلّو کی دم" بولتے ہیں

(صفحہ ۱۲۹) "غلامی کی دو فیتیں لگی ہوئی ہیں" "فیتہ" بالاتفاق مذکر ہے، "غلامی کے دو فیتے لگے ہوئے ہیں" لکھنا چاہیئے تھا ـــــ (صفحہ ۱۴۷) "ان کی جیب کچھ مجھ سے الگ نہ تھی کہ بھری ہوتی ـــــ ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (صفحہ ۱۴۸) "اپنے آپ کو بھی سوٹ کیس کی سی بیکسی سے ڈبے میں ڈال دیا" یہ اندازِ نگارش ایک "اعجوبہ" سے کم نہیں ـــــ (صفحہ ۱۶۸) "چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھا" "کیچڑ" تو مذکر ہے ـــــ (صفحہ ۱۶۸) "ننھے ننھے گاؤں ریل کی لائن سے دُور دُور ملبے کے انبار نظر آتے تھے" "چھوٹے چھوٹے گاؤں" لکھنا تھا ـــــ (صفحہ ۲۴۹) "پیچھے کی ڈنڈی اور رنگ کی گولائی نے کمر میں چبھ کر میری فوجی بہادری کی آزمائش کے لئے اپنی تکلیف دہ اہمیت جتائی" ـــــ جملہ میں غیر معمولی تکلف پیدا ہو گیا جو نگارش کی کمزوری ہے (۲۳۹) "میرا رواں رواں ۔ ۔ ۔ ۔ اس شدت محسوس کر کے جسم کے روئیں کا کُھلے جانا" واقعیت کی تکلف آمیز ترجمانی ہے، اس کیفیت کا اظہار مناسب اور ہم آہنگ لفظوں میں ہونا چاہیئے تھا (۲۱۸) "میں نے معاملہ کو سمیٹ کر ایک ڈھب پر لاتے ہوئے کہا" ـــــ یہ بھی کاداک قسم کا اندازِ نگارش ہے ـــــ (صفحہ ۲۶۰) "ایک پاگلانہ نعرہ لگاتا ہوا ز سنگ سپاہی ایک ایک مریض کی چارپائی کو ہلا رہا تھا" "پاگلانہ نعرہ" کس قدر "وجدان خراش" ترکیب ہے! کہا جاسکتا ہے کہ "سپاہیانہ" بولتے ہیں تو "پاگلانہ" میں کیا ہرج ہے، ہرج یہ ہے کہ سپاہیانہ بولا جاتا ہے اور "پاگلانہ" بولا نہیں جاتا یہ ترکیب نامانوس اور غریب ہے ـــــ (صفحہ ۲۶۵) "گھٹا کی سی گھنگور ریت" "یہ گھنگور ریت" جیسے کسی نے وجدان میں نشتر چبھو دیا ـــــ توبہ! (صفحہ ۲۷۴) "ہر ممکن کوشش کر کے مجھے ہوائی اسکول سے اپنی ٹریننگ معطل کروانی تھی" ـــــ "معطل کروانا" یہاں اس بُری طرح استعمال ہوا ہے کہ مصنف کا ادبی ذوق مشتبہ سا ہو جاتا ہے ـــــ (صفحہ ۳۰۳) "ہم نے ایک ساتھ خوابناک کشتیاں ملائم اور گداز پانیوں میں چلائی تھیں" پانی صاف گدلا، میٹھا اور کھاری تو ہوتا ہے مگر گداز اور ملائم اُس کی صفت پہلی بار سننے میں آئی، شاید مصنف کو سخت اور کھردرے پانی سے بھی کہیں سابقہ پڑا ہو ـــــ (صفحہ ۳۰۴) ایک لہر گمشدگی بڑھی" "موجِ گمشدگی" لکھنا چاہیئے تھا، گمشدگی (فارسی لفظ) کے ساتھ "لہر" (اردو لفظ) کی اضافت درست نہیں ـــــ (۳۰۷) "میری روح اُمیدوں اور طفل تسلیوں کے ایک شکستہ ڈھانچے کی صورت میں ڈھیر ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔" "رُوح کا ڈھیر ہونا" نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ کیفیت کی صحیح ترجمانی ہے ـــــ (صفحہ ۳۰۸)

"جو سب کے سامنے اپنی مادرزاد عُریانی میں کھلکھلا کر ہنستے ہیں" حرفِ جار "میں" نے پورے جملہ کو مہمل بنا دیا۔

جناب اسعد گیلانی کی دوسری تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں، اُن میں عام طور پر زبان وانشا کی یہ خامیاں نہیں پائی جاتیں، یہ ناول بہت دن پہلے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے چھپنے کی اب نوبت آئی ہے، اگر ہمارا خیال صحیح ہے اور خدا کرے صحیح ہو تو اسعد صاحب کو ہم مشورہ دیں گے کہ جس انداز پر اُنھوں نے یہ ناول لکھا ہے، اُس انداز کو جس طرح ہو سکے چھوڑ دیں۔

"جہنم کے دروازوں پر" ـــــ میں "مکررات" بہت ہیں، دواخانوں فوجی بارکوں اور دوسرے مقامات کی تفصیلات کو

قریب قریب ایک ہی انداز میں بار بار پیش کیا گیا ہے، غریبی، افلاس، بھوک اور ماحول کی آشفتہ حالیوں کا ذکر انہوں نے اُسی طرح کیا ہے، جس طرح یہ "ترقی زدہ" کیا کرتے ہیں۔

"ناول" یقیناً دلچسپ ہے اور بعض حصے کافی اثر انگیز ہیں، مگر جس مقصد کیلئے ناول لکھا گیا ہے وہ اُس شان کے ساتھ پورا نہیں ہوتا جس شان اور اہتمام کے ساتھ پورا ہونا چاہیئے تھا، جس منظر کی مصنف تصویر کھینچنا اور جس کیفیت کو بیان کرنا چاہتا ہے اسے وہ اس قدر گھما پھرا کر پیش کرتا ہے کہ خود منظر کشی اور کیفیت و واقعہ کی ترجمانی "چیستاں" سی بن جاتی ہے، عبارت میں فلسفہ کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس نے تحریر میں تکلف اور بناوٹ پیدا کر دی ہے ——— مثال کے طور پر ایک منظر ملاحظہ ہو۔

"میرا لاوارث سامان بکھرا پڑا تھا، میرا بھائی مجھے چھوڑ کر بہت دور فاصلوں میں گم ہو رہا تھا، اور میرے ارادے کچلے دبے ہوئے، پچکے ہوئے ارادے حالات کے اس عجیب سے تغیر کی تاب نہ لاتے ہوئے میرے ساتھ پوری کشمکش کی حالت میں چارپائی کے پر مایوسی کے جبڑوں میں پھنسے سسک رہے تھے۔ ۔ ۔"

پیچیدگی، اُلجھاؤ اور دہ جسے دور کی کوڑی لانا کہتے ہیں، نگارش کی خصوصیت نہیں ہے، سادگی، شوخی اور پُرکاری سے تحریر میں جان پڑتی ہے، جناب نعیم صدیقی کے افسانے اس منزل میں "دلیلِ راہ" بن سکتے ہیں ——— "ترقی پسند" اپنی نظم و نثر کے اُلجھاؤ، اہمال اور بے معنیٰ "اشاریت" کے سبب ناکام ہو چکے ہیں اُن کی تقلید اس تصور کے ساتھ کرنا کہ لاؤ انھی کے ہتھیاروں سے اُن کی کاٹ کریں خطرناک قسم کا اقدام ہے، جس میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے، اور پھر ان "ترقی پسندوں" کے "ہتھیاروں" کا یہ عالم ہے کہ اُسترے سے کھیتوں میں گھانس کھرچنے کا کام لیتے ہیں، تلوار سے قلم بنانا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ چاقو کے پھل میں کسی طرح کُدال کا لوہا فٹ ہو جائے۔

جناب اسعد گیلانی کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی فکر عطا فرمائی ہے، اُن کا قلم کئی سال سے "باطل" کے خلاف "جہاد" کر رہا ہے، وہ "اسلامی ادب" کے معماروں میں سے ہیں، اُن کا ادبی مستقبل بہت زیادہ شاندار اور تابناک ہے، ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہماری مخلصانہ گزارش کو سمعِ قبول میسر آئے گا، مردِ مومن کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ سچی بات کے ماننے میں تامل نہیں کرتا۔

# فاران

ماہر القادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقشِ اوّل

یہ کوئی داستان سراؤں کی بنائی ہوئی داستانیں اور قصہ خوانوں کے تراشے ہوئے افسانے نہیں ہیں —— بلکہ گزری ہوئی باتیں اور وجود میں آئے ہوئے واقعات ہیں کہ مٹھی بھر مسلمان بڑی بڑی فوجوں اور مسلح لشکروں سے نبرد آزما ہوئے ہیں اور میدان انھی کے ہاتھ رہا ہے، دنیا محسوس کر رہی تھی کہ مسلمان "غلبہ" اور "فتح و نصرت" ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، جو طاقت خدا کے ان بندوں سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی، جس قوت نے ان کا مقابلہ کیا اُسے نیچا دیکھنا پڑا ساری دنیا میں بس وہ ہی وہ نظر آتے تھے۔

تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے "ہیرو" یہی مسلمان ہیں، جن کو کبھی شکست بھی ہوئی ہے تو مایوس نہیں ہوئے، ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ گئے، فاتح کے سامنے جھکے نہیں، اپنے اُصولوں سے بال برابر نہیں ہٹے، کوئی غمناک حادثہ اور غیر متوقع واقعہ ان کی ہمتوں کو پست نہ کر سکا، وہ دب دب کر اُبھرے، زخم کھا کھا کر جئے اور دنیا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ جو نقشِ پا کی طرح روندے اور مٹائے جا رہے تھے، وہ آفتاب کی مانند طلوع ہوئے۔

اِن مقدس انسانوں کی تاریخ جراُت، حوصلہ مندی اور حق گوئی و بے باکی کے واقعات سے لبریز ہے، اُن کے تیور ناکامی اور پریشانیوں کے ہجوم میں بھی ملول نہیں ہوئے، دشمنوں کی انتہائی سفاکیاں بھی ان کے عزائم کو متزلزل نہ کر سکیں، اُن کے سر کٹ کٹ گئے ہیں مگر غیر اللہ کے سامنے جھکے نہیں ہیں، انھوں نے اپنے نوخیز بیٹوں، جوان بھائیوں اور عزیزوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے ذبح ہوتا ہوا دیکھنا گوارا کیا ہے لیکن باطل سے سمجھوتا نہیں کیا۔

یہ لوگ سچ مچ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے تھے، خطروں میں کود پڑنا اُن کے لئے ایک کھیل تھا، اور اللہ کے راستہ میں مرجانے کو وہ زندگی سمجھتے تھے، باطل سے دبنے اور جھکنے کے لئے وہ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، کامیابیاں اور سر بلندیاں اُن کی رکابیں تھام کر چلتی تھیں، اقبال مندی اُن کے قدم چومتی تھی اور فتح و نصرت، اُن کے ساتھ ساتھ رہتی تھی، آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا وہ جانتے ہی نہ تھے، غلبہ پانا اور چھا جانا اُن کے لئے مقدر ہو چکا تھا، وہ سچ مچ "تقدیر یزداں" بن گئے تھے۔

ان مقدس نفوس پر اللہ کی رحمتیں ہوں ـــــــ اُن کا عالم یہ تھا کہ لڑائی کے وقت اُن کے کمسن بچے پنجوں کے بل کھڑے ہو ہو کر جوانوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کرتے کہ ان کی کمسنی اور قد کی چھوٹائی کہیں اُن کو حق و باطل کی جنگ میں شریک ہونے سے روک نہ دے، پہلے دن کا دولہا، جہاد کے لئے منادی کی ندا سنتا اور نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر تلوار کی جھنکار پر "لبیک" کہتا، گھمسان کا رن پڑتا ہوتا اور ایک سرفروش مجاھد تلوار لیکر تن تنہا دشمنوں کی صف میں گھس جاتا، لڑائی ہو چکنے کے بعد شہیدوں کی لاشیں شمار ہوئیں تو اُن میں ایسے سرفروش اور جانباز بھی نکلے جن کے سارے زخم شانوں، بازوؤں اور سینوں پر تھے!

ان میں ایسے مجاہد بھی تھے، جو اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے کہ ہمیں کسی طرح دشمنوں کے قلعہ کی فصیل پر چڑھا دو یا قلعہ کے اندر پھینک دو اور جب اُن کی یہ تمنا پوری ہوگئی ہے تو پھر ناقابل تسخیر قلعے سر ہو کر رہے اور جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا ایسے بہادر قلعہ گیر اور اس قدر جری کشور کشا، چشم فلک کو پھر دوبارہ دیکھنے نصیب نہیں ہوئے ـــــــ انھوں نے غیر ملکوں کے ساحلوں پر پہونچکر اپنی کشتیاں جلا جلا دی ہیں تاکہ واپس ہونے کا تصور بھی ذہن میں نہ آنے پائے۔

ان کی فتحمندیوں کا طوفان کسی کے روکے نہ رکتا تھا، جس طرف اس کا رُخ ہوا جل تھل ایک ہوگئے، جس نے مزاحمت کی اُسے ذلیل ناکام اور سرنگوں ہونا پڑا، بڑی بڑی شہنشاہیوں اور باجبروت حکومتوں کے پرخچے اُڑ گئے، دنیا میں وہ اور صرف وہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سر بلند تھے، عزتیں اُن کے لئے مقدر کر دی گئی تھیں اور کامرانیاں اُن کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے پھرتی تھیں۔

اُن برگزیدہ ہستیوں اور نیک انسانوں کی عزت و کامرانی اور فتح و نصرت کا سبب، اُن کی کثرت تعداد، سامان کی بہتات اور اسلحہ کی فراوانی ہرگز ہرگز نہیں ہے، وہ تو باطل پرستوں کے مقابلہ میں تعداد میں بہت ہی کم تھے، کبھی کبھی تو ایک اور سو کی نسبت رہی ہے اور ایک نے دس کا مقابلہ تو بارہا کیا ہے، اُن غریبوں، صحرانشینوں اور اونٹ چرانے والوں کے پاس سامان کہاں سے آتا، ٹوٹی ہوئی تلواریں، پھٹی ہوئی زرہیں، خم کھائے ہوئے نیزے اُن کی کائنات تھی! ان کے تیروں کو دیکھ کر ایرانی فوج کے حاکم نے کوئی جھوٹ تھوڑی کہا تھا:-

"یہ تو تکلے ہیں تکلے... " ـــــــ کرتے رسیاں بندھی ہوئیں، پیوند لگے ہوئے کرتے، کسی کسی کی عبا میں چمڑے کا ٹکڑا جڑا ہوا، سرکہ، زیتون کا تیل، ستو، جو کی روٹی اور کچا پکا گوشت اِن کی غذا ـــــــ مگر اس بے سروسامانی کے باوجود جرأت و ہمت کا یہ عالم کہ شہنشاہوں سے ٹکر لی ہے، بادیہ نشینوں نے! اور تاریخ گواہ ہے بدر، یرموک، قادسیہ اور اجنادین کے میدان شاھد ہیں کہ بڑے سا بڑا اجرار لشکر بھی اُن کے آگے نہیں ٹھہر سکا، لڑائی کے میدانوں میں فتح اُنھیں ڈھونڈتی پھرتی تھی، دشت و صحرا ہی نہیں، دریاؤں کی پیشانیوں پر بھی اُن کے گھوڑوں کے نقش قدم ابھی تک ثبت ہیں۔

اُن صالح انسانوں کا کام صرف لڑنا اور جنگ کرنا ہی نہ تھا، اور اُن کی غرض ملکوں کی تسخیر اور مالِ غنیمت کا حصول ہی نہ تھی، جس طرح وہ بہترین شہسوار، بہادر سپاہی اور بے باک فاتح تھے، اسی طرح وہ شریف ترین فرمانروا بھی تھے، اُن کی جنگیں فساد کے نہیں اصلاح کے لئے ہوتی تھیں، وہ انسانیت کے سب سے بڑے دوست اور غم خوار تھے اس لئے کہ باطل کے وہ سب سے بڑے دشمن تھے، ملکوں کو اُنہوں نے فتح ہی اس لئے کیا تھا کہ وہاں امن و سلامتی کو پھیلائیں اور مظلوم دنیا اور ستائی ہوئی مخلوق کو سکون و آشتی کا پیام دیں ——— اور یہ اُنہوں نے کر کے دکھا دیا ملکوں اور قوموں کو فتح کرنے اور ان پر غلبہ پانے کے بعد نشۂ کامیابی نے اُنھیں بدمست نہیں بنایا، ان کی تلوار جس طرح ظالموں، غارت گروں اور قاتلوں کے لئے ہلاکت و تباہی کا پیام تھی، اس سے بڑھکر مظلوموں اور زیردستوں کی محافظ تھی۔

تاریخ کا ایک ایک صفحہ گواہ ہے کہ خدا کے اِن نیک بندوں نے زمین کو عدل و انصاف سے معمور کر دیا، اُن کی ذات نیکیوں کا سرچشمہ اور امن و سلامتی کا مرکز تھی، اُن کے انصاف نے نوشیروانِ عادل کی داستانوں کو پھیکا کر دیا، اُن کا انصاف سب کے لئے ایک جیسا تھا، اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز نہ تھی۔

اور یہ سچے لوگ صرف نیک اور پاکباز ہی نہ تھے، اُن میں جہانبانی، فرمانروائی اور حکومت کا نظم و نسق چلانے کی بہترین قابلیت پائی جاتی تھی، اُن کی سیاست شریفانہ سیاست تھی، مکر و دغا سے پاک اور چالبازیوں سے دور! سیدھی اور سچی سیاست جس میں فراست اور دور اندیشی کے ساتھ نیکی اور خوش معاملگی بھی پائی جاتی تھی، قول کے سچے، معاہدے کے پابند اور وعدے کے پکے! جس سے جو بات کہہ دیتے وہ پتھر کی لکیر بن جاتی، ایر پھیر اور گول مول باتیں وہ جانتے ہی نہ تھے، جو کہتے صفائی کے ساتھ کہتے، دو ٹوک باتیں! ان پر ہر کوئی اعتماد کر سکتا تھا، ان کی سیاست اُن کے دین کی طرح مقدس اور بے میل تھی ——— تمدن و تہذیب کی اُلجھی ہوئی زُلفوں کو اُن کے شانۂ ذہن و فکر نے سنوارا علم و دانش کے چشمے انھیں کی ٹھوکروں سے اُبلے۔

کشورکشا، قلعہ گیر، فاتح، فرماں روا، معلّمِ اخلاق، مبلّغِ حق و صداقت اور انسانیت کے غمخوار، اُن کا وجود اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی بولتی ہوئی نشانی تھا، اور اُن کی ذات فراست و شجاعت کا سنگم تھی۔

**اور...... ہم ؟**

ایک وہ مسلمان تھے اور ایک ہم مسلمان ہیں...... جی ہاں! "مسلمان" جن کے ناموں میں "اللہ" "محمد" "احمد" "دین" "حسن" "حسین" اور "علیؓ" شامل ہے، جو کلمہ بھی پڑھتے ہیں اور درود کی بھی کثرت رکھتے ہیں، جن کے گھروں کی الماریوں، طاقوں اور محرابوں میں قرآن پاک کے مطلا اور مذہب نسخے بھی رکھے ہوئے نظر آتے ہیں ——— مگر حالت یہ ہے کہ ذلتیں، نکبتیں اور پریشاں سامانیاں ہماری تقدیر بن کر رہ گئی ہیں، کوئی قوم آبادی کی اس قدر کثرت کے باوجود اتنی ذلیل تو کا ہیکو ہوتی ہوگی، گراوٹ کی انتہا ہوگئی، اور نامرادیاں شاید اپنی آخری حد کو پہونچ گئیں، دنیا کا وہ کونسا خطہ ہے جہاں مسلمان ٹھکرائے نہیں جا رہے ہیں، یہ ہماری شامتِ اعمال ہی کا سبب تھا کہ چالیس کروڑ مسلمانوں کے علی الرغم چند لاکھ یہودیوں نے فلسطین میں اسرائیلی حکومت قایم کرلی، اور ہمارے قبلۂ اول کو ہر آن خطرہ لاحق ہے۔

ہم بھی خدا کی وحدانیت اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین رکھتے ہیں، ہم بھی قرآن ہی کو آخری دستور، ابدی قانون اور اللہ کی کتاب مانتے ہیں، ہم آخرت کے بھی قایل ہیں، اور اُن اصولوں پر ہمارا بھی ایمان ہے، جن اصولوں پر ان برگزیدہ مسلمانوں کا ایمان تھا ——— پھر آخر وہ بات کیا ہے جس نے اُن کو

سربلند بنایا اور ہمیں پست کر دیا، وہ فلک نشین تھے اور ہم خاک بسر ہیں، دنیا کی عزتیں ان کی ٹھوکروں سے لگی رہتی تھیں اور ہمیں ذلتوں نے گھیر رکھا ہے ——— یہ سوچنے اور غور کرنے کی چیز ہے!

ایک ہوتا ہے کسی چیز کا زبانی طور پر اقرار اور نظری طور پر مان لینا اور ایک ہے عمل کی زبان سے اُس کا اقرار! ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، مثلاً دو مریض ہیں، طبیب اُن دونوں کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، ان میں سے ایک مریض طبیب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے کہ تم حاذقِ دوراں ہو، ارسطوئے زماں اور بقراطِ وقت ہو، تمہارے نسخہ کے اجزاء کا کیا کہنا! وہ تو اکسیر ہیں اکسیر، آبِ حیات، تریاق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر! یہ مریض طبیب کی، نسخہ کی، دواؤں کی اور تشخیص کی بس تعریفیں کئے جاتا ہے لیکن نسخہ استعمال نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ طبیب کی شان میں یہ قصیدہ خوانیاں "دوا" کا بدل تو نہیں ہو سکتیں اور نہ ان منقبت آرائیوں اور مدح خوانیوں سے مرض کا ازالہ ممکن ہے، اور اگر نسخہ کو کام میں بھی لایا گیا تو اس طرح کہ طبیب نے نسخہ میں لکھی تو ہے "کوزے کی مصری" اور مریض استعمال کرنے لگے "سیکرین"! یا دواؤں کی مقدار میں ردوبدل کر دے اور بعض دواؤں کو سرے سے استعمال ہی نہ کرے بلکہ یہ سوچے کہ ان مفرد دواؤں کی جگہ وہ دوا کیوں نہ استعمال کروں جو ان تمام دواؤں کا "جوہر"، "ست" اور "روح" ہے!

اس کے برخلاف دوسرا مریض نسخہ ملتے ہی دواؤں کا استعمال شروع کر دیتا ہے، طبیب نے جن چیزوں کے کھانے سے منع کیا ہے، اُن سے پرہیز کرتا ہے، جن چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہو بلکہ بعض کے لئے تاکید کی ہو، ان کو استعمال میں لاتا ہے، طبیب کی تشخیص اور حذاقتِ فن پر اُسے چونکہ کامل اعتماد ہے اس لئے نسخہ میں لکھی ہوئی دواؤں اور ان کے استعمال کی ترکیب میں اپنی عقل کے زور سے تیر تکے نہیں لڑاتا ——— ظاہر ہے اور معمولی عقل والا آدمی بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ صحت اسی دوسرے مریض کو ہوگی تندرستی سے یہی بیمار متمتع ہوگا اور زندگی کی مسرتیں اور توانائیاں اسی کے حصے میں آئیں گی، پہلا مریض یا تو مر جائے گا، اور مرا نہیں تو اُس کا جینا مردوں سے بدتر ہوگا۔

جن نیک، خدا شناس اور اقبال مند مسلمانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن کی یہی حالت تھی کہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کو وہ کسی ردوکد، جرح وقدح اور چون وچرا کے بغیر مان کر، اس پر عمل شروع کر دیتے تھے، مثلاً شراب کی ممانعت آئی اور مدینہ کی گلیوں میں شراب بہا دی گئی، خدا کے اِن فرض شناس بندوں نے ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے زمین پر دے مارے ——— "سود" حرام قرار دیا گیا تو انہوں نے ہزاروں روپیہ کا سود چھوڑ دیا اور سودی کاروبار ترک کر دیا ——— عورتوں کے لئے پردہ کرنے کا حکم نازل ہوا تو کھلے ہوئے چہروں پر "جلباب" آ گئے!

وہ مقدس نفوس غیر معمولی ذہین اور اعلیٰ درجہ کے صاحبِ فہم تھے مگر انہوں نے اپنی عقل وفکر کو اللہ اور رسولؐ کے احکام کے تابع کر دیا تھا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ عقل غلطی کر سکتی ہے ذہانت سے بھول چوک ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی رہتی ہے مگر اللہ اور رسولؐ کے احکام میں بال برابر بھی اونچ نیچ نہیں پائی جاتی ——— وہ یہ نہ کرتے تھے کہ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ میں تو اللہ کے احکام پر عمل کریں مگر تجارت کے لئے اہلِ شام کے قانون کو دلیلِ راہ بنائیں، سیاست میں مصر و یونان کی تقلید کریں اور معاشی مسائل میں ایران کو اپنا رہنما تسلیم کر لیں ——— انھوں نے "اسلام" کو ایک مکمل ضابطۂ حیات سمجھ کر قبول کیا تھا، اللہ کے دین میں وہ پورے پورے داخل ہوئے تھے، اُن کی پوری زندگی، اسلامی زندگی تھی، جنگ کے میدان میں، تجارت گاہوں میں، بازاروں میں، ایوانِ سیاست میں، منبر پر، مسجد میں، دارالشوریٰ میں، ——— گھر میں، سفر میں، غرض ہر جگہ اور ہر حالت میں اللہ کا قانون اور رسولؐ کی رہنمائی اُن کے پیشِ نظر تھی۔

اور ہم ——— پرلے درجہ کے منافق اور غیر وفادار، زبان پہ کچھ اور عمل اُس سے بالکل مختلف! اللہ تعالےٰ کے احکام اور رسولؐ کے فرمان پر ایمان لانے کا دعویٰ مگر اپنی زندگی سے اس دعوے کی قدم قدم پر تکذیب اور تردید! ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل بس نماز روزے تک ہی محدود ہے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہم آزاد ہیں، جس کسی کا طریقہ بھی چاہیں اختیار کریں اور اپنے لئے جو قانون جس طرح بھی ہماری مرضی اور مصلحت ہو بنائیں۔

اور یہ مصیبت کچھ عوام ہی تک محدود نہیں ہے ہمارے علمار تک اس میں گرفتار ہیں، اُن میں اعلار کلمۃ الحق کی تڑپ ہی باقی نہیں رہی، وہ اپنی تنعم پرورده زندگی کو اعلانِ حق کر کے جوکھم میں ڈالنا نہیں چاہتے، گاؤ تکیہ کے سہارے قالین پر بیٹھ کر، قرآنِ کریم کا درس دینے اور فقہ کے مسایل بتا دینے کو بہت کافی سمجھتے ہیں، اس حالت میں وہ مطمئن ہیں کہ تبلیغِ حق کا فریضہ وہ ادا کر رہے ہیں، غلط کار امیروں، حاکموں اور ارباب اقتدار کو ٹوکنے کی اُن میں ہمت ہی نہیں رہی، حق کے لئے وہ کسی آزمایش میں پڑنا نہیں چاہتے ——— اور یہ مصیبت اسی حد پر پہونچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ بھی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اعلانِ حق کے لئے اٹھتا بھی ہو تو علمار کا یہ گروہ اُس کا نہ صرف یہ کہ ساتھ نہیں دیتا بلکہ لوگوں کے سامنے اس انداز سے تنقید کرتا ہے کہ سُننے والے اُس داعیٔ حق کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں، یہاں "مدرسوں" "خانقاہوں" "خانوادوں" اور "سلسلوں" کے تصورات کی دھڑے بندی موجود ہے، کوئی شخص اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے میدان میں آتا ہے تو ہمارے علمار سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں "مدرسہ" اور دار العلوم کا یہ شخص پڑھا ہوا ہے یا نہیں؟ فلاں بزرگ سے اُس کو نسبت ہے کہ نہیں! اور "ہمارے اسلاف" کے تعامل کا وہ کہاں تک پابند ہے ——— یہ خیالات حق کی حمایت سے انھیں باز رکھتے ہیں، اور محراب و منبر سے ایک آواز بھی حق کی تائید میں بلند نہیں ہوتی۔

## کثرتِ تعبیر

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کو انسانیت کے لئے "معیار" قرار دیا ہے، اور حضورؐ کی زندگی میں واضح طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ نے کافروں سے کلمہ پڑھوا کر اور اُنھیں مسلمان بنا کر یوں ہی آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ بس نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنا، زندگی کے دوسرے معاملات میں جس طرح تمھارا جی چاہے عمل کرنا، اور نہ آپؐ نے قریش کی کافرانہ سیادت سے تعاون فرمایا، حضورؐ نے قوت کے ساتھ کافروں کے زور کو توڑا، اُن کی سیادت کو مٹایا اور نظامِ حق کو قایم فرما دیا ——— اس لئے کہ آمرانہ قوت کے بغیر "امر معروف" اور "نہی عن المنکر" کا فرض ادا ہو ہی نہیں سکتا ——— مگر ہم میں ایسے ذہین مسلمان بھی موجود ہیں جو "حکومتِ الٰہی" اور "نظامِ اسلامی" کے قیام پر قرآن اور حدیث سے لفظی ثبوت طلب کرتے ہیں حالانکہ رسولؐ اللہ کی پوری زندگی اس کی شاھد ہے!

دوسرا مذہبی طبقہ "عرس و فاتحہ" میں اُلجھا ہوا ہے، وہاں قوالیاں ہیں اور باجے کی آواز اور ڈھول کی تال پر رقص ہے، قبروں پر چراغاں ہے، پھولوں کی چادریں، "اگر کی بتیاں" "یا پیر" کے نعرے ہیں، غرض وہ سب کچھ ہے جس سے "بدعتوں" کو سہارا ملتا ہے اور عجمی روایات میں جان پڑتی ہے، یہ گروہ کسی قبر پر چراغاں دیکھ کر خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ "دینِ مبین" کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور حق بلند ہو رہا ہے۔

اور ہم مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے اللہ کی کتاب کو کھیل بنا لیا ہے، قرآنِ پاک کی تفسیر افسانوی انداز پر کی جا رہی ہے، اللہ اور رسولؐ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اُن کو یہ لوگ "رسم و رواج"

کہتے ہیں، دین کے ہر حکم کو مصلحت، سیاست اور معاشں واقتصاد کے خود ساختہ پیمانوں سے ناپتے ہیں، اور دین کا جو حکم ان پیمانوں پر پورا نہیں اترتا اس کی نفی کرتے ہیں بلکہ مذاق اڑاتے ہیں، "قرآن فہمی" کے یہ دعویدار ہیں حالانکہ قرآن کی پرچھائیں بھی ان کی عقل وفکر پر نہیں پڑی۔

ہمارا مغرب زدہ گروہ زبان سے "اسلام، اسلام، اسلام" پکارتا ہے مگر اس کی زندگی مغربی افکار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، وہ لوگ ایسا "اسلام" چاہتے ہیں، جو زندگی کے تمام معاملات میں اُن کی خواہشوں کا ساتھ دے سکے، انہیں اسلام کے پیچھے چلنا نہ پڑے بلکہ اسلام ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہے، نامحرم مرد وعورت کے اختلاط اور میل جول کے لئے اسلام کو اپنی شریعت میں گنجائش پیدا کرنی چاہیئے اس لئے کہ اسلام جامد دین نہیں ہے وہ ایک متحرک قوت ہے، تصویر، سینما، تھیٹر، رقص وغنا کلب گھر کی قماربازی گھوڑدوڑ کی شرطیں، غرض اُن کی ہر تفریح کا اسلام کو ساتھ دینا ضروری ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ "متحرک دین" نہیں ہے بلکہ "جامد دین" ہے جسے مولویوں اور ملاؤں نے ایسا بنا دیا ہے، اور ملاؤں کے بنائے ہوئے دین سے بغاوت اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے! یورپ کی تہذیب وتمدن کی چمک دمک نے ان کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی ہے، مغرب زدگی نے اُن کی فکر کو عقیم بنا دیا ہے اور اُن کے اندر دینی غیرت باقی نہیں رہی۔

ہمارے ادیب اور شاعر نفس کے چٹخاروں کا شکار ہیں، اُن کے شعر وادب کا کوئی مقصد نہیں ہے، وہ تو بس شہرت اور نام ونمود چاہتے ہیں، وہ رومان آفریں افسانہ لکھ کر حاصل ہو جائے یا کسی سیاسی اسٹیج پر قومی نظم سنا کر! ان کی کوششوں کا مقصود تو داد وستائش حاصل کرنا ہے، ان کی قوتِ سامعہ "واہ واہ اور سبحان اللہ" کے لئے ہر آن گوش برآواز رہتی ہے، وہ اس ذمہ داری کا احساس تک نہیں رکھتے کہ اللہ نے اُن کو فکر ونظر اور اظہار وبیان کی جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ان کا استعمال کہاں اور کس طرح کرنا چاہیئے، وہ تو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ عاشقی اور رومان کی تفسیر کے لئے ہی اُن کی تخلیق ہوئی ہے! اب رہیں اُن کی سیاسی اور قومی نظمیں اور افسانے تو اُن میں غیروں کے افکار کی ترجمانی ہوتی ہے، اُن کو شاید اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ اسلام اپنی مخصوص طرزِ فکر کا مالک ہے۔

ہمارے اُمرا عیش وعشرت میں مبتلا ہیں، کچھ اُن میں قارون ہیں اور کچھ جمشید ہیں! اُن کی زندگی کا مقصد ہی لطف کرنا اور مزے اڑانا ہے ؎ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، کے صحیح صحیح مصداق! دُنیا پرستی اور ہوسناکیوں نے دین سے اُنھیں غافل کر دیا ہے، قومی اداروں میں کبھی کبھار وہ چندہ بھی عنایت فرما دیا کرتے ہیں، مگر اس لئے نہیں کہ قوم سے اُنھیں کسی قسم کی ہمدردی ہے، بلکہ اس جود وعطا کا مقصد ہوتا ہے، نمود ونمائش، عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کرنا، اس بہانہ اخباروں میں اُن کی تصویریں چھپ جاتی ہیں اور جلسوں کی صدارتوں کے موقعے میسر آجاتے ہیں۔

جو طبقہ ہم میں ذہین اور صاحبِ فکر ہے، وہ جاہ واقتدار کا بھوکا ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے سیاسی توڑ جوڑ ہیں، سازشیں ہیں، پروپیگنڈے ہیں، رقابت کی رسّہ کشی اور مسابقت کی معرکہ آرائیاں ہیں، غرض اور نفاقی مفاد نے اُنھیں "صوبہ پرستی" کی لعنت میں بھی مبتلا کر دیا ہے، جن کو اللہ کے نام پر جمع ہو جانا چاہیئے تھا، وہ صوبوں اور خطّوں کے نام پر متفرق ہیں، ایک دوسرے کا دشمن اور مخالف! یہ زہر رگ وپے میں پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔

اب رہے متوسط طبقہ کے افراد اور غریب غربا، جن کو ہم "عوام" کے نام سے پکارتے ہیں، تو وہ بھی عیش کوشی، نفس پرستی اور دین سے غفلت اور بیزاری میں امیروں اور سرمایہ داروں سے پیچھے نہیں ہیں، جہاں تک اُن کے حالات اجازت دیتے ہیں، اور جتنا بھی ان کے امکان میں ہے، لطف کرنے اور مزے اڑانے میں وہ کسی قسم

کی کمی نہیں کرتے، اُن کو زندگیوں کو اسلام سے بس کچھ یوں ہی سی نسبت ہے اور اب تو یہ برائے نام نسبت بھی مجروح ہوتی جا رہی ہے ــــ وہ جو اقبال نے کہا تھا ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تو ہمارا بعینہٖ یہی حال ہے کہ زبان سے تو ہم اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر نہ ہمارا دل مسلمان ہے اور نہ ہماری نگاہ مومن ہے!
جن مقدس نفوس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ "مومنین" تھے اس لئے اللہ نے ان کو عزت اور بلندی عطا فرمائی، اور ہم صرف گفتار کے مومن ہیں مگر کردار کے مومن نہیں ہیں، اس لئے ذلتیں اور حرماں نصیبیاں ہم پر مسلط کر دی گئی ہیں، اگر ہم نے اپنی حالت کو نہ بدلا اور پورے پورے "مومن" نہ بنے تو اللہ کا قانون ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہ کرے گا اور ہمارا رہا سہا وجود بھی ختم ہو جائے گا، اسلام سے صرف ظاہری نسبت ہمیں آخر کب تک سہارا دئیے رہے گی، کوئی قوم فقط "لفظی اقرار" کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی، زندگی عمل چاہتی ہے، جہاں بے عملی اور اصول سے فرار ہے وہاں زندگی کہاں، بے عمل قوم کو "موت" کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے!

**پورا اسلام** ہمیں زندہ رہنا ہے اور عزت کے ساتھ زندہ رہنا ہے، تو پھر ہمیں اپنی پوری زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ہوگی اس نفاق اور دو عملی کو چھوڑنا ہوگا کہ اسلام کی کچھ باتوں کو تو ہم مان لیں اور کچھ کو چھوڑ دیں، "ترک و اختیار" اور "طلب و گریز" کے اس معیار ہی کو سرے سے بدلنا پڑے گا، ہماری سیاست، تجارت، معیشت، زراعت، صنعت و حرفت، شعر و ادب، لطف و تفریح یہاں تک کہ ذوقِ حسن و جمال تک کو بھی "مسلمان" بننا ہوگا!
جس دن یہ ہو جائے گا، اُس دن دنیا کی عزتیں اور بلندیاں ہمارے پاؤں چومتی ہوں گی ساری کائنات ہمارے زیرنگیں ہوگی، اور باطل کی جن قوتوں نے ہمیں مغلوب کر رکھا ہے، ان کا زور ٹوٹ جائے گا ــــ تاریخ اپنے کو دہرا کر رہے گی، اللہ کی فوجیں ہماری مدد کریں گی یہاں تک کہ بدر و یرموک کی طرح، زندگی کے ہر محاذ پر کفر و باطل کو شکست ہوگی، اور ہر طرف اللہ ہی کا کلمہ بلند ہوگا!
مسلمانوں میں گروہوں، جماعتوں اور پارٹیوں کی کمی نہیں ہے، ہر جماعت اسلام ہی کے نام پر مسلمانوں کو بلاتی ہے، مگر ان جماعتوں کے مقاصد اور اُن کے کارکنوں کے اعمال کا پوری طرح جائزہ لینا چاہیئے، کہ اُن میں کون گروہ کیا چاہتا ہے ــــ اللہ تعالٰی نے ہمیں چیزوں کے پرکھنے اور خوب و ناخوب میں امتیاز کرنے کی جو قوت دی ہے اُسے کام میں لانا چاہیئے، یہ نہ ہو کہ ہم ہر آواز دینے والے کے پیچھے چل پڑیں کہ لاؤ تھوڑی دور اس کے ساتھ چل کر بھی دیکھ لیں کہ کیا ظہور میں آتا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اس طرح ہماری عملی قوت ضایع ہو جائے گی اور "تجربہ" کا یہ شوق اصل مقصد ہی کو ضائع کر دے گا۔
کچھ نیک لوگ اس مقصد کے لئے اُٹھے ہیں کہ اللہ کا دین پورا پورا قایم ہو، منبر و محراب سے لیکر سیاست کے ایوانوں اور معیشت کے بازاروں تک اللہ کے دین کی حکمرانی ہو، زندگیوں میں نفاق اور دو عملی باقی نہ رہے، ان لوگوں کو پہچانیے اور پہچان لینے کے بعد ان کی مساعدت کیجئے، ان کا ساتھ دیجئے، ناامیدی اور مایوسی کو دل سے نکال دیجئے، یقیناً حالات بہت زیادہ ناسازگار ہیں اور ساری دنیا مخالفت پر آمادہ ہے، ذہنیتیں مسخ ہو چکی ہیں اور مزاج بگڑ چکے ہیں ــــ مگر آپ استقلال، ثباتِ عزم اور توکل علی اللہ سے کام لیں گے تو حالات کا بدل جانا مشکل نہیں ہے، جس دن آپ نے اپنے کو بدل لیا، اُس دن آپ کا ماحول بھی بدل جائے گا، حق کے سامنے باطل زیادہ دن تک ٹھہر نہیں سکتا ــــ اعلان کر دیجئے ــــ کہ ؎

ہم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاہیئے　　جس میں اک بڑھیا خلیفہ کا گریباں تھام لے
ــــ اُٹھئے، آیئے، بڑھیئے

ظفر احمد انصاری

# کمیونزم — عملی نتائج کی کسوٹی پر

ایک جہنم
جسے لوگ
"جنت" سمجھے ہوئے ہیں!
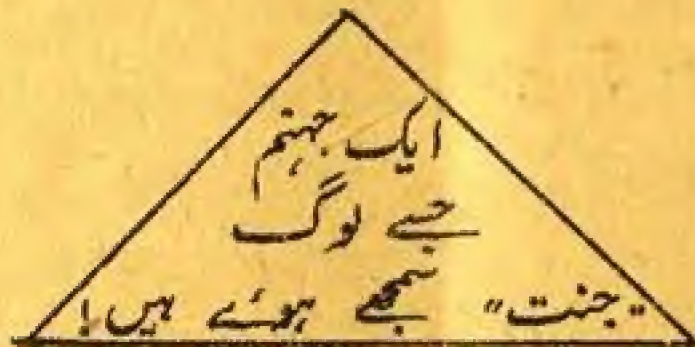
گزشتہ دو صدیوں میں انسان کے دکھ درد کو مٹانے اور انسانی سماج کو ظلم اور جور کی لعنتوں سے پاک کرنے کے لئے مختلف فلسفے وجود میں آئے اور بے شمار تحریکیں ابھریں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر تحریک کمیونزم کی ہے جو مارکس اور اینجلز کے پیش کردہ اصولوں کی رہنمائی میں ایک زبردست ریاست کا نظام کامیابی سے چلانے کا دعوی کرتی ہے۔

لیکن انسانوں کے پیش کردہ دوسرے فلسفوں کی طرح ایک چیز کمیونزم میں بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے اور وہ افراط اور تفریط کی جانب اس کا میلان ہے۔ انسانی ذہن جو ہدایت الہیٰ کی روشنی سے منور نہ ہو ہمیشہ دو انتہاؤں کی جانب لڑھکتا رہتا ہے ——— چنانچہ ایک زمانہ وہ تھا جب تمام معاشی مفکرین ایک زبان ہو کر (LOISSEZ FHIRE) کے نظریے پر فریفتہ اور معاشی امور میں افراد کی بے روک ٹوک آزادی کے شیدائی تھے اور ان کا خیال تھا کہ طلب و رسد کے معاشی قوانین (Laws of Demand + supply) بھی اسی طرح فطری ہیں جس طرح قوانین طبیعی (Physical Laws) لہٰذا معاشی نظام میں حکومت کو کسی طرح کی دخل اندازی نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن زمانے کی ایک ہی گردش نے اس نظریے کی انسانیت آزاری اور لغویت ثابت کر دی اور سوسائٹی ان بھیانک مظالم سے چیخ اٹھی جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے ظہور پذیر ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا جس نے انسان کے حقِ ملکیت کی ہی نفی کی اور اسے تمام موجودہ آلام و مصائب کی جڑ قرار دیا اور اسی بنیاد پر پوری تاریخ کی توجیہ اور تعبیر کی، ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظام ہائے زندگی ——— جو ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر بنائے جاتے ہیں' ان میں توازن اور اعتدال مفقود ہوتا ہے اور اس کی جگہ جذباتی انتہا پسندی ہوتی ہے۔

ایک دوسرا نقص ان غیر اسلامی نظاموں" میں یہ ہوتا ہے کہ اُن کے وضع کرنے اور بنانے والے انسانی فطرت کے تمام

داعیوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے، اس لئے جو نظام اور دستور وہ بناتے ہیں، اُس میں لازمی طور پر خامیاں رہ جاتی ہیں یہ دستور کاغذ پر تو بہت خوشنما اور فلسفیانہ نظر آتے ہیں، مگر عملی زندگی میں زیادہ دنوں تک انسانی معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتے، ان کا بہت سا حصہ "ناقابلِ عمل" ہوتا ہے اور وہ اس لئے کہ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کے بہت سے اہم تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس قسم کے نظاموں اور دستوروں سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ نئی سیاسی اور دستوری اصطلاحیں وجود میں آ جاتی ہیں مگر انسانیت ان کے چکر میں پھنس کر اور زیادہ مضطرب الحال ہو جاتی ہے۔

اس مضمون میں کمیونزم کے فلسفہ "جدلی مادیت" مارکس کی "مادی تعبیر تاریخ" "قدر زائد کے نظریہ، طبقاتی نزاع، پر تبصرہ کرنے یا یہ ثابت کرنے سے کہ کمیونزم کے غیر خدا پرستانہ تصورات سے انسانی سوسائٹی کو کتنے مہلک اثرات سے دوچار ہونا پڑیگا اور تمام ذرائع پیداوار پر حکومت کے قبضہ ہو جانے سے کس طرح ایک سخت گیر اور متشدد آمریت اُبھر آئے گی اور تمام انسانی آزادیاں پامال ہو جائیں گی ——— گریز کروں گا اور صرف ان نتائج پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جو کمیونزم کی جنتِ روس میں رونما ہوئے ہیں تاکہ ان سادہ لوح انسانوں کو جو کمیونزم سے مرعوب ہیں یہ پتہ چل جائے کہ وہ سبز باغ کس نوعیت کا ہے جو ہمارے مظلوم عوام کو دکھایا جا رہا ہے اور "جنتِ ارضی" کس قسم کی ہے جس کا لالچ دیکر ہمارے مظلوم مزدوروں اور کسانوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ تم اپنے دین و ایمان اخلاقی اقدار، اور اپنی تمام تر آزادیٔ فکر، آزادیٔ عمل اور آزادیٔ تحریر کو اس پر بے دریغ جلد قربان کر دو ——— !

کمیونسٹ نظام کو قایم کرکے اس کو عملاً چلانے میں سب سے پیچیدہ اور اہم مسئلہ قوت کارکردگی (EFFICIENCY) کا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کا ذمہ لے لیں کہ ہر آدمی کی ضروریات کو اس کے کام اور مقدار پیداوار سے بالکلیہ صرف نظر کرتے ہوئے پوری کر دیں تو اس صورتِ حال کے تحت پیداوار کی مشین کا چلتے رہنا ہی محلِ نظر ہو۔ آدمی کی محنت و مشقت کی سب سے بڑی محرک یہ توقع ہوتی ہے کہ اسے مقدار پیداوار کے مطابق اُجرت ملے گی۔ اُجرت میں مساوات یا کم و بیش مساوات کی شکل پیدا ہو جانے سے قوتِ کارکردگی مجروح اور مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے اور نا اہلیت کو فروغ پانے اور پنپنے کے مواقع حاصل ہونے لگتے ہیں۔ اہل لوگوں کی اہلیت اس لئے ختم ہونے لگتی ہے کہ ان کو اس کا کوئی ثمرہ نہیں ملتا اور نا اہل اپنی صلاحیتوں کو نشوونما نہیں دیتے کیونکہ گویا ان کو ان کی نا اہلیت ہی کی اُجرت ملتی ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر تمام معاشیین نے پیشین گوئی کی تھی کہ کمیونزم کے اصولوں پر اگر عمل کیا گیا تو قوتِ کارکردگی ایک دن ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔

روس کا دعویٰ ہے کہ کمیونزم کے اصولوں پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے قوتِ کارکردگی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس کی پیداوار کی مشینری بہ حسن و خوبی کام کر رہی ہے لیکن روس کا یہ دعویٰ کہ وہ مارکسی نظریات پر بھی عامل ہے سراسر بے بنیاد اور صداقت سے خالی ہے۔ روس قوتِ کارکردگی کے موجودہ معیار پر پہونچا ہی اس لئے ہے کہ اس نے معاوضہ بندی کے مارکسی اصول اور نظریات کو پسِ پشت ڈال کر سرمایہ دارانہ نظام کے اس اصول کو اپنا لیا ہے کہ ہر اجیر کو اس کی مقدار پیداوار کے مطابق اجرت ملنی چاہیئے۔ مارکس کا دعویٰ تھا کہ قوتِ کارکردگی کو برقرار اور متحرک رکھنے کے غیر شخصی اور بے لوث محرکات بھی ہو سکتے ہیں لیکن تجربات کرنے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد روس نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ نظریہ تصورات اور فلسفہ کی دنیا میں خواہ کتنا ہی خوشنما کیوں نہ ہو لیکن عمل کی دنیا میں بہر حال اس کی افادیت صفر کے برابر ہے۔

مارکسزم کے "مومنین صادقین" ایک بے زر معیشت کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جہاں سوسائٹی

کے ذرائع اور وسائل سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھانے کے مواقع ہوں" وہاں زر، تبادلہ اور منڈیوں (markets) کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ روس نے اپنے معاشی نظام کو ان خطوط پر چلانے کی کوشش کی۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں مزدوروں کی نصف ضروریات و احتیاجات اشیاء کی شکل میں اُجرت دیکر پوری کی گئی تھیں اور روس کے ایک بہت بڑے افسر ایم۔ لارن نے انتہائی جوش کے ساتھ کہا تھا کہ اجتماعی محنت سے پیدا کی ہوئی اشیاء مزدوروں کے درمیان ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کر دی جایا کرینگی[۲]۔

اس وقت یہ توقع کی جاتی تھی کہ زر کا یہ معمولی استعمال بھی جلد ہی غیر ضروری ہو کر رہ جائے گا۔ Buchanan نے کہا تھا:-

"ایک بات بہت ہی واضح اور صاف ہے کہ جس قدر زیادہ عمدہ طریقہ سے مزدور پیداوار کو کنٹرول کرلیں گے، اسی قدر زر کی ضرورت میں کمی واقع ہوتی جائے گی اور بالآخر زر کا وجود آپ سے آپ فنا پذیر ہو جائیگا"[۳]

سنہ ۲۰ء اور سنہ ۲۱ء کے پہلے چھ ماہ میں اس زر کو ختم کرنے کے لئے روس میں مختلف احکام جاری کئے گئے لیکن یہ چیز ناقابل عمل ثابت ہوئی اور روبل (روسی سکے) کو بحال کرنا ہی پڑا، ورنہ صرف یہ کہ زر کا وجود پورے طور پر فنا نہ ہوا بلکہ وہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ اپنی جگہ پر قابض ہو گیا۔

اسٹیٹ پلاننگ کمیشن کے چیرمین مزہلاک (V. I. Mazhlauk) نے توضیح کرتے ہوئے فرمایا:-

"کارڈ سسٹم کے خاتمے، اشیاء کے ذریعہ معاوضوں کے ادا کرنے کے طریقوں کے انقطاع، اور نظام زر کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قیمتوں کی دو اور تین قسموں کے ختم ہو جانے سے روبل معاوضہ بندی کے اشتراکی اصولوں کے نفاذ کا واحد موثر ذریعہ بنتا جا رہا ہے"[۴]۔

اس طرح روبل نے اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن حاصل کرلی اور روس کے معاشی نظام میں وہ قوت کارکردگی بھی اسی کے ذریعہ پیدا ہو گئی جس نے روس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی سرزمین سے جرمنی کے خونخوار اور وحشی حملہ آوروں کو مار بھگانے کے لئے موثر جنگی تیاریاں کر سکے۔ روس میں قوتِ کارکردگی کے موجود ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہ معاوضہ بندی* کے ان سرمایہ دارانہ اصولوں پر عامل ہے جن کی رو سے اُجرتوں کی ادائیگی میں مقدار پیداوار کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان اصولوں کی کارفرمائی روس میں (Stakhnovite movement) اور (Piece wages) کی صورت میں نمودار ہوئی۔ روس کے بارے میں ایک بات اور بھی عرض کروں گا اور وہ یہ کہ جب تک وہ کمیونزم کے اصولوں کو ایک بار پھر آزمانے کی غلطی کا مرتکب نہ ہو اس کے معاشی نظام میں قوتِ کارکردگی بھی موجود رہے گی اور وہ اپنے پیداوار کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔

اس طرح کمیونزم کے آبائی وطن روس میں، مارکسزم کا ایک اہم اصول ماضی کی گود میں ہمیشہ کی نیند سلا دیا گیا اور خود

---

* یہاں بندی کا لفظ معاشیات کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی عام معنوں میں نہیں۔

[۲] Marxism is Dead P 108 by Prof. Brij Narain

[۳] Kann das Geld Abgeschafft werden P 58 by W. D. Comee

[۴] Soviet Union P 387-388 by Lawrence and Wishart

کمیونسٹ بھی شاید اس امر کو تسلیم کرلیں گے کہ مستقبل قریب میں اس اصول کے احیاء کے بارے میں زیادہ خوش آیند توقعات نہیں قایم کیجا سکتیں کیونکہ موجودہ صنعتی اور مالیاتی ترقی کے دور میں یہ چیز محال نظر آتی ہے کہ کوئی ایسا معاشرہ وجود پذیر ہوسکے جسے زر کی سرے سے ضرورت ہی نہ رہے۔

اس کے علاوہ مارکسزم کا ایک اور اہم اصول ہے جس کے بارے میں ہمارا ہر کامریڈ گھنٹوں بحث کرتا ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق اُجرت دی جائے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ خواب بھی روس کی سرزمین میں شرمندۂ تعبیر ہوسکا یا اس کے بارے میں بھی "Aday Wellcome" کے دل خوش کن وعدے کئے جارہے ہیں۔

اس سے قبل ہی ہم بتا چکے ہیں کہ قوت کارکردگی کے مسئلے نے روس کو مجبور کردیا کہ وہ پیداوار کے لئے غیر شخصی اور بے لوث محرکات کو ترک کرکے شخصی نفع اور ذاتی اغراض کے محرکات فراہم کرے۔ اسی اصول پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں لوگوں کے معاوضوں میں ایک عظیم تفاوت کارفرما ہے۔ ایک فرانسیسی کمیونسٹ کامریڈ ایوان (COMRADE YVON) نے حسب ذیل اعداد و شمار دیئے ہیں۔[۵۱]

| | | کم سے کم | اور زیادہ سے زیادہ | اوسط ماہوار آمدنی |
|---|---|---|---|---|
| مزدور | Employees | ۸۰ سے | ۴۰۰ روبل تک | ۱۲۵ سے ۲۲۵ روبل تک |
| معمولی درجے کے اجیر[۵۲] | | ۸۰ سے | ۳۰۰ روبل تک | ۱۳۰ سے ۲۲۵ روبل تک |
| اجیر اور اوسط درجے کے صناع | Technician | ۳۰۰ سے | ۸۰۰ روبل تک | .. .. .. |
| ذاتی ملازمین | Maid Servants — علاوہ کھانے اور رہنے کی سہولتوں کے | ۵۰ سے | ۶۰ روبل تک | .. .. .. |

ذمہ دار منتظمین (ADMINISTRATORS) افسران اعلیٰ، پروفیسر، فن کار اور مصنفین۔ } ۱۵۰۰ سے دس ہزار روبل ماہانہ بلکہ کچھ اس سے زیادہ — بعضوں کی ماہوار آمدنی ۲۰ سے ۳۰ ہزار تک ہے۔

مزدوروں کی پنشنیں ۲۵ سے ۸۰ روبل تک

افسران اعلیٰ اور ماہرین (Special Cases) کی بیواؤں کی پنشنیں ۲۵۰ سے ایک ہزار روبل ماہانہ تک اور اس کے ساتھ عمر بھر کے لئے رہائشی مکان یا چھوٹے بنگلے اور ان کے بچوں کے لئے تعلیمی وظائف اور اکثر تو ان کے پوتوں کو بھی یہ وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

کامریڈوں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق روس میں آمدنیوں کے درمیان ۲۵ اور تیس[۳۰] ہزار کا زبردست تفاوت موجود ہے۔[۵۳] گویا روس میں ایک آدمی کو ۵ روپیہ سے لیکر ۶ ہزار روپے تک تنخواہ ملتی ہے۔ اس وقت یہ عرض

---

Ce qui est devenu la Revolution Russe Page 25—6

[۵۳] اور خلافتِ راشدہ کے عہدِ سعادت میں سرکاری ملازموں کی آمدنی کا تفاوت ۱ : ۲۵ یا ۱ : ۴۰ تک رہا ہے۔

کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ روس میں (SAVINGS) پر باقاعدہ سود دیا جاتا ہے اور سرمایہ دار ممالک کی بہ نسبت روس کی شرح سود بہت زیادہ یعنی ۸ فیصدی ہے۔

اس ضمن میں ایک بات اور ذہن سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے آمدنی بڑھتی ہے، آدمی کو پس انداز کرنے کے مواقع اور زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص کی آمدنی ۱۰۰ سو روپے ہے۔ لیکن اس کی زندگی کی بنیادی ضروریات ۸۰ اسّی روپے کی ہیں۔ اور فرض کیجئے کہ وہ ۱۵ فیصدی (COMFORTS) پر خرچ کرتا ہے۔ اب وہ اپنی آمدنی کا ۵ فیصدی حصہ بچا سکے گا۔ ایک دولت مند آدمی جس کی آمدنی ۲ ہزار ہے، اس کی زندگی کی بنیادی ضروریات تو کم و بیش وہی رہتی ہیں جو ایک معمولی مزدور کی ہیں، (COMFORTS) میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے ـــ اس طرح وہ آسانی سے ۳۰ فیصدی یا ۳۵ فیصدی آمدنی پس انداز کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں ایک طرف تو کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جو صرف اتنا کماتے ہیں کہ اپنی زندگی کی جائز ضروریات پوری کر لیں یا (Hand mouth living) اختیار کریں لیکن دوسری طرف لوگوں کی پس انداز کی ہوئی دولت کروڑوں تک جا پہونچتی ہے۔ خود روس کے سرکاری اخبار (Pravada) نے جنگ کے زمانے میں چندے کی رقموں کے سلسلے میں جو اعداد و شمار دیئے تھے اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ بعض دوست یہ کہیں کہ ابھی تو یہ عبوری دور ہے اور روس کا معاشرہ ارتقاء کے منازل طے کرتا ہوا جب کمیونزم کی منزل پر پہونچے گا تو اس وقت یہ صورتِ حال باقی نہ رہے گی۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔ بلکہ اب تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ روس کے لوگوں نے خود اس اصول کے کھوکھلے پن کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے جس کی طرف لینن نے اس مقولہ میں اشارہ کیا ہے:۔ "ایک بڑے سے بڑے افسر کا معاوضہ بھی ایک اچھے مزدور کی اوسط آمدنی سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے"۔ یہ کوئی اتہام طرازی نہیں ہے بلکہ ابھی حال میں ہی ایک روسی ماہر معاشیات (ECONOMIST) کا بیان چھپا تھا جس میں اس نے کہا ہے کہ موجودہ معاشی عدم مساوات کے بارے میں آگے چل کر کم ہونے کے بجائے بڑھ جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔

لیکن اگر افسروں اور مزدوروں کے درمیان آمدنیوں کی اس ناہمواری سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اس بات کو معلوم کریں کہ خود ایک کارخانے یا کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی آمدنیوں کے درمیان کس قدر تفاوت موجود ہے ـــ تو اس خصوص میں بھی ہم روس کے حق میں کوئی اچھی رائے نہ قایم کر سکیں گے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے (New International) میں مارکسسٹ لینن نے لیون سیڈو (Leon Sedo) کے ایک آرٹکل کا حوالہ دیا ہے:۔

"کانوں میں ایک (New Stakhnovist) مزدور ۴۰۰ سے ۵۰۰ روبل ماہانہ پاتا، لیکن ایک (Stakhnovist) کو ۱۶۰۰ روبل ماہانہ ملتے ہیں۔ ایک (Auxiliary worker) کو ۔۔ ۔۔ ۔۔ (Stakhnovist) نہ ہونے کی صورت میں ۱۷۰ (ایک سو ستر) روبل اور بصورت دیگر ۴۰۰ ملتے ہیں"

(Pravada 16th Nov 1935)

Pravada 20th April 1917

اس کے معنی یہ ہوئے کہ معاشی مساوات کے اس دیس میں ایک مزدور کو دوسرے مزدور کے مقابلے میں دس گنا زیادہ اُجرت ملتی ہے۔ ایسٹ مین نے ثابت کیا ہے کہ اکثر انجینیر (unskilled) غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے مقابلے میں ۸۰ اور ۱۰۰ گنا زیادہ پاتے ہیں۔ ایسٹ مین نے (New Republic) کے شمارہ جولائی ۱۹۳۶ء میں امریکہ کی مالدار کمپنیوں کے ملازمین کی آمدنیوں کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس خاکے سے معلوم ہوتا ہے کہ (Chile upper company) میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ اُجرتوں میں فرق ایک اور ۱۴ کا ہے، (Curtis publishing) میں ایک اور ۱۵ کا فرق ہے، اور (Consolidated) میں ایک اور ۸۲ کا — لیکن اس سرمایہ دار اور ملوکیت پرست ملک کے سرمایہ داروں میں یہ جُرأت کہاں کہ وہ روس کے عدل پرور اور مساوات افروز نظام کا مقابلہ کریں جو ایک ہی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کے درمیان ایک اور ۸۶ کا فرق رکھتا ہے —!

اس موقعہ پر سڈنی اور بیٹرس ویب کی گواہی فراہم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا شمار روس کے پرجوش حامیوں میں ہے اور جن کی کتاب کو کمیونسٹ حضرات اپنی حمایت میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب (Soviet Communism: A new civilization) کے صفحہ ۱۲۰۷ پر یوں لکھتا ہے:-

"افراد کی آمدنیوں کے درمیان جو زیادہ سے زیادہ تفاوت روس میں پایا جاتا ہے اگر ان کے (Extreme instances) (یعنی ان مثالوں کو جو زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم آمدنی کے آخری حدود کی نشان دہی کرتی ہیں — مترجم) کو لیا جائے تو یہ تفاوت اگر امریکہ نہیں تو برطانیہ کے اجیروں کے معاوضوں میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کے برابر ضرور ہوگا"

ان چیزوں سے صرف ایک بات ظاہر ہوئی ہے اور وہ یہ کہ روس میں ایک اہم مارکسی اُصول دفن ہو چکا ہے اور اس گڑے مُردے کے اکھڑنے کے امکانات بھی باقی نہیں رہے — خواہ اس کی تردید میں کتنے ہی بلند آہنگ دعوے کیوں نہ کئے جائیں — مگر واقعات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

ایک عدم طبقاتی سماج کا قیام بھی کمیونزم کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے، لیکن روس میں یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، وہاں کی معاشی عدم مساوات اور مادہ پرستانہ فکر و نظر کی کرشمہ سازیوں کی بدولت سوسائٹی مختلف طبقات میں بٹ چکی ہے، وہاں کا "معاشی نظام" بھی معاشرے میں معاشی مساوات پیدا نہ کرسکا، اور پیدا کس طرح کرتا جبکہ اُس کی بنیاد میں "غیر فطری عوامل" سموئے ہوئے ہیں۔

روس میں جی ہاں! اُس روس میں جسے عوام کی جنت اور مزدوروں کا "باغ عدن" بتایا جاتا ہے سرمایہ دار ممالک کی طرح ریلوں میں مختلف درجے موجود ہیں اور تھیٹروں میں بھی مختلف (CLASSES) ہوتی ہیں جو عدم طبقاتی سماج کے تصور کی ہنسی اُڑا رہے ہیں — روس کے ایک زبردست حامی۔ Pat Sloan. نے اپنی کتاب "RUSSIA WITHOUT ILLUSIONS" میں لکھا ہے کہ:-

"اکثر قارئین اسٹیمر میں پہلے، دوسرے، اور تیسرے درجے کے موجود ہونے پر متعجب ہوں گے، اور جب میں یہ کہوں گا کہ ریل گاڑیوں میں بھی اسی طرح مختلف درجات پائے جاتے ہیں تو اس پر بعض لوگ تعجب سے کہیں گے کہ "ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ روس میں طبقات ختم کردیئے گئے ہیں — اس موقعہ پر مجھے اس بات کی وضاحت کرنے

دیجئے کہ طبقات کے ختم ہو جانے سے میری مُراد ہے کہ سوسائٹی اب زمینداروں، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان منقسم نہیں رہی"!

الفاظ کی تبدیلی سے واقعی طور پر تبدیلی رُونما نہیں ہوا کرتی، یوں کوئی اپنا جی خوش کرنے کے لئے جس واقعہ کی بھی جس طرح چاہے تاویل کرلے ــــــ طبقاتی تفاوت اور معاشرتی نامساوات روس میں موجود ہے اور پُوری قوت اور شان کے ساتھ موجود ہے، وہاں کم آمدنی والے اب بھی تیسرے درجہ میں سفر کرتے، معمولی مکانوں میں رہتے اور گھٹیا قسم کی زندگی گزارتے ہیں، اور جن کی آمدنی زیادہ ہے، اُن کے لئے ہر طرح کی آسائشیں اور سہولتیں مہیا ہیں، روس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو اپنے زعم میں ختم کر دیا مگر وہ "رُوح" فنا نہ ہو سکی، وہ باقی ہے، اُبھر رہی ہے اور اس کی گواہی روس کی ریلیں، دفتر، تھیٹر ہال، بنک بلکہ زیادہ آمدنی والوں کی قیمتی شراب کی بوتلیں پہننے کے گراں بہا کپڑے اور معیشت و معاشرت کے فیشن ایبل اسباب دے رہے ہیں، وہاں بھی معمولی مزدور اور ایک انجینیر کی زندگی میں معاشرت کے اعتبار سے کافی تفاوت پایا جاتا ہے ــــــ کیمونزم نے تو اسی تفاوت اور مساوات کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا، مگر وہ خود اُنہیں پھندوں میں اُلجھ کر رہ گیا، ہاں! کیمونزم نے یہ کارنامہ ضرور انجام دیا کہ اپنے نظامِ معیشت سے خدا اور مذہب کے تصوّر کو خارج کر دیا، اور اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رکھی

## خونیں انتقام

روسی انقلاب کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا ذکر نہ کیا جائے گا تو بات ادھوری اور مفہوم تشنہ رہ جائے گا ــــــ آپ کو معلوم ہے اور اگر معلوم نہیں ہے تو اب اس سے آگاہ ہو جائیے کہ سوشلسٹ نظام کی جن برکتوں (؟) کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، بیچارے روسیوں کو اُس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی، میں اس سلسلہ میں اعداد و شمار سے ثابت کروں گا کہ کیمونسٹ نظام کا قصرِ انسانی لاشوں پر تعمیر کیا گیا ہے، صحیح اعداد و شمار کی روشنی تو آہنی دیوار کے اِس پار آ ہی نہیں سکتی، لیکن میں وہ اندازہ پیش کروں گا جو Ilyin نے "The World on the Brink of Chaos" میں دیا ہے، اس کا خیال ہے رُوسی انقلاب میں مقتولین کی تعداد اٹھارہ لاکھ ساٹھ ہزار تک جا پہونچتی ہے ــــــ ان میں

BISHOPS کی تعداد ــــــ ۲۸

PRIESTS کی تعداد ــــــ ۱۲۰۰

معلّم اور پروفیسر ــــــ ۸۸۰۰

مزدور ــــــ ۱۹۲۰۰۰

اور

کسان ــــــ ۸۱۵۰۰۰

بھی شامل تھے، ان اعداد و شمار کی تائید "Christian Science Monitor" کے نمائندے "W. H. Chamberlain" کے اس بیان سے ہوتی ہے جس میں اس نے کہا کہ "روس کے ان شہریوں کی تعداد جن کو بغیر کسی باقاعدہ قانونی کارروائی کے اپنی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے، بیس لاکھ سے کچھ ہی کم ہوگی (۱)"۔ "Kulaks" کو ختم کرنے کے سلسلہ میں جو زبردست

(۱) Russian Iron Age by W. H. Chamberlain

مظالم توڑے گئے ہیں اُن پر روس کے بڑے بڑے حامیوں کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک جانی چاہئیں ایک امریکی کیمونسٹ نے ان مظالم کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس عہد کے مظالم میں سب سے زیادہ " Spectacular " جبر و استبداد کی حرکت تھی "

اوپر کی سطروں میں روسی نظامِ زندگی کے صرف چند ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں اور واضح ہو جاتی ہے کہ کیمونسٹ نظام ایک غیر معتدل اور انتہا پسندانہ نظام ہے، اس میں سرمایہ داری سے انتقام لینے کے لئے ایک شدید قسم کا انتقامی جذبہ پایا جاتا ہے جس نے اُس کے مزاج میں حد درجہ کی خشونت، بلکہ سفاکی پیدا کر دی ہے، وہ اپنی ذراسی مخالفت کو بھی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا، مخالفین کے لئے جیل کی کوٹھریاں دار کے تختے، پھانسی کے پھندے اور قتل گاہیں ہر آن تیار رہتی ہیں۔

کیمونسٹ نظام میں توازن اور اعتدال مفقود ہے جو انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے ازبس ضروری ہے، یہ نظام اُن انسانی ذہنوں کی پیداوار ہے، جن سے ہر لحظہ غلطی اور بھول چوک کا امکان ہے ـــــ

انسانوں کے لئے نظامِ حیات اور دستورِ زندگی بنانے کا حق تو وہی برتر و اعلیٰ ہستی رکھتی ہے، جس نے اس کائنات اور انسان کو پیدا کیا اور جو زندگی کے تمام اسرار و رموز، فطرت کے داعیات، انسانی کمزوریوں اور زندگی کے تمام تقاضوں کی "علیم و خبیر" ہے ـــــ

---

اُردو ادب کے معمار

از قاضی احمد میاں اختر
جوناگڈھی

# شبلی نعمانی

اُردو ادب کے معماروں میں مولانا شبلی ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔ قصرِ اُردو کی تزئین و آرائش میں ان سے بڑھکر کسی نے حصّہ نہیں لیا۔ حُسنِ اتفاق سے ان میں کئی خوبیاں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ وہ عربی علوم کے فاضل، ایک بالغ نظر مورخ، ایک بلند پایہ ادیب اور ایک نازک خیال شاعر تھے، اور ان سب سے بڑھ کر وہ اُردو کے ایک زبردست اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ ان کے قلم کی گل کاریوں نے اُردو ادب کو سراپا گلزار بنا دیا ہے، اور ان کی بہار آفریں سخن طرازیوں نے چمنِ اُردو میں رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو اُردو دانوں کے مشامِ جاں کو ہر وقت تازہ کرتی رہے گی۔

ہر قابل شخص کو احساسِ خودی کے باوجود دوسروں کی قابلیت کا معترف ہونا پڑتا ہے، اور اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو جانتے ہوئے بھی وہ دوسروں کا ثناخواں رہتا ہے، اس کو چاہے نفسیاتی عیب سمجھا جائے یا اخلاقی خوبی، مگر یہ واقعہ ہے کہ مولوی شبلی اُردو ادب کے معماروں میں سے، جہاں تک جدید اُردو ادب کا تعلق ہے، سرسید، آزاد، نذیر احمد اور حالی کے قائل تھے اور ان کو "عناصرِ اربعہ" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور سب سے پہلے انھی نے یہ لقب ان کو بخشا تھا۔ لیکن ایک مدت کے بعد دوسروں نے انہیں بھی اس زمرے میں شامل کر کے اس لقب کو عناصرِ خمسہ کر دیا!

اس میں شک نہیں کہ شبلی سے پہلے اُردو کے عناصرِ اربعہ سرسید، نذیر احمد، آزاد اور حالی اپنی اپنی طرزِ خاص کے موجد ہوئے، جنھوں نے قصرِ اُردو کی بنیادوں کو اٹھانے اور اس کو بلند کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں اور اُردو ادب کے معماروں میں بہت بلند مقام حاصل کیا۔ شبلی نے اپنے پیشروؤں کی طرح اپنی خاص طرز ایجاد کرنے کی بجائے سرسید اور حالی کی سادگی نذیر احمد کے روزمرہ اور آزاد کی شوخی کے امتزاج سے اور ہر عنصر کو اعتدال کے ساتھ کام میں لیکر ایک ایسی طرزِ انشاء کو رواج دیا جو بہ یک وقت ادبی خیالات کے اظہار کے لئے موزوں تھی تو ساتھ ہی سنجیدہ اور علمی مضامین کو ادا کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنے عزیز دوست کی انشاپردازی کی تعریف کرتے ہوئے شبلی نے جو فقرہ لکھا تھا کہ "آزاد اور نذیر احمد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے" وہ بالکل ان پر صادق آتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے اس زبان کو جو اُن کے پیش رو اور ہمعصر انشاپرداز استعمال کرتے تھے اور جس کا تعلق دہلی یا لکھنؤ کے روزمرہ اور محاورات سے تھا۔ جمع کر دیا اور دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو ملا کر ایسا اسلوب رائج کیا کہ جو آج تک علمی و ادبی تحریروں کے لئے نہایت موزوں اور کارآمد ہے۔ اور یہ بجائے خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو معمارانِ ادب پر شبلی کو ممتاز کرتا ہے،

اگر بہترین موضوعات پر بلند پایہ علمی و ادبی تصانیف کسی کی فضیلت علمی اور کمال ادبی کا معیار ہو سکتی ہیں تو اس میں شبلی سے بڑھ کر اور کون خوش نصیب ہو سکتا ہے جس کے پرزور قلم سے ادب، شاعری، تنقید، فلسفہ و کلام، سیر و تاریخ جیسے اہم مگر دشوار گزار موضوعات پر متعدد ضخیم مجلدات نکل چکے ہیں جن کو اُردو کے ذخیرۂ ادبیات میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

(ایسے دقیق اور تحقیقی موضوعات پر ان کی شگفتہ ادبی قلمکاریاں اور سلجھا ہوا طرز بیان ادب اردو کا ایک ایسا دلکش اعجاز ہے جو ایک مخالف سے بھی خراجِ ستائش حاصل کرکے رہتا ہے)

ہر مصنف کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے اور اس کو ایک خاص اسلوب نگارش اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو پیرایۂ بیان ادب اور شاعری کے لئے مخصوص ہوتا ہے وہ فلسفہ یا تاریخ میں کارآمد نہیں ہوتا، شاعرانہ اور ادیبانہ طرز انشا مذہبی یا کلامی مباحث کے لئے موزوں نہیں ہوتا، لیکن شبلی کے قلم کا یہ امتیازی وصف ہے کہ وہ اپنی جامعیت اور ہمہ گیری سے مناسبت کے ساتھ اپنی فصاحت و بلاغت کو برقرار رکھتا ہے، اور ہر جگہ اپنی موزونیت کی شان دکھاتا ہے۔ جس قلم نے المامون اور الفاروق میں رموز مملکت داری کا انکشاف کیا اور آئینِ جہاں بانی کی تشریح کی، اسی نے سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبیؐ میں تشریعی احکام اور فقہی مسائل کی بحث و تمحیص کے ساتھ ساتھ احادیث و روایات کی جرح و تعدیل کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جس قلم نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں ارتقائے شعری اور تنقید ادبی کی فصاحت اور موشگافیوں میں اپنا زورِ بیان صرف کیا، اسی نے الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم میں فلسفہ، تصوف اور علم الکلام کے ادق مسائل کو دلچسپ اور قابلِ فہم انداز میں پیش کیا۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو شبلی سے پہلے اور بعد میں بھی کسی کے ہاں نہیں پائی جاتیں،

شبلی کے مسلم الثبوت انشاپرداز ہونے کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں، اور ان کا شدید سے شدید مخالف بھی یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ انہیں ان عناصرِ خمسہ یا معمارانِ ادب اردو کی صف میں سے خارج کرسکے۔ ان کی شگفتہ تحریریں، سنجیدہ اور متین، مگر پُرزور اور پرکار اسلوب، عالمانہ طرزِ بیان، اور نقادانہ شان اردو ادب کی جان ہیں جنھوں نے اردو نثر نگاری کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ ادب ہو یا تنقید، سیرۃ ہو یا تاریخ جس فن پر انھوں نے قلم اٹھایا، اس میں ایک مجتہدانہ شان پیدا کردی، حتیٰ کہ اردو نظم میں بھی انھوں نے اپنے لئے ایک انوکھی راہ نکال لی۔ غالب کی گہرائی، سرسید کی ژرف نگاہی، نذیر احمد کی عربیت اور روزمرہ، اور آزاد کی رنگین بیانی، کا اجتماع اگر دیکھنا چاہیں تو وہ شبلی کی تحریروں میں نظر آئے گا۔ اس مجتہدِ ادب کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ یقیناً اپنے پیش رؤں سے زیادہ وسیع، ہمہ گیر، اور مختلف موضوعات کا جامع ہے۔ ان کی یہی جامعیت جہاں ان کی علمی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے، وہاں ان کی خالص ادبیت کو بھی بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ اور اسی ادبیت نے شبلی کو ادب اردو میں وہ بلند ترین مقام بخشا ہے جہاں تک پہنچنا ادبی کمال یا کمالِ ادب کی آخری معراج ہے۔

شبلی نے اپنی تصانیف کے لئے مختلف اور متعدد موضوع اختیار کئے۔ سیرت اور سوانح، فلسفہ و کلام، تاریخ، سفرنامہ، ادبیات، تنقید، مقالات، مکاتیب، نظم، ہر ایک موضوع سے ایک خاص مضمون انتخاب کیا۔ انھوں نے ان موضوعات پر مجتہدانہ قلم اٹھایا اور جو کچھ لکھا اس میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ زبان کی ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی علمی و ادبی نکتہ سنجیوں کے پہلو بہ پہلو ان کا زورِ کلام اور اندازِ بیان دلچسپ ہونے کے علاوہ ہر علمی مسئلہ کے نازک اور نادر پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی تحریروں کا مدلل اور عقلی پیرایہ نہایت درجہ دلنشین اور اطمینان بخش ہے اور وہ سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی کی زندگی میں اور بعد کو بھی ان کی تصانیف اور خیالات پر بہت کچھ لے دے ہوئی، اعتراضات کئے گئے اور تردید میں مضامین بھی لکھے گئے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی تصنیفی قابلیت اور رتبۂ انشاپردازی سے کسی نے انکار نہیں کیا۔

علامہ شبلی کا طرزِ تحریر اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ وہ صحیح مذاق اور لطیف طبیعت رکھتے تھے، وہ اپنی لطافتِ خیال، دقتِ نظر، اور قوتِ استدلال سے اپنی تحریر میں ایک شانِ دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں، جملوں کا دروبست، الفاظ کا انتخاب اور عبارت کا حسنِ تناسب ان کے طرزِ انشا میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں، ان کی ہر تحریر میں ان کا حسنِ نظر اور ذوقِ سلیم نمایاں ہے۔ زبان کی پاکیزگی اور شگفتگی اس پر مستزاد ہے۔ اس کے متعلق سرسید جیسے اردو ادب کے معمارِ اعظم نے "المامون" کے دیباچے میں لکھا ہے:- "ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

علامہ شبلی کو زبان اور محاورات کے امتیازات و خصوصیات کا اتنا پاس تھا کہ انھوں نے اپنی کسی تحریر میں کوئی عامیانہ اور سوقیانہ لفظ یا محاورہ نہیں استعمال کیا۔ وہ خود بھی اس پر شدت سے عمل پیرا تھے اور دوسروں کو بھی اس پر ٹوکتے رہتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" شائع ہوئی تو شبلی نے اس پر تبصرہ لکھا جو اس زمانہ میں پنجاب ریویو میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے زبان کی تعریف کرتے ہوئے دو سوقیانہ محاورں "انگوٹھا دکھا کر" اور "اڑنگے پر چڑھا کر" کے متعلق لکھا تھا کہ یہ آیندہ ایڈیشن میں نکال دیئے جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان میں علمی وقار اور برجستگی، صفائی اور شستگی قایم کرنے میں شبلی سے بڑھ کر کسی نے کوشش نہیں کی۔

شبلی کے زمانے تک یوں تو علم و ادب کا معتد بہ ذخیرہ اردو میں منتقل ہو چکا تھا، لیکن وہ یا تو ترجموں کی صورت میں تھا، یا پھر خشک علمی مباحث پر چند کتابوں، دینیات اور مناظرہ، سیر و سوانح پر بعض تصانیف، اور زیادہ تر شعر و نظم اور افسانوں پر مشتمل تھا۔ سنجیدہ ادب، تاریخ، تنقید، فلسفہ و کلام، وغیرہ موضوعات پر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اردو ادب پر شبلی کا یہ زبردست احسان ہے کہ انھوں نے ان میں سے تقریباً ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور اس مجتہدانہ شان اور عالمانہ و محققانہ انداز میں لکھیں کہ اردو ادب کے ذخیرے میں ان سے بہتر کتابیں نہیں مل سکتیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ شبلی جو کچھ لکھ گئے ہیں ان پر اب تک کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہو سکا اور باوجودیکہ ان کی بعض تصانیف کی اشاعت کو ۵۰ سال سے زاید عرصہ ہو چکا ہے لیکن اب تک اس پایہ کی کوئی تصنیف نظر نہیں آتی۔ خصوصاً ان کی تصانیف میں الکلام، موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم اپنا جواب نہیں رکھتیں بلکہ اپنی بلند ادبیت اور اعلیٰ تنقید کے اعتبار سے دنیا کی بہترین علمی و ادبی تصانیف میں شمار ہونے کے لایق ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی، موضوعات پر شبلی کے محققانہ مضامین اور مقالات کی آٹھ جلدیں اردو ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔

شبلی کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کے سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ وہ غالبؔ کے اندازِ تحریر سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ خصوصاً یہ طرزِ تحریر ان کے مکاتیب میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ مکاتیبِ شبلی کی دو ضخیم جلدیں اور خطوطِ شبلی اس امر کے شاہدِ عادل ہیں۔ اسی بنا پر اردو کے ایک بلند پایہ انشا پرداز مہدی حسن اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شبلی کی "اردوئے خاصہ" کو اپنے خاص اندازِ بیان میں اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:-

"غالبؔ زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوئے خاصہ" کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لایق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں

سے آنکھیں ملا سکتی ہے"۔

نثر کی طرح نظم میں بھی مولانا نے اپنی امتیازی شان قایم رکھی ہے، اور اس میں نئی طرز نکالی ہے۔ ابتدا میں اگرچہ اُنھوں نے پامال کوچۂ غزل اختیار کیا تھا لیکن بہت جلد اس کو ترک کر دیا۔ نظموں میں مولانا حالیؔ کا رنگ جم چکا تھا اور ان کے مسدس نے تمام دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ اس لئے مولانا صرف ایک "قومی مسدس" اور ایک مثنوی "صبح اُمید" لکھ کر رہ گئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی انھوں نے بعض قومی نظمیں اور اشعار کہے ہیں، لیکن ان کی شاعری کا دور صحیح معنوں میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ انھوں نے "کشاف قیات" کے نام سے سیاسی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ یہ نظمیں اکثر رسائل و اخبارات خصوصاً "الہلال" میں شائع ہوتی اور ملک سے خراج تحسین وصول کرتی رہیں اس رنگ میں لکھنے والے شبلیؔ پہلے شخص ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ اسلام کے بعض واقعات پر نظمیں لکھیں جو نہایت دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ سیاسی رنگ میں ان کے مطائباتِ نظم خاص چیز ہیں۔ بعض سیاسی نظموں کا لہجہ اس قدر تیز و تند تھا کہ وہ قابلِ ضبطی سمجھی گئیں۔ "عدل جہانگیری" کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے وہ بہت مقبول ہوئی۔ اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں اس کا نظم و نثر میں ترجمہ کیا گیا۔ غرض کہ اُردو شاعری میں بھی اُنھوں نے اپنے لئے ایک نئی شاہراہ نکالی اور اس خاص صنفِ سخن میں ان کے کمال کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُردو اشعار کو ترنم سے پڑھنے کا طریقہ سب سے پہلے مولانا شبلیؔ نے نکالا جس کی آج تک تقلید ہو رہی ہے۔

## آخری کارنامہ

آخر میں ہم مولانا شبلیؔ کی اس قابل یادگار دینی، علمی و ادبی خدمت کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے جس پر ان کا خاتمہ بالخیر ہوگیا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ــــ مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم ــــ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرۃ پاک پر یوں تو اُردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سرسید کی خطبات احمدیہ اور مولوی سلیمان صاحب منصور پوری کی رحمۃ للعالمین خاص اہمیت رکھتی ہیں، لیکن شبلیؔ اس کام کو بہت وسیع پیمانے پر انجام دینا چاہتے تھے جس کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے۔ تاہم سیرۃ کی یہ دو نامکمل جلدیں بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے نیز زبان اور طرز انشا کے اعتبار سے اُردو ادب کے ذخیرہ میں نہایت گراں قدر تحقیق و تنقید سے قطع نظر، جس والہانہ عقیدت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا اندازہ اس عبارت سے ہوتا ہے جو "ظہور قدسی" کے عنوان سے ولادت باسعادت کے بیان میں پائی جاتی ہے اور جو شبلیؔ کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے:۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے

انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازیِ مسیح سب اسی لیے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارز شہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔ آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں، بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بتکدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔ یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحَابِہٖ وَسَلِّمْ۔"

(ریڈیو پاکستان کراچی کے شکریہ کے ساتھ)

ماہر القادری

# گمراہی

## شعر و ادب کے نام پر

"علم" لکھنے پڑھنے کو نہیں "جاننے" کو کہتے ہیں، اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص نے ایک حرف بھی لکھا پڑھا نہ ہو مگر حقایقِ اشیاء کا وہ علم رکھتا ہو، اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ کہ ایک شخص دفتر کے دفتر کھنگال کر بھی جاہل رہ سکتا ہے۔ اصل چیز نوشت و خواند، کتابیں اور تحریریں نہیں بلکہ "جاننا" ہے، جو جتنا زیادہ جانتا ہے، اتنا ہی بڑا عالم ہے چاہے وہ ابجد شناس بھی نہ ہو، اور جو شخص نہیں جانتا وہ "جاہل ہے" خواہ کتب خانہ کے کتب خانے اُس کے دماغ میں محفوظ کیوں نہ ہو۔

جب آدمی کسی چیز کو جان لیتا ہے تو اُس چیز کی مضرت سے بچنا اور اُس کی منفعت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے، یہ انسان کی جبلت ہے، فطرت ہے اور سرشت ہے، مثلاً آگ کا ہم "علم" رکھتے ہیں، اسی بناپر آگ سے تاپتے ہیں، اُس سے کھانا پکاتے ہیں، پانی گرم کرتے اور اسی طرح کے دوسرے مفید کام لیتے ہیں، مگر آگ میں ہاتھ نہیں ڈال دیتے،۔ "جلبِ منفعت" اور "دفعِ مضرت" حقایقِ اشیاء کے علم و معرفت کا نتیجہ یقیناً ہونا چاہئیے۔

روپیہ پیسہ اور مال و اسباب کے فایدے ہی کو "منفعت" نہیں کہتے، زندگی میں سیرت و کردار اور اخلاق و تہذیب کی اچھائی اور بُرائی پر سود و زیاں کا بہت کچھ دار و مدار ہے، بداخلاقی زندگی کا بہت بڑا نقصان ہے، جہاں نیکوکاری اور پاکیزگی نہیں وہاں زیاں ہی زیاں اور مضرت ہی مضرت ہے۔

دوسروں کو ستانا، اُن کی بُرائی چاہنا، اُن کو تکلیف دینا بھی یقیناً "ظلم" ہے مگر جو شخص برائیوں میں مبتلا ہے، وہ خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور ایسے شخص کو تہذیب و اخلاق کی زبان میں "ظالم" ہی کہتے ہیں ——— خوب کہا نطشہ المانوی نے:-

"تم نے جو میرے ساتھ بُرائی کی ہے، اُسے میں تو معاف کردوں گا، مگر اپنے ساتھ جو بُرائی کی ہے اُسے کون معاف کرے گا ... ... ..."

تاریخ اخلاق میں جسے "دورِ جاہلیت" کہا جاتا ہے، اُس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اُس زمانہ کے لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، بلکہ اُس کی وجہ ہے سیرت و کردار کی پاکیزگی اور اخلاق کی اچھائی سے بے خبری!

اسی لیے ہم بھی "جاہلانہ ادب" اُس لٹریچر کو کہتے ہیں جو انسانوں کو بُرائیوں پر اُبھارتا ہے، جس سے سفلی جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور جو اپنے پڑھنے اور سننے والے میں جذبۂ ہوس کاری کو بھڑکاتا ہے!

"جاہلانہ ادب" میں شعر و افسانہ ہے، تنقیدیں ہیں، قصاید و قطعات میں بڑی بڑی کتابیں ہیں ——— مگر اس کے باوجود وہاں "جہالت" اور "بے خبری" ہے! اگر جاہلی ادیبوں اور شاعروں کو اچھائی بُرائی نیکوکاری اور بدکاری کا علم ہوتا اس انداز پر نہ تو وہ سوچتے اور نہ اُس کا اظہار کرتے۔

جاہلانہ ادب میں (جس میں شاعری کا عنصر غالب ہے) "جوانی" پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، یہ موضوع جاہلانہ ادب کا سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب موضوع ہے، جاہلی شاعر جب "شباب" کا ذکر کرتا ہے تو پھر وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا، اور اخلاق و پاکیزگی کی تمام حدوں کو پھلانگتا اور توڑتا چلا جاتا ہے۔

"جوانی" انسانی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی دور ہے، اس زمانہ میں عزایم جوان ہوتے ہیں، حوصلوں میں طوفانی جوش اور ارادوں میں قیامت کی حرکت پائی جاتی ہے گرم خون، بڑھنے اور پھیلنے کی آرزوئیں، زندہ اُمنگیں ——— یہ عالم کہ ٹھوکر مارو تو زمین سے پانی کے چشمے اُبلنے لگیں۔

بچپن میں تو شعور، احساس کے مقابلہ میں زیادہ تر بے خبری رہتی ہے، بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور غالب کے بقول عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا، کام کرنے اور توانائیوں کو بروئے کار لانے کا زمانہ تو یہی "دورِ شباب" ہے!

جوانی میں شدید احتیاط اور احتساب کی ضرورت ہے، یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اُسے ہنس کھیل کر گزار دیا جائے، زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی اور کام کا یہی دور ہے، یہاں ایک نفس کی بھی بہت کچھ قیمت ہے، جس کسی نے جوانی کی قدر نہ پہچانی اُس نے اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھوں تباہ کر لیا، اُس نے اپنی زندگی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں، بڑھاپے میں جاکر سنبھل بھی گئے تو جوانی کی لغزشوں کی پُوری پُوری تلافی کہاں ہو سکتی ہے، ضعیفی کا ایک سال، جوانی کے ایک دن کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔

ادیبوں اور شاعروں کا فرض تھا کہ وہ نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ پاکباز اور فعّال (active) بننے کی ترغیب دیتے، ان سے کہتے کہ دیکھنا! اس آتشیں دور میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، جوانی میں آدمی سچ مچ شعلوں سے کھیلتا ہے، تم اپنے دامن کو بچائے رکھنا ——— اور ہاں! جوانی، طاقت اور مردمی، جذبات میں بہہ جانے کا نام نہیں ہے، یہ تو کمزوری ہے، گراوٹ فرمائی اور کم ظرفی ہے! جذبات پر غلبہ پالینا، اصل طاقت ہے، موجوں کے دھاروں پر تو ہر کوئی بہہ سکتا ہے، طاقت اور جواں مردی تو یہ ہے کہ موجوں کا رُخ بدل دیا جائے۔

مگر جاہلانہ ادب میں "جوانی" کو انتہائی شرمناک انداز میں پیش کیا گیا ہے ——— "جوانی دِوانی" ان ادیبوں کی ہی تراشی ہوئی ضرب المثل اور گھڑی ہوئی کہاوت ہے، مقصد یہ ہے کہ جس طرح دیوانہ پر اُس کے افعال کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی، اور بے اعتدالی دیوانگی کی صفت ہے، اسی طرح جوان آدمی کو غیر محتاط اور بے اعتدال ہونا ہی چاہئے۔ جوان آدمی سے لغزشوں کا صدور، ضروری ہے، جس جوانی میں یہ ہنگامے نہ ہوں وہ جوانی نہیں بلکہ جوانی کی توہین ہے۔

پھر کہا گیا کہ لطف کرنے، مزے اڑانے اور لذت لینے کا یہی جوانی کا زمانہ ہے، اس لئے عیش میں نہاؤ، لذتوں میں ڈوب جاؤ اور سرمستیوں میں کھو جاؤ، یہ دن پھر لوٹ کر نہیں آنے کے ——— اور "آخرت"..... تو ہاں! اس کا خیال بھی ضروری ہے، تو یہ بھی کر لینا، ابھی بہت کچھ عمر پڑی ہوئی ہے، اس لئے کہ:-

کم بخت! قیامت ابھی آئی نہیں جاتی ———

ہائے! وہ کم نصیب اور بے ذوق بیچاری جوانی، جس میں چٹخارے اور عیش سامانیاں نہ ہوں، جس نے جوانی میں کھل نہ کھیلے اور گلچھرے نہ اڑائے، اُس نے آہ! کچھ نہ کیا، اُس نے بیکار عمر گنوائی ——— جوانی میں کیا چاہیئے؟ شراب، شباب، نغمہ، رنگ رلیاں، قہقہے، چہچہے ——— اور ہاں! رُسوائی بھی! جوانی ننگ و نام کی پروا نہیں کرتی، شباب میں کسی کی نصیحت سُننی ہی نہیں چاہیئے، یہ شباب کی توہین ہے، اس حمام میں تو ہر کسی کو ننگا ہونا پڑتا ہے۔

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

جوانی ہر قید کو توڑ دیتی ہے، وہ کسی ضابطہ کی پابند ہو کر کب رہ سکتی ہے، طوفان میں تناور درخت اور اونچے اونچے ٹیلے تک خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں، یہی جوانی کا حال ہے۔

## خوفناک نتائج

جاہلانہ ادب کی یہ ترغیبات لازمی طور پر نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کرتی ہیں، اور یہ کوئی سُنی سُنائی بات نہیں، "آپ بیتی" ہے، یہ تجربہ کی ہوئی اور آزمائی ہوئی حقیقت ہے، یہ جو نوجوانوں میں عام طور پر بے راہ روی پائی جاتی ہے، اُس میں اسی جاہلانہ ادب کا بہت کچھ ہاتھ ہے!

اس قسم کا شعر و ادب، جوان آدمیوں کے دل میں یہ بات اتار دیتا ہے کہ "عاشقی" جوانی کی رُوحِ رواں اور لازمۂ شباب ہے، اس لئے نوجوان ڈھونڈھ کر اور کوشش کر کے کوئی "مرکزِ خیال" پیدا کرتے ہیں، نظارہ بازیاں، نامہ و پیغام اور چھیڑ چھاڑ نہ ہو، تو وہ اپنی جوانی کو بے کیف اور اپنی زندگی کو سونی اور ویران سمجھتے ہیں، "شعر و ادب" میں نامہ و پیام بھیجنے، آنکھیں لڑانے، چھیڑ چھاڑ کرنے اور دل لگانے کے تمام گُر اور طریقے موجود ہیں، اُن کو پڑھ کر آدمی سب کچھ سیکھ جاتا ہے، ہوش سنبھالتے ہی حسینوں پر مرنے اور جان دینے کی رسم عام ہو گئی۔

اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں بھی اس قسم کا شعر و ادب داخل ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی، جاہلانہ ادب کی تعلیم، ہوس انگیز شاعری کا درس! نہ پوچھئے کہ پھر کیا کیا ہوتا ہے —— آہ! "علم" کے نام پر یہ "جہالت" کی ترویج! اور تہذیب و تمدن کی آڑ میں ہوس کاریوں کے یہ خونیں ڈرامے!

جوانی کی تنہائیوں میں یہ جاہلانہ ادب اور زیادہ نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت ہوتا ہے، خیال کی دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے، آدمی چاہے منہ سے کچھ نہ کہے مگر خالی "آغوش" کچھ اور تقاضا کرتی ہے!

کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کے کورس کی کتابیں پکڑی گئی ہیں، جن میں اس قسم کے شعروں پر:—

مار ڈالا اک نگاہِ ناز سے
ہاں! مری جاں پھر اُسی انداز سے

نشانات ( ۴۴ —— * —— رر —— V. good ) لگے ہوئے ملے ہیں اور کتابوں اور کاپیوں پر اسی انداز کے عاشقانہ اور ہوس کارانہ اشعار لکھے ہوئے پائے گئے ہیں۔

آدمی کو جب کوئی شعر پسند آتا ہے اور اُس کے مضمون اور خیال سے دلچسپی ہوتی ہے؟ جبھی تو اُسے بار بار دُہراتا ہے! اور یہ بھی نفس کا بہت بڑا فریب ہے کہ شعر سے دلچسپی صرف اُس کی شعریت اور لفظ و بیان کی خوبی کے سبب ہے اس میں "صرف" غلط ہے! "شعریت" یقیناً دلچسپی اور پسندیدگی کا باعث ہوتی ہے مگر تنہا شعریت نہیں! اُس میں نفس کی لذت کا بھی ہاتھ ہوتا ہے دلچسپی کا اصل سبب ہے شعر کا بنیادی خیال اور مرکزی تصور!

اب کوئی یہ کہے کہ ہر مجاز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، اور "زلف و رخسار" "وصل و اختلاط" تو صرف استعارے ہیں، ان شعروں اور افسانوں سے بلند اور پاکیزہ حقیقت کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، ہم ہر آدمی کو لُچا، بدمعاش اور آوارہ کیوں سمجھیں!

جی ہاں! "ہر مجاز کی ایک حقیقت ہوتی ہے" بجا ارشاد ہوا، مگر کیا یہ تمام نوجوان لڑکے اور لڑکیاں

واقعی "وحدت الوجودی" "حق نگر" "حقیقت بیں" اور "حق آگاہ" ہوتی ہیں ——— آتش خانوں اور خس خانوں کو یکجا کر کے آپ مطمئن ہیں کہ خس خانے یہ سمجھ لیں کہ آگ کے یہ شعلے "نور کے دھارے ہیں" اور بس یہ سمجھ لینے سے وہ جلنے سے بچ جائیں گے، یہ غلط اندیشی ہے اور نادانی بھی!

جاہلانہ ادب سب سے پہلے "جوانی" پر اپنی کمند ڈالتا ہے کہ یہ بھولا شکار آسانی سے پھنس جائے گا، جوانی میں جذبات بہت زیادہ گرم ہوتے ہیں اس لئے وہ جان کر اس آگ کو ہوا دیتا ہے!

آج عام طور پر جس لٹریچر کی مانگ اور گرم بازاری ہے وہ "جاہلانہ لٹریچر" ہے، اس ادب کو پڑھ کر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کے علم میں اضافہ ہو رہا ہے، بلکہ اس طرح اُن کی جہالت بڑھ رہی ہے، وہ جہالت جس کے پاس قلم و کاغذ اور کتابیں ناپید تھیں، اس جہالت سے جس کی پشت پر کتب خانے ہیں، کم خطرناک تھی ———"

---

آقا محمد رمضانی ترجمہ:- ضیاء الدین احمد برنی

# مطائبات

## (ملّا نصر الدین کے منتخب لطیفے)

ملّا حاکم کے پاس گیا اور کہا کہ میں حج کا ارادہ رکھتا ہوں، اُس نے کہا خیال تو اچھا ہے، ملّا نے جواب دیا، مشکل یہ آن پڑی ہے کہ میرے پاس روپیہ بالکل نہیں ہے، حاکم نے کہا "اگر تیرے پاس روپیہ نہیں ہے، تو حج بھی تجھ پر فرض نہیں ہے" ملّا نے جواب دیا میں آپ سے روپیہ لینے آیا ہوں نہ کہ فتویٰ پوچھنے!

---

ایک دفعہ جنگل میں کچھ لوگوں کو قطب نما ملا، دوڑے ہوئے ملّا کے پاس آئے اور کہا کہ بوجھئے یہ کیا چیز ہے؟ ملّا نے دیکھتے ہی ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا اور پھر ہنسنے بھی لگا، لوگوں نے پوچھا رونے اور ہنسنے کی کیا وجہ ہے؟ جواب دیا میرے رونے کی وجہ تو یہ ہے کہ تم کس قدر بیوقوف ہو کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ ذرا سی چیز کیا ہے اور ہنسا اس لئے تھا کہ باوجود غور کرنے کے خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا یہ کیا چیز ہے؟

---

ایک رات ملّا نے اپنی بیوی کو نیند سے جگا کر کہا کہ میری عینک فوراً لادو، بیوی عینک لائی اور پوچھا، اس وقت آپ کو عینک کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ ملّا نے جواب دیا:- میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہا تھا لیکن اس کے بعض مقامات ذرا اندھیرے میں تھے، اور صاف صاف دکھائی نہیں دیتے تھے، اس لیے میں نے چاہا کہ عینک لگا کر اُن تمام چیزوں کو اچھی طرح دیکھ لوں۔

---

ملّا اپنے دوست کے یہاں گیا، اس نے ملّا کی خدمت میں انگور پیش کیے، ملّا نے خوشہ اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا، دوست نے کہا کہ عقلا کہہ گیے ہیں، انگوروں کو دانہ دانہ کھانا چاہیئے، ملّا نے جواب دیا کہ عقلا نے یہ بات انگور کے متعلق نہیں سیب کے بارے میں کہی ہے۔

---

ملّا سے لوگوں نے پوچھا کہ عربی میں ٹھنڈے شوربے کو کیا کہتے ہیں؟ ملّا نے ہر چند سوچا مگر کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آیا، کہا عرب لوگ شوربے کو ٹھنڈا ہونے نہیں دیتے گرم گرم ہی پی جاتے ہیں۔

---

ایک دن ملّا وضو کر رہا تھا کہ بایاں پاؤں دھونے سے پہلے ہی پانی ختم ہو گیا، ملّا نے اُلٹا پاؤں اُٹھا کے نماز ادا کی، لوگوں نے پوچھا! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ جواب دیا! بائیں پاؤں کا وضو نہ تھا۔

---

ایک دن ملّا نے اپنی بیوی سے کہا:- پنیر لا، اس لئے کہ پنیر معدے کو قوت دیتا اور بھوک بڑھاتا ہے، بیوی نے کہا:- گھر میں پنیر نہیں ہے، کہا:- بہتر، اس لیئے کہ پنیر معدہ کو فاسد کرتا ہے اور دانتوں کی جڑوں کو کمزور کرتا ہے، اس کی بیوی نے کہا:- تمھاری پہلی بات صحیح ہے یا دوسری کہا اگر پنیر موجود ہے تو پہلی ورنہ دوسری۔

امیر مینائی

# خدا کے حضور میں

بہ ہر جا کہ نور یست از نورِ اوست — بہ ہر سو کہ بہ رقے است از طورِ اوست
اوسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف — ہزاروں نشاں ہیں ہزاروں طرف
وہ اول کہ جس کی نہیں حد کہیں — وہ آخر کہیں جس کا آخر نہیں
جہاں پرتوِ روئے جانانہ ہے — یہ محفل نہیں آئینہ خانہ ہے
اوسی ایک نے سب کو پیدا کیا — یہ سب کارخانہ ہویدا کیا
جدھر دیکھیے محفل آراستہ — جدھر جائیے بزم پیراستہ
نمونے یہ سب اُس کی صنعت کے ہیں — تماشے یہ سب اس کی قدرت کے ہیں
عجب کارفرما، عجب کارساز — عجب میر مجلس ہے مہماں نواز
تماشا چمن میں یہی کم نہیں — کہ خشک آتشِ گل پہ شبنم نہیں
نہالوں کو ایسا سرِ معرفت — کہ ہے ہر ورق دفترِ معرفت
ریاحیں ہوں یا نخل ولیل و نہار — اوسی سے ہیں رحمت کے اُمیدوار
اُسی کا ہے جلوہ سما تا سمک — اُسی کا ہے پرتو زمیں تا فلک
کہاں اُس کا جلوہ نمایاں نہیں — نظر ہو تو آنکھوں سے پنہاں نہیں
گدا پر اگر ہو کرم کی نگاہ — ابھی ہفت کشور کا ہو بادشاہ
وہ چاہے تو ہر ذرّہ خورشید ہو — سفالِ گدا، جامِ جمشید ہو
عنایت ہے بندوں پہ بے انتہا — کہ ماں باپ سے مہرباں ہے سوا
جھڑی ابرِ لطف و عنایت کی ہے — نظر ذرّے ذرّے پہ رحمت کی ہے
پیمبر مقرر کیے شہر شہر — کہ ہو رنگِ ایماں سے گلزار دہر

خصوصاً جنابِ رسولؐ خدا
محمدؐ کہ ہیں خاتم الانبیا

(غیر مطبوعہ)

عبدالمجید حیرت

# آئینہ حیرت

دل بھی ہے ہلاکِ غم، جگر بھی
یہ چوٹ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

جس طرح ہوئی ہے صبح سے شام
ہو جائے گی شام سے سحر بھی

پوچھے گا نہ کوئی کیا کسی کو
دیکھے گا نہ کوئی کیا ادھر بھی

کیا چین نہیں ملے گا دل کو
اک عمرِ وفا گزار کر بھی

تقدیر کی بات ہے وگرنہ
تھی چشمِ کرم کبھی ادھر بھی

ہرچند کہ بے وفا ہے دُنیا
دُنیا سے نہیں مگر مفر بھی

انکار تو خیر، ذکر سے سے
اچھا نہیں اس قدر حذر بھی

آغاز ہی معتبر نہیں ہے
رکھئے گا نظر مآل پر بھی

کچھ بات تو ہے کہ دل نہیں خوش
گلشن میں بہار دیکھ کر بھی

برسے گا کبھی تو ابرِ رحمت
حیرت سے گناہگار پر بھی

---

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اُس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

(نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج)

شوقؔ کھنڈوی

# نوائے شوق

جفا قبول کروں گا ستم سے کھیلوں گا ۔۔۔ تری خوشی جو یہی ہے تو غم سے کھیلوں گا
تری بلا سے بھٹک جائے قافلہ دل کا ۔۔۔ رہِ حیات کے ہر پیچ و خم سے کھیلوں گا
خدا کرے تری پھولوں میں زندگی گزرے ۔۔۔ تمام عمر میں خارِ الم سے کھیلوں گا

---

غمِ حیات کے پہلو بدل بھی سکتے ہیں ۔۔۔ جو بجھ گیے ہیں دیے پھر وہ جل بھی سکتے ہیں
شکر فروشِ تبسم کے اک اشارے پر ۔۔۔ ہمارے اشک تبسّم میں ڈھل بھی سکتے ہیں
مری خوشی تجھے منظور ہی نہیں ورنہ ۔۔۔ چُبھے ہیں دل میں جو کانٹے نکل بھی سکتے ہیں

---

تباہی اور پھر ایسی تباہی ۔۔۔ ضمیرِ آدمیت خوں چکاں ہے
ہوئی ہے صبح پر کوئی بتائے ۔۔۔ اُجالے کا کہیں نام و نشاں ہے
شفق نکلی ہے مُنہ پر خون مل کر ۔۔۔ ہمارے غم کی شاید رازداں ہے
جسے حاصل نہیں خود اعتمادی ۔۔۔ اُسے اندیشۂ سود و زیاں ہے

نکالے جا رہے ہیں دل کے کانٹے
غزل کی لے میں فریاد و فغاں ہے

---

کوئی آندھی کو دے آواز، بجلی کو خبر کر دے ۔۔۔ کہ پھر گلشن میں رکھ دی ہے بنائے آشیاں میں نے

میں مجبورِ محبت ہر ستم پر مسکراتا ہوں
بدل ڈالا ہے خود ہی شوقؔ اندازِ فغاں میں نے

نظر سہوری

# .... اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

اُلفت کا مرض ہے جاں پرور، زائل غمِ پنہاں کیا ہوگا
جو دردِ حیاتِ رُوح ہے، اُس درد کا درماں کیا ہوگا
دامانِ گُلِ تر پر ہے نظر، اور سوچ رہے ہیں دیوانے
اس پنجۂ وحشت کے ہاتھوں انجام گریباں کیا ہوگا
کشتی تر جائے یا ڈوبے، دریا میں سکوں ہو یا طوفاں
اللہ نگہباں ہے اے دل! ملاّح نگہباں کیا ہوگا
انساں اور دورِ حاضر کا، فطرت بھی ہے جس پر شرمندہ
اب دیکھنا یہ ہے آئندہ تخلیق کا عنواں کیا ہوگا
اربابِ جنوں کی باتوں پر کیوں اہلِ خرد ہنستے ہیں نظر
ساحل ہی پہ رہنے والوں کو اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

---

طرفہ قریشی

# .... نے محسوس کر کے کہا:-

جوانی کی تمنا کچھ بہ آسانی نہیں نکلی
قیامت کا سہارا لیکر اُٹھی جب کہیں نکلی
یہ لب بستہ تبسّم، یہ تکلّم ساز خودداری
تری تصویر بھی تیری طرح ناز آفریں نکلی

---

عشق کو چاہیے رکھ دے وہیں بنیادِ حرم
جس جگہ بھی ترا نقشِ کفِ پا مل جائے
شکوۂ چارہ گرِ غم ہے جہاں میں بے سُود
درد لیکر کوئی اُٹھے تو دوا مل جائے
جستجو اپنی ہی دنیا میں ہے عینِ مقصود
ڈھونڈا اپنے کو تو اتنا کہ خدا مل جائے

ماہر القادری

# ذبحِ عظیم

زندگی ہے سرفروشی اور قربانی کا نام
کاش! اس کو جان سکتے عیدگاہوں کے امام

دل میں ایماں کی حرارت ہے نہ ذوقِ بندگی
صرف لفظوں کے پجاری صرف رسموں کے غلام

کتنے بے گھر لوگ سایہ کے لیے محتاج ہیں
شکریہ! اے صاحبانِ اقتدار و انتظام

جن کے دن تاریک راتیں اور بھی تاریک تر
جن کی صبحوں کا یہ عالم جیسے ویرانہ کی شام

دل کے چھالے اتنے نازک بھی نہ ہونے چاہئیں
نوکِ نشتر جن کو بادِ صبح گاہی کا خرام

گرمیٔ تکبیر میں شامل ہو گر دل کا خلوص
ایک ہی نعرے میں ہو سکتی ہیں تیغیں بے نیام

میں نے جن ذرّوں کو ٹھکرایا ستارے بن گئے
میں نے جن تاروں کو چاہا ہو گئے ماہِ تمام

میں نے بخشا بے زبانوں کو بھی گویائی کا ذوق
میں نے جسمِ خامشی میں پھونک دی روحِ کلام

زندگی کو ہر گھڑی درکار ہے آشفتگی
کون کہتا ہے کہ دل میں نالۂ خونیں کو تھام

جا رہا ہوں جانبِ کشمیر جانے دو مجھے
چھوڑ دو تم راستہ اے رہبرانِ سست گام

ہر نظر یک آزمایش، ہر نفس قربان گاہ
از زبانِ پورِ ابراہیمؑ بشنو ایں پیام

# کسی کے ساتھ؟

ماہر القادری

ماجد اور رضیہ میں آج خلاف معمول ترش گفتگو ہو رہی تھی، دونوں میاں بیوی اُکھڑی اُکھڑی سی باتیں کر رہے تھے، بات یہاں سے چلی تھی کہ کپڑے کا بھاؤ بازار میں مندا ہو گیا ہے، اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر جلد سے جلد کپڑا خرید لینا چاہیے، ماجد کہتا تھا کہ کپڑے کا بھاؤ ابھی اور کم ہوگا، ایسی جلدی کیا ہے، رضیہ اس پر بولی کہ پچھلے سال بھی آپ نے یہی کہا تھا کہ کپڑے کا نرخ ابھی اور گرنے والا ہے، چند دن انتظار کرنا چاہیے، مگر ایک ہفتہ نہ گزرنے پایا تھا کہ بھاؤ کہیں سے کہیں پہونچ گیا، جو لٹھا سوا روپیہ گز آتا تھا، وہ ڈیڑھ اور پونے دو میں آنے لگا۔

بات بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ اچھی خاصی گرمی گرما پیدا ہو گئی، دونوں اپنی سطح سے نیچے اتر آئے تھے، ماجد کو یہ زعم کہ میں شوہر ہوں، جسے بیوی پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے، میری بات ٹھکرائی نہیں جا سکتی اور رضیہ سمجھتی تھی کہ برابر کا رشتہ ہے، وہ شوہر ہیں تو میں بیوی ہوں، میں آخر دب کر کیوں رہوں، اور یہ جو میاں ذرا ذرا سی بات میں اپنی حکومت جتاتے ہیں، یہ نتیجے میری طرف سے درگزر کا! میں جو اب تک دبتی رہی، ہر بات میں اُنہیں کو برتر سمجھا اور انہیں کی چلتی رہی، اسی کا یہ خمیازہ بھگت رہی ہوں کہ میری سیدھی بات کو بھی وہ اُلٹی سمجھتے ہیں ——— دونوں طرف متضاد جذبے کام کر رہے تھے، اور تضاد کا نتیجہ برہمی اور تصادم ہی ہوا کرتا ہے، ——— اُن کی باتیں

——— عورتوں سے فضول خرچی کے سوا اور آتا ہی کیا ہے، فرمائشوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، یہ لا دو وہ لا دو اور فرمائشیں پوری کرنے کے بعد بھی طعنے سُنو، ناشکری کہیں کی!

——— ان مردوں سے خدا بچائے، عجیب خود غرض مخلوق ہے! بس جو کچھ ہو اُنہیں کے لیے ہو، عورتوں کو تو اُنہوں نے غلام باندی سمجھ رکھا ہے، جیسے کوئی کسی چھوکری کو روٹی کپڑے پر ملازم رکھ لیتا ہے۔

——— میں تمہارے لیے ہر مہینے نئے نئے جوڑے نہیں بنا سکتا، میں تمہارا شوہر ہوں، کارندہ اور نوکر نہیں ہوں، تمہاری فرمائش کو پورا کرنے اور نہ کرنے کا مجھے حق حاصل ہے، سمجھیں، بیگم صاحبہ!

——— اور میں تمہاری بیوی ہوں، کوئی داشتہ نہیں ہوں، تمہارے ساتھ خدا نہ کرے بھاگ نہیں آئی تھی، چار پنچوں میں بیٹھ کر میرا تمہارا رشتہ ہوا ہے، میری ضرورتوں کا پورا کرنا تمہارا فرض ہے۔

——— تمہاری خالہ بھی ایسی ہی زبان دراز تھیں، جبھی تو شوہر کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا۔

——— دیکھو! میرا اور تمہارا معاملہ ہے میرے خاندان کو بیچ میں لانے کی کوشش نہ کرو، میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری بڑی آپا اپنی زبان ہی کی بدولت پانچ سال سے میکہ میں بیٹھی ہیں۔

——— ذرا . . . . . . . زبان . . . . . .

اتنے میں چند عورتیں وہاں آجاتی ہیں، اور میاں بیوی کی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، عورتیں نہ آجاتیں تو یہ بات نہ جانے کہاں تک طول کھینچتی، دونوں کے تیور غضبناک ہوئے جا رہے تھے، برابر کی ٹکر تھی، نہ وہ اس سے کم اور

نہ وہ اُس سے گھٹ کر!

میاں بیوی کی گرماگرمی وقتی ہوتی ہے ۔ وہ جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا، بیوی کی ایک مسکراہٹ تمام شکایتوں کی تلافی کر دیتی ہے اور شوہر کی ذرا سی توجہ سے شکووں کے دفتر آن کی آن میں دُھل جاتے ہیں، بات آئی گئی ہو گئی، دونوں بھول جانا ہی چاہیئے تھا، گھریلو باتوں کا کوئی اثر لیا کرے تو پھر تعلقات کی یہ گاڑی ایک قدم نہیں چل سکتی، اور جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں فریقین کی زندگیاں مستقل عذاب بن کر رہ جاتی ہیں۔

تیسرے دن ماجد اپنے ساتھ رضیہ کو لے کر بازار گیا، کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کے انبار لگے تھے ہر میل کا کپڑا تھا تین گھنٹے تک دونوں میاں بیوی دوکانوں پر کپڑا دیکھتے رہے، پیسہ کی ہانڈی بھی ٹھوک بجا کر لی جاتی ہے اور یہاں تو سیکڑوں روپیہ کا لین دین تھا، ماجد سے زیادہ رضیہ کو کپڑے کی پرکھ تھی، ماجد کو بڑی اُلجھن ہو رہی تھی، وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہاں سے جانا ہو جائے مگر رضیہ کی نگاہِ انتخاب زیادہ سے زیادہ وقت چاہتی تھی، یہ اُس کی آرائش اور زیب و زینت کا مسئلہ تھا، اس میں قوتِ فیصلہ کو سوچنا اور غور کرنا پڑتا تھا کہ فلاں کپڑے کی رنگت زیادہ شوخ تو نہیں ہے، اور یہ پھول فراک میں کیسے لگیں گے؟ آستینوں میں یہ بُندکیاں اچھی دکھائی دیں گی، یا یہ دھاریاں؟ اور ہاں! اب کی میٹھی عید پر جو میرے بھائی کی شادی ہے اُس میں پہننے کے لیے کونسا جوڑا موزوں ہوگا ——— اور شمو آپا اُس دن ریشمین چکن کا جو کرتہ پہن کر آئی تھیں وہ خوب بہار دے رہا تھا اسی میل کی چکن مل جاتی تو اچھا تھا ... ... ... ! ان تصورات نے نگاہ انتخاب کو اور زیادہ نزاکت میں بنا دیا۔

دونوں میاں بیوی تین بجے کے گئے ہوئے، شام کے کوئی سات بجے گھر کو لوٹے ماجد چار سو روپیہ کے نوٹ بٹوے میں رکھ کر لے گیا تھا واپسی پر بٹوا جو کھولا تو آٹھ دس روپیہ بچے تھے، مگر ابھی بیوی کی فرمائشیں پوری کہاں ہوئی تھیں، ساری کی کور، گرتہ کی بیل، فراک کی چین باقی تھی ——— اور ہاں! وہ دوپٹہ کا کپڑا، اور شلوار کی ساٹن کہ جس کی قیمت طے نہ ہو سکی، وہ بھی تو لانی تھی۔

پاس پڑوس کی عورتوں نے رضیہ کے لائے ہوئے کپڑے کی خوب خوب تعریفیں کیں کہ تم تو کلاتھ مارکیٹ کی بہار لوٹ کر لے آئیں، کل ہمارے ساتھ ذرا بازار چلی چلو، ہمیں بھی کپڑے کی بہت ضرورت ہے، ماجد کی اجازت لے کر رضیہ اُن عورتوں کے ساتھ بازار گئی اور عورتوں نے مل کر کپڑا خریدا ——— ان میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھی تھی جسے سب "ماسٹرنی" کہہ کر پکارتے تھے، معمولی ناک نقشہ کی عورت تھی مگر بناؤ سنگھار کا یہ عالم کہ ناخنوں کی کوروں پر سُرخی کے قوس میں تناسب پایا جاتا تھا۔

ماسٹرنی خوش طبع بلکہ ہنسوڑ عورت تھی، باتیں کرتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ نسوانی جھجک اسمیں نام کو نہیں رہی، رضیہ کے پاس اُس کا آنا جانا رہتا اور جب بھی آتی ایک دو عشقیہ قصّے سُنا کر جاتی، فلمی کہانیاں، ڈراموں کے پلاٹ، آزاد عورتوں کے افسانے ——— دونوں کا ربط ضبط بڑھتا جا رہا تھا۔

شروع میں رضیہ شوہر کے ساتھ بازار جایا کرتی تھی، ڈھیلے ڈھالے بُرقعہ میں لپٹی ہوتی! پھر ایسا ہوا کہ ہمسایہ اور عزیز عورتوں کے ساتھ جانے لگی، اُس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھی، گھر کی کسی ماما یا بچہ کو ساتھ لیا اور شاپنگ کے لئے بازار چلی گئی ——— اور اس کے بعد تنِ تنہا بازار جانے کا دستور ہو گیا ———

ماسٹرنی کے ساتھ بازار جانا ہوتا تو وہ عورت رضیہ کو بار بار چھیڑتی بلکہ طنز کرتی کہ تم بازار میں اندھوں کی طرح کیوں چلتی ہو، یہ چہرے پر برقعہ کی سونڈ سی کب تک لٹکتی رہے گی! شرم تو آنکھ کی ہوتی ہے، نہ کہ کالے کفن میں اس طرح گڑیا بنکر لپٹے رہنے کی! خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے، رضیہ نے بازاروں میں دیکھا کہ عورتیں خرید و فروخت کرتے وقت چہروں سے نقاب اُلٹ دیتی ہیں، اُس نے سوچا کہ آخر یہ سب کی سب آوارہ، بدنظر اور چھنال تو نہیں ہیں، ان میں بڑے بڑے شریف

گھرانوں کی عورتیں بھی ہیں ساری شرم میرے ہی حصہ میں تو نہیں آگئی ہے ——— نقاب سرکنے لگی، احتیاط کے بند ڈھیلے ہونے لگے، یہاں تک کہ کبھی کبھار چہرہ بے نقاب ہو جاتا۔

گرانڈ مارکیٹ میں جنرل مرچنٹ کی ایک دوکان جو راہ سے ذرا ہٹ کر تھی، صاف ستھری دکان، ہر چیز قرینہ سے جمی ہوئی، دیدہ زیب الماریاں اور نظر افروز شوکیس! مختصر سی شاپ، لیکن نمایش معلوم ہوتی تھی، ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی کلائی پر "محبوب" لکھا ہوا تھا دکان پر بیٹھتا تھا، بہت سے بہت پچیس سال کی عمر ہوگی، قد ذرا پست تھا مگر ناک نقشہ موزوں اور رنگت جیسے اُس نے چہرے پر طباشیر لگا رکھی تھی۔

رضیہ ایک دن محبوب کی دکان میں پہونچی، اور اندر پہونچکر نقاب اُٹھا دی، محبوب نے اس شاپ کی بدولت ہزاروں چہروں کا نظارہ کیا تھا اور عجیب عجیب جلوے اور طرح طرح کے تماشے دیکھے تھے مگر رضیہ کا چہرہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چکا چوندسی پیدا ہو گئی، اتنی دلکش صباحت ہزاروں میں ایک آدھ آدمی کو میسر آتی ہے، دلکشی اور رعنائی سمٹ سمٹا کر انسان بن گئی تھی ——— محبوب اسے دیکھتا رہا چور نگاہوں سے! دیکھنے کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

——— اس رومال کی قیمت ؟ ——— رضیہ نے دریافت کیا

——— تین روپیہ... تین روپیہ ——— محبوب نے گھبرا کر جواب دیا

——— یہ رومال اور تین روپیہ پس، درما برادرس کے یہاں تو اسی میل کا رومال، ڈھائی روپیہ میں ملتا ہے ———
——— رضیہ نے اپنے ناخن کی کور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

——— بیگم صاحبہ! چیز چیز میں فرق ہوتا ہے، اس وضع کا رومال ایک روپیہ میں بھی مل سکتا ہے، مگر وہ سوتی ہوگا، اس کی ریشم تو دیکھئے اور... ——— محبوب نے جواب دیا

——— (بات کاٹ کر) اور یہ تیل کی شیشی کتنے کی ہے ——— رضیہ نے دریافت کیا

——— یہ... یہ... یہ! ڈھائی روپیہ ہے اس کی قیمت! ——— محبوب نے رُک رُک کر کہا اُس کے ہونٹوں کو یہ جملہ "آپ جو چاہیں قیمت دیدیں" چھو کر چھو کر رہ گیا، عقل نے فوراً سمجھایا کہ تم تاجر ہو اور یہ عورت گاہک ہے، یہ جملہ اُس پر گراں بھی گزر سکتا ہے، عورت کا معاملہ ہے، نہ جانے کیا کہہ سُن دے اور کیا جھگڑا آ کر پڑ جائے ——— محبوب اپنے جذبات کو دبا کر رہ گیا۔

رضیہ تیل کی شیشی لیکر گھر چلی آئی ماجد نے صبح نہا دھو کر بالوں میں تیل لگایا... .. تو تیل کی تعریف کی، کہنے لگا اب سے کوئی دس سال پہلے کلکتہ میں یہ تیل میں نے لگایا تھا، پھر بہت ڈھونڈا مگر کہیں نہیں ملا، میں تو اس تیل کی تلاش میں تھا، ایک دو شیشیاں ہو سکے تو اور لے آؤ نہ جانے پھر ملے یا نہ ملے، یہ تیل مجھے اس قدر پسند ہے، تو اور لوگ بھی اس کے شیدائی ہوں گے! رضیہ نے نازِ محبوبانہ کے ساتھ کہا کہ جہاں میری اور تمھاری پسند مل جاتی ہے، وہاں یوں سمجھو کہ زمین آسمان یا یوں کہو کہ آگ اور پانی کا ملاپ ہو جاتا ہے، اس پر ماجد جلدی سے بول اُٹھا... .. " بلکہ شیر اور بکری گلے مل جاتے ہیں" دونوں میاں بیوی ہنسنے لگے، قہقہوں نے کمرے میں گونج سی پیدا کر دی۔

رضیہ پھر دوسرے دن محبوب کی دوکان پر پہونچی، محبوب کی خوشی کا کیا پوچھنا، سینہ میں دلِ بیتاب بلیوں اُچھل رہا تھا، کنواں آپ ہی آپ پیاسے کے پاس آ گیا تھا"

——— چار شیشیاں چاہئیں اس (شیشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میل کے تیل کی! مگر نرخ میں کچھ رعایت کرنی

ہو گی ــــــــــ رضیہ نے محبوب سے کہا۔

ــــــــ جی! رعایت! آپ جو قیمت دینا چاہیں، بلا تکلف دیدیں۔" آپ جیسے گاہکوں کو ہم ناراض کرنا نہیں چاہتے ــــــــ محبوب نے مسکرا کر جواب دیا۔

تیل کی شیشیاں خرید لی گئیں، رعایتی قیمت پر! حُسن نے خراج وصول کیا اور محبت سمجھی کہ میں نذرانہ پیش کر رہی ہوں! اس دن کے بعد سے چیزیں کم قیمت پر دی جانے لگیں، ماجد دوستوں میں اپنی بیوی کے حُسنِ انتخاب کی تعریف کرتے ہوئے کہتا صاحبو! مجھے بازار میں جا کر چیزیں خریدتے ہوئے بڑی اُلجھن اور کوفت ہوتی تھی، میری بیوی نے مجھے اس پریشانی اور دردسری سے بچا لیا، بھئی! ایسی ایسی چیزیں خرید کر لاتی ہے کہ بس اُنہیں دیکھا کیجئے! اور کم سے کم قیمت پر! شاپنگ کا اُسے عجیب سلیقہ ہے ــــــــ تو اپنی بیگم صاحبہ کو ایکسپورٹ اور امپورٹ کا لائسنس دلوا دیجئے بڑے نفع میں رہیں گے آپ! ایک دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

اب یہ ہونے لگا کہ رضیہ کام نکال کر، بازار جاتی، اور محبوب کی دوکان پر جانا تو لازمات سے تھا، شوق بڑھتا جا رہا تھا ــــــ وہ اس "دلچسپی کو ابھی تک معصوم اور بے ضرر سمجھے ہوئے تھی، مگر استقامت کی چٹان کے نیچے سے دھیرے دھیرے مٹی سرکتی چلی جا رہی تھی ــــــــ بہت بہت دیر تک دونوں کی باتیں ہوتیں، اور یہ باتیں فلسفہ، سیاست اور علم کلام سے متعلق نہ تھیں، ان میں لگاوٹ، دلچسپی اور شوق شامل تھا، فالودے، شربت، سوڈے، برف اور آئس کریم سے بھی اب تواضع کی جانے لگی ــــــــ رضیہ محبوب کی شاپ میں بن سنور کر جاتی اور محبوب بھی خوب بن ٹھن کر آتا، یہ طرفین کی آرائشیں بے سبب نہ تھیں، اُن سے مستقبل کے خاکے تیار ہو رہے تھے ــــــ ایسے خاکے جن میں سپیدی کم اور سیاہی زیادہ ہوتی ہے بلکہ دُھندلاہٹ ہی دُھندلاہٹ!

رضیہ کو فلم سے یوں بھی دلچسپی تھی، اور اس شوق کو تیز کرنے کے لیے اُس کی دوست ماسٹرنی اور خود اُس کے شوہر ماجد کا اصرار موجود تھا ــــــ کرسمس پر شہر میں ایک انگریزی کھیل آیا ہوا تھا، ہر جگہ اُس کی شہرت اور چرچا تھا کہ اس قدر نفسیاتی فلم یورپ نے شاید آج تک تخلیق ہی نہیں کیا۔

رضیہ بھی شوہر کے ساتھ اُسے دیکھنے کے لیے گئی سینما ہاؤس تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، فلم بڑی کاوش اور اہتمام سے تیار کیا گیا تھا، مرکزی پلاٹ اور بنیادی خاکہ یہ تھا کہ ایک شوہر دار عورت ایک دوسرے آدمی سے محبت کرتی ہے، شروع سے آخر تک اسی محبت کو طرح طرح سے پیش کیا گیا تھا ــــ رضیہ شوہر کی توجہ کی بدولت فلموں کے انگریزی مکالمے سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی ــــــ اُس کے ڈایلاگ :-

"شادی کی زنجیر عورت کے جسم کو جکڑ سکتی ہے مگر دل اُس کی گرفت میں نہیں آسکتا"

"شادی اور محبت ایک دوسرے کی ضد ہیں ... ..."

"محبت کا لُطف اور ہے اور شادی کا اور ... ..."

"میرا شوہر میرے محبوب انڈرسن (ہیرو کا نام) کی برابر خوبصورت کہاں ہے! تو کیا میں اپنی آنکھوں کو خوبصورتی کے لطف سے محروم کر دوں ــــــ کیا میں اندھی ہو جاؤں، یا دل کو بالکل پتھر کا بنا لوں ... ... ..."

رضیہ کی آنکھوں کے سامنے محبوب کا تصور مجسم تھا، گھر آئی اور بستر پر لیٹی تو وہ نقش اور گہرا ہو گیا، ماجد کو اس نے آج حقارت کی نگاہ سے دیکھا، وہ کمی سی محسوس کرنے لگی، پھر محبوب کے جملے یاد آنے لگے :-

——— آپ کو ہر طرح کا لباس زیب دیتا ہے، قد موزوں ہے، چہرے پر بھبن ہے اور ———

——— آپ جس دن نہیں آتیں تو آنکھیں ویران ویران سی رہتی ہیں ———

——— کیا میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ اپنی تصویر مجھے عنایت فرمادیں۔

——— میں خوش نصیب بھی ہوں اور بد نصیب بھی ——— مگر آپ کو بتاؤں گا نہیں کہ کیوں ؟

رضیہ ان جملوں کو طرح طرح کے معنیٰ پہنانے لگی، لطف میں ڈوب ڈوب جاتی، رات اسی عالم تصور میں بسر ہوئی ——— اور دوسرے دن محبوب کے یہاں پہنچکر رہی — آج کی بات چیت کا انداز ہی بدلا ہوا تھا محبوب کی مسرتوں میں جان پڑگئی، اس نوازش بے پناہ کی اُسے توقع نہ تھی ———

رضیہ شوہر سے بات چیت کرتی، دل لگی ہوتی اور چھیڑ چھاڑ بھی! مگر یہ سب دکھاوٹ اور بے دلی کی باتیں تھیں، اُس کا دل چوری اور خیانت پر مائل تھا، بُرائی جڑ پکڑتی جارہی تھی، محبوب اس منزل کا پرانا رہرو تھا وہ تجربہ کار تھا اور رضیہ نووارد! محبوب نے اُس کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھانے کی پوری پوری کوشش کی، اس آگ کو پہلے اسی نے سلگایا، اور اُسی نے ہوا دی، رضیہ نے یہ کیا کہ اُس پر پٹرول چھڑک دیا، اب یہ شعلے بجھتے کسطرح! ماحول سازگار ہی سازگار تھا!

پاکیزگی نوحہ خوانی کررہی تھی، عصمت چیخ رہی تھی، آبرو دھاڑیں مار مار کر اور بلک بلک کر رو رہی تھی کہ نادان رضیہ! یہ کیا کررہی ہے! کس راستہ پر جارہی ہے؟ یہ تو بدکاروں، خائنوں، لٹیروں اور ڈائنوں کی راہ ہے! ——— مگر وہ اب کس کی سنتی تھی؟

صوبہ کے صدر مقام کی ایک قومی کانفرنس کا ماجد کو بلاوا آیا تھا، ماجد جانا نہ چاہتا تھا، اُسے اپنے ذاتی کام ہی کیا کم تھے، مگر دوستوں نے اصرار کیا کہ چلنا پڑیگا، کام دھندے تو زندگی کے ساتھ لگے ہیں، ان سے فرصت کہاں مل سکتی ہے، قوم کے لیے بھی تو وقت کا تھوڑا بہت ایثار کرنا چاہئے، ماجد دوستوں کے ساتھ روانہ ہوگیا، ساٹھ میل پر جاکر ٹرین رُک گئی معلوم ہوا کہ سیلاب نے سڑک کو کاٹ دیا ہے، دو چار دن میں لائن درست ہوگی، ٹرین کو واپس آنا پڑا۔

ماجد گھر آیا بیوی موجود نہ تھی، کئی گھنٹہ تک انتظار کیا، مگر بیوی واپس نہیں آئی، بڑی تشویش میں مبتلا ہوگیا، فکر کی بات ہی تھی، اُس نے اپنی موٹر کار خود ہی گیرج سے نکالی اور بیوی کی تلاش میں چل دیا، خیال تھا کہ بازار میں شاید شاپنگ کے لیے چلی گئی ہو، تمام بازار چھان مارے مگر بیوی نہ ملی ——— دو چار دوستوں اور پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھا، مگر کوئی پتہ نہ دے سکا۔

اُس کے ذہن میں طرح طرح کے وہم آنے تھے، ——— وہ کمپنی باغ کے اندر سے موٹر کار میں گزر رہا تھا کہ ایک وکٹوریہ گاڑی میں اُسے رضیہ ایک جوان آدمی کے ساتھ بیٹھی ہوئی نظر آئی نقاب چہرے سے اُلٹی ہوئی تھی، دونوں بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے ——

ماجد اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہوگیا، اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا بھولا اور نرم خو ماجد آن کی آن میں جلاد بن گیا ——— اُس نے پوری قوت کے ساتھ وکٹوریہ سے موٹر کار ٹکرادی، کوچوان اُچھل کر سرو کے درختوں پر جاپڑا اور سبزے اور پودوں نے اُس ناکردہ گناہ کی جان بچالی ——— اور باقی لوگ، لہو میں نہائے ہوئے، رضیہ کی ٹھوڑی کی دو پھانکیں ہوگئی تھیں، اور اُس کے رُخسار میں پائیدان کا لوہا گھسا ہوا تھا، محبوب موٹر کے پہیوں میں بُری طرح اُلجھا تھا۔ ماجد بھی بیہوش تھا، موٹر کی ٹکر سے زیادہ اس "حادثہ" کا صدمہ تھا، آس پاس کے لوگ وہاں جمع ہوگئے، سب چیخ رہے تھے مگر چیخوں

# روحِ انتخاب

## اسلام غیروں کی نظر میں

امریکہ کے مشہور عالم ڈریپر کا قول ہے :- "دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت سے نہیں پھیلا جتنا کہ مذہبِ اسلام تھوڑے عرصہ میں کوہ الٹائی سے لیکر بحرالکاہل تک اور ایشیاء کے مرکز سے افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا۔"

سر ولیم میور (لائف آف محمدؐ کا مصنف) جو اسلام کی مخالفت میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ایک جگہ مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"اسلام نے ہمیشہ کے واسطے توہماتِ باطلہ کو جنکی تاریکی مدتوں سے چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ مذہبِ اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیز گاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔"

چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں ایک آرٹیکل لکھنے والا لکھتا ہے کہ یورپ میں علوم و فنون کی ترقی کا اصل سبب اسلام ہی ہے۔

ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی لکھتا ہے۔ کہ :- "جس وقت ہم فتوحاتِ عرب پر نظر ڈالیں گے اور ان کی کامیابی کے اسباب کو اُبھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعتِ مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحوں کے دین کو قبول کر لیا اور بالآخر ان کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے اپنے جدید حاکموں کو ان قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اس وقت تک تھے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزورِ شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ جس وقت عیسویوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کر لیا۔ اس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا۔ لیکن مذہب کی تبدیلی قبول نہیں کی۔ فی الواقع دینِ اسلام بعوض اس کے کہ بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہو محض بہ ترغیب اور بزورِ تقریر شائع کیا گیا ہے اور یہی ترغیب تھی جس نے اقوام ترک اور مغل کو بھی جنھوں نے آگے چل کر عربوں کو مغلوب کیا دینِ اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ چین میں بھی اسلام کی اشاعت کچھ کم نہیں۔" (تمدنِ عرب)

رابرٹس اپنی تاریخ چارلس پنجم میں لکھتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے۔ جن میں اشاعتِ مذہب کے جوش کے ساتھ رواداری ملی ہوئی تھی ایک طرف تو وہ اپنے پیغمبر کے دین کو پھیلاتے تھے۔ دوسری طرف ان اشخاص کو جو اسے قبول نہیں کرتے اپنے اصلی ادیان پر قایم رہنے دیتے تھے۔"

میسور میان اپنی کتاب سفرِ شرق میں لکھتا ہے کہ عیسائیوں کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ کہ مذہبی رواداری جو مختلف اقوام میں ایک بڑا قانون مروت ہے، عیسائیوں کو مسلمانوں نے سکھایا یہ بھی ایک ثواب کا کام ہے کہ انسان دوسرے کے مذہب کی عزت کرے اور کسی مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے۔"

"تاریخ جنگ صلیبی میں مذکورہ مصنف تیسور لکھتا ہے۔ جس وقت حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انہوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا، برخلاف اس کے جب صلیبیوں نے اس شہر مقدس کو لیا تو انہوں نے بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اور یہودیوں کو جلا دیا۔

مشہور مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ۔ " قدرت کے قانون میں ہر شخص اسلحہ کے ذریعہ اپنی ذات و ملکیت کی حفاظت کا حق رکھتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکتا ہے یا ان سے زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے اور اپنے انتقام و معاوضہ کو ایک مناسب حد تک وسیع کر سکتا ہے۔ محمدؐ صاحب (صلعم) کو ان کے ہموطنوں کی ناانصافی نے اسوقت محروم و جلاوطن کیا۔ جبکہ وہ اپنے خیر اندیش مذہب اور صلح آمیز رسالت پر عامل تھے "

مسٹر طامس کارئل اپنی کتاب "لیکچر ز آن ہیروز" میں لکھتا ہے۔ کہ

" اسلام کا آنا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی ہے عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ اعتماد رکھتے تھے بھیجا گیا۔

...... ...... .. .. .. ۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ وہ تمام دنیا میں مشہور ہو گئی اور چھوٹی چیز بڑی بن گئی۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر ایک جانب غرناطہ اور ایکطرف دہلی تک پھیل گئی ۔ ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ظلمت میں چھپا ہوا ریگستان تھا۔ مگر دیکھو اس نے زور شور سے اڑ جانے والی بارود کی طرح نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں کے ذریعہ دہلی سے تا بہ غرناطہ روشن کر دیا۔

ڈاکٹر سموئیل جانس لکھتا ہے کہ :۔ " قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے :۔

قرآن[1] میں عقاید، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھدی گئی ہیں۔ عدالت ۔ حربی انتظامات ، مالیات اور نہایت محتاط قانون غرباء وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔

ریورینڈ ڈبلیو اسٹیفین لکھتا ہے کہ :۔ " آنحضرتؐ نے بت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قایم کیا۔ آپ نے لوگوں کے اخلاقی میعار کو بلند کیا اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور معقول طریق عبادت جاری کیا۔ آخر کار آپؐ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں کو جو محض ذروں کی طرح ادھر ادھر اڑتے پھرتے تھے باہم ملا کر ایک ٹھوس ملکی جماعت کی شکل میں منتقل کر دیا۔ آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے ، جہاں ملکی انتظام معقول، اعتقاد اور خالص اخلاق سے لوگ ناواقف تھے۔ آپؐ نے ان تینوں باتوں کو وہاں رواج دیا۔ ملکی حالت ۔ مذہبی اعتقاد اور اخلاقی حالت کی اصلاح کر دی۔ بہت سے آزاد قبیلوں کی جگہ آپ نے ایک قوم چھوڑی ۔ بہت سے معبودوں اور بہت سے خداوندوں کے باطل عقیدے کی جگہ آپؐ نے ایک قادر مطلق مگر رحمٰن و رحیم خدا کا معقول عقیدہ قایم کیا۔ لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ اس خیال کے ساتھ زندگی بسر کریں کہ وہ وجود مطلق ہر دم ہمارا محافظ و نگہبان ہے۔ اسی کو نیکیوں کا جزا دینے والا سمجھیں اور اسی کو سزا دینے والا سمجھ کر اس سے ڈریں "

(مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم)

---

[1] لڈولف کریہل

— حدیث میں ہے "من لا یرحم لا یرحم ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء"
مگر افسوس لوگوں نے اس حدیث کو بھوک اور فاقہ والوں پر رحم کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے، اس لیے اُن کو اُس شخص پر تو رحم آتا ہے جو بھوکا ہو، پیاسا ہو، ننگا ہو مگر مسلمانوں کی دین سے محرومی پر رحم نہیں آتا، گویا دنیا کے نقصان کو نقصان سمجھا جاتا ہے لیکن دین کے نقصان کو نقصان نہیں سمجھا جاتا، پھر ہم پر آسمان والا کیوں رحم کرے، جب ہمیں مسلمانوں کی دینی حالت کے ابتر ہونے پر رحم نہیں۔

دین میں ٹھیراؤ نہیں، یا تو آدمی دین میں ترقی کر رہا ہوتا ہے اور یا نیچے گرنے لگتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ باغ کو جب پانی اور ہوا موافق ہو تو سرسبزی اور شادابی میں ترقی ہی کرتا رہتا ہے اور جب موسم ناموافق ہو یا پانی نہ ملے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سرسبزی اور شادابی اپنی جگہ ٹھیری رہے بلکہ اس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے، یہی حالت آدمی کے دین کی ہوتی ہے۔

طبیعت مایوسی کی طرف زیادہ چلتی ہے کیونکہ مایوس ہو جانے کے بعد آدمی اپنے کو عمل کا ذمہ دار نہیں سمجھتا اور پھر اُسے کچھ نہیں کرنا پڑتا، خوب سمجھ لو یہ نفس اور شیطان کا بہت بڑا کید ہے،

دین کوئی فن اور فلسفہ نہیں ہے بلکہ زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ سمجھ لینا چاہیے کہ عالم کی بے عملی نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا شراب پینا اور زنا کرنا نہیں ہے یہ تو عامیوں کے عام گناہ ہیں، عالم کا گناہ یہ ہے کہ وہ علم پر عمل نہ کرے اور اس کا حق نہ ادا کرے ——— "نزدیکاں رابیش بود حیرانی"

جن مقامات کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جان کی بازی لگا کے بلکہ اس جانبازی کے شوق و عشق سے حاصل کرنا بتلایا تھا اور صحابہ کرام نے دین کی راہ میں اپنے کو مٹا کے جو کچھ حاصل کیا تھا، تم لوگ اُس کو آرام سے لیٹے لیٹے کتابوں سے حاصل کر لینا چاہتے ہو؟

جو انعامات اور ثمرات خون سے وابستہ تھے، اُن کے لیے کم سے کم پسینہ گرانا چاہیے۔

ایمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول ؐ کو جس چیز سے خوشی اور راحت ہو بندہ کو بھی اس سے خوشی اور راحت ہو اور جس چیز سے اللہ و رسول ؐ کو ناگواری اور تکلیف ہو بندہ کو بھی اُس سے ناگواری اور تکلیف ہو، اور تکلیف جس طرح تلوار سے ہوتی ہے اُسی طرح سوئی سے بھی ہوتی ہے، پس اللہ و رسول ؐ کو ناگواری اور تکلیف کفر و شرک سے بھی ہوتی ہے اور معاصی سے بھی، لہذا ہم کو بھی معاصی سے ناگواری اور تکلیف ہونی چاہیے۔

شیطان کا یہ بڑا دھوکا اور فریب ہے کہ وہ مستقبل میں بڑے کام کی اُمید بندھا کر اس چھوٹے خیر سے روک دیتا ہے جو فی الحال ممکن ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ بندہ اس وقت جو خیر کر سکتا ہے، کسی حیلہ سے اُس کو اس سے ہٹا دے۔

(ملفوظات مولانا محمد الیاس رح)

## اشارات

**جماعت** اسلامی جس تحریک کو لیکر اٹھی ہے وہ پچھلے ۱۰ سال میں دو مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب تیسرے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ پہلا مرحلہ خالص تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کا تھا جس کا سلسلہ تقریباً ۹ سال جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ تنظیم و تربیت کا تھا اور اس میں تقریباً ۶ سال صرف ہوئے۔ اب تیسرا مرحلہ توسیع اور عملی اقدام کا ہے جسے شروع ہوئے ۳ سال ہو چکے ہیں۔ اس موقع پر اپنے موجودہ موقف اور آئندہ راہِ عمل کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس تحریک کا اور اس کے پچھلے کام کا جائزہ لیں، پھر دیکھیں کہ اس وقت ہم کن حالات اور

مسائل سے دوچار ہیں اور ان میں ہمیں کیا کام کس طرح کرنا ہے۔

یہ تحریک جس مقصد کے لیے اُٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

"انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر ونظر، عقیدہ وخیال، مذہب واخلاق، سیرت وکردار، تعلیم وتربیت، تہذیب وثقافت، تمدن ومعاشرت، معیشت وسیاست، قانون وعدالت، صلح وجنگ اور بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قایم کیا جائے۔"

یہ مقصد اول روز سے ہمارے پیش نظر رہا ہے اور آج بھی یہی ایک مقصد ہے جس کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ ہمارے پیش نظر کبھی تھا، نہ آج ہے، نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا۔ آج تک جس کام سے بھی ہم نے دلچسپی لی ہے اسی مقصد کے لیے لی ہے، اور اسی حد تک لی ہے جس حد تک ہماری دانست میں اس کا تعلق اس مقصد سے تھا۔

جس چیز کو ہم قایم کرنا چاہتے ہیں اس کا جامع نام قرآن کی اصطلاح میں "دینِ حق" ہے، یعنی وہ نظام زندگی (دین) جو حق (پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق اللہ کی بندگی وطاعت) پر مبنی ہو۔ مگر اس کے لیے کبھی کبھی ہم نے "حکومتِ الٰہیہ" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے جس کا مفہوم دوسروں کے نزدیک چاہے جو کچھ بھی ہو، ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ "اللہ کو حاکم حقیقی مان کر پوری انفرادی واجتماعی زندگی اس کی محکومیت میں بسر کرنا" اس لحاظ سے لفظاً بالکل "اسلام" کا ہم معنیٰ ہے۔ اسی بنا پر ہم ان تینوں اصطلاحوں (دینِ حق، حکومتِ الٰہیہ، اور اسلام) کو مترادف الفاظ کی طرح بولتے رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کا نام ہم نے اقامتِ دین، شہادتِ حق، اور تحریکِ اسلامی رکھا ہے جن میں سے پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور دوسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں سے کسی پر اگر لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لیے کہ انھوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا ہمارا مفہوم مراد لیتے تو اُمید نہ تھی کہ اس پر وہ ناراض ہوتے۔

ہمارے نزدیک اسلام اُن لوگوں کی جائداد نہیں ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں بلکہ خدا نے یہ نعمت اُن سب کے لیے بھیجی ہے جو انسان پیدا ہوئے ہیں خواہ وہ روئے زمین کے کسی خطے میں بستے ہوں۔ اس بنا پر ہمارا مقصد محض مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی زندگی کو دینِ حق پر قایم کرنا ہے۔ مقصد کی یہ وسعت آپ سے آپ تقاضا کرتی ہے کہ ہمارا اپیل عام رہے اور کسی مخصوص قوم کے مفاد کو مدِنظر رکھ کر کوئی ایسا طرزِ عمل نہ اختیار کیا جائے جو اسلام کے اس عام اپیل کو نقصان پہونچانے والا گیا اُس کی نقیض واقع ہوتا ہو۔ مسلمانوں سے ہماری دلچسپی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم اُن میں پیدا ہوئے ہیں اور نہ ہماری قوم ہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہماری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کو مانتے ہیں، دنیا میں اس کے نمایندے سمجھے جاتے ہیں، نوعِ انسانی تک اس کا پیغام پہونچانے کے لئے انھی کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اور دوسروں کے لیے اس پیغام کو مؤثر بنانا اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ اپنی انفرادی اجتماعی زندگی میں پورے اسلام کا صحیح نمونہ پیش کریں۔ اس بنا پر ہمارا راستہ اُن لوگوں کے راستے سے ہمیشہ الگ رہا ہے اور آج بھی الگ ہے جنھیں مسلمانوں سے اصل دلچسپی اس لیے ہے کہ وہ ان کی قوم ہیں اور اسلام سے یا تو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے یا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ ان کی قوم کا مذہب ہے۔

ہم نے اپنے مقصد کے لحاظ سے اپنی تحریک کو اس طرز پر اٹھایا ہے کہ ایک طرف اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام رہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کو اسلام کی مکمل اور صحیح علمی اور عملی شہادت دینے کے لیے تیار کیا جائے۔ ہم نے کبھی اسلام اور مسلم قومیت کے فرق و امتیاز کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ ہم نے اسلام کے اصول و احکام اور اسلامی دعوت کے مفاد کو ہمیشہ قوم اور قومی مفاد پر مقدم رکھا ہے اور جہاں کہیں ان دونوں چیزوں میں تناقص واقع ہوا ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کی خاطر قوم اور اس کے مفاد سے لڑ جانے میں تامل نہیں ہوا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لیے کوشش کی تو اس لیے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود برقرار رہے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لیے زندہ ہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ٹرکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قایم ہو جو اسلامی نظام زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ہماری اس پوزیشن کو وہ لوگ کبھی نہ سمجھ سکے جو اسلام اور مسلم قومیت کو گڈمڈ کرتے ہیں، یا قوم کو دین پر مقدم رکھتے ہیں، یا دین کے بجائے صرف قوم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے راستے اگر کبھی کہیں ملے بھی تو عارضی طور پر اس جگہ جہاں اتفاقاً اسلام نے ہمیں اور ان کو جمع کر دیا، ورنہ اکثر ہمارے اور ان کے طرزِ فکر و عمل میں تصادم ہی رہا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہم کو بارہا "غداری" کے طعنے بھی سننے پڑے ہیں۔ مگر یہ طعنے ہمارے لیے بالکل بے معنیٰ ہیں۔ ہم وفاداری کا مستحق صرف خدا اور رسولؐ کو سمجھتے ہیں، پھر اس کو جو خدا اور رسول کا وفادار ہو۔ اس وفاداری سے انحراف تو البتہ ہمارے نزدیک دنیا و آخرت میں لعنت کا موجب ہے۔ لیکن اگر اس وفاداری میں ہم ثابت قدم ہوں تو پھر دوسری چیز جس کا بھی ہمیں غدار ٹھیرایا جائے وہ ہمارے لئے باعثِ شرم نہیں بلکہ باعثِ فخر ہے۔

"دینِ حق" اور "اقامتِ دین" کے تصور میں بھی ہمارے اور بعض دوسرے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم دین کو محض پوجا پاٹ اور چند مخصوص مذہبی عقاید و رسوم کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک یہ لفظ طریقِ زندگی اور نظامِ حیات کا ہم معنیٰ ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں اور تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ہم اس بات کے قایل نہیں ہیں کہ زندگی کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر الگ الگ نظریات اور الگ الگ اسکیموں کے ماتحت چلایا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تقسیم اگر کی بھی جائے تو وہ قایم نہیں رہ سکتی، کیونکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو، انسانی جسم کے اعضاء کی طرح ایک دوسرے سے ممیز ہونے کے باوجود آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ وہ سب مل کر ایک کُل بن جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک ہی روح جاری و ساری ہوتی ہے۔ یہ روح اگر خدا اور آخرت سے بے نیازی اور تعلیم انبیاء سے بے تعلقی کی روح ہو تو پوری زندگی کا نظام ایک دینِ باطل بن کر رہتا ہے اور اس کے ساتھ خدا پرستانہ مذہب کا ضمیمہ اگر لگا کر رکھا بھی جائے تو مجموعی نظام کی فطرت بتدریج اس کو مضمحل کرتے کرتے آخر کار بالکل محو کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ روح خدا و آخرت پر ایمان اور تعلیم انبیاء کے اتباع کی روح ہو تو اس سے زندگی کا پورا نظام ایک دینِ حق بن جاتا ہے جس کے حدود عمل میں ناخدا شناسی کا فتنہ اگر کہیں رہ بھی جائے تو زیادہ دیر تک پنپ نہیں سکتا۔ اس لیے ہم جب "اقامتِ دین" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب محض مسجدوں میں دین قایم کرنا، یا چند مذہبی عقائد اور اخلاقی احکام کی تبلیغ کر دینا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ گھر اور مسجد، کالج اور منڈی، تھانے اور چھاؤنی، ہائی کورٹ اور پارلیمنٹ، ایوانِ وزارت اور سفارت خانے، سب پر اسی ایک خدا کا دین قایم کیا جائے جس کو ہم نے اپنا رب اور معبود تسلیم کیا ہے اور سب کا انتظام اسی ایک رسولؐ کی تعلیم کے مطابق چلایا جائے جسے ہم اپنا ہادیٔ برحق مان چکے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہماری ہر چیز کو مسلمان ہونا چاہیے۔ اپنی زندگی کے کسی پہلو کو بھی ہم شیطان کے حوالے نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں سب کچھ خدا کا ہے شیطان یا قیصر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ہماری ان باتوں پر وہ سب لوگ برہم ہیں جنھوں نے مذہب کا ایک محدود تصوّر اختیار کر رکھا ہے، جو تفریق دین و دنیا اور امتیاز مذہب و سیاست کے قائل ہیں، جن کے نزدیک زندگی خدا اور قیصر کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیئے، اور جنکی نگاہ میں خدا پرستی کا دین بے خدا تمدن و سیاست کے ساتھ زندگی کا بٹوارا قبول کر سکتا ہے اور صرف مسجد و خانقاہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر باقی سب کچھ اپنے حریف کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ لوگ ہم پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ تم مذہب کی تبلیغ کرو، سیاست میں کیوں دخل دیتے ہو؟ مگر ہم اس بات کے قایل ہیں کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اب کیا یہ لوگ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہماری سیاست پر چنگیزی مسلط رہے اور ہم مسجد میں "مذہب" کی تبلیغ کرتے رہیں؟ اور آخر وہ مذہب کونسا ہے جس کی تبلیغ کے لیئے یہ ہم سے کہہ رہے ہیں؟ اگر وہ پادریوں والا مذہب ہے جو سیاست میں دخل نہیں دیتا، تو ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ قرآن و حدیث کا مذہب ہے، جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، تو وہ سیاست میں محض دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اُس کو اپنا ایک جز بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے، اب سیاسی گروہ بن گئے ہو۔ حالانکہ ہم پر کبھی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہو جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے "مذہبی" رہے ہوں۔ اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو "اسلام" کے پیرو ہیں اور اسی کو قایم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جتنا مذہبی ہے اتنے ہی ہم مذہبی ہیں اور ابتدا سے تھے۔ اور وہ جتنا "سیاسی" ہے اتنے ہی ہم سیاسی ہیں اور ابتدا سے تھے۔ تم نے نہ کل ہمیں سمجھا تھا جبکہ ہم کو "مذہبی" گروہ قرار دیا، اور نہ آج سمجھا ہے جبکہ ہمارا نام "سیاسی جماعت" رکھا ہے۔ سیاست اور مذہب دونوں میں تمھارا استاد یورپ ہے۔ اس لیے نہ تم نے اسلام کو سمجھا اور نہ ہمیں۔

کوئی کہتا ہے کہ خدا تو صرف معبود ہے، تم نے یہ سیاسی حاکمیت اس کے لیے کہاں سے ثابت کر دی؟ اور اس پر غضب یہ ہے کہ تم اس حاکمیت کو اللہ کے لیے مخصوص کرتے ہو اور انسانی حاکمیت کے منکر ہو۔ یہ تو خالص خارجیت ہے، کیونکہ تمھاری طرح خارجی بھی یہی کہتے تھے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ مگر ہمارے نزدیک قرآن اور حدیث کی رو سے خدا کا حق صرف عبادت و پرستش ہی نہیں ہے بلکہ طاعت و عبدیت بھی ہے۔ ان میں سے جس حق میں بھی خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا جائے گا، شرک ہو گا۔ بندوں میں سے کسی کی اطاعت اگر کی جا سکتی ہے تو صرف خدا کے اذنِ شرعی کی بنا پر کی جا سکتی ہے اور وہ بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر۔ رہا خدا سے بے نیاز ہو کر مستقل بالذات مطاع ہونا تو وہ تو رسولؐ کا حق بھی نہیں ہے کجا کہ کسی انسانی ریاست یا سیاسی و تمدنی ادارے کا حق ہو جس قانون، عدالت اور حکومت میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو سند نہ مانا جائے، جس کا بنیادی اصول یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے جملہ معاملات میں اصول اور فروع تجویز کرنا انسانوں کا اپنا کام ہے، اور جس میں قانون ساز مجلسیں خدائی احکام کی طرف رجوع کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تسلیم کرتی ہوں اور عملاً ان کے خلاف قوانین بناتی ہوں، اس کی اطاعت کے لزوم تو درکنار جواز تک کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے، اس بلا کو زیادہ سے زیادہ صرف برداشت کیا جا سکتا ہے جبکہ انسان اس کے پنجۂ اقتدار میں گرفتار ہو جائے۔ مگر جو شخص ایسی حکومتوں کے حقِ فرماں روائی کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات کو ایک اصولِ حق کی حیثیت سے مانتا ہے کہ خدائی ہدایت کو چھوڑ کر انسان بطورِ خود اپنے تمدن، سیاست اور معیشت کے اصول اور قوانین وضع کر لینے کے مجاز ہیں، وہ اگر خدا کو مانتا ہے تو شرک میں مبتلا ہے ورنہ زندقہ میں۔ ہمارے اس مسلک کو "خارجیت" سے تعبیر کرنا مذہبِ اہلِ سنت اور مذہبِ خوارج، دونوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ علماءِ اہلِ سنت کی لکھی ہوئی کتبِ اصول میں سے جس کو چاہیئے اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں یہی لکھا ملے گا کہ حکم دینے کا حق اللہ کے لیے خاص ہے۔

مثال کے طور پر علامہ آمدی اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں: اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ ولا حکم الا ما حکم بہ۔ "جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور حکم صرف وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے۔" اور شیخ محمد خضری اپنی اصول الفقہ میں کہتے ہیں: ان الحکم ھو خطاب اللہ فلا حکم الا للہ وھذہ قضیۃ اتفق علیھا المسلمون قاطبۃ۔ "درحقیقت حکم اللہ کے فرمان کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔" یہ صرف دو "خارجیوں" کے اقوال ہم نے بطور مثال نقل کر دیے ہیں۔ اس طرح کے "خوارج" کی آپ جس قدر چاہیں طویل فہرست دیجا سکتی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو چند راچند را کر پوچھتے ہیں کہ یہ حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کا قیام کس نبی کی دعوت کا مقصود رہا ہے؟ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ جو قرآن اور توراۃ میں عقاید و عبادات کے ساتھ ساتھ دیوانی اور فوجداری قوانین، اور صلح و جنگ کے احکام، اور معیشت و معاشرت کے قواعد و ضوابط، اور سیاسی تنظیم کے اصول بیان ہوئے ہیں کیا یہ سب محض تفنن طبع کے لیے ہیں؟ کیا یہ آپ کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑا گیا ہے کہ کتاب اللہ کی تعلیمات میں سے جس چیز کو چاہیں جزو دین مانیں اور جسے چاہیں غیر ضروری زوائد میں شمار کریں؟ کیا انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی نظام قایم کیے وہ ان کی پیغمبرانہ دعوت کے مقاصد میں سے نہ تھے، محض اتفاقات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنا شوقِ فرماں روائی پورا کیا تھا؟ کیا دنیا میں کوئی قانون اس لیے بھی بنایا جاتا ہے کہ صرف اس کی تلاوت کر لی جائے، اس کا نفاذ سرے سے مقصود ہی نہ ہو؟ کیا واقعی ایمان اسی چیز کا نام ہے کہ ہم روز اپنی نمازوں میں کتاب اللہ کی وہ آیات پڑھیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اصول اور احکام بیان ہوئے ہیں اور رات دن ہماری زندگی کے اکثر و بیشتر معاملات اُن کے خلاف چلتے رہیں؟

خدا کی بندگی جس پر ہم پورے نظامِ زندگی کو قایم کرنا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں بھی ہمارا ایک واضح مسلک ہے اور وہ مختلف گروہوں کو مختلف وجوہ سے پسند نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک ہر شخص اس کا مختار نہیں ہے کہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جس طرح چاہے خدا کی بندگی کرے، بلکہ اس کی ایک ہی صحیح صورت ہے اور وہ اُس شریعت کی پابندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ اس شریعت کے مقابلے میں کسی مسلمان کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس کی جن باتوں کو چاہے قبول کرے اور جن باتوں کو چاہے رد کر دے، بلکہ ہم اسلام کے معنیٰ ہی اطاعتِ حکم خداوندی اور اتباعِ شریعتِ محمدی کے سمجھتے ہیں۔ شریعت کے علم کا ذریعہ ہمارے نزدیک صرف قرآن نہیں ہے بلکہ حدیث بھی ہے، اور قرآن و حدیث سے استدلال کا صحیح طریقہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے نظریات پر خدا اور رسولؐ کی ہدایات کو ڈھالے بلکہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نظریات کو خدا اور رسولؐ کی ہدایات پر ڈھالے۔ پھر ہم نہ تو تقلید جامد کے قایل ہیں جس میں اجتہاد کی جگہ نہ ہو اور نہ ایسے اجتہاد کے قایل ہیں کہ ہر بعد کی نسل اپنے سے پہلے کی نسلوں کے سارے کام پر پانی پھیر دے اور بالکل نئے سرے سے ساری عمارت اٹھانے کی کوشش کرے۔

اس مسلک کا ہر جز ایسا ہے جس سے ہماری قوم کا کوئی نہ کوئی گروہ ہم سے ناراض ہے۔ کوئی سرے سے خدا کی بندگی کا قائل ہی نہیں ہے۔ کوئی شریعت سے بے نیاز ہو کر اپنی صواب دید کے مطابق خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے۔ کوئی شریعت میں اپنا اختیار چلانا چاہتا ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ اسے پسند ہے وہ اس شریعت میں رہے اور جو اُسے پسند نہیں ہے وہ شریعت سے خارج ہو جائے۔ کوئی قرآن و حدیث سے قطع نظر کر کے اپنے من گھڑت اصولوں کا نام اسلام رکھے ہوئے ہے۔ کوئی حدیث کو چھوڑ کر صرف قرآن کو مانتا ہے۔ کوئی اصول اور نظریات کہیں باہر سے لے آیا ہے یا اپنے دل سے گھڑ لایا ہے اور پھر زبردستی قرآن و حدیث کے ارشادات کو اُن پر ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی کو تقلیدِ جامد پر اصرار ہے۔ اور کوئی تمام پچھلے ائمہ کے کارناموں کو دریا برد کر کے نیا اجتہاد کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا راستہ ان سب گروہوں سے الگ ہے اور ہم مجبور ہیں کہ ان سے اختلاف بھی کریں اور ان کے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ بھی کریں۔ اسی طرح دوسروں کے بھی اس حق کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جس معاملے بھی ہم کو غلطی پر سمجھتے ہیں اس میں ہم سے اختلاف کریں اور ہمارے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ کریں۔ اب ہر شخص جو ہندوستان و پاکستان میں رہتا ہے اور مختلف گروہوں کے لٹریچر پر نظر رکھتا ہے، خود ہی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اپنی تنقید و تبلیغ میں ہمارا رویّہ کیا رہا ہے اور ہمارے مخالفین نے جواب میں کس تہذیب و شرافت اور معقولیت کا ثبوت دیا ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

---

# ہماری نظر میں

(۱) تجدید تصوف و سلوک
(۲) جامع المجددین

(۱) تجدید تصوف وسلوک از :۔ مولانا عبدالباری ندوی، ضخامت ۴۹۶ صفحے، مجلد گردپوش کے ساتھ قیمت پانچروپیہ،
(۲) جامع المجددین :۔ از مولانا عبدالباری ندوی ضخامت ۵۶۰ صفحات، مجلد گردپوش کے ساتھ قیمت پانچروپیہ، دونوں کتابیں، مہتمم مکتبہ "تجدید دین" شبستانِ قدمِ رسول، ہارڈنگ روڈ، لکھنؤ (بھارت) سے مل سکتی ہیں۔

مولانا عبدالباری ندوی کی شخصیت علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، کانٹ اور ہیوم پر موصوف کی تحریریں اور کتابیں ایک مستند اور ممتاز مقام رکھتی ہیں، شروع شروع میں مولانا عبدالباری ندوی کا بھی وہی حال تھا جو عام طور پر کچل کے لکھے پڑھے نوجوان کا ہوا کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے یقین و تذبذب کی اس دھوپ چھاؤں سے انھیں نکال کر، ایمان و یقین کے "حظیرۃ القدس" میں پہونچا دیا، ان کے نفس کی تربیت اور فکر و نظر کی تشکیل میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے فیضِ صحبت کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہے ـــــــ تیس برس پہلے کا "فلسفی عبدالباری" ـــــــ آج "مولانا عبدالباری" ہیں، اور اب ان کا قلم دین کی خدمت کے لیے وقف ہے۔

(۱) "تصوف" کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں یہ کتاب ـــــــ "تجدید تصوف وسلوک" ان شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے، اور اس موضوع پر کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب نہایت کامیاب پیش کش ہے، اس کتاب کو پڑھ کر خود ہمارے بعض شبہات دور ہوگئے، اس کتاب میں بعض نازک مسائل کی بڑی خوبی کے ساتھ تشریح کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مضامین گوناگوں کیفیات کے حامل ہیں، اور ہر عنوان پر مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ و ارشاد کا کوئی نہ کوئی "اقتباس" ضرور درج ہے، پوری کتاب ان جواہر پاروں سے لبریز ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے حضرت تھانوی کو "حقیقتِ تصوف کا مکتشفِ اعظم" جو لکھا ہے بجا لکھا ہے، مولانا تھانوی نے تصوف کے نازک معانی اور باریک نکتوں کی شرح فرمائی ہے اور حیرت ہے کہ شریعت زبان و قلم کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔

صفحہ (۲۰۷) پر مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے :۔ "صوفی بنے بغیر انسان، انسان ہی نہیں بنتا، یا حیوان رہتا ہے، یا شیطان بن جاتا ہے" ہم نے مولانا موصوف کی خدمت میں عریضہ لکھ کر دریافت کیا کہ "اس عبارت میں "صوفی" سے آپ کی غالباً مراد "مومن" ہے، اس کی مولانا نے تصدیق فرمائی کہ ان کی یہی مراد تھی، مگر یہ بات ہم کس کس سے کہتے پھریں گے! عبارت سے یہ عام مفہوم (مومن) ظاہر نہیں ہوتا۔

مسلمانوں میں اہلِ مجاز، اور اہلِ حقیقت، صوفیوں اور غیر صوفیوں کی تفریق مناسب نہیں، مگر اس کو کیا کیجے کہ اوپر سے یہی ہوتا آیا ہے، تصوف کے تذکروں میں جہاں بایزید بسطامیؒ، معروف کرخیؒ، جنید بغدادیؒ، شہاب الدین سہروردیؒ،

شیخ عبدالقادر جیلانی اور مولانا روم (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام ملتے ہیں وہاں امام اعظم ابو حنیفہ رح، امام مالک رح، امام ابو یوسف رح، اور امام بخاری رح کے نام نظر نہیں آتے، یہی سبب ہے کہ عام طور پر اہلِ تصوف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو عرفان و باطن سے جس قدر باخبر اور آگاہ سمجھتے ہیں حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اتنا نہیں سمجھتے۔

صفحہ (۳۸۷) پر حضرت مولانا تھانوی کے ارشادات کا اقتباس درج ہے :۔

"بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پٹو گے بھی تو اس طرح پٹو گے کہ جس طرح عشاق پٹا کرتے ہیں، عشاق کو غیروں کی طرح نہیں پٹوایا کرتے بلکہ یوں ہی برائے نام کچھ سزا دیتے ہیں، محبوب کو ان کی محبت و عشق کی بھی لاج ہوتی ہے، دوسری ایک بات اور ہے گو کہنے کی نہیں مگر جب زبان پر آگئی ہے تو چھپاؤں کیوں وہ یہ کہ عشاق کو محبوب کے ہاتھ سے پٹنے میں مزہ آتا ہے بلکہ محبوب کے سامنے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے۔۔۔"

مولانا تھانوی نے جو کچھ کہا ہے، یہ بات واقعی کہنے کی نہ تھی، اور زبان پر آگئی تھی تو اسے روکنا تھا، فاسقوں اور گناہ گاروں کو عذاب دینے کی قرآن پاک میں جہاں جہاں وعیدیں پائی جاتی ہیں، وہاں "عذاب" کی اس عاشقانہ توجیہہ" کو آخر ہم کیا کہیں۔

فاضل مصنف صفحہ (۴۸۶) پر تحریر فرماتے ہیں :۔

"ایک اور حضرتِ خواجہ حافظ شیرازی رح ہیں جن کا حال و مقال سب اس لیے مشتبہ ہو گیا کہ "ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو" مگر اُن سے "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح بعضوں نے تاریخ دانی کا فرض حضرتِ منصور رح کو ملحد و زندیق قرار دے کر ادا کیا، اسی طرح بعضوں نے سخن فہمی کی داد یہ دی کہ عارفِ شیرازی کی مستی میں شرابِ انگور اور شرابِ معرفت کے فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ غرض دیوانِ حافظ اصل میں عرفانِ حافظ ہے۔" (صفحہ ۴۸۷)

حافظ شیرازی نے بلاشبہ اپنے شعروں میں بلند حقایق بھی بیان کیے ہیں، مگر اُن کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، جن میں مجاز و ہوس کی فراوانی ہے، اور اُن کو عرفان و تصوف کا جامہ پہنانے سے خود تصوف مشتبہ ہو جاتا ہے، آخر اس قسم کے شعروں کی :۔

آں تلخ وش کہ صوفی ام الخبائثش خواند
اشھیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا

کیا توجیہہ کی جائے گی؟ حافظ کے بعض شعروں میں "شیخ" و "زاہد" پر اس انداز میں طنز کی گئی ہے کہ اس سے شریعت کا استخفاف ہوتا ہے! ـــــــ اسی طرح

شرابِ لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں
خلافِ مذہبِ آناں، جمالِ ایناں بیں

جیسے شعروں سے "حقائق و معارف" منسوب کرنا درست نہیں!

"تجدید تصوف و سلوک" میں اگر "منصور" اور "انا الحق" کا ذکر نہ ہوتا تو کیا اچھا ہوتا، "تصوف" کا یہ پہلو بہت کمزور ہے اور حیرت ہے کہ اتباعِ شریعت کے ساتھ اس "انا الحق" کا پیوند کس طرح لگ سکتا ہے، "منصور حلاج" جب تک تصوف کا "ہیرو" رہے گا، تصوف کو مشتبہ اور مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

مولانا عبدالباری ندوی کی خدمت میں ہمیں نیاز مندی حاصل ہے، اللہ کا فضل ہے کہ یہ تعلق ہمیں اظہارِ حق سے نہ روک سکا، جو باتیں کھٹکیں وہ خوب کھل کر ظاہر کر دی گئیں! ہماری رائے کی غلطی ہم پر واضح کر دی جائے گی تو اس کے اعتراف میں ہم تامل نہ کریں گے۔

اس کتاب کی افادیت اور اہمیت بہر حال اپنی جگہ مسلّم ہے، اس کے پڑھنے سے بہت سے عقدوں کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

(۲) دوسری کتاب ——— "جامع المجددین" ہے، جس میں مولانا عبدالباری ندوی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ارشادات کو مختلف عنوانات کے تحت بڑے سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے، اور اُن پر جو نوٹس (NOTES) لکھے ہیں، وہ بہت ہی خوب ہیں!

کسی شخص کی پیشانی پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ "میں مجدد ہوں" اور نہ آسمانوں سے ندا آتی ہے کہ "فلاں شخص مجدد ہے ——— "مجدد" کے کارنامے اور خود اُس کی زندگی بولتی ہے کہ یہ تجدید دین کا فریضہ ادا ہو رہا ہے! کوئی شک نہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ تجدید و اصلاح کے منصب پر فائز تھے، اُن کی کتابیں "تجدید دین" کی گواہی دیتی ہیں۔

"جامع المجددین" میں ارشاد و ہدایت کے پھول اور دانش و حکمت کے موتی ہر صفحہ پر بکھرے ہوئے ہیں دینی کوتاہیوں اور بیماریوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ساتھ ہی اُن کے ازالہ کی کارگر اور آسان تدبیریں بتائی گئی ہیں!

مولانا تھانوی کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اظہارِ حق کے کھول دیا تھا، اُن کی کتابوں اور تحریروں میں زیادہ تر "مغز" ہی "مغز" ملتا ہے، وہ ادیبوں اور انشا پردازوں کی طرح لفظوں سے نہیں کھیلتے، مفہوم ادا کرنے کے لیے جچے تلے لفظ لاتے ہیں، پھر تحریر میں دل نشینی اور سلجھاؤ ہوتا ہے!

"جامع المجددین" شروع سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھنے کے قابل ہے، دین کے وہ وہ نکتے بتائے ہیں کہ دل وجد کرنے لگتا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے دل میں خشیت اور تواضع کے ساتھ "تعلق باللہ" کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ——— یہ کتاب دین اور دنیا کی سعادتوں کا سنگم ہے،

مولانا عبدالباری ندوی اسلامی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اتنی مفید اور کار آمد کتاب اُنہوں نے مرتب فرما دی ——— جس کسی نے اس کتاب (جامع المجددین) کو نہ پڑھا اُس کی حرماں نصیبی پر ہمیں افسوس ہے، یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اس کے لیے باقاعدہ محفلیں منعقد ہوں اور اُن میں اس کو پڑھا جائے۔!

## اقبال اور قرآن

"اقبال اور قرآن" مرتبہ:- ڈاکٹر عارف بٹالوی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحے، لکھائی چھپائی بہت عمدہ، پائیدار جلد سنہری تحریر کے ساتھ، دیدہ زیب گرد پوش، قیمت پانچ روپیہ، ملنے کا پتہ:- کتاب لمیٹڈ رالبسن روڈ کراچی۔

علامہ اقبال کی ہر دلعزیزی اور قبولِ عام کا یہ عالم ہے کہ ان پر نئی نئی کتابیں آتی چلی جا رہی ہیں مگر اربابِ ذوق کسی طرح سیر نہیں ہو پاتے، اقبال کا کلام سچ مچ شاعری کا "معجزہ" ہے اور "شاعری جزو لیست از پیغمبری" کا صحیح مصداق!

جناب عارف بٹالوی اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جن کو اقبال کی ذات سے غیر معمولی عقیدت بلکہ عشق ہے، یہ کتاب اُن کی اس عقیدت اور شیفتگی کا مظہر ہے، اس کتاب کے موضوعات ہیں ——— کلامِ اقبال و کلامِ خدا ——— اسلام میں زندگی کا تصور ——— قرآن اور خودی ——— اقبال اور کائنات!

لائق مصنف نے اقبال کے شعروں کو قرآن کی آیتوں کے ساتھ تطبیق دینے میں یقیناً بڑی کاوش سے کام لیا ہے،

بیان میں روانی بھی ہے اور شروع سے لیکر آخر تک دلچسپی پائی جاتی ہے۔

"کلام اقبال اور کلام خدا" ——— یہ موضوع اپنی لفظی اور معنوی ترکیب کے اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں، اس کے جواب میں شاید اقبال کا یہ شعر پڑھ دیا جائے گا:-

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

مگر اللہ اور رسولؐ کے ذکر میں لفظوں کو بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ برتنے کی ضرورت ہے، ذرا سی بے احتیاطی اور تسامح سے "ایمان" کا ٹھیک نہیں رہتا ——— "کلام اقبال اور کلام خدا میں" برابری "کا سا انداز پایا جاتا ہے، دوسرے ایڈیشن میں اس عنوان کو ضرور بدل دینا چاہیئے، غیر محتاط عقیدت ترقی کرتے کرتے شدید گمراہی کا سبب بن جاتی ہے، اللہ تو اللہ ہی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ——— حضرت انسؓ اور حضرت بلالؓ ——— جس مقام پر فایز ہیں، وہاں اقبال کو اگر کفش برداری بھی نصیب ہو جائے تو اقبال کی سب سے بڑی سعادت ہے۔

بعض مقامات پر قرآن کریم کی جن آیتوں کے ساتھ اقبال کے شعروں کا پیوند جوڑا گیا ہے، وہ بالکل بے جوڑ ہے، مثلاً داستان یوسفؑ (صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲) کے سلسلہ میں اقبال کے جو شعر درج کیے ہیں اُن کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے ——— لکھتے ہیں "باپ کا دل دھڑک گیا اور بیٹوں کے ارادوں پر ایک نظر ڈالی اور دل میں کہا کہ:-

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی

اگر تطبیق کو اسی طرح وسعت دی جائے تو پھر ہر شاعر کے شعروں کو قرآن کے ساتھ معنوی نسبت دی جا سکتی ہے۔

صفحہ ۳۶۴ پر ہمیں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے ——— "اقبال فہمی اور قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گراں مایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردن ہمیشہ نگوں سار رہے گی اُن میں حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی اور حضرت علامہ پرویز مصنف معارف القرآن کی محترم شخصیت ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے، معارف القرآن کا مطالعہ یقیناً ہمیں اور ہماری نسلوں کو اسلام کی اس زندگی میں داخل کر دے گا جس کے لیے علامہ بے قرار رہے۔ . . . "

"کلام اقبال اور کلام خدا" کی طرح یہاں بھی مصنف نے "اقبال فہمی اور قرآن فہمی" لکھ کر بڑی بے احتیاطی کا ثبوت دیا ——— آخر یہ ہو کیا رہا ہے، اس قسم کی غلط عقیدت خوف ہے کہ کہیں اقبال کے کلام کو رسوا نہ کر دے۔ نادانوں کی دوستی سے اللہ ہر کسی کو بچا تا رکھے۔

اور ہاں! یہ مسٹر پرویز "علامہ" کب سے بن گئے، اب رہا "معارف القرآن" تو اس میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ مذاق کیا ہے، پرویز صاحب کو افسانہ نگاری کرنی چاہیئے تھی مگر وہ "مفسر" بن بیٹھے اور افسانوں کے خود ساختہ خاکوں کو تفسیر کا رنگ دیدیا، معارف القرآن "تفسیر بالرائے" کی بہت بری مثال ہے، اگر عارف بٹالوی نے پرویز صاحب کی تحریروں سے قرآن کو سمجھا ہے تو انہوں نے "غلام احمد پرویز اسسٹنٹ سکریٹری" کو تو ضرور سمجھا ہے مگر قرآن کو نہیں سمجھا۔

صفحہ ۱۲ پر اقبال کا ایک مصرعہ غلط لکھا گیا ہے:-

ؔ خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

کو "تیغ فشاں" لکھا ہے، جسے پڑھ کر وجدان بہت مکدر رہوا۔

"اقبال اور قرآن میں" زبان و بیان کی کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں (صفحہ ۱۲) "جس کی انسانیت میں شرفِ انسانیت کا راز ہے۔۔۔۔" "راز پنہاں ہے" لکھنا چاہیئے تھا ـــــ (صفحہ ۱۵) "جب ثبات پر سرگردانیاں ایمان لے آئیں تو پھر ایک جستجو نے پریشان کیا ـــ" "ثبات پر سرگردانیوں کا ایمان لے آنا" ایک معمہ سے کم نہیں ـــ (صفحہ ۱۵) "جس نے اپنے ترنم لاہوتی کی پوری دلکشی سے فضائے عالم کو اس نغمۂ جاں فزا سے منور کر دیا۔۔۔۔" اس عبارت میں کتنا جھول ہے اور ناپختگی بھی، پھر "نغمہ سے منور کرنا" اس پر مستزاد! ـــــ (صفحہ ۱۶) "آج پھر مسلمان انھی منزلوں سے الگ بھٹک کر غلط راہوں پر چلا جا رہا ہے" "الگ" یہاں بالکل زائد ہے (صفحہ ۴۳) "دوا فطری طور پر مرض یا مریض پر صادق آتی ہے" "صادق آتی ہے" یہاں بالکل بے معنیٰ ہے ـــــ (صفحہ ۱۲۷) "اگر کوئی کان بند کرلے تو آواز و پکار کا کیا گناہ!" "واؤ عطف" یہاں درست نہیں ـــــ (صفحہ ۱۴۲) "زندگی کا انحصار گنتی کے دنوں پر منحصر ہے" "زندگی کا انحصار گنتی کے دنوں پر ہے" لکھنا چاہیئے تھا یہ "انحصار منحصر ہے" کی بھی ایک ہی رہی!

(صفحہ ۱۶۷) "حضرت ابراہیمؑ کے سینۂ منور میں جب نیازِ حق تعالےٰ کی آرزو بیدار ہوئی، ان کی مقدس نگاہوں نے مشاہداتِ عالم میں تلاش فرمائی، انہوں نے طلوعِ سحر کی زرین تابانیوں میں نورِ وحدت کو دیکھنے کی کوشش فرمائی اور سمجھا کہ یہی آفتابِ عالمتاب ظہورِ الٰہی ہے (نعوذ باللہ) لیکن مستقل گردش نے شام کی آغوشِ تاریک میں اسے غروب کرکے آپ کے تخیل کی تردید فرمائی، پھر چاند کا ظہور ہوا تو انھوں نے رات کو منور کر دینے والے چاند کی قوت کو خدا سمجھا مگر اسے بھی ناپائدار پایا، پھر ستاروں کی محفل میں جلوۂ یار کی جستجو کارفرما رہی مگر بے ثباتیٔ نور نے تخیل کو ایمان کی پختگی نہ دی اور آخر انھیں سب پر قدرت رکھنے والا ملا۔۔۔۔" اس میں قرآن پاک کے بتائے ہوئے واقعہ کی ترتیب ہی کو سرے سے الٹ دیا، حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے پہلے ستارہ دیکھا، پھر چاند پر نظر کی اور اس کے بعد آفتاب کا مشاہدہ کیا، جب وہ بھی ڈوب گیا تو خالقِ ارض و سمٰوٰت کی ربوبیت کا اقرار فرمایا۔

(صفحہ ۱۸۶) "ہماری ملتِ اسلامیہ نے غمِ فردا سے بے نیاز ہو کر مستقبل کے لیے کچھ نہیں سوچا" اس مستقبل کا نام آخرت ہے، اس نے آخرت کے معاملے خدا پر چھوڑ دئے ہیں، اور انگریز قوم نے فکر سے مستقبل کو زیرِ بحث رکھا ہے، اس لئے دنیا و آخرت دونوں پر قابو ہے۔۔۔۔" "انگریز قوم نے فکر سے مستقبل کو زیرِ بحث رکھا ہے" اس جملہ کی کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہے ـــــ یہ تو رہی زبان و اظہار کی خامی اور فکر و نظر کی خامکاری کا یہ عالم ہے کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ جسے "آخرت" فرماتا ہے اُسے عارف صاحب بٹالوی "مستقبل" سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ اثر ہے "علامہ پرویز" کی تعلیم کا، جنھوں نے "آخرت" کے معنیٰ ہی بدل دیئے ہیں، ـــــ (صفحہ ۱۸۶) "اس لیے کہ فطری اصولات کے تحت نہیں ہے ـــ" "اصولات" پڑھ کر وجدان تلملا اٹھا ـــــ (صفحہ ۱۸۷) "قرآن میں سائنس ہے گویا سائنس قرآن کا جزِ اکبر ہے" "یہ بھی تو کہیئے کہ ایڈیسن اور مارکونی قرآن کے سب سے بڑے مفسر ہیں ـــ

(صفحہ ۲۵۱) "ان کے ارادوں میں استحکامت اور نیتوں میں اٹل فیصلے آگئے تھے" اس "استحکامت" کا کیا جواب ہے اور پھر "نیتوں میں اٹل فیصلوں کا آجانا" طرفہ قیامت! کسی ادیب اور انشا پرداز کے قلم اور زبان سے ایسے جملے سوتے میں بھی نہیں نکل سکتے ـــــ (۲۶۱) "خدا کی راہ پر سب کچھ قربان کردیں گے" یہاں "پر" کی جگہ "میں" کا محل تھا ـــ (صفحہ ۳۲۶) "ڈھینگ مارتا ہے" "ڈینگ" ہے صحیح املا، "ڈھینگ" بالکل غلط ہے ـــــ "اسی طرح دنیا کے سب سے بڑے امام سید الانبیا خیر البشر رسول اللہؐ ہیں، آپ بیک وقت

بہترین سپاہی بھی ہیں اور عمدہ امام اعظم بھی"۔ "عمدہ امام اعظم" نے جملے کا شکوہ ہی غارت کر دیا۔
(صفحہ ۳۴۱) "وما هذه الحيوة الدنيا الا لهو ولعب وان الدار الاخرة لهى الحيوان" اس آیۃ کا یہ ترجمہ "یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے، اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے" غیر ذمہ دارانہ آزاد ترجمہ ہے ــــــ صفحہ "۲۵۶" کی عبارت کا ایک حصّہ ہے:۔

"قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ حسن معاملہ میں ایک دوسرے سے احسان کرو، اسی ایک لفظ "احسان" میں ساری تفسیر سمٹ کر آگئی ہے، مثال کے طور پر آپ ایک فوٹو گرافر کے پاس تصویر کھنچوانے جاتے ہیں" دو روپیہ پر معاملہ ہو جاتا ہے اب اس اُجرت میں یہی کافی تھا کہ وہ آپ کو پہلا عمل (نیگیٹو) دیدے، لیکن وہ اس کے پرنٹ نکالتا ہے اور پھر اپنے علم و ہنر اور فنِ تصویر کشی سے جوہر عطا کرتا ہے، اسی کا نام "احسان" ہے، اسلام نے آرٹ کا احترام کیا ہے، لیکن اس حد تک کہ تصویر مُصوّر کے فن کی رہینِ منت رہے، مُصوّر یا کوئی دوسرا اس میں جذب نہ ہو جائے اس جذب ہونے کا نام شرک ہے، اور یہ خطرہ اس وقت لاحق ہوتا ہے جب مُصوّر کی خودی بلند نہیں ہوتی ــــ"

یہ ہے وہ "قرآن فہمی" جو پرویز صاحب کے "معارف القرآن" کی بدولت عارف صاحب کو نصیب ہوئی ہے، قرآن کی اصطلاح "احسان" کی تفسیر کے سلسلہ میں مثال بھی دی تو کس کی؟ فوٹو گرافر کی اس انتقالِ ذہنی کی کہاں تک داد دی جائے؟ اور "شرک" کی جو تعریف بیان فرمائی گئی ہے، وہ تو زبردست "ریسرچ" ہے، یہ جو حضرتِ لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:۔

"يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ، إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ"

تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا بیٹا مُصوّری کرتا تھا، اور لقمان اُس کو نصیحت فرما رہے تھے کہ مصوّری تو ضرور کرتے رہنا کیونکہ اسلام نے آرٹ کا احترام کیا ہے مگر دیکھنا کہیں تصویر میں جذب نہ ہو جانا کہ یہ شرک ہے ــــ اگر پرویز اور عارف جیسے دو چار مفسر اور پیدا ہو گئے تو قرآن سچ مچ بازیچۂ طفلاں بن کر رہ جائے گا۔

## "تنظیم اہلسنت" کا "مرزا غلام احمد نمبر"

ہفت روزہ "تنظیم اہلِ سنت" کا "مرزا غلام احمد نمبر"، مدیر:۔ سید نور الحسن بخاری کتابی سائز ضخامت ۱۰۸ صفحے، قیمت فی پرچہ دس آنے، ملنے کا پتہ:۔ دفتر "تنظیم اہلِ سُنت چوک جھنڈا بازار، لوھاری دروازہ، لاہور۔

ہفت روزہ "تنظیم اہلِ سنت" کا "مرزا غلام احمد نمبر" اس قدر مقبول ہوا۔ کہ تیسری بار اُس کے چھاپنے کی نوبت آئی، یہی تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے ــــــ اس "نمبر" کو رسالوں، اخباروں اور مشہور شخصیتوں نے خوب خوب سراہا، پنجاب اسمبلی کے اسپیکر شیخ فیض محمد صاحب نے اپنی رائے کا ان لفظوں میں اظہار کیا:۔

"تنظیم اہل سنت" کے "مرزا صاحب نمبر" کا میں نے بغور مطالعہ کیا، اس کی ترتیب پر میں سید نور الحسن صاحب کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتا ہوں، اُنھوں نے تنظیم کے خاص نمبر کی اشاعت سے ملتِ اسلامیہ کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے، مرزائیت کے بارے میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے خیالات کی اشاعت خصوصیت کے ساتھ جاذبِ توجہ ہے، ان خیالات کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علامۂ موصوف نے کسی ہنگامی جذبہ کے ماتحت ان کا اظہار فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یہ رائے گرامی برسوں کے عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ تنظیم اہلِ سنت کے مندرجہ مضامین پڑھنے کے بعد کوئی معقولیت پسند انسان مرزا صاحب

کے دعویٰ نبوت کا قائل ہوسکتا ہے۔۔۔۔"

"مرزا غلام احمد نمبر" میں مستند حوالوں کے ساتھ قادیانی عقاید کو طشت از بام کیا گیا ہے، قادیانیوں کے مشہور ارگن "الفضل" نے جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۵ میں لکھا ہے:-

"یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر شخص ترقی کرسکتا ہے اور بڑے سے بڑا درجہ پا سکتا ہے: حتیٰ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ سکتا ہے —" (نعوذ باللہ — نقلِ کفر کفر نباشد)

قادیانیت کے بارے میں مفکرِ اسلام شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا فیصلہ سنئے:-

"قادیانیت اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہے گویا کہ یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہو۔"

قادیانی جماعت کو برطانوی حکومت سے کیا تعلق تھا؟ یہ انھی کے اخبار "پیغام صلح" (صفحہ ۶ ۵ ۱۲/۴۲) کی زبانی سنئے:-

"جماعتِ احمدیہ کا سب سے پہلا باقاعدہ اجتماع جو ۱۸۹۲ء میں منعقد ہوا، اس کی کیفیت "آئینہ کمالاتِ اسلام" میں درج ہے، اسی کیفیت میں لکھا ہے کہ آئندہ بھی اس جلسہ کے یہی مقاصد ہوں گے۔۔۔۔ کہ اس گورنمنٹ برطانیہ کا سچا شکرگزار اور قدردان بننے کی کوششیں اور تدبیریں کی جائیں —" اور وہ "کوششیں اور تدبیریں" آج تک کی جارہی ہیں!

اس بات کو سب جانتے ہیں کہ وکالت ایسا پیشہ نہیں ہے جسے کوئی صاحبِ تقویٰ اختیار کرسکے اور انبیائے کرام تو شروع ہی سے صالح فطرت اور انتہائی پاکباز ہوتے ہیں، مگر "سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۱۳۷، صفحہ ۱۳۸) کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ مرزا صاحب نے مختاری کے امتحان کی تیاریاں کیں، امتحان دیا مگر ناکامی ہوئی۔

کوئی گستاخ اور دریدہ دہن قاضی اکمل نامی غلام احمد قادیانی کا "اُمتی" ہے، وہ کہتا ہے:-

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں ۔۔۔ اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل ۔۔۔ غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

(الفضل صفحہ ۱۴ - ۲۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء)

حیرت ہے کہ علامہ عثمانی کی "الشہاب" ضبط ہو جاتی ہے اور اس کا فرانہ اور توہین آمیز لٹریچر پر کسی خدا کے بندے کی نگاہ نہیں پڑتی۔

اسی "مرزا نمبر" میں علامہ اقبال کا ایک مضمون (بحوالہ اخبار اسٹیٹسمین ۱۰ جون ۳۵ء) درج کیا گیا ہے، جس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:-

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کا رویہ فراموش نہیں کرنا چاہیے بانیٔ تحریک نے ملّتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے، اور اپنے مقلدین کو ملّتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا، علاوہ بر ایں اُن کا دین کے بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) — مسلمانوں کے قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ —"

یہی سبب تھا کہ حکومتِ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری سر ظفر اللہ خاں نے قائد اعظم کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی (صفحہ ۱۰۵ — تنظیم اہلِ سنت مرزا غلام احمد نمبر) —— "پاکستان" سے اس گروہ کو کس قدر محبت

ہوسکتی ہے، اُس کا اندازہ، ان جملوں سے کیجئے:۔

"ممکن ہے عارضی طور پر افتراق پیدا ہو، اور کچھ وقت کے لیے دونوں قومیں جُدا رہیں، مگر یہ حالت عارضی ہوگی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ جلد دور ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے۔ (ارشادات مرزا محمود خلیفہ قادیان مندرجہ "الفضل" ۵ راپریل ۱۹۴۷ء)

تنظیم اہلِ سنت کا یہ شمارہ معلومات آفریں ہے، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی نظموں نے اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، حق کی حمایت اور باطل کی تردید: انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، مُدیر اور مضمون نگاروں کو اللہ تعالیٰ اس کی جزا عطا فرمائے گا۔

## لطائف ملا نصر الدین

"لطائف ملا نصر الدین" ترجمہ:۔ ضیاء الدین احمد برنی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، خوبصورت گردپوش اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ:۔
تعلیمی مرکز، گیدو مل لیکھراج روڈ، کراچی۔

آدمی کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، لیکن کبھی کبھار مزاح و ظرافت کے لیے بھی دل چاہنے لگتا ہے، خندہ و تبسم سے بڑے سے بڑے زاہد اور متقی کی زندگی بھی خالی نہیں رہ سکتی، اُردو زبان میں جو "لطیفے" کتابی صورت میں چھپے ہوئے ملتے ہیں وہ زیادہ تر بیربل اور ملا دو پیازہ کی باہمی چشمک اور آپس کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق ہیں، ان لطیفوں میں اصلیت کم اور بناوٹ زیادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن پھر بھی بعض باتیں لُطف سے خالی نہیں، اور انہیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔

جناب ضیاء الدین احمد برنی نے اس کمی کو پُورا کرنے کے لیے ایران کے ایک اہلِ قلم آقا محمد رمضانی کی فارسی کتاب کو اُردو ترجمہ کا قالب عطا کیا ہے، ترجمہ شستہ اور رواں ہے، عبارت اس قدر سلیس ہے کہ "ترجمہ کا گمان تک نہیں ہوتا، اور سہل اتنا کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

فاضل مترجم نے صحتِ زبان کا بہت خیال رکھا ہے، اور اس پر ہم اُسے مبارکباد دیتے ہیں، ورنہ آجکل لکھنے والے عام طور پر زبان سے بے پروائی برتتے ہیں اور بہت سوں کو تو "زبان" ہی نہیں آتی جس لفظ اور جس محاورہ کو جس طرح چاہا لکھ مارا، جناب برنی صاحب کو زبان پر قدرت حاصل ہے، پُوری کتاب میں زیادہ سے زیادہ دو تین جگہ تسامح ہوا ہے ——

"ملا کی بیوی ایک مرتبہ اس قدر بیمار ہوئی کہ بستر سے لگ گئی" روزمرہ "پلنگ سے لگ جانا" ہے —— یعنی "وہ اس قدر بیمار ہوئی کہ پلنگ سے لگ گئی" —— (صفحہ ۳۰) "اُس سے ہر قسم کا استفادہ حاصل کرے" —— "استفادہ کرے" لکھنا تھا، "حاصل" زاید ہے ——

اس کتاب میں ہر طرح کے لطائف ملتے ہیں، بہت زیادہ دلچسپ، کم دلچسپ اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن میں "آمد" سے زیادہ "آورد" پائی جاتی ہے، عجیب بات ہے کہ اس کتاب کے بعض لطیفے اُردو میں بہت "مشہور ہیں، اور وہ شاید اس لیے کہ شعر و ادب، مزاح و ظرافت اور فکر و دانش کی بعض باتیں تمام زبانوں میں مشترک ہیں۔

حیدر آباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ میں لطائف و ظرائف کی ایک فارسی کتاب —— "یک ہزار و یک خندہ" ہماری نگاہ سے گزری ہے، اُس کے ادبی اور علمی لطیفے بہت دلچسپ ہیں، اگر وہ کتاب برنی صاحب کو مل جائے تو اُس کو اُردو زبان میں ضرور منتقل فرما دیں۔

یہ کتاب ــــ "لطائف ملا نصر الدین" ــــ کتابت و طباعت کی خوبیوں اور ظاہری آرائشوں کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے، اس قدر اہتمام کے ساتھ اردو میں کتابیں کم چھپتی ہیں، فاضل مترجم کی تین کتابیں ــــ "کیوپڈ و سائیکی" ــــ "جمال الدین افغانی" ــــ اور "ذکار اللہ دہلوی" عنقریب منظرِ عام پر آرہی ہیں!

## نماز کی حقیقت

"نماز کی حقیقت" از محمد منظور نعمانی ــــ ضخامت ۹۵ صفحے، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- کتب خانہ "الفرقان" گوئن روڈ۔ لکھنؤ،

نماز کی حقیقت، اہمیت، جامعیت اور افادیت پر یہ ایک جامع کتاب ہے، جس کا ایک ایک حرف لکھنے والے کے خلوص اور جوشِ ایمانی کا آئینہ دار ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نماز پڑھنے کے لیے جس توجہ اور خشوع کی ضرورت ہے وہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ پوری کتاب حلاوتِ ایمانی سے معمور ہے، اس میں قرآن کی آیتیں ہیں، رسولؐ کی حدیثیں ہیں اور صحابہ کے آثار ہیں ــــ عبارت انتہائی سہل اور سلیس، دلنشیں انداز!

اس کتاب کے مضامین میں امام غزالی، ابن قیم، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی تالیفات سے استفادہ کیا گیا ہے، ــــ مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ ان کی یہ کتاب بہت سوں کی نماز درست کر دے گی، بے نمازی اور نمازی سبھی کے پڑھنے کی چیز ہے۔

## کلمہ طیبہ کی حقیقت

"کلمہ طیبہ کی حقیقت" از :- محمد منظور نعمانی ــــ ضخامت ۵۲، صفحات، قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :- مکتبہ "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ، جاہل اور عالم، غریب اور مالدار، رند اور متقی، غبی اور ذہین سبھی مسلمان کلمہ پڑھتے ہیں، مگر ان میں سے کتنے ہیں جو کلمہ طیبہ کی حقیقت سے باخبر ہیں، ہم سب رسموں اور لفظوں کے پجاری رہ گیے ہیں، دین کی روح باقی نہیں رہی، ہم ہوا و ہوس کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں!

مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کتابچہ میں بتایا ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھنے، خدا کی ربوبیت اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کے اقرار کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کی پوری پوری متابعت کی جائے، زبان سے کلمہ پڑھتے رہنا اور اپنے عمل سے کلمہ کی غرض و غایت کی نفی کرنا، منافقت ہے۔

"کلمہ طیبہ کی حقیقت" ــــ اس قابل ہے کہ اسے لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر مسلمانوں تک پہونچایا جائے ــــ

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

مسلمانوں میں "لا الٰہ" کا احساسِ ذمہ داری پیدا ہونے کی شدید ضرورت ہے، اور جس دن یہ ہو جائے گا، اسی دن سے ان پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہونے لگے گی۔

## صبح آرہی ہے

"صبح آرہی ہے" ضخامت ۱۴ صفحے ــــ ملنے کا پتہ :- مرکزی مکتبہ حلقہ ادب اسلامی، کراچی!

"ادب" بہت زمانہ سے "جاہلیت" کے اندھیرے میں گم ہے، اسے اجالے میں لانے کے لیے ان شاعروں اور ادیبوں نے کمر ہمت باندھی ہے جو اسلام کو "نورِ مبین" سمجھتے ہیں، اور جن کا یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی صراطِ مستقیم ہے!

۲۱ر مارچ ۱۹۵۰ء کو کراچی میں مرکزی حلقہ ادب اسلامی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا، جاہلی ادب کے خلاف یہ

پہلی آواز تھی جو بلند کی گئی ــــــــــ اس اجلاس میں جو نظمیں، مقالے اور افسانے پڑھے گیے، اُن کو اس کتابچہ میں جمع کر دیا گیا ہے،" ہر مضمون اور ہر نظم مطالعہ کے قابل ہے، اس کتاب کے مضامین کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ادبی قافلہ کی سمت ہی بدل گئی، بلکہ یوں سمجھئیے کہ ہمارا قبلہ درست ہو گیا ـــ

جناب آسعد گیلانی کا افسانہ (ایک عورت دو ملک) اس مجموعہ کی جان ہے، جلسہ کی روداد کو بڑی دلچسپی اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور وہ خود ایک مستقل مضمون ہے، آج ہم کہہ رہے ہیں "صبح آرہی ہے" اللہ نے چاہا تو کل کہیں گے

"صُبح آچکی"

یہ یقین و ایمان کی صبح ہو گی، جبکہ کفر و جاہلیت کے تمام نقش مٹ جائیں گے!

## قیامت

"قیامت" :- از رئیس احمد جعفری، ضخامت ۴۴۸ صفحات، مجلد مصوّر گرد پوش کے ساتھ، قیمت پانچ روپے، ملنے کا پتہ :- ایوانِ اشاعت گرانٹ روڈ، کراچی۔

جناب رئیس احمد جعفری ایک طرف بسیار نویس اور زود نویس ہیں، اور دوسری طرف خوب نویس بھی ہیں، یہ اوصاف ہر کسی کو میسر نہیں آتے ـ "تا نہ بخشند خدائے بخشندہ"، یہ ناول اُس ہنگامہ خونیں کی یادگار ہے جسے تاریخ کا حافظہ شاید کبھی بھول نہیں سکتا، یہ وہ قیامت آفریں دور تھا جبکہ ہندوستان کے رہنے والے سچ مچ درندے اور وحشی بن گیے تھے!

ناول نگار نے جذبات کی رو میں بہ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اُس نے جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی بربریت کو پیش کیا ہے، وہاں مسلمانوں کی وحشت اور جہالت پر بھی طنز کی ہے،

پلاٹ کافی دلچسپ ہے، بیان میں زور اور جاذبیت ہے، اور زبان بہت زیادہ سہل و سلیس! کردار نگاری میں نفسیات کو سمو دیا ہے، پڑھتے میں طبیعت متاثر ہوتی ہے اور نفس اثر قبول کرتا ہے، اس قسم کے جملوں ــــــــ "بیٹی! مت رو، جو کچھ تو گنوا چکی اُسے میں واپس نہیں لا سکتا ــــــــ نے ناول کو کافی اثر انگیز بنا دیا ہے ـــ

دوسرا رُخ ــــــــ نہ جانا کہ جاتا ہے دنیا سے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

داغ کے اس مشہور شعر کو حسرت سے منسوب کیا ہے ــــــــ (صفحہ ۱۳) "مُنہ چُپ ہو گیا، پھر مسکرایا اور زبان مارنے لگا ــــــ "زبان مارنا" کیا بات ہوئی؟ یہ محاورہ آج تک سُننے میں نہیں آیا ــــــــ (صفحہ ۲۴) "سردار جی اپنی لمبی تڑنگی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہے تھے" "لمبا تڑنگا" قد و قامت کے لیے بولا جاتا ہے، ڈاڑھی اور سر کے بالوں کیلئے بولنا درست نہیں ــــــــ (صفحہ ۸۷) "ہتیا چار" صحیح "اتیا چار" ہے! ــــــــ (صفحہ ۱۰۸) "مولا اینٹ کا تکیہ بنائے چپ چاپ لیٹا تھا" ــــــــ "مولا اینٹ کو تکیہ بنائے یا اینٹ کا تکیہ لگائے چپ چاپ لیٹا تھا" لکھنا چاہیئے تھا ــــ

(صفحہ ۱۱۱) "اُس کی نظریں لاجونتی کی ننھی ننھی پتیوں کی طرح جُھک گئیں" چونکہ یہاں محسوس چیز سے تشبیہ دی جا رہی ہے، اس لیے "نظروں" کی جگہ "آنکھیں" زیادہ موزوں تھا ــــــــ صفحہ (۱۵۴) "اور پھر سب ایک دوسرے سے گھُٹ کر بیٹھ گئے" "جمٹ کر بیٹھ گئے" لکھنا تھا ــــــــ (صفحہ ۲۰۰) "ان کڑاکے کے فاقوں نے مجھے مریض کا بنا دیا ہے" "کڑاکے" "جاڑوں" کی صفت ہے نہ کہ فاقہ کی!

(صفحہ ۲۰۲) "وجیت نے دو روٹیاں دال کے ساتھ کھالیں، بھُنا ہوا گوشت اور شامی کباب مولا کے لیے چھپا کر رکھ دیئے"

—— کسانوں، چھوٹے زمینداروں اور گاؤں والوں کے یہاں ایک وقت میں کئی کئی کھانے نہیں پکا کرتے، یہ اُن کی معاشرت کی غیر واقعی ترجمانی ہے، (صفحہ ۲۷۰) "جہاں یہ سماج نہیں ہوگی" "سماج" عام طور پر مذکر بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۳۰۴) "کیا یہ سارے کام محبت کے سوا اور کوئی مجھ سے کرا سکتا تھا" یہ نتیجہ ہے زود نویسی کا کہ جملہ کی ساخت میں جھول ہی نہیں "ذم" بھی پیدا ہوگیا۔ —— ایک جگہ "نبٹانے کو" "نپٹانا" لکھا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

"قیامت" —— بہرصورت ایک دلچسپ پیش کش ہے، اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ناول کا نام بھی بہت خوب ہے، ناول نگار نے اس "قیامت" کو لفظوں میں بند کر دیا ہے!

## مسدس بے نظیر

"مسدس تہنیت جشن بے نظیر" از:— میر یار علی جان صاحب ریختی گو، مرتبہ:— محمد علی خاں اثر رام پوری، ضخامت ۱۶۶ صفحے مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے چار آنہ ملنے کا پتہ:—

اثر رام پوری خسرو باغ روڈ، رام پور- یو-پی (بھارت)

جناب محمد علی خاں اثر رام پوری، نہایت خوش فکر شاعر ہیں، اُن کا یہ شعر بہت مشہور ہوچکا ہے:—

یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں
اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایام کچھ اور

یہ کتاب انھیں اثر صاحب کی ترتیب دی ہوئی ہے، اُن کی کاوشِ جستجو کا یہ عالم ہے کہ ان سو ڈیڑھ سو صفحوں کے لیے انھوں نے دو چار نہیں چھبیس کتابوں سے استفادہ کیا ہے، یوں سمجھئے کہ چمن چمن گھوم پھر کر، اثر صاحب نے اپنی پسند کے پھولوں کو چن کر یہ گلدستہ سجایا ہے۔

اس انقلابِ آزادی نے ریاستوں اور رجواڑوں کی بساط ہی کو اُلٹ دیا، جو دوسروں کو تنخواہیں، منصب اور وظیفے دیا کرتے تھے، اب وہ بھارت راج کے پنشن خوار ہیں، چرخِ نادرہ کار کے ایک ہی چکر میں بلندیاں پستیوں سے بدل گئیں۔

اگلے پچھلے اور موجودہ والیانِ ملک میں سے بہت سوں کو دنیا بھول جائے گی، مگر کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہیں جو کسی نہ کسی عنوان سے لوگوں کو یاد رہیں گی، انھیں میں سے ایک ہستی نواب کلب علی خاں مرحوم فرماں روائے رام پور کی ہے۔

نواب کلب علی خاں کے دور میں رام پور سچ مچ دارالسرور تھا، ہر فن کے اہلِ کمال کھنچ کر رام پور میں آگئے تھے، چین تھا، آرام تھا، فارغ البالی تھی، راعی اور رعایا دونوں خوش اور مطمئن تھے۔

نواب صاحب خلد آشیاں کے دور میں "بے نظیر" باغ میں سال کے سال ایک میلہ لگا کرتا تھا— میلہ کیا تھا یوں سمجھو کہ رام پور میں چند دنوں کے لیے جنت اتر آتی تھی —— جناب اثر رام پوری نے اسی "جشن" کی تفصیل کو محفوظ کرنے کے لیے یہ کتاب مرتب کی ہے۔

مؤلف کا اندازِ نگارش کافی دلچسپ ہے، اُس کے قلم نے مناظر کی خوب خوب تصویر کشی کی ہے —— اس جشن کی تفصیل کے سلسلہ میں، شاعروں، قوالوں، گویوں اور نکلیوں کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ طوائفوں کے بھی حالات زندگی مؤلف نے جمع کر دیئے ہیں، یہ پہلی کتاب ہماری نظر سے گزری ہے، جس میں طوائفوں کو "ہیرو" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب اصل میں مشہور ریختی گو جان صاحب کے غیر مطبوعہ مسدس (تہنیت جشن بے نظیر) کو منظرِ عام پر لانے کے لیے لکھی گئی ہے، مسدس میں ایک سو تین بند ہیں، اور جان صاحب کی شوخیٔ فکر جگہ جگہ نمایاں ہے۔

جان صاحب کے مسدس کے علاوہ، دوسرے نامور شعراء کے منتخب اشعار بھی درج ہیں، جن میں "باغ بے نظیر"

کے میلہ کی سجاوٹ، آتش بازی اور رونق و دلکشی کے ساتھ مالنوں، ساقنوں اور تنبولنوں کے حُسن و جمال کی بھی تعریف کی گئی ہے۔
یہی وہ جشن تھا کہ جس کے دیکھنے کی غالب کو حسرت ہی رہ گئی، ضعفِ پیری کے سبب وہ نہ آسکے۔ ــــــ امیر مینائی جیسا پاکیزہ شاعر بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا:-

آمیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور
خبر ہے میلے میں اُس مہ لقا کے آنے کی

اور داغ دہلوی کا جو وہ مشہور شعر ہے:-

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

تو اس "رومان" کا آغاز بھی اسی جشن میں ہوا تھا۔
یہی وہ دور تھا جب شمشیر و سنان رخصت ہو چکی تھیں اور "طاؤس و رباب" محفلوں میں آچکے تھے، اس تضاد کو کیا کہیئے کہ علامہ عبدالحق خیر آبادی اور مولوی ارشاد حسین جس دربار میں نظر آتے تھے، اُسی دربار سے خسو خاں گویے اور اللہ رکھی اور بندی جان وغیرہ طوائفوں کی سرپرستی ہوتی تھی ــــــ
دُنیا جسے "آرٹ" سمجھتی ہے، اسلام کی نگاہ میں وہ "جاہلیت" ہے اور جاہلیت کے کارناموں پر فخر کرنا مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا!

## موجِ سلسبیل

"موجِ سلسبیل" از:- نظر سیہوری ــ ضخامت ۲۵۶ صفحات، طباعت، کتابت، کاغذ، جلد اور گرد پوش سب کے سب خوبصورت اور نظر نواز، قیمت درج نہیں ہے ملنے کا پتہ:- ہند پبلکیشنز ۲۰۱ شریف دیوجی اسٹریٹ بمبئی ۳ ـ
"موجِ سلسبیل" جناب نظر سیہوری کے سلام، قصائد، رُباعیات اور قطعات کا دلکش مجموعہ ہے، جو جناب وحشی رحمانی کے اہتمام سے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے، اہلِ بیتِ اطہار سے شاعر کی والہانہ محبت اور عقیدت ایک ایک شعر سے جھلکتی ہے، نظموں میں روانی ہی نہیں بیساختگی بھی ہے، کہیں کہیں تو جناب نظر نے کاغذ پر دل کے ٹکڑے پھیلا دیئے ہیں ــــــ ان چند اشعار کو پڑھیئے اور لُطف اُٹھایئے:-

کہا حسینؓ نے ہم ماسوا کو کیا جانیں　　معاملہ ہے ہمارا تو کردگار کے ساتھ

---

وہ اکبرؓ کی اذاں دشتِ بلا میں صبح عاشورہ　　چمن میں بلبلوں کا چہچہانا یاد آتا ہے
مسلمانوں پہ جب کوئی نئی اُفتاد پڑتی ہے　　تو اُمت کو محمدؐ کا گھرانا یاد آتا ہے
گلے پر شہؓ کے تھی تلوار ہونٹوں پر تبسم تھا　　قضا کو اب تک اُن کا مُسکرانا یاد آتا ہے

---

تھی مشیت کی نظر بھی کس قدر جوہر شناس　　چُن لیا دستِ خدا کو فتحِ خیبر کے لیئے

---

جگمگاتی ہے اسی کی روشنی سے کائنات　　کون کہتا ہے کہ گل شمعِ امامت ہو گئی

---

مراتبِ شاہؓ کے کس طرح شمرِ بے حیا دیکھے　　ہوس نے جس کی آنکھیں بند کر دی ہوں وہ کیا دیکھے

---

فضیلت کے لیے حُسنِ عمل کی بھی ضرورت ہے　　کتابیں پڑھ کے انساں عالم و فاضل نہیں ہوتا
شرابِ حبِ شاہؓ کربلا کا کیف کیا کہیئے　　نگاہیں جھوم جھوم اُٹھتی ہیں دل غافل نہیں ہوتا

---

اَشکِ غمِ حسینؓ کی قیمت نہ پوچھیئے　　دو آنسوؤں سے ہم نے شفاعت خرید لی

---

"موجِ سلسبیل" پر ایک دو نہیں سات "تقریظیں" ہیں، جن میں بعض "رسمی انداز" کی ہیں، صفحہ ۲۰ پر مولانا سید ابن حسن جارچوی لکھتے ہیں:-

"امام حسین علیہ السلام کا تعارف کراتے ہوئے جدید اصطلاحیں استعمال کی ہیں" —— حیرت ہے! کیا جناب امام کی شخصیت کسی کے "تعارف" کی محتاج ہے!

یقین ہے "موجِ سلسبیل" اربابِ ذوق میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی، اور اس کتاب کے ذریعہ اہلِ نظر جناب نظر سیہوری سے متعارف ہو جائیں گے!

## اِسلام کیا ہے!

"اسلام کیا ہے"؟ از:- محمد منظور نعمانی، ضخامت ۲۴۴ صفحات کتابت جلی اور دیدہ زیب طباعت نظر افروز، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے آٹھ آنہ، غیر مجلد دو روپے، ملنے کا پتہ:- کتب خانہ "الفرقان" لکھنؤ (بھارت)

اُردو زبان کے مشہور دینی ماہنامہ "الفرقان" کے فاضل مدیر —— جناب مولانا منظور نعمانی کا قلم آغازِ نگارش ہی سے اسلام کی خدمت کے لیے وقف ہے، مولانا موصوف کو ہر دم یہی دُھن رہتی ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی باتیں کسی نہ کسی طرح اللہ کے بندوں کے کانوں میں پڑتی رہیں ——

یہ کتاب —— "اسلام کیا ہے"؟ مولانا نعمانی کے دینی شغف اور جذبہ تبلیغ حق و صداقت کی ایمان افروز یادگار ہے، نماز روزے سے لیکر معاشرت، معاملت، جہاد و شہادت اور توبہ و استغفار تک کے موضوعات کی فاضل مصنف نے جس سلیقہ، ربط و ترتیب اور تفحص و تبحر کے ساتھ تشریح کی ہے، وہ اُنہیں کا حصہ ہے، ایک ایک حرف سے خلوص اور گداز جھلکتا ہے اور ایک ایک سطر لکھنے والے کے ذوقِ یقیں اور جذبۂ ایمانی کی گواہی دیتی ہے -

صفحہ (۴) پر مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث درج ہے:-

"جو شخص دین کو سیکھنے اور جاننے کی اس لیے کوشش کرے کہ دوسروں میں اس کو پھیلائے اور لوگوں کو اس کے مطابق چلانے کی کوشش کرے، تو وہ آخرت میں پیغمبروں کے اس قدر قریب ہوگا کہ اُس کے اور پیغمبروں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"

مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کتاب کے ذریعہ اسی فریضہ کو ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے —— پھر لطف یہ ہے کہ طرزِ بیان انتہائی دلنشین، عام فہم اور سلجھا ہوا ہے، باتوں باتوں میں دین کے نکات بیان کر دیئے ہیں، اور جو کچھ کہا ہے اُس کے لیے قرآن اور حدیث سے سند پیش کی ہے، قرآنی آیات اور احادیث رسولؐ کے ترجمے بہت ہی

خوب ہیں۔

اس معصیت زدہ دور میں جب کہ دین سے عام طور پر بے رغبتی پائی جاتی ہے، اس قسم کی کتابوں کو پھیلانے اور عام کرنے کی بہت ضرورت ہے، ـــــــــ "اسلام کیا ہے" کے مطالعہ سے قلب میں گداز اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی صحیح مصداق ہے یہ کتاب!

اس کتاب سے عوام ہی نہیں خواص بھی استفادہ کر سکتے ہیں، اتنی بہت سی ضروری چیزیں ایک جگہ مشکل ہی سے ملیں گی، کتاب کے آخر میں جو دعائیں درج کی ہیں، وہ کتاب کی افادیت پر خوشگوار اضافہ ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر اور مسلمانوں کو اس کے پڑھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ـــــــــ

## "سُہیل"

"سہیل" از:ـــ آغا حیدر مرزا ـــ ضخامت ۱۴۳ صفحے، مجلد قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ،
ملنے کا پتہ:ـــ کتب خانہ تاج آفس، بالمقابل میونسپل آفس، بندر روڈ، کراچی!

یہ کتاب جناب آغا حیدر مرزا کے چھ افسانچوں یا یوں سمجھئے کہ ادب پاروں کا مجموعہ ہے، زبان صاف ستھری اور بیان میں کافی زور پایا جاتا ہے، جملوں کی ساخت "تھیٹروں" کے ڈراموں سے ملتی جلتی ہے، کہیں کہیں آغا حشر کے اسلوبِ نگارش کا دھوکا ہوتا ہے،

"سہیل"، "ادب برائے ادب"، کے نظریہ کی ترجمان ہے، زندگی کا کوئی اصلاحی مقصد پیش نظر نہیں ہے، صرف "رومان" اور "جذبات"، کی ترجمانی! افسانے بظاہر "جگ بیتی" معلوم ہوتے ہیں مگر اُن کی رُوح بول رہی ہے کہ ان میں افسانہ نگار کی "آپ بیتی"، بہت کچھ شامل ہے، "رومان" جب ناکام ہوتا ہے تو جذبات آتش زیر پا ہو جاتے ہیں، یہ گرمی اِن افسانوں میں پائی جاتی ہے۔

صفحہ (۱۴) "ہر موضوع پر انتہائی و اختتامیہ اسباق دیئے جاتے ہیں" یہ افسانے کی زبان نہیں ہے، ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ـــــــ صفحہ (۱۹) "ایک غیر فہم تکان لئے ہوئے کوہ مرمر کی چوٹیوں پر چڑھنے لگا" ـــــــ "غیر فہم تکان" آخر کیا بات ہوئی! "سمجھنے میں نہ آنے والی" کا ترجمہ "غیر فہم" گرامر کے اعتبار سے غلط ہے۔ "ہر سانس میری روح میں ناسور پیدا کرتا رہے" ـــــــ "روح میں ناسور کا پیدا کرنا" آج تک سننے میں نہیں آیا، زبان و بیان اور طرز و اسلوب میں جدت اور اضافہ کے ہم قایل ہیں، مگر اس قسم کے ناروا اضافے قبول نہیں کیے جا سکتے۔

کتاب خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے، اور جلد تو خاص طور سے بہت خوبصورت ہے، پھر اُس پر سنہری تحریر اور بہار دے رہی ہے، "سہیل" بہر حال ایک دلچسپ کتاب ہے!
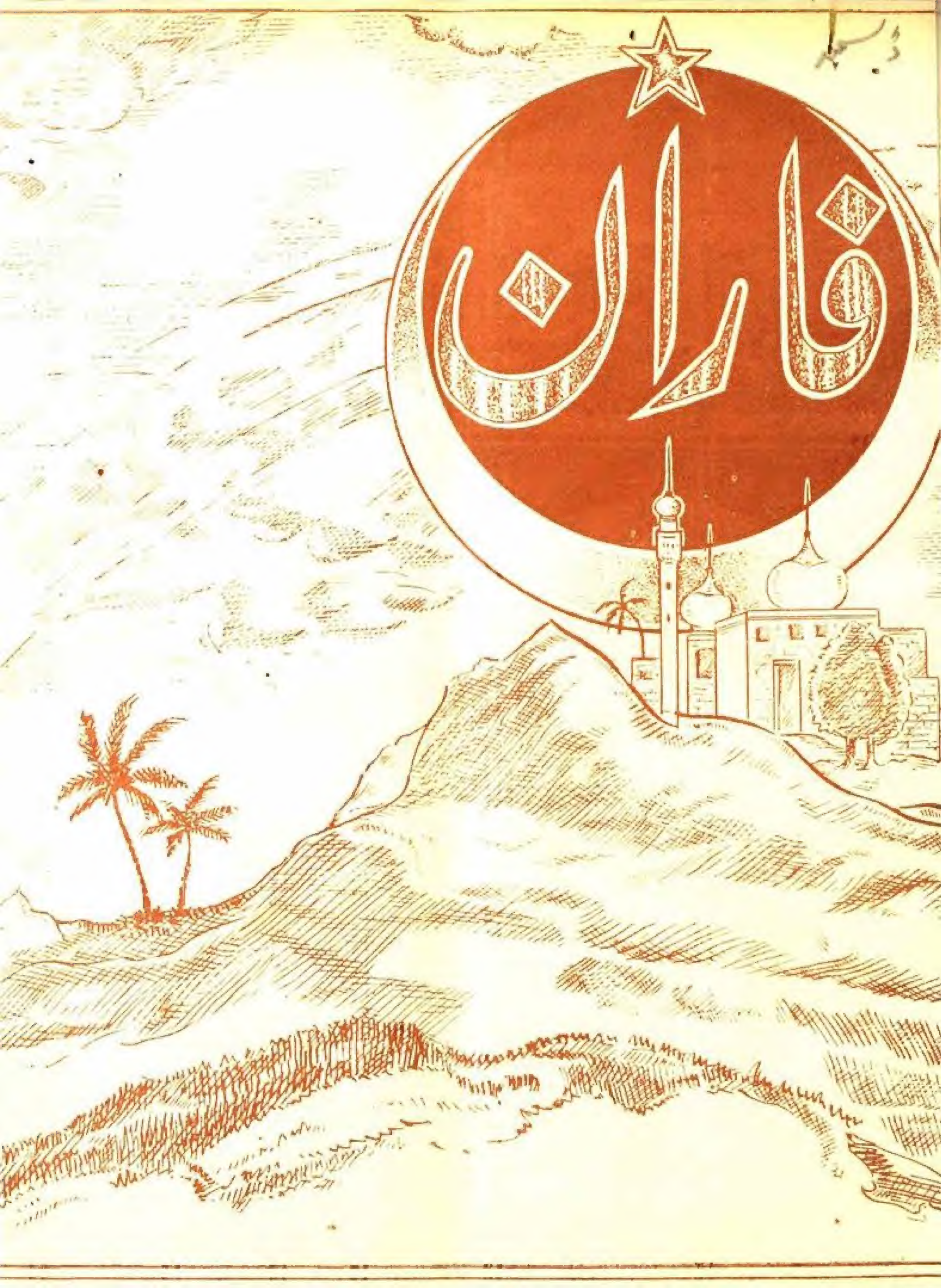
---

# فاران

جلد۲ شمارہ ۹

ماہنامہ

# فاران

دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر: فاران کیمبل اسٹریٹ

کراچی۱

## نظم و ترتیب
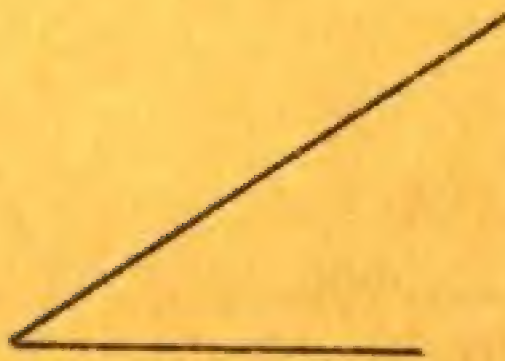
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقشِ اوّل

بھارت کے بعض ذمہ دار افراد کی زبان سے فخر اور طنز کی باتیں سُننے میں آرہی ہیں، فخر اس پر کہ بھارت " لادینی حکومت ہے" اور طنز اس بات پر کہ "پاکستان اسلامی حکومت ہے"! بھارت کے "سیکیولر اسٹیٹ" ہونے کو بار بار فخر کے ساتھ دُہرایا جارہا ہے ہمارا گمان نہیں یقین ہے کہ یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے اُن کا ضمیر ضرور ٹوکتا ہوگا کہ "ہیں! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، تم اپنے دعوے کی صداقت کو واقعات کی کسوٹی پر کس کر دیکھو، اپنے دلوں کو ٹٹولو، صرف کہہ دینے سے تو کوئی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ ۔ ۔ ۔ "

ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ زخموں کے چھیڑنے سے تکلیف و اذیت کے سوا اور فائدہ ہی کیا ہے، اور جس کا سینہ زخموں سے لالہ زار ہو وہ بیچارہ کس زخم کو دکھائے اور کس کو چھپائے! یہ داستان بہت الم انگیز ہے۔ ــــــ صرف دو باتیں (۱) گائے اور (۲) زبان، ہم یہاں کہنا چاہتے ہیں!

گئو کشی کے امتناع کے سلسلہ میں بھارت کی "لادینی حکومت" کے طول و عرض میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب پر ظاہر ہے، اس "جُرم" کی سزا دینے کے لئے اوّل تو ہندو قوم ہی لیشور کی کرپا سے موجود ہے اور اُسے کافی آزادی حاصل ہے اور بھی کوئی خوش نصیب "قوم" کی دار و گیر سے بچ جاتا ہے اس کی کسر پولس اور عدالتیں پوری کر دیتی ہیں۔

اُردو زبان کے ساتھ بھارت کی "لادینی حکومت" نے جو سلوک کیا ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت اور پردے کی بات نہیں ہے، علم و ادب کی تاریخ میں ایک بھی مثال ایسی نہیں مل سکتی کہ کسی زبان کے نہ صرف یہ کہ بے اثر بنانے بلکہ مٹانے کے لئے کسی قوم یا کسی حکومت نے اس قدر دشمنی کا ثبوت دیا ہو، بھارت راج کا اُردو زبان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر ہندو اور سکھ ادیب اور شاعر چیخ اُٹھے ہیں۔ کہ:-

اُردو بولنے والوں کی چیخ پکار اور آہ وزاری پر ترس کھا کر درس گاہوں میں "اُردو زبان" کو جن شرائط کے ساتھ باقی رکھا گیا ہے، اُن شرائط کی مصلحتیں اور نزاکتیں نہ پوچھیے!

ع ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

"بقا" کے نام پر "فنا" کی ایسی ایسی کارگر تدبیریں کہ "بیچاری اُردو" جیے گی بھی تو چراغ صبح گاہی بن کر جیے گی کہ اب بجھی تب بجھی! اُردو سے پریم رکھنے والوں کا نفسِ گرم اور سوزِ دل ہی اُسے زندہ رکھ سکے گا ورنہ بھارت کی "لادینی حکومت" تو اپنی دانست میں اس کے "کریا کرم" کا سامان کر چکی ———— بھارت راج کے مہامنتری پنڈت جواہر لال نہرو کی کوششیں بھی دھری کی دھری رہ گئیں، اُن کا بھی بس نہ چل سکا۔

"لادینی حکومت" کے اس کے سوا اور کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ "حکومت کوئی مذہب نہیں رکھتی" اس لئے اُس کے کسی قانون اور اُصول کی بنیاد کسی فرقہ کا مذہبی رجحان نہیں ہو سکتا، مگر بھارت راج کی انوکھی ریت ہے کہ ایک مخصوص فرقہ کا مذہبی معتقدات اور دھارمک اصولوں کی بقا کے لئے قانون میں گنجائشیں پیدا کی جا رہی ہیں مگر اس پر بھی دعویٰ یہی ہے کہ ہماری حکومت "سیکولر" ہے، یہ عجیب منطق اور نرالا قضیہ ہے کہ جس کے "صغریٰ اور کبریٰ" "نتیجہ" کی بالکل ضد ہیں!

گائے اور اُردو زبان کے سلسلہ میں گاندھی جی کے خیالات ہر کسی کو معلوم ہیں اور یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ مہاتما جی کوئی "ناستک" (ATHEIST) نہ تھے، وہ ایک مذہبی انسان تھے اور ہندو دھرم پر پوری مضبوطی اور خلوص کے ساتھ قائم تھے، مگر ان مسئلوں میں گاندھی جی کے نظریوں کو بھی ٹھکرا دیا گیا! ———— "لادینیت" اور "جمہوریت" کی ایسی ہنسی کسی نے کاہے کو اُڑائی ہو گی!

کانگریس کے "اکھنڈ ہندوستان" کا دعویٰ "ایک قوم" کے نظریہ کی بنیاد پر قائم تھا، موقعہ ملتے ہی پہلی فرصت میں خود کانگریس کے نیتاؤں اور مہاپرشوں نے اس بنیاد کو کھود کر پھینک دیا، مسلم لیگ کے قائدین نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا، وہ ایک ایک کر کے سامنے آتے جا رہے ہیں —

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے آخر اور ۱۹۴۸ء کے وسط میں جو پریشان کن حالات تھے، اُن میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ بھارت میں رہنے والے مسلمان اپنی تمام وفاداریوں اور عاجزیوں کے باوجود سراسیمہ سے ہیں اور نہ جانے کس وقت کیا بپتا آن پڑے! یہ ہم انتہائی محتاط انداز میں حالات کی شدت کو گھٹا کر عرض کر رہے ہیں اور ہم کیا کہہ رہے ہیں، بھارت کے مسلمانوں کی سراسیمگی اور پریشانی کو دیکھ کر آچاریہ جی راجگوپال آچاریہ نے مسلمانوں کی ہمت بندھانے کی ضرورت محسوس کی کہ "بہادر بنو! بہادر! ہمت سے کام لو....." ———— یہ سب "لادینی حکومت" کی برکتیں ہیں!

**موازنہ**

پاکستان میں اللہ کے فضل سے یہ دورُخی پالیسی اختیار نہیں کی گئی کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ! ہمارا دین منافقت نہیں سکھاتا! ہم نے اپنے مقصد، عزم، اُصول اور دستور و آئین کے ماخذ و منشا کو دُنیا کے سامنے رکھ دیا کہ "پاکستان اسلامی حکومت ہے" اور وہ اس لئے کہ ہم "اسلام" کو دنیا کی سلامتی اور عافیت کا ضامن سمجھتے ہیں، گزشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ جس جس گوشۂ ارض پر اسلامی حکومت قائم تھی وہاں عدل و انصاف کا ہر طرف دور دورہ تھا، اور انسانیت کو اتنا سُکھی اور خوش حال پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔

پاکستان کی مجلس دستور ساز نے قراردادِ مقاصد منظور کر کے "اسلامی حکومت" ہونے کا اعلان ہی کیا

ہے، اسلامی نظام ابھی یہاں قائم نہیں ہوا، لیکن صرف اس "نسبت" اور "اقرار" کا اثر ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ برتاؤ کیا جارہا ہے، ہمارے عوام مسلمان یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ غیر مسلموں کو پاکستان سے نکال دو یا پاکستان میں صرف مسلمان ہی رہ سکتے ہیں، اسلام نے اُن میں عالی ظرفی، شرافت اور انسانی ہمدردی پیدا کر دی ہے غیر مسلموں کے جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت ہمارا دینی فرض ہے، ہم اس اصول پر فخر کرتے ہیں ہماری قومی روایت ہے ہمیں ہمسائگی کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے ——— جس کسی کو ہماری بات میں مبالغہ یا شبہ نظر آئے، پاکستان میں آکر ان مناظر کو اپنی آنکھ سے دیکھ جائے وہ اپنی آنکھوں میں پاکستان سے ٹھنڈک لیکر جائے گا۔

ہمارے لیڈر ہر تقریر میں غیر مسلموں سے "وفاداری" کا مطالبہ کرکے اُن کو سراسیمہ اور بدحواس نہیں بناتے، دل آزار کے اس انداز کی اُنکو ہوا تک نہیں لگی وہ بیچارے اس "بھیتری مار" کو کیا جانیں ! ——— مسٹر منڈل نے جو کچھ کیا ہے، اگر بھارت کے کسی مسلمان وزیر نے ایسا کیا ہوتا تو "لادینی حکومت" میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک شور مچ جاتا کہ "ہر مسلمان غدار ہے، ہوشیار رہنا، یہ سب پاکستان کے جاسوس ہیں" ——— ہم مسلمان ایک کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالتے، یہ ہمارے مذہب کی تعلیم ہے !

پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں جب دہلی تشریف لیگئے تھے، تو "لادینی حکومت" کی اکثریت نے اُن کا بائیکاٹ کیا تھا، ہندو اخباروں نے بڑی شدید تنقیدیں لکھ لکھ کر چھاپی تھیں، مگر جب بھارت راج کے بڑے منتری پنڈت نہرو نے کراچی میں نزول اجلال فرمایا تو "اسلامی حکومت" کی رعایا نے اُن کا پُر جوش خیر مقدم کیا، اخباروں نے پنڈت جی کو "دھن باد" دیا اور اُن کی "سیوا" میں محبت کا ہدیہ پیش کیا یہ "اسلام" ہی کی وحدت کا اثر تھا کہ پاکستانی رعایا نے بالاتفاق "لیاقت نہرو معاہدہ" پر "لبیک" کہا ——— مگر بھارت کی "لادینی حکومت" کے بعض اخبارات آج تک یہی رٹ لگائے جارہے ہیں کہ "نہرو نے لیاقت سے معاہدہ کرکے، بھارت کو نیچا دکھایا ..." اور پھر اس معاہدے سے ناراض ہو کر مسٹر شیام پرشاد مکرجی کا استعفا اس کی غمازی کرتا ہے کہ "قوم" کیا چاہتی ہے ؟

"لیاقت نہرو معاہدہ" کے بعد بھارت کی "لادینی حکومت" اور پاکستان کی "اسلامی حکومت" کے اخباروں کے فائلوں کو اُٹھا کر دیکھا جائے تو دونوں کی زبان، بیان اور اظہار میں زمین آسمان کا فرق ملے گا، ایک طرف، نرمی، خوش خلقی، سمجھوتہ کی باتیں، معاہدہ کی پابندی، تنقید مگر حدود کے اندر ——— اور دوسری طرف درشتی، سخت کلامی، جنگ کی دھمکی، طرح طرح کے بہتان، نئی نئی تہمتیں اور عجیب عجیب انداز کے الزامات ! ایک ایک سطر سے معاہدہ کی خلاف ورزی ! ——— آسام کے خوفناک زلزلہ کے بعد پاکستان کی طرف سے دس ہزار من چاول کی پیش کش کا اعلان کیا جاتا ہے اور بھارت کے بعض اخبارات لکھتے ہیں کہ پاکستان کی یہ بھی ایک گہری چال ہے، وہ خراب اور سڑے ہوئے گیہوں دے کر بھارت سے اُس کے بدلے کوئلہ حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم نے اس قسم کی تنقیدوں کو پڑھا اور خدا جانتا ہے بڑا دکھ محسوس کیا کہ انتقام، عداوت، تعصب اور غصہ میں آدمی کا دل کیا اس قدر سخت اور حق ناشناس بھی ہو سکتا ہے ؟ ——— "اخبارات قوم کی آواز ہوا کرتے ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ بھارت کی "لادینی حکومت" کی "قوت فعال" "قوم" (اکثریت) کی آرزوؤں کا بڑی حد تک مظہر ہے !

اپنے سکہ کی قیمت گھٹا دی، پاکستان نے اپنے سکہ کی قیمت کو جوں کا توں رہنے دیا، یہ "جرم" بھی پاکستان ہی کے نامۂ
اعمال میں لکھا گیا کہ ہندوستانی حکومت کو اقتصادی طور پر نقصان پہنچانے کے لئے پاکستان نے ایسا کیا ہے کہ سکہ کی قیمت
کم نہیں کی، اور اس الزام دہی اور تہمت تراشی میں اخبارات ہی نہیں بھارت سرکار کی بعض ذمہ دار ہستیاں تک
شریک تھیں ——— واہ رہی! "لادینی حکومت" واہ!

کم کن زکبر و ناز کہ دیدہ است روزگار
چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

پاکستان کی "اسلامی حکومت" جس پر طنز کی جاتی ہے، اس کی کسی ذمہ دار شخصیت نے غیر مسلم اقلیت سے
یہ نہیں کہا کہ "بھارت ریڈیو نہ سنا کرو۔۔۔" مگر "لادینی حکومت" کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل نے حیدرآباد
دکن کے آفت رسیدہ مسلمانوں سے کہا بلکہ نصیحت فرمائی کہ تمھیں پاکستان ریڈیو نہ سننا چاہیئے ——— یہ ہے
وہ "آزادی" جو انگریز سے حاصل کی گئی ہے اور جس کو "لادینی حکومت" کس قدر مناسب طریقہ پر استعمال کر رہی ہے
پاکستان کی "اسلامی حکومت" اور اس کی رعایا کو اپنے معاہدے، لفظوں اور قول و قرار کا پاس ہے ———
——— مگر بھارت کی "لادینی حکومت" کے اخباروں میں یہی دل خراش باتیں شایع ہوتی رہتی ہیں کہ ——— پاکستان
سے بھارت کی آبادی کے لئے مزید علاقہ کا مطالبہ کیا جائے ——— بھارت کو پاکستان کے ساتھ سختی کا برتاؤ
کرنا چاہیئے، اور ایک مہاسبھائی لیڈر نے تو اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کو فتح کرنے کے بعد، تمام ممالک
اسلامی کو ایک ایک کرکے فتح کرتے ہوئے چلے جاؤ ——— بہت بڑے بڑے بول بولے جا رہے ہیں،
اور بڑے بول کا سر نیچا ہی ہو کر رہتا ہے ——— اور راج رشی ٹنڈن جی مہاراج تو سب سے چار ہاتھ آگے ہیں
وہ تو فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمان ہندوستانی کلچر اختیار نہ فرمائیں گے اُن کی وفاداری بھارت کے ساتھ مشتبہ
رہے گی اور مسلمانوں کی مجبوری، بیکسی اور مظلومیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآنِ پاک تک پر دل آزار
طنز کی جا رہی ہے ——— یہ سب کچھ "لادینی حکومت" میں ہو رہا ہے! اگر بھارت کی "لادینی" کا یہ
عالم ہے تو خدا جانے اس کا "دین" کیا ہوگا!

بھارت کی "سیکولر اسٹیٹ" میں یہ "لے" بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، اکثریت کو یہاں تک اُکسایا جا رہا ہے
کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بیاہ شادی کا رشتہ ناتہ قائم کرلیں ——— یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے، اور ڈنکے کی چوٹ
کہا جا رہا ہے اور حیرت ہے کہ "لادینی حکومت" کے کرتا دھرتا اس قسم کی فساد انگیز اور شر آمیز باتوں پر کوئی
نوٹس نہیں لیتے، اس تجاہل، تغافل اور درگزر کا یہ نتیجہ ہے کہ مفسدین کی ہمتیں بڑھ رہی ہیں اور بیچارے
مسلمان سہمے اور دبے جا رہے ہیں، وہ اپنا دردِ غم بھی کھل کر بیان نہیں کر سکتے!

پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب نے گزشتہ سے پیوستہ عید کے موقعہ پر مسلمانوں کو مخاطب
کرتے ہوئے، ہندوستانی مسلمانوں کا ذکر کر دیا تھا، بس اس پر بھارت میں ایک شور مچ گیا کہ پاکستانی وزیر
اعظم کو بھارت کی مسلمان رعایا کے بارے میں بولنے کا کیا حق ہے۔۔۔ مگر بھارت کی پارلیمنٹ میں خان
عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان کا نہ یہ کہ صرف ذکر کیا جاتا ہے بلکہ اُن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے ———
جب "سیاست" کے رشتہ میں اتنی جان ہے تو "مذہب" کا رشتہ تو سیاست سے بہر حال مضبوط تر ہوتا ہے۔

پاکستان میں ہمارے لیڈر اور ارباب اقتدار غیر مسلموں سے وفاداری کا بار بار مطالبہ نہیں کرتے اور نہ اُن سے یہ کہتے ہیں کہ تم اپنے دلوں سے اپنے مذہبی مقدس مقامات کی عقیدت نکال کر پھینک دو، ہم جانتے ہیں کہ ایک ہندو کو اجودھیا، متھرا، بندرابن، کاشی اور ہردوار سے جو مذہبی لگاؤ ہے، وہ کسی خوف اور دھمکی کے زور سے دور نہیں کیا جا سکتا، اور اپنے پوتر استھانوں سے اُن کی عقیدت پاکستان کی وفاداری سے نہیں ٹکرا سکتی ——— مگر بھارت کی لادینی حکومت میں ذمہ دار رہنما مسلمانوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی طرف تم دیکھنا چھوڑ دو، بس اسی قسم کی دلخراش باتیں سُننے میں آتی رہتی ہیں ——— فیض آباد کی مسجد کا واقعہ بھی "لادینی حکومت" کے کارناموں کی ایک کڑی ہے، اکثر بر ہم چاری کے برت پر بھی بھارت سرکار کا دل نہ پسیجا ———

ہٹ دھرمی کی دوسری بات ہے، ورنہ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اُسے جھٹلایا نہیں جا سکتا، یہ ناقابلِ انکار حقایق ہیں یہ واقعات ہیں جن کی شدت کو نرم سے نرم لفظوں میں اور کم کر کے پیش کیا گیا ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی "لادینی حکومت" پر فخر کرنے والے "اسلامی حکومت" سے موازنہ کر کے دیکھیں کہ دونوں حکومتوں میں کیا ہو رہا ہے؟ اس موازنہ میں اگر انصاف سے کام لیا گیا تو پاکستان کی "اسلامی حکومت" پر طنز کرنے والوں کو ندامت ہو گی کہ ہم نے بغیر سوچے سمجھے یوں ہی ایک چلتی ہوئی بات کہہ دی تھی!

مشرقی پاکستان کے بعض ہندو باہر والوں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر پاکستان کی "اسلامی حکومت" پر احتجاج آمیز تنقید کرنے لگے ہیں، یہ آوازیں اگرچہ کسی کسی کے منہ سے کبھی کبھی سُننے میں آتی ہیں مگر آتی تو ہیں ——— کیا یہ لوگ "اسلامی حکومت" کی جگہ ایسی "لادینی حکومت" چاہتے ہیں، جس کے رہنما اور ارباب اقتدار بار بار اُن کی وفاداری کو چیلنج کریں، جہاں اُن کی مقدس کتابوں اور بزرگ پیشواؤں کا مذاق اُڑایا جائے، جہاں ذرا ذرا سی بات پر ہر "ہندو" کو پاکستان چھوڑ کر بھارت جانے کی دھمکی دی جائے، جہاں کی "اکثریت" "اقلیت" کو زندہ اور سانس لیتا دیکھ کر تاؤ کھاتی ہو کہ یہ "ملیچھ" اب تک زندہ کیوں ہیں ——— اگر وہ یہی چاہتے ہیں تو اُن کی عقلوں پر ہمیں افسوس آتا ہے کہ وہ جنت کو چھوڑ کر، جہنم کی تمنا کر رہے ہیں! کاش! وہ "اسلام" کی برکتوں کا اندازہ کر سکتے!

## جامد تمدّن

کوئی شک نہیں کہ پراچین کال کے اتہاس میں بھارت کی پدوی بہت اونچی ہے، اس کا تمدن بہت قدیم ہے، ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ بھارت میں گیان دھیان کے چاروں اور دیپک جلتے تھے، مگر اس کے باوجود بین الاقوامی تاریخ میں "بھارت" کا نام کہیں نظر نہیں آتا، بھارت پرانے زمانہ میں ساری دنیا سے الگ تھلگ رہا اور بھارت باشی اپنے ملک میں چین کی بنسی بجایا کئے، دوسری قوموں اور ملکوں سے بھارت والوں نے کوئی سمبندھ اور سروکار ہی نہ رکھا، ایران سے اُس کی سرحد ملی ہوئی تھی مگر ایران کے تمدن کو بھارت ذرا بھی متاثر نہ کر سکا ——— اور اس کا ایک سبب یہ ہے وہ یہ کہ ہندو دھرم میں تبلیغ نہیں ہے، یعنی جو شخص جس جاتی، جس ورن، جس گوت، اور جس دھرم میں پیدا ہو گیا اُس سے وہ نکل ہی نہیں سکتا، سناتن دھرم جو ہندوؤں کا سب سے قدیم مذہب ہے اور جس کی بنیاد "ویدوں" پر ہے، اُس کا یہی اصول اور یہی عقیدہ ہے کہ پیدائشی ملیچھ، سدا ملیچھ ہی رہتا ہے، وہ دھرم ماتما بن ہی نہیں سکتا۔

"انفعالیت" ہے!

بھارت والوں (ہندوؤں) کو زیادہ سے زیادہ اپنے ہی دیس کے رہنے والے "بدھوں" پر حکومت کرنے کا تجربہ ہے، اور بدھسٹوں کے ساتھ اُن کے سلوک کا یہ نتیجہ ہے کہ بدھ مت نے جس دھرتی میں جنم لیا تھا وہاں سے اُسے دیس نکالا دیدیا گیا، اور اُس کو چین، تبت اور جاپان کی راہ اختیار کرنی پڑی، بھارت والے نہیں جانتے کہ "غیر ہندوؤں" پر حکمرانی کس طرح کرنی چاہیے، اُن کی شریعت اس باب میں خاموش ہے!

بھارت میں ہندو اکثریت کو تقریباً گیارہ سو سال کی مسلسل محکومی کے بعد حکومت کرنے کا موقعہ ملا ہے، اب انھیں حکومت کی پالیسی متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے کہ کریں تو کیا کریں؟ حکومت کے آئین کی بنیاد "مذہب" پر بھی نہیں رکھ سکتے کہ اُن کے دھرم اور اُن کی تہذیب میں "غیر ہندو رعایا" کے لئے گنجایش ہی کہاں ہے اُن کی تاریخ اس تجربہ کی نظیر سے خالی ہے ـــــ حکومت کو خالص جمہوری بناتے ہیں تو اکثریت کی ناخوشی کا خطرہ ہے وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتی، اس لئے اُن کی "پالیسی" ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی ہے، جس نے سکھوں تک کو بددل کر دیا ہے!

ایک طرف بھارت کی قدیم مذہبی روایات کو زندہ کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں اور دوسری طرف پنڈت جی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ پرانی مذہبی کتابیں، "رہنما" نہیں بن سکتیں ہمیں اپنی عقل و دانش کے ذریعہ مسائل کو حل کرنا ہوگا، ان متضاد خیالات نے ایک عجیب کشمکش پیدا کر دی ہے ـــــ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندو کلچر بین الاقوامی اور آفاق گیر نہیں رہا، لہٰذا اس کمزوری کو جھنجلاہٹ اور عصبیت کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور چاہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان تہذیب سے جس روایت کو ذرا سی بھی نسبت ہے اُسے مٹا دیا جائے، ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ہندو تہذیب کو آپ ہی آپ پھولنے پھلنے کا موقعہ دیا جاتا، یہاں تک کہ ملک اُسے قبول کر لیتا، مگر اندیشہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دوسرے کلچروں اور تہذیبوں پر ہندو کلچر غلبہ حاصل نہ کر سکے گا بلکہ شاید وہ مغلوب ہی رہے گا اس لئے قوت کو کام میں لایا جا رہا ہے!

اس کے برخلاف اسلام کی فطرت میں "تبلیغ" شامل ہے، اسلام کی تہذیب بین الاقوامی تہذیب اور اُس کا کلچر آفاق گیر ہے، اُس نے دنیا کے ایک بہت بڑے حصّہ کو متاثر کیا ہے، اسلامی شریعت غیر مسلموں کے مسائل سے سروکار رکھتی ہے، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم رعایا سے ہمیشہ واسطہ رہا ہے، اس لئے ہم نے کھل کر اعلان کر دیا کہ پاکستان "اسلامی حکومت" ہے! ہمارے پاس اللہ کا قانون اور رسولؐ کی سنت ہے، ہمارے پاس پچھلے تجربے اور گزشتہ نظیریں ہیں، ہم "اسلامی حکومت" میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے طریقے جانتے ہیں، ہمارے پاس ساری مخلوق اور پوری انسانیت کے لئے ایک جامع اور مکمل پروگرام ہے۔

ہمارے دین میں "جبر" نہیں ہے، ہم زور اور قوت سے کسی پر اپنی تہذیب مسلّط کرنا نہیں چاہتے، انسانوں سے پیار کرنا اور اُن کے معاملات میں عدل و انصاف سے کام لینا ہمیں سکھایا گیا ہے، اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلمان کو ناحق قتل کر دے تو ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ قصاص میں اُس مسلمان کی گردن اڑا دیں، ہمارا انصاف مذہب کی نسبت کے اثر کو بھی قبول نہیں کرتا ـــــ یہی سبب ہے کہ پاکستان کو "اسلامی حکومت" کہتے ہوئے ہم فخر کرتے ہیں!

## اسلامی حکومت کی برکتیں

بھارت کے نیتا معلوم ہوتا ہے کہ "اسلام" سے باخبر نہیں ہیں، اور اسلامی تاریخ اُنھوں نے اگر پڑھی ہے تو شاید سمجھ کر نہیں پڑھی ورنہ "اسلامی حکومت" پر وہ طنز نہ کرتے ـــــ "اسلام" کسی مخصوص قوم کا مذہب اور کسی خاص ملک اور خطہ کا دین نہیں ہے، وہ ایک عالمگیر مذہب، اور ایک ایسا ابر کرم ہے جو لالہ زاروں پر ہی نہیں چٹیل میدانوں پر بھی برستا ہے، اُس کا دریائے رحمت

اپنوں ہی کے لئے نہیں، بیگانوں کے واسطے بھی عام ہے!

اسلام غیر مسلموں کو معیشت، معاشرت اور مذہب و تہذیب کی پوری آزادی دیتا ہے، اسلامی تاریخ ان نظیروں اور مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ غیر مسلموں سے جب معاہدے کئے گئے ہیں تو اُن کی جان، مال، مذہب، عبادت گاہوں اور عزت و آبرو کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے وعدوں کو آخر وقت تک نباہا ہے، بدعہدی، زبان دے کر پھر جانا، منافقت اور دھوکا ان کے مذہب میں بہت بڑا گناہ ہے!

اُسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ الیمانی نے ماہ دینار والوں سے جو معاہدہ کیا، اُس میں یہ شرط بھی تھی:

لا یغیرون عن ملتہم ولا یحال بینہم وبین شرائعہم

اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے گا اور نہ اُن کے مذہبی اور قومی معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کی جائے گی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات سے قبل اپنے جانشین کو جو وصیت فرمائی تھی، وہ غیر مسلم رعایا (ذمی) کے بارے میں تھی:-

"میں اس کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے عہد کی وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کے حقوق پورا کرے!"

غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسلامی حکومت میں جس رواداری، انصاف، اور حسنِ سلوک کو ملحوظ رکھا گیا، وہ اسلامی تاریخ کے سنہری اور تابناک اوراق ہیں، جن پر ہم فخر کرتے ہیں، مثالیں اتنی ہیں کہ ان کے ذکر کے لئے بڑی فرصت چاہیے ——— صرف ایک مثال:-

"حضرتِ عمر ابن عبد العزیز کے دورِ خلافت میں ایک ذمی کو ایک مسلمان نے مار ڈالا، خلیفہ نے حیرہ کے گورنر کو فرمان بھیجا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کردو، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور مقتول کے ورثاء نے مسلمان قاتل کی گردن اُڑا دی"

پاکستان میں اسلامی نظام ابھی قایم کہاں ہوا ہے مگر اسلام سے صرف "نسبت" کا یہ اثر ہے کہ اس کے حدودِ حکومت میں غیر مسلموں کی عزت آبرو محفوظ ہے، وہ ایک آزاد شہری کی طرح زندگی بسر کر رہے اور جب یہاں اسلامی نظام قایم ہوگا ——— اور یہ ہو کر رہے گا، اُس وقت پاکستان کی برکتوں میں اور اضافہ ہو جائیگا "اسلامی حکومت" وحشت نہیں محبت کرنے کی مستحق ہے کہ اپنی رعایا کو بلا لحاظ مذہب و ملت امن و سلامتی کی ضمانت دیتی ہے!

ماہر القادری ۱۲ر نومبر ۵۰ء

# پاکستانی عورت دوراہے پر

پاکستان میں عورتیں جس تیزی اور شوق کے ساتھ بے حجابی کی طرف مائل ہوتی چلی جارہی ہیں وہ اتنا دردناک سانحہ ہے کہ رونے کو جی چاہتا ہے، اگر بے پردگی اور نسوانی آزادی و بے باکی کی یہی رفتار جاری رہی تو دس پانچ سال میں پاکستان کے شہر قاہرہ اور طہران بن جائیں گے، مستقبل کے اس معصیت آلود خوفناک تصور سے غیرت مند لوگ لرزے جارہے ہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ اور کیا ہونے والا ہے؟

مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے، عورتوں کی آزادی اور بے باکی وہاں اس منزل میں پہنچ چکی ہے، جہاں "اخلاق و عفت" کو گھانس کے تنکوں اور درختوں کے سوکھے ہوئے پتوں کی برابر بھی وقعت نہیں دی جاتی، برائی کا احساس ہی باقی نہیں رہا، آنکھوں سے شرم اور دلوں سے غیرت رخصت ہوچکی، وہاں کے پارکوں، باغوں، چوراہوں اور تفریح گاہوں میں مرد و عورت کے اختلاط کے شرمناک مناظر دیکھ کر ضمیر چیختا ہے کہ یہ انسان نہیں ہیں جانور اور درندے ہیں جنھوں نے خوشنما لباس پہن لئے ہیں ——— انسان سے لغزش اور بھول چوک تو ہوسکتی ہے مگر وہ اس قدر بے حیا، اتنا بے شرم اور اس درجہ بے غیرت تو نہیں ہوجاتا، آخر گراوٹ کی کوئی حد تو ہونی چاہیے -!

اس فتنہ کی پرچھائیاں پاکستان پر بھی پڑرہی ہیں ——— جن کے دل میں قوم کا درد، اسلام سے عقیدت، خدا اور رسول کے احکام کا پاس اور پاکستان سے محبت ہے، وہ پاکستان میں غیر اسلامی ماحول کو دیکھتے ہیں تو انھیں بڑا دکھ ہوتا ہے، ان لوگوں کا ایمان ہے کہ پاکستان کو اگر کوئی چیز مضبوط اور مستحکم بنا سکتی ہے تو وہ صرف "اسلام" ہے، پاکستان کے آئین، اصول، سیاست، تجارت اور ماحول و معاشرت میں جہاں جہاں اسلام سے دوری اور بیگانگی پائی جاتی ہے، وہیں وہیں پاکستان کمزور ہے، پاکستان کے حقیقی بہی خواہوں اور مخلص دردمندوں کا فرض ہے کہ پاکستان کی ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں اور اللہ کی رسّی کو مضبوط تھام کر "بنیان مرصوص" بن جائیں -

جناب مولانا امین احسن اصلاحی دل دردمند اور چشم حقیقت نگر رکھتے ہیں، انھوں نے اس فتنہ کو بھانپ لیا، ان کی ایمانی فراست نے محسوس کرلیا کہ پاکستانی عورتوں کو غلط راہ پر چلایا جارہا ہے، یہ وہی راہ ہے جس کے گرد و غبار میں مغرب کا قافلۂ عصمت و ناموس غائب ہوچکا ہے، جہاں قدم قدم پر اخلاق و انسانیت کی ہنسی اڑائی جاتی ہے اور جس کے حدود میں غراروں، ساریوں، فراکوں، جمپروں اور لپ اسٹکوں کی بوقلمونیاں اور رنگ آرائیاں تو دکھائی دیتی ہیں مگر حسن پاکیزگی کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا -

جناب مولانا امین احسن اصلاحی کے قلب نے دکھ محسوس کیا، ان کے ضمیر کو اذیت ہوئی اور وہ اذیت

غم کو محسوس کر کے خاموش نہیں رہ گئے کہ یہ ایمان کا آخری درجہ ہے اور ضعف و کمزوری کا درجہ ہے، اتفاق سے بلکہ یوں سمجھئے
"حسنِ اتفاق" سے جیل میں اُنھیں فرصت کے اوقات بھی میسر آ گئے، اور مولانا نے اپنے دل کے ٹکڑے کاغذ پر بکھیر دیتے
—— "پاکستانی عورت دوراہے پر" کہنے کو تو ایک کتاب ہے مگر حقیقت میں یہ ایک دردناک فریاد، ایک نالہ خونیں اور ایک
دردمند دل کی چیخ ہے!

مولانا امین احسن اصلاحی کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اظہارِ حق کے لئے کھول دیا ہے، اُن میں مردِ مومن کی فراست اور مجاہد کی
پائی جاتی ہے، آسمان کی تمام بجلیاں اور زمین کے تمام پہاڑ بھی اکٹھے ہو کر اُن کے سامنے آ جائیں تو بھی مولانا اصلاحی
پائے استقامت کو ذرّہ برابر جنبش نہیں ہو سکتی، یہ وہ "صالحین" ہیں جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اٹھے ہیں جن
ایمان ہے کہ "اسلام" اور صرف "اسلام" ہی صراطِ مستقیم ہے چاہے وہ کتنی ہی خشک اور دشوار گزار کیوں نہ ہو اور اسلام
کے سوا جتنے راستے ہیں وہ گمراہی کی منزلیں ہیں چاہے اُن میں انگور کے خوشے، گل و ریحاں کی شاخیں اور چناروں کے سا
کیوں نہ پائے جائیں، یہ لوگ اس عزم کو لیکر نکلے ہیں کہ ساری دنیا میں اللہ کا دین پھیلا کر رہیں گے، اُنھوں نے اپنی جانیں ا
کے ہاتھ بیچ دی ہیں اور خدا کی قسم اس سودے میں اُنھوں نے بہت نفع کمایا ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ اُس مایۂ ناز اور سرمایہ افتخار شخصیت نے لکھا ہے جس کی تحریریں ادب و انشا کی معراج ہوتی ہیں ا
"اظہارِ حق" جس کے قلم کی فطرت بن چکی ہے، یہ اشتراکی اور نیم اشتراکی لونڈے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جو بات چاہیں منس
کر دیں مگر اربابِ نظر جانتے ہیں کہ مولانا مودودی دعوت و اصلاح کے کس مقام پر فائز ہیں، اُن کی تحریروں نے لاکھوں انسا
کے فکر و نظر کو بدل دیا ہے، مولانا مودودی کی "اسلامی فکر" ضرب المثل بن گئی ہے!

اس "دیباچہ" کا اگر اقتباس اور انتخاب پیش کرنے کی کوشش کریں گے تو اپنے ناظرین کے ساتھ ہم ظلم کریں گے کہ اس
شاہکار مضمون کی ایک سطر بھی بیکار نہیں ہے، یہ تو پورے کا پورا پڑھے جانے کے قابل ہے:-

"پچھلے پچاس ساٹھ برس کے دوران میں ہماری قوم کا ہر طبقہ اور ہر عنصر فرنگی تہذیب سے کم و بیش متاثر ہوا ہے اور یہ تاثر مسلسل بڑھ
چلا گیا ہے، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ڈھائی سال کے اندر اس معاملہ میں جتنی "ترقی" ہوتی ہے وہ کم از کم اس ملک کے مسلمانوں کی تا
میں تو فی الواقع حیرت انگیز ہے، خصوصاً ہماری عورتوں نے اسلام سے فرار اور فرنگیت کی جانب پیش قدمی کی جتنی راہ پاکستان بننے کے بعد
اس تھوڑی سی مدّت میں طے کی ہے اتنی راہ وہ انگریز کی غلامی کے پورے ڈیڑھ سو برس میں بھی طے نہ کر سکی تھیں۔ بگڑنے والیوں کی کث
تعداد، بگاڑ کی تیز رفتاری، بگاڑ میں بے باکی، اور بگاڑ کو عین بناؤ سمجھنے کی جہالت، غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے بعد پاکستان کی
مسلمان عورتیں قبل پاکستان کی مسلمان عورتوں سے فائق تر ہی نظر آتی ہیں۔ گویا کہ یہ ایک گھٹا ہوا طوفان تھا جو صرف بندِ غلامی سے رُ
ہوا تھا۔ اس بند کا ٹوٹنا تھا کہ یہ سیلِ عرم کی طرح پھوٹ پڑا۔

یہ صورتِ حال ایسی نہ تھی کہ دین سے نسبت اور تعلق رکھنے والے لوگ اس کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرتے۔ مگر بڑے ر
اور افسوس کی بات ہے کہ ضلالت کا یہ طوفانِ عظیم اُن لوگوں کے سامنے اُٹھتا اور بڑھتا اور پھیلتا رہا ہے جو دین کی نمائندگی ا
علمبرداری کے مدعی ہیں، اور وہ سب مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے اس کو خاموش بیٹھے دیکھتے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلا
[illegible]

اس کتاب کے مصنف مولانا امین احسن صاحب نے خدا کے دین اور رسول اللہؐ کی اُمّت کا حق اُس وقت بھی پہچانا تھا جب وہ جیل سے باہر تھے اور یہ طوفان ابھی نیا نیا ہی اُٹھنا شروع ہوا تھا، چنانچہ اس وقت اُنھوں نے ایک مختصر رسالہ "پردے کے احکام" پر مرتب کر دیا تھا جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، پھر انھوں نے یہ حق اسوقت بھی پہچانا جب کہ انہیں جیل بھیج دیا گیا تھا اور اُن پر سے فی الحقیقت خدا اور خلق دونوں کے سامنے ذمہ داری ساقط ہو چکی تھی، چنانچہ یہ کتاب اُنھوں نے جیل ہی میں لکھی ہے اور اب باہر آکر پہلی فرصت میں اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے تین باتیں ثابت کی ہیں:۔

اوّل یہ کہ پاکستان کی مسلمان عورتوں کو اس وقت جس راہ پر چلایا جا رہا ہے وہ در اصل مذہبِ مُلّا کے خلاف نہیں بلکہ دینِ خدا کے خلاف ہے، اِس چیز کو اُنہوں نے قرآن کی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند ارشادات سے اس طرح ثابت کر دیا ہے کہ اب پردے کو مُلّاؤں کی ایجاد صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو در اصل خود اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "مُلّا" کہنا چاہتا ہے مگر اخلاقی نامردی کی وجہ سے ایسا کہنے کی جُراَت نہیں رکھتا۔

دوم یہ کہ خدا اور رسولؐ کے قطعی اور واضح احکام کے مقابلہ میں جو روش اس وقت پاکستان کے کار فرماؤں کی بیگمات نے اختیار کی ہے اس کی حیثیت محض ایک فسق اور ایک گناہ کی نہیں ہے، بلکہ وہ صریح بغاوت کی نوعیت رکھتی ہے اس لئے کہ اس خلاف ورزیٔ احکامِ خدا و رسولؐ کو علانیہ برحق کہا جا رہا ہے، اس کی طرف کھلم کھلا مسلمانوں کو دعوت دی جا رہی ہے اور خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقہ کو پوری جسارت و بیباکی کے ساتھ قدامت پرستی، تنگ خیالی، جہالت، پست اخلاقی، مُلّائیت، اور ایک مانعِ ترقی رسم قرار دیا جا رہا ہے، اس چیز کو مولانا نے خود ان لیڈر صاحبان و صاحبات کے اقوال سے ثابت کیا ہے جو اس تحریک کے بانی مبانی ہیں اور ان کے ہر قول کی سند پورے حوالوں کے ساتھ بیان کر دی ہے، اس کو بھی ایسا ہی شخص جھٹلا سکتا ہے جو دن دھاڑے سورج کی موجودگی کا انکار کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو۔

سوم یہ کہ خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف یہ کھلی کھلی بغاوت نری بغاوت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ بدترین بے شرمانہ منافقت بھی شامل ہے جس کی مثال اس سے پہلے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، ہم مسلمان اس سے پہلے سب ہی طرح کے گناہوں میں آلودہ ہو چکے ہیں، کوئی گناہ اب ہمارے لئے نیا نہیں رہا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ حرکت ہماری اس اُمّت میں کبھی کسی نے نہ کی تھی کہ ہر نافرمانی سے پہلے فرمانبرداری و اطاعت پر ایک وعظ کہے، ہر اسلام کُش کام کا آغاز اسلام کے اتباع کی تلقین سے کرے، اور اسلام کے سینہ میں ہر مرتبہ چھری بھونکنے سے پہلے قرآن کی چھاؤں میں اسلام کو از سر نو زندہ اور تازہ اور قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کرے۔ افسوس کہ اب یہ کسر بھی پوری ہو گئی اور آج یہ انوکھی قسم کی منافقت علی الاعلان ہمارے درمیان کی جا رہی ہے، مولانا نے اس بات کو بھی ناقابلِ تردید واقعات سے ثابت کیا ہے اور اس معاملہ میں بھی اُنھوں نے کسی واقعہ کو سند اور حوالہ کے بغیر درج نہیں کیا ہے۔

اس کے ساتھ مولانا نے یہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ مغرب کی یہ اندھی تقلید جس کی طرف اس وقت پاکستان کی عورتیں ڈھکیلی جا رہی ہیں، صرف ہمارے دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ در حقیقت اس سے ہماری دنیا بننے کی بھی کوئی توقع نہیں ہے۔ انہوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اور بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اس روش میں ظاہری چمک دمک خواہ کتنی ہی ہو، بہر حال یہ ہمارے قومی و ملکی مفاد کے لئے سخت نقصان دہ ہے، اور یہ کہ ہماری حقیقی قومی ضرورتیں جس قدر بھی ہیں وہ سب بدرجۂ اتم ان حدود کے اندر پوری ہو سکتی ہیں جو اسلام نے عورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔

یہ سب کچھ اس غرض کے لئے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ کسی کو مطعون کیا جائے، جن لوگوں پر اس تنقید کی زد پڑتی ہے وہ ہمارے اپنے ہیں کوئی غیر نہیں ہیں، ہمارا اپنا ہی خون اور گوشت ہیں۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو مطعون کرنے میں کس کو خوشی ہو سکتی ہے۔ در اصل اس ساری بحث کی اولین غرض یہ ہے کہ ان لوگوں میں اگر ایمان کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو وہ چونکیں اور اپنی غلطی محسوس کرکے اپنے رویّہ کی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ بحث میں اگر تلخی ہے تو عداوت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس رنج کی بنا پر ہے جو کسی عزیز کو گھناؤنے کام کرتے دیکھ کر ایک دردمند عزیز کے دل کو پہنچتا ہے۔ اس کڑوی نصیحت کو اگر قبول کر لیا جائے ہمارے یہ ضالّ و مضلّ بھائی اور بہنیں راہِ راست پر آجائیں تو ہم سے بڑھ کر کوئی بھی خوش نہ ہوگا، لیکن اگر یہ لوگ درست نہ ہوں تو پھر اس بحث کی ثانوی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو صاف صاف آگاہ کر دیا جائے کہ یہ روش جس پر قوم کی ماؤں بہنوں بیٹیوں کو چلایا جا رہا ہے در اصل خدا کے غضب کی راہ ہے، اس کا انجام دنیا میں رُسوائی اور آخرت میں تباہی ہے اگر تم اس انجام کے لئے تیار ہو تو بے شک تمہارے لئے موزوں ترین رہنما یہی صاحبان و صاحبات ہیں جو اس وقت تمہارے ووٹوں کی بدولت تمہارے سربراہ کار بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر تم اس انجام سے بچنا چاہتے ہو تو رہنمائی کے منصب سے ان لوگوں کو ہٹا دو جو اسلام کا نام لے لے کر تم کو اسلام کے بالکل مخالف راہ پر تیزی کے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔

میں توقع رکھتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے مولانا کی یہ کتاب وقت کی بہترین چیز ہے۔ اگر اس سے اصلاح ہو جائے تو سب کی خوش نصیبی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اصلاح نہ ہو تو یہ ہماری طرف سے ہمارے رب کے سامنے معذرت ہے۔

## ہوا کا رُخ

اس کے بعد ہم اس کتاب کے ایک باب (ہوا کا رُخ) کا ابتدائی حصہ پیش کرتے ہیں:—

"ہوا کے رُخ کا اندازہ کرنے کے لئے ہم پہلے پاکستان کے بعض چوٹی کے لیڈروں اور بعض لیڈر خواتین کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ خود ان کے الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات اس ملک کی خواتین کو کس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی اجتماعی و سیاسی ترقی سے متعلق ان کے ذہنوں میں وہ کیا منصوبے ہیں جو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق عین اسلام سے اخذ کئے ہیں۔"

۲۴ رجنوری ۱۹۴۹ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں مغربی پنجاب زنانہ مسلم لیگ اور پاکستان زنانہ رضاکار سروس کے زیر اہتمام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا:—

"عورتوں پر ——— بالخصوص پڑھی لکھی اور پردے کی قید سے آزاد عورتوں پر ——— ایک بھاری ذمہ داری ہے انہیں پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اپنی تعلیم اور آزادی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی مثال قائم کرنی چاہئے کہ دنیا دیکھ لے کہ ایک چار دیواری میں مقید رہنے والی عورت اور اُس عورت میں کیا فرق ہوتا ہے جو اپنی تعلیم کی مدد سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کرتی ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جب میں اپنے ہاں کی عورتوں کو بھی مردوں کے ساتھ پاکستان کے استحکام کے لئے کوشاں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی ہی مسرت بخش ہے کہ ہماری بہنوں کی ایک کثیر تعداد زنانہ نیشنل گارڈز میں بھرتی ہو چکی ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جو لوگ عورتوں کو فوجی تربیت دئے جانے کی مخالفت کرتے ہیں اور پرانی بوسیدہ صورت حال ہی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں انہیں ذرا سرحد کے پار ان ہزاروں چھنی ہوئی عورتوں کے حال پر نظر کرنی چاہئے جو پاکستان کی راہ تک رہی ہیں۔ اگر وہ بدقسمت عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف ہوتیں

عورتوں کی آزادی کے بارے میں جناب لیاقت علی خاں صاحب نے فرمایا:۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عورتوں کے مکمل آزادی کے معاملہ میں آپ سے متفق ہوں۔ مرد عورتوں کو آزادی دئے جانے کے خلاف نہیں ہیں۔ جو بعض مرد اس کے بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں انہیں در اصل کچھ منفرد غلط مثالوں[ف۱] نے مذبذب بنا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو آزادی صحیح طور پر استعمال کرنی چاہئیے۔"

خواتین کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:۔

"اپنے سپاس نامہ میں آپ لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کو مرکز اور صوبوں میں معقول نمایندگی دی جائے۔ ہر چند میں آپ کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس صوبہ کے وزارتی جھمیلوں کی موجودگی میں آپ کو سر دست اس سے الگ ہی رہنا چاہتے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہوگا عورتوں کو حکومت کے ہر محکمہ میں پوری نمایندگی دی جائے گی۔"

تقریر کے آخر میں وزیر اعظم صاحب نے ٹیپ کا بند یہ ارشاد فرمایا:۔

"پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء)

ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب جو ماشاء اللہ پاکستانی کابینہ کے دماغ سمجھے جاتے ہیں اور اپنی مذہبی بصیرت پر انہیں خود بھی بڑا اعتماد ہے اور بہت سے دوسرے حضرات کو بھی اس باب میں ان سے بڑی خوش گمانی ہے وہ "عمر بھر کے غور و مطالعہ" کے بعد عورتوں کے معاملہ میں جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اس کا اظہار کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے آخر اجلاس میں ۶ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمایا:۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہماری اس کانفرنس میں کہیں سے کوئی عورت نمایندہ بن کر نہیں آئی[ف۲] مجھے پوری پوری امید ہے کہ طہران میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے آیندہ اجلاس میں کچھ نہ کچھ عورتیں بھی نمایندہ حیثیت سے ضرور شریک ہوں گی۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت میں نے اس لئے محسوس کی کہ جب تک کسی ملک کی اقتصادی تعمیر میں عورتیں بھی پورا پورا حصہ نہ لیں اس کی اقتصادی حالت درست نہیں کی جا سکتی۔ تمام مذاہب میں سے اسلام ہی تو تھا جس نے سب سے پہلے عورت

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) لڑائیاں ہوئیں مگر کسی عورت کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگا سکا۔ اسلئے کہ یہ پردے کی لعنت دبانہ سکتی اور عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف تھیں۔ خود ہمارے اسی بر اعظم میں دیکھ لیجئے عورتیں صرف مسلمانوں ہی کی چھینی گئیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں کے چھینے جانے کا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ اس لئے کہ پردے کی لعنت تو ہم پر مسلط تھی؟

ف۱ منفرد غلط مثالوں سے وزیر اعظم صاحب کا اشارہ غالباً آزادی کے سوء استعمال کے ان شاذ و نادر واقعات کی طرف ہے جو بے پردہ سوسائٹی میں کہیں ہزاروں لاکھوں میں کبھی سوء اتفاق سے پیش آ جایا کرتے ہیں مثلاً انگلستان کی سرکاری رپورٹ متعلق نکاح و ولادت بابت ۱۹۴۶ء میں درج ہے کہ اس سال ہر انتیس بچوں میں صرف ایک بچہ حرامی پیدا ہوا (یہ صرف ان ناجائز ولادتوں کی تعداد ہے جو غیر شادی شدہ عورتوں کے بطن سے ہوئی ہیں اور جن کا حکومت کو علم ہو سکا ہے) وزیر اعظم صاحب کا منشا، یہ ہے کہ اس طرح کے منفرد واقعات نے بعض مردوں کو بظاہر شبہ میں ڈال دیا ہے ورنہ عورتوں کی مکمل آزادی سے کس بدبخت کو اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی برکات میں کون کافر شک لا سکتا ہے۔

ف۲ اس دینی شعور اور مذہبی حس کی داد دیجئے کہ پوری کانفرنس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جس ایک ہی چیز کی کمی رہ گئی تھی اس کو ہمارے وزیر مال نے کس طرح تاڑ لیا!

حاصل نہیں تھا۔ پس اسلامی ممالک کو چاہیئے کہ اپنے ہاں کی تمام تحریکوں میں عورتوں کو صفِ اوّل میں جگہ دے کر ان کے سا
انصاف کریں۔ اس کے بغیر اقتصادی بحالی ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوگی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہالت ا
تحکمانہ ملائیت نے مسلمان عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہمیں اُن کو اقتصادی بندھنوں سے بھی آزاد کرانا ہے ا
(مردوں کے مقابل میں) احترام اور برابری کا وہ مقام بھی ان کو دلانا ہے جو اسلام کا تقاضا ہے[۵۱]"۔

"آخر میں نہایت ادب کے ساتھ میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ عمر بھر کے غور و مطالعہ[۵۲] کے بعد اب یہ میرا ایما
ہو چکا ہے کہ اسلام کوئی جامد شے نہیں ہے اسلام ایک زبردست طاقت اور ایک زندگی بخش قوت ہے ...... مستقبل کی تعمیر میں اس
بہت اہم حصّہ ہوگا۔ اس کی تعمیر کی ابتدا کی جا چکی ہے[۵۳] اب ہم سے ہر ایک کو اپنا اپنا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیئے کہ جس کام کا بیڑ
ہم نے اٹھایا ہے اس کے لئے آپ اپنے کو کس حد تک تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں ان خیالات اور جہالتوں سے لڑنا ہے جو صدیو
سے ہم پر مسلّط ہیں۔ مگر مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اگر ہم نے اسلام کی صحیح روح کو پیش نظر رکھ کر کام کیا تو ہم اپنے
مقاصد میں کامیاب رہیں گے"۔ (پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء)

## بیگمات کے افکار و نظریات

اب بعض بیگمات کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے جو اس ملک کی خواتین کی لیڈر ہیں (یا جن کو اربابِ اقتدار کی جانب سے
اس لیڈری کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے) اور جو مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ اور مثال کی حیثیت سے بیشتر سرکاری خرچ
پر اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس لئے پھرائی جا رہی ہیں کہ یہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو دکھائیں او
بتائیں کہ ان کو کس نمونہ کی تقلید کرنی چاہیئے اور کیا بننا چاہیئے۔

اس زمرۂ صالحات و طیبات کی گل سرسبد محترمہ بیگم لیاقت علی خاں ہیں۔ انہوں نے ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو جہلم میں کالا
ریفیوجی کیمپ میں جموں اور کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"اب وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند بیٹھی رہیں۔ اب انہیں اس خوابِ غفلت سے
بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لینا ہوگا[۵۴]"۔

---

۵۱ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک کی رہنمائی کا جو مقام پاکستان کو حاصل ہے اس کے بین الاقوامی پرگرا
کی بسم اللہ گویا آزادیٔ نسواں کے جہاد سے ہوتی ہے۔

۵۲ اگرچہ وزیر مال صاحب نے اس بات کی تصریح نہیں فرمائی کہ عمر بھر کس چیز کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نازک حقیقت تک پہونچے ہیں مگر سیاقِ
کلام دلیل ہے کہ وہ ظاہر یہی فرمانا چاہتے ہیں۔ کہ انہوں نے ساری زندگی اسلام کے مطالعہ میں بسر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد
اسلام کے متعلق گل فشانیاں فرمانے اور ہر مجلس میں اس کی ترجمانی کرنے کے حق سے کس کی مجال ہے جو انہیں روک سکے

۵۳ غالباً آزادیٔ نسواں کے پروگرام کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ اب تک ہماری اس سب سے بڑی اسلامی حکومت نے بین الاقوامی
پیمانہ پر جس تعمیر ملّی کا آغاز کیا ہے اس میں عام پبلک کے سامنے نمایاں طور پر یہی چیز آرہی ہے اور اسی چیز کی شہادت آل پاکستان ویمنز
ایسوسی ایشن کی رپورٹ سے بھی مل رہی ہے۔

۵۴ جموں اور کشمیر کی پناہ گزین عورتوں کے سامنے، جن کے پاس نہ مکانوں کی چار دیواری ہے نہ ستر پوشی کا کوئی سامان موجود ہے۔ بیگم صا

مردوں کو مخاطب کرکے بیگم صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ وہ انہیں اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہلیت ان کے اندر پائی جاتی ہو"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۴۹ء)

انہی بیگم صاحبہ نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۹ء کو لندن میں غیر ملکی اخبار نویس عورتوں کے سامنے پاکستانی عورتوں کی رفتار ترقی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

" اگرچہ (پاکستان کی) شہری عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں اور نقاب بھی اوڑھتی ہیں تاہم اسی فیصدی عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں وہ ایسا نہیں کرتی ہیں۔ نیز پردہ نشین عورتیں بھی اپنے مردوں پر ویسی ہی حاوی اور اپنے گھر کے معاملات میں ویسی ہی بااختیار ہیں جیسے کہ بے پردہ عورتیں"

آپ نے فرمایا کہ "مغرب میں بھی تو عورتوں کی مردانہ کارروائیوں اور مصروفیتوں میں حصہ لینے کا خیال ابھی نیا نیا ہی پیدا ہوا ہے[1]۔ بہرحال پردہ دیر سویر ختم ہو کے رہے گا۔ لڑکیوں کی نئی پود جن کی تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط درس گاہوں میں ہو رہی ہے وہ پردہ میں نہیں جائے گی"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء)

کل پاکستان زنانہ ایسوسی ایشن کا ذکر اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے اور ناظرین ایک حد تک اس سے واقف ہوں گے۔ یہ عورتوں کی ایک نیم سرکاری انجمن ہے جس کی سرپرست ہز ایکسیلینسی بیگم خواجہ ناظم الدین اور مس فاطمہ جناح ہیں۔ بیگم لیاقت علی خاں اس کی صدر ہیں۔ اس کی شاخیں پاکستان کے ضلع ضلع میں قائم ہو چکی ہیں۔ ہر جگہ اس کی کرتا دھرتا سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کرکے یہ اعلان کر دیا ہے کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں سے ہوگا ان معاملات میں حکومت اس انجمن سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ حکومت جس شفقت کے ساتھ اس کی سرپرستی کر رہی ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کی کانفرنسیں بالعموم گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں[2]۔ اس کی جنرل سکرٹری بیگم جی۔ اے خان نے اس کے اغراض و مقاصد سے متعلق نمائندہ پریس کو جو بیان دیا ہے وہ ملاحظہ ہو :-

" یہ ایسوسی ایشن بچہ عزم رکھتی ہے کہ پاکستان کی عورتوں کو تہذیبی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی عورتوں کی سطح پر لا کھڑا کرے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن عنقریب اپنے نمائندوں کو دوسرے ملکوں میں اس غرض سے بھیج رہی ہے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئیں کہ وہاں کی ایسی تنظیمیں کس طرح کام کرتی ہیں ... ... ... ... زینت خورشید جو ایسوسی ایشن ہذا کی رکن ہیں، مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہالینڈ جا رہی ہیں۔ جوں ہی ہمارے ارکان کی تعداد ۲ ہزار تک پہنچ گئی ہم اقوام متحدہ کی سماجی اور اقتصادی کونسل سے الحاق کی درخواست کر دیں گی"

(پاکستان ٹائمز۔ لاہور، مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۹ء)

---

[1] بیگم صاحبہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملک کی شہری عورتوں کے چہرہ پر یہ نقاب کے داغ دھبے کہیں کہیں جو نظر آ جاتے ہیں اس کے سبب سے ہمیں ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ابھی ہماری اسلامی ریاست کو وجود میں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہماری خامیوں کا محاسبہ شروع کر دیا جائے آخر مغرب کی عورتوں نے بھی تو اپنی موجودہ منزل تک پہونچنے میں کافی دن لگائے ہماری اسلامی حکومت پر بھی کچھ دن گزرنے دیجیے پھر دیکھئے درسگاہوں کی بدولت جاہلیت قدیمہ" کا ایک نشان بھی باقی رہ جائے تو کہئے!

[2] ملاحظہ ہو ری سیکنڈ ایر پاکستان سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء-ص ۲۷۶- اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۵ فروری ۱۹۵۰ء ؛

یہ انجمن جس قسم کی ثقافتی و تہذیبی ترقی اس ملک کی خواتین میں پیدا کرنی چاہتی ہے اس کا اندازہ بیگم طیب جی کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس انجمن کے ایک اجلاس میں ثقافتی ترقی کے ریزولیشن پر فرمائی:-

"ایک عام شکایت جو ان دنوں میں نے بہت سنی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں (پاکستان میں) عمدہ قسم کے گانوں کا فقدان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں گانے بجانے کے تمام استاد اور معلمین مسلمان ہی رہے ہیں تو یہ موجودہ صورتِ حال بہت ہی ستم ظریفانہ معلوم ہوتی ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں گانا بجانا لڑکیوں کی تربیت کا ایک لازمی جزو تھا۔ اور معمولی گانا بجانا نہیں بلکہ نہایت اونچے قسم کا۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا خسارہ ہے کہ ہمارے زمانہ کی لڑکیاں معیاری اور پکے گانوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کی بڑی سے بڑی امنگ بس فلمی گیتوں کے سیکھنے تک محدود ہے۔ یہ گانے بھی اگرچہ اپنے عام انداز میں اچھے ہوتے ہیں مگر یہ کانوں کو حقیقی حُسنِ صوت کے امتیاز کے قابل نہیں چھوڑتے۔

(دی سکنڈ ایر شائع کردہ پاکستان پبلیکیشن۔ ص ۲۷۴)

اس ثقافتی ترقی کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے ایک باضابطہ ادارہ بھی قائم ہو چکا ہے جس کو ازراہِ دینداری ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے اپنی سرپرستی سے مشرف فرمایا ہے۔ اس ادارہ کا اعلان ملاحظہ ہو:-

"پاکستان اکاڈمی آف آرٹ:
پاکستان میں ناچ سکھانے کی اسکیم

راولپنڈی۔ ۲۹ نومبر۔ مشہور پاکستانی رقاصہ[۵۱] آزوری (حال بیگم نزہت محمود) نے بیان کیا کہ آئندہ سال کے شروع میں ملک پاکستان میں جسم بنانے (Physical culture) اور جسمانی حرکات میں تناسب و ہم آہنگی پیدا کرنے کا پہلا ادارہ قائم ہو جائے گا۔ اس کا اصل مرکز کراچی اور ضمنی مرکز مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں میں ہوں گے۔ اس ادارہ کا مقصد پاکستانی عورتوں اور بچوں میں تال، سر، صحت اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرنا ہے۔

بیگم محمود نے کہا کہ وہ اپنی اس اسکیم کے سلسلہ میں مسٹر غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان اور بیگم لیاقت علی خاں سے ملاقات کر چکی ہیں۔ ان دونوں صاحبوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہے[۵۲]۔ میرے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ رقص کو جو اکابر شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب پاکستان میں روبتنزل ہے پھر سے زندہ کیا جائے[۵۳] اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ پر جگہ دلائی جائے۔

---

۵۱ یہ نامہ نگار کی کوتاہی ہے کہ اس نے بیگم صاحب کو محض پاکستانی رقاصہ لکھا ہے۔ وہ اپنے جذبات و حسیات کے لحاظ سے تو اسلامی رقاصہ کے لقب کی مستحق ہیں۔ اور ویسے بھی اب اس مملکت اسلامیہ میں کوئی شے غیر اسلامی کب رہ گئی ہے۔

۵۲ بیگم صاحبہ نے کراچی کے اکابر و اکرات سے ملنے ہی میں معلوم ہوتا ہے کوتاہی کی ورنہ انہیں دو کی کیا خصوصیت ہے وہاں کے ابرار و صالحین میں سے کوئی بھی اس خالص دینی اور اسلامی خدمت میں شرکت اور تعاون سے پیچھے رہنے والا نہیں ہے۔

۵۳ تاریخ کا جو شُدبُد تھوڑا سا مطالعہ ہمارا ہے اس کی بنا پر یہ عرض ہے کہ یہ فن شریف مغل سلاطین کے اُس دور میں اپنے کمال پر پہونچا تھا جو در خود ان سلاطین کے زوال کا دور آخر تھا اور بیگم صاحبہ ہمارے دورِ طفولیت ہی میں اس کے کمال کی متمنی ہیں۔ جب ابتدا اسی نقطہ سے ہو رہی ہے تو دیکھئے اس کی انتہا کیا ہو۔

اس عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلا قدم یہ ہوگا کہ آزوری راولپنڈی میں ۱۰ دسمبر سنہ ۴۹ء کو رقص اور جسم بنانے کے فن کی نمائش کریں گی۔

اپنے اس ادارہ کے مقاصد کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے بیان کیا کہ ان کے پیشِ نظر پاکستانی عورتوں کو صرف ناچ گانے کے فن ہی میں یکتائے روزگار بنانا نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیتوں کو تہذیب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان کو اپنی اصل جگہ حاصل کرنے اور آیندہ تعمیراتِ ملت کے کاموں میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔

آپ نے کہا کہ اس ادارہ کا دائرۂ عمل صرف ناچ گانا سکھانے ہی تک محدود نہیں ہوگا بلکہ یہ بہت سے دوسرے فنون مثلاً مُصوری وغیرہ سکھانے کا بندوبست بھی کرے گا۔

"خٹک ناچ" کا ذکر کرتے ہوئے آزوری نے بڑے دعوے سے کہا کہ "خٹک ناچ" مسلمانوں کا ناچ ہے[۲]۔ یہ اپنی موجودہ طرز اور موجودہ کمال کو اکابر شاہانِ مغلیہ کی سرپرستی میں پہنچا۔ پاکستانی رقاصہ آزوری نے ہندوستان کے اس دعویٰ کی کہ خٹک ناچ ان کی چیز ہے[۳] پر زور تردید کی اور اس بات کو بہت زور دے کر کہا کہ اس ناچ کو ہمیں ہندوستان والوں سے پھر حاصل کرنا ہے۔

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۳۰ نومبر سنہ ۴۹ء)

ان بیگم صاحبہ کے متعلق ایک اور اعلان بھی قابل ملاحظہ ہے جو ۱۴ فروری سنہ ۵۰ء کے "احسان" لاہور میں شائع ہوا ہے:۔

کراچی۔ ۱۴ فروری ملک میں آرٹ کو ترقی دینے کے لئے عنقریب اکاڈمی آف آرٹ کا قیام عمل میں آجائے گا۔ مادام آزوری جو مشہور آرٹسٹ ہیں انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو بتایا ہے کہ ملک کو زیادہ آرٹ آشنا بنانے کے لئے تحریک جاری کیجائیگی تاکہ پاکستان آرٹ کے لحاظ سے بھی دنیا کے ممالک میں اپنا صحیح مقام حاصل کرسکے۔ آپ نے کہا کہ دنیا کی کوئی قوم آرٹ کے بغیر ترقی کے منازل طے نہیں کرسکتی ـــ آپ نے مزید کہا کہ توقع ہے کہ پاکستان کے وزیر خزانہ اس نئی اکاڈمی کے صدر ہوں گے۔ مادام آزوری نے کہا کہ دنیا کے تمام ممالک میں آرٹ کی ترقی کے لئے اُن کے واسطے اُن کے اپنے قومی تھیٹر ہیں لیکن پاکستان میں کوئی تھیٹر نہیں پاکستان کو ان تھیٹروں کی بہت ضرورت ہے۔"

ان اعلانات میں بار بار "آرٹ" کا جو لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس طائفہ کی اصطلاح

---

۱؎ اس مقام پر سرسری نہ گزر جایئے بلکہ یہاں اچھی طرح ذہن نشین کرلیجئے کہ ہمارے معمارانِ ملت کے نزدیک "تعمیرِ ملت" کی اصطلاح کا اصلی مفہوم کیا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیر درحقیقت کن اجزاء سے ہوتی ہے۔

۲؎ یہ بھی بیگم صاحبہ کی عنایت ہے کہ انہوں نے اسے صرف "مسلمانوں" کا ناچ قرار دیا۔ ورنہ انہیں تو اسے خالص اسلامی ناچ کہنا چاہیئے تھا۔

۳؎ پاکستان کے تمام مسلمانوں کو آزوری صاحبہ کا شکر ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ایک ایسے عظیم الشان قومی و ملی نقصان پر ہم کو متنبہ کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کی بھی توجہ نہیں گئی۔ واگہ کے اس پار کے نقصانات کا جب کبھی ذکر آیا تو کسی نے ہزاروں بہوؤں بیٹیوں کی بے حرمتی کا غم کیا، کسی نے مساجد اور مزارات کا ماتم کیا، کسی نے ایک آہِ سرد کے ساتھ دینی مدارس اور اسلامی کتب خانوں کو یاد کیا، لیکن اسے اسلامی بے حسی کہئے یا دینی بے خبری کہ ہمارے بڑوں اور چھوٹوں میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا خالص ملی و اسلامی ناچ، "خٹک ناچ" بھی واگہ کے اس پار ہی رہ گیا اور ستم یہ ہے کہ ظالم ہندو اسے اپنائے لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان کا ناچ ہے۔

اللہ اکبر، یہ ظلم! اگر اس ورثۂ ملی کو بھی ہم واپس نہ لے سکے تو پاکستان بنانے سے حاصل کیا ہوا ۔ ؟

میں آرٹ سے مراد ناچ اور گانا ہے۔ نیز ان اعلانات میں جس آرٹ اکاڈمی کے قیام کی بشارت دی گئی ہے اس کے باضابطہ قیام کا اشتہار بھی آذوری صاحبہ کے رقص کی تصویر کے ساتھ ۹ر فروری سنہ ۵۰ء کے "ڈان" کراچی میں شائع ہو چکا ہے اور اس اشتہار پر "زیر سرپرستی آنریبل مسٹر غلام محمد وزیر مال" کے الفاظ بھی اہلِ پاکستان کی آنکھیں روشن کرنے کے لئے ثبت ہیں۔ یہاں پھر ایک مرتبہ پلٹ کر مسٹر غلام محمد کی اس تقریر کو پڑھ ڈالئے جو انہوں نے اسلامی اقتصادی کانفرنس میں کی تھی، یہ ہے عمر بھر کے مطالعۂ اسلام کا نچوڑ!

## زنانہ نیشنل گارڈ

پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کو جو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی پریڈوں اور سلامیوں سے اس ملک کے اربابِ اقتدار اور لیڈر صاحبان کو جس درجہ دلچسپی ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت دفاعی نقطۂ نظر سے جو اہمیت ہمارے ملک میں اگر کسی چیز کو حاصل ہے تو اسی چیز کو حاصل ہے۔ ہماری قیادتِ علیا کے اراکین اپنے مصروف پروگراموں میں اور کسی چیز کے لئے وقت نکال سکیں یا نہ نکال سکیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ زنانہ نیشنل گارڈ کی پریڈوں اور سلامیوں کو قضا ہونے دیں اور یہ پریڈیں اور سلامیاں جن اسلامی آداب و قواعد کے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں اس کے متعلق چند رپورٹیں ملاحظہ ہوں:-

"قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کی طرف سے ڈھاکہ اسپورٹ ایسوسی ایشن کے وسیع میدان میں قواعد کھیل اور رسہ کشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ صوبہ کے گورنر سر فریڈرک بورن نے زنانہ نیشنل گارڈز کی جماعت میں شہر کے بعض معتمد حضرات کی بیگمات اور کالج کی طالبات شریک ہیں اور باوجود روزمرہ کی مصروفیات کے یہ خواتین اس قومی ادارہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے قیام کی پہلی سالگرہ موقع پر نہ صرف ڈھاکہ بلکہ دوسرے اضلاع کی خواتین بھی اسپورٹس میں شریک ہوئیں۔ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ہمراہ سفید وردیوں اور سبز پیٹیوں میں ملبوس خواتین نے مارچ پاسٹ کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد سو گز کی دوڑ، لانگ جمپ (لمبی چھلانگ)، رسہ کشی اور دوسرے کھیلوں کے مظاہرے کئے گئے ہیں۔ اس موقع پر ہندوستان کے ہائی کمشنر مسٹر سنتوش کمار باسو، میجر جنرل ایوب خاں اور دوسرے اعلیٰ فوجی اور سول افسران بھی موجود تھے۔"

(نوائے وقت، ۱۶ر مارچ سنہ ۴۹ء)

پچھلے دنوں اس زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک دستہ کو مکہ اور مدینہ کی سندِ تصدیق بھی حاصل ہوگئی۔ سعودی عرب کے جو نمایندے بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے ایک "چاق چوبند" دستہ کی پریڈ دیکھی اور نہ صرف اس کی تحسین فرمائی بلکہ یہ امید ظاہر کی کہ سعودی عرب کی خواتین بھی اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں گی۔ پاکستان کے مسلمان جو مکہ اور مدینہ کے فتووں کو ہمیشہ آخری دینی سند کی حیثیت دیتے رہے ہیں، علمبردارانِ کتاب و سنت کے اس فتوے کے بعد بھلا اب کسی کو زنانہ نیشنل گارڈ کے کسی پہلو پر نکتہ چینی کرنے کا ہے کو لب ہلانے کی اجازت دیں گے۔ اصل خبر بالفاظہا ملاحظہ ہو۔

"کراچی۔ ۹ر دسمبر۔ آج کراچی میں پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک چاق چوبند دستہ نے پریڈ کی، بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شریک ہونے والے سعودی عرب کے ارکان وفد اور پاکستان میں سعودی عرب کے مدار المہام نے پریڈ کی سلامی لی۔

سعودی عرب کے وفد کے لیڈر نے اس تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی خواتین قومی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش جس طرح کام کر رہی ہیں انشاء اللہ سعودی عرب کی عورتیں بھی اپنے فرائض اسی تندہی سے انجام دیں گی۔"

(نوائے وقت ۱۱ر دسمبر سنہ ۴۹ء)

اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تمام تربیت مرد فوجی افسروں کے سپرد ہے اور وہ ان بہنوں کی تربیت جن شرعی اخلاقی ذمہ داریوں کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں اس کے متعلق ایک واقف حال کی شہادت ملاحظہ ہو۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنی ۲۳ر اپریل سنہ ۴۹ء کی اشاعت میں اپنے ایک مراسلہ نگار "حقیقت پسند" کا مندرجہ ذیل مراسلہ شائع کیا ہے:-

"جنابِ من!

پیشتر اس کے کہ آپ تتلیوں اور پردے کی بحث ختم کریں، کیا آپ ایک حقیقت پسند شخص کو بھی اپنے احساسات پیش کرنے کا موقع دیں گے۔ فوج سے متعلق اپنے ۳۰ سالہ تجربہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ فوج کے صرف وہ افسر عورتوں کے آوارہ پھرنے کے حق میں ہیں جو محض جنگی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ ... ... ... یہ لوگ نوجوان ہیں اور عورتوں کی یہ آزادی اس لئے چاہتے ہیں تاکہ جہاں موقع میسر آئے یہ عورتیں ان کی تفریح کا سامان بن سکیں۔ ان کے ہاں کھانے کی میزوں پر سب سے زیادہ پردہ ہی بحث کا موضوع ہوتا ہے اور یہ لوگ تصویر کا دوسرا رخ کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

میں کیپٹن ظفر اللہ اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی توجہ ان ہی دنوں کی صرف اس خبر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں ان زنانہ نیشنل گارڈوں کا ذکر تھا، جن کا معاملہ نرسنگ اور دوسرے ڈاکٹری شعبوں میں بھرتی کے لئے زیر غور تھا اور اس سلسلہ میں ان کے ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت پیش آئی اس ڈاکٹری معائنہ کا خوفناک نتیجہ بیان کرنے سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔ یہی ایک بات ہمارے سمجھدار دوستوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے[1]۔ آخر اس کی وجہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔؟

حقیقت پسند، لاہور

اگر آپ یہ اندازہ کرنا چاہیں دفاع ملکی اور نیکی و خیرات کے خشک بے مزہ اور کڑوے کسیلے کاموں کو ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ نے کس قدر لذیذ اور پُرکشش بنا دیا ہے تو اس کے لئے اس کی تیسویں بٹالین کے اس تفریحی پروگرام کی روداد ملاحظہ فرمایئے جو کرافٹ ہال میں زیر سرپرستی بیگم لیاقت علی خاں ۲۷، ۲۸، ۲۹ اگست کی تاریخوں میں منعقد ہوا۔ یہ روداد "ڈان" میں اس کے نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوتی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے:-

"پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کا تیسواں بریگیڈ گزشتہ تین روز سے ایک نایاب نظارۂ جمال فراہم کر رہا ہے۔ لوگ جب کسی نیک مقصد میں مدد کے لئے خیراتی فنڈ کا کوئی تماشہ دیکھنے جاتے ہیں تو ٹکٹ خریدتے ہوئے عموماً وہ کسی اونچے معیار کی توقع نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ سے ان کے لئے یہ پُرمسرت اور تعجب انگیز امر تھا جب انہوں نے دیکھا کہ موسیقی، رنگ اندر زریں ملبوسات کا ایک طوفان ان پر اُمنڈ پڑا۔

تماشہ کی ابتدا سازندوں کے ایک طائفہ نے کی۔ نوخیز خوش جمال اور خوش پوشاک لڑکیاں ستار، اسراج، وائلن اور بانسری پورے کمال فن کے ساتھ بجا رہی تھیں۔ یہ انبوہِ جمال و موسیقی دیکھنے والوں کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش تھا۔ پھر چھ مہوش لڑکیوں نے فصلی ناچ شروع کیا۔ یہ ناچ حسن و شباب اور مسرت و انبساط کا پورا پورا مظاہرہ تھا۔ منی پوری ناچ تو کمال فن کا ایک نادر نمونہ تھا جو ایسے تفریحی تماشوں میں دیکھنے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔ مصری ناچ اپنی خصوصیات کے مطابق حرکاتی تیزی اور نغماتی ہم آہنگی کا ایک دلکش مرقع تھا۔ پھر پنجاب کا مشہور دیہاتی ناچ لڈی تو بس طوفان نغمہ و رنگ تھا۔ ستار پر مسز نذیر احمد کا نغمہ تنہائی اور اس پر رنگ برنگ روشنیوں کا بہاؤ آواز کے جادو کو دوبالا کر رہا تھا۔ پردوں کے پس منظر میں غالب کی غزل ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ایسے دل آویز انداز میں گائی جا رہی تھی کہ دل کے تاروں کو مرتعش کئے دیتی تھی۔ ... ...

---

[1] نامہ نگار صاحب کی یہ سادہ مزاجی قابل داد ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کے خوفناک نتائج ان حضرات کی آنکھیں کھولنے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ مبارک نتائج برآمد ہوں اور ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ خود ان کا ہو۔

رنگ و لباس اس تفریحی تماشہ کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ان خصوصیتوں کا مظاہرہ سوزن کاری کی فیشن پریڈ کے ذریعہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف قسم کے ملبوسات آب و تاب، ریشمی چمک اور جواہراتی دمک کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ دہلوی بیگمات اپنی ناممکن التقلید خصوصیات کے ساتھ، حیدرآبادی بیگم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے پُرشکوہ ملبوس میں، لکھنوی بیگم اپنے مخصوص ناز و ادا کے ساتھ جو واجد علی شاہی دربار کا طرۂ امتیاز تھا۔ رامپوری بیگم اپنے دل ربا انداز، نئی پاکستانی خاتون قدامت کے لوچ کے ساتھ نئی تیزی اور نفاست لئے ہوئے، میمن اور سورتی بیگمات اپنے دل آویز کاڑھے ہوئے ملبوسات کے ساتھ اسٹیج کے آرپار تھرک تھرک کر ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی تھیں۔

تماشہ کا اختتام درجن بھر عورتوں کی دلفریب قوالی سے کیا گیا۔ نہ صرف یہ موسیقی اور نغمہ کسی بہتر سے بہتر قوالی کا معیار کا تھا بلکہ ان پُرفن عورتوں نے تو اپنے پُرسحر ناز و ادا سے قوالی میں کمال ہی پیدا کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کامیابی میں ان کے حسن و لباس کو بہت کچھ دخل تھا۔

نغمہ و رقص سے مرکب چار سین کا ایک پُرمذاق ڈراما بھی پیش کیا گیا جس کا نام "جیت" تھا۔ یہ ایک مسلمان رئیس کے گھر کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ .. .. .. .. .. .. ہیروئن مسرت و انبساط کی تصویر تھی، مذاق و شوخی و شرارت سے بھری ہوئی اداکاری اور فن کاری کا مرقع تینوں منگیتر نہایت وجیہ اور نوجوان تھے لیکن جیتنے والا حمید تو واقعی فاتح تھا۔ .. .. .. ..

بیگم لیاقت علی خاں دلی مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال مہربانی سے سرپرستی فرما کر اس تماشہ کو پیش کرنے کی ہمت افزائی فرمائی، یہ صرف انہی کی پُرتجسس نگاہیں تھیں جنہوں نے بہت سے پوشیدہ جواہرات کو ڈھونڈھ نکالا۔ آرٹ اور اس کے متعلقات سے ان کی دلچسپی نے ہماری معاشرت میں آرٹ اور موسیقی کو دوبارہ زندگی بخشی ہے۔

یہ تماشہ کہاں تک پسند کیا گیا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تماشہ کے دوران میں قریب قریب ہر پیش کش پر ریلیف فنڈ کے لئے عطیات کے اعلان ہوتے رہے۔"

(ڈان: مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۵۱ء)

"یہ ہے ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تصویر جس کو اس وقت پاکستان کی دفاعی تیاریوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہے ہماری وہ فوج ظفر موج جس کے لئے قرآن و حدیث سے دلیلیں فراہم کی گئی ہیں کہ مسلمان خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جنگی کاموں میں حصہ لیتی تھیں، یہ ہیں وہ طریقے جن میں ماہر ہو جانے کے بعد ہماری بہنیں اور بیٹیاں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیں گی اور یہ ہیں وہ اسلامی طریقے جن سے ہماری قوم کا جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ ابھرتا ہے اور جن سے کام لے کر وہ اپنے جہاد کے لئے روپے فراہم کرتی ہے۔"

**زنانہ کالجوں کا رنگ**

ہمارے زنانہ کالجوں میں لڑکیوں کو جس طرح اسلامیت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے اس کے ثبوت میں صرف فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کا حوالہ دے دینا شاید کافی ہوگا۔ اخباروں میں آئے دن اس کالج سے متعلق ایسی تصویریں چھپتی رہتی ہیں جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے وزرائے عظام یا حکام عالی مقام میں سے کوئی بزرگ نہایت شان سے براجمان ہیں اور ان کے ارد گرد کالج کی طالبات اور معلمات اس طرح جمع ہیں جس طرح شمع کے گرد پروانے۔

لاہور کا اسلامیہ کالج فار ویمن ایک پردہ کالج ہونے کے لحاظ سے مشہور رہا ہے۔ اب ہمارے ارباب کار اس کو جو شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے مراسلے سے فرمائیے جو "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کی ۲ فروری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ایک طالبہ کا باپ اخبار مذکور کو لکھتا ہے:-

جناب من!

زنانہ اسلامیہ کالج لاہور خالصۃً پردہ دار ادارہ ہے اور اس بنا پر اسے مسلمانوں سے عطیات اور امدادی و خیراتی رقوم حاصل ہوتی

رہی ہیں۔ مگر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کالج میں ایسے مرد اور ان کے دوست احباب آتے ہیں جن کا اس ادارے سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب ایسے لوگ کالج میں آتے ہیں۔ اور یہ وقتاً فوقتاً آتے ہی رہتے ہیں۔ تو لڑکیوں کو حکماً ننگے سر اور بے نقاب رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ میں ایک طالبہ کے والد کی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہ کالج باپردہ نہیں رہا؟ اگر نہیں رہا تو پبلک کو اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا؟[1]

ایم۔ اے۔ مجید قریشی۔ لاہور

## مخلوط کالجوں کا حال

لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط کالجوں اور اسکولوں کے متعلق ہر نیک نہاد مسلمان کو یہ گمان تھا کہ تہذیب شیطانی کی یہ لعنتِ کبریٰ پاکستان بننے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کی جائے گی لیکن اوپر بیگم لیاقت علی خاں کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں کہ آزادیٔ نسواں اور پردہ شکنی کے لئے جو جہاد انہوں نے شروع کر رکھا ہے اس میں اپنی ساری کامیابی کا انحصار وہ انہی کالجوں پر سمجھتی ہیں۔ انہی کالجوں کے اندر ان کے خیال میں۔ اس فوجِ ظفر موج کے افسر اور کمانڈر تیار ہو رہے ہیں جو اس ملک میں اس خالص اسلامی تہذیب کو قائم کریگی جس کے لئے بیگم صاحبہ میلاد کی مجلسوں میں عالمانہ انداز میں تقریریں فرمایا کرتی ہیں اور جس کے قائم کرنے کے لئے ہی ان کے محترم شوہر نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں مشہور قرارداد مقاصد پیش کرائی ہے۔

ان کالجوں میں پڑھنے والیوں اور پڑھنے والوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ واقعہ یاد آگیا ہے جس کو ہم محض اس خیال سے یہاں ذکر کرتے ہیں کہ اس سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ موجودہ تعلیم کس ٹائپ کے اشخاص تیار کرتی ہے اور کس ذہنیت اور کس مذاق کے لوگ ہیں جن کو اس نظامِ تعلیم میں یہ درجہ بخشا گیا ہے کہ وہ ہماری نوجوان نسل کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مکتب میں بٹھا کر تعلیم دے رہے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے اخلاق بگڑتے نہیں بلکہ بن رہے ہیں۔

غالباً اپریل ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے بعض رفقاء کو پاکستان کے ایک کالج میں تقریر کیلئے دعوت دی گئی جو لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط کالج تھا۔ مہمان کی تقریر سننے کے لئے ہال میں جس طرح لڑکے جمع ہوئے اسی طرح طالبات بھی جمع ہوئیں اور تہذیب جدید کے آداب کے مطابق لڑکیاں ہال کی اگلی بنچوں پر بیٹھیں اور ایک آدھ کے سوا سب بنیں بے نقاب تھیں۔ جب حاضرین اور مہمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کالج کے پرنسپل صاحب معزز مہمان کے خیر مقدم اور حاضرین سے ان کے تعارف کیلئے کھڑے ہوئے اور اپنی فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز انہوں نے ایک مصرعہ سے فرمایا جس کو اپنے ادبی ذوق اور اپنی اخلاقی حس دونوں پر انتہائی ظلم کر کے میں محض اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ ناظرین اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ مصرعہ یہ تھا۔

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے

پرنسپل صاحب نے یہ مصرعہ اس بے تکلفی سے پڑھ دیا گویا خطبہ مسنونہ تلاوت فرما رہے ہیں اور دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر میرا جو حال ہوا اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ باوجودیکہ اب اس واقعہ پر ایک مدت گزر چکی ہے لیکن آج بھی اگر اس اجتماع اور اس مصرعہ کا خیال آجاتا ہے تو مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ گویا اس مصرعہ کے پڑھنے کا جرم پرنسپل صاحب سے نہیں بلکہ مجھی سے ہی صادر ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے مقصود کسی خاص کالج اور اس کے پرنسپل صاحب کو زیر بحث لانا نہیں ہے بلکہ مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن مخلوط کالجوں کی نسبت بیگم لیاقت علی خاں صاحبہ اور ہمارے ارباب کار کو یہ گمان ہے کہ ان کے اندر اس ملک میں آئندہ قائم ہونے والی تہذیب کے نمونے ڈھالے جا رہے ہیں ان کے طلبہ اور طالبات تو الگ رہے ان کے پرنسپلوں تک کے مذاقِ سلیم کا یہ حال ہے کہ ان کی صحبت سے

[1] نامہ نگار صاحب سے گزارش ہے کہ جب پبلک اتنی اندھی ہو جائے کہ دن دھاڑے اور ڈنکے کی چوٹ عملاً جو کچھ کیا جا رہا ہے اسے نظر نہ آئے تو آخر اسے آگاہ کیوں نہ بنایا جائے۔ وہ تو اپنے سامنے دنیا بے وقوفوں کی بستی ہے (The world is full of fools) کا قاعدہ کلیہ رکھ کر چل رہے ہیں۔ اور ان کا اب تک کا تجربہ اسی قاعدہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو پرہیز کرنا واجب ہے۔

## ڈرامے اور مینا بازار

آزادیٔ نسواں اور پردہ شکنی کی اس تحریک ہی کو مقبول بنانے کے لئے ڈراموں، ناچ گانے کی مجلسوں اور مینا بازاروں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس کی ہر دلعزیزی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں تہذیب و ثقافت نام ہی ان چیزوں کا رہ جائے گا۔ ڈراموں میں بیشتر زنانہ نیشنل گارڈز، کالجوں کی طالبات اور سرکاری اداروں کی پناہ گزیں لڑکیاں حصہ لیتی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس "آرٹ" کو فروغ دینے کے لئے ہمارے اندر سے ایک مستقل طبقہ اس تحریک کے کارکنوں کے ہاتھ آگیا ہے جو عجب نہیں کہ بگڑتے بگڑتے ایک دن اس کو پیشہ ہی بنا بیٹھے۔

مینا بازار پاکستان میں بیگم لیاقت علی خاں صاحب کی اولیات میں سے ہے۔ انہی نے کراچی میں اس کا آغاز فرمایا اور اب یہ حال ہے کہ پاکستان میں قومی و ملّی مقاصد کے لئے روپے اکٹھے کرنے کا اس کو واحد کامیاب ذریعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں کراچی کے مینا بازار کی تقلید کی جاچکی ہے اور جو شہر باقی رہ گئے ہیں وہ بھی جلد از جلد اس اسوۂ حسنہ کی پیروی سے سعادت اندوز ہونے کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ مینا بازار ظاہر میں تو اس غرض کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں کہ ان سے قومی اغراض کے لئے روپیہ اکٹھا کیا جائے لیکن در حقیقت ان کا مقصد عورتوں کو اس آزادی و بے قیدی کی چاٹ لگانا ہے جو اس ملک کے اربابِ اقتدار یہاں پھیلانے کے دل سے خواہشمند ہیں چنانچہ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر یہاں بازار کی ایک خاص قسم رائج کی گئی ہے جو پردہ شکنی کی تحریک اور جنسی جذبات کو بھڑکانے میں خاص طور پر معین ہے اور چونکہ جنسی جذبہ کی زود اشتعالی اور اثر انگیزی معلوم ہے اور اس کے ذریعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ عوام کی بھیڑیں اکٹھی کی جاسکتی ہیں اس لئے اس نسخہ کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ قوم کو اگر ایک آزاد اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو اس کو ایسی تربیت دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے اعلیٰ قومی اور مذہبی جذبات بیدار ہوں اور تمام پیشِ نظر مہمات میں یہی جذبات اس کی رہنمائی کریں۔ اگر ہر کام ناچ گانے کی مجلسوں، ڈراموں، مینا بازاروں ہی کے واسطے سے لیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ایک جنسی جذبہ کے سوا اس قوم کے دوسرے سارے جذبات بالکل مردہ ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اگر آپ کوئی مسجد بنانے کے لئے بھی اس سے چندہ مانگیں گے تو اس وقت تک وہ آپ کو ایک حبہ نہیں دینے کی، جب تک آپ پہلے اس کو مینا بازار کی سیر نہ کرائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں یہ ذوق، روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے اور مینا بازاروں کی نت نئی قسمیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو مینا بازار سیالکوٹ میں لگایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح پاکستان کے کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی نے فرمایا۔ اس کے پروگرام میں ایک دن عورتوں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس خاص دن کے متعلق ایک خاتون کا بیان ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے عینی شاہد کے بعد اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع کرایا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوسکے گا کہ پاکستان میں مینا بازاروں کا مقصد کیا ہے۔ خاتون مذکور لکھتی ہیں:۔

"جنابِ من!

سیالکوٹ چھاؤنی میں جو مینا بازار لگایا گیا تھا اس کے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا دوسرا دن عورتوں کے لئے خاص ہوگا۔ میں یہ اعلان ہی سن کر حیران رہ گئی کیوں کہ مینا بازار تو کہتے ہی اس بازار کو ہیں جو عورتیں عورتوں کے لئے لگائیں۔ لیکن جب میں اس مینا بازار میں گئی تو وہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ وہاں کی ہر چیز کو اپنی توقعات کے بالکل برعکس پایا۔ تقریباً سب ہی دکانوں اور اسٹالوں کو مرد ہی چلا رہے تھے۔ اس احاطہ میں سب سے نمایاں چھ پولیس افسر تھے جو اس نمائش کے وسط میں براجمان تھے۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز وہ چار جی ایم پی

---

۱؎ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ناظرین کو ۲۰ر مارچ ۱۹۴۹ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور میں کراچی کے مینا بازار میں صرف بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان کی ملاقات کی ایک تصویر دیکھ لینا کافی ہوگا۔

کے آدمی تھے جو ہر طرف پھر رہے تھے۔ تقریباً سو آدمی مختلف ڈیوٹیوں میں ہر طرف گشت لگا رہے تھے "

بیگم ایم بشیر، سیال کوٹ۔

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۹ء)

## بیرونی ممالک میں ہماری خواتین کا تعارف

آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک اب اندرونِ ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کی منادی دوسرے ممالک میں بھی شروع ہو گئی ہے۔

آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی ششماہی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ پاکستان کی خواتین نے بیرونی ممالک سے اپنے تعلقات جس قدر وسیع کرلئے ہیں خود حکومت پاکستان بھی اپنے تعلقات اب تک اس قدر وسیع نہیں کرسکی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وہ اخبارات بھی جو اس تحریک کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش ہیں اس وسعتِ تعلقات کو دیکھ کر گھبرا اُٹھے ہیں اور وہ عورتوں کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں اندرونِ ملک ہی تک محدود رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہماری اسلامی حکومت کی خواتین جس پہلو سے متعارف ہو رہی ہیں اس کو واضح کرنے کے لئے ہم یہاں اس وفد کی کارگزاری پیش کرتے ہیں جو آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی طرف سے امریکہ میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی زنانہ نمائش میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوسکے گا کہ جہاں ہر مذہب و ملت کی خواتین نے اپنی اپنی تہذیب و روایات کی نمائش کی وہاں ایک خالص اسلامی حکومت کی نمایندہ خواتین نے اسلامی تہذیب و روایات کے کیا نمونے دکھائے۔

".. بین الاقوامی زنانہ نمائش کا چھبیسواں سالانہ اجلاس جو ۹ر نومبر ۱۹۴۹ء کو نیو یارک میں شروع ہوا۔ اس میں پاکستان کی نمایندگی بیگم حسین ملک (قائدِ وفد) بیگم نذیر احمد اور مسز پرائڈنے کی۔ .. .. شام کو پاکستانی وفد و بیگمات مذکورہ نے حاضرین کی تواضع کے لئے ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا۔ .. .. .. بیگم حسین ملک نے جنہوں نے اس پروگرام کا افتتاح کیا، پاکستانی عورتوں کی طرف سے امریکن عورتوں کو خیرسگالی کا پیغام پہنچایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی عورتوں کو تعمیرِ ملی کے کاموں میں عملاً شریک کرنے کے لئے اُن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ .. .. .. پردہ کے نفاذ سے عورتوں کو ان کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم کرنا مقصود نہیں تھا[۱]۔ بہر حال اب پردہ پاکستان سے بڑی تیزی سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیگم حسین ملک کے بعد بیگم نذیر احمد نے حاضرین کو پاکستانی گیت سے محظوظ کیا۔ پروگرام کے آخر میں مشہور عالم رقاصہ زہرہ اور اس کے ساتھی نے مغلوں کا درباری رقص پیش کیا[۲]۔

اس پروگرام میں ہمارے سفارت خانے کے افسروں، ان کے متعلقین، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہونے والے پاکستانی وفد کے اراکین اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی "

۲۳ر اور ۲۵ر نومبر ۱۹۴۹ء۔ ڈان کراچی

پاکستانی خواتین کی ترقی پر نیو یارک کے "کرسچین سائنس مانیٹر" (christian science monitor) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جو ڈان کراچی نے اپنی ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے۔ ہم اس کا ضروری اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ ہوسکے گا کہ باہر کی دنیا میں پاکستانی خواتین کے حال اور مستقبل کو کس نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور کس عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔

---

[۱] بیگم صاحبہ نے بیا باوجی (معذرت) غالباً اسلام کی طرف سے پیش کی ہے جس کے لئے وہ مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں۔

[۲] انصاف کے ساتھ فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم ہوا ہوتا تو اس عظیم الشان اسلامی ورثہ کا محافظ کون ہوتا اور امریکہ جیسے دور دراز کفرستان میں آج اس کا مظاہرہ کر کے اسلام کا بول بالا کون کرتا "!

"نیویارک - ۲۸ دسمبر - پاکستانی خواتین برابر ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہی ہیں ... ... ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی آزاد قومی زندگی کی لہر حرم کے اندرونی گوشوں تک پہونچ گئی بہت سی پردہ نشین عورتوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا اور یک لخت ان میں سے سینکڑوں ڈھیلے زرد ڈھاپچے لئے ہوئے پناہ گزینوں کی مدد کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں ........ بیگم رعنا لیاقت علی خاں ـــ وزیر اعظم پاکستان کی نرم و نازک - زندہ دل حسین بیوی ـــ نہایت ہوشیاری کے ساتھ پردہ کو سرے سے اڑا دینے کے خواہاں اور اس کے دقیانوسی حامی گروہوں کے بین بین راستہ اختیار کر رہی ہیں ... ... حال ہی میں صوبہ سرحد میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ پاکستانی گورنر کو خوش آمدید کہنے کے لئے سینکڑوں پٹھان عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں"

(ڈان - کراچی - مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

شاہ ایران کے ساتھ جو ایرانی اخبار نویس پاکستان آئے تھے انہوں نے واپس جاکر اپنے اخبارات میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کا ایک نمونہ مسٹر ممتاز احمد خاں صاحب جو شاہ کے ہمراہ طہران گئے تھے، کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:-

ممتاز احمد خاں صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں-

" ... ... ... ایرانی اخبار نویسوں نے جو شاہ ایران کے ساتھ پاکستان آئے تھے، واپس جاکر پاکستان پر ہر پہلو سے بہت ہی ہوش رُبا مضامین لکھے اور ان میں پاکستان کی فوج سے لے کر اس کی شان دار ساڑیوں اور غراروں تک ہر شے کا ذکر کیا-

ہفتہ وار اخبار "ترقی" کے ایڈیٹر آقائے لطف اللہ صاحب نے لاہور پر ایک مضمون لکھا جس میں پاکستانی عورتوں کی دولت حُسن کو، جو ملک کے ہر حصے سے اس خوب صورت رومانی شہر میں جمع کی گئی تھی، بہت نمایاں کرکے بیان کیا- اپنے اس مضمون میں اُنہوں نے "حسن نمکین ہندی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایران کے قدیم شاعروں، مصنفوں اور سیاحوں نے ہندی لڑکیوں کی غزال چشمی کے جو نقشے کھینچے تھے آج کا لاہور اس کا ہو بہو نقشہ پیش کرتا ہے ... ... ...

یہ مضامین دکانوں، ہوٹلوں، بازاروں اور گھروں میں ہر جگہ، خوب مزے لے لے کر اور شوق سے پڑھے گئے"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور، مورخہ ۴ اپریل ۱۹۵۰ء)

**زہر آلود تحریریں**

اس تحریک کو جلدی سے جلدی کامیاب بنا دینے کے لئے جس قسم کا لٹریچر دن رات فراہم ہو رہا ہے اور وہ جس طرح بے روک ٹوک اخبارات و رسائل کے ذریعہ سے گھر گھر پہونچ رہا ہے افسوس ہے کہ اس کی پوری تفصیل پیش کرنا سر دست میرے لئے ممکن نہیں ہے- تاہم چند مراسلات کے نمونے نذر ناظرین ہیں- ان سے آپ اندازہ فرما سکیں گے کہ ہماری اس اسلامی حکومت کے ارکان جو اپنی ذات پر معمولی سے معمولی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اگر کوئی اخبار یا رسالہ بھول کر بھی ان کی شان میں ایک حرف نکتہ چینی کی قسم کا لکھ دیتا ہے تو فوراً چراغ پا ہو جاتے ہیں اور اس "غدّار" کی سیفٹی ایکٹ سے خبر لے ڈالتے ہیں، وہ کتنے روادار اور فیاض و حریت نواز واقع ہوئے ہیں، اس قسم کی تحریروں کے لئے جو ان کے اس محبوب مقصد "آزادیٔ نسواں" کو تقویت پہنچائیں اگرچہ ان میں خاندانِ رسالت اور صحابہ و صحابیات کی کھلی ہوئی توہین کی گئی ہو، اگرچہ ان میں ہمارے تمام اسلاف صالحین کو

---

[۱] قرآن نے جن خواتین کو مسلمان عورتوں کی رہنمائی پر مقرر کیا ان کے اوصاف سورۂ احزاب میں یہ گنائے ہیں:- مسلمات (خدا کی فرمانبردار) مومنات (خدا پر ایمان رکھنے والیاں) قانتات (مطیع) صادقات (راست باز) صابرات (ثابت قدم) خاشعات (خداترس) متصدقات (صدقہ دینے والیاں) صائمات (روزہ رکھنے والیاں) حافظات (اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والیاں) ذاکرات (اللہ کو یاد رکھنے والیاں) (احزاب ۳۵)

لیکن یہ اوصاف تو بقول نامہ نگار دقیانوسی قیادت کے ہیں- نئی قیادت جن محاسن سے مسلح ہو کر میدان میں آئی ہے وہ نرمی و نزاکت اور زندہ دلی اور حُسن ہے - ؎ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا -!

بدا خلاق ٹھہرایا گیا ہو، اور اگرچہ ان کے ایک ایک حرف سے اسلام کے خلاف غصہ اور نفرت کی بدبو پھوٹ رہی ہو- چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

راولپنڈی کے کوئی بزرگ کیپٹن ظفراللہ پونسی ہیں- ان کا ایک مراسلہ، جو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۷ اپریل سنہ ۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو-

"جناب من! مس جبین نے میرے خط کا جو جواب دیا ہے اس نے اس قیدی کی یاد تازہ کر دی ہے جو مدتوں قید رہنے کی وجہ سے اُس کوٹھری ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے جس میں وہ بند رکھا گیا ہے-

ہاں میں جانتا ہوں کہ پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ پردہ کرتی تھیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قائد اعظم کی بہن فاطمہ ایسا نہیں کرتیں اور یہی دموخرالذکر فاطمہؒ) طریقہ صحیح ہے[ف۱]- کیونکہ ہمارا ملک دوسرا ہے، ہماری دنیا دوسری ہے، ہمارے حالات دوسرے ہیں اور یہ سب کچھ اس سے مختلف ہے جو تیرہ سو سال پہلے تھا[ف۲]-

یہ بالکل بے تکے پن سے ہر معاملہ میں قدیم زمانہ سے جواز تلاش کرنے کا رجحان صرف احمقانہ ہی نہیں[ف۳] بلکہ خطرناک بھی ہے- اس کا نتیجہ سماجی جمود اور ذہنی پستی ہوگا-

بہن جبین، سنو! آپ کی جو بہنیں قید سے رہائی پا چکی ہیں ان پر تتلیوں اور بلبلوں کی پھبتی چست کر کے اپنے دل کو اطمینان نہ دلانے کی

---

ف۱ یہ تقابل ملاحظہ ہو مس فاطمہ جناح کا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تمام خواتین جنت کی سردار اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور جن کی زندگی تمام خواتینِ اُمت کے لئے اسوہ اور جن کی محبت لازمہ ایمان قرار دی گئی ہے- پھر یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس تقابل میں مس فاطمہ جناح کے طریق زندگی کو اہل بیت رسالت کے اسوۂ حسنہ پر کھلم کھلا ترجیح دی گئی ہے لیکن ہماری اسلامی حکومت کے اکابر میں سے کسی کی غیرت بھی اس پر حرکت میں نہ آئی- پچھلے دنوں کسی اخبار کی محض اس اطلاع پر کہ امریکہ کی کسی فلم کمپنی کی کسی فلم میں کسی نوعیت سے حضرت فاطمہؓ کا ذکر آ گیا ہے پاکستان کے مسلمانوں کی غیرت بھڑک اُٹھی تھی حالانکہ وہ محض افواہ ہی افواہ تھی اور یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص سیدہ پاک کی کھلی ہوئی توہین و تحقیر کرتا ہے لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی- ہمارے بعض بزرگ مسلمانوں کی آنکھ اور اپر بھی قربان ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنے بزرگوں اور ائمہ دین کی جاہے جتنی توہین کر ڈالیں مگر کوئی دوسرا ان کے خلاف زبان کھولے تو اس کی جان اور اپنی کی جان ایک کر کے رہیں-

ف۲ جب سب کچھ دوسرا ہے تو صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا دین بھی دوسرا ہے اسلام کا انکار کر کے تم جس نازی میں چاہو بھٹکو اور جس کو چاہو اپنا امام اور ہادی بناؤ کسی مسلمان کو تم سے بحث نہیں ہوگی لیکن مسلمان کہلا کے، تمہیں ان کی توہین کرنے کا کیا حق ہے جن کی محبت اور جن کی پیروی اُمت کے لئے جزو ایمان اور ذریعۂ نجات قرار دی گئی ہے؟

ف۳ آپ کچھ سمجھے کہ یہ ذاتِ شریف کس بات کو "احمقانہ" قرار دے رہے ہیں؟ اس بات کو کہ مسلمان ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے طریقے سے سندِ جواز ڈھونڈھنے کی کوشش کیں، ہر امر میں خلافت راشدہ اور سلفِ صالحین کے تعامل کی دلیل تلاش کریں، ہر قدم اٹھاتے وقت اس بات کی جستجو کریں کہ پیغمبر اور صحابہ کی زندگی کی روشنی میں یہ قدم اُٹھانا صحیح ہے یا غلط؟ یہ رجحان ان حضرت کے نزدیک "احمقانہ" ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے؛ لطف یہ ہے کہ یہ مراسلہ اس اخبار میں شائع ہوا ہے جو سنہ ۴۹ء کے وسط میں سیفٹی ایکٹ کے تحت تین مہینے کے لئے اس جرم میں بند کیا گیا کہ اس نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی افواہ چھاپ دی تھی جس سے ہمارے وزیر اعظم صاحب کے متعلق عوام میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی- لیکن اسی اخبار نے جب مسلمانوں کے اتباعِ صحابہ و رسولؐ کے فعل کو احمقانہ اور خطرناک قرار دیا تو کسی کو اس کی ذرہ برابر پروا نہ ہوئی-

کوشش نہ کرو اپنے دل کے اندر دبی گوشوں میں تم جانتی ہو کہ تتلیاں اڑ سکتی ہیں اور بلبلیں گا سکتی ہیں مگر تم پنجرے میں بند زرد چڑیا کی مانند رہائی یافتہ ساتھیوں پر حسرت بھری نظر سے تکتی ہوئی محض چیخ چیخ ہی کر سکتی ہو۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۷ راپریل ۴۹ء)

ایک صاحب احساس، صاحبہ کا ایک مراسلہ ملاحظہ ہو جو مذکورہ بالا اخبار کی ۳۰ راپریل ۴۹ء کی اشاعت کی زینت ہے۔ وہ اخبار کے ایڈیٹر کو مخاطب کر کے رقمطراز ہیں :-

"جناب من !

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روزانہ زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ طریق پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پردہ کے معنے چہرے کو اس طرح چھپانے کے نہیں ہیں جس طرح ہمارے ہاں چھپایا جاتا ہے۔ اصل شئے اخلاقی طرز عمل ہے۔ ہم عورتوں پر پردہ ان لوگوں نے ٹھونسا تھا جن کی اخلاقی حالت کافی بلند نہیں تھی۔[1] انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اخلاق کو بآسانی بلند نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے عورتوں کو اس ظالمانہ طریقے سے قید کرنے کی راہ نکالی اور وہ سمجھے کہ اس خرابی پر قابو پانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ . . . . .

اس میں شک نہیں کہ اگر ہم (عورتیں) بھی مردوں کی طرح باہر پھرنے لگیں تو شروع شروع میں کچھ تکلیف ہوگی مگر یہ صرف عارضی شئے ہوگی جب ہم سب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کوئی بھی ضرورت سے زیادہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوگا۔[2] ہمارے دیہات میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اور وہ ٹھیک طرح سے رہتی ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شہروں میں بھی یہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے؟ شہری لوگ تو بہرحال نسبتاً زیادہ ہی پڑھے لکھے اور زیادہ ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ہوتے ہیں۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور۔ مورخہ ۳۰ راپریل ۴۹ء)

اس تحریک کو غذا اور قوت پہنچانے کے لئے اسلامی تاریخ بالخصوص صدر اول کی تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ پاکستان ٹائمز لاہور کے میگزین سیکشن مورخہ ۲ راکتوبر ۴۹ء میں ایک بزرگ اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

---

[1] یہ اخلاقی پستی کا الزام "صاحب احساس" صاحبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بلکہ نعوذ باللہ خود اللہ میاں پر بھی عائد کر رہی ہیں کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ پردہ سے متعلق تمام جزئیات و تفصیلات خود قرآن پاک اور حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں اور رہا ہے آئمہ و فقہا میں سے کسی نے بھی اس "تبرج" کو جائز نہیں قرار دیا ہے جس کی حمایت میں موصوفہ یہ تقریر فرما رہی ہیں۔

[2] جی ہاں بالکل اسی طرح جس طرح ننگوں کے کلب میں داخل ہو کر کپڑے اتار دیئے تو بڑی شرم محسوس ہوتی ہے مگر کچھ مدت کے بعد کسی مرد و عورت کو یہ احساس تک نہیں رہتا کہ برہنگی کوئی شرمناک چیز ہے۔

[3] صاحب احساس .. خاتون اور ان کے ہم مشرب لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اگر ہمارے دیہات میں کوئی عورت ان آزاد منش خواتین کے سے بناؤ سنگار کر کے ان کی سی چال چلتی ہوئی باہر پھرے اور مردوں کے ساتھ ان کی طرح خلا ملا رکھے تو شاید اسے گاؤں کے غیور لوگ زندہ ہی نہ رہنے دیں۔

"پہلا ادبی مرکز جس کا ہماری موجودہ تاریخ پتہ چلا سکی ہے اس کے قائم کرنے کا فخر حضرت سکینہ رضؓ کو حاصل ہوا جو سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں۔ مدینہ میں ان کا خوبصورت محل وقت کے تمام بڑے بڑے بذلہ سنجوں، گویّوں، شاعروں اور اہل علم کا مرکز تھا عین اس زمانہ میں جبکہ بہادران اسلام کی تلواریں اسپینؔ اور سندھ کو زیرنگین کرنے میں مصروف تھیں یہ نامور خاتون وقت کے ذہین طبقہ کے دلوں اور دماغوں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ یہ ایام اسلامی فتوحات کے ایام بہار تھے۔ ایک طرف ملک کے بعد ملک فتح ہو رہے تھے، دوسری طرف اجتماعی اور تہذیبی دائروں کے اندر بھی فتح کے بعد فتح حاصل ہو رہی تھی۔

حضرت سکینہ رضؓ فیشن میں ہماری سب سے بڑی اور سب سے پہلی لیڈر ہیں، وقت کی تمام مجلسی خواتین ان کے طرّہ کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اس کو طرّۂ سکینہ کہا جاتا تھا۔ وہ موسیقی میں خاص دلچسپی لیتی تھیں چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام سُریج نامی کو اس زمانہ کے شہرۂ آفاق گویّے طویس سے تربیت دلائی تھی۔

اس ادبی مرکز کے جواب میں ایک دوسرا ادبی مرکز، حجاز کے مشہور صحت افزا مقام طائف میں قائم تھا۔ اس مرکز کی روح رواں عائشہ جو مشہور صحابی حضرتِ طلحہ رضؓ کی صاحبزادی تھیں۔ ان (عائشہ) کی ماں حضرت ابوبکر رضؓ کی بیٹی اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں جن کے نام ہی پر بھانجی کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

ان کی کھلے بندوں بیباک پن شد حضرتِ سکینہ سے بھی زیادہ نمایاں اور جاذبِ نظر تھی۔ ایک مشہور قدیم مورخ نے لکھا ہے کہ ان کے دوسرے شوہر ابن زبیر نے جب ان کی اس بات پر اعتراض کیا کہ وہ کبھی چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ "جب خدائے جمیل نے مجھے اپنے فضل سے حُسن و جمال بخشا ہے تو میں اس کے حُسن و صنعت لوگوں کی نگاہوں سے کیوں چھپاؤں لوگ اس طرح خدا کی صنّاعی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں[۵]"

(پاکستان ٹائمز میگزین سیکشن مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

یہ اہل بیت رسالتؐ اور خاندان صدیق اکبرؓ کی بہو بیٹیوں کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مضمون نگار صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی اس زمانہ کا عام رنگ تھا اسی طرح عورتیں کھلے بندوں اپنے حُسن و جمال کی نمایش کرتی پھرتی تھیں تاکہ لوگ خدا کی صنعت کاری کی نشانیاں دیکھ سکیں، جگہ جگہ صحت افزا مقاموں پر نازنینان وقت لٹریری سیلون بنا کے بیٹھتی تھیں در بھانڈ اور گویّے اور شعرا ان کے اردگرد جمع رہتے تھے۔ وہ فیشن کے نئے نئے نمونے ایجاد کرتی تھیں اور وہ نمونے مقابلہ کے بازاروں میں آتے تھے اور ترجیح و انتخاب کے بعد تمام شہروں میں پھیلتے تھے۔ اور دلدادگان حُسن و ادا ان کو قبول کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ کا وہ دور مبارک جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون سے تعبیر فرمایا ہے۔ ان مضمون نگار صاحب کے نزدیک نسوانی ترقی کی ان تمام رعنائیوں سے منور تھا، لیکن بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں رہا اور انہوں نے عورتوں کی اس ترقی کو پیچھے دھکیل دیا۔ چنانچہ یہی مضمون نگار صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ تو بعد کے عباسیوں کے زمانے میں جب انحطاط شروع ہوا تو عورتوں کی ترقی کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس زمانہ میں بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ جن لوگوں کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد باقی نہ رہا انہوں نے عورتوں کو چہار دیواری کے اندر بند کر دیا۔"

---

[۵] یہ پوری بکواس بلاحوالہ ہے۔ حدیث یا تاریخ کی کسی کتاب کا نام اشارۃً بھی نہیں دیا گیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ ان روایات کا ماخذ کیا ہے اور ان کے تاریخی استناد کا کیا پایہ ہے۔ آگے ہم اس معاملہ کی اصل حقیقت واضح کریں گے۔

اس قسم کی نادر تحقیقات جو یہ حضرات فرما رہے ہیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کی نگاہوں میں جلال و جمال تو سمایا ہوا ہے ہالی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا، اور وہی سوسائٹی جو ہالی وڈ میں قائم ہے یہ حضرات پاکستان میں بھی قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہالی وڈ کے نام سے ہالی وڈ کی تہذیب کو یہاں مقبول بنانا ممکن نہیں ہے اس لئے انہوں نے اس پر مدینہ اور طائف کے لیبل لگانے شروع کر دیئے اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہالی وڈ کی ساری تہذیب تو در حقیقت سرقہ ہے ہماری اس اسلامی تہذیب کا جو خیر القرون میں مکہ و مدینہ و طائف میں رائج تھی لیکن بعد میں عباسیوں کے دورِ زوال میں آ کے اس تہذیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

جن پاکیزہ خاندانوں کی عفیفات کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے ان کی تصویر ذرا ایک نظر اس رنگ میں بھی ملاحظہ فرمائیے جس رنگ میں قرآن نے ان کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ یہ تصویر کتنی مختلف ہے اس تصویر سے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہلِ بیت کو مخاطب کر کے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

"وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھو، اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر اپنی نمائش نہ کرتی پھرو۔ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتی رہو۔ اس حکم سے اللہ یہ چاہتا ہے اے رسول کے گھر والو تم سے ناپاکی کو دور کرے اور تم کو پاکیزہ بنائے جیسا کہ چاہیئے۔ اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور دانائی کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو۔ اللہ پاک باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے۔ فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں ایمان رکھنے والے مرد اور ایمان رکھنے والی عورتیں، یکسو ہونے والے مرد اور یکسو ہونے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدم مرد اور ثابت قدم عورتیں، خدا ترس مرد اور خدا ترس عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والی عورتیں —— ان کے لئے اللہ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ (۳۲-۳۵-احزاب)

یہ ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کو مخاطب کر کے دی گئی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال میں حضرت فاطمہ زہراؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جو درجہ و مرتبہ ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مذکورہ ہدایات و اوصاف کا کوئی بہترین نمونہ اگر ہو سکتا تھا تو یہی خواتین ہو سکتی تھیں اور اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان اوصاف کا بہترین عملی نمونہ تھیں بھی۔ پھر یہ بات کس قدر بعید از قیاس ہے کہ جن پاکیزہ خواتین کی زندگیاں اس قرآنی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں انہی کی پوتیاں اور بھانجیاں ایسی اٹھیں کہ انہوں نے مدینہ و طائف میں لٹریری سیلون (Literary saloon) بنا بنا کے اپنے اردگرد گویوں اور بذلہ سنجوں کے مجمعے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے اور اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لئے اسی تبرج جاہلیت کو اختیار کر لیا جس کی اُن کی بزرگ دادیوں اور خالاؤں کو قرآن مجید میں ایسی صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی تھی۔

لیکن ہم تھوڑی دیر کے لئے دل پر انتہائی جبر کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور حضرتِ سکینہؓ نے اپنے عظیم الشان باپ اور اپنی عظیم المرتبت دادی اور حضرتِ عائشہؓ نے اپنے صالح باپ اور اپنے جلیل القدر نانا اور اپنی جلیل المرتبہ خالہ کی پسندیدہ اور اسلامی روشیں ترک کر کے وہی آزادیاں اور بے قیدیاں اختیار کر لیں جن کا مضمون نگار صاحب نے ذکر فرمایا ہے مگر سوال یہ ہے کہ "زوال اور انحطاط" کا نمونہ ان میں سے کون سا طریقہ ہے۔ وہ جس کا ذکر قرآن نے فرمایا ہے اور جس پر حضرتِ فاطمہؓ زہرا اور حضرت عائشہؓ صدیقہ تھیں یا وہ جس کو مضمون نگار صاحب نے حضرتِ سکینہؓ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہؓ کی طرف منسوب کیا ہے؟

ستم پر ستم یہ ہے کہ یہ حضرات اتنی بڑی بڑی تہمتیں ایسے پاکیزہ خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر لگا جاتے ہیں اور کچھ نہیں بتاتے کہ یہ بات وہ کس سند کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں تاکہ کوئی شخص اس کی نوعیت اگر واضح کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ شہیدِ کربلا کی صاحبزادی، فاطمہ زہراؓ

کی پوتی صدیق اکبرؓ کی نواسی، ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی بھانجی کی حرمت ان کا مریڈ صاحبان کی نظر میں بس اس قدر ہے کہ "ایک قدیم موّرخ لکھتا ہے" کی سند پر جو ہفوات چاہیئے ان کی شان میں بکتے چلے جائیے۔ معلوم نہیں یہ قدیم مورخ کون ہے؟ کس دور کا آدمی ہے؟ اس کا دین و مذہب کیا ہے؟ اور کن ذرائع معلومات کی بنا پر یہ باتیں وہ روایت کر رہا ہے؟ محض قدیم ہونا یا موّرخ ہونا تو اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر ایمان لے آئے۔ قدیم و جدید دونوں ہی گروہوں میں ہم ایسے بہت سے موّرخوں سے واقف ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد ہی یہی تھا اور ہے کہ انبیاء و صالحین اور ان کے پاکیزہ گھرانوں کی زندگیاں بگاڑ کے پیش کریں تاکہ اس طرح اپنے ان آقاؤں کی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کے لئے شرعی دلائل فراہم کرسکیں جن کا وہ نمک کھاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب نے اس گروہ کے کن "قدیم موّرخ" کی خوشہ چینی سے تحقیقات کے یہ نوادر فراہم فرمائے ہیں۔

حوالہ کی غیر موجودگی میں مذکورہ بالا بیانات کی تردید یا تصدیق کا معاملہ تو مشکل ہے لیکن عام ناظرین کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں ادب و تاریخ کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں کہ جو زمانہ انحطاط کے بگڑے ہوئے خلفاء اور امراء نے اپنے نمکخواروں سے اس لئے لکھوائی تھیں کہ ان کی تفریح طبع کا سامان مہیا ہو سکے۔ ان کتابوں میں گپوں اور قصوں اور عشقیہ حکایتوں اور افسانوں، راگوں اور گیتوں کی لپیٹ میں صحابہ و صحابیات یا ان کے وابستگان سے متعلق ایسے واقعات بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی جن سے ان فاسق امراء کی رنگ رلیوں کے لئے دلیل ہاتھ آئے۔ ہمارے عربی لٹریچر میں کتاب الاغانی اس طرز کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں عربی گیتوں اور راگوں اور گانے والیوں کے ذکر کے سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی ضمناً آتے ہیں جن کا مقصد پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر ڈالنا ہوتا ہے کہ یہ رنگینیاں کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ رسول اور صحابہ کے زمانہ میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح آج موجود ہیں۔ اس قسم کے جتنے واقعات ان کتابوں میں ملتے ہیں بیشتر یا تو محض گپ ہیں یا ان میں صداقت کا کوئی ذرہ ہے تو اسکی نوعیت بس یہ ہے کہ عام فطری کمزوری کے تحت ذرا سی کوئی بات کسی سے صادر ہوئی ہے اور اس کو نمک مرچ لگا کر ایک پوری یوسف زلیخا تیار کر لی گئی ہے۔ کوئی صاحب نقد اور صاحب علم تو اس طرز کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن جو لوگ مکھیوں کی طبیعت رکھتے ہیں اور بیشتر گندی چیزوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں وہ اس قسم کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں[1]۔ یہ کتابیں جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرے تو ہر چند ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بے ذوقی ہے تاہم

---

[1] میں نے اس اہتمام کے ماخذ کے متعلق یہ رائے محض اپنے ذوق کی بنا پر قائم کی تھی اور چونکہ ملتان جیل میں، جہاں میں نے یہ کتاب لکھی ہے، اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ضروری کتابیں میسر نہیں تھیں اس وجہ سے پورے اعتماد کے ساتھ اس کی تردید یا تصدیق میرے لئے مشکل تھی۔ لیکن حسن اتفاق سے ایک روز جیل کی لائبریری کی فہرست الٹتے پلٹتے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظر ایک کتاب پر پڑ گئی جس کا نام تھا "سکینہ بنت حسین" کتاب نکلوا کر دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے مصنف مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ کتاب کی نوعیت کا اندازہ تو شرر صاحب کے نام ہی سے ہوگیا تھا لیکن مزید اطمینان کے لئے کتاب پڑھی تو اس کے ماخذ کے متعلق میرا گمان صحیح نکلا۔ شرر صاحب نے اپنے مذاق کے مطابق یہ ایک ناولانہ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اگرچہ بیان کردہ واقعات کے حوالے نہیں دیئے ہیں اور نہ ایک ناولانہ مضمون میں اس کی ضرورت تھی لیکن بہ حیثیت مجموعی کتاب کے ماخذ کا پتہ دے دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر و بیشتر حصہ کتاب الاغانی سے ماخوذ ہے۔

یہ کتاب ہمارے بزرگ اسلاف کی رندی کا اشتہار دینے کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ لوگوں کو رندی و ہوسناکی کے لئے دلیل اور سند ہاتھ آئے چنانچہ مصنف نے اپنا مقصد کتاب کے شروع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے قدیم مورخین چونکہ عموماً لوگوں کے ثقہ اور پارسا ہونے ہی کی فکر میں زیادہ رہتے ہیں لہٰذا ہم افسوس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں......"

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

اس کی آزادیِ انتخاب کا حق تسلیم کر کے ہم اس پر صبر کر لیں گے۔ لیکن یہ تو بڑا ظلم ہے کہ حدیث اور رجال اور تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں کو چھوڑ کر اب اس طرح کی خرافات میں سے جھوٹی سچی روایتیں جمع کی جائیں اور دنیا کو یقین دلایا جائے کہ دیکھو یہ ہیں اسلامی تہذیب، اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کے اصل نمونے۔ یہ حرکت بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کوئی شخص اسرائیلی خرافات میں سے وہ سارا مواد جمع کرلے جس میں خدا کے پیغمبروں پر جھوٹ، زنا، چوری، شراب خوری اور طرح طرح کی بداخلاقیوں کی تہمتیں لگائی گئی ہیں اور پھر کہے کہ دیکھو، یہ ہیں وہ اصل کام جن کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر دنیا میں بھیجے تھے۔

## آغاخاں کی رہنمائی

یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ ڈان میں مسلمانوں کے قدیم ناصح مشفق جناب سر آغاخاں بالقابہ کی وہ تقریر نظر سے گزری جو انھوں نے ۸ رفروری ۱۹۵۶ء کو مسٹر زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بنک کے مکان پر، بین الاقوامی امور سے متعلق ادارہ کے اہتمام میں، کراچی کے اونچے طبقے کے ایک اجتماع کو مخاطب کر کے مرشدانہ انداز میں فرمائی ہے۔ تقریر کا موضوع تھا: "مسلمان سلطنتوں کا عروج و زوال اور ان کا مستقبل"۔ اس تقریر میں آپ نے تاریخ کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے اربابِ کار کو جو قیمتی مشورے دئیے ہیں ان میں سب سے زیادہ زرّیں مشورہ، خود اُن کے الفاظ میں، یہ ہے۔

"یقین کیجئے کہ حقیقی اسلام کبھی بھی جامد نہیں تھا، یہ ہمیشہ ایک متحرک شئے رہا ہے۔ بنوامیّہ کے عظیم الشان دور میں جبکہ اس کی بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں، یہ متحرک نہایت سادہ اور واضح تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مورخوں اور مفکروں کو ہدایت کیجئے کہ وہ اپنی ساری توجہ بنوامیّہ کے اس عظیم الشان صد سالہ دور پر مرتکز کریں اور آپ اس اموی دور کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھئے"۔

آگے چل کر اس مثالی دور کے فضائل و محاسن کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے اسلامی تہذیب و معاشرت کے انہی دو نمونوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا ذکر پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب کے حوالہ سے اوپر گزر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اس سلسلہ میں وہ مثالیں بالکل واضح طور پر پیش کی جاسکتی ہیں حضرتِ امام حسینؓ کی صاحبزادی سکینہؒ اور طلحہ کی صاحبزادی (حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی نواسی) نے عرب کی زندگی میں معاشرتی اور علمی حیثیت سے جو آزادانہ حصّہ لیا اس کا موازنہ انیسویں صدی کی خواتین کے مرتبہ سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابتدائی اموی خلفاء کے زمانہ ہی میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا معیار کس قدر بلند ہوچکا تھا۔ اب اس کے مقابلہ میں ذرا اس نفرت و حقارت کو رکھئے جو اس زمانہ کے بعض گمراہ مسلمانوں کو فنونِ لطیفہ (گانے بجانے) سے ہے"۔

(ڈان، کراچی مورخہ ۹ رفروری ۱۹۵۶ء)

اس تقریر کو پڑھ کر آغاخاں بالقابہ کی مرشدانہ قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اسلام سے فرار کی جو راہ انھوں نے سجھائی ہے وہ اب تک یہاں کے نکتہ وروں کو نہیں سوجھی تھی۔ ہمارے اربابِ کار ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کوئی ایسی راہ ڈھونڈ نکالیں کہ اسلام کے ساتھ ناتہ بھی نہ ٹوٹے اور یہ اسلام ان کے پیشِ نظر مقاصد میں خلل انداز بھی نہ ہوسکے۔ لیکن ایسی راہ ڈھونڈ نکالنا جو کفر و اسلام۔ شیطان و رحمٰن، یزدان و اہرمن دونوں کو جمع کرسکے ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک مرشدِ کامل کی ضرورت تھی اور اس تقریر کو

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) مصنف کے مذاق اور رجحان کا اندازہ اس کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے خلیفہ راشد کے متعلق لکھے ہیں:۔ "عمر بن عبدالعزیز کو جو تمام خلفائے اسلام میں ملاؤں اور خشک مزاج زاہدوں کی شان رکھتا تھا اس کو (حضرتِ سکینہؓ کے جوڑے کی عام تقلید کو) روکنے کے لئے اپنی شاہی قوت سے کام لینا پڑا وہ ہاتھ میں دُرّے لئے پھرتا اور جس کے سر پر طرّہ سکینہ دیکھتا دُرّے لگاتا"۔

شرر صاحب نے کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں سے اخذ کر کے اس قسم کے بہت سے فتنے اپنے ناولوں کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پھیلائے تھے اور اب ہمارے نئے محققین نے شرر صاحب کے ناولوں ہی کو اپنی تحقیقات کا ماخذ بنایا ہے۔

پڑھنے کے بعد ہر شخص تسلیم کرے گا کہ یہ مرشدِ کامل اگر کوئی ہو سکتا تھا تو بس ہمارے آغا خاں بہادر بالقابہ ہی ہو سکتے تھے جو اسلام اور اسلام کی تاریخ پر اتنی عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔

سر آغا خاں بالقابہ نے ہمارے اربابِ کار کو جو راہ سجھائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے نعرہ کے ساتھ کفر قایم کرنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اپنے مورخوں اور مفکروں کو اس کام پر لگاؤ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دَور کو چھوڑ کر بنی امیہ کے صد سالہ دَور کو اسلامی تاریخ کا خیر القرون ثابت کرنے پر اپنی تمام مساعی مرتکز کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ دَورِ میمون ہے جس میں اسلام کی بنیادیں "گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں" جس میں سکینہ اور عائشہ جیسی فیشن ایبل خواتین جو بیسویں صدی کی خواتین کے لئے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہیں، پیدا ہوئیں۔ جس میں گانے بجانے کا وہ فنِ شریف اپنے عروج و کمال کو پہنچا جس کو اس زمانہ کے گمراہ مسلمان نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اگر ہمارے اربابِ حل و عقد سر آغا خاں کے اس زرّیں مشورہ کو قبول کر لیں تو قراردادِ مقاصد پاس کر دینے کے بعد سے وہ جس الجھن میں پھنس گئے ہیں اس سے بیک جنبش وہ رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس "دورِ مبارک" میں جس میں آغا خاں کے حسبِ ارشاد "اسلام کی بنیادیں پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ رکھی گئیں" صرف سکینہ اور عائشہ کے قابلِ اتباع اور رقص و سرود کے ہنگامے ہی موجود نہیں ہیں بلکہ اس کی گہرائیوں اور وسعتوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہمارے اربابِ کار کو تلاش ہے اور وہ مل نہیں رہا ہے اور اگر مل رہا ہے تو اسلام کے لیبل کے ساتھ نہیں مل رہا ہے۔

اس کے لئے بس ایک کام، جیسا کہ سر آغا صاحب نے مشورہ دیا ہے، کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی ریسرچ کے پورے ڈپارٹمنٹ کو کچھ مزید توسیع کے ساتھ اس کام پر مامور کر دیجئے کہ وہ اس دور کی گہرائیوں میں اچھی طرح اتر کر جو گوہر مقصود ہاتھ آئیں اُن کو اکٹھا کر لیں۔ اگر ہم عامیوں کی معلومات بھی اس کارِ عظیم میں کچھ مفید ہو سکیں تو اس دور کی بابت جو کچھ جانتے ہیں وہ بھی اشارات کی صورت میں یہاں نوٹ کئے دیتے ہیں، شاید یہ تلاشِ مقصود میں کچھ رہنمائی کر سکیں۔

اس دَور کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملک عضوض" اور "جبریت" کے دور سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر ہمارے اربابِ اقتدار اپنی مطلق العنانی اور اپنے استبداد کے استحکام کے خواہاں ہوں تو یہ دورِ جبریت اس کے لئے نہایت گہری بنیادیں مہیا کر سکتا ہے۔ اس دور میں اسلام کے جمہوری شورائی نظام کو عجمی ملوکیت اور ولی عہدی سے بدل ڈالا گیا۔ اگر ہمارے اربابِ کار تخت و تاج کے قیام کے ارمان رکھتے ہوں تو اس دور سے بڑھ کر ہماری تاریخ کا کوئی دَور بھی اس ارمان کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ہے۔ اس دَور نے خلفائے راشدین کے خدمتِ خلق اور محنت و بے مزد کے طریقہ کو قیصریت و کسرویت سے بدلا۔ اگر ہمارے حکمراں قیصریت و کسرویت کے احیاء کے متمنی ہیں تو صرف یہی دَور ہے جو ان کے لئے مثال کا کام دے سکتا ہے۔ اس دَور میں مروانی امراء کی عیاشیاں اور سفاکیاں ظہور میں آئیں۔ اگر ہمارے اربابِ کار ان کے راستوں پر چلنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ ان چیزوں کے لئے تاریخ کا قابلِ فخر دور یہی ہے۔ اس دَور نے یزید اور اس کے ان شقی امرا کو جنم دیا جنھوں نے حسینؓ اور آلِ رسول کو کربلا میں اس جرم میں قتل کیا کہ وہ ان کی بادشاہی کے آگے خدا کی بادشاہی کا عَلم بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے اربابِ حل و عقد اپنی تاریخ کو بھی کربلا کی ٹریجڈی سے نورانی کرنا چاہتے ہوں تو اس کے لئے بلاشبہ اسی دور سے رہنمائی مل سکے گی۔ اسی دَور میں حجاج بن یوسف ثقفی، خالد قسری اور ابن ہبیرہ جیسے درندے پیدا ہوئے جن کی سفاکیوں سے خدا کی زمین چیخ اٹھی۔ اگر ان کے کارناموں کو پھر زندہ کرنا پیشِ نظر ہو تو لازماً اسی دَور کی گہرائیوں اور وسعتوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس دَور کے بعض مصلحین نے اپنے زمانہ کے اُمرا سے خطاب کر کے کہا تھا کہ خدا نے تم کو اپنی مخلوق کا چرواہا بنایا تھا مگر تم نے بھیڑیے بن کر ان کی کھالیں ادھیڑ ڈالیں، ان کے گوشت کھا لئے اور ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے چھوڑ دئیے۔ اگر ہمارے خداوندانِ نعمت بھی یہی چاہتے ہیں کہ گڈریے کے بجائے بھیڑیے بن کر ہماری کھالیں کھینچیں اور ہمارے گوشت نوچیں تو بلاشبہ اس سیرت کی بہترین مثالیں بنو امیہ کے اسی صد سالہ دور میں مل سکیں گی۔ نیز یہی دور ہے جس نے آغا خاں کے بقول فاطمہ زہرا کی جگہ سکینہ اور عائشہ صدیقہ کی جگہ عائشہ بنت طلحہ کو جنم دیا۔ جس کی آزادی حسن کے فیشن اور جن کی مجلس آرائیوں

کو آغا خاں بیسویں صدی کی خواتین کے لئے بھی قابلِ رشک قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات ہے تو عورتوں کی اصلاح کی جو تحریک ہمارے لیڈروں نے چلائی ہے اس کی تقویت و تائید کے لئے بھی بہترین دینی مواد اسی دور کی تاریخ سے مل سکے گا۔

غرض سر آغا خاں بہادر نے اپنے اس ایک اشارہ سے ہمارے اربابِ اقتدار کی وہ ساری اُلجھنیں دُور کر دی ہیں جن میں وہ قراردادِ مقاصد پاس کر کے مبتلا ہو گئے تھے۔ اب اگر ہمارے مورخوں اور مفکروں نے سر جوڑ کے اس صد سالہ دور کے مطالعہ میں محنت کی اور اس کی گہرائیوں میں اُتر کر اس دَور کے سارے مآثر بے نقاب کر لئے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ تجدید و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام جو ہماری قیادت علیا کے پیش نظر ہے اس کے لئے کوئی چیز امریکہ و انگلستان سے برآمد نہیں کرنی پڑے گی بلکہ پورا سامان تعمیر اور سارا مسالہ اپنے ہی گھر سے فراہم ہو جائے گا جس کو کوئی شخص بھی پردیسی یا "غیر اسلامی" کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

سر آغا خاں کی یہ تقریر پاکستان کے اونچے حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ یہاں تک کہ ڈان نے اس پر داد دی ہے کہ اقبالؔ کے بعد آغا خاں کے سوا یہ حکیمانہ باتیں اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔

مخالفینِ پردہ سے مولانا اصلاحی مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

جو حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے باوجود اپنے قول و عمل دونوں سے پردہ کی مخالفت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ محض مولویوں کی ایجاد ہے، وہ اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمائیں کہ کسی چیز کے متعلق وہ کس طرح باور کریں گے کہ وہ اسلام کی ہے؟ پردہ کا یہ پورا ضابطہ پوری تفصیل و وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے اس کی پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔ ان دونوں چیزوں کے بعد اب اور کونسی چیز پیش کی جائے جس کے بعد آپ اس کا اسلامی ہونا تسلیم کریں گے؟ اگر اسلام قرآن کی آیات اور رسولؐ کے قول و فعل کا نام نہیں ہے تو کیا تم نے صرف اپنے نفسِ امارہ کی خواہشات کا نام اسلام رکھا ہے؟ نیز یہ ارشاد ہو کہ جو قوم اپنے دین کے اتنے واضح ضابطہ کی اتباع دین کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اس جسارت کے ساتھ توہین کرے گی جس جسارت کے ساتھ ہمارے اربابِ اقتدار نے شاہِ ایران کے وُرود کراچی کے موقع پر ہماری بہنوں کی نمائش کر کے اس کی توہین کی ہے وہ اپنے آپ کو خدا کے غضب سے کتنے دنوں تک محفوظ رکھ سکے گی۔

**پیشِ نظر اخلاقی انقلاب** پاکستان میں عورت کو بلند کرنے کے لئے کس قسم کے انقلاب کے ارادے اور منصوبے ہیں، اُس کی ایک جھلک مولانا اصلاحی نے اس طرح پیش کی ہے:۔

آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن زنانہ نیشنل گارڈز[1] اور اس قبیل کے دوسرے اداروں کے ذریعے سے عورتوں کے اخلاقی

---

[1] گرل گائیڈز کا ایک مظاہرہ فروری کے مہینہ میں لاہور میں ہوا تھا جس میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے بیان کے مطابق ۸۰۰ لڑکیوں نے حصہ لیا۔ اس تنظیم کا مقصود چھوٹی عمر سے لڑکیوں کے اندر ان اوصاف کو تربیت دینا ہے جو آگے چل کر ان کو "تعمیرِ ملت" کی ان خدمات کے لائق بنا سکیں جن میں آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی کارکن خواتین رات دن سرگرم کار ہیں۔ بیگم جی۔ اے خان اس کی چیف کمشنر ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق پانچ ہزار لڑکیاں پنجاب کے اندر اس تنظیم میں اس وقت تک شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے مظاہرے کے موقع پر بیگم فضل الرحمٰن صاحب نے جو ایڈریس دیا اس میں انہوں نے یہ فتویٰ ارشاد فرمایا کہ "گرل گائیڈز کے سارے اُصول اسلام کے بنائے ہوئے ہیں"

(ملاحظہ ہو سول اینڈ ملٹری گزٹ، مورخہ ۲ر فروری سنہ ۵۰ء)

ظاہر ہے کہ اب اس امت میں ان بیگمات سے بڑھ کر دین اور شریعت کا عالم کون ہے، یہی تو اب مسلمانوں کو یہ بتانے کی اہل رہ گئی ہیں۔ کہ اسلام کیا سکھاتا ہے اور کیا نہیں سکھاتا!

تصورات میں جس قسم کا انقلاب پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اور اسلام کے نام پر ہو رہی ہے، ہم کو اسلامی نقطۂ نظر سے مختصراً بھی اس پر تبصرہ کرنا ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے جو معلومات فراہم کردی ہیں ان پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ نسوانی اخلاق کی تمام معروف اسلامی قدروں کو نگاہوں سے گرانے اور ان کی بجائے دوسری قدروں کو دلوں میں جگہ دلانے کی جدوجہد پورے زوروں سے اوپر سے لے کر نیچے تک جاری ہے۔ اب تک جو صفتیں ایک مسلمان عورت کے لئے قابلِ تعریف سمجھی جاتی رہی ہیں اور ہر شریف عورت بطور ایک اخلاقی نصب العین کے جن کو نگاہ میں رکھتی تھی، اب ان کو ایک ایک کرکے قابلِ نفرت ٹھیرایا جارہا ہے۔ تاکہ ہر عورت ان سے گھن کرے اور اگر ان کا کوئی شائبہ اس کے اندر پایا جاتا ہو تو جب تک وہ ان سے اپنے آپ کو پاک نہ کرسکے ان کو عیب کی طرح چھپائے اور جوں ہی ان کو دور کرنے کا موقع پائے فوراً ان کو نکال پھینکے۔

اب تک ہر مسلمان عورت اپنے لئے معیار اور مثال مائی عائشہؓ اور بی بی فاطمہؓ کو سمجھتی تھی لیکن اب اس کو بتایا جارہا ہے کہ ماضی میں تیرے لئے معیار و مثال فلاں اور فلاں ہیں جو یوں گاتی تھیں اور یوں بے پردہ پھرتی تھیں اور حاضر میں تیرے لئے اسوہ اور نمونہ فلاں لیڈر کی بیوی اور فلاں لیڈر کی بہن یا بیٹی ہیں۔

اب تک ہر عورت، خواہ اس کا اخلاقی معیار کچھ ہی ہو، یہ سمجھتی تھی کہ ناچنا اور گانا بیسواؤں اور رنڈیوں کا شیوہ ہے لیکن اب بڑے بڑے سجادہ نشین مرشد اس کو یہ سکھاتے ہیں کہ تو ناچ اور گا، کیونکہ یہ فن شریف تو اسلام کے دورِ اول میں پرورش پایا ہے اور امام حسینؓ کی صاحبزادی اور خلیفۂ اول کی نواسی نے یہ کارِ سعید انجام دیئے ہیں اور مغلوں کے دور میں تو ناچنا گانا ہر لڑکی کی تربیت کا ایک جزو لاینفک رہا ہے۔

اب تک ہر لڑکی یہ سمجھتی تھی کہ اس کا اصلی میدانِ عمل گھر ہے اس وجہ سے اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے اندر وہ سگھڑ پن اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے جو اس کو اس کی گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کے لائق بنائے اور وہ علم و ہنر سیکھے جو ایک سلیقہ شعار بیوی اور ایک لائق ماں کے فرائض انجام دینے میں اس کے کام آسکے۔ لیکن اب اسے تربیت اس بات کے لئے دی جارہی ہے کہ وہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں اور اندر سے جمع ہو جانے والے لاکھوں شائقین کے سامنے کس طرح پریڈ کرے، کس طرح سلامیاں دے، کس طرح اپنی جسمانی کرتبوں کی نمائش کرے اور کس طرح اپنی بیباکیوں پر لاکھوں مشتاقوں سے تحسین و آفریں کے نعرے لگوائے اور تالیاں بجوائے۔

اب تک ہر لڑکی سینے پرونے، پڑھنے لکھنے، پکانے ریندھنے، بھائیوں اور بہنوں کو سنبھالنے اور ماں باپ کی خدمت کرنے کو اپنے لئے ہنر خیال کرتی تھی۔ اور انہی چیزوں کی تربیت حاصل کرتی تھی لیکن اب اسے بیگم آنندی کی آرٹ اکاڈمی کا راستہ دکھایا جارہا ہے۔ کہ تیری اصلی تربیت گاہ وہاں ہے۔ تو اس اکاڈمی میں جاکے سیکھ کہ کس طرح جسم بنائے جاتے ہیں، ادائیں کس طرح سانچے میں ڈھلتی ہیں، حرکتوں میں لوچ اور تھرک کس طرح پیدا کی جاتی ہے، غمزوں میں جان کس طرح آتی ہے، چال میں نزاکت اور بات میں دلکشی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔

اب تک ہر شریف باپ کی ہر شریف بیٹی اپنے لئے اس بات کو کمالِ شرافت سمجھتی تھی کہ جب تک باپ کے گھر میں رہے باپ بھائی کی کمائی پر فراخی یا تنگی کی جیسی زندگی بھی میسر آئے، صبر و شکر کے ساتھ گزارے اور جب شوہر کے گھر میں جائے تو اس کی کمائی پر بسر کرنے کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھے اور قناعت و فرض شناسی کے ساتھ اپنی قابلیتیں ان خدمات کے ادا کرنے میں صرف کرے جو گھر اور خاندان سے متعلق ہیں، لیکن اب اس کو بتایا جارہا ہے کہ لعنت ہے اس زندگی پر جو باپ کے بخشے ہوئے ٹکڑوں اور شوہر کے دستر خوان کے ریزوں پر بسر ہوئی تو خود گھر سے نکل، جدوجہد کر، شکار مار، خود بھی کھا اور دوسروں کو بھی کھلا۔

اب تک رشتۂ نکاح کی گرہ خدا کی لگائی ہوئی گرہ سمجھی جاتی تھی، اور اب بھی خدا کے فضل سے ہماری سوسائٹی میں ایسی

بہنوں کی کمی نہیں ہوئی ہے جو اس کی حرمت پر یقین رکھتی ہیں اور اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں کہ جن کو خدا نے جوڑا ہے، ان کو موت کے سوا کوئی دوسرا بھی الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اب عورت کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ ازدواج اور مناکحت کی پابندیاں تو ہماری اپنی عائد کردہ پابندیاں ہیں، کل تک ہم نے ان پابندیوں کو نافع پایا اس لئے ان کو باقی رکھا، اب اگر یہ ہماری راحتوں میں مخل ہوں تو ان کو بدل بھی سکتے ہیں۔

اب تک عفت و عصمت کو ہر بہن اور بیٹی اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتی رہی ہے اور اس کی حفاظت میں زندگی کو قربان کر دینا ہماری اخلاقی روایات کی سب سے زیادہ پُر فخر داستان سمجھی جاتی تھی، لیکن اب ہمارے نئے مصلحین یہ درس دے رہے ہیں کہ عصمت فروشی کوئی بُری چیز نہیں ہے، بری چیز اگر کوئی ہے تو عصمت فروشی میں ایسی بیحیائی ہے جو بدنامی کی موجب ہو۔

اب تک عورت کے لئے یہ کمال سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مرد کی ہو کے رہے اور اس کی اطاعت و وفاداری، اس کے گھر کی دیکھ بھال اس کے بچوں کی تربیت و نگہداشت میں اپنی پوری زندگی بسر کر دے۔ لیکن اب اس کے کانوں میں یہ افسوں پھونکا جا رہا ہے کہ صرف ایک شوہر کو تلاش کر لینا اور اس طاعت و وفاداری میں زندگی بسر کر دینا کوئی کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ عورت "تعمیر ملت" کے وسیع کاموں میں اور "خدمتِ وطن" کے وسیع میدانوں میں اپنی جولانیاں دکھائے۔

اب تک عورت کی ترقی یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنے نسوانی اوصاف و فضائل میں ترقی کرے لیکن اب اس کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اس کی اصلی ترقی مردوں کی ریس کرنے اور ہر پہلو سے ان کی نقل اڑانے اور زنانہ کام چھوڑ کر مردانہ کام کرنے میں ہے اور اس کے بعد ایک ترقی یافتہ عورت کے لئے اگر کوئی زنانہ کام موزوں ہے تو بس یہ کہ وہ ناچ گانا سیکھ کر اور جسم بنانے کے فن سے واقف ہو کر مخلوط سوسائٹی میں مردوں کی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرے۔

اقدار اور نقطہ ہائے نظر کا یہ فرق کوئی معمولی اور سطحی فرق نہیں ہے بلکہ اصولی اور بنیادی فرق ہے، یہ صرف ماضی اور حال کے تقاضوں اور مطالبات کی محض ایک ظاہری آویزش نہیں ہے جو کسرِ و انکسار کے بعد خود بخود دُور ہو جائے بلکہ یہ دو بالکل متصادم اخلاقی نظریوں کی ٹکر ہے جن میں سے ایک کی فتح دوسرے کی شکست کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اس فتح و شکست سے پہلے لازمی ہے کہ اس پوری قوم کے اندر ایک شدید ذہنی خلفشار برپا ہو جو بالآخر ایک سخت ہل چل پر منتہی ہو۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو اس قوم سے محبت ہے وہ اس صورتِ حال کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ یہ جس نئے سانچہ میں ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ اسلامی سانچہ ہے یا کوئی اور سانچہ ہے۔ ہمارے نئے مصلحین، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اپنے اس سانچہ کو اسلامی سانچہ کہتے ہیں۔ مسٹر لیاقت علی خاں سے لے کر بیگم آذوری تک ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ان کی زندگیوں کا کوئی قول و فعل اور ان کی کوئی نقل و حرکت اسلام کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ ان کا جینا اور مرنا سب اسلام کے لئے اور اسلام کے طریقہ پر ہے اور اسلام ہی کو از سرِ نو تازہ اور سربلند کرنے اور دنیا کے سامنے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ پیش کرنے کے لئے وہ یہ سارے پاپڑ بیل رہے ہیں۔ بیگم آذوری اگر خٹک ناچ ناچتی ہیں تو خدانخواستہ اس لئے نہیں کہ یہ ناچ ہے بلکہ اس لئے ناچتی ہیں کہ یہ اسلام اور تہذیبِ اسلام کا احیاء ہے۔ ہمارے وزیرمال اگر بیگم آذوری کے ناچ کی سرپرستی فرماتے ہیں تو یہ رقص و سرود کی سرپرستی نہیں ہے بلکہ یہ دراصل اسلامی آرٹ کی سرپرستی ہے بیگم لیاقت علی خاں کراچی سے پشاور تک اور مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک جو کچھ بناتی پھرتی ہیں وہ بھی سرتاسر اسلام اور خدمتِ اسلام ہے۔ شاہِ ایران کے ورود کے موقع پر انھوں نے پاکستان کے ناموس کی ایک بہت بڑی مقدار جو معزز مہمان کی خدمت میں پیش کر دی تو یہ بھی اُنھوں نے اسلام ہی کا کام کیا ہے، اسلام سے سرِمو انحراف نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان

نئے اخلاقی اصولوں کو پرکھا جائے کہ فی الحقیقت اسلام عورتوں کو یہی تعلیم دیتا ہے جو یہ حضرات دے رہے ہیں یا اپنی ہوائے نفس پوری قوم پر مسلط کر دینے کے لئے یہ لوگ اسلام کے نام کو محض ایک آڑ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ آیئے دیکھئے کہ قرآن و حدیث میں عورتوں کو کیا اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔

## لیڈر عورتوں کے لئے قرآنی ہدایات

سب سے پہلے ان اخلاقی ہدایات کو لیجئے جو قرآن نے ان عورتوں کو دی تھیں جو اُمت کی تمام عورتوں کی لیڈر بنائی گئی تھیں اور جن کو مسلمان خواتین کی تعلیم اور ان کی رہنمائی کی خدمت سپرد کی گئی تھی اور پھر اپنی لیڈر خواتین کا ان خواتین سے اور قرآن کی اخلاقی تعلیمات کا موجودہ مصلحین کے پیش کردہ اخلاقی اُصولوں سے موازنہ کر کے دیکھئے ان دونوں میں دور پرے کی کوئی نسبت بھی ہے؟ قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت دیتا ہے:۔

یاایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلاً ہ وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الاٰخرۃ فان اللہ اعد للمحسنٰت منکن اجراً عظیماً ہ یا نساء النبی من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین وکان ذالک علی اللہ یسیراً ہ ومن یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحاً نؤتھا اجرھا مرتین واعتدنا لھا رزقاً کریماً ہ یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولاً معروفاً ہ وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ واٰتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیراً ہ واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من اٰیات اللہ والحکمۃ ان اللہ کان لطیفاً خبیراً ہ

(۲۸-۳۴-احزاب)

اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تم دنیاوی زندگی کی راحتوں اور اس کے ساز و سامان کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اور آخرت کی کامیابی کی طالب ہو تو صبر و شکر سے رہو، تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لئے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ اے نبی کی بیویو! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی برائی کا ارتکاب کرے گی اس کے لئے دوہری سزا ہوگی اور اللہ کے لئے یہ معمولی بات ہے۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں بردار رہے گی اور بھلے کام کرے گی اُس کو ہم اس کا دوہرا اجر دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت کی روزی مہیا کر رکھی ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو اس لئے اگر تم خدا ترس ہو تو بات میں لگاوٹ کا انداز نہ پیدا ہونے دو کہ جس کے دل میں کچھ روگ ہے وہ کوئی غلط اُمید باندھ بیٹھے بلکہ سیدھے سیدھے بھلے طریقے سے بات کرو اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ اگلی پچھلی جاہلیت کے سے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اللہ تو بس یہ چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے اور تم کو پاک بنائے جیسا کہ چاہئے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں جو سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو بے شک اللہ راز دان اور خبر رکھنے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو تمام اُمت کی مائیں اور تمام ماؤں اور بہنوں کی لیڈر ہونے کی حیثیت سے ——— مندرجہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں۔

الف - ان کا مطمح نظر دنیا اور دنیا کا سر و سامان نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خدا اور رسول کی اطاعت اور ان کی رضا طلبی اور آخرت کی فلاح ہونی چاہیئے۔

ب - ان کے مرتبہ اور ان کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ان کا اخلاقی پایہ بہت بلند ہونا چاہیئے۔ خدا کے یہاں ان کی برائیوں

پرسزا بھی بڑی ہے اور ان کی بھلائیوں پر جزا بھی دہری کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کی ماں اور تمام خواتین کی رہنما ہیں۔ ان کا بگاڑ پوری اُمت کا بگاڑ اور ان کا سنوار پوری اُمت کا سنوار ہے۔

ج۔ ان کے لہجے میں لوچ اور گفتگو میں لگاوٹ کا انداز نہیں پیدا کرنا چاہئے بلکہ وقار اور سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ بات کرنی چاہئے۔ تاکہ سننے والے کے نفس میں کوئی غلط قسم کی خواہش نہ پیدا ہو۔

د۔ ان کو بناؤ سنگار کرکے اپنی نمائش کرتے نہیں پھرنا چاہئے بلکہ اپنے گھروں کے اندر نماز۔ انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں اپنے کو مصروف رکھنا چاہئے۔

ہ۔ اللہ کی آیتوں اور رسول کی نصیحتوں کی تبلیغ ان کا اصلی کام ہونا چاہئے اور خدا کے جو بندے اور بندیاں ان چیزوں کی طالب ہوں اُن کو ان سے بہرہ مند کرنا چاہئے۔

اس اُمت میں عورتوں کی قیادت پر جس گروپ کو اول اول سرفراز کیا گیا اس کو خدا اور رسول کی طرف سے اصلاح اور تربیت و تزکیہ کا یہ پروگرام دیا گیا تھا۔ اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا ایک نظر ان متبرجات پر بھی ڈالئے جو آج لیڈر بنی ہوئی ہماری بہنوں اور بیٹیوں کی رہنمائی کرتی پھر رہی ہیں۔ اور انصاف سے فرمایئے کہ ہے کوئی مناسبت دونوں میں؟ ان اخلاقی ہدایات کا کوئی پرچھاواں بھی ان کی زندگیوں کے کسی پہلو پر نظر آتا ہے؟ پھر کیا ستم ہے کہ جن شیطانی عادات و خصائل کو قرآن مجید جاہلیت اولیٰ کے لفظ سے پکارتا ہے۔ ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو ان میں آلودہ کرنے کی کوشش کی جائے اور پھر دعویٰ کیا جائے کہ یہ ان کو صبغۃ اللہ میں رنگا جا رہا ہے۔ ان حضرات کی "اسلامی خدمات" میں کوئی کمی رہ گئی ہے کہ یہ اس پر دین کو دانستہ مسخ کرنے کا اور خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت و بیباکی کا مزید اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟

## فیشن ایبل عورتیں

فاضل مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کرکے بتایا ہے کہ "عورت" کے لئے اسلام نے کس قسم کی معاشرت پسند کی ہے؟ اور کس انداز کو ناپسند کیا ہے؟

— "مردوں کی شباہت اختیار کرنے والی عورتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ (ابو داؤد)

— "حضرت عائشہ رضؓ کے سامنے ذکر آیا کہ ایک عورت ہے جو مردوں کے سے جوتے پہنتی ہے انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنانِ مذکر پر لعنت کی ہے" (ابو داؤد)

— "جو عورت بنی سنوری ہوئی دوسرے مردوں میں ناز و ادا کے ساتھ چل رہی ہے اس کی مثال قیامت کے دن تاریکی کی ہے، جس کے لئے کوئی روشنی نہیں۔ (ترمذی)

جو عورتیں مصنوعی حُسن کی دلدادہ ہوتی ہیں اور اس کے نئے جسم سازی اور خود نمائی کے نت نئے طریقے ایجاد کرتی ہیں یہاں تک کہ فطری ساخت بدل دینے کے لئے بھی طرح طرح کے جتن کرتی ہیں۔ جو لباس کو جسم کے چھپانے کے بجائے ان کے محاسن کو نمایاں کرنے کے لئے پہنتی ہیں اور ایسے فیشن ایجاد کرتی ہیں کہ عورت کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہتی ہے ان کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

عن عبد اللہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الواصلۃ والمستوصلۃ والراشمۃ والمستوشمۃ۔

عبداللہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصنوعی بال لگانے والیوں اور لگوانے والیوں اور گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر لعنت کی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے۔

نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عشر عن الوشر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں سے منع فرمایا ہے —

والوشم والنتف وعن مكالمعة المرأة المرأة

(ابوداؤد)

ایک دانتوں کو نکیلا اور چمکدار بنوانے سے، دوسرے گدنے سے، تیسرے حاجب و ابرو کے نوک پلک نکلوانے سے، چوتھے اس بات سے کہ عورت عورت کے ساتھ ہم آغوش ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بعض روایات میں اس ضمن میں متنمصات کا لفظ بھی آیا ہے جس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو نوک پلک درست کرنے کے لئے ابرو کے بال اکھڑوا دیتی ہیں نیز متفلجات للحسن اور المغیرات خلق اللہ کے الفاظ بھی آئے ہیں جن سے مراد وہ عورتیں ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اپنے دانتوں میں مصنوعی فصل پیدا کرتی ہیں اور اپنی قدرتی ساخت کی اپنے زعم کے مطابق، دوسری ناہمواریوں کو درست کراتی ہیں[۱]۔

اسی سلسلہ میں یہ حدیث بھی سننے کے قابل ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسھن کاسنمۃ البخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو عورتیں کپڑے پہن کے بھی ننگی ہی رہتی ہیں اور اپنے اعضا کو لچکاتی ہوئی اور لچکتی ہوئی چلتی ہیں جن کی گردنیں بختی اونٹ کی طرح ناز سے ٹیڑھی رہتی ہیں نہ وہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی۔

## عفت کی اہمیت

عفت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل احادیث سے ہو سکے گا۔

فاتقوا اللہ فی النساء فانکم اخذتموھن بامانۃ اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ وان لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احداً تکرھونہ

(ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ اے لوگو! عورتوں کے حقوق کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ تم نے اُن کو اللہ کی امانت کی حیثیت سے پایا اور اللہ کے کلمہ کے ذریعہ سے ان کے جسموں کو اپنے لئے جائز بنایا ہے اور تمہارا ان کے اوپر یہ حق ہے کہ کسی غیر مطلوب سے تمہارے بستر کو پامال نہ کرائیں۔

زنا العینین النظر و زنا اللسان المنطق والنفس تمنیٰ وتشتھی والفرج یصدق ذالک ویکذبہ

آنکھوں کا زنا بدنگاہی اور زبان کا زنا گفتگو ہے، نفس ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق و تکذیب کرتی ہے۔

ان احادیث پر ایک نظر ڈال کر اندازہ فرمائیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لئے کیا اخلاق اور کیا خصائل پسند فرمائے ہیں اور کن اخلاق اور کن خصائل کو ناپسند فرمایا ہے اور پھر ان کو سامنے رکھ کر ان اخلاقی تصورات کا جائزہ لیجئے جن کو آج ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے اندر مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور دونوں کا موازنہ کرکے دیکھئے کہ ہے ان دونوں میں کوئی دور قریب کی نسبت؟ کھینچ تان کرنے کی جتنی گنجائش بھی ممکن ہو آپ کو آزادی حاصل ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیے اور "وقت کے تقاضوں" کی جو اصطلاح آپ نے ایجاد فرمائی ہے اس کا حق بھی آپ جس قدر رکھنا چاہتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ فیاضی کے ساتھ محفوظ کر لیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ آپ کے اخلاقی تصورات کے سانچے میں اور اس قرآنی اور نبوی سانچہ میں کوئی مناسبت بھی ہے؟ "وقت کے تقاضوں" سے کسی کو بھی انکار

---

[۱] ان حدیثوں میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے یہ عرب جاہلیت کی شوقین ultra fashioned) عورتیں بناؤ (make up) کے خیال سے کرتی تھیں آپ اس فہرست میں ان چیزوں کا اضافہ کر لیجئے جو جاہلیت جدیدہ نے ان مقاصد کے لئے ایجاد کی ہیں۔ ان احادیث میں نفس بناؤ سنگار کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس غیر فطری بناؤ کی ممانعت ہے جس میں عورت قدرت کی صنعت کی اصلاح کے درپے ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی چیز کے درست کر لینے کے بجائے قدرت کی بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنے کی سعی کرتی ہے۔

"نہیں ہے لیکن وقت کے تقاضوں کے خاطر جاہلیت کو اسلام اور کفر کو ایمان کی جگہ تو نہیں دی جا سکتی۔ اگر کسی کو "وقت کے تقاضوں" کے پیچھے اس طرح بگٹٹ بھاگنا ہے کہ اسے کفر و اسلام سے کوئی بحث ہی نہیں رہی ہے تو وہ جائے جس گڑھے میں چاہے گر جائے لیکن پھر اُسے اسلام اسلام پکارتے رہنے کا کیا حق ہے؟ اُس سے کس نے کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ قرارداد مقاصد بھی پاس کرے اور جگہ جگہ مسلمانوں سے کہتا پھرے کہ ہم تو اسلام کو اس کی اصلی شکل اور اسپرٹ میں ازسرِ نو قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اگر وقت کے تقاضوں نے اُسے بتادیا ہے کہ پسندیدہ سانچہ آکسفورڈ کا سانچہ ہے تو وہ شوق سے اس سانچہ میں ڈھل جائے لیکن پھر یہ کیا بوالفضولی ہے کہ جگہ جگہ میلاد کی مجلسوں میں وہ وعظ کرتا پھرے کہ "دنیا کی مشکلات کا حل اگر ہے تو پیغمبر کی تعلیم ہے"۔"

## خاندان اور معاشرے کے نقصانات

اس کتاب میں صرف منقولات ہی نہیں ہیں، آخری حصہ میں عقلی دلیلوں کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ حکومت میں عورتوں کی مساویانہ حصہ داری" کا تصور کس قدر غیر فطری اور غلط ہے، مشہور فلسفی مل (MILL) اور اُس کے ہم خیال اہلِ فکر کی دلیلوں کی فاضل مصنف نے دھجیاں بکھیر دی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کی فراست کے آگے فلسفہ و عقل کا کوئی الونہ بھی نہیں ٹھیر سکتا، ان مغرب زدوں نے فراستِ مومن کو "ملائیت" کا نام دیکر اُسے بدنام کر رکھا ہے، مولانا اصلاحی کی یہ کتاب ان کو چیلنج دیتی ہے کہ "ملائیت" "تمھاری" "عقلیت" کو ہر محاذ پر شکست دے سکتی ہے، ڈرو فراستِ مومن سے ڈرو کہ وہ انسانی ارادوں کو بھانپ لیتی ہے اور نفسیات کے تیوروں کو پہچانتی ہے ---

کتنی دل نشین اور سچی باتیں کہی ہیں لائق مصنف نے :-

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ تمام نظامِ اجتماعی و سیاسی کے اندر اصلی مرکزی نقطہ خاندان ہے۔ پہلے خاندان وجود میں آتا ہے۔ پھر خاندانوں کے مجموعہ سے معاشرہ بنتا ہے اور پھر معاشرہ سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ اگر خاندان کا وجود نہ ہوگا تو ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر خاندان کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے اثر سے ریاست کے نظام میں خلل واقع ہو جائے گا اور اگر خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پوری ریاست کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ خاندان کی اس اہمیت کی وجہ سے نظامِ اجتماعی و سیاسی کے اندر سب سے زیادہ فکر اسی کے تحفظ کی کی جاتی ہے کیونکہ اس کی حیثیت جڑ کی ہے اور اسی کے تحفظ پر پورے نظام کے تحفظ کا انحصار ہے۔

خاندان کی اس اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آئیے دیکھئے کہ خاندان کی شیرازہ بندی میں اصلی اہمیت کس کو حاصل ہے، مرد کو، یا عورت کو؟

اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندان کی تشکیل میں مرد اور عورت دونوں ہی حصہ لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کام میں جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سامانِ تعمیر کی فراہمی میں تو بے شک مرد کا حصہ نمایاں ہے لیکن گھر کی اصلی معمار عورت ہی بنتی ہے۔ اسی کی ذات کی کشش ہے جس کی شیرازہ بندی سے گھر، گھر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ وہ نہ ہو تو گھر کے ساتھ مرد کی وابستگی آدھی بھی باقی نہ رہے، گھر والوں کو دو وقت کی روٹی ملنی بھی دشوار ہو جائے، بچے سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرنے لگیں، اور دیکھتے دیکھتے نوکر اور نوکرانیاں گھر کو ٹھکانے لگا دیں، عورت موجود ہے تو سارا چمن آباد ہے اور اگر وہ غائب ہو جائے یا ذرا سی غافل ہو جائے تو تھوڑی دیر بھی نہ گزرے کہ ہر طرف خاک اُڑنے لگے۔

گھر کی ظاہری صورت پذیری ہی عورت کی رہینِ احسان نہیں ہے بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گھر کی معنوی اور روحانی صورت گری میں بھی جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہیں ہے۔ اس کے رحم کی طہارت سے خاندان میں نجابت و شرافت کا جوہر پیدا ہوتا ہے، اس کی ممتا کا جمال گھر کو رحم و محبت کی نورانیت سے منور کرتا ہے، رفیقِ زندگی کی حیثیت سے اسی کی وفاداریاں اور جاں نثاریاں

جو خاندان میں وفاداریوں اور جاں نثاریوں کی روایات چھوڑتی ہیں۔ اس کے صبر و وفا سے بچے صبر و وفا کا سبق سیکھتے ہیں اُسی کی قربانیوں سے اولاد کو ایثار کا درس ملتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی ایک گردش میں جو معانی مضمر ہوتے ہیں وہ ہزارہا اوراق میں نہیں سما سکتے علاوہ اپنی پر محبت جھڑکیوں سے جو کچھ سکھا دیتی ہے ہزارہا معلموں کی محنت سے بھی وہ چیز نہیں سکھائی جا سکتی۔

یہ ساری برکتیں خاندان کو صرف عورت کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ اگر عورت کو اس جگہ سے ہٹا کے کسی کارخانہ یا دفتر بھیج دیجئے تو خاندان کے اندر اس کے سبب سے جو جگہ خالی ہوگی اس کو آپ کسی اور طرح سے نہیں پُر کر سکتے۔ دفتروں اور کارخانوں کے لئے آپ کو ہر ساخت اور ہر قابلیت کے لاکھوں اور کروڑوں آدمی مل سکیں گے لیکن گھر کے اندر جو جگہ وہ خالی کرے گی اس کو بھرنے کے لئے اس آسمان کے نیچے اُس کے سوا خدا نے کسی اور کو پیدا ہی نہیں کیا ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ روٹی ہوٹلوں میں بھی کھائی جا سکتی ہے۔ راتیں کلبوں اور سینما گھروں میں بھی گزاری جا سکتی ہیں۔ خبر گیری و تیمارداری ہسپتال اور نرسنگ ہوم میں بھی مل جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ انعامات اور تمغوں کے لالچ دلا کر (جیسا کہ روس میں کیا جاتا ہے) عورتوں سے بچے بھی جنوائے جایا کریں اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ کی نرسوں اور داناؤں کے ذریعہ سے ان بچوں کی پرورش بھی کرالی جایا کرے۔ لیکن اس کو خوب یاد رکھئے کہ ہوٹل میں جینے اور ہسپتال میں مرنے کی یہ زندگی نہ تو خاندان کی زندگی کا بدل ہو سکتی اور تمغوں اور الاؤنس کی خاطر جنے ہوئے بچوں اور سرکاری پرورش گاہوں میں کرایہ پر اگائی ہوئی اور پرورش پائی ہوئی نسلوں سے کوئی قوم بن سکتی ہے۔ آدمی سازی اور جوتہ سازی کے کام میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ آپ جس طرح انعام اور اُجرت کے بل پر کارخانوں میں جوتے تیار کرا سکتے ہیں اگر وہی طریقہ آپ نے آدمی سازی کے لئے بھی اختیار کر لیا تو آدمیوں کی شکل کی ایک مخلوق تو ضرور تیار ہو جائے گی لیکن وہ آدمیت کے تمام اوصاف سے یکسر خالی ہوگی۔ جو آدمی باٹا کے جوتوں کی طرح تیار کئے جائیں گے وہ پاؤں میں پامال کئے جانے کے لئے تو اچھے رہیں گے لیکن زمین کی خلافت میں ان کا کوئی حصہ ہو یہ ناممکن ہے۔

جو بچے اس طرح دنیا میں آئیں گے کہ وہ اپنے باپ کو بھی متعین طور پر شناخت نہ کر سکیں وہ نجابت و شرافت کا جوہر کہاں سے لائیں گے؟ جو ماں کی مامتا اور اس کی شفقت سے کبھی آشنا ہی نہ ہوئے ہوں ان کے اندر رحم و شفقت کے جذبات کس طرح نشو و نما پائیں گے؟ جو حقیقی بھائیوں اور بہنوں کی طرح ایک ماں باپ کی آغوش میں پالے ہی نہ گئے ہوں وہ خونی اخوت و حمیت کے رمز سے کہاں سے آشنا ہوں گے؟ جنہوں نے ایک خاندان کے اندر رہ کر ایک وفادار اور جاں نثار ماں اور ایک وفادار اور شفیق باپ کی زندگی دیکھی ہی نہ ہو وہ وفاداری اور جاں نثاری کے مفہوم سے کس طرح واقف ہوں گے؟ جنہوں نے ماں اور باپ کے ایثار کے مزے سرے سے اٹھائے ہی نہ ہوں وہ دوسروں کے لئے کس طرح ایثار کر سکیں گے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خاندان کے نظام کو منتشر کر دینے کے بعد ان اوصاف کی پرورش کے لئے آپ کوئی اور طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یاد رکھئے کہ یہ محال ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان جذبات و عواطف کے بغیر بھی اس دنیا کا یہ کارخانہ چل سکتا ہے تو یہ محال تر ہے۔ آج دنیا میں جو خرابیاں پھوٹ پڑی ہیں اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ انسان ان اوصاف سے خالی ہو رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ ان اوصاف سے بالکل ہی خالی ہو گیا تب تو اس دنیا کا ایک گھڑی بھی باقی رہنا ناممکن ہو جائے گا جو تباہی اس پر صبح کو آتی ہے وہ شام ہی کو آدھمکے گی۔

اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر خاندان کے ساتھ عورت کی وابستگی اس درجہ ضروری ہے کہ اس کے اس مقام سے ہٹتے ہی سارے نظام اجتماعی و سیاسی کے انتشار کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو آخر یورپ و امریکہ اور روس جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں نے اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا اور انہوں نے عورت کو گھر کی پابندیوں سے آزاد کر کے سیاست و معیشت کی تمام سرگرمیوں میں کس طرح مرد کے برابر لا کھڑا کیا اور اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ

ان ملکوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی انتشار نہیں پیدا ہو رہا ہے بلکہ یہ برابر ترقی کر رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے میں یہاں، روس اور امریکہ میں خاندان کے نظام کا جو حال ہے اور اس کے سبب سے وہاں کے اہلِ نظر جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اس کو پیش کروں گا تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے ہم ان کی حالت کو جس درجہ قابلِ رشک پا رہے ہیں اور ان کی تقلید کے لئے بے قرار ہیں وہ خود اپنی حالت کو اس قدر قابلِ رشک نہیں پا رہے ہیں بلکہ اپنے خاندانی نظام کے انتشار کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سخت خطرہ میں گھرا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔

اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی نے امریکہ اور روس کے حالات پیش کر کے بتایا ہے کہ وہاں عورتوں کی آزادی اور بے باکی نے کیا کیا گل کھلائے ہیں، اور اس "ذوا قیمت" نے وہاں کے معاشرے کو کیا کیا نقصان پہنچائے ہیں۔

"پاکستانی عورت دوراہے پر" ——— ایک آئینہ ہے جس میں چہروں کے خدوخال نظر آ سکتے ہیں، جس کے دل میں کھوٹ اور بے غیرتی ہوگی، وہ اپنے چہروں کے داغوں کو دیکھ کر جھنجھلائے گا اور آئینہ شاید زمین پر دے مارے گا، اور جس کا دل احساسِ غیرت سے لبریز ہوگا، وہ آئینہ ساز کی کوشش اور دردمندی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے جبین و رخسار کے داغوں کو دھونے اور مٹانے کی سعی کرے گا۔

یہ کتاب مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں بار پانے کی مستحق ہے،

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی معرکۃ آرا تصنیف "پردہ اور اسلام" کو ارباب نظر اس موضوع پر "حرفِ آخر" سمجھتے تھے، مگر اس کتاب کے بعض مباحث مولانا مودودی کی شاہکار تصنیف پر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں ——— ادب وانشا بھی بہت نکھری ہوئی ہے، انداز ایسا درجہ دل نشین ہے کہ بہت سے نامور انشا پردازوں کو شاید اس پر رشک آئے گا، مصنف کے دل کا خلوص ایک ایک حرف سے ظاہر ہوتا ہے، صرف دو روپیہ بارہ آنے میں مجلۂ ادب اخلاق مکتبۂ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور سے مل سکتا ہے!

عزیز حاصل پوری

# دعوت و پیام

اللہ کی نبیؐ کی اطاعت قبول کر
ناموسِ مصطفےؐ کی حفاظت کیواسطے
"رسم و رواج و بدعت خود ساختہ" کو چھوڑ
"آئینِ وضع کردۂ مغرب" سے کر گریز
رسم و ریا کے ساتھ کیا جائے جسکو پیش
ہیں آزمائشوں ہی میں آسائشیں نہاں
میں از رہِ خلوص ہوں اک ناصحِ شفیق
کرتا ہوں یہ "جواہرِ منظوم" "تیری نذر

ایمان اور دین کی دولت قبول کر
کر جان و دل نثار۔ شہادت قبول کر
قرآن کو دیکھ، مسلکِ سنت قبول کر
محبوبِ کبریا کی شریعت قبول کر
ہرگز نہ وہ خراجِ عقیدت قبول کر
راحت کی آرزو ہے تو کلفت قبول کر
سُن میری بات میری نصیحت قبول کر
یہ تحفۂ خلوص و محبت قبول کر

لبیک کہہ کے بڑھ سوئے آوازِ حق عزیز
مردِ خدا، جہاد کی دعوت قبول کر

# کب آئے گا

قابل اجمیری

دیں کا نقیبِ حق کا نگہباں کب آئے گا
مٹ جائیں جس سے عہدِ غلامی کی لعنتیں
جو داستانِ شوق کو رنگیں بنا سکے
مدت سے تشنہ کام ہے ہستی کا قافلہ
چھائی ہوئی ہے کب سے فضاؤں پہ تیرگی
گونجے گی کب اذانِ بلالی سے بزمِ دہر
صدیوں سے تک رہا ہے بشر جس کا راستہ
سوکھی پڑی ہے کب سے غریبوں کی کشتِ شوق
ہر سمت ایک معرکۂ کربلا ہے گرم
مُردہ دلوں میں روحِ عزائم جو پھونک دے

کوئی خدا پرست مسلماں کب آئے گا
جانے وہ انقلاب وہ طوفاں کب آئے گا
آخر وہ اشکِ خوں سرِ مژگاں کب آئے گا
کوئی بتائے چشمۂ حیواں کب آئے گا
کیا جانے آفتابِ درخشاں کب آئے گا
اس تیکدے میں بندۂ یزداں کب آئے گا
وہ روزِ انقلاب بداماں کب آئے گا
رحمت بدوش ابرِ خراماں کب آئے گا
کوئی غلامِ شاہِ شہیداں کب آئے گا
محفل میں ایسا مردِ رجزخواں کب آئے گا

انسان کر رہا ہے خدا سے بغاوتیں
فاروقِ عصر و فاتحِ دوراں کب آئے گا

شبنم رومانی (بی، کام)

# ابلیس کا پیام اپنے فرزندوں کے نام

اے جانِ پدر! میرے بڑھاپے کی مراد دو!
مخصوص عنایات کو اب عام بنا دو

جو قوم کے افراد کو دے دعوتِ تنقید
اس ناقد بیباک کو سولی پہ چڑھا دو

افلاس کی فریاد و فغاں نالہ و شیون
دولت کی کھنکتی ہوئی تانوں میں دبا دو

آقاؤں سے اُلجھے جو کوئی بندۂ مظلوم
اس بندۂ مظلوم کو گولی سے اُڑا دو

جو شخص تمھیں دورِ مئے ناب سے روکے
اس شخص کو اک زہر بھرا جام پلا دو

جو رقصِ حسینانِ وطن کا ہو مخالف
اس مردِ تہی ذوق کو کانٹوں پہ سلا دو

سچوں کی کرو خارِ مغیلاں سے تواضع
جھوٹوں کے لئے مخمل و کمخواب بچھا دو

بے داغ جوانی کو پلاؤ مئے افرنگ
معصوم دماغوں کو نمائش کی ہوا دو

پھیلاؤ فضاؤں میں فرائڈ کے جراثیم
اقبال کے نسخوں کو زمانے سے مٹا دو

عہدوں کی بقا کے لئے افسونِ خرد سے
اربابِ ہوس مست کو آپس میں لڑا دو

اے میرے سپوتو! یہی پیغام ہے میرا
اللہ کے بندوں کو شیاطین بنا دو

امیر مینائی

# جنّتِ نگاہ

## "بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں"

(ایک غیر مطبوعہ قصیدہ کی تشبیب)

---

کان ہیں منتظرِ قلقلِ مینائے سخن ساقیا! شیشے سے کہہ دے کہ رہے پنبہ دہن

سرد چلتی ہے ہوا، چھائی ہے گھنگھور گھٹا بوندیاں پڑتی ہیں شاداب ہیں گل ہائے چمن

سرو مغرور ہیں ایسے کہ جو طوبےٰ آئے بہرِ تسلیم ذرا بھی نہ جھکائیں گردن

جنبشِ برگِ گلِ تر میں ہے دف کی آواز بالِ پروازِ عنادل میں صدائے ارغن

عید سی عید جوانانِ چمن کو ہے نصیب غسل کرتے ہیں بدلتے ہیں نئے پیراہن

آتی ہے گریۂ بلبل پہ ہنسی پھولوں کو نرگسِ باغ ہے گلچیں کی طرف چشمک زن

جس طرف دیکھئے رقصاں روشوں پر طاؤس چہچہے کرتے ہیں مرغانِ خوش الحانِ چمن

جمع ہیں مست قدح نوش خرابات نشیں جلوۂ ساغر و مینا و سبو توبہ شکن

بطِ مے جلوۂ طاؤس دکھاتی ہے کہیں کبک کی طرح صراحی ہے کہیں قہقہہ زن

روشیں فرطِ صفا سے ہیں وہ آئینۂ صاف نہ کہیں گرد ہی جن میں نہ کہیں رنگ و شکن

سبزہ بالائے زمیں، روئے زمیں ابرِ سیاہ سبزہ زار ایک طرف، ایک طرف کجلی بن

زیر و بالا نہیں کچھ نشۂ مستی کے سوا ابر اِدھر جھوم رہے ہیں تو اُدھر نخلِ چمن

شاخِ گلشن پہ ہیں اس طرح شگفتہ غنچے جیسے انگڑائی میں کھل جاتے ہیں مستوں کے دہن

جوشِ بارش میں عجب طرح کا ہے جوشِ بہار جس طرف دیکھئے گل ڈھیر ہیں خرمن خرمن

سطحِ آب پہ یوں موج نظر آتی ہے جیسے پیشانیٔ محبوب پہ پڑتی ہے شکن

چھوڑتی ہے کوئی نہروں میں شگوفہ جو صبا دیکھنے لگتے ہیں فوّارے اُٹھا کر گردن

کوک کوئل کی ہے یا سازِ مغنی کی صدا

رقصِ طاؤس سے ہے وجد میں سارا گلشن

---

ماہر القادری

# آنسو!

یوں کہنے کو تو سبھی گھرانے شریف ہی کہلاتے ہیں مگر ان میں سے گنتی گھرانے ہیں جو واقعی شریف ہوتے ہیں، لوگ نادانستہ بُرائی کرتے ہیں اور یہ خاندانی شرافت اس بُرائی کے بعد بھی ان سے چمٹی رہتی ہے ———— مگر صفیہ نے واقعی ایک شریف گھرانے میں پرورش پائی تھی، اُس کا گھریلو ماحول صاف ستھرا تھا، اور اس صفائی اور ستھرائی کا تعلق سفید چاندنی، خوش نما غلافوں اور خوبصورت الماریوں اور خوش نما پردوں سے نہیں اخلاق و نیکوکاری سے تھا، اصل شرافت کردار کی شرافت اور حقیقی پاکیزگی دل کی پاکیزگی ہے، دل میلا ہو تو دھوپ اور چاندنی سے بنے ہوئے کپڑوں کے پہننے سے بھی کچھ نہیں ہوتا، یہ تو سب دکھاوے کی چیزیں ہیں اور دکھاوٹ میں ذرا سی بھی جان نہیں ہوتی، یہ جو تھیٹروں، ڈراموں اور سوانگوں میں لوگ طرح طرح کے لباس پہن کر نقلیں کرتے ہیں، تو کیا اس طرح اُن کی شخصیتیں بدل جاتی ہیں؟

صفیہ بہت ذہین اور طباع تھی، ذہین بچے عام طور پر شوخ ہوا کرتے ہیں مگر صفیہ ذہانت کے باوجود انتہائی سنجیدہ، باوقار اور شرمیلی تھی، آٹھ سال کی عمر میں جب اُس نے قرآن شریف ختم کیا ہے تو وہ اس طرح احتیاط کے ساتھ دوپٹہ اوڑھتی کہ سر کا ایک بال بھی دکھائی نہ دیتا، آدھی پیشانی تک چھپ جاتی، اُس کی تربیت شروع ہی سے اس انداز پر ہوئی تھی۔

صفیہ تندرست تھی، اُٹھان کا یہ عالم کہ دس گیارہ سال کی عمر میں جوان معلوم ہوتی، گھر کے لوگ ہنسی میں کہا کرتے تھے کہ صفیہ کے قد کی بڑھوار کا یہی انداز رہا تو اس کے لئے مکان کے دروازے اونچے کرانا پڑیں گے، اللہ نے صورت شکل بھی دی تھی، سن و سال اور قدوقامت کے ساتھ رنگ روپ اور بھبن بھی بڑھتی گئی۔

صفیہ کے باپ قاضی حمید اللہ مشرقی تہذیب کی زندہ تصویر تھے، شریف، خوش خُلق، متواضع، منکسرالمزاج، نیک طینت اور ساتھ ہی غیور اور خوددار بھی! گھر کے بھی کھاتے پیتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے، بستی کے لوگوں میں اُن کی عزت کی جاتی تھی، ہر کوئی اُن کے ساتھ احترام سے پیش آتا، ہاتھ کے سخی تھے، غریبوں کی امداد کر کے انھیں خوشی ہوتی، اس معاملہ میں وہ:-

؎ جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

کے مصداق تھے، باغیرت اور خوددار ضرور تھے مگر مغرور نہ تھے، نوکروں سے اُن کا برتاؤ گھر کے آدمیوں کی طرح تھا، ملازم کی کسی غلطی پر خفا بھی ہوتے تو یہ خفگی زیادہ شدت اور طول نہ کھینچتی، ایک دن ملازم نے حقہ پر چلم جلا کر رکھی تو دہکتے ہوئے کوئلے قاضی جی کے ہاتھ پر گر پڑے، نوکر کی بے احتیاطی پر قاضی جی کو طیش آگیا، اُنھوں نے چھڑی اُٹھا کر اُس کے رسید کی، نوکر سامنے سے ہٹ نہ جاتا تو دوسری چھڑی بھی "اُس کے گھٹنے پر پڑتی!

قاضی جی حقہ پیتے میں بہت دیر تک سوچتے رہے، کئی بار ڈاڑھی کو مٹھی میں دبا دبا کر چھوڑ دیا، وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے، نفس اور عقل کہہ رہے تھے کہ جو کچھ کیا، ٹھیک کیا، نوکروں کو تنبیہ اور سرزنش نہ کی جائے گی تو یہ سر پر بیٹھنے لگیں گے، آقا اور خادم دونوں انسان ہی ہوتے ہیں مگر "فرض" کی سطح پر آکر یکسانی نہیں رہتی، آقا کو ملازم پر بہرصورت برتری حاصل ہے، مگر ضمیر کہتا کہ تم سے یہ لغزش ہو گئی قاضی جی! نوکر نے قصداً ایسا نہیں کیا، ہر آدمی سے غلطی ہو جاتی ہے، کیا تمھارے ہاتھ سے رکھنے اور اٹھانے میں چیزیں نہیں گر جاتیں، زبان سے بھی تنبیہ کی جا سکتی تھی، نوکر بھی تمھاری طرح جان رکھتا ہے اور جان ہی نہیں عزت بھی، اللہ تعالیٰ

کے یہاں آقاؤں سے اُن کے ملازموں اور خادموں کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی، وہاں یہ منطقی دلیلیں کام نہ آئیں گی۔

قاضی جی تیزی کے ساتھ پلنگ سے اُٹھے، چھڑی اُٹھائی اور ڈیوڑھی میں پہونچے، ملازم تخت پر بیٹھا تھا، قاضی جی کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر وہ بے چارہ سہم گیا کہ شامت نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، چھڑی مارتے میں میرا پیچھے کی طرف ہٹ جانا اُن کو ناگوار ہوا،

—— بدلو! یہاں آؤ، یہ لو چھڑی لو، اور جس طرح میں نے تم کو مارا تھا، اسی طرح مجھے بھی اس چھڑی سے مارو —— قاضی جی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

بدلو بے چارہ ڈر کے مارے کانپنے لگا، وہ سمجھا کہ قاضی جی یہ سب کچھ غصہ میں کہہ رہے ہیں، اُس کی زبان پر مہر لگ گئی، وہ خاموش کھڑا رہا، اس پر قاضی جی بولے :—

—— بدلو! ڈرو نہیں، میں اپنی غلطی کی معافی چاہنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں، قصور تم سے نہیں مجھ سے ہوا، تم بدلہ لوگے یا معاف کردوگے تو میں یہاں سے جاؤں گا نہیں، بدلو! ہمارے نبیؐ کا یہی حکم ہے، ہمارے مذہب نے یہی تعلیم دی ہے۔

بدلو نے قاضی جی کے پیر پکڑنے چاہے، مگر قاضی جی نے ایسا کرنے سے روک دیا، بدلو رونے لگا، قاضی جی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے، آقا اور خادم دونوں رو رہے تھے، ندامت اور محبت کے آنسوؤں سے! قاضی جی نے بدلو کو پانچ روپیہ دیئے، بدلو نے انعام سمجھا، اور قاضی جی نے کفارہ ادا کیا —— قاضی جی کے حُسنِ اخلاق کی یہ ایک جھلک تھی!

صفیہ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ برس کی ہوگئی، وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے، پلک مارتے میں جُگ بیت جاتے ہیں —— صفیہ کے ماموں جن کو سب لوگ "نواب صاحب" کہہ کر پکارتے تھے ایک دن قاضی جی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بھائی جان! صفیہ اللہ رکھے جوان ہونے کو آئی مگر آپ نے اُس کی تعلیم کا کوئی بند و بست نہیں کیا، کیا اُسے یوں ہی "بیل" بنا کر رکھنے کا ارادہ ہے؟

قاضی جی اس پر بولے کہ یہ تو تم جانتے ہوگے وہ کس قسم کی تعلیم ہے جو لڑکی کو "بیل" نہیں "ہرنی" بنا دیتی ہے! میں نے تمہاری بھانجی کو اَن پڑھ نہیں رکھا، جتنی اس کی عمر ہے اُس کے مطابق وہ لکھنا پڑھنا جانتی ہے اُس کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہے، سینا پرونا، کھانا پکانا اور خانہ داری کی باتیں تمہاری بہن اُسے سکھا رہی ہے، صفیہ کی سمجھ بھی اچھی ہے، ماشاء اللہ ذہن بھی رسا پایا ہے، تعلیم و تربیت میں اپنی ہم عمر لڑکیوں میں وہ کسی سے بھی گھٹ کر نہیں ہے۔

نواب صاحب نے اس پر قدرے جھنجلا کر کہا :— بھائی جان! آپ تو اگلے وقتوں کی باتیں کرتے ہیں، اب زمانہ اور ہے، آج کل تعلیم یافتہ اُس کو کہا اور سمجھا جاتا ہے جس کے پاس سند ہو، سارٹیفکٹ ہو، ڈگری ہو اور جس نے اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات پاس کئے ہوں —— میں نے ایک ماسٹر صاحب سے صفیہ کی پڑھائی کے لئے بات چیت کرلی ہے، تیس روپے ماہوار لیں گے وہ پڑھائی کی فیس! روزانہ دو گھنٹے تعلیم دیا کریں گے، بڑے قابل اور تجربہ کار ٹیچر ہیں، دسیوں بیسیوں لڑکیوں کو امتحانات میں کامیاب کرا چکے ہیں، تعلیم گھر ہی کے اندر ہوگی مگر صفیہ کو اُن کے سامنے آنا پڑے گا تعلیم کی ضرورت کے لئے ایک دو آدمیوں کے سامنے آجانا میرے خیال میں "بے پردگی" نہیں ہے! آپ "ہاں" کہہ دیں تو میں کل ہی ماسٹر صاحب کو لے آؤں، آپا جان سے میں ذکر کرچکا ہوں، وہ کہتی تھیں کہ تمہارے دولہا بھائی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔

قاضی جی اس پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے، اُن کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی، غصہ کی نہیں غیرت کی سُرخی، کہنے لگے، —— اخلاقؔ انسانیت اور شرم و غیرت کے اصولوں کو میں غیر متغیر سمجھتا ہوں، زمانہ چاہے کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے، مگر اخلاق و انسانیت کے اصول نہیں بدل سکتے، وہ آدمی ہی کیا جو "وقت" اور "زمانہ" کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے پھرا کرے —— ایک بات تو یہ ہوئی! اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے نواب صاحب! دوسری بات یہ ہے کہ "علم" ڈگریوں اور سارٹیفکٹوں کا پابند نہیں ہے، موجودہ تعلیم ڈگریاں تو دیدیتی

ہے مگر "علم" نہیں دیتی، اسکولوں اور کالجوں کا "نصاب" ہی اس نہج پر بنایا گیا ہے کہ طالب علموں کے ذہن و فکر کی صحیح اصولوں پر تربیت نہیں ہوتی؛ اخلاق کو تو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے (میں کچھ عرض کروں ——— نواب صاحب نے قاضی جی کی بات کاٹتے ہوئے کہا) جی! پہلے مجھے کہہ لینے دیجئے، آپ بولتے رہے تو میں نے آپ کو کب ٹوکا تھا، آپ صبر کے ساتھ میری بات سنئے، بیچ بیچ میں لقمہ دینے سے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور ممکن ہے کہ کلام مربوط ہی نہ رہے (نواب صاحب قدرے کھسیانے ہو کر مسکرانے لگے) اور قاضی جی نے کہنا شروع کیا:—

"علم" کی غایت اور مقصد ہے "نیکی" اور "پاکبازی"، جہاں نیکی اور پاکبازی نہیں وہاں چاہے کتب خانے اور ڈگریاں کیوں نہ ہوں مگر "علم" نہیں ہو سکتا، اسلام نے "حجاب" کو اسی لئے ضروری قرار دیا ہے کہ اس سے عورت کے اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے، بے حجابی اخلاق کی ضد ہے یا یوں سمجھو کہ ایک طرح کی بدپرہیزی اور بے احتیاطی ہے ——— تو آپ کی بھانجی صفیہ کو نامحرم ٹیچر کے سامنے بے پردہ کرا کے کیا میں اُس معصوم کو اُس بے احتیاطی میں مبتلا کر دوں، جس سے اسلام نے روکا ہے، میں اس کا باپ ہوں، کھانے، پلانے اور پرورش کرنے سے زیادہ اُس کے اخلاق و کردار کی نگرانی مجھ پر فرض ہے، "اخلاق" تعلیم پر مقدم ہے، جہاں اخلاق و کردار پر حرف آنے کا ذرا سا بھی امکان ہو، وہاں "تعلیم" "دولت" "شہرت" اور "ترقی" کے سبز باغوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے، جس جگہ اخلاق کے معاملہ میں بے احتیاطی برتی جاتی ہے، وہاں خود "علم" کی توہین ہوتی ہے۔

——— آپ اُس معصوم بچی کے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں، بھائی جان! میرا تو دل کانپا جا رہا ہے ——— نواب صاحب نے ادھ جلی سگریٹ فرش پر پھینکتے ہوئے کہا:—

صفیہ کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے، مگر یہ سوال "احتیاط" کا ہے، فطرتاً تمام لڑکیاں اور لڑکے اچھے ہی ہوتے ہیں مگر غلط ماحول، بُری سوسائٹی اور "بے احتیاطی" اُنہیں بُرا بنا دیتی ہے، "احتیاط" کو بدگمانی نہیں کہتے رزاق میاں (نواب صاحب کا اصلی نام) یہ جو تم اپنے گھر کے صندوقوں اور الماریوں میں قفل لگا کر رکھتے ہو، تو کیا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ تم نے گھر کے تمام لوگوں کو چور اور اُٹھائی گیرہ سمجھ رکھا ہے ——— جہاں "بے احتیاطی" روا رکھی جاتی ہے، وہاں لغزش کا امکان ہے، یہ لغزش چاہے عملی کی جگہ خیالی ہی کیوں نہ ہو، مگر ہے وہ لغزش ہی! اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں اُن کو توڑنا ہی سب سے پہلی "لغزش" ہے! "پردہ" بھی حدود اللہ میں شامل ہے، اس حدِ حجاب کو توڑ کر اور پھاند کر، جیسی بھی صورت، موقع اور حالات ہوں، اُن کی نسبت سے "بُرائیاں" پیدا ہوئے بغیر رہ نہیں سکتیں ——— اور ——— قاضی جی ابھی بول ہی رہے تھے کہ نواب صاحب نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا:—

"بھائی جان! جن ماسٹر صاحب کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے، وہ بہت اچھے آدمی ہیں، دسیوں بیسیوں شریف لڑکیوں کو وہ روزانہ تعلیم دیتے ہیں، اور برسوں سے یہی کام کر رہے ہیں، مگر اُن کے بارے میں کوئی بُری افواہ تک سننے میں نہیں آئی، آپ تو بال کی کھال نکال رہے ہیں، سیدھی بات میں نزاکتیں پیدا کی جا رہی ہیں، یہ احتیاط نہیں وہم ہے، اور وہم کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔"

قاضی جی نے اس پر جواب دیا:—

"تم اس احتیاط کو وہم کہتے ہو، تو تمھاری رائے پر ہی میں صاد کرتا ہوں، اچھا صاحب! یہ احتیاط نہیں وہم ہے مگر عورت کی عفّت و عصمت کا جہاں سوال ہو وہاں یہ "وہم" بھی ایک زندہ حقیقت سے کم نہیں! میری اس بات کو ایک سامنے کی مثال کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرو (نواب صاحب طنز آمیز انداز میں سر ہلاتے ہیں) اگر تمھیں کسی خوش ذائقہ شربت یا لذیذ کھانے میں زہر کا وہم ہو جائے، تو تم اس شربت اور کھانے کو زبان پر بھی نہ رکھو گے! عصمت و عفّت جان سے زیادہ قیمتی چیز ہے، اس پر حرف آنے کا جہاں "وہم" بھی

ہو، وہاں بڑے سے بڑا نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے، غیرت مند انسانوں کا یہی فیصلہ ہے، ناقابلِ تبدیل فیصلہ! (جی --- میں کچھ عرض کروں۔ --- نواب صاحب نے کہا) میری بات ابھی پوری کہاں ہوئی ہے، بڑے بے صبرے واقع ہوئے ہو رزاق میاں! (خطا ہوئی، لیجئے کان پکڑتا ہوں --- نواب صاحب نے مسکرا کر جواب دیا --- اور قاضی جی نے پھر گل افشانی شروع کر دی۔

رہے تمہارے وہ نیک نفس اور پاکباز ماسٹر صاحب تو میں نے اُن کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں کہا، تم اُن کو جتنا نیک بتاتے ہو، اللہ کرے وہ اُس سے زیادہ نیک ہوں --- مگر "پردہ" کے لئے اللہ اور رسول نے یہ شرط نہیں رکھی کہ "بُروں" سے تو پردہ کیا جائے، اور "نیکوں" سے نہ کیا جائے، صحابۂ کرام سے زیادہ نیک اور پاکباز کون ہوگا، نامحرم عورتیں اُن سے بھی پردہ کرتی تھیں، عفت و عصمت کے معاملہ میں کسی پر اس قسم کا اعتماد کر لینا اپنی جگہ بہت بڑی بے احتیاطی اور غلط اندیشی ہے، اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ ماسٹر صاحب کے بارے میں کوئی بُری افواہ سننے میں نہیں آئی، تو میں خود ذاتی طور پر ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو اخلاقی اعتبار سے بُرے ہیں مگر عوام میں اُن کی اچھی شہرت ہے، بہت سی زندگیوں پر آخر وقت تک پردے پڑے رہتے ہیں۔

ے کہ خبثِ نفس نگردد بہ سال ہا معلوم

اور ہاں! رزاق میاں! تم نے بُرائی شاید اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ جائے یا تنہائی میں اُس سے چھیڑ چھاڑ کی جائے، میں کہتا ہوں کہ ایک نامحرم مرد کا ایک عورت کے ساتھ آزادی کے ساتھ باتیں کرنا بھی "بُرائی" سے خالی نہیں، لقّاسے اور دید میں بھی بُرائی ہے، زبان چاہے کچھ نہ کہے، آنکھیں بہت کچھ کہہ سکتی ہیں --- اور تمہارے ماسٹر صاحب تو لڑکیوں کو عاشقانہ اشعار، رنگین نظمیں اور رومان آفریں ناول پڑھاتے ہیں، اس میں تو سو فی صدی بُرائی ہی بُرائی ہے، تعلیم و تربیت کا یہ انداز ہی غلط ہے، لڑکیوں کی زندگیوں پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ضرور پڑتا ہے، اور یہ ذرا سی چنگاری آگے چل کر شعلہ بن سکتی ہے، یوں کوئی بے غیرت بن کر آنکھوں پر ٹھیکرے رکھ لے تو اُس کا کیا علاج!

یہ تھے قاضی جی کے پاکیزہ تصورات اور ملکوتی تخیلات --- اور صفیہ انھی پاکباز تصورات کے سایہ میں پل کر جوان ہو گئی، اُس کے لئے ایک دو نہیں دسیوں پیام آئے، ان میں مالدار و غریب، متوسط، اچھے اور بُرے سبھی طرح کے پیام تھے، قاضی جی نے اپنی بیٹی کے لئے جس بر کا انتخاب کیا وہ معمولی حیثیت کا تاجر تھا مگر مذہبی، صوم و صلوٰۃ کا پابند، نام ہی خلیق نہ تھا، اُس کی عادت اور خو بو میں اخلاق گھُل مل گئے تھے۔

دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے، پیار، محبت، چاہت، دلداری، خلوص، ایک دوسرے کی غمخواری! کسی بات پہ بدمزگی بھی ہو جاتی تو معاملہ زیادہ طول نہ کھینچتا، دونوں میں سے کوئی ایک پہل کرتا اور آن کی آن میں ملاپ ہو جاتا، خلوص و محبت میں کبھی کبھا کی بدمزگی بھی لطف پیدا کر دیتی ہے، روٹھنے کے بعد منے اور منائے جانے میں بڑا مزہ آتا ہے --- اللہ تعالےٰ نے ڈھائی سال کی مدت میں ایک چاند سا بچہ بھی دے دیا، اُس کا نام رکھا گیا، بلال --- ہنس مکھ بچہ، ماں کی طرح خوب سُرخ و سپید رنگت اور باپ کی سی چوڑی پیشانی، ماں باپ کی محبتوں کا سنگم، پھُول کی طرح ہنستا اور بلبل کی طرح چہکتا، گھر میں اُس کے دم سے رونق تھی۔

خلیق لکڑی کا کاروبار کرتا تھا، شروع شروع میں ناتجربہ کاری، نوکروں کی غفلت کے سبب ٹوٹا بھی آیا، پھر حالت سنبھلنے لگی، اور ترقی ہی ہوتی گئی، آدمی دیانت دار، بات کا سچا اور وعدے کا پکا تھا، بازار میں اُس کی ساکھ بنی ہوئی تھی، دس پانچ ہزار کا مال اُدھار مل جاتا، زیادہ منافع کے خیال سے مال کو روک کر رکھنے کی اُسے عادت ہی نہ تھی، تھوڑے سے نفع پر مال بیچ دیتا، اس لئے دوسروں کے مقابلے میں اُس کے مال کی بکری بہت زیادہ ہوتی، اور بہت سے مال پر تھوڑا سا نفع بھی مل ملا کر اچھا خاصہ ہو جاتا۔

خلیق تین سال تک پولس کی چوکی کے پاس ایک کرایہ کے مکان میں رہتا رہا، یہ مکان بہت بڑا تھا، اُس ملکی چوس مالک مکان نے

تین سال کی مدت میں ایک بار بھی مکان کی مرمت نہیں کرائی، خلیق اُس سے جاکر مرمت کے لئے کہتا تو یہی جواب ملتا کہ کل مزدور بھیجتا ہوں، پرسوں مزدور لگ جائے گی، مگر یہ وعدے شرمندۂ ایفا نہ ہو پائے، بے مرمت مکان میں رہنا خطرے سے خالی نہیں، برسات میں ایک کمرے کی چھت کا کچھ حصہ گر گیا، اور خلیق کو مکان چھوڑ دینا پڑا ——— اب وہ شہر کے سب سے زیادہ گنجان محلہ میں آگیا تھا، مکان زیادہ پرانا تھا مگر نیا بنا ہوا تھا، در و دیوار سے خوشنمائی ٹپکتی تھی۔

خلیق نے ملنسار ہونے کے باوجود کم آمیز طبیعت پائی تھی، ہر کسی کو نہ تو وہ دوست بناتا اور نہ بہت جلد بے تکلف ہو جاتا، وہ اُن لوگوں کی طرح نہ تھا کہ جو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں اجنبیوں سے ملتے ہیں اور ذرا سی دیر میں اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے یہ لنگوٹیا یار ہیں ——— اس نئے مکان میں رہتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے، پاس پڑوس کے لوگوں سے صاحب سلامت ہونے لگی، مگر جسے یارانہ اور تعلقات کہتے ہیں، وہ بس دو تین آدمیوں سے ہوا، اور اُن میں سے زیادہ گہرے تعلقات میونسپل آفس کے ہیڈ کلرک سے تھے، جس کا مکان خلیق کے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔

اس ہیڈ کلرک کا نام تھا، احمد یار خاں صوفی! سب لوگ اُسے "صوفی صاحب" کہتے تھے! اُس کا یہ لقب ——— صوفی ——— بھی ایک عجیب معمہ بنا ہوا تھا، کوئی سمجھتا کہ احمد یار خاں کا تخلص ہے، کسی کا خیال تھا کہ وہ کسی پیر کا مُرید ہے ——— "صوفی" کہلاتا ہے اور یہ بھی کہ وہ خود پیروں کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کے یہاں پیری مُریدی ہوتی ہے ———

صوفی نے بڑی ملنسار طبیعت پائی تھی، ذرا سی دیر کی ملاقات میں اجنبیوں کو شیشہ میں اُتار لیتا، ہنسوڑ اور بذلہ سنج تھا، ایسے آدمی سے ہر کوئی بہت جلد بے تکلف ہو جاتا ہے، آدمی شوقین تھا، ستار بجانے کا اُسے شوق، پتنگ اُڑانے کی اُسے لت، شطرنج کھیلنے کا شوق حد کو پہونچا ہوا، خوش خوراک، خوش پوشاک اور خوش گفتار بھی! شاعر نہ تھا مگر شعر سے دلچسپی کا یہ عالم کہ بات بات میں شعر سناتا، ہزاروں شعر اُسے یاد تھے، واسوخت امانت اور مثنوی زہرِ عشق کے بہت سے حصے اُسے ازبر تھے، سناتا تو سناتا ہی چلا جاتا۔

خلیق اور صوفی کا آپس میں اچھا خاصہ یارانہ ہو گیا، گھر سے گھر ملا ہوا تھا، اجنبیت کب تک رہتی رات دن کا واسطہ تھا، پڑوسیوں سے میل جول ہو ہی جاتا ہے، ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا اور کھانا پینا بھی رہتا، جب دل ملے ہوئے ہوں تو ملاقات کی سو راہیں نکل آتی ہیں ——— ایک دن صوفی نے خلیق کے دروازے پر دستک دی، ملازم لڑکے نے دروازہ کھولا اور کہا کہ صاحب! نہا رہے ہیں، آپ یہاں بیٹھک میں تشریف رکھئے، صوفی دیوان خانہ میں بیٹھ گیا، زنانہ کمرہ بیٹھک سے بالکل ملا ہوا تھا، دروازے پر چلمن پڑی تھی، لڑکا اندر سے پان لے کر آیا تو چلمن اٹھاتے ہیں، رسی جو بہت کمزور ہو گئی تھی، ٹوٹ گئی اور چلمن زمین پر گر پڑی، صفیہ چلمن کے قریب ہی چوکی پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کاٹ رہی تھی، صوفی نے اُسے اچھی طرح دیکھا، چھالیہ کاٹتے ہوئے، پنکھے سے منہ چھپاتے ہوئے، اُٹھ کر تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے، ہوس نے آنکھوں میں جذبات کا رس گھول دیا، ململی کپڑوں میں سرو قامتی، صباحت اور تندرستی قیامت نظر آئی، آنکھیں چاہتی تھیں کہ یہ نظارہ بار بار میسر ہوتا رہے، تھوڑی دیر بعد خلیق نہا دھو کر وہاں آگیا، اور بہت دیر تک دونوں بات چیت کرتے رہے۔

صوفی کا بس چلتا تو وہاں سے نہ جاتا مگر پرائے مکان میں آخر کب تک بیٹھا رہتا، جانا پڑا لیکن اس طرح:-

تری محفلِ ناز سے اُٹھنے والے
نگاہوں میں تجھ کو لئے جا رہے ہیں

اتفاق کی بات کہ صفیہ نے اُسی دن حلوے کی طشتری صوفی کے یہاں بھیجی، صوفی اور خلیق کے گھروں میں ایک دوسرے کے یہاں سے کھانے پینے کی چیزیں آتی جاتی رہتی تھیں، مگر اُس دن صفیہ کا حلوے کی طشتری بھیجنا خلیق کے سمندِ ہوس کے لئے تازیانہ

ہوگیا، ہوس نے اُسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ آج کی "نظارگی" کا یہ نتیجہ ہے، اُدھر سے یہ پہل ہوئی ہے، صوفی دوسرے دن بڑا سا طباق خود لئے ہوئے خلیق کے یہاں آدھمکا، اس میں گھنٹہ والے حلوائی کے دوکان کی برفی، پون ٹوٹی کے نکڑ کے لڈو، بڑے بازار کے اندر اور چھنومل کی دوکان کا پپڑی کا حلوا تھا، آتے ہی خلیق سے بولا ——— زور دار آواز میں کہ اندر سُنی جاسکے اور مقصد صفیہ کے کانوں تک اپنی باتوں کا پہونچانا تھا ——— خلیق صاحب! بھابی جان سے آداب کہئے اور شکریہ بھی! کس قدر ذائقہ دار حلوہ بناکر بھیجا ہے۔ کہ کل سے اب تک زبان چٹخارے لے رہی ہے، بھابی جان کے ہاتھ میں لذت ہے، جو چیز پکاتی ہیں ذائقہ دار ہوتی ہے، خلیق! تم بڑے خوش قسمت ہو، ایک ہماری بیگم صاحبہ ہیں کہ دال اور ترکاری تک پکانی نہیں آتی اور گوشت ڈھب ڈھب شوربہ، اُس میں غوطہ لگایا جاسکتا ہے۔

صوفی نے ربط ضبط بڑھانا شروع کر دیا، تحفے تحائف بھیجتا، خلیق کے یہاں گھنٹوں آکر بیٹھتا، اور عجیب عجیب باتیں کرتا ——— خلیق صاحب! میری تصویر آج تک اچھی نہیں آئی (پھر خود ہی مُسکراکر) صورت ہی خراب پائی ہے میں نے! بے چارے فوٹو گرافر بھی کیا کریں (خلیق کہتا ہے، آپ تو ماشاء اللہ خوبصورت ہیں صوفی صاحب! مگر تصویر کھنچوانے کا ڈھنگ ہوتا ہے ——— (صفیہ اس گفتگو کو سُن رہی تھی، ایک دیوار کا تو فاصلہ تھا)

——— صاحب! سلیقہ تو ختم ہے، ہماری بھابی جان پر! خلال کرنے کی سینکیں تک کس قرینہ سے رکھی ہیں، اور ایک ہماری بیوی ہیں، گھر کو کباڑی کی دوکان بنا رکھا ہے، کاش! مذہب میں بیویاں بدلنے کی اجازت ہوتی (ایک دوسرا دوست قہقہہ لگاکر کہتا ہے) تو پھر! صوفی صاحب آپ نفع میں رہتے ——— اور (خلیق دوست کی بات کاٹتے ہوئے) اس قسم کی بے تکلفی کو میں پسند نہیں کرتا (اور صوفی کے کان آپ ہی آپ بجنے لگے، جیسے پردے کے پیچھے سے ہنسنے کی آواز آرہی ہے)

صوفی نے سب جتن کرکے دیکھ لئے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، وقت ناوقت خلیق کے دروازے پر آکر دستک دیتا، طرح طرح کے تحفے بھیجتا، ہنسی مذاق کی باتیں کرتا، ستار بجاتا، شعر پڑھتا، اپنی بیوی کی طرح طرح سے بُرائی، صفیہ کی بات بات میں تعریف یہ بڑی نفسیاتی مار تھی، مگر صفیہ اپنی جگہ کوہ وقار تھی اُسے جنبش تک نہ ہوئی ——— صوفی تنہائی میں سوچتا تو ہوس بڑھاوے دے کر اُسے مایوس ہی نہ ہونے دیتی، وہ اُسے سمجھاتی اور ہمت بڑھاتی کہ ننگ و ناموس اور عزت آبرو کا سوال ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صفیہ ہر خطرہ مول لیکر ایکا ایکی بے تکلف ہوجائے، ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں . . . . . مگر دل کی لگی اپنا اثر دکھائے بغیر رہ نہیں سکتی، آج نہیں تو کل اُس کا دل پسیجے گا، اور تمہاری باتیں اگر اُسے ناگوار ہوتیں تو شوہر پر اس بات کو ظاہر کرکے ربط ضبط میں کمی بلکہ بندش نہ کرا دیتی اب پان کے بیڑے کتنی جلد جلد لگ کر آنے لگے ہیں، پہلے تو وضع کا یہ رنگ کہاں تھا، لاکھ بیگانگی سہی مگر محبت اب بھی بے اثر نہیں ہے۔

مگر ہوس کہاں تک آخر مایوس نہ ہونے دیتی، صفیہ کی طرف سے کوئی ایسی بات ہی ظہور میں نہیں آئی کہ صوفی کو سہارا ہوجاتا، ہر داؤں خالی گیا، سارے نشانے چوک گئے، تمام تدبیریں اکارت گئیں، پسپائی اور ناکامی نے ندامت کی صورت اختیار کر لی کہ میں ایک پاکباز اور عصمت مآب خاتون پر بُری نگاہ رکھتا ہوں، اور پھر خلیق میرا دوست ہے، پڑوسی ہے، یہ میں کیا کر رہا ہوں عشق بازی کرنی ہی ٹھہری تو اس کے لئے آبرو باختہ عورتوں کی کمی نہیں ہے ——— خیالات بدلتے جارہے تھے، پاکبازی نے ہوس کو قریب قریب شکست دے دی!

جنم اشٹمی کی تعطیل تھی، صوفی کے گھر کے لوگ کسی رشتہ دار کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے تھے، صوفی پلنگ پر لیٹا ہوا مثنوی زہر عشق کے اشعار گنگنا رہا تھا، خود ہی گاتا . . . . . اور خود ہی جھومتا جاتا، پھر وہ کچھ سوچنے لگا، سوچتے سوچتے اُٹھ بیٹھا،

دل ہی دل میں بولا ـــــ دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے، اگر اُدھر سے نظارے کا جواب نظارے سے دیا گیا تو بس ایک "زہر عشق" اور تیار ہوئی سمجھو، ہوس کو آج کھل کھیلنے کا پھر موقع مل گیا۔

خلیق کے مکان سے صوفی کے گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی، دیوار میں دو روشن دان تھے ایک روشن دان کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا، خلیق نے دیوار کے سہارے میز لاکر رکھی اور دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے پیروں سے اُس پر چڑھ گیا، اُس نے جھانک کر دیکھا، صفیہ چوکی پر بیٹھی ہوئی قرآن شریف پڑھ رہی تھی، اور روتی جاتی تھی، خدا کا خوف اُس کے چہرے پر چھایا ہوا تھا، عصمت کی تصویر، عفت، پاکیزگی کی مورت، خشیتِ الٰہی کا مجسمہ! اُس کی پیشانی قرآن کا پارہ بنی ہوئی تھی ـــــ صوفی دھڑام سے نیچے کود پڑا اور بستر پر جا لیٹا، اُسے خود اپنے پر آج غصہ آ رہا تھا، جی میں آتا تھا کہ اپنی آنکھوں کو پھوڑ لے، اپنے وجود سے اُسے نفرت ہو گئی تھی، وہ محسوس کر رہا تھا کہ دنیا کے پردے پر اُس سے بڑھ کر آوارہ اور بدکردار شاید ہی کوئی ہو ـــــ

کئی گھنٹے تک یہی عالم طاری رہا ـــــ "ندامت ہی کا نام توبہ ہے" اور وہ مجسّم توبہ اور سراپا ندامت بنا ہوا تھا، پھر وہ بستر سے اٹھا، خلیق کے دروازے پر جا کر دستک دی، خلیق نے دروازہ کھولا، صوفی نے اُس کے پیر پکڑ لئے، اور بولا :—

"خلیق بھائی! معاف کر دو، میرا قصور معاف کر دو، (خلیق نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ـــ کیسا قصور! ہیں! یہ تم کیا کہہ رہے ہو ... ارے ..... ہو گیا گیا ہے تم کو، زمین پر بچھے جا رہے ہو) سمجھو کہ میں نے تمہاری سب سے زیادہ قیمتی چیز چرانے کی کوشش کی تھی (تم ... اور چوری ـــــ واہ! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو ـــــ خلیق نے جواب دیا) بات ٹالنے سے کام نہ چلے گا خلیق! تمھیں اور بھابی جان کو بھی معافی دینی پڑے گی، ورنہ خدا کی قسم یہیں تمھارے کمرے میں دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤں گا، مجھے مر جانا ہی چاہئے، ایسے بدنفس اور بُرے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے (یعنی یہ کے اور بڑھتی جا رہی ہے ـــــ خلیق بولا) جب تک تم معاف نہ کر دگے یہ تے "بڑھتی ہی رہے گی، خلیق! میرے دوست اور بھائی خلیق! اپنے مجرم، خطاکار اور پاپی دوست کو معاف کر دو، للّٰہ معاف کر دو، اگر معاف نہیں کر سکتے تو ان میری گناہ گار آنکھوں کو پھوڑ دو، مجھے ٹھوکریں مار مار کر کے جہنم میں پہونچا دو (صاحب! معاف کیا، معاف کیا ... ... خلیق نے قدرے گھبرا کر کہا) اندر سے آواز نہیں آئی، خلیق اندر جاؤ بھابی جان سے کہو کہ وہ مجھے معاف کر دیں!

صوفی کی باتیں سُن کر صفیہ بھی گھبرا سی گئی، وہ ایسی باتیں کر رہا تھا، جیسے کوئی اپنی جان سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی، کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے، صفیہ بے اختیار بول اٹھی :—

"میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا ... ..."

"میرے خدا نے معاف کیا" خدا نے، خدا نے، ان لفظوں کو دُہراتے ہوئے صوفی بے اختیار رونے لگا، اس کی آنکھیں ساون بھادوں برسا رہی تھیں، وہ مجسّم ندامت بنا ہوا تھا، آنسو زمین پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے، خلیق کے دوست وہاں نہ آ جاتے تو وہ نہ جانے کب تک روتا رہتا ـــــ

---

# ہماری نظر میں

## دستوری سفارشات پر تنقید

(۱) دستوری سفارشات پر تنقید از :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۳ر ملنے کا پتہ :- شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی بنک اسکویر مال روڈ، لاہور

سب جانتے ہیں کہ پاکستان "اسلام" کے نام پر بنا تھا، مسلم لیگ کی عظیم الشان کامیابی صرف اسی "اسلام" کے نعرے میں مضمر ہے، قیام پاکستان کے بعد کچھ اس قسم کی بولیاں سُننے میں آنے لگیں کہ خداوندانِ نعمت کے ارادے اب کچھ اور ہیں، پاکستان کو ترکی کے انداز کی ایک قومی مملکت بنانے کے منصوبے ہیں مگر قوم نے مطالبہ کیا اور شدّت کے ساتھ مطالبہ کیا کہ جن وعدوں کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا ہے، اُن کو پُورا کیا جائے، اس مطالبہ کا یہ اثر ہوا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے "قرارداد مقاصد" منظور کرکے پاکستان کے اسلامی حکومت ہونے کا اعلان کر دیا، اس اعلان پر قوم نے "مرحبا" کہا، جماعتوں نے مُبارک باد دی، افراد نے تحسین و ستائش کے پھُول نچھاور کئے، تمام عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو رہا ہے، صدیوں کی آرزوئیں پُوری ہونے والی ہیں اور دُنیا پھر ایک بار "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند ہو جائے گی۔

"قرارداد مقاصد" کے منظور ہونے کے بعد اُصولی طور پر دستور ساز اسمبلی کو برطرف ہو جانا چاہیئے تھا نئے سرے سے انتخاب کی ضرورت تھی، کیونکہ اسلامی حکومت کا دستور وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو قرآن اور سنت سے واقفیت رکھتے ہوں اور جن کی فراست اسلام کے مزاج سے آشنا ہو مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا، وہی لوگ اسمبلی کی کرسیوں پر براجمان رہے، جن کا دماغ انگریزی قانون کی پیداوار تھا، اور جنھوں نے اسلامی دستور کی ایک سطر بھی کبھی نہ لکھی تھی ——— عوام کی زبان سے جب یہ اندیشے ظاہر ہونے لگے تو اُن کے اطمینان کے لئے حکومت نے بہ مراحِم خسروانہ اور راہِ عطوفتِ کریمانہ "تعلیماتِ اسلامی بورڈ" مقرر فرما دیا جس کو دستور ساز اسمبلی میں کوئی آئینی پوزیشن حاصل نہ تھی اور نہ اب تک ہے، عُلمائے کرام کے اس بورڈ کا بس یہ کام ہے کہ وہ بارگاہِ عالی میں سفارشیں اور تجویزیں مُرتب کرکے گزرانتے رہے ہیں، اربابِ اقتدار نے یہ ایک سیاسی کھیل کھیلا، اُسی انداز کا کھیل جو انگریز ہندوستان میں کھیلا کرتا تھا۔

سارے عالم میں شور برپا تھا کہ پاکستان میں اسلامی دُستور بن رہا ہے" اربابِ اقتدار تقریروں میں اعلان کر رہے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا احیاء ہوگا اور دُنیا کے لئے یہ ایک مثالی حکومت ہوگی، یہ وعدے، یہ اعلانات، یہ دعاوی یہ اُمیدیں، ——— انتظار اور شدید انتظار کے بعد جو "دستوری سفارشات" سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ ان وعدوں میں کوئی صداقت اور ان اعلانات میں کسی قسم کی جان نہ تھی، یہ سب ہوائی باتیں تھیں، لوگوں کو بچوں کی طرح کھلونے دے کر بہلایا جا رہا تھا۔ "دستوری سفارشات" اسلامی تو کیا جمہوری بھی نہیں ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کی جگہ

قیصریت اور کسرائیت قائم کرنے کا عزم ہے، "قرارداد مقاصد" کے خلاف یہ "دستوری سفارشات" ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مشہور اسلامی مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے ۱۴ر اکتوبر سنہ ۵۰ء کو موچی دروازہ لاہور کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں ان "دستوری سفارشات" پر جو تنقید اور تبصرہ فرمایا ہے، وہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے، یہ تقریر "دستوری سفارشات" پر ایک جامع تنقید اور سیر حاصل تبصرہ ہے، اس کا ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر پڑھے جانے کے لائق ہے، کتنی سچی اور بے لاگ بات کہی ہے مولانا مودودی نے :-

**انگریز چلتے وقت ہمیں ان مرکزی حکمرانوں کے ہاتھوں رہن رکھ گیا ہے، اور یہ حکمران اب اس رہن کو مستقل قبضے میں تبدیل کردینے کا سامان کر رہے ہیں۔**

"دستوری سفارشات" کی روح علامہ مودودی کے ان لفظوں کی تصدیق کر رہی ہے، فراستِ مومن کس قدر نبض شناس ہوتی ہے! اور قرآنی بصیرت حاصل ہو جانے کے بعد ذہن و فکر میں کس درجہ سلجھاؤ اور رائے میں کتنی اصابت پیدا ہو جاتی ہے ——— یہ کتابچہ ہر اُس شخص کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو پاکستان کا اپنے دل میں درد رکھتا ہے اور جو چاہتا ہے کہ پاکستان کا افق خلافتِ راشدہ کی انسانیت نواز تجلیوں سے جگمگانے لگے کیونکہ پاکستان اسی غرض کے لئے وجود میں آیا تھا۔

(۲) "دستوری سفارشات اور تنقید و تبصرہ" ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ :- شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی بنک اسکویر مال روڈ، لاہور۔

اس کتاب میں بعض اکابرِ پاکستان کے آراء و افکار اور اخباروں کے اُن تبصروں اور تنقیدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے جو "دستوری سفارشات" کی کمزوری اور نااہلی کو ظاہر کرتی ہیں، یہ کتاب اس اعتبار سے بھی اہم اور معلومات آفریں ہے کہ اس میں "قرارداد مقاصد" کا اصل متن ملتا ہے اور ساتھ ہی بنیادی اُصولوں کی کمیٹی کی سفارشات بھی درج ہیں۔

اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "دستوری سفارشات" سے ملک کا کوئی طبقہ بھی مطمئن نہیں ہے، عجیب چیز بنائی ہے، بنانے والوں نے! اور آئندہ بھی انھی بت تراشوں سے محراب و منبر بنوانے کا ارادہ ہے!

اس کتاب کے تمام مضامین پڑھے جانے کے قابل ہیں مگر خواجہ عبدالرحیم صاحب بیرسٹرایٹ لانے قانونی نقطۂ نظر سے جو تنقید کی ہے، وہ خاص طور پر غور و فکر کی محتاج ہے!

(۳) "دو دستوری خاکے" مرتبہ :- نعیم صدیقی، ضخامت ۱۳۱ صفحے، لکھائی چھپائی دیدہ زیب، قیمت ۵ر ملنے کا پتہ :- مکتبۂ چراغِ راہ، لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ، کراچی ملا

اس کتابچہ کا دیباچہ جناب نعیم صدیقی نے لکھا ہے، جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام صرف چند اخلاقی اُصولوں اور عبادت کے طریقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل نظامِ حیات ہے، اور اسلامی حکومت کسی "دستور" کے بغیر کس طرح قائم رہ سکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً جس نظامِ حکومت کو قائم فرمایا بلکہ چلا کر دکھلا دیا، وہ "بے دستور نظام" نہ تھا، قرآن، سنت، آثارِ صحابہ اور ائمہ کے اجتہادات میں اس "اسلامی دستور" کے واضح نشانات ملتے ہیں!

اس کے بعد جناب محمد اسد (لیوپولڈ) کا دستوری خاکہ درج ہے، جس کی بعض دفعات پر جناب نعیم صدیقی نے اختلافی نوٹ بھی درج کر دیے ہیں اور وہ نعیم صاحب کی اسلامی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں ——— دوسرا دستوری خاکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں سے نعیم صدیقی نے اخذ کر کے یکجا کر دیا ہے، یہ دستوری خاکہ نہایت جامع اور اسلامی مزاج کے مطابق ہے۔

"عین مطابق ہے" ہم نے جان کر نہیں لکھا کہ اس مبالغہ کو ہم پسند نہیں کرتے، ابوالاعلیٰ مودودی ایک انسان ہیں اور انسان سے اخذ و اقتباس اور ترتیب و اجتہاد میں بھول چوک ہو سکتی ہے، اب یہ "راسخون فی العلم" کا کام ہے کہ وہ مودودی صاحب کے دستوری خاکے کو قرآن و سنت کے معیار پر کس کر دیکھیں۔

پہلے "دستوری سفارشات" کو پڑھیے پھر اس کتابچہ کو ملاحظہ فرمائیے، تاکہ "روشن خیالی" اور "ملائیت" کا فرق معلوم ہو جائے اور اس مرعوبیت کا خاتمہ ہو سکے جو "یورپ" نے ہمارے دماغوں پر مسلط کر دی ہے، اسلامی بصیرت اور فراستِ مومن کے آگے، دھوکے کی سیاست ٹھیر نہیں سکتی ——

## اسلام کا نظریۂ جہاد

"اسلام کا نظریۂ جہاد" از :- حیدر زماں صدیقی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ :- کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور۔

قرآن جسے "جہاد" اور "قتال فی سبیل اللہ" کہتا ہے، اُس پر دُنیا کے بادشاہوں اور فرماں رواؤں کی جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا قیاس کرنا، فکر و نظر کی بہت بڑی غلطی ہے، یورپ کے مورخین نے "جہاد" کو دنیا کے سامنے مسخ کر کے پیش کیا ہے اور یورپ کی اس غلط ترجمانی سے مرعوب ہو کر خود مسلمانوں نے "جہاد" کی معذرت آمیز انداز میں طرح طرح سے تاویلیں کی ہیں ——

"APOLOGY" کے اس طلسم کو اُردو زبان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پوری شدت کے ساتھ توڑا، اُن کی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" اس موضوع پر جامع ترین کتاب ہے۔

جناب حیدر زماں صدیقی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور عقل و نقل اور دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ "جہاد" ایک مقدس فریضہ ایک اہم ضرورت اور ایک ناگزیر صورتِ عمل ہے، "اسلام کا "جہاد" فساد کے لئے نہیں اصلاح کے لئے ہوتا ہے، "اسلامی جہاد" بادشاہوں، حاکموں اور قوموں کی خونریز جنگوں کی طرح نہیں ہے کہ وہاں فتح و غلبہ حاصل کرنے کے لئے ہر بڑے سے بڑا ظلم روا رکھا جا سکتا ہے، "جہاد" کے حدود اللہ اور رسولؐ نے مقرر فرما دیئے ہیں، اُن سے تجاوز جائز نہیں، "جہاد" ظالموں اور مفسدوں کے لئے قہرِ الٰہی اور انسانیت کے لئے رحمت و برکت ہے۔

اسلامی مسائل پر لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے، مسلمانوں میں پرویز جیسے انشاپرداز بھی موجود ہیں جو اسلام کے نظریوں کو اپنی شوخیٔ فکر سے "طلسمِ ہوش ربا" بنائے دے رہے ہیں —— جناب حیدر زماں صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے فکرِ سلیم عطا فرمائی ہے اور اس کتاب میں انہوں نے اپنی عقل و بصیرت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں صرف کیا ہے۔

فاضل مصنف نے اُن علماء کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جنھوں نے ظلم کے خلاف تلوار سے جہاد کیا ہے اور سیف و قلم دوش بدوش معرکہ آرا رہے ہیں، کتاب میں اوّل سے آخر تک جوشِ صداقت اور جذبۂ عمل کار فرما ہے۔

(صفحہ ۱۴) "اور واعیہ ہائے مثال کا انکشاف ہو سکتا ہے" "داعیہ کی جمع "داعیات" ہے فارسی انداز پر عربی جمع، وجدان پر بار گزرتی ہے، "واقعات" کو اگر "واقعہ ہائے" کہا جائے تو سماعت کس قدر ناگواری محسوس کرے گی، (صفحہ ۳۱) "چنانچہ ان کی باہم قبیلوی لڑائیاں مسلسل رہتی تھیں" "قبیلوی" کی جگہ "قبائلی" لکھنا تھا، "سندیلہ" کی بستی کے رہنے والے کو جس طرح "سندیلوی" لکھتے ہیں اُس انداز پر "قبیلہ" سے "قبیلوی" بنانا درست نہیں ——

(صفحہ ۶۳) "لیکن اسلوبِ فکر کا الجھاؤ اُس کے دامنگیر ہو جاتا ہے" اس جملہ میں بہت زیادہ جھول پایا جاتا ہے ——

(صفحہ ۸۳) "خالقِ کائنات نے ارسالِ رُسل اور انزالِ کتب کے ذریعہ اس کام کی تکمیل کر دی ہے" "تنزیلِ کتب" لکھنا تھا "انزال" میں شدید ذم پایا جاتا ہے، عربی لغات اور اُس کی مصطلحات اپنی جگہ مسلم! مگر جس زبان میں اظہارِ خیال کیا جا رہا ہو

اُس زبان کے مزاج اور خصوصیات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

"اسلام کا نظریہ جہاد" ـــــــ ایک قابلِ قدر تصنیف ہے، جوشِ بیان کے ساتھ قوتِ استدلال بھی ہے اور عقل جذبات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، قرآن وحدیث اور تاریخ وسیر سے استنباط کیا ہے اور طرزِ بیان کافی دل کش اور جاندار ہے، جگہ جگہ اشعار اس قدر برمحل استعمال کئے ہیں کہ وجدان جھوم جھوم جاتا ہے۔

## ڈھاکہ پچاس برس پہلے

"ڈھاکہ پچاس برس پہلے" از:- حکیم حبیب الرحمٰن خاں۔ طباعت وکتابت اعلیٰ، مجلد مع خوبصورت گردپوش کے ساتھ، ضخامت ۱۴۸ صفحے، قیمت سوا دو روپے ملنے کا پتہ:- کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور

کتاب کا مضمون اس کے عنوان سے ظاہر ہے ـــــــ حکیم حبیب الرحمٰن خاں مرحوم اس کے لکھنے والے ہیں، ادبی دنیا میں حکیم صاحب مرحوم کا نام آج شاید پہلی مرتبہ کاغذ پر آرہا ہو، مگر اُن کا اندازِ تحریر اس قدر دل نشین، منجھا ہوا صاف ستھرا اور پختہ ہے کہ اگر وہ انشا پردازی پر توجہ دیتے تو بہت نام پیدا کرتے۔

ہمارے گورنر جنرل عزت مآب خواجہ ناظم الدین صاحب کے لکھے ہوئے چند صفحے آغازِ کتاب میں شامل ہیں جو صاحبِ تصنیف کے تعارف پر مشتمل ہیں، اس "تعارف" سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم ڈھاکہ کے ایک نامور طبیب تھے، خوش خوراک، خوش پوشاک، متواضع، مہمان نواز، شعر و شاعری کے شوقین! سیاسیات میں بھی وہ سرگرمی اور پورے جوش اور خلوص کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے، اور مسلم لیگ کے فیصلہ کی تعمیل میں سرکارِ انگریزی کے دیئے ہوئے خطاب "شفاء الملک" کو انھوں نے واپس کر دیا تھا۔

ڈھاکہ بہت قدیم شہر ہے، جہانگیر کے زمانہ میں اس کا نام جہانگیر نگر رکھا گیا مگر جس طرح دلّی دلّی ہی رہی، شاہ جہاں آباد نہ بن سکی، اسی طرح ڈھاکہ کا نیا نام جہانگیر نگر بھی شہرت نہ پا سکا، مغلیہ عہد کے نئے ناموں میں آگرہ کا نام اکبر آباد بس تھوڑا بہت مشہور ہوا اور وہ بھی شاعروں کی بدولت!

اس کتاب میں ڈھاکہ کے پیشوں، صنعتوں، کھانوں، مٹھائیوں، میلوں ٹھیلوں اور کھیلوں وغیرہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے، مصنف نے جس چیز پر قلم اُٹھایا ہے، بس اس کو ہو بہو مصور کر دیا ہے، جہاں کھانوں کا ذکر کیا ہے، وہاں تفصیل میں آخر تک یہی تلازمہ پایا جاتا ہے اور پڑھنے والے کے منھ میں پانی بھر بھر آتا ہے، مصنف کے قلم نے کاغذ پر دسترخوان چن دیا ہے ـــــ کشتی اور ورزش کا جہاں ذکر ہے، وہاں اکھاڑے کی تصویر کھینچ دی ہے، شروع سے آخر تک کتاب کا یہی رنگ ہے ـــــــ کھانوں کی تفصیل سب چیزوں سے زیادہ ہے، اس سے مصنف کے شوق کا پتہ چلتا ہے۔

مُرغ بازی اور بٹیر بازی تو سُنی تھی مگر ڈھاکہ میں لوگ "انڈے" بھی لڑایا کرتے تھے، اور وہ اس طرح:- "دو شخص بالمقابل اکڑوں بیٹھتے ہر ایک شخص انڈا مٹھی میں رکھتا، انڈے کا اوپری حصہ نظر آتا، دوسرا مقابل شخص اس نکلے ہوئے حصہ پر اپنے انڈے کے سرے سے ضرب لگاتا، اگر مارنے والے کا انڈا ٹوٹ گیا، تو وہ دوسرا انڈا اپنی مٹھی میں بدستور لیتا اور مقابل ضرب لگاتا، تا آں کہ سارے انڈے ٹوٹ جاتے اور جس کا انڈا اخیر میں سالم رہتا وہ سب ٹوٹے ہوئے انڈوں کا حق دار ہوتا" (صفحہ ۱۳۱)

مصنف نے لکھا ہے کہ انڈے لڑانے کا شوق مسلمانوں میں مخصوص تھا، جی ہاں! ایک زمانہ سے اس قسم کے تمام شوق مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں اور ہم ان کو اپنا کلچر اور آرٹ سمجھ کر، ان پر فخر کرتے ہیں! یہ طرح طرح کے کھانے، قسم قسم کے کپڑے، شادی بیاہ کی رسمیں گانا بجانا، نرت، مُرغ بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی اور اس طرح کی تمام "بازیاں" یہ ہم مسلمانوں کے زوال کی یادگاریں ہیں، ان کو فخر اور حسرت کے ساتھ بیان کرنا، گویا قوم کو اُسی زوال کی طرف لوٹنے کی دعوت دینا ہے، ہمارے اقبال کی تاریخ تو بدر و حنین کے میدانوں میں لکھی گئی تھی، تقویٰ، خدا ترسی، خدمتِ خلق، خشیتِ الٰہی اور عدل و مساوات کے واقعات ہماری تاریخ کی

سنہری کڑیاں ہیں، ہمارا اسلامی کلچر تو سادہ و معصوم کلچر ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ "غیر اسلامی" ہے۔!

ہمیں اپنے اُس تمدن کے شان و شکوہ کو فخر و حسرت کے ساتھ بیان کرنا چھوڑ دینا چاہیئے، جو عجمی اور غیر اسلامی تمدن تھا، اور جس نے ہمارے اسلامی کردار کو غارت کر دیا۔

"شاعر" کا مشاعرہ نمبر

"مشاعرہ نمبر" (شاعر آگرہ) مدیر :۔۔ اعجاز صدیقی ضخامت ۱۹۲ صفحات، اس شمارے کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ، سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ قصر الادب، آگرہ (بھارت)

ہندوستان کے مشہور ماہنامہ "شاعر" نے ایک طرحی مصرعہ تجویز کیا تھا:۔

؎ انھیں اندھیروں سے بزم گیتی کو ایک دن روشنی ملے گی

جس پر اُردو زبان کے شاعروں نے نظمیں اور غزلیں کہیں، جن کو یک جا کر کے "مشاعرہ نمبر" مرتب کیا گیا ہے، آج کل کے شاعر طرحی مصرعوں پر غزلیں کہنے سے جی چُراتے ہیں، اسی لئے طرحی شاعروں تک کو آخر میں غیر طرحی بنا دینا پڑتا ہے، مدیر شاعر کا یہ اعجاز ہے کہ اُنہوں نے اتنے بہت سے شاعروں سے طرح پر نظمیں اور غزلیں کہلوا لیں۔

اس شمارے کے شروع میں مشاعرے کی افادیت، اہمیت اور تاریخ پر چند قیمتی مقالے درج ہیں، اسہیل بخاری ایم۔ اے نے لکھا ہے ــــــ "مشاعرے کوئی ماضی قریب کی ایجاد نہیں ہیں تاریخ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی سینکڑوں سال قبل ان کے وجود کا پتہ دیتی ہے" ــــــ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک صاحب نے "سماع" کے جواز میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ حضرت نوحؑ جب طوفان میں کشتی چلا رہے تھے اور اس کی پتواروں سے جو آواز نکل رہی تھی وہ "نغمہ و موسیقی" تھی! ہم اُردو بولنے والے جسے "مشاعرہ" کہتے اور سمجھتے ہیں وہ خالص ہندوستان کی ایجاد ہے، شعر خوانی کی محفلیں تو اُس وقت سے دنیا میں گرم ہیں جب کہ علم تاریخ بھی پیدا نہ ہوا تھا مگر یہ اُردو مشاعرے سرزمین ہند کی پیداوار ہیں۔

"شاعر نمبر" میں مشاہیر شعراء کے علاوہ کم مشہور یہاں تک کہ بعض گمنام غزل گو حضرات بھی شریک ہیں، ہر شاعر نے اپنی بساط و فکر کے مطابق طبع آزمائی کی ہے، اس کشکول میں موتیوں کے ساتھ خزف ریزے بھی پائے جاتے ہیں، منظوم حصہ کا آغاز جوش ملیح آبادی کی نظم سے ہوتا ہے، جس کا پہلا شعر ہے :۔ ؎

خبر بھی ہے عصرِ نو کے شاعر کہ زیست ہے ایک جُرم سنگیں — یہ جُرم کی شمع جب بجھے گی تو دولتِ روشنی ملے گی

ہم نے طرح طرح سے اس شعر کو سمجھنے اور معنیٰ پہنانے کی کوشش کی مگر افسوس ہے کہ ناکامی ہوئی، ہوسکتا ہے کہ ہماری فہم کا یہ قصور ہو! اگر زیست جُرم سنگیں ہے تو اس شمع کے بجھنے کے بعد دولتِ روشنی کس طرح ملے گی؟ اول تو زیست کو "شمع جرم" کہنا ایک عجیب سی بات ہے، "جرم کی شمع" کی ترکیب وجدان پر ناگوار گزرتی ہے، پھر زیست کی شمع اگر بجھا دی گئی یا بجھ گئی تو اس کے بعد دولت روشنی کہاں اور کیونکر میسر آئے گی! وہ کس قسم کی روشنی ہے جس کے ملنے کی تمنّا کی جا رہی ہے، پوری نظم پڑھ کر اس کے مرکزی خیال کی بنا پر اس شعر سے یہ مفہوم نکالا جاسکتا ہے کہ اے شاعر! جب تو مر جائے گا اُس وقت تجھے شہرت نصیب ہوگی لیکن اس مفہوم کو جن لفظوں سے ادا کیا گیا ہے" وہ انتہائی ناقص اور ادھورے ہیں!

جوش صاحب کے کلام کے کم و بیش ایک درجن مجموعے چھپ چکے ہیں، آخر کے مجموعوں میں زیادہ تر "اعادہ" ہے، اور اب "اعادہ" کی قوت بھی ختم ہو گئی!

نذیر بنارسی کا یہ مصرعہ بہت ہی خوب ہے ؎ چمن سلامت بہار اک دن طواف کرتی ہوئی ملے گی ـــــ افسوس ہے پہلا مصرعہ

"بہت کمزور ہے" (یہ زرد پتے سمٹ سمٹ کر، سمیٹ ہی لیں گے اپنے بستر —) "مطلع" میں تو قافیہ کی پابندی کے سبب شاعر کو معذور سمجھا جاسکتا ہے مگر نظم غزل اور رباعی کے باقی شعروں میں بہتر سے بہتر "اولی مصرعے" نظم کئے جاسکتے ہیں اور کرنے چاہئیں۔

نازش پرتاب گڈھی کی "نظم" کے کئی شعر محل نظر ہیں:—

ابھی تو سُلگے گا اور دامن بہار کا آتش چمن سے — کچھ اور جھلسے گا صحن گلشن لٹی ہوئی ہر کلی ملے گی

فانی کا شعر ہے:—

بھڑک کے آتش گل تو ہی اب لگا دے آگ — کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

یہاں "آتش" کے لفظ سے ٹھیک کام لیا گیا ہے، فرض کر لیجئے کہ "آتش چمن سے" "دامن بہار" سلگ بھی رہا ہے تو پھر صحن گلشن کے جھلس جانے کے بعد "کلیوں" کا "لٹا ہوا" ہونا ایک مہمل سی بات ہے "آگ کی صفت جھلسا دینا، جلا دینا اور راکھ کر دینا ہے نہ کہ لوٹ لینا"!

نویں شعر کا مصرعہ اولی ہے ؎ محبتوں کے جہاں میں ناچیں گی اور بھی بے فضائیاں سی —— اوّل تو "محبت" کی جمع ہی اس جگہ بہت کچھ قابل غور ہے، پھر یہ "بے فضائیاں" آخر کیا ترکیب ہے! نازش صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنی جولانی طبع کو فکر و تامل کا پابند کریں۔

روشن صدیقی کا یہ شعر کتنا اچھا ہے:—

غروب خورشید پر رہے گا، فروغ شب کا مدار کب تک — یہ سوچتا ہوں کہ ان ستاروں کو کب نئی زندگی ملے گی

جگن ناتھ آزاد کی غزل کا مطلع ہے:—

خیال یہ تھا کہ دل کو تسکین، نگاہ کو تازگی ملے گی — خبر نہ تھی تیرے روبرو بھی مجھے تری ہی کمی ملے گی

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے اور اسی کا محل بھی ہے کہ "تری کمی محسوس ہوگی" مگر اس مفہوم کو ادا ان لفظوں میں کیا گیا ہے کہ "تری ہی کمی ملے گی"! یہ تو بالکل درست ہے کہ اور نفسیاتی کیفیت کی واضح ترجمانی ہے کہ محبوب کے قریب اور روبرو ہوتے ہوئے بھی دل کو کسی طرح قرار نہیں آتا مگر یہ غلط ہے کہ محبوب آنکھوں کے سامنے ہو اور نگاہ کو تازگی نہ ملے، اس میں "حسن" کی "سُبکی" کا پہلو نکلتا ہے۔

جناب عجاز صدیقی نے نامساعد حالات میں "مشاعرہ نمبر" جس فراخ حوصلگی، محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کے لئے اُردو دنیا کی طرف سے وہ ستائش کے مستحق ہیں، طرحی غزلوں اور نظموں کا انتخاب کر لیا جاتا تو یہ کوشش اور نکھر جاتی، ان نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت ضرور آشکارا ہو جاتی ہے کہ اُردو زبان کے شاعر ذہنی طور پر شدید اذیت اور کشمکش میں مبتلا ہیں، کسے خبر تھی کہ آزادی کی جس دن صبح طلوع ہوگی، اُردو دنیا کے لئے وہ شام کا دھندلکا ہوگا۔

ہائے! ؎ کسی کی صبح اپنی شام ہوگی

## اشتراکی روس

"اشتراکی روس —— انتخابات" از — علی احمد خاں — ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت ۳/، ملنے کا پتہ:— مکتبہ چراغ راہ، لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ، کراچی ملا —— سوویٹ روس میں انتخابات کس طرح ہوتے ہیں؟ نامزدگی کا حق کس کو دیا جاتا ہے؟ اس سلسلہ میں آئینی طریق کار کیا ہے؟ —— اس کتابچہ میں ان حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ "اشتراکی خداؤں" جبر و تشدد اور آمریت میں جابر و ظالم شہنشاہوں کو بھی سیکڑوں میل پیچھے چھوڑ گئے، روس میں "حزب مخالف" کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، زبان و قلم پر شدید احتساب ہے، وہاں بس وہی شخص صحیح سلامت رہ سکتا ہے جس نے زمین و آسمان کے خالق —— خدا —— کی جگہ "اسٹالن" کو اپنا "الٰہ" مان لیا ہو، آدمی کو بہر حال بندگی سے کسی عنوان چھٹکارا نہیں مل سکتا، جو خدا کی بندگی سے منہ موڑتا ہے اُسے اپنے جیسے آدمیوں کا بندہ بننا پڑتا ہے، اسلام اور اشتراکیت میں نزاع ہی اس بات پر ہے، اشتراکیت کہتی ہے کہ کارل مارکس، لینن اور اسٹالن کو اپنا "الٰہ" مانو اور اسلام کہتا ہے کہ رب العالمین کو اپنا "خدا" تسلیم کرو۔

جلد (۴) ـــــــ شمارہ (۱۰)

ماھنامہ

# فاران

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر:-

فاران کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

## نظم و ترتیب



### حصۂ نظم

# نقشِ اوّل!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کا وہ طبقہ جس نے اپنی فکر و نظر کو انگلستان، امریکہ اور روس کے بازاروں میں گروِ رکھ دیا ہے، اور جو خدا اور رسولؐ کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر، اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے، اُس طبقہ نے دین سے فرار اور اسلام سے گریز کی ایک عجیب چال اختیار کی ہے ——— وہ یہ کہ جہاں کسی اسلامی حکم اور مذہبی پابندی کا ذکر آیا، بس جھٹ سے تہمت تراش دی کہ یہ "ملائیت" ہے! اسلام کو مطعون کرنے اور دین کو ہدفِ بنانے کے لئے "ملائیت" کی آڑ تلاش کی گئی ہے۔

اس مغرب زدہ اور ہوس پروردہ طبقہ میں اتنی جُرأت تو ہے نہیں کہ وہ اسلام کی کھُل کر مخالفت کر سکے، اس مخالفت سے بہت سے خطرے لاحق ہیں، سب سے بڑا خطرہ اپنی ہر دلعزیزی کو جوکھوں میں ڈالنے کا ہے، عوام مسلمانوں کی برہمی کا خوف ہے! اس کے ماسوا یہ بھی ہے کہ باپ دادا سے جو اسلامی تصورات ورثہ میں ملے ہیں، اُن کی کافروں اور ملحدوں کی طرح مخالفت اور انکار کرتے ہوئے بھی دل جھجک محسوس کرتا ہے، خیال یہ ہے کہ اسلام سے خاندانی وابستگی کا سلسلہ بھی قائم رہے اور ساتھ ہی "ملائیت" کی مخالفت کی آڑ میں دین و شریعت کی پابندیوں پر بھی ہاتھ صاف ہوتا رہے ——— تاکہ

؎ باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی !

اور یہ بھی ؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی ——— جب ضرورت محسوس ہوئی، دل چاہا کسی مصلحت کا تقاضا ہوا تو اسلام کی تعریف میں چند قصیدے تصنیف کر ڈالے اور جب نفس کی خواہشوں نے غلبہ کیا، ذاتی مفاد سامنے آگئے، عیش و تفریح کی بوقلمونیوں نے رجھایا تو اللہ کا نام لیکر، رسولؐ پر درود بھیج کر اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر اعلان فرمایا گیا کہ ان جاہل "ملاؤں" نے اسلام جیسے "متحرک" دین کو "جامد" بنا دیا ہے، اسلام تو سائنٹفک مذہب ہے، اس میں بڑی گنجائشیں اور لامحدود وسعتیں ہیں، یہ قدامت پرست "ملا" دین کو تنگ بنائے دے رہے ہیں۔

یہ جو کہا جا رہا ہے کہ اسلامی دستور کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہونی چاہیئے تو یہ ان "ملاؤں" کی تنگ نظری ہے، یہ اپنی اجارہ داری قایم رکھنے کے لئے اس قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں، اللہ تعالےٰ نے انسان کو جو "عقل" عطا فرمائی ہے، کیا اُس کو ناکارہ بنا کر چھوڑ دیں، ہم نے زبان سے اللہ کی ربوبیت اور محمدؐ کی رسالت کا اقرار کر لیا، بس اور کیا چاہیئے، اس اقرار کے بعد کیا اللہ کی دی ہوئی عقل کو کام میں نہ لائیں، زمانہ ہر آن متغیر ہے، حالات سدا بدلتے ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تیرہ سو سال پہلے کے بنے ہوئے قوانین آج کے تقاضوں کا بھی ساتھ دے سکیں ——— (ان لوگوں نے دین و شریعت کو ریلوے ٹائم ٹیبل سمجھ رکھا ہے کہ جس میں سال کے سال تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، دین و شریعت کے اصول کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنے کو وہ "تجدد و ترقی" اور دین کی "متحرک قوت" سے تعبیر کرتے ہیں، دین و اسلام کی اس قدر کھُلی ہوئی توہین کرنے کے بعد حیرت ہے کہ وہ زبان سے اسلام کی شان میں قصیدے بھی پڑھتے رہتے ہیں)

یہ جو منبر و محراب سے فتوے اور احکام صادر ہوتے رہتے ہیں کہ یہ فرض ہے، یہ سنت ہے، یہ مستحب ہے، یہ مباح ہے، اس طرح ہاتھ پیروں کو دھوؤ، یوں کلی کرو، سر کا مسح اس طرح ہونا چاہیئے، فلاں حرکت سے وضو ٹوٹ گیا، اُس بات کے کرنے سے روزہ جاتا رہا، حج کے لئے جاؤ تو یہ یہ کرو، کہیں رات کا قیام، کسی جگہ نماز، کہیں دوڑ کر چلنا، کسی مقام پر کنکریاں پھینکنا، اور پھر جانوروں کی قربانی ان سب پر مستزاد، لاکھوں روپے کی قیمت کا گوشت بیکار جاتا ہے، یہ سب "ملائیت" اور "رسم پرستی" ہے ——— گردن زدنی ہیں یہ ظالم و جاہل "ملا" کہ اس ترقی و انقلاب کے زمانہ میں، عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا

چاہتے ہیں، پارلیمان کے شہ نشین سے لیکر کلب گھروں کے "بال روم" تک، عورت کے لئے کھول دیئے گئے ہیں کہ وہ جہاں جی چاہے جائے اور اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے، مگر یہ قدامت زدہ لکیر کے فقیر "ملا" عورت کو مردوں سے خلا ملا رکھنے سے منع کرتے ہیں، اور عورت کو جہنم کے طرح طرح کے عذاب سے ڈراتے ہیں کہ نامحرم مردوں سے بے تکلف ہونے، زینت کو ظاہر کرنے، مردوں کی سی وضع بنانے اور دیدہ و نظارہ سے لطف اٹھانے کی یہ یہ سزا آخرت میں دی جائے گی ——

یہ اسلام تھا جس نے ساری دنیا کو بند غلامی سے چھڑایا اور یہ "ملا" ہیں کہ بے چاری عورت کے پیروں میں غلامی کی بھاری زنجیریں اور ان کی گردنوں میں محکومیت کے گراں بار طوق ڈالے دے رہے ہیں، یورپ نے عورت کو آزادی دی اور وہ بام ترقی پر چڑھتا چلا جا رہا ہے، مگر یہ قوم کی ترقی کے دشمن "ملا" اور "مولوی" ہیں کہ اس ترقی یافتہ دور میں اگلے زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں، انھوں نے اسلام کو "جامد دین" بنا دیا ہے، جس میں کسی قسم کی لچک اور لوچ نہیں ہے، ان کو تو اپنی نمازوں، سجدوں، دعاؤں، ڈاڑھیوں، مسواکوں اور ٹخنوں سے اونچے پائچوں پر ناز ہے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ ڈاڑھی منڈوں، بے نمازوں، شراب پینے والوں اور جن کو یہ "ملا" "فاسق و فاجر" سمجھتے ہیں، اُن فاسقوں، رندوں اور گنہ گاروں سے کیسے کیسے عظیم الشان کام لے لیا کرتا ہے، سب سے بڑی عبادت تو قوم کی خدمت ہے، ایک شخص جو قوم کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا ہے، وہ دراصل خدا کی عبادت میں مصروف ہے، چاہے اس کی پیشانی پر ان ظاہری سجدوں کا ایک نشان بھی نہ ہو۔

ان "ملاؤں" اور "مولاناؤں" نے کیسی کیسی حدیثیں گھڑ لی ہیں کہتے ہیں اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہتی ہیں اور اپنے اعضا کو لچکاتی ہوئی چلتی ہیں، جن کی گردنیں بختی اونٹ کی طرح ناز سے ٹیڑھی رہتی ہیں، نہ وہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اُس کی خوشبو پائیں گی —— اور یہ بھی رسول اللہ ہی کا نام لیکر فرمایا جاتا ہے کہ "آنکھوں کا زنا بدنگاہی اور زبان کا زنا گفتگو ہے ——" تو گویا ان ملاؤں اور مولویوں کے کہنے سے بیچاری عورتیں گھروں میں گھٹ کر مر جائیں، اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں، اپنے ہونٹوں کو سی لیں، یہی وہ باتیں ہیں جو اسلام تصویر اور بت تراشی ان ملاؤں کے یہاں ناجائز! گانا بجانا اور ناچنا ان کی شریعت میں ممنوع، گھوڑ دوڑ کی شرطیں ان کے دین میں حرام —— تو پھر "ان" "زاہدانِ خشک" کے یہاں آخر زندگی کی کونسی لذت ہے جو جائز ہے! کہتے ہیں کہ باہر نکلو تو نگاہوں کو نیچی کئے رہو، کسی نامحرم عورت کے چہرے پر دوسری نگاہ ڈالنا گناہ ہے! ان پابندیوں میں جکڑی ہوئی زندگی ایک طرح کی موت ہے، زندگی سے لذت، حسن اور آرٹ کو چھین لیا گیا تو زندگی میں آخر رہ کیا گیا؟ ان ملاؤں اور مولاناؤں کے ہاتھوں میں اگر حکومت کی باگ ڈور آگئی تو بس پھر قوم اور ملک کا خدا حافظ ہے، دو دن میں خاک اُڑنے لگی، شہر کے گلی کوچوں میں یہ برق پاش جلوے، یہ فردوس بداماں نظارے، یہ دیدہ زیب لباس، یہ چہل پہل، یہ گہما گہمی پھر کہاں نظر آسکے گی، آرٹ گیلریاں بند، سینماؤں اور تھیٹر ہالوں پر پہرے، کلب گھروں پر قدغن، مخلوط تعلیم مسدود، ہر گلی کوچہ سے قومی ترقی کے جنازے نکلتے ہوئے دکھائی دیں گے، بیرونی حکومتوں کے سفیروں، نمائندوں اور وفود کو ان سے [illegible] "جیسی تواضع کیا جائیگا، شراب، عورت، رقص و نغمہ جب نہ ہوگا، تو مغرب کے معزز اور مہذب مہمان کس قدر بے لطفی محسوس کریں گے اور کیا عجب ہے کہ سیاسی اور تجارتی تعلقات میں ڈھیل پیدا ہو جائے، متمدن دنیا ہمارے متعلق کتنی خراب رائے قائم کرے گی؟

اس ذہنیت کے لوگ دراصل خدا سے ناراض ہیں کہ اُس نے انسانوں کو پیدا کر کے اخلاقی اصولوں کا پابند کیوں بنا دیا، یہ پابندیاں انسان کی فطری آزادی کے منافی ہیں، آدمی کو عقل دی تھی تو اس عقل کو مطلق آزاد ہونا چاہئے تھا، خدا کا نام لیکر وہ کچھ کہہ نہیں سکتے، اللہ میاں کا غصہ بیچارے "ملا" اور "مولوی" پر اتارتے ہیں" اسلام کے جس قانون پر طنز کرنی چاہی اس کا نام "ملائیت" رکھ دیا۔

ان مخالفِ اسلام" Anti-Islamic [illegible]

کی تائید کے لیے کچھ ایسے ذہین اہلِ قلم بھی پیدا ہوگئے ہیں جو "قرآن فہمی" کے نہ صرف یہ کہ مدعی بلکہ اجارہ دار ہیں اور رسول اللہ کی سنت (قولی و فعلی) کو دین میں قابلِ حجت نہیں مانتے اور اُسے زیادہ سے زیادہ "تاریخ" کے برابر وقعت دینے کے لیے آمادہ ہیں اُن کا کام ہی یہ ہے کہ رسول اللہ ؐ کی احادیث کو مسلمانوں کی نگاہ میں مشتبہ اور بے وقعت بنا دیں، حدیث کی کمزوریوں کو خوب اچھالیں اور اچھائیوں پر پردہ ڈالدیں، مثلاً حضرت عمر فاروقؓ نے حدیثوں کی کثرتِ روایت سے روک دیا تھا، اس کو تو بیان کریں گے مگر خود حضرت عمر فاروقؓ نے رسول اللہ کی احادیث کو دینی مسائل میں حجت بنا کر جو فیصلے کئے ہیں اُن کا جو ہے سے بھی نام نہ لیں قرآن کی تفسیر میں تمام اگلے پچھلے مفسرین کو عام طور پر بے اعتبار ٹھیرائیں اور خود جس طرح چاہیں قرآن کی تفسیر کرتے چلے جائیں۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ؐ کی "سنت" جو قرآنِ کریم کی عملی تفسیر اور منشاء خداوندی کا مظہر ہے، درمیان میں نہ رہی تو قرآن کا صحیح مفہوم کس طرح متعین ہوگا، اور سنتِ رسول کا درمیانی واسطہ نہ رہنے سے بہت سی پابندیاں آپ ہی آپ دور ہو جائیں گی، مثلاً قرآن پاک میں صرف لفظ "صلوٰۃ" آیا ہے، جس طرح نماز پڑھی جاتی ہے یہ پوری ترکیب تفصیل کے ساتھ قرآن میں نہیں پائی جاتی، جب رسول اللہ ؐ کی احادیث سے قطع نظر کر لیا گیا تو اس صورت میں نماز کی ہیئت اور شکل ہی متعین نہ ہو پائے گی زیادہ سے زیادہ قیام، رکوع اور سجود ہو سکے گا اور پھر بھی اس کی دشواری پیش آئے گی کہ نماز آخر شروع کس طرح کی جائے، کھڑے ہو کر آدمی کیا پڑھے، رکوع میں زبان سے کیا کہے یا صرف خاموشی کے ساتھ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکا رہے، اور پھر سجدہ کس طرح کرے؟ یہی حال دوسرے فرائض اور احکام کا ہے کہ "سنتِ رسول اللہ" کا واسطہ اگر درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو احکام کی تشکیل اور فرائض کی ہیئت متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی، کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول اللہ کا رہنا بہت ضروری ہے، ہر متن تشریح و تفصیل چاہتا ہے اور ہر "قانون" میں نظیریں ہوا کرتی ہیں جن کی روشنی میں خود قانون کے نفاذ میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں، "نظایر" (Precedents) کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ "قانون" نامکمل تھا، "نظایر" نے اُسے مکمل بنا دیا، نظیروں اور مثالوں سے خود قانون کے منشاء کی تعمیل کے لئے آسانیاں بہم پہنچتی ہیں، یہی حال رسول اللہ ؐ کی احادیث کا ہے، قرآن کریم "اصل" ہے اور احادیثِ رسول اُس کی فروع ہیں،

اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک میں بُری باتوں اور ناپسندیدہ کاموں کے لئے "فحشا" اور "منکر" کی جامع اصطلاح بیان فرمائی ہے، "زنا" بھی فواحش و منکرات میں شامل ہے، "جرم زنا" کے ثبوت کے لئے کس قسم کی شہادت ضروری ہے، سماعی یا عینی، اس کی تفصیل احادیث بتاتی ہیں، اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی تفصیلات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس ضرورت کو رسول اللہ کی احادیث پورا کرتی ہیں ——

قرآنِ پاک کی آیات جو معاملت و تجارت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اُن کا مجموعی طور پر مفہوم یہ ہے کہ معاہدے کی پابندی کی جائے، ناپ تول میں کمی نہ ہونی چاہیے، کسی کو قرض دیا جائے تو اس کی کتابت بھی کی جا سکتی ہے، مگر بیع و شراء، قرض کے لین دین اور تجارت و معاملت کی بہت سی شکلیں پیش آسکتی ہیں بلکہ آتی رہتی ہیں جن کا قرآن پاک میں مفصل ذکر نہیں ہے، رسول اللہ کی احادیث ان کی طرف نشان دہی کرتی ہیں،

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو "تاریخ" سے زیادہ وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں وہ "قرآن" کے ساتھ بہت بڑا ظلم کرتے ہیں، کیونکہ سنتِ رسول جو قرآن کے منشاء اور مفہوم کا عملی مظہر ہے، جب باقی نہ رہی تو پھر قرآن بازیچۂ طفلاں بن کر رہ جائے گا، ہر شخص جس کی جو سمجھ میں آئے گا اُس کے مطابق قرآن کا مفہوم متعین کر کے عمل شروع کر دے گا —— اور ہم کہتے ہیں قرآن کے سمجھنے میں جب رسول اللہ کی فہم معتبر نہیں ہے (العیاذ باللہ) تو پھر وہ کون ہے جس کی فہم و بصیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

قرآنِ پاک کے یہ شیدائی، جن کا دعویٰ ہے کہ قرآن ہی کی حفاظت کے لئے احادیث کا وہ انکار کرتے ہیں، سب سے پہلے "قرآنِ پاک" ہی پر ہاتھ صاف فرماتے ہیں، "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اطاعتِ رسول" سے "اطاعتِ اللہ" ہی مراد ہے، اور یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے اُن کو ذرہ برابر شرم نہیں آتی اس طرح وہ خدا کے کلام

کو مطعون کر رہے ہیں کہ اللہ پاک، ایک ہی بات کے لئے خواہ نخواہ دو زاید لفظ (اطیعوا الرسول) استعمال کرتا ہے اور بار بار استعمال کرتا ہے، ان کے "فہم قرآنی" کا یہی حال ہے کہ قرآن کی اہمیت جتنا جتنا کر قرآن کے معنیٰ میں تحریف کرتے ہیں، شیطان نے ان کو اس غلط فہمی بلکہ فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ تم پر قرآن کے جن معارف روحانی اور رموز و غوامض کا انکشاف ہوا ہے، وہ آج تک کسی پر نہیں ہوا، پوری اُمت تیرہ سو سال سے اب تک گمراہی پر جمی رہی ہے، تم نے اور صرف تم نے پہلی مرتبہ صراطِ مستقیم کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا ہے ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو " لا الٰہ الا اللہ " تو کہتے ہیں مگر " محمد رسول اللہ " کہنا نہیں چاہتے، رسولؐ کی " سنت " حضور کے " اُسوہ " اور سرکار (علیہ التحیۃ والثناء) کی احادیث " سے ان کو کد ہے، " کبھی کہتے ہیں کہ رسولؐ کی اطاعت منصوص نہیں ہے، کبھی رسالت اور امامت کی تفریق پیدا کرتے ہیں، " اور آخر میں کھل کر کہتے ہیں کہ رسول اللہ کی احادیث دین میں تشریعی حیثیت نہیں رکھتیں " ! جس نے رسول کی سنت کو تشریعی نہ مانا، دوسرے لفظوں میں اُس نے محمد ابن عبد اللہ (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی رسالت کا انکار کیا، اور اُسے " اقرار " مان بھی لیا جائے تو وہ بس نام ہی کا اقرار ہے ! رسالت کے اقرار کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ رسولؐ کی زندگی، سُنت اور اسوۂ حسنہ کو دین میں حجت مانا جائے ۔

احادیثِ رسولؐ جن کو " منکرین حدیث " تاریخ سے تعبیر کرتے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لمحہ قرآنِ پاک ہی کی تلاوت نہیں فرمایا کرتے تھے، اور عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے ! احادیث بتاتی ہیں کہ رسول اللہ، صحابہ کرام کو قرآنی آیات کے معنیٰ بتاتے تھے بہت سے مسائل میں حکم دیتے تھے کہ یہ کرو یہ نہ کرو، یہ ثواب کا کام ہے اور یہ گناہ کا فعل ہے، ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی " اور اس فعل سے اللہ ناراض ہوگا، یہ کام جنت کی طرف لے جائے گا اور اس حرکت کی پاداش میں دوزخ کا عذاب ملے گا ! ان میں معاشرت اور معاملت کے احکام ہی نہیں فیصلے بھی ہیں ———— آخر رسول اللہ کے ان احکام اور فیصلوں کی کیا صرف اتنی ہی اہمیت ہے کہ ان کو قصوں کہانیوں کی طرح پڑھ کر گزر جائیں ! کیا محمد ابن عبد اللہ صرف اُسی وقت تک منصبِ رسالت پر فائز رہتے تھے، جب تک آپ قرآن کی آیتوں کی تلاوت فرماتے رہیں، نزولِ وحی اور تلاوت آیات کے بعد رسالت کا منصب (خاکم بدہن) آپ سے چھین لیا جاتا تھا ؟ اگر لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے تو خدا کی قسم وہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ مذاق اور تمسخر کرتے ہیں اور رسالت کے منصب کو انھوں نے بچوں کا کھلونا سمجھ رکھا ہے کہ ابھی دیدیا اور ابھی چھین لیا ۔

اس مفروضہ کو تھوڑی دیر کے لئے دل پر جبر کر کے ٹھیک مان لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عقل اور فہم کے مطابق فیصلے فرماتے اور احکام دیتے تھے، یعنی بہ حیثیت رسول کے نہیں، بہ حیثیت بشر کے ! تو پھر ہم دریافت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی عقل و فہم سے بڑھ کر اور کس مسخرے کی عقل ہے، جسے ہم فہم رسول پر ترجیح دیں ! وہ کون " دانائے راز " ہے جو دین اور کتاب کے مسائل کو رسول اللہ سے بہتر سمجھتا ہے، جس پر خود وحی آتی تھی، وہ قرآن کے مفہوم کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا تھا، یا یہ " چکڑالوی " " جیراج پوری " اور " بٹالوی " زیادہ بہتر سمجھتے ہیں ۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے " قرار داد مقاصد " میں جو یہ کہا تھا کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد " کتاب و سنت " پر ہوگی، تو یہ " منکرینِ حدیث " طعن کر رہے ہیں کہ تم نے کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول اللہؐ کا دم چھلاّ کیوں لگا لیا (نعوذ باللہ) دستور کی بنیاد صرف " کتاب اللہ " پر ہونی چاہیئے، اور کتاب اللہ سے دستور مرتب کرنے کے لئے وہ تیار ہیں ————

ان لوگوں سے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ضرورت سے بہت زیادہ عقل عنایت فرما دی ہے، کوئی پوچھے کہ اسلامی حکومت کا دستور پورے کا پورا لکھا ہوا تو قرآن کے اندر موجود ہے نہیں ! تم کو لامحالہ قرآن کے احکام سے اخذ، اقتباس، استخراج اور استنباط کر کے دستور بنانا پڑے گا، اور اس استخراج و استنباط میں بہر حال تمہاری اپنی " عقل " بھی شریک ہوگی، تو وہ مسائل جن کو تمہاری " عقل " مستنبط، مستخرج اور مقتبس کرے گی، آخر اُن کی دین میں کیا حیثیت ہوگی ؟ کیا اُن کو " ادب " " تاریخ "

اور "قصص" کا درجہ دیا جائے گا، اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر کوئی ایسا دستور مرتب ہی نہ ہو پائے گا، جو پورے کا پورا تسلیم کیا جا سکے ــــــ اور جس دستور کو تم "قرآن" سے مرتب کروگے وہ قابلِ نفاذ اور مستحق اطاعت ہے تو پھر تمھاری "عقل" اور "فہم" کی اگر اطاعت کی جا سکتی ہے اور اس کا فیصلہ آئینی طور پر حجت بن سکتا ہے تو پھر رسول اللہؐ کی "فہم" اور اس کے فیصلے حجت کیوں نہیں بن سکتے، رسول کی سنت سے تم کو آخر اس قدر دشمنی اور بیزاری کیوں ہے؟ احادیث رسول کو تم نے اس درجہ بے وقعت کیوں سمجھ رکھا ہے؟ ــــــ ہم یہ نہیں کہتے کہ احادیث کی کتابوں میں جو روایتیں لکھی ہوئی ہیں اُن کا حرف حرف قرآن کی طرح محفوظ، صحیح اور واجب التعمیل ہے، ہماری گزارش یہ ہے کہ جو احادیث صحیح اور معتبر ہیں، جو قرآن کے منشاء کے مطابق ہیں اور جو نبوت کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں اُن کی تو بے قدری نہ کرو، موتیوں اور کنکریوں کو ایک ہی جیسا سمجھو جہاں ملاوٹ دکھائی دے، کنکریوں کو پھینک دو اور موتیوں کو چن لو، وہ بھی احمق ہے جو موتیوں کے ساتھ کنکریوں کو بھی ایک ہی دھاگے میں پرو لیتا ہے اور وہ احمق تر ہے جو کنکریوں کے ساتھ موتیوں کو بھی ناکارہ سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔

کتاب اللہ کے بعد اسلامی حکومت کی دستور سازی میں سب سے زیادہ جو چیز معین، مددگار اور مفید ثابت ہوگی وہ رسول اللہؐ کی احادیث اور آپ کی سنت ہے کہ حضورؐ خود بہ نفس نفیس اسلامی اسٹیٹ کے حاکم اعلیٰ تھے، پھر خلفائے راشدین کا دور آتا ہے، یہ نفوسِ قدسیہ رسول اللہؐ کے تربیت یافتہ تھے، قرآن کو انھوں نے خود مہبطِ قرآن سے پڑھا اور سمجھا تھا، فہم قرآن میں رسول کے بعد سب سے زیادہ مستند یہی لوگ ہیں، ان کے دور میں اسلامی حکومت بہت وسیع ہو گئی تھی، نئے نئے تمدنوں، نئی نئی قوموں، ملکوں اور نئے نئے حالات اور مسائل سے واسطہ آ کر پڑا مگر صحابہ کی فہم نے کتاب و سنت کی روشنی میں تمام مسائل کا حل تلاش کر لیا، یہ بزرگ انتہائی دیانت دار، راستباز اور اللہ سے ڈرنے والے تھے، ان کے فیصلے بے لاگ ہیں جن میں ہمارے لئے بہت کچھ روشنی ہے ــــــ ائمہ فقہ کے اجتہادات بھی دستور سازی میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں مگر یہ اجتہادات "کتاب و سنت" کے احکام اور اُصول کی طرح ابدی اور ناقابلِ تبدیل نہیں ہیں، ان سے اختلاف ممکن ہے، ان کو بدلا جا سکتا ہے ــــــ لیکن اس قسم کی ذہنیت بھی مضرت سے خالی نہیں کہ چونکہ ان اجتہادات کو ایک زمانہ ہو چکا ہے، اب حالات اور ہیں، چاہے حالات کا تقاضا نہ ہو، پھر بھی اُن میں کاٹ چھانٹ کر کے کچھ "ایجادِ بندہ" کا رنگ پیدا کر دینا ضروری ہے۔

اسلامی دستور کی تسوید، تبیض اور تشکیل میں اسی ترتیب سے کام لینا ہوگا، اور جہاں ضرورت پیش آئے گی وہاں کتاب و سنت کے منشا، دین کے مزاج اور اسلام کی فطرت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے "اجتہاد" بھی کیا جائے گا، نبوت اور رسالت کا دروازہ بند ہو چکا ہے مگر اجتہاد کی راہ کھلی ہوئی ہے، مگر یہ بھی خیال رہے کہ "اجتہاد" کتاب و سنت کے احکام کو نہیں بدل سکتا، "اجتہاد" تو اُسی صورت میں ہوتا ہے، جب کتاب و سنت کا حکم اور فیصلہ زیادہ واضح نہیں ہوتا، یا اُس کے لئے کوئی نظیر ہی نہیں ملتی۔

مجتہد کے لئے کتاب و سنت سے آگاہی، دین و شریعت کے مزاج سے مناسبت اور ساتھ ہی صاحبِ تقویٰ ہونا ضروری ہے، خوفِ خدا اور اسلامی کردار نہ ہو تو محض "علم و آگہی" بھی "اجتہاد" کے لئے کافی نہیں ہیں، اسلام ایسے مجتہدوں سے پناہ مانگتا ہے، جو اپنے "اجتہادات" پر فخر کرتے ہوں جس طرح ہائی کورٹوں کے مقنن اور دستور ساز اسمبلیوں کے ارکان اپنے کارناموں پر فخر کیا کرتے ہیں ــــــ اسلام کے مجتہدین تو "اجتہاد" کرتے ہوئے لرز لرز جاتے ہیں کہ کہیں ہم سے غلطی نہ ہو جائے، ہماری بھول چوک خدا کے بندوں کو کسی گمراہی میں مبتلا نہ کر دے، "اجتہاد" سے اگر دین و شریعت کا کوئی اصول ٹوٹتا ہو تو وہ اجتہاد حقیقت میں "فساد" ہے اور ایسے "مفسدین" جو قرآن کی آیتیں پڑھ کر، اسلام کی حفاظت اور دین کی تبلیغ کا ڈھنڈورا پیٹ کر اجتہاد کرتے ہیں، وہ اللہ کی زمین میں فساد و گمراہی پھیلاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو "قرآن، قرآن" پکارتے ہیں،

مگر قرآن کا ایک حرف بھی اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔

ایک اہلِ قلم جو "قرآن فہمی" کے اپنے کو سب سے بڑا کنٹریکٹر ( Contractor ) سمجھتے ہیں اور جن کے فکر و عمل کی تمام قوتیں، احادیثِ رسول کو مطعون کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "قراردادِ مقاصد" میں اسلامی دستور کی بنیاد جو "کتاب و سنت" کو قرار دیا گیا، اس میں "سنت" کا اضافہ کرکے مجلسِ دستور ساز نے بڑی غلطی کی ——— گویا ان "صاحب" کے نزدیک دین، شریعت، معاشرت اور دستور و سیاست پر اگر کہیں بھولے سے بھی رسول اللہ کی سنت کی پرچھائیں پڑ گئی، تو بس وہیں معاملہ خراب ہو گیا، مسلمانوں میں سارا فساد رسول اللہ کی "سنت" نے برپا کر رکھا ہے، اس کی جڑ جس طرح ممکن ہو کاٹ دینی چاہیئے، ان "ذاتِ شریف" کو اگر اسلام کی بدقسمتی سے اختیار مل جائے تو سب سے پہلے وہ احادیث کی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دریا برد کر دیں اور پھر آرڈی ننس جاری فرما دیں کہ جو کوئی مسلمان رسول اللہ کی سنت پر عمل کرے گا اُس کو سزا دی جائے گی تاکہ دین اپنی اصلی حالت پر عود کرکے قرآن کی طرف آجائے (ہم اس قسم کے تصورات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) ان صاحب کو رسول اللہ کی سنت اور حضور کی احادیث سے جو عداوت اور بیزاری ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا!

"معارفِ قرآنی" کے اس "مکتشفِ اعظم" کے نقطۂ نگاہ سے پوری اسلامی دنیا میں ایک عالمِ دین بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسلامی دستور کی تشکیل میں اس کے مشوروں کو اہمیت دی جائے کیونکہ ہر عالمِ دین رسول اللہ کی سنت کو دین میں حجت سمجھتا ہے اور ہر عالم کی نگاہ میں کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول اللہ ہی معتبر ہے ——— تو اس صورت میں اسلامی دستور بنانے کی اہل صرف ان ہی "صاحب" کی شخصیت رہ جاتی ہے، نہ رسول اللہ کی احادیث معتبر، نہ خلفائے راشدین کے آثار قابلِ تقلید، نہ ائمہ مجتہدین کے مشورے اور فیصلے کارآمد، یہ پورا سلسلہ ہی (معاذ اللہ) غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہے، ان "صاحب" کے خود ساختہ اسلامی تصور کی بنا پر خلافتِ راشدہ کا نظامِ حکومت ہی کب صحیح اور معتبر قرار پاتا ہے، کیونکہ خلفائے راشدین نے رسول اللہ کی سنت کو دینی مسائل میں حجت ٹھیرایا ہے!

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے فرشتے تو بھیجے نہ تھے کہ وہ قرآنی تعلیم کو عام کریں، "معروف" کو پھیلائیں اور "منکر" سے روکیں، اس فرض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے ذریعہ انجام دیا، حضورؐ قبایل کے وفود کو شرفِ باریابی بخشتے تھے، کافروں سے جنگ اور صُلح فرماتے تھے، علاقوں میں حاکموں کو بھیجتے تھے، معاشرت کے مسائل میں حکم دیتے اور فیصلے صادر فرماتے تھے، اور ظاہر ہے کہ یہ تمام تفصیلات "قرآن" میں لکھی ہوئی نہ تھیں، ہم دریافت کرتے ہیں کہ حضورؐ کے ان فیصلوں کی دین میں آخر کوئی اہمیت ہے یا نہیں؟ یہ فیصلے قرآنی تعلیمات کے تحت صادر ہوتے تھے یا اُس سے مغایر تھے؟ اگر مغایر تھے تو اس کے معاذ اللہ یہ معنیٰ ہوئے کہ خود رسول اللہ کا طرزِ عمل قرآن سے مخالف تھا اور اگر یہ فیصلے قرآنی تعلیمات کے مطابق تھے تو رسول اللہ کے ان فیصلوں کو کیا ہم ہنگامی اور وقتی سمجھ کر اُن سے اعتنا نہ کریں؟ کیا اُن میں "مثال" اور "نظیر" بننے کی بھی صلاحیت نہیں ہے؟ کیا وہ اس قدر عاجل اور گریزپا تھے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد ہی اُن کی اہمیت جاتی رہی؟ اور یہ جو اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی تعلیم دی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) یہ کوئی شاعری فرمائی تھی" اسوۂ حسنہ" کے تذکرے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، اللہ کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ایہا الناس! قرآن پڑھو، خود سوچو اور جو کچھ تمہاری عقل بتائے اُس پر عمل شروع کر دو، یہ محمدؐ ابن عبداللہ جن پر ہم نے قرآن نازل کیا ہے، قرآن تم تک پہونچا چکے ان کا کام ختم ہو گیا، اب

جو کچھ ہے وہ قرآن ہے اور تمہاری عقل ہے! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا تو اقرار کرنا، مگر دیکھنا! ان کے کسی عمل، قول، فعل اور سنت کی تقلید نہ کر بیٹھنا، تم کو صرف قرآن کے اتباع کی تعلیم دی گئی ہے، رسول کا فعل "غیر قرآن" ہے اور جو چیز "غیر قرآن" ہے وہ ظن ہے اور "ظن" کی پیروی جایز نہیں ــــــ ہائے یہ بیچارے مولانا اسلم جیراج پوری، اور علامہ پرویز بٹالوی جن کی حسرتوں، اُمیدوں اور تمناؤں کا اللہ میاں نے خون کر دیا کہ وہ نہیں کہا، جو یہ چاہتے ہیں! بلکہ یہ لوگ "حدیث دشمنی" کی جس انتہا پر پہنچ چکے ہیں، اُس کا تو یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو بھی کیوں بھیجا، قرآن شریف لکھا لکھایا، مکہ کی کسی پہاڑی پر رکھ دیا جاتا، بس اللہ اللہ خیر سلا! خدا کے سوا کسی درمیانی شخصیت کا تصور اور واسطہ ہی نہیں رہتا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا تو اُس میں اطیعوا اللہ کے ساتھ "اطیعوا الرسول" کا بھی پیوند لگا دیا، اس طرح ہم "حاملانِ قرآن" کی مشکلوں میں اور اضافہ ہو گیا، کہ ہم لوگ یہ بات ثابت کرتے کرتے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں کہ "اطیعوا الرسول" سے بھائی مسلمانو! "اطیعوا اللہ" ہی مراد ہے ــــــ اور یہ کم بخت "سنت زدہ" مسلمان ہیں کہ کسی طرح سمجھ ہی نہیں پاتے! اور اس "اسوۂ حسنہ" کے ذکر نے ہمیں اور پریشانی میں ڈال دیا مگر قرآنی بصیرت کے قربان جائیے کہ اس کی بھی تاویل ہمیں مل گئی، ہم لوگوں سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمیشہ ہمیشہ کے قابلِ اتباع نہیں ہے، وہ ایک وقتی چیز تھی ختم ہو گئی، اُس کی حیثیت بس ایک "تاریخ" کی ہے ــــــ مگر ایک مشکل اور آن پڑی وہ یہ کہ کفار اور مشرکین کے سامنے جب قرآن پڑھا جاتا تھا تو وہ بھی قرآن کو قصہ وحکایت اور اساطیر الاولین کہا کرتے تھے، کیا کریں کیا نہ کریں، ایک تاویل جیسے تیسے بن پاتی ہے، تو قرآن ہی کی کسی دوسری آیت سے بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے، اے قرآن! اپنے حامیوں اور پیروی کرنے والوں کی مدد فرما! ہم اس قدر یک رنگی اور خلوص کے ساتھ تیری خدمت کریں گے کہ لوگوں کے ذہن شاید اس کو بھی بھول جائیں گے کہ "قرآن" کسی پر نازل بھی ہوا تھا؟

ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں اسلامی دستور کے سلسلہ میں "امارت" کا جو ایک خاکہ پیش فرمایا گیا ہے، اُس کے بارے میں ہم یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا وہ پورے کا پورا قرآن ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس "غیر قرآن" کو پیش کرنے کی آپنے جُرأت کس طرح کی؟ فرض کر لیجیے حکومتِ پاکستان آپکے پیش کئے ہوئے دستوری خاکہ کو اپنے کانسٹی ٹیوشن میں شامل کر لیتی ہے، تو کیا اس دستور کا اتباع مسلمانوں پر ضروری ہو گا؟ ــــــ

اس کا جواب بہرحال "اثبات" ہی میں ملے گا ــــــ تو ہم موٹی عقل کے نیازمند یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلامی دستور کی تسوید وتشکیل میں اگر آپ کی "عقل" کا اعتبار ہو سکتا ہے تو کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "فہم" کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا؟ اور قرآن کے ساتھ "سنت" کو دستور کی بنیاد بنانے سے کیا قرآن کی نفی ہو جائے گی؟

قرآنِ پاک بلاشبہ تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اور ہدایت وسعادت کا مرکز ہے، مگر رسولؐ کی احادیث قرآنی تعلیمات کی تفصیل ہی تو پیش کرتی ہیں، یہ تفصیل "عینِ قرآن" نہیں ہے مگر "غیر قرآن" بھی نہیں ہے، بلکہ "ظلِ قرآن" ہے اسی لئے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسولؐ کے اخلاق کو "قرآن" کہا تھا، رسول اللہ کی زندگی قرآن کا یقیناً پرتو تھی، قرآن کے لفظوں میں جو کچھ لکھا تھا، رسول کی زندگی میں وہ بولتا اور چلتا پھرتا نظر آتا تھا ــــــ قیامت ہے کہ اسلامی دستور کی ترتیب وتشکیل پا رہا ہو، اور ایک مسلمان اس پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو کہ تم نے قرآن کے ساتھ "سنت" کو دستور کی بنیاد کیوں قرار دیدیا ــــ

اگر رسالہ "طلوعِ اسلام" کے صفحات پر دستوری خاکہ پیش کرنے والے کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآنی بصیرت سے کام

لیکر اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کر سکتا ہے، اور دستور کی تسوید و تشکیل میں اس کی اپنی "فہم" بھی شریک کار رہ سکتی ہے، تو کیا ان لوگوں سے محض اس بنا پر یہ حق چھین لیا جائے گا اور وہ دستور سازی کے قابل نہ سمجھے جائیں گے کہ یہ لوگ قرآن کے بعد رسولؐ کی سنت سے روشنی حاصل کرتے ہیں، پھر خلافتِ راشدہ کی مثالوں کو دلیل راہ بناتے ہیں، اُس کے بعد ائمہ مجتہدین کے فیصلوں پر غور کرتے ہیں، اور اس پورے سلسلہ کی روشنی میں، جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں "اجتہاد" کو بھی کام میں لاتے ہیں ——— اگر "طلوعِ اسلام" کے چند صفحوں سے "دستور سازی" میں رہنمائی اور مشورت کا کام لیا جا سکتا ہے تو موطا، بخاری، مسلم، ابو داؤد، کتاب الخراج، ہدایہ اور اسد الغابہ سے کیا یہ کام نہیں لیا جا سکتا؟ ——— اللہ تعالیٰ اور جو چاہے مرض لگا دے مگر کسی کو جہالت کے کبر اور نادانی کے غرور میں مبتلا نہ کرے، اس مرض میں ہر چیز اُلٹی ہی نظر آتی ہے، دماغ کا سانچہ ہی بگڑ جاتا ہے! "زعم ہمہ دانی" اور "غرورِ عقل" کے موڑ پر شیطان انسان کو بڑی آسانی سے پچھاڑ دیتا ہے کیونکہ شیطان خود اسی "انانیت" کے ہاتھوں "لعین" و "رجیم" بن چکا ہے، اور اُس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ دوسرے بھی میری طرح ہو جائیں، ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں اور اُس کے احکام کے آگے اپنی عقل کی عاجزی کا اقرار کرتے ہیں!

ہم کہتے ہیں اور خدا کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ جس طرح "رسالت" سے "توحید" کی نفی نہیں ہوتی، اور رسالت اور توحید میں کسی طرح کا ٹکراؤ نہیں ہے، اسی طرح رسولؐ کی "سنت" اور "کتاب اللہ" کے مابین کوئی تصادم نہیں ہے ـ جس طرح "موحد" رسالت پر اقرار لانا ضروری ہے . اسی طرح "کتاب اللہ" پر ایمان رکھنے والے کو احادیثِ رسول پر یقین لانا بھی لازم ہے، احادیثِ رسولؐ کے منکر کو قرآنی فہم کی ایک رمق بھی میسر نہیں آ سکتی۔

ع　　محمدؐ عربی کآبروئے ہر دو سراست
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ اُو

اس "ذہنیت"[۱] کا "مفسرِ قرآن" اللہ کی کتاب کو اپنی عقل اور قلم کے زور سے "الف لیلہ" اور "طلسم ہوش ربا" بنا کر قوم کی گمراہی کا سبب تو بن سکتا ہے، مگر کسی کے دل میں ایمان کی ایک کرن بھی نہیں چمکا سکتا! ——— ہمیں وہ دستورِ حکومت اور ایسا نظامِ حیات نہیں چاہیئے جس میں رسول اللہ کی سنت اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ جلوہ گر نہ ہو!۔

---

[۱] "منکرِ حدیث"!

امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ:- خالد بھوپالی

# مقدس منشور

## جسمیں اخلاق وانسانیت کا امتزاج پایا جاتا ہے!

استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے احکام کو اپنی خواہشات پر مقدم سمجھو!
(امام غزالیؒ)

"طلبِ جنت بدونِ عمل گناہ ہے"
(خواجہ حسن بصریؒ)

امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کے ایک شاگرد نے خط لکھا جس میں استدعا کی کہ ایسی نصیحتیں فرمائی جائیں جو مدت العمر کار آمد ثابت ہوں، امام صاحب نے اُس کا جواب لکھا جس کا اقتباس اُردو میں ہم پیش کرتے ہیں:-

**محبِ عزیز!** خدا تمھاری عمر اپنی عبادت وطاعت کے لیئے دراز کرے اور تم مقربین کی راہ چلو، یاد رکھو کہ تمام نصیحتیں معدنِ رسالت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل ہوا کرتی ہیں۔ اگر تم نے حضورِ انور کے کلام مبارک سے کچھ حاصل کرلیا ہے تو پھر میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے اور اگر کچھ حاصل نہ کیا تو بھلا اتنے عرصے میں کیا کیا۔

**فرزندِ عزیز!** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتوں میں سے ایک یہ نصیحت ہے کہ بندے کے خدا سے اعراض کی یہ علامت ہے کہ وہ فضول باتوں میں مصروف رہے، اگر اس کی عمر کا حصہ ان باتوں میں گزرا جن کے لیئے وہ پیدا نہ ہوا تھا تو یہ زیادتی حسرت وافسوس کا سبب ہے۔ اور جس کی عمر چالیس برس سے گزر گئی اور نیکیاں بُرائیوں سے زیادہ نہ ہوئیں تو وہ جہنم کی تیاری کرلے،

**عزیزمن!** نصیحت کرنا آسان ہے مگر عمل کرنا دشوار ہے۔ ہوا پرستوں کو نصیحت بُری معلوم ہوتی ہے البتہ منہیاتِ شرعی کا گرویدہ ہونا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

وہ طالبِ علم جو علومِ رسمی سے فارغ ہوکر دنیاوی عزوجاہ کے طالب ہوجاتے ہیں ان کا یہ خیال ہوتا ہے

کہ علم نجات کا بڑا ذریعہ ہے اور اس خیال کی بدولت عمل کو چھوڑ بیٹھتے ہیں (نعوذ باللہ منہا) یہ بیوقوف نہیں سمجھتے کہ تحصیلِ علم سے اور اتمامِ حجت ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "آخرت میں سب سے زیادہ الم اُس عالم کو ہوگا جس کو اللہ نے علم سے کچھ فائدہ نہ پہنچایا ہو۔

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا خبر ہے؟ بولے "اشارات و عبارات کچھ بھی کام نہ آئے، البتہ جو چند رکعتیں آدھی رات کو پڑھتا تھا انھوں نے کام دیا۔

فرزندِ عزیز! اعمال سے مفلس، احوال سے خالی، معانی سے بے خبر نہ رہنا اور اس کو یاد رکھو کہ محض علم نجات کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، دیکھو ایک شخص مسلح ہو کر جنگل گیا راستے میں شیر مل گیا تو کیا بغیر اسلحہ کے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے لاکھ مسائل یاد کر لئے، اور عمل ایک پر بھی نہ کیا تو وہ مسائل اس کے کس طرح کار آمد ہو سکتے ہیں۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص پر حرارت اور صفرا غالب ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا علاج سکنجبین اور آبِ جَو ہے، پھر بغیر علاج وہ کیونکر اچھا ہو سکتا ہے ؎

گر مے دو ہزار رطل پیمائی		تا مے نخوری نہ باشدت شیدائی

فرزندِ عزیز! اگر تم سو برس تحصیلِ علم کرو اور ہزار کتابیں جمع کر لو تو بغیر عمل کے تم اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ خدا فرماتا ہے "انسان کے لیے وہی ہے جو کوشش کرے۔ اور فرماتا ہے "جس کو اللہ کے ساتھ بقا کی اُمید ہو اُس کو چاہیئے کہ نیک کام کرے۔ نیز فرمایا "ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اُن کو جنّت الفردوس دی جائے گی۔ اور ایک جگہ فرمایا "پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نمازیں کھوئیں اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پس ان کی گمراہی اُن کے آگے آئے گی مگر جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔

فرزندِ عزیز! بھلا اس حدیث میں کیا کہو گے کہ آپ نے فرمایا "اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے:۔
(۱) اس کی شہادت کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں (۲) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں (۳) پابندیِ نماز (۴) ادائے زکوٰۃ (۵) رمضان کے روزے اور بشرطِ استطاعت حج۔ اور ایمان یہ ہے کہ اقرار زبانی تصدیق قلبی اور ادائے اعمال۔ اور اس کی دلیلیں بیشمار ہیں۔ تم کو غالباً یہ خیال ہو کہ اعمال سے جنت نہیں ملے گی۔ یہ ٹھیک ہے، جنّت تو اللہ کے فضل و احسان ہی سے ملے گی مگر باعثِ انعام ادائے اطاعت و عبادات ہیں، خدا ہی فرماتا ہے "اللہ کی رحمت نیکو کاروں کے قریب ہے" اگر کوئی کہے کہ جنّت محض ایمان ہی سے ملے گی، تو اسے ہم بھی مانتے ہیں مگر کب ملے گی۔ بہت سی گھاٹیاں دشوار گزار ہیں۔ وہاں مشکل سے رسائی ہوگی۔ پہلی خندق تو ایمان کی ہے پہنچتے پہنچتے مفلس ہو جائیں گے۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے "خدا قیامت کے دن فرمائے گا جنّت میں میری رحمت سے داخل ہو اور اپنے اعمال کے لحاظ سے مدارج حاصل کرو۔

فرزندِ عزیز! جب تک عمل نہ کرو گے اجر سے محروم رہو گے۔ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ستّر برس عبادت کی۔ ایک بار اس نے دعا کی "اے اللہ مجھے فرشتوں کے ساتھ کر دے" اللہ نے ایک فرشتے کو بھیجا اور فرمایا

"کہ اس سے کہہ دو کہ اس عبادت سے تو جنت کا اہل نہیں ہو سکتا" عابد نے عرض کیا "کہ ہم تو عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں عبادت کیے جائیں گے" فرشتے نے جا کر عرض کیا "الٰہی تو اس کے جواب سے واقف ہے۔ فرمایا" جب وہ میری طاعت اور عبادت سے اعراض نہیں کرتا تو میں اپنے کرم و احسان سے اس کو کس طرح محروم چھوڑ دوں" میرے فرشتو! تم گواہ رہو کہ میں نے اس کی مغفرت فرمائی" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "حساب کر لو قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کو تول لو قبل اس کے کہ وہ تولے جائیں"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا ہے "جو یہ خیال کرے کہ بغیر اعمال کے جنت ملے گی وہ آرزومند ہے، اور جو یہ سمجھے کہ اعمال سے ملے گی وہ محنتی ہے۔

حضرتِ خواجہ حسن بصری علیہ الرحمۃ نے فرمایا "طلبِ جنت بدونِ عمل گناہ ہے" ایک بزرگ کا قول ہے کہ "مرتبۂ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کو اور ان کے ثواب کو نہ دیکھو، بلکہ عمل کیے جاؤ" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "سمجھدار وہ شخص ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے اور مابعد موت کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو خواہشات کا پابند ہو اور پھر اللہ سے اُمید رکھے"

فرزندِ عزیز! مدتوں راتوں کو مطالعہ کیا، تکرارِ علم بھی کی اور جاگنے کی تکلیف گوارا کی مگر میں نہیں جان سکتا کہ اس سے تمہارا کیا مقصود تھا۔ اگر تمہاری نیت حصُولِ عزوجاہ منصب وحشم، زینت و ترقی دنیا سے وابستہ تھی تو تم پر ہزار و صد ہزار افسوس ہے اور اگر مقصد احیاء شریعت سننِ نبویہ اور تہذیبِ اخلاق، اور کسرِ نفس وغیرہ تھا تو میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں، کسی نے کہا ہے ؎

بجز مشغول کنم دیدہ و دل را کہ مدام   دل ترا می طلبد دیدہ ترا می خواہد

اے فرزند، جس قدر جی چاہے عیش کر لو کیونکہ تم مرنے والے ہو، جس کو چاہو دوست بناؤ کیونکہ تم جدا ہونے والے ہو اور جو چاہے کرو تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا"

فرزندِ عزیز! تم کو تحصیلِ علمِ کلام، منطق، طب، شاعری، نجوم، اور نحو و صرف سے کیا حاصل ہوا خدا کی عزت و جلال کی قسم میں نے انجیلِ مقدس میں دیکھا کہ اللہ نے فرمایا ہے "اے بندے تو نے مخلوق کے دکھلانے کی وجہ سے اپنی زینت و نمائش کی، اور اس میں برسوں ختم کر دیے لیکن میری نظر گاہ کو کبھی پاکیزہ اور صاف نہ بنایا، تجھے میرے سوا اور کسی سے کیا غرض، تیرے لیے ساری بھلائیاں میرے پاس ہیں"

فرزندِ عزیز! علم بدونِ عمل جنون ہے اور عمل بغیر علم غیر ممکن ہے، اور یقین کر لو کہ جو علم تم کو اس دنیا میں گناہوں سے باز نہ رکھے اور عمل کی توفیق نہ دے وہ تم کو جہنم کی تکالیف و مصائب سے بھی نہیں بچا سکتا۔ پس اگر آج تم نے عمل نہ کیا کل تم یہ کہو گے فارجعنا نعمل صالحاً اے اللہ ہم کو دنیا میں واپس بھیجدے تاکہ ہم نیک کام کر آئیں، اسپر تم کو یہ جواب ملے گا کہ "احمق وہیں سے تو آیا ہے"

فرزندِ عزیز! ہمت بلند کرو اور نفس کو مغلوب کرو، تمہارا مستقر قبر ہے، اور مُردے ہر وقت تمہارے منتظر ہیں تم کو چاہیئے کہ بلا توشے کے ان سے نہ ملو،

حضرتِ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے "یہ اجسام ایسے ہیں جیسے جانوروں کے پنجرے یا چوپایوں کے اصطبل، اب تم سوچ لو کہ تم کس میں ہو اگر پرندوں کے پنجروں یا آشیانوں کی طرح تمہاری رُوح مقید ہے تو اُمید

ہوتی ہے کہ تم پرواز کر کے پہونچ جاؤ گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ کا عرش سعدؓ بن معاذؓ کی موت سے لرز گیا" اور اگر نعوذ باللہ چوپایوں کے اصطبل کی طرح تمھاری روح مقید ہے تو مصداق اولٰئک کالانعام بل ھو اضل ہے۔ اپنی خانقاہ یا مکان سے سیدھے جہنم کی راہ چلے جاؤ"

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بار ٹھنڈا پانی دیا گیا آپ نے پیالہ ہاتھ میں لے لیا اور بےہوش ہو گئے۔ پھر پیالہ بھی ہاتھ سے چھٹ گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا ماجرا تھا، فرمایا "مجھے جہنمیوں کی وہ خواہش یاد آئی جب وہ اہلِ جنت سے کہیں گے کہ ہم کو بھی تھوڑا سا پانی یا جو کچھ خدا نے تم کو دیا ہو دو، وہ کہیں گے "اللہ نے کفار اور منکرین پر اس کو حرام کیا ہے۔

فرزندِ عزیز! اگر صرف علم کافی ہوتا اور عمل بیکار ہوتا تو وہ ندائے رحمت جو پچھلی رات کو ہوتی ہے کہ کیا کوئی سوال کرنے والا یا توبہ اور استغفار کرنے والا ہے جو اپنے خالق سے سوال کرے، بیکار ثابت ہوتی۔

احادیث صحیحہ میں ہے کہ پچھلی رات کو اللہ تعالیٰ پکارتا ہے "کہ کیا ہے کوئی کاتب یا کوئی سائل" اے فرزند! کیا یہ آواز ان لوگوں کے لیے ہے جو پڑے سویا کرتے ہیں اور اس کی اطاعت اور عبادت سے غافل ہیں، نہیں! بلکہ یہ آواز ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو مصداق کانوا قلیلاً من اللیل ما یھجعون ؕ ہیں۔ یعنی رات کو کم سوتے ہیں اور صبح کو استغفار کرتے ہیں" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر ہوا آپؐ نے فرمایا "آدمی تو اچھا ہے کاش اگر تہجد کی نماز پڑھتا" نیز آپ نے فرمایا "کہ رات کو زیادہ نہ سویا کرو کیونکہ سونا قیامت کے دن محتاج چھوڑ دیتا ہے"

تہجد کے بیحد فضائل ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے ومن اللیل فتہجد بہٖ نافلۃ لک ۖ یہ حکم ہے اور بالاسحار ھم یستغفرون شکر ہے اور والمستغفرین بالاسحار یہ عمل کرنے والوں کی صفت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تین آوازیں اللہ کو پسند ہیں۔ (۱) مرغ کی آواز (۲) قاریِ قرآن کی آواز ۳ اور جب لوگ پڑے سوتے ہوں تو ان لوگوں کی آواز جو استغفار اور تضرع وزاری جناب باری میں کرتے ہیں۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "صبح کو ایک ہوا چلتی ہے جو اذکار طیبات واستغفار و تحمید و تمجید ملاءِ اعلیٰ تک پہنچاتی ہے" نیز فرمایا کہ رات کے اول حصے میں عرش کے نیچے ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اب عبادت کرنے والے کھڑے ہوں وہ فرقہ عبّاد عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ پھر نصف حصے میں قانتین کے متعلق پکارتا ہے۔ وہ بھی یادِ خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ اور صبح کو مستغفرین کو اٹھاتا ہے اور پکارتا ہے چنانچہ وہ بھی اپنے گناہوں کا اعتراف اس ذاتِ ستار و غفار کے سامنے کرتے رہتے ہیں اور جب سورج نکل آتا ہے تب پکارتا ہے کہ اب غافل بیدار ہوں وہ اس طرح اٹھتے ہیں جیسے مردے قبروں سے گھبرا کر اٹھیں گے۔

فرزندِ عزیز! حضرتِ لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت فرمائی کہ "بیٹا اشرف المخلوقات ہو تم کو انسان بنایا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر مرغ سبقت لے جائے۔ وہ صبح کو بانگ دے اور تم پڑے سوتے رہو اور اپنے مالک حقیقی کی یاد سے اس وقت غافل ہو جاؤ۔ کسی نادم نے کہا ہے۔ میں رات کو پڑا سوتا رہتا ہوں اور فاختہ رات کو چلاتی ہے مجھ سے بڑھ کر کون جھوٹا ہو سکتا ہے کہ میں اس غفلت پر اللہ کے عشق و محبت کا مدعی ہوں۔ اگر میں واقعی سچا ہوتا تو ایک پرندہ مجھ پر سبقت نہ لے جاتا۔

فرزندِ عزیز! مختصر یہ کہ تم عبادت اور [illegible] بارى کی حقیقت سمجھو۔ اور میں تمھیں سمجھائے دیتا ہوں کہ وہ طاعت

اور عبادت مقبول ہو سکتی ہے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہو۔ اعمال و اخلاق و عادات سب میں اگر اتباع ہو تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہو بھلا اگر تم ایام تشریق اور عید الفطر کا روزہ رکھو تو کون کہہ سکتا ہے کہ اتباع نبوی ہے۔ یا اگر کسی کے کپڑے وغیرہ غصب کر لو اور پھر اُن کو پہنکر نماز پڑھو تو ظاہر ا تو یہ دونوں باتیں عبادت ہیں، مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف ہیں۔

فرزند عزیز! تمہارا قول اور فعل شریعت مصطفوی سے خارج نہ ہو کیونکہ اس سے جو خارج ہے وہ حقیقتاً گمراہ ہے اور اس کا بھی خیال رکھنا کہ رسومات صوفیہ اور اُن کے کلمات وجدانی میں مصروف نہ ہونا بلکہ طریقۂ معرفت۔ عبادات و ریاضات و مجاھدات سے حاصل کرنا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ زبانی باتیں اور خواہش پرست دل، بدبختی کی علامت ہو۔ جب تک نفس کو اتباع شریعت اور مجاھدے سے مغلوب نہ کرو گے معرفت سے بے خبر رہو گے۔ تم نے بعض باتیں ایسی دریافت کی ہیں جن کا تحریری جواب مناسب نہیں ہے۔ بہت سی باتوں کا تعلق ذوق سے ہوتا ہے جو کسی طرح تحریر میں نہیں آسکتی ہیں۔

فرزند عزیز! تمہارے بعضے سوال اسی قسم کے ہیں۔ اور جن سوالوں کا جواب ہو سکتا ہے وہ احیاء العلوم میں شرح و بسط سے ذکر کئے گئے ہیں اور بعضے اس جگہ لکھے دیتا ہوں۔ ایک یہ کہ اعتقاد صحیح ہو جس میں مطلق وجود بدعات نہ ہو۔ دوسرے ایسی سچی اور پکی توبہ کہ پھر آئندہ اس کام کے کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ تیسرے حقوق عباد سے بچتے رہنا یہاں تک کہ دشمن بھی راضی رہے۔ چوتھے اس قدر علم شریعت حاصل کرلے جس سے خدا کے اوامر و نواہی اچھی طرح معلوم ہو جائیں

## عمل کی اہمیت

ہم حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول سنائے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً چار ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا مگر میں نے غور کر کے ایک حدیث پر عمل کیا اور سب کو چھوڑ دیا کیونکہ اس میں علم اولین و آخرین موجود ہے۔ اور میں نے اپنی نجات کے لیے اس کو کافی سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ "دنیا کے اتنے کام کرو جتنا تم کو اس میں رہنا ہے۔ اور آخرت کے اتنے کام کرو جتنا تم کو وہاں قیام کرنا ہے۔ اور رضائے باری کے اتنے کام کرو جتنا تم کو اُس سے حاجہ پڑنا ہے۔ اور جہنم کے اتنے کام کرو جتنا تم اُس کی تکلیف کے متحمل ہو سکتے ہو۔

فرزند عزیز! جب تم اس حدیث پر غور کرو گے اور سمجھو گے تو تم کو زیادہ علم کی کیا ضرورت رہے گی۔

ہم ایک حکایت تم کو اور سناتے ہیں اس کو سمجھو اور غور کرو۔ حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ مدتوں شیخ کی خدمت اور فیضان سے مستفیض ہوئے۔ ایک بار شیخ نے پوچھا کہ تم میرے پاس تیس برس سے ہو اس عرصے میں تم نے کیا حاصل کیا۔ عرض کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں نے خوب غور سے دیکھا کہ مخلوق کا یہ حال ہے کہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی دوست و مونس و غمخوار ہوتا ہے۔ کوئی مرض الموت تک رفیق ہے اور قبر تک جاتا ہے مگر افسوس کہ کوئی مونس و غمخوار و رفیق قبر میں نہیں جاتا۔ میں نے سوچا کہ ایسا رفیق تلاش کرنا چاہیئے کہ جو قبر میں میرا محب و مونس ہو تو میری سمجھ میں یہ آیا کہ اعمال صالحہ سے بڑھ کر کوئی نہیں اُن کو میں نے اختیار کیا اور سب کو چھوڑ دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ مخلوق اپنی خواہشات پوری کرنے میں مصروف ہے اور اللہ فرماتا ہے کہ جو خدا سے ڈرا اور اُس نے خواہشات کو روکا وہ جنتی ہے پس میں نے سمجھ لیا کہ قرآن سچا ہے اس وجہ سے میں نے مجاہدات و ریاضات اختیار کیے اور اپنے نفس کا اتباع چھوڑ دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان کس قدر محنت و تکلیف گوارا کر کے دنیا کماتا ہے اور تھوڑی سی دولت پر مغرور ہو جاتا ہے حالانکہ خدا فرماتا ہے جو تمہارے پاس ہو

وہ مٹنے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ رہنے والا ہے۔ تو اپنی توجہ کو دنیا سے ہٹالے اور فقرا کو تقسیم کر دیا کر۔ چوتھی بات یہ ہے کہ مخلوق میں سے کچھ تو اس کے قائل ہیں کہ انسان کی عزت کثرتِ مال سے ہوتی ہو۔ بعضوں کا یہ خیال ہو کہ عزت و دولت اور اولاد سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ انہیں پر فخر کر بیٹھتے ہیں اور بعضے ظلم و ستم سے اوروں کا مال غصب کرتے ہیں۔ میں نے قرآن مجید کو دیکھا تو اس میں ارشاد ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سے وہ شخص بڑا بزرگ ہو جو بڑا متقی و پرہیزگار ہے۔ پس میں نے تقویٰ اختیار کیا اور یقین ہے کہ قرآن مجید بالکل سچا ہے۔ اور ان لوگوں کے خیالات بالکل بیہودہ ہیں۔ پانچویں بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مذمت کرتے ہیں جس کی اصلی علت حسد ہے جو مال وجاہ یا علم کی وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے۔ اور خدا فرماتا ہے کہ ہم نے ان کی معیشت دنیا میں تقسیم کر دی ہے۔ پس جب اللہ نے ہر چیز کو تقسیم کر دیا تو حسد فضول ہو۔ اس وجہ سے میں اللہ کی تقسیم پر راضی ہوگیا۔ چھٹی بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس میں اس کی کوئی غرض ہوتی ہے۔ میں نے اللہ کے کلام کو دیکھا وہ فرماتا ہے کہ "شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اُس سے دشمنی کرو۔ پس میں نے شیطان سے دشمنی اختیار کی۔ ساتویں بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ انسان طلبِ معاش میں بیحد کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات وہ شبہات اور حرام میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ ذلت بھی اُٹھاتا ہے اور اپنی قدر بھی کھوتا ہے۔ میں نے جب اللہ کے کلام کو دیکھا تو فرماتا ہے کہ "زمین پر جو چلنے والا ہے اُس کا رزق اللہ پر ہے" پس میں نے یقین کر لیا کہ میرے رزق کا ضامن اللہ ہے اس وجہ سے میں نے اُس کی عبادت شروع کی اور طمع چھوڑ دی۔

آٹھویں بات یہ ہو کہ میں نے دیکھا کہ مخلوق کا کسی نہ کسی پر اعتماد ہے۔ بعضے روپے پیسے کے گرویدہ ہوتے ہیں اور اُس پر اُن کو کامل اطمینان ہوتا ہے اور بعضے ملک و دولت پر فخر کرتے ہیں اور بعضے صنعت و حرفت پر اور بعضے کسی مخلوق پر — میں نے اللہ کے کلام کو دیکھا تو وہ فرماتا ہے جو "اللہ پر بھروسہ کرلے۔ بس خدا ہی اس کے لیے کافی ہے" پس میں نے اللہ ہی کی ذات کو مالک بنالیا اور اُس پر بھروسہ کر لیا وہی میرا بہتر مددگار ہے۔

حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے سنکر فرمایا خدا تم کو توفیق دے۔ میں نے توراۃ و انجیل۔ زبور۔ قرآن کریم۔ سب میں انہیں باتوں کی تعلیم دیکھی۔

فرزندِ عزیز! تم ان حکایتوں کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ تم کو کثرتِ علم کی کیا ضرورت ہے۔ اب میں ان باتوں کو بیان کرتا ہوں جو صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لیے مفید ہیں۔

سالک کے لیے پہلے ایسا مرشد ہو جو اس کو اخلاقِ نفیسہ کی تعلیم دے، بداخلاقی سے روکے۔ اس کی تربیت ایسی ہو جیسے کسان اپنی کھیتی کی درستی کے لیے کھیتوں سے کیچڑ اور کوڑا الگ کر دیتا ہے۔ اللہ نے تعلیم ہی کے لیے انبیا علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ جب اس دارِ فانی سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو خلفائے راشدین کو تبلیغ کے لیے چھوڑا۔ چنانچہ ان حضرات نے تعلیم فرمائی۔ اسیطرح شیخ بھی عالم فاضل ہو۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر عالم صاحبِ ارشاد ہو۔ میں تم کو عالم کے صفات بتاتا ہوں۔ وہ شخص جو حُبِّ دنیا وجاہ و منزلت سے پاک ہو اور ایسے شخص کا متبع ہو جس کا اتباع مسلسل حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم تک ملتا ہو۔ مرتاض بھی ہو، اخلاق و عاداتِ نفیسہ مثل صبر و شکر و توکل و یقین، سخاوت و قناعت، حلم و تواضع، حیا و وفا، علم و صدق، وقار و سکون اس میں موجود ہوں، وہ ہمیشہ بارگاہِ نبوت سے انوار حاصل کرتا ہو، اور اُس میں بُری عادات و اخلاق مثل بخل و حسد و نفاق و حرص و طولِ اَمل وغیرہ نہ ہوں، اور بجز علم حدیث کے اور علوم سے بالکل الگ ہو۔ یہ علامتیں مرشد

عالم کی ہیں۔ایسا شخص نائب رسول ہو سکتا ہے اور ایسے ہی کی اقتدا لازمی ہے مگر افسوس ایسے اشخاص کا وجود دشوار ہے۔اور جس کو قسمت سے ایسا شخص مل جائے اس کو چاہیئے کہ ظاہراً و باطناً اس کا احترام کرے۔احترام ظاہری یہ ہے کہ اس سے ہر ایک مسئلے میں نہ جھگڑے اگرچہ لغزش بھی ظاہر ہو جائے۔اور نماز کے وقت کے علاوہ اور وقتوں میں اس کی جائے نماز اٹھائے اور اس کے سامنے نوافل کی کثرت بھی نہ کرے بلکہ اس کے ارشادات کو سنے اور ان پر عمل کرے۔احترام باطنی یہ ہے کہ جو حکم وہ دے اس کو قبول کرے اور دل میں اس کا انکار نہ ہو۔نہ قولاً نہ فعلاً۔تاکہ منافق نہ کہلائے۔اور اگر ان شرطوں کی پابندی نہ ہو سکے تو اس کی صحبت چھوڑ دے۔اور سالک پر سیاست نفس و تادیب بھی لازمی ہے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ برے جلسوں سے احتراز کیا جائے کیونکہ شیاطین کئی طرح سے بہکاتے ہیں۔اور یہ لازمی ہے کہ فقر کو غنا پر مقدم رکھے۔یہ باتیں ہیں جو سالک پر لازمی ہیں۔

تم نے جو تصوف کی حقیقت پوچھی اس کا جواب یہ ہے کہ تصوف میں دو باتیں ہیں۔ایک استقامت دوسری مخلوق سے التفات و نرمی کا برتاؤ۔استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے احکام کو اپنی خواہشات پر مقدم سمجھو اور حسن خلق یہ ہے کہ تم لوگوں کی آرزوئیں پوری کرو جو تم سے ممکن ہو سکے اور خلاف شرع بھی نہ ہوں، نہ یہ کہ تم اپنی مرادیں ان سے پوری کراؤ۔تم نے پوچھا کہ عبودیت کی حقیقت کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے تین آداب ہیں۔ایک احکام شرع کی تعمیل، دوسرے قضا و قدر و تقسیم باری تعالیٰ پر راضی و شاکر رہنا۔تیسرے اللہ کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم سمجھنا۔تم نے توکل کا سوال کیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یقین کامل ہو کہ جو کچھ روز ازل میں تمہارے لیے مقدر کیا گیا ہے وہ تمکو پہونچے گا اور ملے گا اور اخلاص یہ ہے کہ تمہاری ساری عبادت اللہ ہی کے لیے ہو اور اس کی رضا کے طالب ہو نہ مخلوق کی تعریف کے لیے۔اور یہ سمجھ لو کہ ریا مخلوق کی تعظیم و تکریم سے پیدا ہوتی ہے۔یہ تمکو نہ نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔اور جب تک ان کو ذی قدرت سمجھو گے ریا نہ جائے گی۔اور تمہارے جو سوال ہیں وہ میری اور کتابوں میں موجود ہیں ان میں دیکھ لو۔اور بعض باتیں لکھنا مناسب نہیں۔جن کا تمہیں علم ہو گیا ان پر عمل کرو پھر اور باتیں تم پر منکشف ہو جائیں گی۔

**فرزند عزیز**! آج سے پھر سوال نہ کرنا مگر زبان دل سے۔اللہ تعالے فرماتا ہے "اگر وہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا تو بہتر ہوتا۔خضر علیہ السلام کی نصیحت دیکھو اور عمل کرو۔تیزی اور عجلت نہ کرنا جب تک تم پر انکشاف حقائق و معارف نہ ہو جائے۔قبل از وقت کوئی شے نہیں ملا کرتی۔اور یہ یقین کر لو کہ جب تک عمل نہ کرو گے کچھ نہ پاؤ گے۔

**فرزند عزیز**! اگر ان پر تم عمل کرو گے تو واللہ عجائب دیکھو گے۔روحانی قوت حاصل کرو اور اپنی جان صرف کرو۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے "اگر جان دینے پر آمادہ ہو تو آؤ ورنہ صوفیہ کی گفتگو میں نہ پڑو۔

**فرزند عزیز**! میں تم کو اور آٹھ باتوں کی نصیحت کرتا ہوں تاکہ تمہارے اعمال قیامت میں دشمن نہ بن جائیں۔چار پر عمل کرنا اور چار کو چھوڑ دینا۔ایک یہ کہ مناظرہ کبھی نہ کرنا اس میں بڑی آفتیں ہیں۔اسی سے حسد و نفاق و عداوت پیدا ہو جاتے ہیں۔ہاں اگر تم سے اور کسی مسئلے میں گفتگو ہو جائے اور تمہارا منشا اظہار حق

ہو تو ایسی صورت میں بحث جائز ہے لیکن وہیں تک جہاں تک اظہارِ حق مقصود ہو۔ اور اگر حق فریقِ مخالف کی طرف ہو تو اُس کے ماننے میں تم کو کچھ عذر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ بحث ہمیشہ تنہائی میں ہو مجمعِ عام میں نہ ہو، اس کا فائدہ بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ عُلماء اطبّاء کی طرح ہیں اور جُہلا مریضوں کی طرح۔ اور ان کا سوال مثل بیان مرض کے۔ اور جواب باعثِ ازالۂ مرض ہے۔ عالِم ناقص علاج نہیں کر سکتا۔ اور عالِم کامل ہر مریض کا علاج نہیں کرتا بلکہ اُس شخص کا کرتا ہے جس کا مرض علاج پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح جس قوم میں جہالت غالب ہو اور وہ لوگ حق کی تلاش سے غفلت کرتے ہوں تو ایسے لوگوں سے گریز ہی چاہیئے۔ یہ سمجھ لو کہ جہل کی چار قسمیں ہیں:- ایک قابلِ علاج ہے اور تین ناقابلِ علاج۔ قابلِ علاج وہ جہل ہے کہ وہ شخص جب سوال کرے تو سوال حسد و منافقت یا عداوت پر موقوف نہ ہو بلکہ اُس سے تحقیقِ حق مقصود ہو۔ یہ جہل بیشک قابلِ علاج ہے۔ لاعلاج جہل میں پہلا وہ ہے جس کا سوال حسد و عداوت و منافقت پر ہو، ایسے شخص کو جواب دینا بالکل لغو اور فضول ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "جس نے ہمارے ذکر سے اعراض کیا اُس سے اعراض کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ دوسرا وہ شخص جو احمق ہو۔ احمق کا سمجھانا نہایت مشکل ہے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے کہ میں مُردے کو زندہ کرنا دشوار نہیں سمجھتا جتنا احمق کو سمجھانا۔ اور ایک احمق وہ ہے جو علم تھوڑا حاصل کرتا ہے اور بڑے بڑے علماء پر اعتراض کرتا ہے۔ اسیطرح وہ صوفی جس نے کچھ مدّت حاصل کیا پھر کبار صوفیہ پر اعتراض کرنے لگا ایسے اشخاص کو جواب دینا فضول ہے۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ہمارا گروہِ انبیا لوگوں کی عقل کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ دوسرے وعظ۔ کبھی نہ کہنا کہ اس میں بڑی آفتیں ہیں۔ پہلے تم عامل بن جاؤ پھر اوروں کو وعظ سنانا۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے "پہلے اپنے نفس کو وعظ سناؤ۔ جب تم عامل ہو جاؤ تب اوروں کو وعظ سناؤ ورنہ اپنے رب سے حیا کرو۔ اگر تم عامل بن جاؤ تو خیر مگر پھر بھی دو عادتوں سے بچتے رہنا۔ ایک یہ کہ تکلف عبارات، و اشارات، و ابیات و اشعار و قصّہ خوانی نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ متکلفین کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ وعظ تو یہ ہے کہ آخرت کا اور وہاں کے احوال کے مصائب کا ذکر ہو۔ اور نزع کے وقت کیا حالت ہو گی۔ منکر و نکیر کے سوال میں کیا جواب دیا جائے۔ پلصراط پر کیا گزریگی۔ اور تقصیرِ نفس کی اصلاح کا ذکر ہو۔ عمر کس طرح اور کن باتوں میں گزارنی چاہیئے۔ غرضکہ ان باتوں کا یاد دلانا جن سے لوگ غفلت و نسیان چھوڑ کر خالق اکبر کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ یہی اصلی وعظ ہے۔ اس کی بعینہٖ ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے گھر کی جانب سیلاب بڑھتا آتا ہے تو کیا تم بڑے تکلف اور اشعار و قافیہ بندی سے اس کو سمجھاؤ گے یا گھبرا کر کہو گے کہ بھائی گھر ڈوبا جاتا ہے بھاگو اور اپنی جان بچاؤ۔ دوسرے یہ کہ تم مجلسِ وعظ میں اس کی کوشش نہ کرنا کہ لوگوں پر حال طاری ہو جائے اور وہ کپڑے پھاڑنے لگیں۔ تمہارے وعظ کی خوب تعریف ہو کہ مولوی صاحب تو کیا عمدہ وعظ فرماتے ہیں بلکہ تمہارا عزم یہ ہو کہ لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف، معصیت سے طاعت کی طرف بلاؤ۔ حرص سے زہد کی طرف اور غرور سے تقوےٰ کی طرف، بخل سے سخاوت کی طرف، شک سے یقین کی طرف بلاؤ اور سمجھاؤ ان کو اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی تعلیم دو۔ اور اللہ کی رحمت سے بھی مغرور نہ کرو کیونکہ ان کے طبائع میں احکامِ باری کی نافرمانی بھری ہوئی ہے۔ تم پہلے ان کی ہمتوں اور ارادوں کو دیکھ لینا اور یہ کہ ان کے دل کس طرف متوجہ ہیں۔ غرضکہ سارے افعال و اخلاق و عادات دیکھ کر پھر ان کی عادات رذیلہ کی مذمت کرنا اور ان سے باز رہنے کی کوشش کرنا۔ اور جس شخص پر خوف غالب ہو اُس کو اُمید دلانا اور جس پر اُمید غالب ہو اُس کو خوف کی تعلیم دینا۔ بس یہ طریقہ وعظ کا ہے۔ اور جو وعظ اس طریقے کا نہ ہو وہ سراسر وبال ہے بلکہ جو وعظ اس کے خلاف بیان کرے وہ شیطان

ہے اس سے مخلوق کو بھاگنا چاہیئے۔ وہ جلد گمراہ کر دے گا۔ اور جس کو اللہ قدرت و توفیق عطا فرمائے اُس کو چاہیئے کہ ایسے شیطان کو وعظ نہ کہنے دے۔ تیسرے یہ کہ تم امراء و سلاطین سے خلط ملط نہ کرنا اور نہ ان کے دیکھنے اور ملنے کی کوشش کرنا کیونکہ ان کی صحبت اور اُن کی مخالفت آفت ہے، اور اگر اتفاقاً ان سے ملاقات ہو بھی جائے تو ان کی مدح سرائی نہ کرنا کیونکہ اللہ ظالم اور فاسق کی تعریف سے ناراض ہوتا ہے اور جس نے ان کی درازیٔ عمر کی دعا کی تو گویا وہ خدا کی نافرمانی عرصے تک چاہتا ہے۔ چوتھے یہ کہ تم اُمراء کے عطایا اور ہدایا کو نہ قبول کرنا اگرچہ وہ حلال ہی کا پیسہ کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں سے طمع باعثِ فسادِ دینی ہے۔ اور ان کے عطایا قبول کر لینے سے مداہنت اور دین میں تساہل پیدا ہو جاتا ہے اور انسان ان کے احسانات سے دب کر اوامرِ شرعیہ کی تاکید نہیں کر سکتا۔ اور ان کے ظلم میں اعانت ہونے لگے گی۔ اور ادنیٰ ظلم یہ ہے کہ ان سے محبت کرنے لگو گے۔ اور جو شخص ظالم کی بقا کی دعا کرے اس کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر ظلم و ستم عرصے تک جاری رہے اس سے بڑھ کر اور کیا آفت ہے۔ اور خدا کے لیے تم بعض شیاطین کے اس کہنے میں نہ آجانا کہ تم ان سے تو روپیہ پیسہ لیلو پھر فقراء پر تقسیم کر دینا کیونکہ امراء تو فسق و فجور میں صرف کیا کرتے ہیں اور تم نیک کاموں میں صرف کرنا۔ خبردار اس پھندے میں کبھی نہ پھنسنا۔ ملعون شیطان نے اس وسوسے میں کئی لوگوں کو پھانس لیا ہے اور اس کی آفت ظاہر ہے۔ میں نے **احیاء العلوم** میں ذکر کر دیا ہے۔ وہاں دیکھ لینا۔

وہ چار باتیں جو قابلِ عمل ہیں یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ پہلے تم اپنا سارا معاملہ خدائے واحد ذوالجلال والاکرام سے رکھنا۔ اور اگر کوئی شخص تمھارے خلاف کوئی کام کرے تو تم اس سے ناراض نہ ہونا تمھارا مالکِ حقیقی تو خدا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو بات تم اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی۔ کیونکہ ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک اپنی طرح اوروں کا بھلا نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ جب تم علم پڑھو یا مطالعہ کرو تو تم تزکیۂ نفس و صحتِ قلب کی تعلیم حاصل کرنا۔ جس طرح تم کو معلوم ہو جائے کہ تم ایک ہفتہ زندہ رہوگے تو تم علم فقہ و کلام و اُصول میں مبتلا نہ ہو جانا۔ یہ علوم تمھاری اعانت نہیں کر سکتے بلکہ مراقبۂ قلب اور معرفت صفاتِ نفس اور اعراض علائق دینا اور اللہ کی محبت اور اس کی عبادت ہی کام آ سکتے ہیں۔ انسان پر دن اور رات گزرتے ہیں شاید اسی میں اُس کی موت ہو۔

**فرزندِ عزیز!** اگر تم کو معلوم ہو جائے کہ رئیس یا حاکم ایک ہفتہ کے بعد تمھاری ملاقات کو آئے گا اُس کے آنے کا کیا کیا انتظام کرو گے۔ لباس و مکان و فرش وغیرہ کی اصلاح ہو گی۔ اب تم سوچو کہ جس طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اگر تم سمجھدار ہو تو سمجھ لوگے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا تمھاری صورتیں اور اعمال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دل اور نیتیں دیکھتا ہے۔ اور اگر تم کو احوالِ قلب معلوم کرنا ہے تو **احیاء العلوم** دیکھو کیونکہ یہ علم فرض العین ہے۔ اور اس کے علاوہ فرض کفایہ ہیں۔ البتہ وہ علم جس سے اللہ کے فرائض مثل وضو۔ نماز۔ روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔

چوتھے مال زیادہ جمع نہ کرنا مگر وہ جو عیال کے لئے سال بھر تک کافی ہو۔
حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم دُعا کیا کرتے تھے۔ **اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ قُوْتَ آلِ مُحَمَّدٍ كَفَافًا۔**

**فرزندِ عزیز!** میں نے تمھاری تحریر کا جواب دیا۔ اب تم کو چاہیئے کہ اس پر عمل کرو اور مجھ کو بھلائی کی دُعا سے نہ بھولنا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے جس کا پڑھنا باعثِ فلاحِ دارین ہے:۔

اَللّٰھُمَّ اَقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ وَمِنْ
طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ
الدُّنْیَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا وَاجْعَلْہُ
الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَیْنَا
وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ
عِلْمِنَا وَلَا رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا ۞

ترجمہ :- اے اللہ ہم کو اپنا خوف اس قدر دے جس سے تو ہم میں اور اپنی نافرمانیوں میں حائل ہو (یعنی ہم گناہوں سے بچیں اور ڈریں) اور توفیقِ طاعت اس قدر عطا فرما جس کی وجہ سے جنت میں داخل کرلے اور اس قدر یقین عطا فرما جس کی وجہ سے دنیوی تکالیف شاق نہ گزریں، اور جب تک زندہ رکھے اُس وقت تک سماعت بصارت اور قوت ہم کو کام دے اور فائدے کو ہمارا وارث بنا- اور ہمارا کینہ اس شخص سے ہو جس نے ہم پر ظلم کیا ہو اور جس نے ہم سے دشمنی کی ہو اُس کے مقابلے میں ہماری مدد کر- اور ہمارے دین میں کچھ مصیبت پیدا نہ کر- اور دنیا کی فکر ہم کو زیادہ نہ ہو اور دنیا میں ہماری انتہائے علم ہو نہ منتہائے رغبت ہو اور ایسے شخص کو ہم پر مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے ۞

---

# عمل ← عمل ← پیہم عمل

## حضرت حسن البنا شہید کا ایک بصیرت افروز مضمون

جسے

قاضی خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری نے اُردو کا قالب عطا کیا

---

اسلامی تعلیمات میں ہر مرض کی دوا، ہر بیماری کا علاج، ہر تنگی کے لیے فراخی، ہر کرب کے لیے تسکین، ہر عمل کے لیے نظام اور ہر چیز کی کھلی کھلی تفصیل موجود ہے! اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے،

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ ویخرجھم من الظلمات الی النور باذن ربھم ویھدیھم الی صراط مستقیم

تمہارے پاس اللہ کا نور بصورتِ کتاب مبین آچکا ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب مبین کے ذریعہ اُن لوگوں کو جو اس کی مرضیات کی پیروی کرتے ہیں سلامتی کے راستہ پر رہنمائی فرماتا ہے اور ان کو اپنے حکم سے اندھیروں سے نور (اُجالے) کی طرف نکالتا ہے اور صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے،

(تھوڑی دیر کے لئے) تم اپنے دل میں مختلف قوموں میں سے ایک ایسی قوم کا تصور کرو جو تعلیماتِ اسلام کی پیرو ہو، تو تمہیں نظر آئے گا کہ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کیونکہ قرآن مجید ان کو بتاتا ہے،

انما المومنون اخوۃ۔ (سب مومن بھائی بھائی ہیں)

وہ حقوق و واجبات میں برابر ہیں کیونکہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا ہے کہ

"کسی عربی کو کسی عجمی پر بجز تقویٰ و پرہیزگاری کے کوئی فضیلت و تفوق نہیں!"

اسی طرح تمہیں نظر آئے گا کہ تعلیمات اسلام پر عمل کرنے والے سب اپنے اپنے گھروں اور اہل وعیال کے معاملہ میں خوش ہیں، کیونکہ قانونِ اسلام نے کنبہ کے ہر فرد کے حقوق و واجبات کی ایک حد مقرر کر دی ہے، اور میاں بیوی کے درمیان تو اس کی بنا عدل و انصاف پر رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف

عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل اُن ہی حقوق کے ہیں جو اُن عورتوں پر دستور کے مطابق

اور والدین اور اولاد کے درمیان اس کی بنا محبت اور رعایت پر رکھی گئی۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"تم میں کا ہر ایک راعی (نگہبان) ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی رعیت (زیر نگرانی افراد) کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"

اسی طرح تم دیکھو گے کہ یہ قوم (روحانی اعتبار سے) اپنے اخلاق میں یکتا (اور اجسام کے اعتبار سے) قوی و تندرست ہوگی کیونکہ ان کے رسولؐ نے پوری وضاحت کے ساتھ ان کو بتایا ہے۔ کہ

"میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں"

اور یہ کہ

"مومن قوی مومن ضعیف سے بہتر ہے"

اسی طرح یہ بھی نظر آئیگا کہ وہ کسب معیشت کی راہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ، اپنے گرد احاطہ کئے ہوئے کون و مکان کے مسائل پر بھی غور کرتے ہیں، اور اس کے اسرار و دقائق سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، اور زندگی کی پاکیزگیوں، خوشبوؤں، اور آرائشوں سے جو ان کے لئے حلال کی گئی ہیں پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ ان کے مذہب نے ان کے لیے کسب و عمل کو محبوب فعل قرار دیا ہے اور بے کار، سست و کاہل اور نکما رہنے سے منع کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا کبھی نہیں کھایا جو اس نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا ہو،

اور اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

قل انظروا ماذا فی السموات والارض — اے نبی ان سے کہیئے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اس پر غور و فکر کریں

نیز ارشاد ہے:۔

ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک — اور وہ آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں (تو کہتے ہیں) اے ہمارے رب تونے یہ سب کچھ ہرگز بیکار نہیں پیدا کیا، پاک ہے تیری ذات!

نبی کریم کا یہ بھی ارشاد ہے۔ کہ

"اللہ جمیل ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے"

اسی طرح تم یہ بھی دیکھو گے کہ اس اُمت کے لوگ اپنے باہمی معاملات میں انصاف سے کام لیتے ہیں اپنے مطالبات میں سیر چشمی کو کام میں لاتے ہیں، ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے، نہ ایک دوسرے پر ظلم توڑتا ہے، کیونکہ ان کے گوش اس حدیث قدسی سے آشنا ہیں، کہ اللہ فرماتا ہے،

اے میرے بندو میں نے اپنے اوپر ظلم کرنا حرام کرلیا ہے اس لئے تمھارے لیے بھی اس کو حرام کرتا ہوں تم آپس میں ظلم مت کرو!

اور انھوں نے اپنے نبیؐ کا یہ ارشاد بھی سن رکھا ہے کہ

ظلم قیامت کے دن بہت سی تاریکیاں بن کر (سامنے) آئے گا!

وہ آپس کے حقوق جانتے اور اپنی حدود پہچانتے ہیں، کیونکہ ان کے دین نے حاکم و محکوم کی ذمہ داریوں اور ظالم کی سزا اور مظلوم کے حق میں امتیاز پیدا کر دیا ہے، اور ہر ایک کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے کہ اس سے آگے نہ بڑھے، نبی کریمؐ فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو تمہارے لیے علامات (حدود) متعین کر دی گئیں ہیں، ان علامات پر رک جاؤ اور تمھارے لیے

حد مقرر کر دی گئی ہے پس اپنی حد سے آگے نہ بڑھو"
وہ بھلائیوں میں اشتراک کرتے ہیں، تکالیف دور کرنے میں ایک دوسرے کی معاونت (مدد) کرتے ہیں، زندگی کی راہ طے کرنے میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہوتے ہیں، اور جو آلام اور مایوسیاں لوگوں کے سلوک برتاؤ کے سبب پیش آتی ہیں ان کو برداشت کرتے ہیں۔ (کیونکہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے) اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور وہی چیز اس کے لیے بھی ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو"

ان سب امور کے علاوہ یہ بھی نظر آئے گا کہ وہ لوگ اپنی جانوں اور اپنے اصولوں کی حمایت وصیانت میں عمل اور قوت کے ساتھ ہر آن مستعد رہتے ہیں، اور مستعد اس لیے رہتے ہیں کہ ہر انسان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے واجبات انجام دے، اور اس غرض کے لیے قوت بھی کام میں لائی جائے اگر کوئی شخص نرمی سے بات نہ مانے! اور حق کے سامنے سر اطاعت خم نہ کرے، چنانچہ اگر وہ دلیل وبرہان کو تسلیم نہ کرے تو پھر سیف وسنان سے بھی کام لیا جائے!

(کسی شاعر کا قول ہے)

"بعض عقلیں نہروں کی طرح ہوتی ہیں (کہ روئیدگی اور سرسبزی پھیلاتی ہیں) اور بعض عقلیں چٹانوں کی طرح ہوتی ہیں (کہ روئیدگی اور سرسبزی سے قطعاً عاری ہوتی ہیں) اسی طرح بعض طبائع شریف وآزاد ہوتی ہیں (کہ دلائل وبرہان سے مانی جاتی ہیں) اور بعض طبائع ذلیل وغلام، (کہ بغیر طاقت وقوت کے مظاہرہ کے نہیں مانتیں)

اور اکثر اوقات قوت کا استعمال حق کا بول بالا کرنے کے لیے زیادہ ضامن ہوتا ہے، اور جب امن کے ذرائع مسدود ہو جائیں تو پھر تو جنگ ہی واحد علاج رہ جاتا ہے! اور جب لوگ دلائل کا انکار کریں اور ظلم وزیادتی پر اتر آئیں تو دنیا میں امن قایم کرنے کے لیے لڑائی زیادہ بہتر ہے! دستور اسلام میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے!

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم، — اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر رعب جمائے رکھو!

اور اسلام نے حکم دیا ہے کہ مسلمان کی جان اس کا مال، حق کی مدد کے راستہ میں قربان کرنے اور بھلائی کی اعانت اور لوگوں میں عدل وانصاف کے پھیلانے کے لیے ہے، اور یہی وہ دستور ہے جس نے امن کا حکم دیتے ہوئے اور اس کی تاکید کرتے ہوئے امن کو تقدس کا درجہ عطا کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم۔ وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمومنین والف بین قلوبھم۔ — اگر وہ (کفار) امن کی طرف مائل ہوں تو آپ ان کو امن دیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھیئے وہ سننے اور جاننے والا ہے، (پھر) وہ اگر تجھے دھوکہ دینے کا ارادہ کریں گے، تو اللہ تجھے کافی ہے وہ ہی تیری تائید اپنی مدد اور مسلمانوں کے ذریعہ کرے گا، اور مسلمانوں کے قلوب میں باہمی الفت پیدا کرے گا!

ہاں ذرا اس قوم کا تصور کرو جو راہ عدل پر گامزن ہے، اور اس کے عدل میں رحم دلی کا عنصر بھی سرایت کیے ہوئے ہے اور جس کا علم اس کے دین ومذہب سے متحد ہے، جس کے یہاں تونگری غربت کے ساتھ امتزاج رکھتی ہے، پس اس میں نہ کوئی تونگر ہے نہ فقیر، اور پھر اس قوم کے افراد میں دنیا سے بے رغبتی اور دنیا سے فائدہ اٹھانے کے دونوں جذبے مجتمع ہیں!

اس تصور کے ساتھ اب ذرا سوچو ایسی قوم جس کا یہ حال ہو زندگی کی مشکلات حیاتِ دنیوی کے تھکا دینے والے لمحات میں کیسی خوش بخت، کتنی خوش، اور کتنی راحت یاب نہ ہوگی!

کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ اصول و قواعد جن کو دستور اسلام نے مقرر کیا ہے دورِ حاضر کے تمام اجتماعی امراض کے لیے جن سے ہر زندگی بیزار، ہر وجود شاکی ہے، علاج شافی ہے، دورِ اوّل کے مسلمان (اللہ ان سے راضی ہو) انھیں قواعد پر عامل تھے، جس دن ان پر اسلام کے بلند آسمان سے رحمت کے بادل برستے تھے تو تمام عالم سرسبز شاخ کے پھولوں کی مہک سے مہک اُٹھا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض۔

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے،

پھر وہ دَور آیا کہ لوگ جادۂ حق سے منحرف ہوگئے، نیکی کے راستوں کو چھوڑ دیا، اور اپنے لیے نئے قواعد، نئی تنظیم گڑھ لی، جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ پیش قدمی اور ارتقاء ہے، جب اس پر بھروسہ کیا اس پر مطمئن ہوگئے اور یہ سمجھنے لگے کہ ہم کسی چیز پر قائم ہیں، تو اُن پر حق تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آگیا۔ کہ

فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شئ حتیٰ اذا فرحوا بما اوتوا اخذ ناھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون۔

پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیے یہاں تک جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں خوب اترا گئے تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا پھر تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے!

وہ کونسی حیرت زدگی اور کونسی پریشانی اس سے زیادہ ہوگی جس میں موجودہ عالم آجکل گھرا ہوا ہے، اگر یہ حیرانی اور عذاب نہیں ہے جو ہم پر مسلط ہے تو (نہیں معلوم) پھر حیرانی اور عذاب کیا ہے؟

پوری دنیا مسلح ہو رہی ہے، ہر ایک چلا رہا ہے، اور ہر آدمی پریشان ہے نئے نئے انقلاب آرہے ہیں، مصیبتیں پے در پے نازل ہو رہی ہیں، رسوائیاں، یکے بعد دیگرے آرہی ہیں، ہر قوم دوسری قوم کی گھات میں لگی ہوئی ہے، لیڈر اور قائد، بیم و رجا کا شکار ہیں ناامیدی ان سے قریب تر ہو رہی ہے، مشکلات نے گلا گھونٹ رکھا ہے، اور تمدن جدید نے جو پختہ عمارتیں کھڑی کی تھیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں کو لبھا لیا اور گرویدہ کر لیا تھا اب اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہیں جس طرح آسمان سے ستارے اور شہابِ ثاقب ٹوٹتے ہیں۔

یہ تو عام دنیا کی حالت ہے، اور خاص ہماری (مسلمانوں کی) حالت! تو ہمارا بھی وہی حال ہے جو باقی دنیا کا کہ مصائب و تکالیف کی غرق کر دینے والی موجیں ہم سب کو بہائے لیے جا رہی ہیں!

مزید برآں، تنگدلی، فرقہ بازی کی لعنت، اختلاف کی بدبختی، اور افتراق و تشتت کی آگ علیحدہ ہم پر مسلط ہے، ہم نے (افراتفری کا شکار ہو کر) کامیابی کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے عجیب عجیب جہتوں اور راہوں پر چلنا شروع کیا مگر (نتیجہ یہ نکلا کہ) ہم ہر راستے سے خائب و خاسر خالی ہاتھ واپس آئے۔

کاش! ہم اسی پہلی حالت پر لوٹ آئیں، تاکہ خوش دلی کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ ہمارا لوٹنا غنیمت ہوا لیکن ہم اپنا سب کچھ ان راہوں میں کھو چکے ہیں، اور طویل جد و جہد کے بعد (خائب و خاسر) لوٹنے سے ہماری حالت پر کسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے،

۵ــ بعت بیتی وحماری معاً　　　میں نے گھر فروخت کیا اور اس کے ساتھ سواری بھی بیچ دی اب
وجلست لا تحتی ولا فوقیا　　　ایسی حالت ہوگئی ہے کہ نہ بیٹھنے کو سواری نہ سر چھپانے کو ٹھکانا رہا۔

یہ حالت قابلِ رحم اور موجب افسوس ہے، اس سے حزن وغم پیدا ہوتا ہے، (مگر بجائے افسوس اور اظہار حزن کے) اب ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس گھرنے والے خطرہ کے سد باب کے لیے جو افراد کو، قوموں کو، بلکہ پوری انسانیت کو اپنے گھیرے میں لیتا جارہا ہے اپنے اپنے حصہ فرائض کی انجام دہی کے لیے اُٹھ کھڑا ہو،

(ان حالات کے پیش نظر) اے مفکرینِ اسلام اب آپ کی باری آتی ہے، پکارنے والا پکار رہا ہے،

هیا الی العمل فان العالم ینتظرکم　　عمل کے لیے بڑھو، زمانہ تمہارا منتظر ہے!

پہلے تو تم آگے بڑھ کر اپنی قوم کو بچاؤ، پھر سارے عالم کو بچانے کے لئے بڑھو، تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب موجود ہے جو ایک طرف قانونِ حکیم ہے تو دوسری طرف طبیب ماہر بھی، پھر اگر وہ ایک طرف علاج شافی ہے تو دوسری طرف آرام وراحت دینے والی دوا بھی!

آگے بڑھو، اور اپنی قوم میں اخلاق فاضلہ پیدا کرنے، دلوں کا تزکیہ کرنے، روحوں کی پاکیزگی، اور نفوس کی اصلاح کرنے کے ساتھ ان کو (تباہی سے) بچاؤ، کیونکہ خدا کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔　　خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

تم خود زندہ نمونہ ہو، اور خود پہلے صحیح اسلام کے پیکرِ خلق وعمل بنکر سامنے آؤ، ان کے بچانے کے لیے اپنے اعمال سے حقیقی اسلام کا تصور پیش کرو، (اگر تم نے ایسا کیا تو یقین رکھو) کہ وہ سب اسلام کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہو جائیں گے اور انارکی کی جہنم اور شکوک (وتوہمات) کی آگ سے نکل کر اسلام کی راحت فزا جنت میں جاگزیں ہو جائیں گے!

یاد رکھو اس مقصدِ عظیم کو نہ (لچھے دار) تقریروں سے حاصل کر سکو گے، نہ (چٹخارے دار) تحریر دل سے! اس مقصد کے حصول کے لیے صرف عمل (کا زینہ) درکار ہے! (اور بام کامیابی پر اسی ذریعہ سے پہونچ سکو گے) کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے (اللہ ان سے راضی ہو) جتنا کچھ قول وبیان سے تعلیمات اسلام کو پھیلایا اس سے کہیں زیادہ اپنی جانوں (کو مشقت میں ڈال کر) اپنے اخلاق حسنہ (کے سبب) اور (آزمائش کے وقت) اسلام پر مضبوطی سے جمے رہنے (کے پیہم عمل) سے پھیلایا،

کیا تم کوئی پکار سن رہے ہو؟
اور کیا تم پکارنے والے کو جواب دوگے؟

هیاء الی العمل فان العالم ینتظرکم!
عمل کے لیے بڑھو! زمانہ تمہارا منتظر ہے!

---

ANARCHY ــــہ

محمد عاصم
(رفیق دار العروبہ گوجرانوالہ)

# الجزائر

## جہاں حق پرست پامال ہو ہو کر اُبھرے ہیں!

فرانسیسی جور و استبداد کی چند خونیں جھلکیاں ــــــ
ــــــ مجاہدین اور مخلص و سرفروش رہنماؤں کے "تاریخ ساز" کارنامے ــــــ مسلمانوں کی درماندگی اور دل آزاری کی دل ہلا دینے والی داستانیں

مگر

"حق" غالب ہو کر رہے گا، تاریخ پھر اپنے کو دہرائے گی، یہاں تک کہ مظلوم کے ہاتھوں میں ظالم کا حلقوم ہوگا اور آسمانی فرشتے مسکراتے ہوں گے!

الجزائر، جسے انگریزی میں الجیریا کہا جاتا ہے، برّاعظم افریقہ کے شمال میں ایک عرب خطّہ ہے۔ اس وقت پورے افریقہ پر اور بعض دوسرے چھوٹے موٹے علاقوں کے سوا مختلف یورپی قومیں اپنا پنجۂ اقتدار جمائے ہوئے ہیں اور اسے اپنا موروثی حق سمجھتی ہیں۔ الجزائر کا شمار شمالی افریقہ کے اُن عرب علاقوں میں ہوتا ہے جنہیں عرب عام طور پر "المغرب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر "المغرب"، چار ملکوں پر مشتمل ہے جو علی الترتیب شمال مشرق سے شمال مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں! طرابلس الغرب (جس کا نام اٹلی والوں نے اپنے ظالمانہ قبضہ کے بعد بدل کر لیبیا رکھ دیا تھا اور بدقسمتی سے آج زیادہ تر اسی نام سے مشہور ہے) تونس، الجزائر اور مراکش۔

شمالی افریقہ کے دوسرے علاقوں کی طرح طرابلس[1] الغرب بھی سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصّہ تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اس پر ظالمانہ حملہ کیا اور ظلم و ستم کی ایک ایسی مثال قایم کی، جسے سننے کے لیے انسان کے جسم میں پتھر اور لوہے کا کلیجہ چاہیئے۔ طرابلسیوں نے اپنی بے سروسامانی و قلتِ تعداد کے باوجود لگاتار بیس سال تک اٹلی کی فوجوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب اٹلی کو شکست ہوئی، تو طرابلس پر اتحادیوں کی مختلف فوجیں قایم ہوگئیں۔ ان دنوں طرابلس کو مکمل خود مختاری دینے یا نہ دینے

[1] طرابلس ہی کے نام سے دوسرا علاقہ موجودہ جمہوریت لبنان کا ایک ضلع ہے، طرابلس الغرب کے مقابلے میں اسے طرابلس الشام کہا جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے یہ قدیم شام کا ایک حصّہ تھا۔

کا مسئلہ بڑی اہمیت حاصل کیے ہوئے۔ اس وقت اس کے ایک علاقہ برقہ پر امیر ادریس السنوسی کی خود مختاری تسلیم کرلی گئی ہے۔ یو۔این۔او کی تجویز کے مطابق ۱۹۵۱ء کے آخر تک پورے طرابلس کو متحد ہو کر آزادی حاصل ہو جانا چاہیئے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اس وقت تمام مسلمانانِ عالم کی نگاہیں یو۔این۔او۔کے آخری اقدام پر لگی ہوئی ہیں۔

بقیہ تین علاقے یعنی تونس، الجزائر اور مراکش جنگ سے پہلے بھی فرانس کے قبضہ میں تھے اور جنگ کے بعد بھی ان پر اسی کا جابرانہ قبضہ رہا اور اب تک ہے۔

یہ وہ عرب علاقے ہیں، جن کے جور و ستم کی داستان ان کے مشرقی مسلمان بھائیوں تک اوّل تو پہنچتی نہیں، اور اگر پہنچتی ہے، تو طرح طرح کے غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈوں سے مل ملا کر۔ اب تک مغربی قوموں کی یہ عام پالیسی رہی ہے کہ جس علاقہ پر ایک کو غاصبانہ تسلّط حاصل ہو جائے، اس کے اندرونی حالات اور اس کی مصیبتوں کی خبریں دوسرے علاقوں تک نہ پہنچنے پائیں۔

ہمارا یہ ارادہ ہے کہ مضامین کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جائے، جس میں تمام عرب ملکوں سے متعلق عموماً اور مغربی عرب کے ملکوں سے متعلق خصوصاً صحیح صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ آج کی صحبت میں ہم ان میں سے صرف الجزائر کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے،

## جغرافیہ اور آبادی وغیرہ

الجزائر کے مشرق میں طرابلس اور تونس، مغرب میں مراکش، جنوب میں صحرائے اعظم افریقہ اور شمال میں بحیرۂ روم ہے، الجزائر کے کل تین صوبے ہیں۔ الجزائر، وھران اور قسنطینہ، پورے علاقے کا پایۂ تخت شہر الجزائر ہے، جو بحیرۂ روم پر بندرگاہ ہے اور اس کے عین سامنے فرانس کی بندرگاہ مارسیلز پڑتی ہے۔

الجزائر کا زیادہ تر علاقہ ریگستانی ہے۔ شمال کا ساحلی علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور زراعت کے قابل ہے۔

الجزائر کی کل موجودہ آبادی تقریباً ۹۰ لاکھ ہے، جس میں ۸۹ فیصدی اصل باشندے ہیں اور بقیہ ۱۱ فیصدی وہ فرانسیسی نو آبادکار ہیں، جو فرانس کے قبضہ کے بعد آہستہ آہستہ فرانس سے آکر یہاں کے ساحلی علاقوں پر آباد ہو رہے ہیں۔ اصل آبادی میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ایک تھوڑی اقلیت عیسائیوں اور یہودیوں کی بھی ہے۔ مسلمان آبادی عرب اور بربر دو قوموں پر مشتمل ہے۔ بربر یہاں کے قدیم باشندے ہیں، جو عربوں کی ابتدائی فتوحات (یعنی صحابہ کرام) ہی کے زمانے میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان میں بہت سے نامور اور قابل قدر علما، فقہاء، ادباء اور سپہ سالار پیدا ہوئے۔ اسپین کی جنگوں میں عربوں کے علاوہ بربروں نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ الجزائر کے علاوہ مراکش میں ان کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ عربوں کی یہ مشہور تاریخی خصوصیت ہے کہ وہ جہاں گئے، اپنی تہذیب، اور زبان بھی ساتھ لیتے گیے۔ شمالی افریقہ میں ان کی یہ خصوصیت حیرت انگیز طور پر نمایاں اور روشن نظر آتی ہے۔ جب عرب یہاں آئے، تو فتوحات اور دعوتِ حق کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و تمدن اور زبان بھی لائے۔ اتنا طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود آج الجزائر اور مراکش کے اندرونی بادیہ میں نے حجاز و نجد کے بادیہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہی کھجور کا درخت، اونٹ کا دودھ اور اس کی سواری جو نجد و حجاز میں تھی، یہاں بھی ساتھ آئی۔ عرب زبان اور نحو میں اہلِ مغرب شروع سے آج تک مشرقی ملکوں کے عربوں سے نمایاں اور ممتاز رہے ہیں۔ عربی کی قدیم ترین تین یونیورسٹیاں یعنی جامع الازہر (قاہرہ)، جامع الزیتونہ (تونس) اور جامع القرویین (فاس، مراکش)، افریقہ ہی میں قایم ہوئیں اور اب تک قایم ہیں۔

## تاریخی پس منظر

افریقہ کی فتوحات کا سلسلہ یوں تو خلافتِ راشدہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں مصر اور حضرتِ عثمانؓ کے زمانے میں طرابلس فتح ہوئے۔ بعد کی خانہ جنگیوں کے باعث فتوحات کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا۔ یہاں تک کہ حضرتِ معاویہؓ کے عہد میں مشہور قائد صحابیٔ رسول حضرت عقبہ بن نافع فہری کی سرکردگی میں شمالی افریقہ کا تمام علاقہ فتح ہوا۔ سقوطِ اندلس (۸۹۷ھ / ۱۴۹۲ء) کے قریبی زمانے تک تمام شمالی افریقہ پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ مختلف وقتوں میں مختلف مسلمان حکومتیں اور خانوادے یہاں دادِ حکومت دیتے رہے۔ اسپین میں جب عیسائیوں کو عروج حاصل ہوا اور مسلمانوں کی طاقت ڈانواڈول ہونے لگی، تو عیسائی فوجوں نے شمالی افریقہ کے علاقوں پر بھی حملے کرنا شروع کر دیے۔ اسی زمانہ میں الجزائر کا کافی علاقہ اہلِ اسپین کے ہاتھوں میں چلا گیا، لیکن ۱۵۱۶ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے مشہور جنگجو جرنیل عروج آرلیس نے اسے دوبارہ اہلِ اسپین کے ہاتھوں سے چھین کر انہیں بالکل بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد مسلسل تین صدیوں تک الجزائر سلطنتِ عثمانیہ کا مضبوط ترین بحری مرکز بنا رہا۔ اس زمانے میں الجزائر کی بحری طاقت اس قدر مضبوط تھی کہ گویا پورے بحرۂ روم پر اس کا قبضہ تھا۔ سولھویں صدی کے آخر میں یہاں کے بحری جہازوں نے بحرۂ روم میں لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یورپ کی ساحلی عیسائی سلطنتوں پر حملہ کرنا اور ان کے جہازوں کو لوٹنا ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ ۱۶۵۹ء، ۱۶۶۴ء، ۱۶۸۲ء، ۱۶۸۳ء اور ۱۶۸۶ء میں انگریزی اور فرانسیسی فوجوں نے الجزائر کے بحری بیڑے پر پے در پے حملے کر کے کم از کم اپنے گزرنے والے جہازوں کے لیے راستہ محفوظ کر لیا۔ لیکن باقی چھوٹی موٹی حکومتیں برابر لوٹ مار کا نشانہ بنی رہیں۔ اور بسا اوقات الجزائر کے گورنروں کو خراج ادا کرتی رہیں ۱۸۲۷ء میں الجزائر کے گورنر حسین دائی اور فرانس کے سفیر مقیم الجزائر میں سخت جھگڑا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ حسین دائی نے غصہ میں آکر فرانسیسی سفیر کو پنکھے سے پیٹنا شروع کر دیا۔ فرانس نے اس واقعہ کو اپنے لیے باعثِ ذلّت خیال کیا اور اسے بہانہ بنا کر آخر کار ۵ راکتوبر ۱۸۳۰ء کو الجزائر کے ساحل پر اپنی فوجیں اُتار دیں۔ یہ الجزائر پر فرانس کے باقاعدہ قبضہ کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے الجزائر پر فرانس کا غاصبانہ اقتدار قایم ہے۔

## امیر عبدالقادر جزائری

اٹھارویں (۱۸) صدی کا آخر اور اُنیسویں (۱۹) صدی کا آغاز مسلمانوں کی تاریخ میں وہ زمانہ ہے، جب دنیائے اسلام کے اکثر ملکوں میں مسلمانوں کو اپنی پستی اور دین سے ہٹ جانے کا شعور پیدا ہوا اور اُنہوں نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ لوٹانے کے لیے جدوجہد شروع کی ہندوستان میں حضرت شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ (ش ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کی تحریک تجدید و جہاد اسی زمانے میں نمودار ہوئی۔ طرابلس میں سید محمد بن علی السنوسی نے اپنی دعوتِ اصلاح کا آغاز انہی دنوں میں کیا۔ فرانس کی عظیم الشان فوجی طاقت اور اہل جزائر کی بے سروسامانی دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید پورے الجزائر کے زیرنگیں کرنے میں فرانس کو چند ہفتوں سے زیادہ نہ لگیں گے، مگر اس کے باوجود مسلمانوں نے فرانس کی فوجوں کا لگاتار سترہ سال جس جواں مردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا، اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ شروع شروع ایک ڈیڑھ سال تک اہلِ جزائر بے قاعدہ اور غیر منظم ٹولیوں کی شکل میں فرانس کی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۲۱ راکتوبر ۱۸۳۲ء کو الجزائر کے صوبہ وھران میں ایک شیر دل صاحب سیف و قلم امیر عبدالقادر (جو ایک مشہور دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور جن کی عمر اس وقت ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی) نے فرانسیسیوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ اُنہوں نے اپنا مرکز شہر معسکر کو بنا کر مجاھدین کی تنظیم کی اور ان میں اسلامی جہاد و قربانی کی رُوح پھونکی۔ افسوس کہ سیّد شہیدؒ کی طرح امیر عبدالقادر کو بھی فرانسیسیوں سے جنگ کے علاوہ اندرونی حریفوں

اور حاسدوں سے بڑی حد تک نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس وقت بہت سے قبیلے اور ان کے سردار فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کو بے فائدہ بلکہ مُضر خیال کرتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے محض فرانسیسیوں کو خوش کرنے کے لیے امیر عبدالقادر کی راہ میں طرح طرح کی رُکاوٹیں ڈالیں۔ مگر اُنھوں نے مخالفتوں کی ذرّہ برابر پروا نہ کی، اور اپنی ہوشمندی اور بہادری سے تمام بزدل اور شر پسند عناصر پر قابو پاکر فرانس سے کھلم کھلا جنگ کا اعلان کر دیا۔ مختلف معرکے ہوئے۔ کبھی فرانسیسیوں کا پلّہ بھاری رہتا اور کبھی قسمت امیر عبدالقادر کی یاوری کرتی۔ آخر آئے دن کی جنگوں اور بے اندازہ جانی و مالی خساروں سے تنگ آ کر فرانس امیر عبدالقادر سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہوا۔ جس کی رو سے آمیر کو صوبہ وھران کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا گیا اور دونوں فریقوں میں خود مختارانہ حیثیت سے سفارتی تعلقات قایم ہوئے اور آمیر کو یہ اختیار دیا گیا کہ جس ملک سے اپنے لیے اسلحہ منگوانا چاہیں منگوا سکتے ہیں۔ لیکن جلد ہی فرانسیسیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور فریقین کے درمیان از سر نو جنگ چھڑ گئی۔ بہت سے معرکوں کے بعد جن میں کبھی فرانسیسی غالب رہے اور کبھی آمیر، ۳۰ر جون ۱۸۳۷ء کو دوسرا معاہدہ طے پایا، جس میں فرانسیسیوں نے امیر عبدالقادر کو وھران کے علاوہ صوبہ الجزائر کے کچھ علاقہ کا بھی حکمران تسلیم کیا۔ اس معاہدہ کے بعد دو سال تک جنگ کا سلسلہ رکا رہا۔ لیکن ۲۰ر نومبر ۱۸۳۹ء کو دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا، جو ۱۸۴۳ء تک مسلسل جاری رہی۔ مگر اب کے جنگ کا پانسہ پلٹا ہوا تھا۔ فرانس کی بے پناہ مادی طاقت غالب آنے لگی۔ دوسری طرف خود آمیر کے مددگاروں اور ساتھیوں نے ہمّت ہارنا شروع کی، قبائل کے قبائل جہاد اور دشمن کے مقابلے سے کنارہ کش ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آمیر کو شکست پہ شکست ہونے لگی۔ اور وہ سلطان مراکش مولائی عبدالرحمٰن کی پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مولائی عبدالرحمٰن نے شروع شروع میں اُن کی کافی مدد کی، لیکن فرانس کے فوجی دباؤ سے مجبور ہو کر انہیں دست کش ہونا پڑا۔ آمیر کے دو تین سال اسی حیص بیص میں گزر گئے۔ ۱۸۴۶ء میں اُنہیں موقع ملا اور اُنھوں نے دوبارہ الجزائر پر حملہ کیا۔ کامیابی بھی ہوئی، مگر عارضی، سرداران قبائل اور دوسرے ساتھیوں کی بے وفائی نے الجزائر کی قسمت پر مُہر لگا دی اور امیر عبدالقادر مسلسل شکستوں اور اپنوں کی بے مہریوں سے تنگ آ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے، اور ۲۳ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو اُنھوں نے اپنے کو قاعدے کے مطابق فرانس کے حوالے کر دیا۔ اس حادثے کے بعد ایک عرصہ کے لیے یہ توقع جاتی رہی کہ الجزائر میں فرانس کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند ہو۔ آمیر عبدالقادر ۱۸۵۲ء تک فرانس میں نظر بند رہے۔ اس کے بعد اُنہیں اجازت ملی کہ الجزائر کے علاوہ جہاں جانا چاہیں، چلے جائیں۔ پہلے وہ آستانہ آئے، پھر برصا میں قیام کیا اور آخر کار ۱۸۵۵ء میں دمشق منتقل ہو گئے، جہاں ۱۸۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اب تک ان کی اولاد دمشق میں علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز ہے۔

## موجودہ حالت

۱۔ **معاش**:۔ ابتدا سے آج تک الجزائر کے باشندوں کے ساتھ فرانسیسیوں کا رویّہ نہایت تحقیر و تذلیل کا رہا ہے۔ ان کے نزدیک اہل جزائر کو جینے کا حق صرف اس وقت تک ہے، جب تک وہ اپنی اور آیندہ آنے والی نسلوں کی زندگیاں فرانسیسیوں کی خدمت کرنے اور ان کے لیے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے میں صرف کرتے رہیں۔ آئے دن الجزائر کے ساحلی علاقوں پر فرانس سے آ کر آباد ہونے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور اس سو سوا سو سال کی مسلسل نو آبادکاری کے بعد اب ان کی تعداد ملک کی کل آبادی کا تقریباً دسواں حصّہ ہو چکی ہے۔ اصل باشندوں کی زمینوں اور مکانوں پر جائز و ناجائز طور پر قبضہ کر کے اُنہیں بے دخل کیا جا رہا ہے، اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہو کہ ملک کی ۲ کروڑ فدان[۱] قابلِ زراعت زمین سے نصف سے زیادہ پر فرانسیسی نو آبادکار

[۱] زمین کی پیمائش کا ایک پیمانہ جو عام طور پر تمام عرب ملکوں میں استعمال ہوتا ہو، عربی انگریزی ڈکشنریوں میں اس کی مقدار ایک ایکڑ کے برابر بتائی گئی ہے، مگر اس بارے میں ہمیں پوری تحقیق نہیں ہو۔

کو مالکانہ حقوق حاصل ہو چکے ہیں۔ ملک کی درآمد و برآمد پر بھی ان کو پورا اقتدار حاصل ہے۔ بیشتر اصل آبادی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فرانسیسیوں کی غلامی اختیار کریں اور ان کے کھیتوں میں مزدوری کرکے پیٹ پالیں جس چیز پر عام مسلمان باشندے سخت نالاں ہیں، وہ یہ ہے کہ قابل زراعت زمین میں زیادہ تر انگوروں کی کاشت ہوتی ہے اور پھر ان کی شراب بنا کر فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں کو روانہ کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں ایسی زمینوں کی قلت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، جہاں عام باشندوں کے لیے غلّہ اور کھانے کی دوسری ضروری چیزیں پیدا ہو سکیں۔ کھانے پینے کی اکثر چیزیں باہر سے منگوائی جاتی ہیں، جو حد درجہ گراں پڑتی ہیں اور عام باشندے اُنہیں بڑی مشکل سے خرید سکتے ہیں، گرانی دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور ملک میں افلاس و غربت کا دور دورہ ہے۔ بے روزگاری کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ایک لاکھ یا اس سے زائد باشندے روزگار کی تلاش میں فرانس میں جاکر کس مپرسی کی حالت میں پھر رہے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی ہیں، مگر ان کے علاج کیلئے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ باہر سے جو دوائیں آتی ہیں، گراں قیمت ہونے کے باعث عام باشندے انہیں خرید نہیں سکتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کھیت یا بندرگاہ پر ایک عرب یا بربر مزدور بھوک یا کسی بیماری کے باعث جان توڑ رہا ہوتا ہے۔ مگر سنگدل فرانسیسی اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور ان کے دل اس غریب کی حالت پر ذرّہ برابر نہیں پسیجتے۔

ب۔ **معاشرت**:۔ مختلف اوقات میں مختلف ذرائع سے فرانس کی یہ کوشش رہی ہے کہ الجزائر کے اصل باشندوں کو ان کے دین وملّت، زبان، تہذیب وتمدن، علم وادب اور دوسری تمام قومی و دینی خصوصیات سے علٰحدہ کرکے فرانسیسی قومیت، زبان اور تہذیب وتمدّن میں مدغم کردیا جائے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آئے کہ وہ اپنا علٰحدہ وجود بالکل فراموش کرچکے ہوں۔ اسی لیے طرح طرح سے ان میں اس قسم کے خیالات ونظریات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فرانس سے الگ ہوکر الجزائر اور اس کے باشندوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے، انہیں بلا تامل فرانسیسی قومیت کو قبول کرلینا چاہیئے۔ دراصل الجزائر فرانس ہی کا ایک حصہ ہے، اسلیے دونوں کو ہمیشہ ایک رہنا چاہیئے۔ کبھی عربوں اور بربروں میں تفریق کرکے ان میں نفرت وعداوت ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ بربروں کی آبادی زیادہ تر مراکش میں ہے، اس لیے عربوں اور بربروں کے درمیان تفریق ڈالنے کی مہم وہاں زیادہ زوروں سے شروع کی گئی ہے اور اب تک جاری ہے۔

ج۔ **تعلیم**:۔ تعلیمی لحاظ سے الجزائر کے باشندے حد درجہ مظلوم ہیں۔ باشندوں کو الگ مدرسے قایم کرنیکی اجازت بہت کم دی جاتی ہے۔ جو دینی مدرسے الگ قایم ہو جاتے ہیں، ان کی نہ صرف یہ کہ مدد نہیں کی جاتی، بلکہ بالواسطہ اور بلاواسطہ طرح طرح سے ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے ایسے مدرسے قایم کیے جاتے ہیں، جن کا مقصد باشندوں میں نہ صرف عربی تعلیم کے رواج کو کم کرکے فرانسیسی زبان کو فروغ دینا ہوتا ہے، بلکہ ان میں فرانسیسی تہذیب اور طرزِ رہائش کو ہر دلعزیز بنانا بھی خاص طور پر ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ باشندوں کی تسکین کے لیے جن میں سرکاری مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم دی بھی جاتی ہے، اس کا حال بھی ناقابلِ گفتنی ہے۔ ہفتہ میں مشکل سے دو یا تین گھنٹے غریب عربی زبان کو ملتے ہیں اور ان میں بھی صحیح زبان سے زیادہ عامی زبان کے سکھلانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ عربی کی تعلیم رومن رسم الخط میں دی جاتی ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ کوئی مسلمان طالب علم عربی زبان یا دینی تعلیم کے حصول کی غرض سے دوسرے مسلمان ممالک کا سفر کرسکے۔ حکومت اس پر سخت نگرانی رکھتی ہے اور کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی طالب علم کو اجازت ملتی ہے، تو وہ یہ کہ فرانس کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جاکر تعلیم حاصل کرسکے۔ اگرچہ اس وقت قاہرہ اور بغداد کے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں الجزائر اور مراکش کے کچھ طلبہ بغرض تعلیم مقیم ہیں۔ مگر یہ سب کے سب اپنے وطن سے خفیہ طور پر بھاگ کر آئے ہیں اور اب

ان کے لیے اپنے گھروں کو واپس جانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ ان دنوں مصر کی وزارت تعلیم کے پیش نظر متعدد اصلاحی اسکیمیں ہیں اسی سلسلے میں اس نے حکومت فرانس سے اجازت طلب کی ہے کہ اسے الجزائر اور دوسرے فرانسیسی مقبوضات میں اپنے مصارف پر عربی مدرسے قایم کرنے کا موقع دیا جائے۔ چونکہ ان دنوں مصر اور فرانس کی حکومتوں کے تعلقات نہایت خوش گوار ہیں، اس لیے بعض مصری حلقوں کا خیال ہے کہ حکومت فرانس ان مدرسوں کے قایم کرنے کی اجازت دے دے گی۔ مگر ابھی کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ آئندہ واقعات ہی اس کا فیصلہ کرسکیں گے۔

د۔ **سیاسی نظام** :۔ فرانس کی طرف سے الجزائر میں جو گورنر مقرر ہوتا ہے "المقیم" (Governor) کہا جاتا ہے۔ بظاہر الجزائر میں پارلیمنٹ بھی ہے اور اس میں باشندوں کے نمایندے بھی شریک ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب تک الجزائر کے باشندے آزاد انتخاب سے قطعی طور پر محروم ہیں۔ پارلیمنٹ میں اکثریت نوآبادکار فرانسیسی نمایندوں کی ہوتی ہے۔ اصل باشندوں کے جو نمایندے لیے جاتے ہیں، ان کے انتخاب میں ملک کی رعایا کو کوئی اختیار نہیں۔ حکومت خود جنہیں چاہتی ہے، منتخب کرلیتی ہے۔ جیسا کہ آج سے پینتیس چالیس سال پہلے ہمارے اپنے ملک میں ہوا کرتا تھا۔

ر۔ **شہری آزادی** :۔ شہری آزادی کے اعتبار سے ایک فرانسیسی اور ایک عرب یا بربر کے حقوق میں بڑا فرق ہے۔ عام باشندوں کو معمولی معمولی جرموں پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک عیسائی یا فرانسیسی باشندے کو سخت ترین جرائم پر اوّل تو سزا دی ہی نہیں جاتی، اور اگر دی جاتی ہے تو بہت ہلکی۔ اہل فرانس کے نزدیک اصل باشندوں کی جان، مال، آبرو کوئی قابلِ احترام چیز ہی نہیں ہے۔

صحافت پر حکومت کا پوری طرح قبضہ ہے، جیسا کہ عام طور پر جابر حکومتوں کا قاعدہ ہوتا ہے۔ آزاد اخبار اور رسالے بہت کم پائے جاتے ہیں، اکثر و بیشتر اخبارات ہر معاملے میں حکومت کی تائید کرتے ہیں۔ اور کسی کا حلقۂ اشاعت وسیع ہوا، تو دوسرے ملکوں میں فرانسیسی پروپیگنڈے کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔

س۔ **مذہبی آزادی** :۔ اس وقت الجزائر میں اسلام کے علاوہ دو مذہب عیسائی اور یہودی بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ان کے پیرؤوں کو اپنے مذہبی احکام کے بجالانے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ ان کے باہمی فیصلے ان کے علماء اور پادری کرتے ہیں، ان کے گرجوں اور عبادت گاہوں کا انتظام ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور حکومت ان کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتی۔ اس کے برعکس مسلمان باشندے مذہبی آزادی سے بالکل محروم ہیں۔ اگرچہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۴۷ء میں حکومتِ فرانس نے الجزائر کے متعلق اپنی پالیسی میں اس دفعہ کا باقاعدہ اضافہ اور اعلان کیا ہے کہ آئندہ سے مسلمانوں کو بھی دوسری قوموں کی طرح پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، مگر ان خوشنما اعلانوں کا کوئی عملی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ حالت یہ ہے کہ غیر شرعی عدالتوں کے علاوہ جو شرعی عدالتیں قایم ہیں، ان کے قاضی اور دوسرے عہدہ دار حکومت خود مقرر کرتی ہے، اور عام مسلمانوں کا ان کے تقرر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ بعض اوقات مسلمانوں کی شرعی عدالتوں کے جج خود فرانسیسی بھی ہوجاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان نام نہاد شرعی عدالتوں کو "شرعی" کا نام دینا شرع اور دین کا مذاق اُڑانا ہے، مگر اس میں فرانس کا کیا شکوہ کیا جائے، بہت سی نام نہاد مسلمان حکومتوں میں بھی دین و شرع کے ساتھ یہ مسخرہ پن کھُلم کھُلا ہو رہا ہے۔

اسی طرح مساجد اور اوقات کا پورا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ مسجدوں میں حکومت خود امام اور واعظ مقرر کرتی ہے اور عام مسلمانوں کو ان کے انتخاب سے کوئی سروکار نہیں۔ اوقاف کی آمدنی کو جمع کرنے اور اسے خود اپنی مرضی کے مطابق صرف

کرنے کا حکومت کو پورا پورا اختیار ہو۔ بعض ایسی بستیوں میں جہاں فرانسیسی فوج مقیم ہو، صبح کی اذان ممنوع قرار دے دی جاتی ہو، تاکہ اس کی آواز سے فوج کے سپاہیوں کی نیند میں خلل نہ آئے۔ عرب علماء کو بربروں کی بستیوں میں جا کر ان میں اسلام کی تبلیغ کرنے سے اکثر روکا جاتا ہے۔ بسا اوقات مسلمان علماء پر خود مسلمان بچوں کو قرآن سکھانے کے جرم میں مقدمات چلائے گئے ہیں اور انہیں چار چار ماہ کی سزا دی گئی ہے۔

---

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ الجزائر کے غیور مسلمان اس حال پر قانع ہیں۔ اپنی دینی اور عربی حمیت کے لحاظ سے شمالی افریقہ کے عرب مسلمان تمام دنیائے اسلام میں ممتاز ہیں۔ یہی وہ خطہ ہو جہاں امیر عبدالقادر جزائری، سید سنوسی اور محمد بن عبدالکریم ریفی جیسے مجاہد اور مصلح پیدا ہوئے۔ آج بھی وہاں کے رہنے والے اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں۔ فرانس کے شرمناک جبر و استبداد کے باوجود الجزائر میں متعدد دینی و سیاسی تحریکیں فروغ پا رہی ہیں اور مقدور بھر ملک و ملت کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہیں کر رہی ہیں۔ دینی تحریکوں میں سب سے ممتاز اور نمایاں جمعیۃ العلماء المسلمین الجزائر کی اصلاحی دعوت ہو، جو تقریباً بیس سال سے اپنا کام کر رہی ہے۔ یہ دعوت بعض لحاظ سے ہندوستان کی تحریک اہلِ حدیث اور مصر کی دعوت المنار سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیکن اپنی روشن خیالی اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے یہ ان دونوں سے برتر اور معاملہ فہم نظر آتی ہے۔ یہ دعوت اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر ایک مستقل صحبت میں گفتگو کی جائے۔ انشاءاللہ تعالیٰ اگر موقع ملا تو اس پر ایک مستقل صحبت میں گفتگو کی جائے گی۔

# دو[1] غیر مطبوعہ خط[1]

## (۱) مولوی نجم الغنی رامپوری کے نام علامہ اقبال کا مکتوب

لاہور ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ حکیم صاحب، السلام علیکم!

اخبار الصنادید" کی دو جلدوں کے لیے سراپا سپاس ہوں، میں نے پہلی جلد کو بالخصوص نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا، قوم افغان کی اصلیت پر آپ نے خوب روشنی ڈالی ہے، کہ شامرہ غالباً اور افاغنہ یقیناً اسرائیلی الاصل ہیں، قاضی میر احمد شاہ رضوانی جو خود افغان ہیں ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ لفظ "فغ" قدیم فارسی میں بمعنی "بت" آیا ہے اور افغان میں الف سالبہ ہے، چونکہ ایران میں بود و باش رکھنے کے وقت افغان بت پرست نہ تھے، اس واسطے ایرانیوں نے انہیں افغان کے نام سے موسوم کیا۔ میرے خیال میں حال کی پشتو زبان میں بہت سے الفاظ عبرانی اصل کے موجود ہیں اگر لسانی تحقیق کی جائے تو مجھے یقین ہے نہایت بارآور ہوگی ـــــ آپکا طرزِ تحریر نہایت سادہ اور موثر ہے اور بہ حیثیت مجموعی آپکی تصنیف تاریخ کا عمدہ نمونہ ہے۔ والسلام!

آپکا مخلص محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا

## (۲) منشی جوالا پرشاد برق کا خط حضرت امیر مینائی کے نام

قیصر گنج ضلع بہرائچ ۱۴ ستمبر ۱۸۹۰ء

مخدوم بندہ! تسلیم،

ایک چھوٹی سی مثنوی جس کا "بہار" میں نے نام رکھا ہے اور جو میری فکر کا پہلا ہی نتیجہ ہے آپ کے ملاحظہ کو بھیجتا ہوں مجھے اُمید ہے کہ آپ اس ناچیز تحفہ کو منظور فرما کر مجھے اعزاز بخشیں گے، چونکہ فی زمانا لکھنؤ میں نقادِ سخن سوائے آپکے دوسرا نظر نہیں آتا اور چونکہ آپ مغربی اور مشرقی دونوں خیالات سے واقفیتِ تامہ رکھتے ہیں اسلیے میں نے مناسب تصور کیا کہ آپ کا استمزاج اس امر خاص میں لوں کہ آیا اپنی شاعری کا یہ رنگ کیوں نہ اُسے کسی دوسرے ڈھرے پر لگاؤں میں نے اس مثنوی میں حتی الوسع دونوں خیالات کو مدغم کرنیکی کوشش کی ہے اب ہا یہ امر کہ میں کہانتک اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اب صرف آپ ہی کی رائے پر منحصر ہے ـــــ دوسری جلد صرف اس غرض سے بھیجی گئی ہے کہ آپ سے حضور نواب صاحب بہادر کے کتبخانہ میں جگہ دیں گے مجھے آپکی خدمت میں فیض آباد میں منشی محفوظ علی صاحب کے ہاں نیاز حاصل ہوا تھا، ان دنوں میں میں فیض آباد میں منصف تھا اب میرا تبادلہ اس کو دریم میں ہوا ہے اگر جواب سے سرفراز فرمایا جاؤں تو جناب میرا پتہ لوح مثنوی پر ملاحظہ فرمالیں[2]۔ آپکا خادم جوالا پرشاد

---

۵۱ عطیہ جناب اسرائیل احمد مینائی

۵۲ پتہ کے لفافہ کی پشت پر "جواب نوشتہ شد" یکم اکتوبر ۹۰ء مرقوم ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت امیر مینائی نے سترہ اٹھارہ دن کی مدت میں غالباً منشی جوالا پرشاد برق کی مثنوی کو پڑھ کر اظہار رائے فرمایا ہوگا، کاش! یہ جواب بھی دستیاب ہو سکتا (م)

مظفر حسین شمیم

# "انقلاب زدہ" ادب!

ہر علم اور ہر فن کے بعض بنیادی اُصول ہوتے ہیں جو زمان و مکان کی تبدیلیوں کے باوجود اپنی جگہ پر قایم رہتے ہیں یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ زمان و مکان کی تبدیلیاں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ یہی حال ادب کا ہے۔ ادب کے بنیادی اُصول اب بھی وہی ہیں، جو ابتدا میں تھے لیکن جس طرح زمان و مکان کی تبدیلیوں کے ساتھ ہر علم و فن کی تفصیلات تبدیل ہو جاتی ہیں اُسی طرح ادب کی تفصیلات بھی بدل جاتی ہیں۔ ادب انسانی جذبات و احساسات اور تجربات کے ایک خاص متناسب طریقے سے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ پہلی جنگ عالمگیر کے خاتمہ کے بعد ہی رُوس میں سُرخ انقلاب رونما ہوا اور اشتراکیت کے اُصولوں پر ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے پہلے جب اٹھارویں صدی میں انقلاب فرانس ہوا تھا تو دنیا کے اربابِ فکر کا زندگی[1] کے متعلق نقطۂ نظر بنیادی طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔ ہر طرف سے انسانی حقوق۔ مساوات اور جمہوریت کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں ٹھیک اسی طرح انقلاب رُوس نے دنیا کے بہت سے مفکرین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی انقلاب کی طرح ڈال دی۔ بیسویں صدی میں مشینری کی ایجاد و ترقی اور رسل و رسائل کی ترقیوں نے دنیا کے معاشی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر دی اور اس نے تمام دنیا کے اربابِ فکر کے سوچنے کے سانچوں پر اثر ڈالا۔

انقلابِ رُوس کے عالمگیر سیاسی، معاشی و معاشرتی اثرات سے قطع نظر اس کے انقلاب نے مختلف ملکوں کی ادبی تحریکوں کو بھی متاثر کیا۔ مختلف ملکوں میں فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر لکھنے والوں کے ایسے گروہ پیدا ہو گئے جنھوں نے اُن طبقوں کے مصائب کو جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی استبداد کی چکی میں پیسے جا رہے تھے اپنی تحریروں کا موضوع[2] قرار دیا، پاکستان اور ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جنھوں نے اقتصادی نقطۂ لحاظ سے بدحال طبقوں کی زندگی کا گہری نظروں سے مشاہدہ کر کے، انہیں محسوس کیا اور، اُن کے مصائب کی ترجمانی اپنے قلم سے کی اور دردمندی کے ساتھ کی ——— لیکن ان اہلِ قلم کی شہرت کو دیکھ کر اس جماعت میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جن میں حقیقی ادب اور ادبی نعروں کے درمیان حدِ فاصل قایم کرنے کی

---

[1] مگر جو لوگ معاشیات اور سیاسیات ہی کو صرف "زندگی" نہیں سمجھتے، اُن کے نقطۂ نگاہ میں اللہ کے فضل سے بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی جس طرح فاضل مضمون نگار نے ابھی ابھی چند سطریں میں پہلے کہا ہے کہ "ہر علم اور ہر فن کے بعض بنیادی اُصول ہوتے ہیں، جو زمان و مکان کی تبدیلیوں کے باوجود اپنی جگہ پر قایم رہتے ہیں" اسی طرح "زندگی" کے بھی کچھ ایسے بنیادی اُصول ہیں جن کو انقلاب چھو بھی نہیں سکتا، (م - ق)

[2] مگر مصیبت زدوں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کی پہل اشتراکی یا اشتراکی تحریک سے متاثر ہونے والے ... میں اور شاعروں نے نہیں کی، گزشتہ ادب میں ظلم و ستم کے خلاف "احتجاج" کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سعدی کی گلستاں اور بوستاں میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں ——— یہ تو رہا ادب کا معاملہ! قرآن پاک میں ظالموں، جابروں اور دوسروں کا حق مارنے والوں کی طرح طرح سے مذمت کی گئی ہے، اشتراکی ادب تو اب پیدا ہوا ہے، اور اُس کی کتابوں میں غریبوں اور بھوکوں کے ساتھ "ہمدردی" کے الفاظ لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھوکا رہ کر فاقہ کشوں کو کھانا کھلایا ہے اور غریب بڑھیاؤں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے سودا سلف جا کر لا دیا کرتے تھے! (م - ق)

صلاحیت نہ تھی۔ نہ تو یہ مزدوروں کی زندگی سے واقف تھے نہ کسانوں کے مصائب سے آگاہ تھے۔ انہوں نے بطور فیشن[1] کسانوں اور مزدوروں کو اپنا موضوعِ بحث قرار دے دیا اور "انقلاب" کے کھوکھلے نعرے بلند کرنے لگے۔ اس جماعت نے ایسے ایسے ادبی شگوفے چھوڑے کہ تمام اہلِ نظر کی عقل حیران رہ گئی۔ لطف یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُن تمام تحریروں کو ادب کی محفل سے مردود قرار دیدیا، جن میں طوائفوں، مزدوروں اور کسانوں کا تذکرہ نہ ہو۔ گویا ادب صرف طوائفوں، مزدور اور کسانوں کی معاشی مشکلات کے تذکرے کا دوسرا نام ہے۔ اربابِ سیاست کا پرانا دستور ہے کہ وہ ہر مفید چیز کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس ادبی تحریک کو بھی سیاست کا شعبہ بنا کر اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ وقتی شہرت کے لالچ میں بعض ایسے لکھنے والے بھی اس وبا میں مرگئے جن میں اچھا ادب پیدا کرنے کی صلاحیت تھی، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اب تک بعض سیاسی افراد اپنے سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر کچھ لکھنے والوں کو بعض ایسی بدعتیں رائج کرنے میں راست یا بالواسطہ مدد پہونچا رہے ہیں جس سے ادب کا سارا حسن خاک میں مل رہا ہے۔ نہ زبان[2] صحیح رہی، نہ بیان درست رہا اور نہ خیالات میں کوئی جدت باقی رہ گئی لے دے کے ایک بے چارہ مزدور یا دوسرا غریب کسان رہ گیا جن کے اردگرد سارا ادب پروانے کی طرح چکر کھا رہا ہے۔ جہاں سوویٹ روس کے زندہ جاوید افسانہ نگار میکسم گورکی نے ان موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے وہاں وہ کسان اور مزدور کے دل سے وہ چیز ڈھونڈھ لایا ہے جو حقیقی ادب کی جان ہے۔ کاش ہمارے یہ نوجوان لکھنے والے گورکی کی تصانیف کا بغور مطالعہ کریں اور یہ سمجھیں کہ اُسے کس چیز نے یہ مقام بلند عطا کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے ان نوجوانوں کو یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ گورکی نے کبھی ادب[3] کو سیاست کا شعبہ نہیں سمجھا۔ وہ ادب کو ہمیشہ ادب سمجھتا رہا۔ وہ نفس مضمون کے ساتھ ٹیکنک کی اہمیت کو نہ بھولا۔ اُس نے کبھی یہ نہیں کیا کہ محض نفس مضمون پر ٹیکنک کو قربان کر دیا ہو۔ اُس کے اندازِ بیان میں ہر جگہ اُس کی انفرادیت قایم ہے۔ ہمارے اِن نوجوان لکھنے والوں کی طرح نہ اُس کے مشاہدے میں کہیں سطحیت کا اظہار ہوتا ہے اور نہ سہل انگاری کا عیب موجود ہے۔ جس طرح روسی انقلاب نے لکھنے والوں پر اثر ڈالا اُسی طرح جنسی مسائل کے

---

[1] اور ہم نے تو انقلابی ادیبوں اور شاعروں کو زیادہ تر اسی فیشن میں مبتلا پایا،

یہی وہ لوگ ہیں جو سُرخ سویرے کیلئے — خونِ مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں

مزدوروں اور کسانوں کے "غم" میں قیمتی سے قیمتی شرابیں پیتے ہوئے ان کو دیکھا گیا ہے، اپنے محلّہ کے کسی غریب اور فاقہ کش کی یہ جھوٹے منہ بھی خیریت نہیں پوچھتے کہ تم کس حال میں ہو؟ ان کو "مزدور" اور "غریب" سے ہمدردی نہیں ہے بلکہ اشتراکی انقلاب سے ہمدردی ہے کہ اس انقلاب کے بعد رہے سہے اخلاقی بندھنوں سے بھی وہ آزاد ہو جائیں گے، اور ان کے عیش دسترس میں اضافہ ہو جائے گا کیوں کہ روس میں جو شاعر اور ادیب ہیں، اُن کی ہزاروں روپیہ ماہوار کی آمدنیاں ہیں، اور وہ خوب گلچھرے اُڑاتے ہیں، (م۔ق)

[2] یہی بات ہم برسوں سے کہہ رہے ہیں کہ ان انقلابی ادیبوں اور شاعروں نے "زبان" اور "بیان" کے حُسن کو غارت کر دیا، اُردو ادب، اب "ادب" نہیں رہا بلکہ "انقلاب زندہ باد" ہو کر رہ گیا ہے، ہماری اس مخلصانہ گزارش پر طنز فرمائی گئی کہ "تم ملّا" ہو، قدامت زدہ اور لفظ پرست ہو اور ایک بہت بڑے انقلابی شاعر بلکہ انقلابی شاعروں کے پیرِ مغاں تو ہمیں "اقبال گزیدہ" کہا کرتے ہیں، اُدا اپنی خبر نہیں کہ وہ

[3] "سیاست" "شجرِ ممنوعہ نہیں ہے کہ کسی ادیب شاعر کے لیے اُس کا چھو لینا گناہ ہو" فاضل مضمون نگار کا غالباً مفہوم یہ ہے کہ ادیب اور شاعر جو کچھ بھی کہے اور جس موضوع پر بھی اظہارِ خیال کرے اُس میں "ادبیت" کا عنصر غالب رہنا چاہیئے، یہ نہ ہو کہ "ادب" صرف پروپیگنڈا بن کر رہ جائے، مثلاً کوئی افسانہ نگار ایک افسانہ لکھتا ہے جس کا بنیادی اور مرکزی تصور "شراب نوشی کی مذمت ہے" ! اپنے افسانہ میں اُسے پند و نصیحت کا واعظانہ انداز اختیار نہ کرنا چاہیئے بلکہ افسانہ کا پلاٹ اور اندازِ بیان ایسا ہو کہ افسانہ کی روح اور اُس کا مجموعی تاثر شراب کے خلاف "احتجاج" کرے (م۔ق)

متعلق فرائڈ کی تحقیقات نے بھی لکھنے والوں کو متاثر کیا لیکن جیسے ہند و پاکستان کے بہت سے نوجوان لکھنے والوں نے سوویٹ روس کے ادب کی روح کو سمجھنے میں بھول کی اُسی طرح اکثر نوجوانوں نے فرائڈ کی جنسی تحقیقات کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی اور اُن کی اِس غلط فہمی کو موپساں اور آسکر وائلڈ جیسے ادیبوں کے مطالعے نے ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ ہر ملک کا تمدّن ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور اُس تمدّن کی مخصوص روایات ہوتی ہیں۔ موپساں نے فرانسیسی تمدّن کے ایک رُخ سے نقاب اُٹھائی ہے اور وائلڈ نے اپنی بعض تحریروں میں انگریزی تہذیب کے پس منظر میں جنسی کجروی کے بعض نقشے کھینچے ہیں لیکن موپساں اور وائیلڈ نے جن اخلاقی کمزوریوں کے خاکے پیش کئے ہیں اُنہیں پڑھ کر کہیں کراہت محسوس نہیں ہوتی، کسی کا جی نہیں متلاتا، یہی آرٹسٹ کا کمال ہے۔ مگر جب ہم اِن موضوعوں پر اپنے نوجوانوں کی تحریریں پڑھتے ہیں تو گھن آنے لگتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اِس کا کھلا ہوا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہ نوجوان نہ تو اپنے دیس کے تمدّن سے آگاہ ہیں اور نہ اُس کی خصوصیات کو سمجھتے ہیں اور نہ اُنہیں یہ معلوم ہے کہ ادب اور جرّاحی میں کیا فرق ہے؟ ادیب اور جرّاح دونوں کے میدانِ عمل بالکل جداگانہ ہیں۔ اپنے وطن میں بیٹھ کر موپساں اور وائلڈ کا منھ چڑھانا دانشمندی کے خلاف ہے۔ ایک اور عیب جو اس زمانے میں خصوصاً اُردو ادب میں نظر آتا ہے وہ مطالعہ اور مشاہدے کی کمی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ اگر کسی لکھنے والے کو زبان و بیان پر پُوری قدرت حاصل نہ ہوگی تو وہ اپنے تاثرات کی جیتی جاگتی تصویریں پیش نہیں کر سکتا۔ یہی حال مشاہدہ کا ہے۔ اگر مشاہدے میں گہرائی نہ ہوگی تو ہر تخلیقی تحریر بے جان رہ جائے گی۔

کاش ہمارے نوجوان لکھنے والے اپنے مطالعہ اور مشاہدے میں گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان ادب بھی کئی چولے بدل چکا ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ میں یہ زمانہ برق رفتار سُرعت کے ساتھ ایک انقلاب کا دور رہا ہے۔ جہاں تک ہند و پاکستان کے ذیلی برّاعظم کا تعلق ہے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کے علاوہ تقسیمِ ہند کے پہلے اور بعد کے ہنگاموں نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی ایک عجیب افراتفری پیدا کر دی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ ادب سے زیادہ اخبار نویسی کا دور ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی ادیب یا شاعر کے قلم سے نظم یا نثر کا کوئی ایسا شاہکار نہیں نکلا جس میں لاکھوں تباہ شدہ انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں سُنائی دیں۔ اس تباہی و بربادی پر نظم و نثر کے اب تک جو نمونے دیکھنے میں آئے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ادبِ عالیہ کی محفل میں جگہ پانے کے لائق نہیں۔ اس صُورت میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا موجودہ حالات میں ہمارے ادیب کے دل نے محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے یا یہ زمانہ ادب کی تخلیق کے لیے ناسازگار ہے؟ لیکن میں اِس ادبی جمود سے مایوس نہیں ہوں۔ اِس طوفان کے بعد جب سکون آئے گا اور مطلع صاف ہو جائے گا تو پھر ادب بھی اپنی اصلی شاہراہ پر آ جائے گا۔

---

شمیم صاحب کا بڑا احسان ہوگا اگر وہ سوویٹ روس کے ادب کی روح اور فرائڈ کی جنسی تحقیقات کا مفہوم سمجھا دیں تاکہ لوگوں کی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں، ہمارے خیال میں تو پاکستان اور ہندوستان کے وہ ادیب اور شاعر جو اشتراکیت سے متاثر ہیں اُسی رُوح کو پیش کر رہے ہیں جو اشتراکی ادب کی بنیاد ہے! آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیک ٹاک کی خامیاں پائی جاتی ہیں، مگر یہ دریا ایک ہی چشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ ——— اب رہا فرائڈ سو اس کی جنسی تحقیقات کے اقتباسات جس قدر ہماری نگاہ سے گزرے ہیں، اُن میں ہوسناکی کی انتہائی شدت پائی جاتی ہے، بہت ممکن ہے کہ فرائڈ کے خیالات کی ترجمانی کرنے والوں سے بھول ہوگئی ہو، مگر جو شخص (فرائڈ) یہ تک کہتا ہو کہ ایک کم سن لڑکی کو اپنے باپ سے اور ایک کمسن لڑکے کو اپنی ماں سے جو محبت ہوتی ہے اُس میں جنسی کشش کا ہاتھ ہوتا ہے، اُس کے خیالات کی بنیاد معلوم! "لذتیت" کے امام مشہور یونانی فلسفی ایپی کورس کے بارے میں تو اہلِ نظر کی یہ رائے ضرور ہے کہ اُس کی "لذت" سے شہوانی لذت مراد نہیں ہے بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ سب سے بڑی لذت نیکی اور پاکبازی کی لذت ہے، مگر فرائڈ کی جنسی تحقیقات کے بارے میں اس قسم کی کوئی توجیہ سُننے اور

اسدؔ ملتانی

# ایمان کی بات

کہیں تسکیں ہی مرے شوقِ فراواں کی نہیں
خلد میں بھی وہ فضا کوچۂ جاناں کی نہیں

آہ، مصروف ہیں وہ لوگ چمن بندی میں
جن کو پہچان گل و سنبل و ریحاں کی نہیں

اہلِ باطل کے کسی عیشِ نمایاں پہ نہ جا
کہ خبر ہی تجھے ان کے غمِ پنہاں کی نہیں

اپنے ہم جنس کے آئین کا پابند بنے
کیا یہ توہین خود آزادیٔ انساں کی نہیں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

ہر سروساماں ہی عمل ہی سے عمل ایماں سے
صرف ایماں کی کمی ہے سروساماں کی نہیں

دل میں ہو اور عمل پر اثر انداز نہ ہو
بات ایماں کی یہ ہے، بات یہ ایماں کی نہیں

زیست اس طرح بسر کرتے ہیں فرد و ملت
جیسے کوئی بھی ضرورت انہیں قرآں کی نہیں

قلم کے دور میں کیا علم کی ہو قدر اسدؔ
مانگ "رومان" کی اس وقت ہے "فاراں" کی نہیں

شاعر لکھنوی

# ...... اے لغزشِ آدم کیا ہوگا؟

جب ہے یہ شکستوں کا عالم پیدا کوئی عالم کیا ہوگا
نظریں تو پریشاں ہو ہی گئیں جلوہ بھی منظم کیا ہوگا

غم ہو کہ مسرّت کی دنیا۔ نغمہ ہو کہ ماتم کیا ہوگا
دِل تو ہے خود اپنا اک عالم دل کا کوئی عالم کیا ہوگا

ہر بار نگاہیں اُٹھیں گی دیدار کے سو ارماں لے کر
جلووں نے مجھے پہچان لیا اب شوقِ نظر کم کیا ہوگا

تھی سب یہ محبّت ہی کی سزا، جنّت چھوٹی دُنیا پائی
اَب کے جو قدم بہکا اپنا اے لغزشِ آدم کیا ہوگا

پروانے بھی ساکِت شمع بھی چپ بکھرے ہوئے گل خالی ساغر
اب اور شکستِ محفل کا ہوگا بھی تو ماتم کیا ہوگا

ہنستے ہوئے دل کے زخموں کا آنسو سے مداوا ناممکن
پھولوں کے تبسّم کی قیمت اک قطرۂ شبنم کیا ہوگا

تجدیدِ محبّت کی خاطر ہم جائیں گے شاعر لیکے یہ دل
نظروں کو بھی جنبش دے نہ سکے اِتنا کوئی برہم کیا ہوگا

عالم اکبر آبادی

# منتخبات

سونے والے شبِ راحت کے تجھے کیا معلوم — کتنی مشکل سے شبِ غم کی سحر ہوتی ہے

ہے تفسیرِ غمِ دل ایک آنسو — اب اس سے بھی زیادہ مختصر کیا

پھول سا چہرہ غم سے اُداس — نیند سے آنکھیں بھی بوجھل

آپ نے کھائی تھی سوگند — ہاتھ میں لے کر گنگا جل

محبت تھی جبھی تو حال دل کا — وہ سنتے ہی پریشاں ہو گئے تھے

میں پھر کچھ عقیدت کے سجدے کروں گا — کہاں ہیں وہ نقشِ قدم رہگذارو!

اُٹھا ساغر اُٹھا ساقی۔ گھٹائیں — صلائے عام لے کر آرہی ہیں

کیا کیا زحمت آپ کو دی ہے — خاک پڑے اِن ارمانوں پر

محفل محفل تم آباد — صحرا صحرا ہم برباد

درد کی دولت جس کو خدا دے — عشق کوئی، دستور نہیں ہے

اپنے کاندھے اپنا بوجھ — کس نے اُٹھایا کس کا بار

دنیا بھی اک گلشن ہے — پھولوں کی سی عمر گزار

سرور سرحدی

آگیا تھا اک ذرا ترکِ محبت کا خیال — عمر بھر اُن کی نگاہوں سے پشیمانی رہی

مجھے تم نگاہِ کرم سے نہ دیکھو — بہت سخت ہے انتقام زمانہ

جلوۂ دوست عام کیوں ہوتا — ہر نظر تو نظر نہیں ہوتی

سعیٔ ترکِ آرزو سے اور وحشت بڑھ گئی — تھا جنونِ شوق پہلے بھی مگر ایسا نہ تھا

یاس کی بگڑی ہوئی تصویریں — جان پڑ جاتی ہے اُن کے نام سے

دلِ مضطر کو بہلانے ستارے لیکے آئی ہے — میں اپنی شامِ غم کی سادگی پر مسکراتا ہوں

وزیر زادہ مہر
جوناگڈھی

# تجلیاتِ مہر

ہر نفس محوِ خیالِ رُخِ جانانہ ہے
اب مرے سامنے کعبہ ہے نہ بُت خانہ ہے

مختصر حُسن و محبت کا یہ افسانہ ہے
شمع کا جلوہ ہے اور گردشِ پروانہ ہے

دِل کا انداز جو ہر لحظہ حریفانہ ہے
یہ بھی اک شعبدۂ نرگسِ مستانہ ہے

پینے والوں کی روش صرف جدا ہے ورنہ
وہی ساقی، وہی مینا، وہی پیمانہ ہے

ہم پہ گذرا نہ کبھی دورِ بہاراں اک دن
زندگی اپنی مثالِ گُلِ ویرانہ ہے

تجھکو معلوم نہیں مسلکِ رنداں ساقی
وہ جہاں جام اُٹھالیں وہیں میخانہ ہے

دل کی دنیا ہمہ تن سوز ہوئی جاتی ہے
آپ افسانہ سمجھتے ہیں تو افسانہ ہے

اُن سے اظہارِ وفا جُرم نہیں ہے لیکن
مہرؔ سوچو تو یہ کیا جُرأتِ رندانہ ہے

شفقتؔ کاظمی

# جذباتِ شفقت

اُن سے چھوٹے تو جی سے در گذرے
آخر اپنی سی ہم بھی کر گذرے

زندگی ہے عجیب چیز، اگر
فکرِ دُنیا سے بے خبر گذرے

آہ مجبوریاں ترے غم کی
شام گذرے نہ اب سحر گذرے

کام دُنیا سے کیا فقیروں کو
بے خبر آئے، بے خبر گذرے

ماہر القادری

# میسور کے برقی فوارے

پھول کھلتے ہیں اُدھر سبزہ اِدھر لہرائے ہے
میں بھی تتلی بن کے اُڑ جاؤں یہ جی میں آئے ہے

نور برساتے ہوئے فوارہ ہائے رنگ رنگ
دل کشی اتنی کہ چلتا آدمی رک جائے ہے

روشنی کی ہر طرف مہتابیاں چھٹتی ہوئیں
چاندنی ہر سمت آغوشِ نظر پھیلائے ہے

شدّتِ انوار سے طاری تھی مجھ پر بے خودی
لوگ یہ سمجھے کہ جیسے جی مرا گھبرائے ہے

ہر روش پر صنعتِ انساں کے زندہ معجزے
ہر قدم پر حیرتِ نظارہ ٹھوکر کھائے ہے

ساحلِ شفاف سے ٹکرا کے موجِ آبشار
قمقموں کی تابشوں کو آئینہ دکھلائے ہے

خوب پی کر جس طرح بہکے کوئی بادہ گسار
ہر روش پر اس طرح بادِ چمن اٹھلائے ہے

دیکھنے کی چیز ہیں یہ برق کی گل کاریاں
جن کی زد میں آ کے ہر صورت حسیں بن جائے ہے

پھول، سبزہ، حوض، فوارے، چمن، بارہ دری
میں یہ سمجھا جنّت شدّاد زیر پائے ہے

ایک ایک کر کے اُبھر آتے ہیں ماہر داغِ دل
جب کبھی یہ منظرِ فردوس یاد آ جائے ہے

حسنین کاظمی
بی۔ اے (علیگ)

# ......اور بینڈ بج رہا تھا ــــــ!

روشنی مغرب کی طرف ڈھلک رہی تھی۔ سائے مشرق کی جانب بھاگ رہے تھے۔ اور ساری دنیا گرم تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ دیواروں کے سائے، آدمیوں کے سائے، اور سائے ہی سائے...... سب کے سب زمین پر رینگ رہے تھے۔

چھمّوں بچارا دیوار سے لگا ہوا سوچ رہا تھا۔

"ایک روپیہ مزدوری کا ملے گا۔ دس آنے کا خرچ اور چھ آنہ کی بچت۔ بارہ آنہ ستائیس روپے میں چھ آنے اور ملائے۔ دو آنے اٹھائیس ہو گئے" اور پھر افسردہ ہو کر رہ گیا۔

"نہ جانے کب سَو روپے کی تھیلی پوری ہو گی۔ کل سے سگریٹ پینا بھی چھوڑ دوں گا۔ چَوَنّی اور بچے گی تو روزانہ دس آنے کی آمدنی ہو جائے گی۔ شاید جلد پوری ہو جائے تھیلی"

اس مہنگائی کے زمانہ میں بچارے کو پیٹ کاٹ کاٹ کر رقم جوڑنی تھی۔ پہلے تو اس کی یہ حالت تھی کہ چاہے اُسے پیٹ بھر روٹی نہ ملے۔ تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی میسر نہ آتے۔ لیکن روزانہ قینچی کے سگریٹ کا ایک پیکٹ ضرور مل جائے۔ کتنا مجبور ہوتا ہے آدمی اپنی عادتوں سے۔ مگر اب تو اُس نے اس خرچ کو بھی بہت کچھ گھٹا دیا تھا۔ دونوں وقت کی روکھی روٹی اور چٹنی کے سوا اس کے پاس اب کوئی خرچ نہ تھا۔

"وہ بالکل چھوڑ دیگا سگریٹ پینا...... بالکل" اس نے تہیّہ کر لیا تھا۔

اور پھر سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

غریب مزدور۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ، سخت محنت اور خالی پیٹ......

صبح جب وہ گھر سے چلا تھا تو دو باسی روٹیاں اس نے پیٹ میں ڈال لی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد نہ جانے کس نے اُسے جگا دیا۔

سب مزدور اپنے اپنے کام پر آگئے تھے اور چھمّن راج بھی۔

آج اس کا دل کام میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

نوراں غائب تھی۔

وہ دن میں کئی مرتبہ اپنے کوٹھے پر چڑھتی تھی۔ اور چھمّوں اُسے دیکھ کر بڑے جوش کے ساتھ کام کرنے لگتا تھا۔ نوراں کی غیر موجودگی اُسے کھل رہی تھی۔ وہ بہت غمگین اور اداس تھا۔

نوراں اسی مکان کے قریب ہی رہتی تھی جس جگہ وہ کام کیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ پانی بھر کر لا رہی تھی۔ راستے میں پیر پھسلا اور گر پڑی۔ وہ رونے لگی۔ چوٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے سخت گیر باپ کے غصہ کی وجہ سے۔

"اب وہ گھڑا کہاں سے لائے گی" بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی اور روتی جاتی تھی۔ نرم و نازک ہاتھ آہستہ آہستہ

پیر کو سہلا رہا تھا۔

چھموں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا اور وہ بھی روتے ہوئے۔ ایک حسین اور نازک لڑکی روتی ہوئی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہوگی اس لٹھ گنوار کو۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ نوراں کا رونا اس سے دیکھا ہی نہیں گیا۔

چھموں اُسے تسلیاں دے رہا تھا اور وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

اُس نے پانی بھر کر نوراں کے گھر پہونچا دیا۔ اپنے پاس سے گھڑا لاکر! اور پھر اس طرح اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا منہ بند ہوا۔ پانی کا اُتار چڑھاؤ؟ انسانی ہمدردی؟ کتنی معمولی سی بات تھی یہ؟ کوئی بڑی بات بھی تو نہیں تھی۔

محبت کے بعض موڑ کتنے سپاٹ ہوتے ہیں!

اب وہ اس سے ہمدردی کرنے لگی تھی۔

اس کے لیے اور اس کے کنجوس باپ کے لیے یہ بات بہت اہمیت رکھتی تھی۔ مٹی کا ایک کچا گھڑا اس کے باپ کے لیے سونے کا گھڑا تھا۔ اسی گھڑے اور پانی کے بہانے میں نہ جانے اس غریب کو کتنے آنسو بہانے پڑتے۔

مٹی کا کچا برتن ... ... اس لڑکی کی زندگی کے ایک بہت ہی اہم موڑ پر لگا ہوا سنگ میل ... ... مٹی کا گھڑا! ... ... سنگِ میل!! ... ... چھموں!!!

چھموں میں بظاہر کسی قسم کی کشش نہ تھی، اوپر کو اُٹھی ہوئی کھوپری، تنگ پیشانی، بیٹھی ہوئی ناک، چندھی آنکھیں، ٹیڑھی انگلیاں، ننگے پیر ... ... اور چال ... ... دھم دھم ... ... جیسے زمین کے سینے پر دُھرمٹ بج رہے ہوں، ہاں! وہ سچ مچ اسی طرح چلتا تھا، دھم دھم کرتا ہوا، ایک اُجڈ گنوار کی چال نستعلیق کہاں ہو سکتی ہے!

چھموں ... ... بے ڈھنگا ہی نہیں احمق بھی تھا، گاؤں والے جسے "عقل کا کولھو" کہا کرتے ہیں! کوئی بات کیوں نہ ہو رہی ہو، اُس کو تو بس ہنسنے سے کام! اور ہنستے میں، اُس کے پیلے پیلے دانتوں اور چندھی آنکھوں کا منظر ... ... ایک مضحکہ سے کم نہ تھا ——— مگر نوراں کو اُس سے دلچسپی تھی، دل کے معاملات عجیب ہوتے ہیں، وہاں عقل کی چلتی نہیں چلتی پسندیدگی کے لیے کوئی معیار نہیں، بس! جسے دل چاہنے لگے۔

چھموں بھی اس آگ کی گرمی کو محسوس کرنے لگا ... ... اب وہ چپ چپ رہتا، کچھ کھویا ہوا سا؟ اُس کی ہنسی، بہنگم قہقہے، بندر کی سی حرکتیں اور ہر چھوٹے بڑے سے مذاق ... ... سب کا سب جیسے نوراں نے چھین لیا ہو۔

اُسے نوراں سے محبّت ہو گئی تھی۔

اور آج نوراں غائب تھی۔ نہ جانے کیوں؟ نہ جانے کہاں؟ اور اسی لیے وہ سستی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا اس کا۔

"کیوں بھتّن، نوراں سے جھگڑا ہو گیا ہے آج؟ کہیں چلی گئی ہے؟ بیمار تو نہیں ہو گئی وہ؟" ... ... جھجن اُستاد اس سے پوچھ رہا تھا۔

چھموں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"تیرے منہ میں خاک" الفاظ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئے۔

"دو آنہ اٹھائیس ... ... ابھی تو بہت دن ہیں۔ سَو روپے کی تھیلی ... ... بیاہ ... ... نہ جانے کہاں ہو گی وہ ... ... کہیں سچ مچ تو بیمار نہیں ہو گئی" سوچتے سوچتے اس کے ہاتھ سے گارے کی پرات گر گئی۔ اور اس کا پیر ہو

لہان ہو گیا۔

اُسے نوراں کی محبت کا پورا فلم دکھائی دینے لگا۔ ۔ ۔ ۔ وہ حسین نظارے، ایک دوسرے کا آمنا سامنا، شرم کے مارے جھکی ہوئی نگاہیں، دبی زبان سے بیاہ کا وعدہ بھی!

اور پھر ایک دن کا واقعہ بھی یاد آ گیا، جس دن چھموں کو اُس نے اپنے بدن پر رسیوں کے نیل دکھائے تھے، اُس کے باپ کے غصّہ کے نشان! چھموں اُن کو دیکھ کر تڑپ تڑپ گیا، نوراں کے بدن کے نیل چھموں کے دل پر منتقل ہونے لگے اس نے ایک پھریری لی۔ اور پھر سَو روپے کی تھیلی اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی رسی بٹنے والے لٹّو کی طرح۔

سَو روپے کی تھیلی۔ ۔ ۔ ۔ جو اس نے شادی کی شرط ٹھہرائی تھی، نوراں نے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے کنجوس اور لالچی باپ کے منھ پر مارنے کے لیے چاندی کے ٹکڑے۔ اس کی آواز کو بند کرنے کے لیے چاندی کے اینٹ پتھر۔

وہ تڑپ کر رہ گیا۔

اس نے جلدی جلدی کام ختم کیا۔ اور نہا دھو کر پرانے کھنڈر میں برگد کے گھنے درخت کے نیچے پہونچ گیا جہاں سے نوراں گزرا کرتی تھی۔

لیکن وہاں بھی سوائے اندھیرے کے کوئی دوسرا نہ ملا۔ وہ گھر واپس ہونے لگا۔

وہ تنہا نہ تھا۔ ناامیدیاں۔ مایوسیاں۔ بدگمانیاں۔ سب کی سب اس کے ساتھ تھیں صرف نوراں کہیں کھو گئی تھی اس کے گارے اور چونے کے محلوں کی رانی۔

وہ روزانہ کام پر جاتا۔ لیکن بے خوشی اور چاؤ سے نہیں۔ پیٹ کی خاطر۔ وہ کام کرتا مگر جوش کے ساتھ نہیں۔ اس کا دل ہی نہیں لگتا تھا،

"سَو روپے کی تھیلی اور نوراں"

وہ بچارا گارا بنایا کرتا۔ پسینے کے قطرے گارے میں ٹپکا کرتے اور وہ پھاوڑے اور پیروں سے پچاک پچاک کیا کرتا۔ پرات میں گارا بھر کر جب وہ اوپر دو منزلہ پر لے جاتا تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگتیں۔ وہ ہانپنے لگتا۔ پسینے کی نالیاں اس کے بدن سے پھوٹ نکلتیں اور نسیں پھول پھول کر ایسی ہو جاتیں جیسی چھجّن راج کی سوتی ڈور۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ شرابور ہو جاتا۔ اور پھر ناریل کے حقہ میں سُلفہ رکھ کر پینے لگتا۔ چلم سے اس کی تھکن دور ہو جاتی۔ یا پھر نوراں کی دبی دبی مسکراہٹ کی یاد سے اس کی اداس زندگی کھلکھلا اُٹھتی۔

چھجّن کرنی سے گارا پھیلاتا اور اینٹیں چُنتا چلا جاتا۔ اور پھر سوت کی ڈور سے دیوار کو ناپتا۔ "کیوں بھیّن ٹھیک ہے رَدّا؟"

چھموں چونک پڑتا جیسے سوتے وقت کس نے اس کے پیروں پر فاختہ اُڑا دی ہو۔

"ہاں ٹھیک ہی ہے چھجّن اُستاد۔ تمہارے راستے میں کہاں سے آئے کھانچے"

پسینہ پونچھ کر وہ پھر مایوس ہو جاتا۔ اور ناریل کے حقے سے دل بہلانے لگتا۔

ساٹھ ستّر دن گذر گئے۔

منزلیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔ چھجّن اونچا ہوتا چلا گیا۔ چھموں اونچا ہوتا چلا گیا۔

روزانہ چڑھنا اور اترنا۔ عجیب قسم کے نشیب و فراز تھے ان کی زندگیوں میں!

کسی دن تو چھموں کو دو منزلے پر کھڑے ہوئے اپنی کامیابی کی منزل کے روشن چراغ جگمگاتے ہوئے نظر آتے۔ اور

کسی دن وہ اوپر سے نیچے گرتا ہوا معلوم ہوتا۔
اُمید کی کرن ابھی باقی تھی اور تھیلی کی جستجو۔
اُس کا خیال تھا کہ نوراں اُسے دھوکا نہیں دے گی۔ یہ خیال ٹھیک تھا۔
لیکن نوراں ؟

وہ اپنے باپ سے مجبور تھی۔ اور اس کا لالچی باپ ؟ اس کمبخت کا تو خیال ہی کچھ اور تھا۔ چھجوں کو یہ بات معلوم نہ تھی یا اگر معلوم بھی ہو۔ پھر بھی وہ تو منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اُسے کسی اور چیز سے مطلب ہی نہ تھا۔
"سَو روپے اور نوراں"

اب اس کے پاس ستّر اَسّی روپے جمع ہو گئے تھے۔
وہ بہت محنت سے کام کرنے لگا تھا۔ ۔۔ ۔۔ گارا بھر بھر کر اوپر لے جانا۔ نیچے اُترنا اور پھر بھرنا ۔۔ ۔۔ ۔۔ دیواریں اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں اور چھجّن بھی۔
وہ بہت خوش تھا۔ اس کا کام ختم ہونے والا تھا۔
لیکن چھجّوں اداس تھا۔ ۔۔ ۔۔ "اب اس سے یہ مکان چھوٹ جائے گا۔ نوراں کے ورشتوں کا رنگ محل۔
وہ سوچ رہا تھا "کاش چھجّن اس منزل کو کچھ دن تک اور چنتا رہے"
چھجّوں گارا لینے کے لیے نیچے اترا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔
دُور گلی کے نکڑ پر باجہ بجتا ہوا آ رہا تھا کسی کی بارات کا جلوس تھا۔
باجہ سُن کر نہ جانے کیوں اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔
شاید اُسے اپنی بارات چڑھنے کا خیال آجاتا ہو۔
اور سیڑھی پر پیر رکھتے وقت بھی وہ پریشان تھا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھ رہی تھی۔
"نہ جانے میں کب دولہا بنوں گا۔ کب سہرا باندھا جائے گا میرے۔ گھوڑے پر بیٹھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔۔۔ آتشبازی۔۔ نوراں"
اور پھر اس کے دل کو ڈھارس ہوگئی "ستّر اَسّی روپے تو ہو ہی گئے ہیں۔ بیس پچیس کا معاملہ اور ہے۔ یہ کونسی بڑی بات ہے"
تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ کو دولہا بنا ہوا نظر آیا۔ اور بجتا ہوا بینڈ باجہ۔ ۔۔ ۔۔ تو تو تو۔۔۔ ۔۔ بھوں بھوں، وہ نیچے اتر رہا تھا اور بارات آگے کو بڑھ رہی تھی آہستہ آہستہ۔
جلدی جلدی اُتر کر وہ گارا لے آیا۔
بارات بھی چڑھ رہی تھی اور وہ بھی۔
آخری منزل پر پہونچ کر اس نے دیکھا کہ بارات نوراں کے دروازے پر آ کر رک گئی ہے۔
اس کا دل بڑی تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔
چھجّن مسکرا رہا تھا۔ ایک غمگین اور تلخ مسکراہٹ !
"کیا دیکھ رہے ہو۔ چھجّوں بھتیجے ۔۔ ۔۔ ۔۔ نوراں کی بارات ہے نوراں کی۔ اسی کا نام ہے دنیا ۔۔ ۔۔ ۔۔ زندگیوں کی اونچ نیچ۔ ٹیلے اور قبریں ۔۔ ۔۔ ۔۔ گارا اور اینٹ"

وہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔

سونا۔ چاندی ۔۔۔۔ نوراں

اینٹ گارا ۔۔۔۔ چھتوں

اُسے ایسا معلوم ہوا کہ نوراں کوٹھے پر کھڑی ہے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی ہے۔

"چھتوں! میری اس میں کوئی خطا نہیں ہے، میں اپنے باپ سے مجبور ہوں، مجھے ربڑ کی گڑیا جانو۔ مجھے بیچا جا رہا ہے اور میں خاموش ہوں"

چھتوں چیخنے لگا ۔۔۔۔ نوراں ۔۔۔۔ نوراں - اسّی روپے میرے پاس ہیں۔ بیس کی کسر ہے۔

نوراں ۔۔۔۔ نوراں سَو روپے کی تھیلی"

اور پھر وہ اس کی طرف لپکا جیسے اُسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہو۔

اڑڑڑ ادھم ۔۔۔۔۔۔

وہ سڑک کے اوپر پڑا تھا۔ دو منزلے کے نیچے۔ خون میں لتھڑا ہوا!

اور اُس کے اوپر منزل آخر کی دو چار آخری اینٹیں اور گارے کی برات۔

اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ چہرہ لہولہان تھا جیسے سُرخ مقنع اس کے چہرے پر پسینے کی وجہ سے بھیگ کر چپک گیا ہو۔

اور اب وہ دولہا بنا ہوا اپنی دولہن کے پاس پہونچ چکا تھا۔ اس سے ہمکنار ہونے۔ نوراں سے نہیں عروسِ قضا سے۔

شام کے دھندلکے میں دو جلوس جا رہے تھے۔

ایک جنگل کی طرف ۔۔۔۔ قبرستان!

اور دوسرا بستی کی طرف ۔۔۔۔ پیا کے دیس

ایک خاموش اور دوسرا ناچتا کودتا۔

"ہم تیری ہی طرف سے آئے ہیں اور ہمیں تیری طرف لوٹنا ہے"

"میں تو بمبئی سے دولہن لایا رے ۔۔۔۔ او بابو جی۔ میں تو ۔۔۔۔"

دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔

فضا میں بینڈ باجے کی ہلکی ہلکی آواز لہرا رہی تھی۔ "میں تو بمبئی سے دولہن ۔۔۔۔"

---

(اس افسانہ میں "رومان" بہت ہلکے قسم کا ہے! مگر ایک غیرت مند طبیعت اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ مزدور کی موت کہیں اُس لغزش کا سبب نہ ہو کہ وہ ایک نامحرم عورت سے "تعلق خاطر" رکھتا تھا، اور اُس کے نظارۂ حُسن و شباب سے اُس کی آنکھیں چٹخارے حاصل کرتی تھیں، شرافت، غیرت اور پاکبازی کے تقاضے بہت بلند ہوتے ہیں۔

(ادارہ)

# روح انتخاب

## روس میں دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار

کیا روس میں سرمایہ داری نہیں۔ کیا اسٹالن ایک بہت بڑا سرمایہ دار نہیں اتنا ہی بڑا جتنا بڑا سرمایہ دار ٹرومن اور اٹیلی ہے۔ اس کا اندازہ ایک تازہ خبر سے لگایئے۔

مارشل اسٹالن نے اعلان کیا ہے کہ جو شخص اس کے بڑے لڑکے جیکب یاشا یوگاس دلی کی قبر کا نشان پتہ بتائے گا۔ اس کو انعام دیا جائے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا انعام کی رقم کیا ہو گی۔ کیوں کہ صاحب زادہ مر چکا ہے۔ وہ توپ خانے میں کپتان تھا۔ جنگ عالم گیر میں جرمنوں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ اور قید ہی میں سنہ ۴۲ء میں مار ڈالا گیا۔ اور وہیں کہیں دفن کر دیا گیا۔ اسٹالن کا یہ بیٹا پہلی بیوی سے ہے۔ اس کی قبر کا نشان معلوم کرنا کوئی اہم معاملہ نہیں۔ اور نہ ایک مزدور رہنما کے مالی حالات اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ ایسے معمولی کام کے لیے کوئی بڑا انعام تجویز کر سکے۔ جنگ عالم گیر میں لاکھوں ہی ماؤں کے لال تھے جو مٹی میں مل گئے اور ان کی قبروں کے نشان کسی کو معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئی۔ غالباً آپ کا خیال ہو گا کہ انعام کی رقم ۹ پونڈ ہو گی۔ ایک مزدور لیڈر کی توفیق سے تو یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ مگر نہیں انعام کی رقم زیادہ ہے ——— کیا ۹۰ پونڈ؟ ——— نہیں اس سے زیادہ غالباً ۹ سو پونڈ؟ ——— نہیں اور بڑھیے! لیکن ۹ ہزار سے تو کسی صورت زیادہ نہیں ہو سکتی؟ ——— نہیں اندازے کو اور وسعت دیجیے! ——— غالباً آپ تھک گئے ہوں گے۔ آپ کا خیال ہو گا کہ یہ رقم بھی بہت زیادہ ہے۔ نہیں۔ غور سے سنئے دنیا بھر کے مزدوروں اور فاقہ کشوں کے سب سے بڑے ہمدرد نے اپنے بیٹے کی قبر کا پتہ بتلانے والے کو ۹۰ ہزار پونڈ بطور انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اسٹالن ایک مزدور رہنما ہے۔ سرمایہ دار تو کیا ہو گا۔ سرمایہ داروں کا دشمن ہے۔ سرمایہ داری سے اس کو سخت نفرت ہے۔ غور فرما کر اندازہ لگایئے کہ جو شخص ۹۰ ہزار پونڈ صرف اپنے بیٹے کی قبر کا نشان معلوم کرنے کے لیے صرف کر سکتا ہے۔ اس کے پاس کتنی دولت ہو گی۔ ٹرومین چرچل اور فورڈ بھی اتنا بڑا داؤں اتنے معمولی پانسے پر لگانے کا تصور کہاں کر سکتے ہیں۔

اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جیکب یاشا گاسو کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ مرا نہیں بلکہ اشتراکی نظام سے "کفر و ارتداد" اختیار کر کے پہلے سوئٹزرلینڈ بھاگ گیا تھا۔ اور وہاں سے پیرس پہونچ گیا۔ یہ ۹۰ ہزار پونڈ کی رقم اس کی قبر کے نشان کی قیمت نہیں بلکہ اس کے سر کی قیمت ہے۔ یہ انعامی اشتہار سرخ فوجی اخبار موسوم بہ ریڈ اسٹار میں شائع ہوا ہے۔

اگر یہ بات اتنی ہی ہے کہ قبر کا نشان معلوم کرنا مقصود ہے۔ تب بھی اتنے معمولی اور فضول سے کام کے لیے نوّے ہزار پونڈ کی رقم کا انعام مقرر کرنا سرمایہ دارانہ ذہنیت کی بدترین صورت ہے۔ اور سرمایہ داری کی علامت ہے۔ اور اگر یہ قیمت اس غریب کے سر کی ہے تو اور زیادہ معیوب کیونکہ یہ نہ صرف اشتراکیت کے کھوکھلے پن کا اظہار کرتی ہے بلکہ اشتراکی ذہن کی ظلم پسندی اور چھچھورے پن کا بھی اعلان ہے۔

بندوں کی خداوندی ——— اس کا نام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت ——— ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں ؛ (سہ روزہ کوثر)

# ہماری نظر میں!

**اُردو ادب** "اُردو ادب" انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ، ایڈیٹر:- آلِ احمد سرور، ضخامت ۱۵۲ صفحے، لکھائی چھپائی کی دلکشیوں کے ساتھ! قیمت سالانہ دس روپے، فی پرچہ ڈھائی روپے، ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڈھ

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ "اُردو ادب" کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے، جو اُردو زبان کے مشہور ادیب جناب آلِ احمد سرور کی ممتاز ادارت میں شائع ہوا ہے، اور اس طرح شائع ہوا ہے کہ اربابِ ذوق کی پذیرائی کے لیے سنجیدہ ادب کی کافی دلچسپیاں اُس کے اندر موجود ہیں۔

"حرفِ آغاز" میں فاضل مدیر نے اپنا دل کھول کر کاغذ پر رکھ دیا ہے، اس میں دردمندی ہے، خلوص ہے، حقائق ہیں اور اردو زبان کے اُن محسنوں کا ماتم بھی ہے، جن کو موت نے ہم سے چھین لیا، ان گنتی کے چار صفحوں میں کہنے والے نے بہت کچھ کہہ دیا، اس میں ٹھوس حقیقتیں بھی ہیں، دُور رس اشارے بھی ہیں اور مفید مشورے بھی! ــــــ صفحہ (۷) پر ایک جملہ ہے:-

"اُسے (یعنی اُردو زبان کو) ہندوستان کی بنیادیں از سرِ نو تازہ ہوائیں عطا کرنی ہیں"۔ "بنیادوں اور ہواؤں کا عطا کرنا" ایک عجیب سی بات ہے! یہ خیال مضمون نگار کو دوسرے لفظوں میں ادا کرنا تھا، یہ جملہ "ترجمہ" سا معلوم ہوتا ہے۔

توازن ــــــ زندگی اور ادب" میں ــــــ یہ مضمون بھی آلِ احمد سرور کا لکھا ہوا ہے اور مجموعی طور پر خوب ہے مگر سرور صاحب ہمیں معاف فرمائیں مضمون کے بعض حصّوں میں ادبیت کم اور فلسفہ زیادہ ہے، اور جہاں جہاں "فلسفہ" ہے، وہاں شگفتگی اور سُلجھاؤ کی کمی محسوس ہوتی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے ماحول کی کشمکش کا یہ اثر ہے، صبر و ضبط سے کام لیکر کوئی اپنے دل کو چاہے کتنا ہی سخت بنالے مگر گرد و پیش کے حالات سے غیر متاثر رہنا کسی طرح ممکن نہیں!

اس مضمون میں ترقی کا رجحان، علم و عمل کا صحیح توازن، فرد کی آزادی، سماج، سائنس، عقل کی اہمیت، روایات کی پابندی" نظم اور غزل کا ادب اور زندگی میں مقام ــــــ اتنے بہت سے مباحث آگئے ہیں اور ظاہر ہے کہ چند صفحوں میں شرح و تفصیل کی سمائی کس طرح ہو سکتی ہے، اس لیے بعض باتیں پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آسکیں وجدان تشنگی محسوس کرتا ہے۔

آج کل "ادب اور زندگی ــــــ "زندگی اور ادب" کے نعروں سے شعر و ادب کی فضا گونج رہی ہے مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ آخر خود "زندگی" کیا ہے؟ یہی کمی اس مضمون میں بھی پائی جاتی ہے، "زندگی" کا واضح اور یقینی تصور چونکہ دماغوں میں موجود نہیں ہے اس لیے "زندگی"، "ترقی"، "انسانیت" اور "سماج" کی جو تشریح کی جاتی ہے اُس میں عجیب عجیب فلسفیانہ تضاد نظر آتے ہیں۔

ایک جملہ ہے:- "انسان جب ترقی کرتا ہے تو وہ روایات یا وراثت کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے" (صفحہ ۱۰) ہمارے خیال میں یہ کلیہ ہی سرے سے غلط ہے کہ ترقی کے لیے روایات اور وراثت کی پابندیوں سے آزادی ضروری ہے! انسان کو روایت اور وراثت میں بہت سی اچھی باتیں، مفید تصورات اور کارآمد تجربات بھی ملتے ہیں، تو کیا اُن کو محض "روایت" سمجھ کر نظرانداز کردینا چاہیئے، یہ تو خود زندگی کی ترقی کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔ پچھلوں کے تجربے ہمارے کام آرہے ہیں اور ہمارے تجربے آنے والوں

کے کام آئیں گے ؟

اگر کوئی تجربہ تصور یا اصول انسانوں میں بہت دنوں سے چلا آرہا ہے اور وہ فی نفسہ مفید اور کارآمد بھی ہے تو اُسے " وراثت " اور " روایت " کہہ کر ٹھکرا دینا فکر ونظر کی بہت بڑی غلطی بلکہ ترقی کی موت اور خود زندگی کی خودکشی ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کو یہ سمجھ کر کاٹ ڈالے کہ یہ مجھے چونکہ " وراثت " میں ملے ہیں، میں ان سے کیوں کام لوں، مجھے تو روایتی اور وراثتی اشیاء اور آبائی تصورات کو نظر انداز کر کے اپنی دنیا خود بنانی ہے ——— نہ روایت بُری ہے اور نہ وراثت، اصل اعتبار چیز کی اچھائی اور افادیت کا ہے۔

(صفحہ ۱۰) " ترقی دریا کے بہاؤ پر تنکے کی طرح بہنے کا نام نہیں، دریا اور اُس کی موجوں پر اپنی شخصیت اور اپنے مقصد کا نقش قائم کرنے کا نام ہے، اقبال کے الفاظ میں یہ زمانے پر حکمراں ہونا ہے ——"

مگر کوئی خدا کا بندہ وقت کے دھارے میں نہ بہے تو اُس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ قدامت زدہ اور رجعت پسند ہے اور وقت کے نئے تقاضوں کی اسے خبر نہیں یہ ابھی تک بسم اللہ کے گنبد سے باہر نہیں نکل سکا ——— اور کوئی مجاہد اپنے مقصد کا دریا کی موجوں پر نقش بٹھانا چاہتا ہے، تو اس پر طنز کی جاتی ہے کہ یہ " آمریت " ہے، فلاں مقصد اپنی افادیت کھو چکا ہے، اب نیا زمانہ ہے، نئی قدریں اور نئے پیمانے ہیں ——— تو آخر آدمی کیا کرے کیا نہ کرے!

(صفحہ ۱۳) " ہمارے دور میں تہذیب کا سوال بھی ایک معمہ بنا ہوا ہے، بعض لوگ صدیوں کی پرانی تہذیب واپس لانا چاہتے ہیں، وہ یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ایسا کرنا صدیوں کی ترقی کو نظر انداز کر دینا ہے، ہندوستان میں دو ہزار سال یا پاکستان میں تیرہ سو سال پہلے کی تہذیب کو اوّل تو نافذ نہیں کیا جا سکتا، دوسرے ایک حد تک اوپری باتیں لی جاسکتی ہیں اس تہذیب کو زندہ نہیں کیا ۔۔"

بھارت ورش کے مذہب اور تہذیب کے بارے میں تو یہ عرض ہے کہ بھارت کا مذہب اور تہذیب تاریخ کے کسی بھی دور میں بین الاقوامی نہیں رہی، پھر بھارت ورش میں سدا سے شہنشاہوں، راجاؤں اور سامراٹوں کی حکومت رہی ہے، بھارت کی تہذیب جمہوریت کے تصور تک سے آشنا نہیں ہے، بھارت کے قدیم عہد میں کسی انقلابی تحریک کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، جو لوگ دو ہزار سال قبل کی تہذیب ہندوستان میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لیں، اُن کو اپنے قدیم تصورات اور معتقدات میں بہت کچھ کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرنی پڑے گی جب کہیں جا کر گزشتہ تہذیب کی چند قدروں کو زندہ کیا جاسکے گا۔

اسلامی تہذیب بین الاقوامی تہذیب ہے، نیکی کے بنیادی اصولوں کے ساتھ زمانہ کے ہر مفید تقاضے کا وہ ساتھ دے سکتی ہے، اسلام انسانیت کو زندگی کا ایک جامع پروگرام دیتا ہے، اور یہ پروگرام افلاطون کی ریاست کی طرح خیالی اور تصوراتی نہیں ہے، خود پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی میں اُس پروگرام اور نظام کو قائم کر کے اور چلا کر دکھا دیا، پھر خلفائے راشدین کا زمانہ آیا، اس زمانہ میں بھی یہ نظام قائم رہا، انسانیت کو اس قدر سُکھی اور خوش حال پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔

اسلامی تہذیب کے احیاء سے یہ مطلب نہیں ہے کہ موٹروں، ٹراموں، بائیسکلوں اور ہوائی جہازوں کو جلا دیا جائے گا، اور سب لوگ اونٹوں پر بیٹھا کریں گے، کرسیوں، میزوں اور صوفوں کی جگہ بورئیے اور چٹائیاں استعمال ہوا کریں گی، بندوق توپ اور بموں کا جواب تلواروں، نیزوں اور تیروں سے دیا جائے گا، جس کسی نے ان چیزوں کو " اسلامی تہذیب " سمجھا ہے، اُس نے نہ تو اسلام کو سمجھا اور نہ وہ نفس تہذیب سے واقف ہے، اسلامی تہذیب کے احیاء کے یہ معنیٰ ہیں کہ اسلام کے اصولوں کی ترویج ہوگی، سائنس کی تمام ترقیوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے گا، صنعتیں اور ایجادیں آج جہاں پہونچ چکی ہیں انکو ایک قدم پیچھے بھی نہ ہٹایا جائے گا بلکہ اُن کو بڑھانے اور پھولنے پھلنے کے موقع دیئے جائیں گے، مگر یہ سب کچھ ایک اصول کے تحت

اور ایک مقصد کے لئے ہوگا، اسلامی تہذیب منکرات سے بچنے اور نیکیوں کے پھیلانے کا نام ہے، ہم پاکستان کیا ساری دنیا میں ایسی تہذیب، ایسی معاشرت، اس قسم کی سیاست اور اس انداز کا ماحول چاہتے ہیں جہاں بزرگی کا معیار "نیکی" کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو، جہاں بڑے سے بڑے حاکم کو سربازار ایک عامی ٹوک سکے، جہاں تاریکیوں اور تنہائیوں میں خدا کے خوف کے سبب آدمی برائیوں سے بچ سکے، "اسلامی تہذیب" "نانِ بے اخلاق" کی قایل نہیں ہے، وہ روٹی کے ساتھ آدمی کو اخلاق بھی دیتی ہے۔

آلِ احمد صاحب سرورؔ اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں، مگر ایک مسلمان کے ذہن میں یہ تصور آیا تو کس طرح آیا کہ تیرہ سو سال قبل کی تہذیب اب زندہ نہیں کی جاسکتی، اللہ اللہ! تعلیم یافتہ مسلمان تک اب اس قدر نیچے اُتر آئے ہیں کہ خود اپنی اسلامی تہذیب پر طنز کرتے ہیں!
(صفحہ ۱۸) "ادب کی بڑھوتری میں شاعری کا یہ غلبہ حارج ہوا ہے" ——— لفظ "ترقی" اُردو زبان کے روزمرہ میں داخل ہے، راہ چلتے لوگ بھی اس لفظ کو بولتے اور سمجھتے ہیں، اس کو اور زیادہ آسان بنانے کی ضرورت نہ تھی "بڑھوتری" "روپیہ پیسہ کی اصطلاح ہے"، "ترقی" کا مترادف لفظ تو "بڑھوار" ہوسکتا ہے، مگر "بڑھوار" زیادہ تر فصل، درختوں اور پودوں کے لیے بولتے ہیں مثلاً "اس پودے کی بڑھوار ماری گئی" یعنی اس کی ترقی رک گئی۔

جناب محمد مصطفےٰ خاں مدّاحؔ ——— یادش بخیر حضرتِ احمقؔ پھپھوندوی کا مضمون "رامائن اور عربی فارسی لفظ" بہت خوب ہے، صاحبِ مضمون نے تلسی داس جی کی رامائن سے وہ اشعار (چوپائیاں) چُنے ہیں جن میں فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مثلاً ——— صاحب، رُخ، رضا، وداع، باغ، صحیح ساز، خبر، بازار، منشا، شہنائی، پیادہ، شور، اندیشہ، غریب، غنی، نوازنا، بخشش، سزا، سرتاج، قبول، کُلاہ، بازی گر، نفیر، بذل، فراخ، پیچ، جہیز ——— یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ اُردو پیدا بھی نہیں نہیں ہوئی تھی، تلسی داس جی کا سنہ پیدایش ۱۵۳۲ عیسوی ہے اور اُن کی مشہور تصنیف رامائن ۱۵۷۴ء میں پوری ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے چار سو سال قبل بھارت کا لسانی مزاج عربی اور فارسی لفظوں کو قبول کر رہا تھا، بھارت کے ریڈیو اور محکمۂ تعلیمات کو نہ جانے اس کی خبر ہے کہ نہیں!

"حیدرآباد میں پچاس سال پہلے" یہ مولوی محب حسین مرحوم کا روزنامچہ ہے، جس کے آغاز میں قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی (مصنف لیلیٰ کے خطوط) کا ڈھائی صفحہ کا تعارف نامہ ہے! مولوی محب حسین صاحب حیدرآباد دکن میں ایک صاحب گزرے ہیں جو پردے کے مخالف اور بے پردگی کے حامی تھے، اُنھوں نے اصلاحی نظمیں اور مضامین بھی لکھے ہیں مگر وہ زیادہ تر سطحی ہیں، ادب وانشاء میں ان نظموں اور مضامین کا کوئی درجہ نہیں ہے، کوئی شک نہیں مولوی محب حسین قوم کی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے مگر اُن کی اصلاح کا طریقہ غیر اسلامی تھا، "پردہ" جو شعارِ اسلامی ہے جس پر قرآن گواہ ہے اور رسول اللہ کی احادیث جس کی شہادت دیتی ہیں، اُس کے وہ صاحب مخالف تھے۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے مولوی محب حسین کی بڑی تعریفیں کی ہیں، اُنھوں نے مولوی صاحب مرحوم کو مُصلح ثابت کرنا چاہا ہے اور مردِ مجاہد بھی! لکھتے ہیں ——— "وہ ایک صاحبِ کردار بزرگ تھے اور عرصہ تک مخالف ہواؤں کا مقابلہ کرتے رہے" ——— ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ آج مولوی محب حسین زندہ ہوتے اور مسلمان عورتوں کی بے حجابی، عریانی، آزادروی اور بے باکی کے مناظر دیکھتے تو شرم سے پانی پانی ہوجاتے اور اپنی رائے کو واپس لے لیتے، چنانچہ مولوی سید محمد اختر صاحب جن کا روزنامچہ میں کئی بار ذکر آیا ہے، اور جو مولوی محب حسین کے زبردست حامیوں میں تھے، اب اپنے اُن خیالات سے تائب ہوچکے ہیں اور "پردے" کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

قاضی صاحب نے مولوی محب حسین کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے صرف اس لیے ملائے ہیں کہ وہ "بے پردگی"

کے حامی تھے، اس "روزنامچے" میں نہ زبان کا لطف ہے، نہ تخیّل ہے، نہ ادب کی چاشنی ہے اور نہ حیدرآباد دکن کے تمدن ہی کی عکاسی ہے، یہ ایک بے مزہ اور سپاٹ قسم کی ڈائری ہے، رسالہ "اُردو ادب" کے یہ چند ورق بلاوجہ ضائع ہوئے ہیں اور مضمون کے آخر میں "باقی آئندہ" بھی لکھا ہے، یعنی سنجیدہ ذوق کو یہ تلخ گھونٹ ابھی اور پینے پڑیں گے۔

مولوی محب حسین کے اصلاحی خیالات کا خود اُن کے جملوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

"کپتان ممتاز یار جنگ کے مکان پر گیا، وہ اور اُن کے بھائی میر لیاقت اور دو انگریز ٹینس کھیل رہے تھے، لیاقت علی کے مزاج میں کشادگی ہے وہ ہمیشہ اُن لوگوں کی جو اُن کے یہاں کھیلنے آتے ہیں شراب چاء وغیرہ سے خاطر کرتے ہیں۔" (صفحہ ۴۶)

یہ وہ مُصلح اور صاحبِ کردار بزرگ ہیں جن کی تعریف کرتے کرتے قاضی صاحب کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے، اللہ اللہ! کتنے پاکیزہ تصورات اور اسلامی خیالات ہیں ان "صاحب کردار بزرگ" کے کہ شراب پلانے والے مُسلمان کی تواضع، مہمان نوازی اور کشادہ دلی کو سراہا جاتا ہے۔ ؎ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا،

جس گھرانے کا روزنامچے میں بار بار ذکر آیا ہے، اور جن لڑکیوں کے مولوی محب حسین اتالیق تھے، اور جہاں انگریزوں کی شراب سے تواضع کی جاتی تھی اور یورپینوں کا آنا جانا رہتا تھا ——— اُسی گھرانے سے حیدرآباد دکن میں "بے پردگی" کا رواج شروع ہوا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "بے پردگی" اور "بے حجابی" کو کس قسم کی ذہنیتیں قبول کرتی ہیں۔

جنابِ آلِ احمد سرور کو مضامین کے انتخاب میں کسی ایک مخصوص شخص کے ذوق اور خیالات کی رعایت نہیں کرنی چاہیئے، یقین ہے کہ آئندہ اس ذمہ داری کو محسوس کیا جائے گا، رسالہ "اُردو ادب" سے ہم بلند توقعات رکھتے ہیں!

## طبِّ اسلامی

"طبِ اسلامی" از :- حکیم محمد یحییٰ خاں، ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت تین روپے، مجلد، تین روپے آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ :- "ارمغان" راولپنڈی،

یونانی طب پر جس کے "اضافہ و ترقی" کو ہم "مسلمانوں کا طب" بھی کہہ سکتے ہیں، اُردو زبان میں حکیم کبیر الدین صاحب نے قابلِ قدر کام کیا ہے، اُن کے ترجمے مقبول بھی ہو چکے ہیں اور شہرت بھی پا چکے ہیں ——— انگریزی طب اور یونانی طب کے سلسلہ میں ڈاکٹر بھولا ناتھ سے حکیم کبیر الدین صاحب کا جو تحریری مناظرہ ہوا ہے وہ کتابی صورت میں محفوظ ہو چکا ہے، یہ مباحث حکیم صاحب موصوف کی حذاقتِ فن پر دلالت کرتے ہیں۔

پاکستان میں اُس یاد کو جناب (حاذق العصر) حکیم محمد یحییٰ خاں صاحب نے تازہ کر دیا! پاکستان بننے کے بعد اس موضوع پر اس قدر جامعیت کے ساتھ یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے۔

"طبِ اسلامی" کتاب کا نام ہے، اس نام کو دیکھ کر دل میں کھٹک پیدا ہوئی، اس لیے کہ اسلام جو کتاب و سنت سے عبارت ہے اور جس نے انسانی زندگی کے لیے رشد و ہدایت کے جامع اصول پیش کیے ہیں، اُس نے فلسفہ، منطق، تاریخ، کلام، شعر و ادب اور طب و کیمیا وغیرہ علوم سے فنی طور پر اعتنا نہیں کیا کہ ان چیزوں میں خود انسان کی عقل رہنمائی کر سکتی ہے مثلاً اسلام یہ تو بتاتا ہے کہ فلاں جانور حلال ہیں اور فلاں جانور حرام ہیں، مگر وہ قورمہ اور قلیہ پکانے کی ترکیب نہیں بتاتا ——— فاضل مصنف کے قلم سے یہ تصریح پڑھ کر :-

"طبِ اسلامی مذہبی طب نہیں ہے، بلکہ وہ طب ہے جس نے اسلامی تاریخ کے دورِ نہضت میں تدریج و ترقی کی منزلیں طے کی ہیں ... ... ..." (صفحہ ۱۳)

دل کی کھٹک دور ہو گئی اور مصنف کی اصابتِ فکر پر دل نے "مرحبا" کہا۔

اس کتاب کو لائق مصنف نے شیخ الرئیس ابو علی الحسین ابن سینا کی خدمات علم و حکمت سے معنون اور منتسب کیا ہے، اس انتساب کی موزونیت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر صاحب تصنیف نے شیخ الرئیس کو "حجۃ الحق" کا جو خطاب دیا ہے اُس سے عقیدت کا مبالغہ ظاہر ہوتا ہے، جس شخص کا جو منصب اور مقام ہے اُس کو انھی حدود کے اندر رہ کر سراہنا چاہیئے۔ "حجۃ الحق" یا "حجۃ الاسلام" جیسے لقب امام غزالی، امام ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے برگزیدہ نفوس کو زیب دیتے ہیں بو علی سینا، ابن رشد، ابن بیطار، زکریا رازی، ابن خلدون، یاقوت، حموی اور ابو الفضل، فیضی کو ان القاب سے یاد کرنا مناسب نہیں ان حضرات کی علمی شخصیتیں کوئی شک نہیں کہ بہت بلند تھیں مگر "حجۃ الحق" اور "حجۃ الاسلام" کے طرّوں کے لیے کچھ اور ہی پیشانیاں

"ابلق ایام آغاز عالم سے یہی چال چلتا آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند قدموں کی مسافت طے کرنے کے بعد اُس نے نئے نئے موڑ کاٹے ہیں" (صفحہ ۸) "نئے نئے موڑوں سے گزرا ہے" یا اسی انداز کا کوئی جملہ لکھنا چاہیئے تھا، اور گھوڑا "کاوہ کاٹتا" ہے "موڑ نہیں کاٹتا" یہی فنی اور روزمرہ کی اصطلاح ہے ——— "اگرچہ گزشتہ تہذیبوں کی کاخہائے مقلوب بہ خاک میں سے کچھ آثار و باقیات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۹) "کاخ" بالاتفاق مذکر ہے اور اس "کاخ ہائے مقلوب بہ خاک" کی ترکیب سے وجدان کو وحشت سی ہوتی ہے ——— "غصہ میں برّانے لگتے ہیں" (صفحہ ۱۶) "برانا" نیند کے ساتھ بولتے ہیں غصہ کے ساتھ نہیں بولتے، مثلاً "وہ نیند (یا سوتے) میں برّا رہا ہے ——— "ابن آثال کو حمص کا کلکٹر مقرر کیا ہوا تھا" (صفحہ ۵۶) "کیا ہوا تھا" اسی طرح کئی جگہ استعمال ہوا ہے جو روزمرّہ کے خلاف ہے ——— "نور کی انتہائی رفتار آواز کی رفتار سے بہت زیادہ بڑی ہے" (صفحہ ۸۵) "بہت زیادہ تیز ہے" "زیادہ موزوں ہے ——— "تاہم جب باد صبا کے تھپیڑے اس طوفانِ گرد کو مار ہٹائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۱۹۶) پورا جملہ ہی اپنی لفظی اور معنوی ترکیب کے اعتبار سے بہت کمزور بلکہ غیر ادیبانہ ہے۔

فاضل مصنف نے اس تصنیف کے لیے عربی، اُردو اور انگریزی کی دو چار نہیں اکیس کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور دیانت کے ساتھ آخر میں اُن کے نام بھی لکھ دیئے ہیں، ان میں مولانا عبد الرزاق کانپوری کی "البرامکہ" بھی جسے غلطی سے عبد الرزاق ملیح آبادی سے منسوب کر دیا ہے (صفحہ ۲۰۱) مصنف کا مذاق شعری نہایت پاکیزہ ہے، فارسی اور اُردو کے اشعار جا بجا بڑے سلیقہ کے ساتھ استعمال کئے ہیں، جس کے سبب موضوع کی خشکی اور مضمون کی سنجیدگی میں شوخی اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے (صفحہ ۱۳) پر یہ شعر:-

میری نگاہِ شوق پہ اس درجہ سختیاں
اور اپنی چشمِ شوخ کو مطلق سزا نہیں

البتہ کمزور ہے۔

یونانی اطباء اور حکماء کے حالات میں سنین دیدئے گیے ہیں مگر مسلمان طبیبوں اور اس فن کے اماموں اور مجتہدوں کے حالات میں سنین کا ذکر نہیں کیا، جو بہت ضروری تھا، پھر ان کے حالات میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، بو علی ابن سینا، جس کے بارے میں ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل کا قول ہے "قانون فی الطب میں بو علی سینا نے ارسطو اور جالینوس جیسی شخصیتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے" ——— اور طبی دنیا کا مشہور مقولہ ہے ——— "علم طب معدوم تھا، بقراط نے اُسے ایجاد کیا، مردہ تھا جالینوس نے اُسے زندگی بخشی، متفرق تھا رازی نے اُسے جمع کر دیا، ناقص تھا، بو علی سینا نے اُس کی تکمیل کر دی" ——— اس بو علی سینا کا ذکر صرف دس گیارہ سطروں میں ہے، سوانح حیات کے اس ضرورت سے زیادہ اختصار کو پڑھنے والا محسوس کرتا ہے اور طبیعت میں گھٹن سی ہونے

لائق مصنف نے اس کتاب کو بڑی کد و کاوش اور کمال تحقیق کے ساتھ مرتب فرمایا ہے، پہلے "فنِ طب کی ابتداء" سے بحث کی ہے، پھر بتایا ہے کہ امراض و عوارض کو انسان نے شروع شروع میں سحر اور ارواحِ خبیثہ اور دیوتاؤں کی ناراضی کا سبب

قرار دیا، لہٰذا علاج بھی زیادہ تر منتروں اور ٹوٹکوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا ـــــــ "محققین نے تصریح کی ہے کہ آسٹریلیا تسمانیہ، جزیرہ نما ہائے ملایا، برما، سیام، بورنیو، فجی، مڈغاسکر، افریقہ اور امریکہ کے قدیم باشندے خبیث روحوں، جنوں، اور بھوت پریت کی ناراضی اور جادو کے اثرات کو باعثِ آلام و امراض قرار دیتے تھے، غالباً اسی فلسفہ کا اثر ہے کہ اس فنِ عظیم کا نام بھی طب قرار پایا ہے کیونکہ علمائے لغت طب کے معنوں میں دوا اور جادو دونوں کو شامل سمجھتے ہیں، اس لفظ کے انگریزی مترادف ( medicine کے مفہوم میں بھی یہی دونوں چیزیں شامل ہیں ـــــــ

اس کے بعد طبِ قدیم کے ارتقائی منازل بیان کیے ہیں اور بابل، مصر، ہند، چین اور یونان کے طب کی اجمالی تاریخ پیش کی ہے اس کے بعد اسلامی تاریخ کا دور شروع ہوتا ہے، مسلمان حکما اور اطبا آتے ہیں اور طبِ یونانی کو از سرِ نو زندگی بخشتے ہیں! مسلمانوں کے طبی اجتہادات نے بقراط اور جالینوس کی تحقیقات پر گرانقدر اضافہ کیا، فاضل مصنف نے مسلمان مصنفین اور مترجمین کی کتابوں کے جو نام لکھے ہیں، اُن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ صرف آنکھ کے مرض (علم الکحالہ) پر بائیس کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں، اور علم الجراحت کی ترقی کا یہ عالم تھا:ـــ

"طبِ اسلامی کے دورِ ارتقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ طبیب الگ ہوتے تھے، جراح الگ اور کحال الگ! اس زمانہ میں جراحی کے متعدد شعبے تھے، آنکھوں کا آپریشن انتہائی ترقی یافتہ صورت میں پوری کامیابی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مصنوعی آنکھیں تک بنائی اور ڈالی جاتی تھیں، ٹوٹی ہڈیوں کو درست کرنے اور اُن کو اپنی جگہ پر باندھنے والے جراح علٰحدہ ہوتے تھے ... ... (۹۹)

صاحبِ تحقیق مصنف نے سیکڑوں طبی کتابوں کے نام درج کیے ہیں اور چند ممتاز تصانیف مثلاً "الاسباب والعلامات" (ابوعبداللہ سید محمد ایلاقی)" شرح الاسباب والعلامات" (ملا برہان الدین النفیس) التصریف لمن عجز عن التالیف" (زہراوی) "تقویم الابدان فی تدبیر الانسان" (ابن جزلہ بغدادی) "الحاوی" (زکریا رازی) "ذخیرہ خوارزم شاہی" (زین الدین اسمٰعیل بن حسین الجرجانی)" القانون فی الطب" (بوعلی ابن سینا)" مفردات ابن بیطار" (ابن بیطار) وغیرہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، کتاب کا وہ حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دور میں طب میں کیا کیا ترقیاں اور اضافے ہوئے؟ یورپ کے بعض متعصب مؤرخ اور تنقید نگار مسلمانوں کے کارناموں کو گھٹا کر بلکہ بعض اوقات مسخ کر کے بیان کرتے ہیں مگر اُنہی میں ڈاکٹر کمسٹن جیسے حق پسند بھی ہیں، جنھوں نے ڈنکے کی چوٹ اس کا اعتراف کیا ہے کہ عرب ذہنی طور پر یونانیوں کے نقال نہ تھے، عربوں کا جب مشرق میں ظہور ہوا ہے تو یونانی طب بڑی حد تک مٹ چکی تھی عربوں نے اُسے برباد ہونے سے بچایا اور اُس کو ترقی دے کر جلا دی، علمی دنیا پر بڑا احسان کیا، مسلمانوں کے تحقیق و اضافہ کی کوششوں پر ہم کو اُن کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

مسلمان حکومتوں کے دور میں شفاخانوں نے جس قدر ترقی کی تھی، اُس کا حال مسٹر پی اسکاٹ کی زبان سے سنئے:ـــ

"اسلامی عہد کے شفاخانوں میں صحت و صفائی کے قوانین کو غایت درجہ اہتمام کے ساتھ ملحوظ رکھا جاتا تھا، ہمارے دورِ ترقی میں ہسپتالوں کا نظام اُس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، ان کی مکانیت موجودہ ہسپتالوں سے زیادہ، ان کا انتظام بہتر اور ان میں ہوا کی آمد و شد کی رعایت لازمی ہوتی تھی، شفاخانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے باغ، صحن اور بڑے بڑے کمرے اور ان میں فوارے ضروری طور پر لگائے جاتے تھے ـــــــ اس سلسلہ میں بیمارستان قاہرہ مثالی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے جو موجودہ دور کے مسلح و مکلف شفاخانوں سے بدرجہا زیادہ شاندار اور پُرتکلف تھا اس میں مریضوں کے بستروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی نہروں کی شکل میں پانی بہتا تھا اور پاس ہی خوشبودار پھولوں کی کیاریاں تھیں اس ہسپتال سے تندرست ہو کر رخصت ہونے والے ہر شخص کو پانچ اشرفیاں زادِ اسلام کے طور پر دی جاتی تھیں۔ (۱۵۷) ـــــــ مسلمانوں کے عہد میں سب سے پہلا شفاخانہ ولید بن

عبدالملک نے ششنہ ہجری مطابق ششنہ ء میں بمقام دمشق جذامیوں کے لیے بنوایا —— ہارون الرشید کا دارالشفا بھی اپنے انتظامات کے سبب اُس دور میں بے نظیر تھا، جبریل بن بختیشوع اس کا افسر الاطبا تھا! ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنی جیبِ خاص سے جو شفاخانہ (بیمارستان) بنوایا تھا اُس کا نگران معلوم ہے کون تھا؟ ایک ہندی طبیب دھن! (صفحہ ۱۵۷) —— کہیں کوئی صاحب راج رشی ٹنڈن جی کے کانوں تک یہ اطلاعیں نہ پہونچادیں، ورنہ وہ فرمادیں گے کہ دیکھنا! ہارون الرشید کے وقت سے پاکستان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں؟

"رنگ و نور کے سلسلہ میں آج سائنس کی ترقیات بے شک حیرت انگیز ہیں لیکن ابن الہیثم کے مناظر و مرایا کے اکتشافات نہ ہوتے تو کیا یہ دور بینیں، خورد بینیں، کیمرے، اور عکاسی کے آلات سینما اور موویٹون کے کرشمے ظہور پذیر ہو سکتے تھے، موجودہ طبعی دنیا کا امام (ROGER BACON) علمی اعتبار سے الہیثم کا مترجم اور نقال ہے اور بس..... (۱۸۳)

جناب مولوی حکیم محمد یحییٰ خاں صاحب کی یہ علمی کوشش ہر آئینہ مستحق تبریک اور لائقِ تحسین ہے۔ اُنھوں نے سچ مچ دریا کو زے میں اور سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کر دیا ہے، اس کتاب کا ایک ایک صفحہ معلومات آفریں ہے، ضرورت ہے کہ قوم کے نوجوانوں میں علمی و فنی کتابوں کے مطالعے کے ذوق کو عام کیا جائے ورنہ ساری قوم فلم اور سینما کی "ٹیک نک" کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

**نغمۂ روح** "نغمۂ روح" از:- خاور دُرانی، ضخامت ۱۵۸ صفحے، کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید اور چکنا جلد مصور درنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت ڈھائی روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ رومان کرشن نگر لاہور۔

جناب خاور درانی صاحبہ کے کلام کا مجموعہ اُن کے چھوٹے بھائی جناب اجمل درانی کے اہتمام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے —— صفحہ (۳) پر لکھا ہے، "ملکۂ سخن خاور درانی صاحبہ ایم۔ اے، بی، ٹی" —— اس سلسلہ میں ہم ایک اُصولی بات عرض کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ گزشتہ زمانہ میں جب ملوکیت اور اُمرائیت کا دور دورہ تھا تو بادشاہوں اور امیروں کے درباروں سے شعراء کو خطاب اور مناصب سرفراز ہوا کرتے تھے، قریب قریب ہر دربار میں ایک "ملک الشعراء" ہوتا تھا، بادشاہوں کا دیا ہوا خطاب سرکاری حیثیت رکھتا تھا، اس لیے وہ عوام میں بھی تسلیم کیا جاتا اور مشہور ہو جاتا، جس طرح نواب میر محبوب علی خاں فرماں روائے دکن نے داغ کو فصیح الملک کا خطاب اور نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن نے جلیل مانک پوری کو فصاحت جنگ کا خطاب سرفراز کیا —— یا انگریزی حکومت کی طرف سے مسلمان عالموں کو "شمس العلما" کا خطاب دیا جاتا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی صاحب فن اور بڑی شخصیت کو خود قوم خطاب دیدیا کرتی ہے اور وہ شہرت پا جاتا ہے مثلاً علماء میں مولانا محمود حسن کو "شیخ الہند" اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو "شیخ الاسلام" شاعروں میں علامہ اقبال کو "حکیم الامت" اور "حکیم مشرق" صفی لکھنوی کو "لسان القوم" اور جگر مرادآبادی کو "رئیس المتغزلین" لیڈروں میں مولانا محمد علی کو "رئیس الاحرار" مسٹر محمد علی جناح کو "قائداعظم" اور طبیبوں میں حکیم اجمل خاں کو "مسیح الملک" کا خطاب قوم ہی نے دیا تھا، فضل حق صاحب کو بھی قوم "شیرِ بنگال" کہنے لگی تھی مگر یہ حضرت "روباہ" ثابت ہوئے اور اس خطاب کا خود بخود "اسقاط" عمل میں آگیا —— "خطاب" کی یہی دو صورتیں ہیں جو اوپر عرض کی گئیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ ایک "صاحبہ" (؟) اپنے کو "خطیبۂ ہند" اور "زہرۂ سخن" لکھتی ہیں، اُن سے ان خطابوں کا سبب تسمیہ پوچھا گیا تو فرمایا گیا کہ "زہرۂ سخن" تو حضرت سیماب اکبرآبادی کا عطیہ ہے اور "خطیبۂ ہند" گورکھپور یا (غالباً) فیض آباد کے کسی قومی جلسہ میں مولانا عبدالحامد بدایونی نے عنایت فرمایا تھا۔

"نغمۂ روح" پر آنریبل جسٹس مسٹر محمود علی صوفی نے پیش لفظ لکھا ہے، اور اُنھوں نے خاور صاحب کی شاعری پر ان لفظوں میں تبصرہ کیا ہے:-

"خاور دُرّانی صاحب کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں کہتے ہیں نہ مُبہم استعاروں کی پناہ نہیں لیتیں۔

خاور کے کلام میں خاص یہ صفت پائی جاتی ہے کہ ابہام نہیں ہے، جو کچھ کہا ہے صاف و واضح اور دوٹوک کہا ہے، شاعری ہو یا نثر نگاری بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ روزمرہ کی بات چیت ہی کیوں نہ ہو اُس میں "سلجھاؤ" بڑی چیز ہے!

شاعر نے خود نوشتہ دیباچہ میں لکھا ہے:-

"ریاست ٹونک کے شاعرانہ ماحول نے میرے جذبات و تخیلات کا ساتھ دیا، ریاست ٹونک کی سرزمین وہ سرزمین تھی جہاں شعر و ادب کے چشمے پھوٹتے تھے"

ٹونک کہنے کو تو چھوٹی بستی ہے، بہت سے بہت چالیس ہزار آبادی ہوگی، مگر یہ سرزمین بڑی "شاعر خیز" بلکہ "مردم خیز" واقع ہوئی ہے، حضرت مولانا برکات احمد اسی خاک سے اُٹھے تھے، اس علم و فضل کا دوسرا عالم پھر ہندوستان میں دیکھنے میں نہیں آیا، اور شاعری تو ٹونک کی زمین سے سبزے کی طرح اُگتی ہے، وہاں جتنے اچھے سخنور ہیں اُتنے ہی اچھے سخن سنج بھی ہیں، خاور دُرّانی کو یقیناً ٹونک کی شاعرانہ فضا راس آئی! ؎

رُوح کو زندہ رکھیں اور نفس کو کرلیں فنا     زندگی کا بس یہی مفہوم ہونا چاہیے

مصرعہ اولیٰ کمزور ہے، "نفس کو کرلیں فنا" بھی وجدان کو کھٹکتا ہے اور "کو کر" میں تنافر سا ہے!

پندارِ ہست و بود پہ چھا کر چلے گئے     مدہوشیوں کو میری بڑھا کر چلے گئے

"پندارِ ہست و بود" کی ترکیب بہت اُلجھی ہوئی ہے اور "پندار پہ چھاجانا" کیا بات ہوئی! دوسرے مصرعہ میں "میری" پر پہونچ کر ذوقِ سلیم کو ٹھوکر سی لگتی ہے، یہ مصرعہ اگر یوں ہوتا تو یہ عیب جاتا رہتا۔

؎ مدہوشیوں کو اور بڑھا کر چلے گئے

صفحہ ۶۶ پر ایک شعر ہے:-

تو وہ ایک نغمۂ دلربا جو ہے کائنات پہ چھا رہا
میں وہ ایک نالۂ نارسا[1] جو نہاں ہے پردۂ ساز میں

مصرعہ ثانی بہت خوب ہے، مگر مصرعہ اولیٰ میں تعقیدِ لفظی بہت نمایاں ہے، اور وجدان اُس سے ناگواری محسوس کرتا ہو۔

اسی کا نام محبت ہے کیا معاذ اللہ!
اک آگ سی مرے سینہ میں پائی جاتی ہے

شیفتہ کا بہت مشہور مقطع ہے:-

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

---

[1] "نارسا" بھی یہاں محلِ غور ہے "نارسا" اُس نالہ کو کہتے ہیں کہ جس کی گوشِ محبوب تک رسائی نہ ہو، یا جہاں بھی اُسے پہونچنا مقصود ہو وہاں نہ پہونچ سکے، اور شعر میں اس مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ نالہ جو کیا ہی نہیں گیا اور جو ابھی تک سرہی نہیں ہوا۔ (م۔ق)

ان شعروں کی سادگی و پُرکاری دیکھئے :-

ہمیں معلوم تھا ہو گا اثر کیا اہلِ محفل پر
سناتے ہی رہے ہم دردِ دل کی داستاں پھر بھی

اے دستِ شوق اپنی ہی قسمتی پہ رو
دامن وہ خواب میں بھی چھڑا کر چلے گئے

زمانہ درد کی لذّت سے آشنا ہی نہیں
کرے گا کیا کوئی سُن کر مرے فسانے کو

عشق کی اک جست میں طے ہو گئیں سب منزلیں
فلسفی سمجھا کئے، اور نکتہ داں دیکھا کئے ؎

نوحہ کا ایک مصرعہ ہے :-

لاشِ قاسم پہ رو کر دلھن نے کہا (صفحہ ۱۵۰)

حالانکہ حضرت قاسم کا بیاہ ایک بے سروپا افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا ——— "چاندنی رات میں" جس نظم کا عنوان ہے، اُس کے بعض اشعار خوب ہیں !

تصویر کشی اور رقص و موسیقی جن کو آج کل "آرٹ" کہا جاتا ہے، اسلام میں اُن کے لیے کوئی گنجایش نہیں، ان کے مفاسد آج اور زیادہ کھل کر سامنے آ رہے ہیں، اور شاعری کی اسلام نے حوصلہ افزائی نہیں کی! مسلمان عورت کو عاشقانہ شعر کہنے سے کلیتہً احتراز کرنا چاہیئے "مشاہدۂ حق" کے لیے "بادہ و ساغر" کے استعاروں کی ضرورت بھی محسوس ہو تو بھی مسلمان خاتون کا ان انگاروں سے دامن بچا کر گزر جانا ہی بہتر ہے! حمد، نعت و مناقب اور قومی شاعری میں زورِ طبیعت صرف کیا جا سکتا ہے مگر اس میں جذبۂ شہرت و نمود شریک ہو تو پھر یہ شہرت کی چاٹ اور اُس کے لیے کوششیں "مضرّت" سے خالی نہیں ——— ہم نے "نغمہ روح" پر تنقید کرتے ہوئے چند اصولی باتیں عرض کر دی ہیں، جن میں خدا گواہ ہے کہ اخلاص و دردمندی شریک ہے!

## لکیریں

"لکیریں" از :- نازش پرتاب گڈھی، ضخامت اسّی صفحے، ملنے کا پتہ :- ایس، یو، وارج کمپنی، کچہری روڈ پرتاب گڈھ

جناب نازش پرتاب گڈھی نے انتہائی تیزی کے ساتھ شہرت کی منزلیں طے کی ہیں، اب وہ اُردو زبان کے خاصے معروف شاعر ہیں، اور اُن کا کلام عوام و خواص میں پسند کیا جاتا ہے، "لکیریں" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور اُن کی یہ پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے ——— اس مجموعہ پر نصف درجن شاعروں اور ادیبوں کی رائیں درج ہیں، اور سب نے نازش صاحب کے کلام کو سراہا ہے۔

نازش کی غزلوں میں نغمہ و فریاد کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے، مسکراہٹوں کے ساتھ آہیں بھی! اُس کے نغمہ میں رس اور اُس کی فریاد میں تاثیر ہے، وہ تلوے سہلاتے سہلاتے کبھی چٹکیاں بھی لے لیتا ہے ——— ان شعروں کی لطافت و سادگی اور اندازِ تغزّل تو دیکھئے :-

اے غمِ دل! عجیب الجھن ہے　　　موت مانگوں کہ زندگی مانگوں
نظر کر جوشِ وحشت! ہے ادھوری اپنی رُسوائی　　　کرم اے دوست! بربادی مکمل ہو نہیں پائی
عشق پائندہ و محکم ہے تو کیا ذکرِ وصال　　　منزلِ وصل پہ ہوتا ہے محبت کا زوال

؎ کتاب میں "دیکھا کیے" لکھا ہے، ہم نے "سمجھا کیے" کے تصرف کی جرأت کی اور شعر اب یقیناً بلند ہو گیا (م۔ق)

ہائے کس منزل میں لے آیا غمِ بے چارگی | جس جگہ راحت تو کیا، کوئی مصیبت بھی نہیں
ایک ایسا بھی مقام آیا ہے راہِ شوق میں | جس جگہ قدموں کو خود ہی ڈگمگا دینا پڑا
خیالِ ترکِ محبت بجا سہی لیکن | یہ سوچتا ہوں کہ پھر اُن کا حال کیا ہو گا
اُٹھے نہ ابھی درد کہ فرصت نہیں مجھ کو | آئے نہ ابھی رات، میں کچھ سوچ رہا ہوں
الوداع اے شوقِ منزل! اب خدا حافظ ترا | تھک چلا ہوں میں بھی اور سورج بھی ڈوبا جائے ہے
یہی انسان کہ ہے تدبیر سے بھی بیگانہ | یہی تقدیر بھی ہے، مالکِ تقدیر بھی ہے
عجب اک انتشار و برہمی کا دور ہے ساقی | بجائے مے ترے ساغر میں کیا کچھ اور ہے ساقی

مرے درد میں نہاں ہے وہ نشاطِ جاودانی
کہ نچوڑ دوں جو آہیں تو ٹپک پڑے تبسم

دوسرا رُخ :۔

بتا وحشت! مذاقِ سجدہ ریزی ہے کہاں اپنا | کہ اب وہ ڈھونڈتے ہیں مجھ کو، لیکر آستاں اپنا

"مذاقِ سجدہ ریزی" کی جگہ "دماغِ سجدہ ریزی" کہا جاتا تو "ہے کہاں اپنا" کے ساتھ جوڑ ٹھیک بیٹھ سکتا تھا، مصرعہ ثانی مہمل ہے، آخر وہ سجدہ گذار کو لیکر اپنا آستاں کیوں ڈھونڈ رہے ہیں! یہ ایک عجیب سی بات ہے!

چند آنسو بہا کے بیٹھ رہا | میں نے سمجھا تھا درد ساون ہے

دوسرا مصرعہ کمزور ہے، درد کا "ساون" ہونا درد کی صفت نہیں ہے، شاعر کہنا یہ چاہتا ہے، کہ وفورِ درد کے سبب میں نے سمجھا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی، مگر آنکھوں سے چند آنسو ہی ٹپک کر رہ گئے! لیکن مصرعہ ثانی میں اس مفہوم کا جن لفظوں سے اظہار کیا گیا ہے، وہ ناقص ہیں۔

یہ اجنبی سی ٹیس، یہ میرے نئے حواس | ایسے میں کاش! آپ بھی ہوتے نہ میرے پاس

"اجنبی سی ٹیس" تو خیر گوارا کی جا سکتی ہے، مگر یہ "نئے حواس" کیا بات ہوئی! آدمی کے "حواس" بھی کیا نئے اور پُرانے ہوا کرتے ہیں ——— اور محبوب کی قربت سے آخر اس قدر وحشت کیوں ہے!

ناکامِ آرزو کو غنیمت ہے بے خودی | کیوں دے رہے ہیں آپ مجھے زحمتِ حواس

"حواس" بالکل غلط استعمال ہوا ہے "احساس" کا یہاں محل ہے!

اُف رے یہ جبریت، یہ کشاکش یہ تضاد | میں جئے جاتا ہوں اور جینا گوارا بھی نہیں

"جینا" کا "الف" تکلیف دہ حد تک یہاں دب رہا ہے۔

پھر مری آنکھوں میں رہ رہ کے کھٹکتا ہے یہ کیا | یہ تو آنسو بھی نہیں، یہ تو شرارا بھی نہیں

آج پہلی بار سُننے میں آیا کہ آنکھوں میں آنسو بھی کھٹکا کرتے ہیں۔؟

ہائے اب آئے ہو تم دل کی تسلّی کے لئے | جب مری پلکوں پہ مبہم سا ستارا بھی نہیں

ستارے سے شاعر کی یہاں مُراد آنسو ہی ہو سکتی ہے، شعر کے تیور بتا رہے ہیں! اگر شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اب تم دل کی تسلّی کے لیے آئے ہو جب درد حد سے گزر گیا .... یعنی

سہ پرسِش کا زمانہ بیت گیا، | تسکین سے اب کیا ہوتا ہے

مگر مصرعِ ثانی سے اس مفہوم کا اظہار نہیں ہوتا، پلکوں پر آنسوؤں کا نہ رہنا اس کی دلیل تو نہیں ہے کہ غم اس قدر شدید ہے کہ محبوب کی تسلّی سے بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔

یوں بھی ہوا ہے رنگِ طبیعت کبھی کبھی گزری ہے بارِ اُن کی محبّت کبھی کبھی

"یوں" کا نہیں یہاں "یہ" کا محل ہے۔

چاند کے دیدۂ بے خواب سے کچھ ٹپکا ہے کوئی آنسو، کوئی شبنم، کوئی تارا تو نہیں

"کوئی شبنم" درست نہیں، کوئی "قطرۂ شبنم" کہنا چاہیئے تھا۔

جانے کون اُٹھا ہے اُس کے آستانے سے حسن خود نکل آیا اپنے ناز خانے سے

"اُس" کا "مرجع" آخر کون ہے؟ سجدے تو حُسن ہی کے آستانے پر ہو رہے تھے یا کہیں اور! "اس کے" کی جگہ "آج" کر دیا جائے تو یہ ابہام دُور ہو جائے گا ــــــ "ناز خانہ" کی ترکیب بھی وجدان کو کھٹکتی ہے!

یہ ہجر یہ آفات میں کچھ سوچ رہا ہوں اے بوندوں بھری رات! میں کچھ سوچ رہا ہوں

"بوندوں بھری رات" کی ترکیب غیر شاعرانہ ہے، اس میں کوئی لُطف اور ندرت نہیں، خنک رات، بھیگی ہوئی رات، شبنم آلود شب یا برسات کی رات، کہنا چاہیئے تھا!

تو اپنی نگاہوں کی طرف دیکھ تو ساقی مستوں کا نہیں جُرم اگر سنبھلا نہ جائے

"سنبھلا" کا "الف" بہت بُری طرح دب رہا ہے، حیرت ہے کہ شاعر بار بار اس کا اعادہ کرتا ہے۔

زمیں یہ خلد ہے نازش، یقین ہو کیوں کر سسک سسک کے گزاری ہے زندگی میں نے

یہ کس نے دعویٰ کیا ہے جس کی تردید کی گئی ہے کہ زمین پر خلد پائی جاتی ہے!

معاذ اللہ! یہ سوکھے لب یہ بدلی تیوریاں تو بہ کہیں شورش نہ اُٹھ جائے خلافِ پیرِ میخانہ

"اُٹھ جائے" یہاں مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے، شاعر یہ کہنا چاہتا ہے اور اسی طرح کہا اور بولا جاتا ہے کہ "کہیں شورش نہ ..."

جسے تم وعدۂ فردا سے بھی تسکیں نہ دے پائے کہیں اُس سر پھرے کی آہ سے محفل نہ جل جائے

اگر یہ سیاسی شعر ہے تو ہم کچھ نہیں کہتے، مگر اس میں "سیاسیات" سے زیادہ "تغزل" کا قرینہ پایا جاتا ہے، اس لیے یہاں "محفل" کا کوئی محلِّ استعمال سمجھ میں نہیں آتا؟ کیا عاشق محبوب کی محفل میں آکر طنز کر رہا ہے کہ تم جس کو وعدۂ فردا سے بھی تسکین نہ دے سکے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس سر پھرے کی آہ سے محفل میں آگ لگ جائے ــــــ اوّل تو یہاں "سر پھرے" شعر کے بنیادی مفہوم کے اعتبار سے زیادہ صحیح استعمال نہیں ہوا پھر آگ لگا دینا، قلبِ دردمند اور دلِ مظلوم کی آہ کی صفت ہے نہ کہ "سر پھرے کی آہ" کی! اور کوئی عاشق یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اگر وعدہ وفا نہیں کرتا اور جھوٹی تسلیاں دیتا ہے تو اُس کا انتقام اس طرح لے کہ محبوب کی محفل یا گھر میں آگ لگ جانے کی تمنا کرے، یہ محبت کے اُصول اور فطرت کے خلاف ہے ــــــ لکھنا اس طرح چاہیئے تھا کہ کہیں وہ سر پھرا ناکام عاشق تمہاری محفل کے نظام کو درہم برہم نہ کر دے، یا قیامت سر پر نہ اُٹھا لے۔

کسی سفینہ کو جائے قرار مل نہ سکے جو بس چلے تو میں بڑھ کر ڈبو ہی دوں ساحل

شاید یہ کتابت کی غلطی ہو اور شاعر نے "جائے قرار" لکھا ہو، کاتب صاحبان نقطے کیا جملوں کے جملے بعض اوقات ہضم کر جاتے ہیں۔

اے سراپا درد! کرلے ذوقِ غم اتنا بلند اُن کی ہر سعیِ کرم کو رائگاں کرنا پڑے

اس "کرلے" ہی پر پہلے تو وجدان تلملا کر رہ گیا، پھر "رائگاں کرنا پڑے" سے اور وحشت ہوئی، صرف لفظ ہی لفظ ہیں، ورنہ شعر میں کچھ ہو نہیں!

"اُٹھ جائے" [illegible]

تاجِ آزادی ابھی پوری طرح سج نہ سکا ابھی انسان کی پلکوں پہ گہر باقی ہے

"گہر باقی ہیں" کہنا چاہیئے تھا۔

اجداد کے فسانوں پہ تقریظ بھول جا اپنے پہ کوئی نقد و نظر کر سکے تو کر

مصرعہ اولیٰ پوری طرح بن نہ سکا "تقریظ" یہاں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے!

یہ تراحسیں تبسم، یہ ہجومِ ماہ و انجم مرا غم کہیں نہ کھو دے مجھے کر نہ دے کہیں گم

محبوب مسکرا رہا ہے، چاند ستاروں کا ہجوم ہے، تو پھر ایسے میں یہ "غم" کس بات کا ہے جس سے عاشق کو اندیشہ ہے کہ وہ اُسے گم نہ کردے! دوسرے مصرعہ میں "غم" نے سارے شعر کو بے معنیٰ بنادیا کہنا یہ چاہیئے تھا کہ کہیں میں ان لطیف فضاؤں اور حسین جلوؤں میں گم ہو کر نہ جاؤں، یہ التفات اور شانِ جلوہ آرائی مجھے اپنے سے کھو نہ دے!

جناب نازش کی شاعرانہ ذہانت اپنی جگہ مسلّم! یہ اُن کی شاعری کا دورِ شباب ہے، مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نازش صاحب لفظوں کے استعمال میں احتیاط نہیں برتتے، اور ان کے بعض شعر پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انتہائی عجلت میں شعر کہنے کے عادی ہیں، اور یہ عادت جب راسخ ہو جاتی ہے تو پھر شاعر شعر گوئی میں غور و فکر سے کام نہیں لیتا ـــــ

نازش صاحب نے اپنی پسند کے چند اشعار اس مجموعہ میں شریک کیے ہیں، ان کا عالم یہ ہے:۔

"میں نے چاہا کہ یہ تابندہ کرن لہرائے ؛ پھر بھی شب رنگ و سیہ تاب پھریرے لپکے۔ " پھریروں کے ساتھ لپکنا" بے جوڑ ہے۔

میں نے بربط کے کسی تار کو جب بھی چھیڑا میرے نغموں کی طرف درد کے ڈیرے لپکے

"درد کے ڈیرے" اور پھر اُن ڈیروں کا لپکنا اور زیادہ مہمل ہے!

ٹھوکریں دے کے حوادث نے جگایا مجھ کو

"ٹھوکریں مار کر" کہنا چاہیئے تھا، "دھکے دینا" البتہ بولا جاتا ہے!

پریت کے گیت جو مچلیں بھی تو کیوں کر مچلیں میری آواز، مری لے تو ہے کفنائی ہوئی

آواز اور لے کا کفنایا جانا، بس "ایجادِ بندہ، اگرچہ . . ." سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

شبِ مہتاب میں کیا اُٹھیں ستاروں کی طرف میری تخئیل کی نظریں تو ہیں جھلائی ہوئی

"نگاہ خیال" عام طور پر بولا جاتا ہے اور "چشمِ تخئیل" بھی خیر صحیح ہے مگر "تخئیل کی نظریں" یہ ترکیب وجدان پر کتنی بار گزرتی ہے، پھر چنگاریاں جھلایا کرتی ہیں، نہ کہ نظریں!

آج ہر فرد ہے سایہ میں سیہ بختی کے اور یہی کچھ مرے اشعار سے بھی چھلکے گی

سیہ بختی کا چھلکنا نہ دیکھا اور نہ کہیں سُنا! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ آج ہر شخص غم و مصیبت میں گرفتار ہے، میں بھی اسی ماحول میں رہتا ہوں، اس لئے میرے شعروں سے بھی یہی غم ظاہر ہو گا کیونکہ شاعر اپنے ماحول کا ترجمان ہوا کرتا ہے ـــــ لیکن اس مفہوم کا اظہار اُس سے ٹھیک طور پر نہ ہو سکا۔

اس نام نہاد "ترقی پسندی" کی پرچھائیں سے بھی شاعروں اور ادیبوں کو دور رہنا چاہیئے کہ اچھا خاصہ آدمی غارت ہو جاتا ہے، جناب نازش میں شعر و ادب کی کافی صلاحیتیں موجود ہیں، ہماری تمنا ہے کہ وہ پوری کی پوری صحیح طور پر کام میں آئیں، نازش کے شاعرانہ مستقبل سے ہم بلند توقع رکھتے ہیں!

# "فاران" کے

**خریدار صاحبان** — کی خدمت میں عرض ہے کہ رسالہ "فاران" پوری ذمہ داری اور کامل احتیاط کے ساتھ پوسٹ کیا جاتا ہے، اگر کسی خریدار کو رسالہ نہیں پہونچتا تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ راستہ کی بدنظمی کا شکار ہوگیا، اس کے لئے ہمیں خفگی آمیز خط لکھنے کے بجائے ڈاک خانہ سے خط و کتابت کرنی چاہیئے، ہمارے لئے دوبارہ رسالہ بھیجنا بہت دشوار ہے —

**مضمون نگار صاحبان** "فاران" کی پالیسی اور معیار کا اندازہ فرما کر مضامین ارسال فرمائیں !

**ہندوستان کے خریدار** دفتر "الحسنات" رام پور (یو-پی) کو روپیہ روانہ فرما سکتے ہیں اور **بھارت کے تمام ایجنٹ صاحبان** براہِ کرم تمام **بقایا رقم** "الحسنات" رام پور (یو-پی) کے پتہ پر بھیجکر ہمیں شکر گزاری کا موقعہ دیں !

# فاران

ماہر القادری

جلد ۲ — شمارہ ۱۱

ماہنامہ

# فاران

فروری سنہ ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران"

کیمبل — اسٹریٹ

کراچی ۱

## نظم و ترتیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# نقشِ اوّل

حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، خطرات کی پرچھائیاں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں، ہم پاکستان کے رہنے والے اُس دیوار پر کھڑے ہیں، جس کے نیچے سے آہستہ آہستہ مٹی نکلتی چلی جا رہی ہے —— ہم جس کشتی پر سوار ہیں اُس کی پتواروں، تختوں اور بادبانوں کو ملاّحوں نے طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ بادبان لرز رہے ہوں، تختے چرچرا رہے ہوں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں، اس سفینہ کے بچانے کے لئے ہم اپنی جان کی بازی لگا دیں گے، اسلئے کوئی طاقت ہمیں احتجاج اور اظہارِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی، ہمیں کشتی کے ناخداؤں کے وقار اور اقتدار سے زیادہ کشتی پیاری ہے۔

ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں پُوری بصیرت اور ہوش مندی بلکہ ذمّہ داری کے ساتھ کہہ رہے ہیں، یہ ایک دردمند دل کی چیخ اور مُضطرب رُوح کی فریاد ہے! خدا گواہ ہے کہ مقصد نہ کسی کو بدنام کرنا ہے اور نہ کسی کے خلاف تہمتیں تراشنی ہیں، ایک ایک لفظ اس ذمّہ داری کے ساتھ لکھا جا رہا ہے کہ ہمیں ایک دن خدا کے سامنے اپنے قول اور فعل کا جواب دینا ہے، "فتنہ و فساد" کے تصوّر سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں، پاکستان میں وہی کم بخت اور رُوسیاہ فتنہ اور انتشار پھیلا سکتا ہے جس کا نہ خدا کی رحمت پر ایمان ہو اور نہ محمدؐ عربی کی شفاعت کا یقین ہو۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسی نسبت نے پاکستان کو ہماری نگاہ میں عزیز اور مقدّس بنا دیا ہے، پاکستان کی حفاظت خود اسلام کی حفاظت ہے، پاکستان کے ساتھ ہماری قسمتیں وابستہ ہو چکی ہیں اس پاک سرزمین کا ایک ایک ذرّہ ہمیں جان سے زیادہ پیارا ہے، ہم اس مُقدّس چمن کی ایک پتّی کا نقصان بھی گوارا نہیں کر سکتے!

اظہارِ حق اگر جُرم ہے تو اِس جُرم کا ہم اعتراف کرتے ہیں اور اُس کی پاداش کے لئے ہم تیار ہیں، ہم نے تمام عواقب اور نتائج کو سوچ کر ہی قلم اُٹھایا ہے، عوام بھی سُن لیں اور خواص بھی آگاہ ہو جائیں کہ ہم کسی کی دل دہی کے لئے کتمانِ حق نہیں کر سکتے، ہم جو کچھ کہتے ہیں صاف اور بر ملا کہتے ہیں، ہمارے پاس کوئی "راز" (SECRET) نہیں ہے، ہمیں اس بات کا دعویٰ بھی نہیں ہے کہ سچّائی ہمارے قلم کے ساتھ ساتھ گھومتی ہے، اظہارِ رائے میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے، ہماری غلطی ہم پر واضح کر دی جائے گی تو اُس کے اعتراف میں ہمیں باک نہ ہوگا، مگر جس چیز کو

ہم حق سمجھ رہے ہیں اُس کے اظہار سے کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی اس لئے طمع کے پھندے، خوف کی کمندیں اور دھمکی کے تازیانے ہم سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائیں۔

## درونِ خانہ

پاکستان کو بنے ہوئے اللہ کے فضل سے تین سال ہو گئے جس کے ایکھزار سے بھی کچھ اوپر دن ہوتے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ انگریز جس مقام پر ہمیں چھوڑ کر گیا تھا اُس جگہ سے ہم ایک اِنچ بھی آگے نہیں بڑھے بلکہ شاید کچھ اور پیچھے سرک گئے ہیں، وہی "نظامِ تعلیم" ہم پر مسلط ہے جس پر ہم انگریز کے زمانہ میں طنز کیا کرتے تھے کہ "اسکول اور کالج "کلرک سازی" کے کارخانے ہیں" پاکستانی طلباء کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک اسلامی حکومت کے طالبِ علم ہیں، ہم نے آزادی صرف اس لئے حاصل نہیں کی تھی کہ کرسیوں پر بیٹھنے والے بدل جائیں! حصولِ آزادی کا مقصد اور غایت یہ تھی کہ ہمارا ماحول دوسروں کے افکار و تہذیب کی غلامی سے آزاد ہو جائے، مگر ایسا نہیں ہوا اور شاید قصداً نہیں ہونے دیا گیا تاکہ کرسیوں کا اقتدار پہلے ہی کی طرح باقی رہے، جس ملک کا نظامِ تعلیم تک آزاد نہ ہو وہ ملک "کاغذ" پر آزاد ہو گیا ہو تو ہو گیا ہو مگر "زمین" پر آزاد نہیں ہوا۔

سرکاری محکموں میں رشوتوں کی وہ گرم بازاری کہ مٹھی گرم کئے بغیر مطلب برآری مشکل سے ہوتی ہے، دُور دُور تک یہ جال پھیلا ہوا ہے، دفتروں کا "ROUTINE" آج بھی "انگریز کی جے" پکار رہا ہے، سرکاری عہدیداروں اور عوام کے درمیان بندگی و خواجگی اور کہتری و مہتری کی نہ جانے کتنی خندقیں اور خلیجیں اب تک حایل ہیں۔

صوبہ پرستی کی لعنت پورے شباب پر ہے، اونچے اونچے حلقوں میں پارٹی بندیاں موجود ہیں، صوبہ پرستی (PROVINCIALISM) کے پردے میں اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی ہے، رقابتوں کا زور ہے اور اس چیز نے دفتری نظام کو متاثر کر رکھا ہے اس مکروہ اور خطرناک ذہنیت کی اصلاح اسلامی مساوات کے تصور اور عمل کے ذریعہ ہو سکتی تھی مگر بیچارے اسلام کو محکموں اور دفتروں میں گھسنے کہاں دیا گیا!

غریب، مظلوم اور بیکس مہاجرین کا مسئلہ ایسا تھا کہ حکومت کی پوری مشینری کو حرکت میں آ جانا چاہیئے تھا مگر اس سلسلہ میں جو تغافل اور تساہل برتا جا رہا ہے اُسے دیکھ دیکھ کر درد مند دل خون ہوا جاتا ہے، برسات میں جب مہاجرین نے احتجاجی جلوس نکالے اور واویلا کی، تو اُس وقت حکومت نے کچھ سرگرمی دکھائی مگر اُس کے بعد پھر جمود ساطاری ہو گیا، تجویزیں سوچی جا رہی ہیں، اسکیمیں بن رہی ہیں اور کمیٹیاں غور کر رہی ہیں یہ مسئلہ کسی طرح حل ہی نہیں ہو پاتا، ہزارہا آدمی کیڑوں مکوڑوں کی طرح زمین پر رینگ رہے ہیں، کھلی ہوئی فضا، سردی کی شدت، لباس کی کمی، نتیجہ یہ ہے کہ موتوں پر موتیں واقع ہو رہی ہیں نہ جانے اربابِ اقتدار کے سینوں میں دل ہے بھی یا نہیں! اگر ہے تو اُس کا ایکس رے (X-RAY) ہونا چاہیئے کہ دلوں میں شاید گداز باقی ہی نہیں رہا —— —— مہاجرین کی بیکسی مظلومیت اور بیچارگی کو دیکھ کر اربابِ حکومت کی نیندیں حرام ہو جانی چاہیئے تھیں مگر یہاں تو ایک ڈنر اور ایک ایٹ ہوم بھی ناغہ نہیں ہوتا، جو حکومت ساڑھے تین سال کی مدت میں فلاکت زدہ مہاجرین کے سر چھپانے کے لئے مکان نہ بنا سکی اُس نے شہنشاہ ایران کے خیر مقدم کے لئے راتوں رات شاندار دروازے بنا کر کھڑے کر دئے، حکومت چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا مگر حکومت چاہے کیوں؟ مہاجرین کا اُس پر حق

کیا ہے؟ یہ بدنصیب اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستان کی طرف کیوں چل دیئے تھے؟ ان کو وہیں ہندوستان میں مر جانا چاہیئے تھا، یہاں آگئے ہیں تو اپنے اس گناہ کی سزا انھیں بھگتنی ہوگی ——— کسی قوم پر ایسی بپتا کاہے کو پڑی ہوگی ——— !
فانیؔ بدایونی نے شاید اسی دن کے لئے کہا تھا:-

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

دستور ساز اسمبلی نے حکومتِ پاکستان کے لئے دستور کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ نہ تو اسلامی ہے اور نہ جمہوری، ان لوگوں سے دوسروں کی ٹھیک طرح نقل کرنی بھی تو نہ آئی! ہر طبقہ نے اس "دستور" کو ناپسند کیا اور ہر طرف سے ملامت و بیزاری کی صدائیں بلند ہوئیں، یہ دستور پیش کر کے دستور ساز اسمبلی نے اپنی نااہلیت کو بے نقاب کر دیا! مگر اسمبلی کے ارکان ہیں کہ اپنی کرسیوں پر قوم کا! اعتماد کھونے کے باوجود ڈٹے ہوئے ہیں! اور سب سے بڑھ کر مضحکہ انگیز بات یہ ہے کہ دستور کی تسوید اور تشکیل کے لئے "صلائے عام" دے دی گئی ہے، اس "شاعری" کی کہاں تک داد دی جائے کہ دستور ساز اسمبلی کے لئے باہر سے "دستور" مانگا جا رہا ہے ——— اور اس میں چال یہ ہے، بہت باریک چال ——— کہ انفرادی طور پر دستور سازی کے سلسلہ میں جو سفارشیں آئیں گی ان میں اختلافات ہوں گے، لہذا ان اختلافات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا جائے گا کہ قوم کسی ایک دستور پر متفق ہی نہیں ہوتی، ہم کیا کریں! انگریز بھی عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے اسی قسم کے سیاسی کھیل کھیلا کرتا تھا۔

قراردادِ مقاصد میں کہا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی ماحول پیدا کیا جائے گا مگر صورتِ حال یہ ہے کہ عورتوں کی بے حجابیاں ہیں، کاک ٹیل پارٹیاں اور خٹک ناچ کے جلسے ہیں، موسیقی کانفرنسیں اور مینا بازار ہیں ——— ——— اقبالؔ نے کہا تھا:-

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

مگر یہاں ابتدا ہی "طاؤس و رباب" سے ہوئی ہے، عالم یہ ہے کہ:-

"طاؤس و رباب اوّل، طاؤس و رباب آخر"

"شمشیر و سناں" کا دور ہوتا تو آج ہمارے مجاہد کشمیر کے چناروں کے سایہ میں نمازیں پڑھتے ہوتے!

**خارجی سیاست** یہ تو پاکستان کی اندرونی حالت کی چند جھلکیاں تھیں! ہم نے تفصیل میں جانے سے قصداً اجتناب کیا ہے کہ زخموں کو چھیڑنے سے تکلیف و اذیت کے سوا اور مل ہی کیا سکتا ہے ——— ہماری خارجی حالت یہ ہے کہ غیروں کے چشم و ابرو پر ہماری نگاہ رہتی ہے، دنیا میں ہمارے دوست بہت ہی کم ہیں بیگانے زیادہ ہیں، ہم اس بات پر فخر کرتے اور خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے نمائندے نے مجلس اقوام میں چھ گھنٹے تک مسلسل دھواں دھار تقریر کی مگر یہ نہیں دیکھتے کہ آخر اس تقریر کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟ تقریر جس مقصد کے لئے کی گئی تھی، کیا وہ مقصد واقعی پورا ہوگیا؟ ہماری "وزارتِ خارجہ" بُری طرح ناکام ہو چکی ہے، باہر کے ملکوں سے ہمارے تعلقات کا یہ عالم ہے کہ اسلحہ اور مشینوں کے آرڈر بک ہو ہو کر منسوخ ہو جاتے ہیں اور ہندوستان کو بیرونی ممالک سے دھڑا دھڑ

ہتھیار، طیارے اور ٹینک آرہے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ بدستور کھٹائی میں پڑا ہوا ہے بلکہ اب تو اور اُلجھ گیا ہے، چار مہینے تک ہمارا وفد لیک سکسس (LAKE SUCCESS) میں پڑا رہا مگر مجلسِ اقوام میں "کشمیر" کا نام تک نہیں آیا، کشمیر کے مسئلہ کا حل نہ ہونا، ہماری "خارجی سیاست" کی سب سے بڑی کمزوری ہے، جہاں فولاد و آہن کی ضرورت تھی، وہاں ہم نے لالہ و گل سے کام نکالنا چاہا، اپنے اُصول کو منوانے کے لئے ہم رُوٹھے بھی تو بچوں کی طرح بہت جلد من گئے۔

افغانستان سے ہمارے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ ہیں اور یہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی جارہی ہے، بھارت نے ہمارے "دینی بھائی" کو ہم سے توڑ لیا اور وہ آج ہم سے دشمنی کر رہا ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ کب کیا صورت پیش آجائے! افغانستان کو ہمارا قوت بازو ہونا چاہیئے تھا مگر وہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے، افغانستان پاکستان کی سرحد پر "پختونستان" کا خنجر لئے ہوئے گھوم رہا ہے۔

انگلستان اور امریکہ مزاج اور اُفتادِ طبع کے اعتبار سے قریب قریب ایک ہی جیسے ہیں اور انگریز کا ہمیں بڑا ہی تلخ تجربہ ہے، تقسیم ہند کے سلسلہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جس "مسلم دشمنی" کا ثبوت دیا وہ کوئی راز کی بات نہیں ہے، ریڈ کلف پر ہمارے رہنماؤں نے اعتماد کر کے دیکھ لیا کہ اُس فرنگی نے ہماری راہ میں کانٹے بو دئے جس کی نوکیں ہمارے دل و جگر میں پیوست ہیں ــــــ ڈکسن صاحب کو ہی دیکھ لیجئے کہ کشمیر کے مسئلہ میں انگلستان ہو چکر اپنی رائے بدل دی۔

ساری دُنیا جانتی ہے اور خود مجلس اقوام کے ارکان جانتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان حق بجانب ہے مگر حق دلوائے کون؟ مجلسِ اقوام کو "پاکستان" سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے وہ تو اپنی مصلحتوں کو دیکھتی ہے، ہم نے احتجاج کر کے بھی دیکھ لیا، بہت کچھ نرم گرم گفتگوئیں بھی ہوچکیں، کمیشن بھی اپنی رپورٹیں پیش کر چکے مگر بات جہاں پہلے تھی اب بھی وہیں ہے! طاقت کے آگے ساری دلیلیں بیکار جاتی ہیں، بموں اور ٹینکوں کی دُنیا میں لفظی احتجاج کو کون پوچھتا ہے اور ان سیاستدانوں کے دل فولاد کے بنے ہوئے ہیں جن پر کسی کی فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوتا ــــــ لہٰذا ہمیں مجلسِ اقوام سے اپنی توقعات وابستہ نہ کرنی چاہیئیں، اسی غلط اعتمادی نے ہمیں طرح طرح کی اُلجھنوں میں ڈال دیا، کشمیر پاکستان کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، کشمیر کو خدا نہ کرے اگر ہم نے کھو دیا تو پھر نہ جانے ہمیں کیا کیا کھونا پڑے گا۔

کمزور کا دُنیا میں کوئی ساتھی نہیں، نالہ و فغاں اور آہ و فریاد کو کوئی نہیں سُنتا، توپوں کی گرج سُن کر لوگ چونکتے ہیں، ہمارے اربابِ حل و عقد اب تک لفظوں، تقریروں اور بیانوں کے مورچوں پر لڑتے رہے ہیں، دانشورانِ مغرب سے اربابِ اقتدار کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے اسلامی دستور کی "فنی تسوید و ترتیب" کے لئے انگلستان کے ایک قانون داں کی خدمات حاصل کیگئی ہیں، ہماری وزارتِ خارجہ کی باگ ڈور اُس شخص کے ہاتھوں میں ہے جس کی انگریز کے ساتھ وفاداری اور نیازمندی کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹا، انگلستان سے جو ہمارے سیاسی اور تجارتی معاہدے ہوتے ہیں اُن میں "انگریز مرعوبیت" کارفرما ہوتی ہے۔

ہندوستان میں "اکھنڈ بھارت" کی تحریک زور پکڑتی جارہی ہے، ڈنکے کی چوٹ کہا جارہا ہے کہ پاکستان بھارت ہی کا ایک حصّہ ہے جسے غلط طور پر کاٹ کر علیحدہ کردیا گیا، اب اُس حصّہ کو ملا لینا چاہیئے، یہ صرف گوالکر، ڈاکٹر کھرے اور شیام پرشاد

مکرجی کی نہیں بھارت کی اکثریت کی آواز ہے، کوئی شک نہیں کہ بھارت میں پنڈت نہرو اور راجگوپال آریہ جیسے صلح پسند رہنما بھی موجود ہیں مگر اکثریت کے مطالبہ کو وہ کب تک دبا سکیں گے، اُردو زبان کے مسئلہ میں ہم پنڈت جواہر لال نہرو کی بے چارگی کا حشر دیکھ چکے ہیں، وہی ہوا جو "قوم" چاہتی تھی، پنڈت جی کی بات نہیں مانی گئی ——— بھارت کے کرتا دھرتا جن کے ہاتھوں میں آج بھارت راج کی باگ ڈور ہے شاید بہت دن تک حکومت کی کرسیوں پر نہ رہ سکیں گے، ہوا کا رُخ کچھ اور ہے، اور اگر وہ رہے بھی تو "جنتا" کے مطالبہ کے سامنے انھیں جُھک جانا پڑے گا۔

مہاسبھا اسی کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ بھارت اور پاکستان ایک ہو جائیں اور بھارت کی اکثریت مہاسبھا کی ہمنوا ہے، اس لئے "اکھنڈ بھارت" کی تحریک کو محض خیالی اور کاغذی سمجھ لینا فکر و نظر کی بہت بڑی غلطی ہے ——— غلطی نہیں خودکشی! بھارت کی غذائی صورت انتہائی نازک ہے اور نازک ہوتی رہتی ہے، اس احساس کو بھی بھارت میں عام کیا جا رہا ہے کہ جن صوبوں میں سب سے زیادہ غلّہ پیدا ہوتا تھا، وہ پاکستان میں رہ گئے ——— "اس لئے" ——— اور ——— "چونکہ" ——— ظاہر ہے اس "چونکہ" اور "اس لئے" کا کیا مطلب ہو سکتا ہے!

"لیاقت نہرو پیکٹ" کے ہوتے ہوئے، بھارت "پختونستان" کی تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے، پاکستان کے خلاف کیا کچھ نہیں کہا جا رہا؟ ہم احتجاجی یادداشتیں بھیجتے ہیں مگر وہاں کوئی اثر نہیں ہوتا، مشرقی اور مغربی بنگال کو ایک کرنے اور ملانے کی تحریک بھی خفیہ طور پر اپنا کام کئے جا رہی ہے ——— سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہم داخلی اور خارجی طور پر شدید خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، ہمیں حالات کی نزاکتوں اور خطروں کے آتش فشاں پر لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے، نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے؟

خطرات کا یہ عالم، اور ہمیں ان باتوں میں اُلجھا دیا گیا ہے کہ غیر ملکوں کے وفود، سُفراء اور ارباب سیاست قائدِ اعظم مرحوم کی قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں اور اُس کی تصویریں بڑے زور شور کے ساتھ اہلِ ملک کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ کہ دیکھو! یہ ہے پاکستان کے وقار کا عالم کہ دُنیا ہمارے قدموں پر جُھکی جا رہی ہے اور ہمارے حضور عقیدت و نیازمندی کے نذرانے پیش کر رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یا پھر چند "بیگمات" کی تصویروں کے مُرقعے آئے دن سرکاری، نیم سرکاری اور عوامی اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں غیر ملکی سفیروں، سیاست دانوں اور وزیر اعظموں کے دوش بدوش "بیگمات" مسکراتی، ہاتھ ملاتی، کھانا کھاتی اور پھولوں کے ہار پہنتی یا پہناتی ہوئی نظر آتی ہیں، پاکستان کی اسلامی غیرت سرنگوں ہوئی جا رہی ہے مگر ظاہر یہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان ان باتوں سے اونچا ہو رہا ہے ——— کیا پاکستان چند "بیگمات" کے شوقِ نمود کی پذیرائی کیلئے بنا تھا؟ کیا "اسلامی ماحول" پیدا کرنے والوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں؟ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

ہماری اُمیدوں کا پیمانہ اور خوشی کا معیار اب یہ رہ گیا ہے کہ لندن اور نیویارک کے اخباروں میں پاکستان کی کبھی کبھار تعریف چھپ جاتی ہے تو ہم خوشی کے مارے بیتاب ہو جاتے ہیں کوئی باہر کا آیا ہوا سیاستداں یا اخبار نویس یہ کہہ دیتا ہے کہ "کراچی دُنیا کا عظیم الشان شہر بننے والا ہے" یا "پاکستان میں ترقی کے لئے کافی امکانات موجود ہیں۔۔۔۔" تو ہم آئینوں میں اپنے چہروں کو دیکھنے لگتے ہیں کہ اس نویدِ مسرت اثر نے ہمارے رُخساروں کی سُرخی اور شادابی میں کتنا اضافہ کر دیا!

افلاس کو دور کرنے، جہالت کو مٹانے، بھوکوں کو روٹی، ننگوں کو کپڑا اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے کے لئے اربابِ حکومت نے کوئی پروگرام اب تک پیش نہیں کیا ——— اور اس پر امریکہ اور برطانیہ کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ پاکستان کو کمیونزم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے، حالانکہ جہاں فاقہ ہے، بے روزگاری ہے، افلاس اور محتاجی ہے وہاں "کمیونزم" موجود ہے؛ فاقہ کشوں کی ان تنگ و تاریک اور غلیظ جھونپڑیوں میں کمیونزم پرورش پا رہا ہے، یہ ناتواں بھکاری، فاقہ کش مزدور، مظلوم کسان اور بے روزگار نوجوان کمیونسٹ فوج کے ہراول دستے ہیں، فلک بوس محلوں اور صبا رفتار موٹروں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو ہو جاتے ہیں اور یہ "سرخی" ایک دن رنگ لا کر رہے گی۔

اس نزاکتِ حالات کا آخر ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ رکشا چلانے والے، گدھا گاڑی ہانکنے والے، بوجھ ڈھونے والے اس کے ذمہ دار ہیں ——— ! ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے اور اِن خرابیوں کے جواب دِہ "وہ" ہیں، جن کے حکم سے کشمیر میں جنگ بند ہوئی اور "CEASE FIRE" عمل میں آیا، جنھوں نے بھارت سے معاہدے کئے، جو مجلسِ اقوام میں پاکستان کی نمایندگی کرتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں خزانوں کی کنجیاں ہیں، جو فوج، پولس، پریس اور ریڈیو کے مالک ہیں، جن کے "فرمان واجب الاذعان" پر لوگ سیفٹی ایکٹ کے تحت جیلوں میں بند کر دئے جاتے ہیں، جن کے چشم و ابرو کی جنبش پر حکومت کی ساری مشنیری گردش میں ہے۔

تم نے حکومت چلانے کی ذمہ داری آخر قبول کیوں کی تھی؟ اور جب کر چکے ہو تو تم پر احتساب بھی ہوگا، تنقید بھی کی جائے گی، تمہیں ٹوکا بھی جائے گا، باز پرس بھی ہوگی، تمہاری دل دہی کے لئے ہم زخموں کو گلاب کا پھول نہیں کہہ سکتے، خطروں کو ہم "نویدِ رحمت" آخر کس طرح سمجھ لیں! تنقید تمہاری طبعِ نازک پر گراں گزرتی ہے تو گزرا کرے، احتساب اور باز پرس سے تمہاری پیشانیوں پر شکنیں پڑتی ہیں تو پڑا کریں، ہمیں تمہاری طبعِ نازک سے زیادہ اسلام، ملت اور پاکستان عزیز ہے ——— لفظوں کی شیشہ بازی کا زمانہ گزر چکا، حقائق سے گریز اب نہیں کیا جاسکتا، یہ قوم کی موت اور زندگی کا سوال ہے، تمہاری شخصیتیں کتنی ہی عظیم و برتر سہی مگر قومی عزت، پاکستان کے وقار اور اسلام کی عظمت کے مقابلہ میں تمہاری شخصیتوں کو ہم مقدم اور مرجح سمجھنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہیں!

تمہارے بارے میں ہم بہت دن تک حسنِ ظن کو مجروح کر دیا، ہم نے بہت کچھ تجربہ کر کے اور آزما کر دیکھ لیا ——— تم ہمارے دلوں کی اذیت اور روح کے اضطراب کا اندازہ نہیں کر سکتے، خوش نصیب ہو تم کہ تمھیں قربانیوں سے نہیں گزرنا پڑا، ہندوستان میں "زندہ باد" کے نعروں اور پُرجوش "استقبالوں" میں تمہاری زندگی گزری اور یہاں پاکستان میں منصبِ اعزاز کی جمی جمائی کرسیاں تمھیں مل گئیں، تمہارے تو شاید پھانس بھی نہیں چبھی تم خنجروں اور تلواروں کے زخموں کی اذیت کو کیا جانو!

اس پاکستان کے لئے لاکھوں کلمہ گو خاک و خون میں تڑپے ہیں، ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمتوں کو لوٹا گیا، اسی پاکستان کی خاطر چار کروڑ مسلمانوں کو ہندوستان میں "یرغمال" کے طور پر چھوڑ دیا گیا ہے، خانقاہیں ویران ہوئیں، دینی مدرسے اُجڑے، مسجدیں مزبلوں میں تبدیل ہوگئیں اور واگہ سے لیکر سوادِ دہلی تک اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ——— اتنی المناک قربانیوں کے بعد جو خطۂ ارض حاصل ہوا ہے، اُسے اُن لوگوں کے رحم و کرم

پرکس طرح چھوڑا جا سکتا ہی جو شاہانِ "بنوامیہ" کی سُنّت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، جن کی پیشانیوں میں تو ہمیں جلالِ فاروقی کی جھلک نظر آتی ہی اور نہ جن کا تمدّن فقرِ بوتراب سے آشنا ہی، جن میں نہ تو بازوئے خالد کی قوت ہی اور نہ طارق کی سی جُرات پائی جاتی ہی ــــــ ہم "فتحِ مکّہ" کے انتظار میں تھے اور یہاں "واٹرلو" کا سا نقشہ نظر آرہا ہے۔

قیادت کا انقلاب ناگزیر ہو گیا ہی، اور انقلاب سے ہماری مُراد کمیونسٹوں کا انقلاب ہرگز نہیں ہے، ہم جب "انقلاب" بولتے ہیں تو اس سے اسلام کا تعمیری انقلاب مُراد ہوتا ہی! زمامِ انقلاب اُن لوگوں کو سونپی جائے گی جو زیادہ سے زیادہ "صالح" ہوں! ــــــ اور "صالح" "مُلّا" کو نہیں اُس مردِ مومن کو کہتے ہیں جس کی فراست زمانہ کی نبض کو پہچان سکے، جو نہ کسی لالچ سے رام ہو سکے اور نہ کوئی دھمکی اُسے مرعوب کر سکے، جو "منصب" اور "عہدہ" نفس کی لذت کے لئے نہیں بلکہ "خدمتِ خلق" کے واسطے قبول کرے، جس کی خواہشیں اللہ کے "حکم کی تابع ہوں" خدا کے خوف سے جس کا دل ہر وقت لرزتا اور سہما ہوا رہے، کوئی طاقت جسے جُھکا نہ سکے، جو "صُلحِ حدیبیہ" کے مزاج کو بھی پہچانتا ہو، اور بدر و خیبر، فتحِ مکہ اور غزوۂ تبوک کی نزاکتوں سے بھی باخبر ہو۔

پاکستان کے داخلی اور خارجی معاملات کا محور "اسلام" ہی! پاکستان کی عنانِ حکومت سنبھالنے کے اہل وہی لوگ ہیں جن کا "اِسلامی کردار" ہو، جو لوگ اِسلامی کیریکٹر نہیں رکھتے اُن کو آج نہیں تو کل ہٹ جانا پڑے گا ــــــ ہوشمند وہ ہی جو "ہٹائے جانے" کی پشیمانی قبول کرنے سے پہلے خود ہی عزت کے ساتھ ہٹ جائے ــــــ ہم پاکستان کی تاریخ کا وہ ورق اُلٹنا چاہتے ہیں جو ــــــ

"اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ"

کی تجلیوں سے روشن ہو، اس لئے اربابِ حکومت اور عوام کو

"اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ"

کے مقام پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

ماہر القادری

حسن احمد مینائی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

# پُراسرار کائنات!

## سائنس کو کائنات میں "خالق کائنات" کی نشانیاں نظر آنے لگیں

**یہ دنیا**

آپ ہی آپ نہیں بن گئی، اس کو ایک حکمت والی طاقتور ہستی نے بنایا ہے

**یہی "علم جدید" کا آخری فیصلہ**

سائنس داں چند نئے نظریات کی تحقیق کرنے کے بعد ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم شاید ایک ایسی کائنات میں رہ رہے ہیں جو لہروں اور صرف لہروں پر مشتمل ہے یہ تو ہم معلوم کر چکے ہیں کہ مادہ یا مختلف عناصر دراصل کوئی ٹھوس چیز نہیں ہیں کیوں کہ حقیقت میں تو سارے مادی جوہر نہایت چھوٹے چھوٹے نظام شمسی ہیں جن میں ایک یا ایک سے زیادہ برقئے ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ اپنے مرکز کے گرد منظم مداروں میں نہایت تیزی سے گردش کر رہے ہیں چنانچہ ہر چیز چاہے وہ ہمیں کتنی ہی سخت اور ٹھوس کیوں نہ معلوم ہو دراصل مسام دار یا اسفنج کی طرح ہے اس کا ایک سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ اگر سونے کے ایک ٹکڑے کو پارے میں رکھ دیا جائے تو تھوڑی ہی دیر میں پارے کے ذرات سونے کے ذرّات میں رستہ بنا لیتے ہیں سونے کا رنگ بھی بدل جاتا ہے اور گو اُس کے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے تمام عناصر کا ہے کہ وہ بھی مسامدار ہیں۔ جوہر کے برقیوں کی گردش جس فضا میں جاری ہے وہ اثیر کی فضا ہے سائنس کے نزدیک اثیر (ETHER) وہ لطیف ترین مادہ ہے جس سے ساری کائنات پُر ہے اور جو ہر چیز میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ تمام مادہ اس کے لئے مسامدار ہے کیوں کہ محسوس ہونے والے مادّے کے چھوٹے چھوٹے ذرّات اسی اثیری فضا میں تیر رہے ہیں سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ برقئے یا جوہر کی منفی برق والی اکائیاں ایک خاص قسم کی لہروں پر مشتمل ہیں اور وہ چیز جسے ہم اشعاع کہتے ہیں ایک دوسری قسم کی لہروں پر مشتمل ہے لہذا خلاصہ یہ ہوا کہ علم طبیعات کے موجودہ رجحانات تمام "مادی" کائنات کو لہروں اور صرف لہروں میں بدل رہے ہیں۔ ان لہروں میں فرق یہ ہے کہ جو لہریں مقید ہیں یا کسی محدود جگہ میں حرکت کر رہی ہیں انہیں ہم مادہ کہتے ہیں اور جو غیر مقید ہیں انہیں ہم نے اشعاع کا نام دیا ہے ایک فرق یہ بھی ہے کہ اشعاع کی لہریں اثیر میں نور کی رفتار سے سفر کرتی ہیں یعنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہیں اس کے بالمقابل وہ

لہریں جن پر مادہ مشتمل ہے نسبتاً کمتر رفتار سے حرکت کرتی ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اشعاع وہ مادہ ہے جو نور کی رفتار سے حرکت کر رہا ہو۔ غرض موجودہ طبیعات کائنات کو لہروں کے چند نظاموں میں بدل رہی ہے اگر ہمیں یہ تصور کرنا مشکل ہو کہ کوئی لہر یا لہریں بغیر کسی مادے کے کیوں کر پیدا ہو سکتی یا حرکت کر سکتی ہیں تو ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ کسی اثیر یا اثیروں کی لہریں ہیں۔ اس طرح گو اثیر کی نوعیت کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے لیکن طبیعات کے جدید رجحانات ساری کائنات کو ایک یا زیادہ اثیروں میں بدل رہے ہیں چنانچہ سائنسدانوں کی اب یہ کوشش ہے کہ ان اثیروں کے طبیعی خواص کو زیادہ احتیاط سے جانچا جائے کیوں کہ انہیں میں کائنات کی اصل حقیقت پوشیدہ ہونی چاہیئے۔ سائنسدانوں کو اُمید ہے کہ وہ اسی طرح کائنات کی "آخری حقیقت" (ULTIMATE REALITY) یا "حقیقت الحقایق" کا کامیابی کے ساتھ کھوج لگا سکیں گے۔ یہاں اگر جدید تحقیقات کے نتیجہ کا ذکر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا جو مختصر طور پر یہ ہے کہ "تمام اثیر اور ان کی لہریں یا اہتزازات جن پر کائنات مشتمل اور جن سے مرکب ہے غالباً سب خیالی ہیں اس "خیالی" یا "تخیلی" وجود کو ہم عارضی طور پر "حقیقت" کا نام دے سکتے ہیں اور یہی وہ "حقیقت" ہے جس کا مطالعہ کرنا موجودہ سائنس کا مقصد ہے۔ واضح رہے کہ یہ حقیقت اثیر کے اُس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے سائنسدانوں کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ اگر ہم اُن سائنسدانوں کے معیار سے جانچیں اور تھوڑی دیر کے لئے انہیں کے الفاظ استعمال کریں تو اثیر اور ان کی لہریں در اصل کوئی حقیقت نہیں ہیں حالانکہ فی الواقع یہی وہ سب سے زیادہ "باحقیقت" چیزیں ہیں جن کا انسان کو کوئی علم یا تجربہ ہے اور موجودہ سائنس کی روشنی میں یہی اصل کائنات ہیں۔ ان تمام اثیروں اور ان کی لہروں کے خیالی ہونے کا مفروضہ قایم کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ سائنسدان کسی تجربہ کے ذریعہ بھی اثیر یا اثیروں کے وجود کا انکشاف اور احساس نہیں کر سکے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی اثیر کا واقعی وجود ہو تو یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ خواہ یہ اثیر بالکل ساکن ہو یا ہم اُس کے درمیان سے نہایت تیز رفتار سے گزر رہے ہوں اس کا کوئی اثر بصریات یا نور اور برق کے مظاہر پر مترتب نہیں ہوتا حالانکہ یہ تمام مظاہر اسی اثیر میں انجام پاتے ہیں۔ اثیر کے وجود کی مدد سے سائنس دانوں نے جتنے بھی تجربے کرنے کی کوششیں کیں وہ ناکام رہیں۔ اس سلسلے کا مشہور تجربہ وہ ہے جو فضا میں زمین کی رفتار یا حرکت مطلق معلوم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ ریاضی اور سائنس کی مدد سے یہ حساب لگایا جا چکا ہے کہ زمین آفتاب کے گرد گھومنے میں فی سکنڈ کم و بیش اٹھارہ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے یا آفتاب اپنے سارے نظام کے ساتھ جس میں زمین بھی شامل ہے فضا میں ستاروں کے ایک مجموعے ہرکیولیز (HERCULES) کی طرف بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے اس کے باوجود وہ تجربہ جو فضا میں زمین کی رفتار مطلق، یعنی وہ رفتار جو کسی دوسرے جرم فلکی کی نسبت سے نہ ہو، معلوم کرنے کے لئے کیا گیا، اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کرۂ زمین اثیر کے اُس وسیع اور ہمہ گیر سمندر کی نسبت سے جس میں ساری کائنات حرکت کر رہی ہے، بالکل ساکن ہے۔ فطرت یا کائنات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ رفتار مطلق یا حرکت مطلق کو کسی تجربہ کے ذریعہ معلوم کرنا ممکن نہیں چنانچہ فضا میں کرۂ زمین کی حرکت مطلق معلوم نہیں کی جا سکتی ہے۔

مشہور ماہر ریاضیات اور سائنسدان پروفیسر آئن سٹائن (EINSTEIN) کے نظریہ اضافیت نے سائنس کی تحقیقات میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا۔ کائنات کے اس ریاضیاتی نظریے سے جن اہم مسائل کی توجیہ ہوتی ہے، اُن میں اس امر کی تشریح بھی شامل ہے کہ حرکت مطلق کو مادی آلات کے ذریعہ معلوم کرنا کیوں ناممکن ہے۔ نظریۂ اضافیت کے قائم ہونے کے بعد سائنس آج کل فطرت کے جو نقشے بنا رہی ہے وہ سب ریاضیاتی ہیں اور سائنس کے بیان کے مطابق یہی نقشے یا خاکے

ایسے ہیں جو تجربہ کئے جانے والے حقائق کا بڑی حد تک ساتھ دیتے اور اُن پر پُورے اُترتے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں ریاضی کی بہت سی کامیابیوں کے بعد اور کائنات کے کارخانے میں جو مختلف عمل اور مظاہر ظہور پذیر ہو رہے ہیں ان کا سائنسی طور پر مطالعہ کرنے کے بعد کائنات کے خالق کا جو تخیل علمِ جدید نے اپنے نزدیک قایم کیا ہے اس کے اظہار کے لئے اس کے پاس بہترین الفاظ یہ ہیں کہ "خالقِ کائنات جو طاقت بھی ہے وہ ایک زبردست ریاضی دان ہے"۔ علمِ جدید کی رو سے کائنات کی جو شکل فرض کی گئی ہے اس کی تمثیل صابون کے ایک بلبلے سے بہت اچھی طرح دی جاسکتی ہے۔ ہمیں یہ ضرور فرض کرنا پڑے گا کہ کائنات کے اس تخیلی بلبلے کی سطح پُوری طرح ہموار نہیں ہے اور کائنات اِس بلبلے کا اندرونی حصہ نہیں بلکہ اُس کی سطح ہے۔ یہ بات بھی لازمی طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ صابون کے بلبلے کی سطح جہاں دو سمتیں رکھتی ہے وہاں کائنات کے مفروضہ بلبلے کی سطح پر چار سمتیں ہیں ان میں سے تین عام سمتیں فضا یا "مکان" (SPACE) کی اور ایک سمت "زمان" (TIME) کی ہے اور وہ مادہ جس کا یہ کائناتی بلبلہ بنا ہوا ہے سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ کسی "بڑی حکمت والی ہستی" نے زمانِ محض (Absolute time) اور مکانِ محض (Absolute space) کو ایک سانچے میں ڈھال کر یہ ساری کائنات موجود کر دی ہے۔ اس جگہ یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ موجودہ سائنس اس بات پر زور دیتی ہے کہ زمان یا مکان کوئی لامحدود یا نامتناہی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں بہر حال محدود ہیں۔ سائنس جب "وقت" کے رستے پر زمانۂ گزشتہ کی طرف بڑھتی ہے تو اسے کئی ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طویل سفر کے بعد ہمیں وقت یا زمان کی ابتدا اور اس سرچشمہ پر پہونچ جانا چاہیئے۔ یہ وہ مقام یا منزل ہوگی جس سے پہلے ہماری کائنات "غیر موجود" تھی۔ نظریہ اضافیت کی رو سے کائنات کے موجودہ مادی حالت میں آنے سے پہلے تمام مادہ اپنے ابتدائی ذرّوں یعنی الکٹرون اور پروٹون کی شکل میں تمام فضا میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ مادی نقطۂ نظر سے یہ "عدم" کی حالت تھی لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اس یکسانیت یا سکون کی حالت میں تغیر واقع ہوا۔ اس تغیر کے واقع ہونے کے سبب سے سائنس لاعلم ہے اور وہ صاف طور پر اقرار کرتی ہے کہ یہ سوال اس کی بساط سے باہر اور اس کے موضوع سے خارج ہے۔ غرض اس تغیر یا حرکت کے پیدا ہوتے ہی کائنات وجود میں آنے لگی۔ الکٹرون اور پروٹون جو پہلے فضا میں یکساں طور پر پھیلے ہوئے تھے انہوں نے برقیوں اور مرکزہ ہائے جوہری کی حیثیت سے عناصر کا روپ اختیار کرنا شروع کیا۔ مادہ نہایت بڑی بڑی مقداروں میں فضا میں مختلف جگہ جمع ہونا شروع ہو گیا اور مادے کی اِن زبردست مقداروں نے سحابیوں کی صورت اختیار کی۔ موجودہ کائنات کے مختلف نظام ہائے شمسی ایک طویل عرصہ پہلے سحابیوں ہی کی شکل میں تھے۔

## جستجوئے حقیقت

کائنات کی ماہیت سے متعلق فلسفیوں کا تو ایک مکتبِ خیال انگریز فلسفی لاک (Locke) کے اس خیال کی تائید میں ہے کہ اشیاء کا جوہرِ اصلی ہمیشہ نامعلوم رہے گا لیکن سائنس اس کی قائل نہیں معلوم ہوتی ہے اور برابر کائنات کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ اپنے اس تخیل کی بنا پر کہ یہ ساری مادی کائنات غالباً خیال پر منحصر ہے، سائنس فلسفہ سے بہت قریب ہو جاتی ہے کیونکہ اس طرح ساری کائنات کو ایک مفکر ریاضی کا "خیال" مان لیا جاتا ہے۔ خیالی تخلیق کا ہم یوں انکار بھی نہیں کر سکتے کہ اس کا خود ہم کو تجربہ ہے۔ انسان خواب میں یا وہم کی صورت میں "خیالی تخلیق" کرتا ہے۔ اِسی پر "تخیلی تخلیق" کو قیاس کیا جاسکتا ہے فلسفہ یا سائنس اس دماغ یا ذہن (MIND) کو جس کے خیال کی تخلیق یہ کائنات ہو سکتی ہے کائناتی ذہن (universal mind) کہتی ہے۔ یہ خیال بھی معقول معلوم ہوتا ہے کہ اس کائناتی ذہن کی تخلیق ہمارے منفردہ ذہنوں کی تخلیق سے زیادہ

"مادی" ہونی چاہیئے۔ فطرتی قوانین کائناتی ذہن کے تخیل کے قوانین ہیں۔ چنانچہ موجودہ سائنس کی نظر میں فطرت کی یکسانی یا یکرنگی اس کائناتی ذہن کی استقامت بالذات (SELF CONSISTANCY) کا سب سے بڑا اور کھلا ثبوت ہے۔ اب اگر ہماری کائنات ایک تخیلی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تخیلی عمل ہونا چاہیئے۔ زمان ومکان کی محدودیت یا انکا متناہی نہ ہونا ہمیں یہ تصور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ تخلیق کا عمل کبھی ہوا ہے۔ اس عمل کے تخیلی ہونے سے متعلق سائنس یہ دعویٰ کرتی ہے کہ فطرت کے مقادیر مستقلہ (Constants) مثلاً کائنات کی وسعت یا برقیوں کی وہ تعداد جو کائنات میں ہے، ایسی مقداروں کا تعین "خیال" پر دلالت کرتا ہے اور انہی بے انتہا مقداروں سے ہم اُس "ذہن" کی بے نہایت وسعت وعظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کا تخیل یہ کائنات ہے۔ سائنس یہ بھی مانتی ہے کہ زمان ومکان، جو عمل تخلیق کے بعد سے تخلیقی خیال کا نظام ہیں خود بھی لازمی طور پر "عمل تخلیق" کے ایک پہلو کی حیثیت سے عدم سے وجود میں آئے ہوں گے۔ قدیم علوم کائنات نے خالق عالم کی تصویریوں کھینچی تھی کہ وہ زمان ومکان کے ایک نظام میں مصروفِ عمل ہے اور ایسے خام مادے سے، جو پہلے سے موجود ہے، آفتاب۔ ماہتاب اور ستارے بنا رہا ہے لیکن علم جدید ہمیں بتاتا ہے کہ خلاق کا دائرہ عمل زمان ومکان سے ماورا ہے۔ وہ کائنات کے بنانے کے لئے پہلے سے کسی موجود مادے کا محتاج نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلاقِ ازل کے اس ارادے کے ساتھ کہ وہ کائنات کی تخلیق کرے زمان ومکان اور نتیجۃً وہ چیز جسے ہم مادہ کہتے ہیں وجود میں آگئے۔

پہلے تو ایک صفحۂ سادہ تھا آئینہ
دیکھا جو اُس نگار نے تصویر ہو گیا　　(امیر مینائی)

پچھلے چند برسوں میں علم کے دریا نے تیزی سے ایک نیا رُخ اختیار کیا ہے۔ موجودہ صدی کے شروع تک سائنسدانوں کا یہ اندازہ تھا کہ کائنات ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہی ہے جو اپنی نوعیت میں "مکانی" ہے۔ خیال تھا کہ یہ حقیقت برقیوں کے ایک عظیم بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جنہوں نے محض اتفاقی طور پر ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے اور جن کا کام یہ ہے کہ چند بے مقصد اور بے شعور طاقتوں کے زیر اثر کچھ زمانے کے لئے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہو جانے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اسی مفروضہ کے تحت یہ خیال قائم کر لیا گیا تھا کہ زندگی اس بالکلیہ مکانی کائنات میں محض ایک حادثہ کے طور پر آپہونچی ہے۔ عناصر کی اس عظیم الشان کائنات کا ایک حقیر سیارہ یعنی یہ زمین جس پر انسان بستا ہے اتفاقی طور پر کچھ عرصہ کیلئے ذی شعور ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری زمین کی طرح کائنات کے اور مقامات پر بھی زندگی نمودار ہو گئی ہو لیکن آخر کار اُنھی اندھی مکانی طاقتوں کے عمل سے کائنات کے اِن ذی شعور اقطاع کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ وہ ایک وقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائیں۔ سائنس کی جدید تحقیقات اور تازہ انکشافات سے ان تمام خیالات کی تردید ہوتی ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنسدانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک "غیر مکانی حقیقت" کی طرف لے جا رہا ہے اس روشنی میں ہمیں کائنات ایک "عظیم مشین" سے زیادہ ایک "عظیم تخیل" معلوم ہوتی ہے جو کائناتی ذہن" کا تخیل ہے۔ سائنس اب اس خیال کی حامی ہے کہ یہی "کائناتی ذہن" مادے کی اقلیم کا "خلاق" اور اس کا "حاکم" ہے۔

علم جدید ہمیں اپنے تخیل کے اُن ابتدائی ارتسامات پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے جو یہ تھے کہ ہم ایک ایسی کائنات میں آپڑے ہیں جس میں انسانی زندگی کوئی خاص مقصد نہیں رکھتی ہے لیکن اب تمام مادی کائنات ایک ایسی تخلیق ثابت ہو رہی ہے جس کے ذریعہ "ذہن" نے اپنے آپکو ہویدا اور آشکارا کیا ہے۔ سائنس کو کائنات میں ایک ایسی طاقت

کی نشانیاں نظر آنے لگی ہیں جو تمام موجودات کی ”خالق“ اور ہر چیز پر قابو رکھنے والی ہے۔ اس طرح علم جدید آخر کار مانتا ہے کہ یہ ساری کائنات ایک غور و فکر اور شعور رکھنے والی نہایت ہی طاقتور اور بڑی حکمت والی ہستی کا تخلیق کردہ ایک با مقصد اور مکمل نظام ہے۔

بہ چشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری
جہاں بہ چشمِ خرد سیمیا و نیرنگ ست (اقبالؒ)

عبدالحمید عشق

# غلطی ہائے مضامین

## "تاریخِ انقلاباتِ عالم" — پر ایک ناقدانہ نظر!

جناب ابو سعید بزمی کی تصنیف "تاریخ انقلاباتِ عالم" پر رسالوں اور اخباروں میں جو تنقیدیں اور تبصرے شائع ہوئے ہیں، اُن میں اس کتاب کو طرح طرح سے سراہا گیا ہے، تنقید کم اور مدح وثنا خوانی زیادہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یا تو تبصرہ نگار حضرات نے اس کتاب کو سرے سے پڑھا ہی نہیں، بس اِدھر اُدھر سے چند صفحے اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور جھٹ سے ایک "عدد" تنقید قلم وقرطاس کے سپرد کر دی، اور اگر اُنھوں نے اس کتاب کو پڑھا ہے تو اُن کی نگاہِ تنقید سے اہلِ نظر کو قلتِ معلومات اور پایابیٔ علم وخبر کا گلہ ہے — میں نے اس کتاب کو پڑھا اور دوسری مستند کتابوں سے جو موازنہ کیا تو "تاریخِ انقلابات عالم" میں بہت سی واقعاتی اور نظریاتی غلطیاں نظر آئیں۔

مُصنف — جن کو تبصرہ نگاروں نے "فاضل لائق اور مُتبحر" لکھا ہے، وہ انشا پرداز اور صحافت پرداز تو ضرور ہیں مگر فنِ تاریخ میں اُن کو زیادہ درک نہیں ہے، اور تاریخی حقائق سے جو نظریے اُنھوں نے مستنبط کئے ہیں اُن میں سے بعض نظریے درست نہیں ہیں، اس قسم کی کتابیں طالب علم ہی نہیں اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی ہیں۔

بزمی صاحب صفحہ (۶۸) پر لکھتے ہیں — کہ ہندوستان کا سب سے پہلا انقلاب وہ ہے جس کا تذکرہ مہابھارت میں ملتا ہے اور جس کا ہیرو رام کو قرار دیا جاتا ہے، رام اور راون کی جنگ اگرچہ افسانوی دنیا میں گم ہو کر رہ گئی ہے، تاہم اُس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ .. .. .. " بزمی صاحب کو نہ جانے کہاں سے ایسی تاریخی کتاب ہاتھ لگ گئی جس میں مہابھارت کا ہیرو رام کو قرار دیا گیا ؎ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے! میں سمجھتا ہوں اور صحیح سمجھتا ہوں کہ چھٹی جماعت کا ایک طالب علم بھی مہابھارت کا ہیرو رام چندر جی کو قرار نہیں دے سکتا، معمولی لکھے پڑھے لوگ تک اس بات کو جانتے ہیں کہ مہابھارت کا ہیرو تو ارجن ہے، جس نے مہاتما کرشن کے کہنے پر کوروں سے جنگ لڑی اور اُن پر فتح پائی، مہابھارت تو کوروں اور پانڈوں کی جنگ پر مشتمل ہے، رام اور راون کی لڑائی سے اُس کا کیا واسطہ! — یہاں ہم اس بات کی وضاحت بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ رامائن کے مصنف بالمیک ہیں اور مہابھارت ویاس جی کی تصنیف ہے!

صفحہ (۴۷) پر "تاریخ انقلاباتِ عالم" کے مصنف رقمطراز ہیں۔ .. .. ارسطو جس نے جمہوریت ومساوات کے بڑے بڑے اُصول وضع کئے ہیں۔ .. .. .. .. افلاطون نے بھی اُنہی اُصول کی تائید کی ہے"

اربابِ نظر جانتے ہیں کہ افلاطون اور ارسطو کے نظریوں میں تضاد پایا جاتا ہے، اور اس سے بڑھ کر مضحکہ انگیز غلطی یہ ہے فرماتے ہیں "افلاطون نے ارسطو کے اصول کی تائید کی تھی" حالانکہ افلاطون ارسطو کا اُستاد تھا، اور افلاطون کو مرے ہوئے جب دس سال گزر جاتے ہیں اُس وقت ارسطو نے اپنی کتاب سیاسیات کا آغاز کیا ہے، کیا افلاطون ارسطو کے اُصول کی تائید

کے لئے قبر سے اُٹھ کر آگیا تھا ؟ یا خواب میں تلقین فرمائی تھی کہ میں تمہارے اُصول کا موید ہوں ؟

صفحہ (۱۰۳) پر ہے سانکھیہ اور یوگیہ (یہ دونوں ہندی فلاسفہ کے گروہ ہیں) اُصولی لحاظ سے ایک ہیں ۔ ۔ ۔ سانکھیہ ۔ ۔ ۔ ۔ مادہ اور رُوح دو جُدا جُدا چیزیں ہیں اور دونوں ازل سے ابد تک رہیں گی ۔ ۔ ۔ مادے میں شعور واحساس کی ۔ ۔ رُوح کے اِتصال سے پیدا ہوتی ہی، مختصر یہ کہ سانکھیہ کو نرلیشور (خدا کے وجود کے انکار کرنے والے) قرار دیا ہے یوگیہ اُصولی لحاظ سے سانکھیہ خیالات رکھتے ہیں، صرف ان میں اتنی زیادتی ہی کہ آدمی ریاضت کی مدد سے زندگی میں اپنی رُوح مادے سے الگ کرسکتا ہی، نیائے ویشیشک کا یہ فلسفہ ہی کہ اس دُنیا کے بعد کوئی دُنیا نہیں یعنی دہریت اور الحاد کا فلسفہ ہی ۔ ۔ ۔ !

بزمی صاحب نے یہ سب حوالے میکس مولر کی تصنیف سے دیتے ہیں، ایس این گپتا نے اپنی تصنیف "تاریخ ہندی فلسفہ" میں میکس مولر کی تحقیق کو کوئی جگہ نہیں دی، جب صاحبِ تاریخ تمام دُنیا کی تاریخ لکھنے کے لئے بیٹھے تھے تو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ وہ اصل کتابوں یا اُن کی مستند شرحوں سے استفادہ کرتے، تاکہ حقیقت اپنے ٹھیک روپ میں جلوہ گر ہوتی، اہل تحقیق محنت سے نہیں گھبراتے ——— انگریز مؤرخ مشرق کی تاریخ اور نظریوں کے پیش کرنے میں بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں، ان پر پورا پورا اعتماد کر لینا اہلِ تحقیق کو زیب نہیں دیتا ۔

مسٹر ایس ۔ این گپتا جو سنسکرت کالج کلکتہ کے پرنسپل ہیں اپنی کتاب "تاریخ ہندی فلسفہ" میں لکھتے ہیں کہ وگیان بھکشو جو سانکھیہ کا سب سے بڑا شارح ہی اُس نے اپنی کتاب "وگیان امرت بھاشیہ" میں اکثر مواقع پر بیان کیا ہی کہ سانکھیہ ابتدا میں توحیدی تھا اور بعد میں اُس کی ایک شاخ دہری ہوگئی جس نے ایک مبالغہ آمیز کوشش یہ ثابت کرنے کی کی عالمی عمل کی تشریح کے لئے ایشور کے مفروضے کی ضرورت نہیں، اگرچہ مہا بھارت میں بتایا گیا ہی کہ سانکھیہ اور یوگیہ میں فرق یہ ہی کہ اوّل الذکر دہری اور ثانی الذکر توحیدی ہی ۔ ۔ ۔ اس بیان سے بھی بزمی صاحب کے قول کی تردید ہوتی ہی کیونکہ موصوف نے دونوں فرقوں سانکھیہ اور یوگہ کو خدا کا انکاری بتایا ہی، حالانکہ یہ دونوں فرقے عقاید کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں ۔

صفحہ (۱۵۰) پر ارشاد ہوتا ہی کہ جب اُن (امیر معاویہؓ) کی وفات پر اُن کے بیٹے یزید نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور عام مسلمانوں کے نتیجہ امام حسنؓ (جو حضرت علیؓ کے صاحبزادے تھے) کی خلافت ماننے سے انکار کیا تو مسلمانوں میں سخت برہمی پھیلی، بدنصیبی سے امام حسنؓ میں قائد انقلاب کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیت بہت کم تھی، انھوں نے اس جھگڑے میں پڑنا پسند نہ کیا اور خود ہی خلافت سے دست برداری دیدی لیکن عام مسلمانوں نے اب بھی یزید کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور امام حسنؓ کے چھوٹے بھائی امام حسینؓ کو خلیفہ بنانا چاہا ۔ ۔ ۔ ۔

اس تاریخ دانی کی کہاں تک داد دی جائے، تاریخ و سیر کا یہ وہ انکشاف ہی جو ابو سعید صاحب بزمی پر ہوا ہی، اگر ایسے ہی دو چار مورخ اور پیدا ہو جائیں تو فنِ تاریخ کی بساط ہی اُلٹ کر رہ جائے، کہاں یزید کا دعوائے خلافت اور کہاں حضرت حسنؓ کا اُس کی خلافت سے انکار! حضرت امام حسنؓ تو ۵۰ھ ہجری میں انتقال فرما چکے تھے اور امیر معاویہؓ کی وفات ۶۰ھ ہجری میں واقع ہوئی تھی، ظاہر ہی کہ امیر معاویہؓ کے ولی عہد یزید نے باپ کے مرنے کے بعد ہی خلافت کا دعویٰ کیا تھا اور اُس وقت امام حسنؓ اس دُنیا میں موجود کہاں تھے ؟

---

۵ء بعض مورخین نے ۴۹ھ اور بعض نے ۵۱ھ تاریخ وفات لکھا ہی،

مصنف کا یہ کہنا کہ "امام حسنؓ میں قائد انقلاب کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیت بہت کم تھی۔ ۔ ۔" تاریخی حقائق میں غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے، امام حسنؓ نے بہت سے نازک مواقع پر اپنے پدر بزرگوار حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو جو مشورے دیئے اُن میں اصابتِ فکر جھلکتی ہے، حضرت امیر معاویہؓ سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا صُلح کر لینا اسلامی تاریخ کا شاندار واقعہ ہے، اگر امام عالی مقام صلح نہ فرماتے اور امیر معاویہؓ سے برسرپیکار ہو جاتے تو مسلمانوں میں ایسی تلوار چلتی کہ جمل اور صفین کے خونریز معرکے اس کے آگے گرد ہو جاتے، امیر معاویہؓ کے عہد سے لیکر ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک چالیس سال کی مدت میں مسلمانوں کو جو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئی ہیں اُن پر حضرتِ امام حسنؓ کی "صلح"[1] بھی کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے ——— امام حسنؓ کے متعلق بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے۔ "یہ (یعنی امام حسنؓ) میرا بیٹا مسلمانوں میں صُلح کرانے والا ثابت ہوگا۔"

باب (۱۲) صفحہ (۳۰۳) - یورپ کی نئی زندگی ——— بزمی صاحب نے سلطان محمد فاتح ثانی کی فتح قسطنطنیہ کے بارے میں لکھا ہے اس فتح کے بعد مفتوح قوم کو اُن تباہیوں اور غارت گریوں سے دوچار ہونا پڑا جو اس قسم کے موقعوں پر پیش آتی ہیں۔!

ایک مُسلمان مُورخ سے ہم اس قدر غیرذمہ دارانہ بات کہنے کی توقع نہیں رکھ سکتے! یورپ کے مورخین۔ ۔ ۔ ایورسلے، کریسی اور لین پول جیسے چوٹی کے تاریخ دانوں نے سلطان محمد فاتح ثانی کو نہ تو غارت گر بتایا اور نہ یہ لکھا کہ اُس کی فتح کے سبب مفتوح قوم کو تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا، لین پول لکھتا ہے، -جو کچھ محمد فاتح ثانی نے قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر کیا ہے وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، جو ظلم عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں کیا ہے۔ ۔ ۔ کریسی جیسا محقق لکھتا ہے کہ چند گھنٹے یہ حالت رہی اور فوراً ہی محمد ثانی نے فوجوں کو قتلِ عام سے روک دیا اور گرجے وغیرہ محفوظ رہے، قسطنطنیہ کی فتح کے دن محمد فاتح ثانی نے جس وسعتِ ظرف، درگزر اور رحمدلی کا ثبوت دیا اُس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں ——— افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالارِ اعظم ——— ڈیوک نوٹاراس، جب گرفتار کر کے اُس کے سامنے لایا گیا تو محمد فاتح ثانی نے اُسے معاف کر دیا، اور ڈیوک کے ساتھ اس درجہ شرافت کا برتاؤ کیا کہ اُس کی بیمار بیوی کی عیادت کے لئے گیا اور تسلی آمیز کلمات اپنی زبان سے ادا کئے اور ساتھ ہی دُشمن کی فوج کے دوسرے افسروں کو بھی رہا کر دیا۔ ۔ ۔ ۔

"تاریخ انقلاباتِ عالم" کی غلطیوں کو اگر گنا جائے تو یہ "غلط نامہ" خود ایک مستقل کتاب بن جائے گا، مورخین اور اہلِ قلم کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے، یہ نہیں کہ ایک آدھ کتاب کو دیکھا اور اُس کی بنیاد پر واقعات اور نظریوں کی ایک عمارت کھڑی کر دی، مصنف کو ماخذ اور حوالے (REFERENCES) کے لئے زیادہ سے زیادہ مستند کتابیں تلاش کرنی چاہئیں، ایک آدھ کتاب پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں، اس کے ماسوا درایت و روایت کے پرکھنے اور جانچنے کی خود میں بھی قابلیت ہونی چاہیئے، ان ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے بعد جو کتاب لکھی جائے گی اُس میں واقعات کی صحیح ترجمانی ہوگی اور ایسی تصنیف سے کتاب پڑھنے والوں کو فائدہ پہونچ سکتا ہے، جناب ابوسعید بزمی نے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا اور شاید چھپنے کے شوق میں ایک چلتی ہوئی کتاب لکھ دی۔

---

[1] صلح نہ ہوتی تو مسلمانوں کی خانہ جنگی کے سبب ملکوں کے فتح کرنے کے موقعے کس طرح میسر آتے!

پروفیسر سید احمد چشتی
(ایم۔اے)

# شعر و حکمت

شاعری کیا ہے؟ اس کا جواب اکبر الہ آبادی کی زبان سے سنئے، فرماتے ہیں:۔

شاعری رنگ طبیعت کا دکھا دیتی ہے　　بوئے گل راہ گلستاں کا پتا دیتی ہے

اکبر کے نزدیک شاعری ایک وجدانی چیز ہے، محض اکتساب سے اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، صرف موزوں طبع ہونے اور علم و فضل رکھنے سے کوئی شخص حقیقی شاعر نہیں ہو جاتا، شاعر کے دل میں سوزِ محبت اور گدازِ عشق کا پایا جانا بہت ضروری ہے،

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر　　علم سے شاعری نہیں آتی

دل میں جوش اور ولولہ ہوتا ہے تو پھر اثر انگیز اشعار وجود میں آتے ہیں اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے:۔

سخن وہ دلنشیں ہے جوشِ خاطر سے جو ہو پیدا　　کہ دل میں بیٹھ جاتا ہے وہی جو دل سے اٹھتا ہے

شاعر کو واردات اور محسوسات کے اظہار میں مخلص بھی ہونا چاہیئے، بناوٹ اور غیر واقعی اظہار سے شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

سخن سنجی کا کیا کہنا مگر یہ یاد رکھ اکبر　　جو سچی بات ہوتی ہے وہی دل میں اترتی ہے

شاعری کے لئے وزن اور قافیہ کی بھی ضرورت ہے، "وزن" میں دل کشی ہوتی ہے

دل کا میلان ضروری ہے سخن میں ہو جو وزن　　طبع سنجیدہ سامع ہے ترازو کی طرح

لیکن نری قافیہ پیمائی سے بھی کام نہیں چل سکتا، الفاظ کے ساتھ معنویت کا ہونا بھی ضروری ہے، صرف الفاظ جوڑ دینے سے کیا ہوتا ہے؟

نہیں مزہ صرف اس میں اکبر کہ قافیوں کی روا روی ہو
غزل اگر ہو تو عاشقانہ، جو مثنوی ہو تو معنوی ہو

شاعری "خیال" اور "اظہار" کے مجموعہ کا نام ہے، الفاظ و معانی میں ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے، اگر شعر میں صرف لفظوں کی طلسم بندی ہو اور معنویت کی کمی محسوس کی جائے تو اکبر کی نگاہ میں وہ شعر ایک ایسا آسمان ہے جس میں ستارے نہیں ہیں۔

معنیٰ کے ساتھ ہو تو مزہ ہے زبان کا　　انجم نہ ہوں تو لطف نہیں آسمان کا
معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں　　وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خوان کا

اکبر الہ آبادی شعر و شاعری میں تقلید کے قایل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ حقیقی شاعر میں تخلیقی قوتوں کا ہونا ضروری ہے، اس کو خود اپنے دماغ سے سوچنا، اپنے دل سے محسوس کرنا اور اپنی زبان سے اس کا اظہار کرنا چاہیئے۔

اوروں کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں　　وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں

خود سوچ کے حسب حال مضمون نکال    انسان یوں ہی ترقیاں پاتے ہیں

اکبر اُردو شاعری میں ایک نئی طرز کے مُوجد ہیں ——— اور مُوجد ہی نہیں بلکہ خاتم بھی! بہت سے شاعروں نے اکبر کے طرزِ شاعری کی نقل اُتارنے کی کوشش کی مگر اس منزل میں دو چار قدم ہی چل کر طاقت جواب دے گئی اکبر کے اسلوبِ شاعری کی نقل پُوری طرح ہو نہ سکی۔

اکبر کی شاعری نے جس زمانہ میں ہوش سنبھالا، وہ انگریز کی اندھی تقلید کا دَور تھا، شعر و ادب ہی پر کیا موقوف ہے، ہر بات میں "صاحب بہادر" کی نقالی کو باعثِ فخر و مباہات سمجھا جاتا تھا، شاعری میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مضامین لائے جاتے تھے جن سے ہوس ناک جذبات کو سہارا ملتا تھا، یہ معصیت زدہ رومان" آج تک ہماری "شاعری" کا دامن تھامے ہوئے ہے، اکبر نے اس پر طنز کی :-

تہذیب کے خلاف ہے جو لائے راہ پر    اب شاعری ہے وہ، جو اُبھارے گناہ پر

اور اِس زمانہ میں گناہ پر اُبھارنے والی شاعری کو "آرٹ" کہا جا رہا ہے!

مغربی تہذیب کی نقالی نے اُردو شعر و ادب سے اُس "حُسن" کو بھی چھین لیا جو ہمارے لٹریچر کی جان تھا، ہمارا لٹریچر سپاٹ اور بے لُطف بن کر رہ گیا، اکبر نے یہ محسوس کرکے کہا :-

اب شغلِ زندگی کے ہیں قانون ہی کچھ اور    کیسی غزل یہاں تو ہے مضمون ہی کچھ اور

وہ جادوئے سخن ہے نہ وہ رنگِ انجمن    تہذیبِ مغربی کے ہیں افسُون ہی کچھ اور

جب ماحول ایسا ہو اور طبیعتوں کا یہ رنگ ہو، تو قدر دانوں کا معیارِ قدر و ستائش کیا ہوگا؟ اکبر نے اس پر بھی طنز کی :-

قدر دانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج    بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلّو نہ ہوئے

اس قدر دردناک طنزیہ انداز میں شاید ہی کسی نے زمانہ کی جوہر ناشناسی کا گلہ کیا ہو!

اکبر کا ایک شعر ہے :-

دوست کہتے ہیں تغزّل نہیں تجھ میں اکبر    دل لگانا ہی پڑا اُس بتِ بے پیر کے ساتھ

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو اس بات کا احساس تھا، یا اُن تک اربابِ نظر کی یہ رائے اور تنقید پہونچی تھی کہ اُن کے کلام میں دوسرے غزل گو شاعروں کی طرح تغزل کا نکھار نہیں پایا جاتا ——— مگر اکبر کے یہاں پھر بھی اس انداز کے شعر ملتے ہیں۔

کیا شان ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

اس شعر میں تصوّف کی ایک دُنیا بند ہے ——— معاملہ بندی کا لُطف اس شعر سے حاصل کیجئے :-

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر    ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

اکبر کی "غزل" اور دوسرے شاعروں کے تغزّل میں اس لحاظ سے ایک طرح کی مغایرت سی پائی جاتی ہے کہ اکبر کی غزلوں میں واقعیت کا عنصر زیادہ ہے یعنی دوسروں کے یہاں "جگ بیتی" کی فراوانی ہے اور اکبر کی غزلوں میں "آپ بیتی" کا غلبہ ہے،

یہ مصیبت ناتواں دل نے کبھی دیکھی نہ تھی    پہلے بھی تکلیف اس کو تھی مگر ایسی نہ تھی

یہ شعر بول رہا ہے کہ میں ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہوں۔

اکبر اپنے دلی جذبات اور قلبی واردات کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر جاتے ہیں، بناوٹ کی باتیں اُن کو آتی ہی نہیں:-

بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عُزلت — دل اپنا ہوتا ہے، اپنا خیال ہوتا ہے
دل کو مرے فروغ تمھاری نظر سے ہے — بجلی بنا ہوا یہ اسی کے اثر سے ہے
میں نے پوچھا ہے تمھیں مجھ سے محبت یا نہیں — ہنس کے فرمایا نہیں اب تک مگر ہو جائے گی

اس مُتمدّن دُنیا میں کوئی چاہے کتنا ہی ایجاد پسند اور ندرت آفریں کیوں نہ ہو مگر "تقلید" سے دامن بچا نہیں سکتا، دیے سے دیا جلتا آیا ہے، یہی سنسار کی سدا سے ریت ہے، اکبر کی غزلوں میں بھی "تقلید" کی جھلکیاں ملتی ہیں:-

غالب:- غمِ ہستی کا ہو جز مرگ اسد کس سے علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
اکبر:- کون پا سکتا ہے مکروہاتِ دُنیا سے نجات — زندگی جبتک ہے جھگڑے زندگی کے ساتھ ہیں

---

آتش:- بے تاب دل کو تسکین ہوتی ہے دیدِ خط سے — وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں
اکبر:- سبزۂ خط سے قرارِ دلِ بے تاب ہوا — کشتہ اس بوٹی نے آخر کو یہ سیماب ہوا

---

میر:- گُل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بُلبل — اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بُلبل
اکبر:- کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت — دو چار برگِ خشک تو دو چار پَر ملے

---

## طنز و مزاح

اکبر الہ آبادی کے کلام کی سب سے زیادہ امتیازی خصوصیت "طنز" ہے، جو جگہ جگہ سنجیدہ مزاح اور باوقار ظرافت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے! اکبر کی ظرافت کا آغاز اودھ پنچ کے مضامین سے ہوا اور جوں جوں سماج میں تبدیلیاں ہوتی گئیں، اکبر کی ظرافت نکھرتی اور رنگ جماتی چلی گئی۔

طنز اور ظرافت اکبر کی طبیعت میں شروع ہی سے موجود تھی، غزلوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں،

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا — ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

اودھ پنچ کی مضمون نگاری نے ان دبی ہوئی چنگاریوں کو اُکسایا، یہاں تک کہ یہ چنگاریاں آگے چل کر "بجلیاں" بن گئیں، اکبر انتہائی حساس شاعر تھے، طبیعت غیور اور مزاج پاکیزہ پایا جاتا تھا، ہندوستان میں "مغرب زدگی" کی تباہ کاریاں دیکھ کر اُن سے خاموش نہ رہا گیا، وہ دیکھ رہے تھے کہ تہذیبِ مغرب اپنے جلو میں "انکار و الحاد" لیکر آرہی ہے، اس نے چیخ اُٹھے:-

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جاکے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

پُرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں تصادم ہو رہا تھا، اکبر اور بنکم چندر چٹرجی جیسے اربابِ بصیرت نے مغربی تہذیب

کے فتنہ کو پہلی نظر ہی میں محسوس کر لیا تھا، اور وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا، لہذا اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف خوب کھل کر صدائے احتجاج بلند کی، وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی تہذیب سے لوگوں کو نفرت دلائی، اور مغرب کی مرعوبیت کے طلسم کو توڑا۔

اکبر نفسیاتِ انسانی کے رازداں بھی تھے، وہ جانتے تھے کہ نصیحت کی کھلی کھلی باتوں سے طبیعتوں کو وحشت ہوتی ہے اس لئے انھوں نے واعظوں اور ناصحوں کے عام انداز سے ہٹ کر "طنز و ظرافت" کا رنگ اختیار کیا، انھوں نے مسکرا مسکرا کر چٹکیاں لیں، اور شہد میں ڈبو ڈبو کر پند و نصیحت کی گولیاں مریضوں کے سامنے پیش کیں ——— اکبر کے اشعار چھپ کر منظرِ عام پر آئے تو ایک دھوم مچ گئی، ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں، اکبر کی طنز و ظرافت کا خیر مقدم اگرچہ مسکراہٹوں اور قہقہوں سے کیا گیا مگر ان مسکراہٹوں اور قہقہوں میں کچھ دردناکیاں اور دل گرفتگی بھی شامل تھی،

قہقہوں کی مشق سے میں نے نکالا اپنا کام جب کسی نے قدرِ آہ و نالہ و زاری نہ کی

اکبر کی ظرافت کا مقصد صرف قہقہہ و تبسم نہیں ہے، اُس میں ایک "پیام" ہے "مقصد" اور یہ پیام اس قدر دلنشیں انداز میں ادا ہوا ہے کہ وجدان لوٹ لوٹ جاتا ہے، اکبر نے طنز و مزاح کے پردے میں سماج کے نازک ترین مسائل کو بیان کیا ہے، بلند حقائق کی ترجمانی کی ہے اور بہت سی حقیقتوں کے چہرے سے نقابیں اُٹھا دی ہیں۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ سُن تو قرآں کا دغط بھائی اخوشی سے تقلید ترک لے کر
پھرے گا کمپوں میں آخر اک دن یا سلائی کا بکس لے کر

ملکی ترقیوں کے دوالے نکالئے
پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک وابستہ ہے
چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

پہنے سایہ مری جاں آثار کر پشواز
زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ بساز

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی ہے
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے جاتے ہیں

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں آہ کیجئے اور فیس لیجئے

طاعون کی بدولت اُن کو بھی ارتقا ہے
جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

اکبر الہ آبادی نے نئی قسم کی تشبیہوں اور لطیف و نادر تمثیلوں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے، بظاہر یہ سامنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، مگر اظہار و بیان میں جدت و لطافت کو سمو دیا گیا ہے اس لئے وجدان لذت محسوس کرتا ہے۔

ساتھ اُن کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا
بندر کی طرح او نٹ اُچھل ہی نہیں سکتا

یاروں کی دوڑ دھوپ ہے دنیا کی چیخ پر
اور دین ہے کباب ضرورت کی سیخ پر

یاں کے معشوقوں کو مرشد نہ کریں کیوں آزاد
زہرہ جب ناچ رہی ہے فلکِ پیر کے ساتھ

اکبر دوسری زبانوں کے الفاظ اس قدر بےساختگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ ایک خاص اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں:۔

اسمال[1] نہیں گریٹ[2] ہونا اچھا  دل ہونا بُرا ہے پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہیں دونوں بیکار  انسان کو گریجویٹ[3] ہونا اچھا

---

شیطاں نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس[4]  بالکل ہی گیا زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر  فوراً داغوں گا ایک ڈفیمیشن سوٹ[5]

---

کہتی ہو ز راہِ کبر مجھ سے وہ گرل[6]  کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈیوک[7] نہ ارل[8]
اکبر نے کہا دکھا کے داغِ دل و اشک  ہے میری گرہ میں بھی یہ روبی[9] یہ پرل[10]

---

ہم کیا خالی ہوائی گولا چھوڑیں  کس جوگ کے بل پر اپنا چولا چھوڑیں

---

بحر آزادی میں یہ کیسا تموّج ہو گیا  قاصراتُ الطرف کو شوقِ تبرّج ہو گیا

اکبر نے بعض اوقات عامیانہ بلکہ بازاری الفاظ سے بھی کام لیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس قسم کے لفظوں کے برمحل استعمال نے شعر کو ہلکا اور بے وزن نہیں ہونے دیا۔

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے  لیکن خرید ہو جو علیگڑھ کے بھاؤ سے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا  سائنس سے سُنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے
مجھ خستہ کی ہستی نہیں کچھ آپ کے آگے  بھُرتے کی ہے کیا اصل مٹن چاپ کے آگے
بھڑی اُٹھائی خموشی سے چل دیئے اکبر  سفر میں رکھتے نہیں کام ٹیم ٹام سے ہم

---

اکبر نے کلو، بدھو، صلو، جمن، گنیش، وفاتی، بی نصیبن، شیخ، بابو، اور برہمن، سے شعر میں بڑے بڑے کام لئے ہیں، ان اصطلاحوں کی مخصوص ٹیک نک ہے جس سے اکبر کی شاعری خاص طور پر پہچانی جاتی ہے۔

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے  کونسل میں فقط سیّد، مسجد میں فقط جمن
حکم انگلش کا مُلکِ ہندو کا  اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

اکبر نے آم، املی، ٹیم ٹام، للو پتو، دال دلیہ، نون تیل، گٹ پٹ وغیرہ الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں اور انگریزی الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور ضرورت پڑتی ہے تو فارسی عربی اور انگریزی الفاظ کے درمیان اضافت لگا کر، اپنا مافی الضمیر بیان کر جاتے ہیں، بیرسٹر عدالتوں میں جو "گاؤن" (Gown) پہنتے ہیں، اکبر نے

[1] SMALL [2] GREAT [3] GRADUATE [4] NOTICE
[5] Defamation Suit [6] Girl [7] Duke
[8] EARL [9] RUBY [10] PEARL

اُسے "جبہ بیرسٹری" کہا ہے۔

اکبر پیرائے بدل بدل کر اظہارِ خیال کرتے ہیں، سعدی کی طرح کوئی بات قصہ و حکایت کے انداز میں کہتے ہیں اور کہیں لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

اہلِ یورپ کے ساتھ ہوٹل میں چکھی سیّد نے ایک دن کاری
خانساماں نے کان میں یہ کہا آپ تو علم سے نہیں عاری
پڑھیئے کوئی دُعائے اکلِ طعام دین سے بھی رہے وفاداری
تب یہ اشعارِ حضرتِ سعدی ہوئے اُن کی زبان پر جاری
اے کریمی کہ از خزانۂ غیب گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

---

دسمبر میں وہ دوڑے بے تحاشا لگا ہونے ترقی کا تماشا
زباں گنجینۂ لفظی میں لکھ لٹ چلی اسپیچ کے میدان میں بگ ٹٹ
ہوئی جب جنوری رو کڑ کی طالب رپٹ لکھوا گیا قومی محاسب
مفاعیلن مفاعیلن فعولن
مفاعیلن مفاعیلن فعولن

## پیروڈی

اکبر فارسی اشعار کی پیروڈی (PARODY) کرنے میں بڑی مشاقی اور خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہیں، حافظ شیرازی کے دیوان کے مطلع سے کیا کام لیا ہے:۔

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بنادانی کہ قرآں سہل بود اوّل ولے افتاد مشکلہا
کریما بہ بخشائے بر حال بندہ کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ
لگی ہم کو یورپ کی ٹھنڈی ہوا کریما بہ بخشائے بر حالِ ما

---

گلستانِ سعدی کے مشہور قطعہ (گِلے خوشبوئے در حمام روزے) پر قطعہ کہا ہے:۔

یکے ذی علم در اسکول روزے فتاد از جانبِ پبلک بدستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی کہ پیشِ اعتقاداتِ تو پستم
بگفتا مُسلمِ مقبول بودم ولے یک عمر با ملحد نشستم
جمالِ نیچری درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم

انیس کا مصرعہ ہے ؎ پانچویں پشت ہے شبیرؓ کی مداحی میں ــــــ اکبر کی نگاہِ انتخاب کی پسلی اس طرح پھڑکی۔۔۔۔
؎ دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں۔

طنز و تعریض کے جوش میں بعض اوقات "پیروڈی" کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ "Cynicism" تک نوبت پہونچ گئی ہے:۔

ملک الموت نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس ــــ اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا ــــ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

اکبر میں جدت ندرت اور اختراع کی بے پناہ قوت قدرت نے ودیعت کی تھی پھر لطف یہ ہے کہ طرز بیان ذرا سا بھی اُلجھا ہوا اور پُرپیچ نہیں ہے، سیدھی سادی باتیں کہتے ہیں اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک لفظ نشتر کی طرح دل میں اُترتا چلا جاتا ہے ــــ اکبر نے استعاروں اور تشبیہوں میں بھی سادگی اور واقعیت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔

دل میں سوزش ہے آنکھ میں آنسو ــــ عشق ہے کھیل آگ پانی کا

اچھا ہوا مقابلۂ برقِ حُسن و عشق ــــ اُن کو ہنسی جو آگئی عاشق کی آہ پر

حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گزرا ــــ تماشا تھا ہوا سے اک گرہ دیدی تھی پانی میں

اکبر کے کلام میں اس قدر تاثیر کیوں ہے؟ اس کا جواب خود اُن کی زبان سے سُنئے:۔

سخن سنجی کا کیا کہنا مگر یہ یاد رکھ اکبر
جو سچی بات ہوتی ہے وہی دل میں اُترتی ہے

وہ خود بھی جانتے تھے کہ اُن کی کامیابی کا دار و مدار حق گوئی اور راست بازی پر ہے۔

یہ حق گوئی ہے اکبر کی کہ ہے جس کا اثر اتنا
فسوں کیسا مسلماں آدمی ساحر نہیں ہوتا

مذہب کا وہ بہت احترام کرتے ہیں، مسلماں تو مسلمان برہمن کو بھی وہ ناستک (دہریہ اور منکر) دیکھنا نہیں چاہتے، کہتے ہیں ؎ اے مسلماں! سجدے لے برہمن زنار لے۔

---

اس زر پرست دنیا میں غریب آدمی کے لئے قدم قدم پہ مصیبتوں کا سامنا ہے، وہ بے چارہ کسی کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ خوشامد اور چاپلوسی کی جارہی ہے:۔

خلق کو سب نے خوشامد سمجھ لیا ــــ کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب آدمی کیساتھ

---

وہ مسجد سے اذان کی آواز سُنتے ہی باغ باغ ہو جاتے ہیں، اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ
؎ جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

---

قرآنِ پاک میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں (صحابہ کرام) کا یہ کردار بیان کیا گیا ہے:۔

"أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ"

مگر مسلمانوں کی زندگی اس کے برعکس ہو کر رہ گئی ہے، اکبر نے مسلمانوں کی اس دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی:-

خانہ جنگی ہی میں حضرت مرد ہیں　　　عیب جوئی کے ہنر میں فرد ہیں
اپنوں ہی کے واسطے ہیں شعلہ خو　　　سامنے غیروں کے بالکل سرد ہیں

---

امیروں کی مذہب بیزاری اور حکومت پرستی پر کتنی دل نشین طنز کی ہے:-

کافی ہیں امیروں کو تو آئینِ گورنمنٹ　　　مذہب کی ضرورت تو غریبوں کیلئے ہے

---

اکبر جانتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ سچی بات کڑوی ہوا کرتی ہے، ان تلخ جرعوں کو ہر کوئی خوشی خوشی نہیں پی سکتا، اُن کی باتوں پر لوگ ضرور چین بر جبیں ہوتے ہوں گے، مگر اکبر نے اظہارِ حق میں لوگوں کی خوشی اور ناخوشی کی مطلق پروا نہیں کی۔　　جو سچی بات ہے کہہ دوں گا بیخوف و خطر اس کو　　　نہیں رکنے کا میں ہرگز پری ٹوکے کہ جن ٹوکے

اکبر خود نگر نہ تھے مگر خود شناس ضرور تھے، اُن کو معلوم تھا کہ اُن کا کلام قبولِ عام حاصل کر رہا ہے اور خواص اُس پر وجد کرتے ہیں، تمیر کے بعد یہ شاعرانہ تعلّی اکبر کو یقیناً زیب دیتی تھی:-

سکّہ ہے کھرا مرے سخن کا　　　سب نے اس کو پرکھ لیا ہے

---

اکبر کے رنگِ تغزل کا اوپر ذکر آچکا ہے، مگر جی چاہتا ہے کہ چند شعر سخن سنج حضرات کے ذوق کی پذیرائی اور تواضع کے لئے پیش کر دیے جائیں۔

ختم کیا صبا نے رقص گل پہ نثار ہو چکی　　　جوشِ نشاط ہو چکا، صورتِ ہزار ہو چکی
کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابیٔ دل ہوں　　　کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں
جلوہ عیاں ہے قدرتِ پروردگار کا　　　کیا دل کشا یہ سین ہے فصلِ بہار کا
یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا　　　مجھے قیامت کی ہیں اُمیدیں جو کچھ کریگا خدا کرے گا
سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں　　　بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے وہ بھی نوجوانی میں

اکبر نے غزل میں ہر قسم کے مضامین سمو کر یہ بتایا ہے کہ غزل کو باعتبار مضمون و تخیل بہت کچھ وسعت دی جا سکتی ہے۔

اکبر کے قطعات اور رباعیاں بھی کافی جاندار ہیں، اس قطعہ میں قوم کی بے عملی کو کس قدر سادہ اور موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

یہی بحثیں رہیں سب ہیں یہ کیسے ہیں وہ کیسے ہیں　　　یہی سنتے ہوئے گزری وہ ایسے ہیں وہ ایسے ہیں
عمل اوروں ہی کا دیکھا کیے یہ نیک یہ بد ہیں　　　ترقی خود نہ کی کچھ، رہ گئے ویسے کہ جیسے ہیں

---

اکبر الہ آبادی نے زبان کو وسعت ہی نہیں دی اُس کو نکھارا بھی! اس کا خود اُن کو بھی احساس تھا، یہی احساس

شعر کی زبان بن کر اس طرح گویا ہوا:-

اُمید ہے دعا کی اہلِ سخن سے اکبر
میرے حقوق بھی کچھ اُردو زبان پر ہیں

---

**حرفِ آخر** بد ترین جہالت اور سب سے بڑی حماقت "خدا کا انکار" ہے! اکبر نے اس "انکار" کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعہ جہاد کیا، وہ بار بار یہی کہتے ہیں کہ "خدا کو مانو، خدا کو جانو، اور نیکی کی راہ اختیار کرو" —— اس اعتبار سے اُن کی شاعری ایک عالمگیر پیام کی حیثیت بھی رکھتی ہے، اُن کے اس قسم کے اشعار شک و تذبذب سے پاک ہیں، یقین اور محکم یقین کہ جسے کوئی طاقت جنبش نہیں دے سکتی۔

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

اکبر کے زمانہ میں "بے پردگی" آج کی طرح عام نہ ہوئی تھی اور شاید وہ بے باکیاں بھی نہ تھیں جو اس زمانہ میں پائی جاتی ہیں، مگر اُن کی نگاہ نے اُسی وقت بھانپ لیا تھا کہ یہ بے راہ روی صرف "نقاب کشائی" تک محدود نہ رہے گی —— اس لئے اکبر نے پوری قوت کے ساتھ "پردے" کی تائید اور "بے پردگی" کی مخالفت کی، یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی اُنھیں — پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی
مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو — پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو
پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں — حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی
خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اُس کو نہیں آتا، اُنہیں غصہ نہیں آتا

اور آج سچ مچ یہی ہو رہا ہے کہ ادھر "حجاب" رخصت ہوا اور اُدھر "غیرت" خدا حافظ کہہ کر چلتی بنی۔

---

اکبر الہ آبادی نے آج سے بہت پہلے کہا تھا:-

مُریدِ دہر ہوئے طبعِ مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

اور ہم اپنی آنکھوں سے "خودکشی" کے مناظر دیکھ رہے ہیں، اس "نئے پن" کی وبا میں زندگیاں مبتلا ہوتی چلی جا رہی ہیں —— اس لئے

زمانہ اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

(اقبال)

---

# علمِ طِب کس طرح وجود میں آیا؟

## ایجاد، ابداع، تجربے، تحقیق و اکتشاف

علامہ ابن ابی اصیبعہ کی شہرۂ آفاق تصنیف "عیون الانبا فی طبقات الاطبا" کے پہلے باب کا ترجمہ
(مترجم) حکیم محمد یوسف نیر مرحوم کی علمی یادگار

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حمد اُس بے نیاز پروردگار کے لئے زیبا ہے جو قوموں کا پھیلانے والا۔ بوسیدہ ہڈیوں کا زندہ کرنے والا۔ رُوحوں کا خالق اور بیماریوں کا دُور کرنے والا ہے۔ اپنے فضل و کرم سے وسیع اور کثیر نعمتوں کا وعدہ کرتا ہے۔ اور نافرمانوں کو دردناک عذاب اور بُرے انجام سے ڈراتا ہے۔ اپنی اعلیٰ صناعی سے مخلوق کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور کمال صنعت و حکمت سے مرضوں اور اُن کی دواؤں کو پیدا کرتا ہے۔

میں اپنے اصلی فرائض پُورے کرنے کے لئے بہ خلوص دل شہادت دیتا ہوں کہ اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور یہ وہ شہادت ہے جو مجھے لغزشوں اور ندامتوں کی آفات سے نجات دیگی۔ اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندے اور پیغمبر ہیں جو کلمات جامع لے کے مبعوث ہوئے اور تمام عرب و عجم کی ہدایت کے لئے رسُول بنائے گئے۔ جن کے نورِ نبوّت کی شعاعوں نے سخت سے سخت تاریکیوں کو روشن کردیا۔ جن کے معجزے کی تلوار نے سرکشوں اور ظالموں کو مٹا دیا۔ اور جن کی نبوّت کے قطعی الدلالۃ ہونے نے شرک کے مرض کو فنا کردیا۔ جب تک بجلیاں چمکتی ہیں اور ابر برستا ہے اُن پر اور ان کی اولاد پر جو صاحبِ کرم ہیں اور اصحاب پر جنھوں نے اُن کی شریعت کو اپنا مقصد قرار دیا اور اُن کی ازواجِ مطہرات پر جو اُمّہات مومنین ہیں اور ہر آلودگی سے پاک اور صاحبِ شرف و کرم ہیں ہمیشہ خدا کی رحمت نازل ہوتی رہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو، چونکہ فنِ طب تمام علوم و فنون سے اشرف اور بہ نسبت تمام دیگر سرمایوں کے پُر نفع ہے اور اس کی فضیلت کے اثبات میں کتب سماوی اور احکام شرعی بھی وارد ہوئے ہیں اور اُن میں علم الابدان کو علم الادیان کا ہم رُتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز حکماء کا مقولہ ہے کہ ہستی کا اصل مدعا دو چیزیں ہیں نیکی اور لذت۔ اور یہ

دونوں چیزیں اُسی وقت میسر آسکتی ہیں جب صحت موجود ہو۔ اس لئے کہ وہ لذتیں جو اس دنیا میں حاصل کی جاسکتی ہیں اور وہ نیکیاں جو دارالآخرۃ میں متوقع ہیں اُن کا اکتساب اُس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک صحت دوام اور اعضا میں قوتِ تام نہ پائی جائے۔ اور یہ اُمور فنِ طب ہی کی بدولت حصول پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ صحت موجود کا محافظ اور صحت مفقود کا واپس لانے والا ہے پس جب اُس کا درجہ اس قدر بلند ہے اور جبکہ عموماً ہر شخص ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کا محتاج ہے تو اُس کی طرف جس قدر اعتنا کی جائے وہ کم ہے۔ اور اس کے قوانین کلیہ و جزئیہ کی تحصیل میں جتنی توجہ مبذول ہو وہ تھوڑی ہے۔ یہ فن جب سے پیدا ہوا اُس زمانے سے آج تک ایک جماعت کثیر اس فن کی تحصیل میں مشغول اور اُس کے اُصول کی جستجو میں مصروف رہی اِس گروہ میں بہت سے ایسے اکابرِ فن اور اربابِ نظر بھی تھے جن کے تبحّر اور فضل و کمال سے صفحات تاریخ مزین ہیں اور جن کی تصنیفات و تالیفات اُن کے کمالات کی شاہد ہیں۔ مگر ان اربابِ کمال اور شائقینِ فنون میں سے کسی ایک نے بھی کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی جس سے اطبائے سلف کے حالات ترتیب اور تفصیل سے معلوم ہو سکتے۔ اس لئے میری یہ رائے قائم ہوئی کہ اس کتاب میں ماضی و حال کے مشاہیر کے حالات قلمبند کروں۔ اور ازمنہ و اوقات کے لحاظ سے اُن کے طبقات کے واقعات ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ نیز اُن کے اقوال و حکایات اُن کے لطائف و ظرائف اُن کے ملفوظات اور اُن تصنیفات و تالیفات کا بھی کسی قدر ذکر کروں۔ تاکہ یہ امر معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ نے اُن لوگوں کو علم سے کس درجہ بہرہ ور کیا تھا اور اُنھیں کس قدر ذہن رسا اور فہم ذکا عطا فرمایا تھا۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر لوگ اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے ہم سے متقدم اور مختلف اوقات میں گزرے ہیں لیکن اُنھوں نے جو تصنیفات چھوڑیں اور ان تصنیفات میں اِس فن کے جو مسائل جمع کئے اُس کے لحاظ سے اُن کو ہم پر وہ شرف ہے جو اُستاد کو شاگرد پر اور محسن کو اُس شخص پر ہوتا ہے جس پر اُس نے احسان کیا ہے۔

میں نے اس کتاب میں اطبا کے علاوہ اُن حکما اور فلسفیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو فنِ طب میں ماہر تھے۔ اور اُن کے حالات کے ساتھ اُن کے لطائف و ظرائف اور اُن کی تصنیفات کا بیان بھی کیا ہے۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے حال کو طبقات و مراتب کے لحاظ سے مناسب مقامات میں لکھا ہے، لیکن وہ حکما، اور ریاضی دان جو دیگر علوم و فنون میں صاحب کمال تھے اُن کے واقعات کو میں نے نہایت استقصا کے ساتھ اپنی دوسری کتاب "معالم الامم و اخبار ذوی الحکم" میں درج کیا ہے۔ یہ کتاب جس کی تالیف کا بالفعل میں نے عزم کیا ہے پندرہ بابوں میں منقسم۔ اور "عیون الانبار فی طبقات الاطباء" کے نام سے موسوم ہے۔ اس ناچیز تحفہ کو میں اُس آقائے ولی نعمت اور وزیر الوزرا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو عالم عادل رئیس کامل سرتاج وزرا شاہنشاہِ حکما امام علما اور آفتابِ شریعت ہے۔ اور جن کا نام امین الدولہ کمال الدین والملۃ ابوالحسن بن غزال بن ابوسعید ہے۔ خدائے تعالیٰ ابداً لاباداً اُس کی سعادت عالم میں پھیلائے۔ اور دین و دنیا میں اُسے فائز المرام کرے۔

اِس کتاب کے بابوں کی ترتیب اور اُن کی تعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

پہلا باب :- فنِ طب کی تاریخ کہ وہ کیونکر اور کب عالم وجود میں آیا۔

دوسرا باب :- وہ اطبا جنھوں نے فنِ طب کے متعلق کچھ بیان کیا اور جو اس فن کے ابتداءً شائع کرنے والے تھے۔

تیسرا باب :۔ اطبائے یونان جو نسلِ اسقلیبوس[1] میں گزرے۔
چوتھا باب :۔ اطبائے یونان جن میں بقراط نے فنِ طب کی اشاعت کی۔
پانچواں باب :۔ جالینوس اور وہ اطبار جو اُس کے ہمعصر یا اُس کے زمانہ کے قریب گزرے۔
چھٹا باب :۔ اسکندریہ کے اطبار اور اُن کے معاصر عیسائی طبیب۔
ساتواں باب :۔ عرب کے وہ اطبار جو اسلام کے ابتدائی دور میں گزرے۔
آٹھواں باب :۔ اطبائے شام جو دولتِ عباسیہ کی ابتدار میں گزرے۔
نواں باب :۔ وہ اطبار جنھوں نے یونانی اور سُریانی وغیرہ سے فنِ طب کی کتابوں کے ترجمے عربی میں کئے۔
دسواں باب :۔ اطبائے عراق۔ و جزیرہ و دیار بکر۔
گیارہواں باب :۔ وہ اطبار جو بلادِ عجم میں ظاہر ہوئے۔
بارہواں باب :۔ اطبار ہند۔
تیرہواں باب :۔ وہ اطبار جو بلادِ مغرب میں ظاہر ہوئے۔ اور وہیں اقامت گزیں رہے۔
چودہواں باب :۔ وہ اطبار جنھوں نے مصر میں شہرت و ناموری پیدا کی۔
پندرہواں باب :۔ وہ اطبار جنھوں نے ملکِ شام میں شہرت کا تمغہ حاصل کیا۔

# بابِ اوّل

فنِ طب کس زمانہ میں پیدا ہوا اور کیونکر وجود میں آیا اس امر کا پایۂ تحقیق کو پہونچنا بوجوہ مشکل ہے۔

اوّلاً امتدادِ زمانہ۔ کیونکہ جس چیز کو بہت دن گزر جاتے ہیں اور خصوصاً اِس قسم "طب" کی چیز تو اس کی تحقیقات کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔

ثانیاً۔ قدمار اور ممتاز اور اہل الرائے لوگوں کا اِس بارے میں کوئی متفق علیہ قول نہیں ملتا جس کی پیروی کی جائے۔

ثالثاً۔ جن لوگوں نے اِس کے متعلق کچھ رائے ظاہر کی ہے وہ مختلف الطبقات ہیں اور اُن کے اقوال میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کے قول کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی حق ہے۔

جالینوس نے اپنی تفسیر میں جو اُس نے بقراط کی کتاب الایمان پر لکھی ہے یہ بیان کیا ہے کہ قدمار نے فنِ طب کی ایجاد کے متعلق جو بحث کی ہے وہ کوئی آسان بحث نہیں۔ بہر حال پہلے ہم جالینوس کا قول نقل کرتے ہیں پھر اوروں کے مختلف اقوال کو بہ طریق حصر بیان کریں گے۔

فنِ طب کی ابتدائی تاریخ کے متعلق دو گروہ ہیں جو فریق حدوثِ اجسام کا قائل ہے وہ طب کو بھی حادث جانتا ہے۔ اس لئے کہ جن اجسام میں یہ فن مستعمل ہوتا ہے وہ حادث (فانی) ہیں تو یہ بھی حادث ہوا۔ اور جو گروہ اجسام کے قدیم ہونے کا معتقد ہے وہ طب کو بھی قدیم کہتا ہے اس واسطے کہ تمام اجسام قدیم (غیر فانی) ہیں تو لامحالہ طب بھی قدیم ہے۔

---

[1] اسقلیبوس کو یونانیوں نے فنِ طب کا موجد اور امام بلکہ دیوتا مانا ہے۔

جو گروہ حدوث اجسام کا قائل ہو اُن کے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک کا یہ اعتقاد ہو کہ طب انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ صحت و علالت طبیعت انسانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ طب انسان کے بعد عالم وجود میں آئی۔ اور انسان ہی اس کا موجد ہے۔ پھر اس گروہ میں بھی دو فریق ہیں۔ بعض اُس کا وجود من جانب اللہ الہام کے ذرائع سے مانتے ہیں اور جیسا کہ جالینوس نے لکھا ہے بقراط اور تمام اصحاب قیاس اور شعرائے یونان کا مسلک یہی ہے۔ دوسرا فرقہ اس بات کا قائل نہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ فن انسانی کوششوں کا نتیجہ ہو یہ گروہ اصحاب الحیل اور اصحاب تجربہ کے فرقے میں سے ہے اور تھلی مغالطہ باز اور فیلن اسی گروہ میں شامل ہیں۔ مگر یہ لوگ بھی اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں کہ یہ فن پہلے کہاں سے نکلا اور کیونکر نکلا۔ بعض کا خیال ہو کہ ملک مصر سے اس کی ابتدا ہوئی۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایک بوٹی جو یونانی میں لانی کہلاتی ہو وہی بوٹی ہو جس کو راسن کہتے ہیں۔ (راسن[1] مصری لفظ ہو) بعض کا خیال ہو کہ جملہ فنون فلسفہ اور طب وغیرہ کا موجد ہرمس اوّل ہو اور بعض لوگ اہل فونوس کو اس کا موجد مانتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں ایک والی نے کسی شہزادی کے لئے اوّل کچھ دوائیں تجویز کی تھیں۔ جن سے اُس کو شفا ہوئی۔ انہی دواؤں سے لوگوں نے علم طب ایجاد کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اہل موسیا اور افروجیا نے اس فن کو نکالا اس لئے کہ اوّل انہیں لوگوں نے راگ راگنیوں سے نفسی اور روحانی بیماریوں کا علاج کیا تھا۔ پھر ان سے جسمانی بیماریوں کو بھی شفا حاصل ہوتی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس فن کے ظاہر کرنے والے جزیرہ قو کے حکما ہیں۔ بقراط اور اُس کے آباؤ اجداد جو آل اسقلیبوس کہلاتے تھے اسی جزیرہ کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہو کہ رودس، کنیدس اور قو ان تین جزیروں سے یہ فن شروع ہوا اور یہ تینوں جزیرے اُس وقت وسط اقلیم رابع میں خیال کئے جاتے تھے۔ بعض اس طرف گئے ہیں کہ کلدانیوں نے اس فن کو نکالا ہو۔ بعض لوگ اس کا بانی یمن کے ساحروں کو اور بعض بابل کے ساحروں کو اور بعض فارس کے ساحروں کو جانتے ہیں۔ اور بعض اہل ہند کو بعض اہل افریطس کو۔ بعض طور سینا کے باشندوں کو فن طب کا موجد سمجھتے ہیں۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ علم طب خدا کا بتایا ہوا ہے اُن میں سے بعض کہتے ہیں کہ خواب میں اُس کا الہام ہوا۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ بعض لوگوں نے کسی دوا کو خواب میں دیکھا۔ جب وہ جاگے تو اُنھوں نے اُنہی دواؤں کے ذریعہ سے نہایت سخت بیماریوں سے شفا پائی اور پھر جس نے استعمال کی۔ اُس کو فائدہ ہوا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدائے تعالےٰ نے تجربہ کے ذریعوں سے لوگوں پر اس فن کا انکشاف فرمایا اور پھر انہیں تجربوں میں زیادتی اور پختگی ہوتے ہوتے اس فن کی تکمیل ہو گئی۔ وہ اس بارہ میں ذیل کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔

مصر میں ایک عورت تھی جو ہر وقت غم و فکر اور بے چینی اور بے قراری میں مبتلا رہتی تھی۔ اُس کا معدہ ضعیف ہو گیا تھا۔ سینہ اخلاط ردیہ سے بھر گیا تھا اور حیض بند ہو گیا تھا اتفاق سے اُس نے ایک بوٹی جس کا نام راسن ہے چند بار کھائی جس کے استعمال سے اُس کے سب امراض دور اور تمام عوارض کافور ہو گئے۔ اور وہ بالکل تندرست

---

[1] لہجہ کے تغیر سے راسن لفظ یونان پہونچکر "لانی" ہو گیا۔

ہوگئی۔ پھر جس جس نے اس دوا کا استعمال کیا اُس کو فائدہ ہوا۔ اسی بنا پر لوگوں نے اور چیزوں کا تجربہ بھی کیا اور یونہی تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ہی نے اس فن کو پیدا کیا ہے اُن کا یہ استدلال ہے کہ اتنے بڑے جلیل القدر فن کا استخراج عقلِ انسانی سے بالاتر ہے۔ جالینوس کا یہی مذہب ہے۔ وہ بقراط کی کتاب الایمان کی تفسیر میں لکھتا ہے کہ ہمارے نزدیک یہی ٹھیک رائے ہے کہ خدا ہی نے اس فن کو تخلیق کیا۔ اور لوگوں کو الہام کے ذریعہ سے اس کی تعلیم کی۔ کیونکہ اس زبردست علم کے ادراک کے لئے عقلِ انسانی کافی نہیں ہے۔ اور صرف خدا ہی اُس کا خالق ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ مانا جاتا ہے کہ فلسفہ الہامی طور پر ظاہر ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فنِ طب فلسفہ سے کم رُتبہ نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس فن کو بھی خدا ہی کا پیدا کیا ہوا کیوں نہ مانا جائے۔

شیخ موفق الدین اسعد بن الیاس بن مطران کی کتاب موسومہ "بستان الاطباء و روضۃ الالباء" میں ہم کو ایک عبارت ملی جس کو مصنف مذکور نے ابو جابر مغربی سے نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فن کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب وحی اور الہام ہے۔ اُس کی دلیل یہ ہے کہ اس فن کا مقصد انسانوں کو نفع پہونچانا ہے اور وہ اس طرح کہ یا تو مرض پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ یا ہو تو دفع کر دیا جائے۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ انسانوں کا سلسلہ غیر متناہی نہیں ہے، بلکہ کہیں جا کر ختم ہوتا ہے ورنہ غیر متناہی کا وجود لازم آئے۔ اب جو شخص سب سے پہلا انسان تھا وہ طب کا ایسا ہی محتاج ہوگا جیسا آج ہر شخص ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تنہا ایک شخص اس فن کو ایجاد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کی عمر کم ہے اور فنِ طب نہایت وسیع ہے۔ شاید یہ کہا جائے کہ ابتدا میں چند انسانوں نے ملکر اس فن کو ایجاد کیا ہوگا لیکن یہ احتمال صحیح نہیں۔ کیونکہ اُن چند افراد کی قابلیت اور لیاقت بالکل ایک درجہ کی نہیں ہو سکتی۔ اور جب اُن کی قابلیتوں میں اختلاف مراتب تھا تو ضرور ہے کہ اُن کی رائیں باہم مختلف ہوں۔ حالانکہ فنِ طب نہایت مستحکم اور کامل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ایک ایسی شے کے بنانے والے متفق ہو کر اُس شے کو نہ بنائیں وہ چیز کامل نہیں ہو سکتی۔

ابن مطران کا قول ہے کہ یہ دلیل اور علوم و فنون میں بھی جاری ہوتی ہے اور اُن کا الہامی ہونا ثابت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ابو جابر کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ چند اشخاص ایک مستحکم کام میں متفق الرائے نہیں ہو سکتے اشخاص تو ایسے ہی کام میں متفق الرائے ہوں گے جو مستحکم اور کامل ہوگا۔ (یہ ابن مطران کا اعتراض تھا)

ابو جابر کہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوگیا کہ ابتداءً چند اشخاص اس فن کو ایجاد نہیں کر سکتے تھے اور اسی طرح انتہا میں بھی۔ کیونکہ ان میں بھی اختلاف آرا لازم ہے۔ اور اختلاف آراء کے ساتھ کوئی فن کامل نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے تو کر سکتا ہے کہ تمھارے نزدیک آیا یہ ممکن ہے یا نہیں کہ ایک شخص یا بہت سے اشخاص بوٹیوں اور دواؤں کے مقامات۔ معادن اور اُن کے خواص اور حیوانات کے اعضا کے قویٰ۔ خواص۔ مضرات اور منافع سے واقف ہوں اس کے ساتھ وہ تمام مرضوں اور شہروں اور باشندوں کے اختلاف امزجہ کو جانتے ہوں۔ اور اس قوت سے آگاہ ہوں جو دواؤں کے ترکیب کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اور دواؤں کی قوتوں میں سے جو باہم متضاد ہوں اور جو باہم موافق و مناسب ہوں اور دیگر تمام باتیں جو فنِ طب سے وابستہ ہیں اُن سے آشنا ہوں۔ اگر کوئی شخص ان تمام باتوں کو آسان اور سہل سمجھے تو جھوٹا ہے اور اگر باعتبار معرفت کے یہ اُمور اُسے دشوار نظر آئیں تو ہم کہیں گے کہ فنِ طب کا استنباط کرنا غیر ممکن ہے اور جبکہ فنِ طب کے لئے ابتدائی درجہ میں استنباط۔ وحی اور الہام کے سوا اور

کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا اور یہ ثابت ہو گیا کہ استنباط ناممکن ہے تو صرف یہی باقی رہ گیا کہ اس کا وجود بطریق وحی والہام ہوا ہے۔
ابن مطران کہتا ہے کہ یہ تقریر از سرتا پا پریشان اور مضطرب ہے گو کہ جالینوس نے تفسیر العہد میں لکھا ہے کہ یہ فن وحی اور الہام کے ذریعہ سے پیدا ہوا۔ افلاطون بھی کتاب "السیاستہ" میں لکھتا ہے کہ اسقلیبوس موید من اللہ اور ملہم تھا۔ بایں ہمہ یہ کہنا کہ یہ فن استنباط کی حد سے باہر ہے صحیح نہیں یہ کہنا اُن عقول کی تحقیر ہے جنھوں نے ایسے فن ایجاد کئے۔ جو طب سے بھی بلند پایہ ہیں۔

**تجربے** اب ہم فرض کرتے ہیں کہ جس طرح موجودہ عالم طب کا محتاج ہے اسی طرح ابتدا میں جو پہلا شخص تھا وہ بھی اس کا محتاج تھا فرض کیجئے کہ ایک دن اُس کا بدن اور سر دفعۃً بوجھل ہو گیا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ تمام جسم پر امتلائے دموی کے آثار چھا گئے وہ گھبرا گیا کہ کیا کروں۔ اسی حالت میں خود بخود شدت سے نکسیر پھوٹ گئی۔ جس نے اُس کی تمام تکالیف کو کھو دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر اُس پر یہی کیفیت طاری ہوئی اب اس نے خود اپنی ناک کے اندرونی حصے پر خراش پیدا کر کے خون نکالدیا۔ اور اسی تدبیر سے راحت حاصل ہو گئی جب یہ تجربہ ہو چکا تو اُس نے اپنی آئندہ نسلوں کو وصیتاً اس طرف متوجہ کیا۔ اور آخر کار ذہن رسا نے فصد کی طرف رہبری کی۔ اسی طرح اگر یہ فرض کیا جائے کہ اسی قسم کے بیمار کے کہیں زخم لگا اور خون جاری ہوا اُس سے خود بخود اُس کو آرام ہو گیا۔ اس طرح فصد کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ طب کا ایک باب بن گیا تو یہ احتمال بھی کچھ بعید نہیں۔ اسی طرح کثرتِ اکل سے ایک آدمی کا پیٹ پھول گیا۔ اور قراقر کی شدت ہوئی پھر خود بخود قے یا دست آیا۔ اور تمام تکلیفیں جاتی رہیں اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص نے ہنسی میں کوئی دوا مُنھ میں ڈال لی۔ اُس سے قے اور دست آ گئے۔ اس بنا پر اُس کو خیال ہوا کہ اِس دوا کی یہ تاثیر ہے کہ قے اور دست آ کر طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ کسی اور شخص کی طبیعت بدمزہ تھی اور مادہ کسی طرح دفع نہیں ہوتا تھا اُس شخص نے اُس کو اُسی دوا کے استعمال کی ہدایت کی۔ اس نے استعمال کی اور وہ شکایتیں جاتی رہیں۔ اسی طرح اور نباتات کا جو اس سے مشابہ تھیں تجربہ کیا گیا کہ اُن کا کیا عمل ہے پھر اور باریکیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ یعنی یہ کہ کون سی دوا ایک اثر کو وقت سے پیدا کرتی ہے اور کون سی آسانی سے۔ پھر اس پر لحاظ کیا گیا کہ دوا کا مزہ کیا ہے۔ اور جب منھ میں رکھتے ہیں تو کیا مزہ معلوم ہوتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کیا کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ تجربہ سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی گئیں۔ اور جو چیزیں بالقوۃ تھیں بالفعل وجود میں آ گئیں غلطیاں رفع ہوتی گئیں۔ اور جو رائیں محض قیاس سے قایم ہوئی تھیں وہ تجربہ سے یقین کا درجہ حاصل کرتی گئیں۔ یہاں تک کہ مزید تحقیقات کی حاجت نہیں رہی فرض کرو کہ ایک شخص کو دست آنے لگے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا دوا یا غذا اُس کے لئے سود مند ہے اُس نے اتفاقاً ایک دن سماق کی چٹنی کھالی جس کے کھاتے ہی اُسے افاقہ نظر آیا۔ اُس نے کئی مرتبہ سماق کا استعمال کیا اور اسی دوا سے وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنا تجربہ وسیع کرنا چاہا اور اس امر پر غور کرنا چاہا کہ سماق میں دو ذائقے ہیں ایک ترشی اور دوسرا کسیلا پن۔ تو اِن دونوں میں سے کون سے اجزا اس بارہ میں زیادہ مؤثر ہیں۔ اس امر کی تحقیق کے لئے اُس نے ایک اپنے ہی جیسے مریض کو کوئی ترش چیز کھلائی۔ اور اُس کا اثر خلافِ اُمید دیکھا۔ پھر اُس کو کوئی کسیلی اور قابض چیز دی جس سے فائدہ ہوا اس بنا پر اُس نے یہ قاعدہ بطور کلیہ کے قرار دیدیا کہ قابض چیز استفراغ کے لئے نافع ہے۔ اسی طرز پر معلومات کا سلسلہ روز افزوں ترقی کرتا رہا اور عجیب و غریب باتیں ظاہر ہوتی رہیں۔ یہانتک

کہ جو بات کسی محقق نے نکالی اُس میں دوسرے آنے والے گروہ نے کچھ نہ کچھ اضافہ کرکے اس فن کو درجہ تکمیل تک پہونچایا۔ ایک نے مخالفت کی تو بہتوں نے موافقت کی۔ متقدمین سے کوئی غلطی ہوگئی تو متاخرین نے اُس کی اصلاح کردی۔ اگلوں سے کوئی بات رہ گئی تو پچھلوں نے اُس نقص کو پُورا کردیا۔ یہی سلسلہ تھا جس نے اس فن کو حدود کمال تک پہونچادیا۔

جیش اعم کا بیان ہے کہ ایک شخص قصاب سے تازی کلیجی خرید کرکے لئے جاتا تھا۔ راہ میں اُس کو ایک اور ضرورت پیش آگئی۔ اُس نے کلیجی وہیں چھوڑی اور خود اُس کام کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ کلیجی پگھل کر خون ہوگئی ہے اور بہہ رہی ہے۔ کلیجی جہاں رکھی تھی وہاں ایک قسم کی بیل تھی جس کے پتے زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ کلیجی اُنھی پتوں پر رکھ دی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اُس نے اُس کی پتیاں نوچ کر اپنے پاس رکھ لیں اور ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا جو مخفی طور پر کسی کو ہلاک کرنا چاہتے تھے، آخر یہ راز کھُل گیا اور وہ قتل کردیا گیا۔ میں (مصنف کتاب) کہتا ہوں کہ یہ واقعہ جالینوس کے زمانے کا ہے۔ اور جالینوس ہی نے اس شخص کو پکڑوا کر بادشاہ وقت کے پاس بھجوایا تھا۔ خود جالینوس کا بیان ہے کہ وہ قتل گاہ کو جارہا تھا۔ تو میں نے حکم دیا تھا کہ اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے۔ تاکہ وہ اس بوٹی کو نہ دیکھ سکے اور کسی کو اشارے سے اُس کا پتہ نہ بتادے۔ جالینوس نے اس واقعہ کو اپنی کتاب ادویۂ مُہلہ میں نقل کیا ہے۔ جمال الدین نقاش مسعودی نے مجھ سے بیان کیا کہ مقام اسفرد کی پہاڑی کے دامن میں کثرت سے گھاس ہے۔ ایک دفعہ مشائخ شہر میں سے ایک بزرگ وہاں گئے۔ اور سو رہے۔ سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ یہاں تک کہ چند آدمیوں کا اُدھر سے گزر ہوا تو دیکھا اُن کی ناک۔ کان اور دوسرے مخارج سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ لوگ نہایت متعجب ہوئے اور ان بزرگ کو جگایا معلوم ہوا کہ یہ اُس زہریلی گھاس کا اثر ہے جس پر وہ سو گئے تھے۔ اِس گھاس کی صُورت کاسنی سے ملتی جلتی ہے مگر اُس کے دونوں پہلوؤں میں اُبھار ہوتا ہے۔ اور نہایت تلخ مزہ ہے۔ جمال الدین نے جاکر خود اِس گھاس کو دیکھا۔ اور مجھ سے اُس کی کیفیت بیان کی۔ جمال الدین کا یہ بھی بیان ہے کہ جن لوگوں نے اِس گھاس کو سونگھا اُن کی نکسیر پھوٹ پڑی۔ یہ جمال الدین کا بیان ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی گھاس ہے جس کا جالینوس نے ذکر کیا تھا یا اور کوئی گھاس ہے۔

ابن مطران بیان کرتا ہے کہ جب دواؤں کے اِس قسم کے خطرناک اثر ظاہر ہوئے تو نیک طینت لوگوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح خدا نے یہ دوا پیدا کی ایسی دوا بھی پیدا کی ہوگی جو اِس کا توڑ کرسکے۔

ان لوگوں نے امتحان کا یہ طرز اختیار کیا کہ کسی جانور کو پہلے مُضر دوا کھلا کر اس کے بعد دوسری مفید دوا دیتے تھے اگر اس میں کامیابی ہوئی تو فہو المراد ورنہ کسی اور چیز سے کام لیتے تھے اس تدریجی ترقی کی تصدیق تریاق سے ہوتی ہے۔ کیونکہ تریاق اوّل اوّل صرف حَب الغار اور شہد سے بنایا جاتا تھا پھر ترقی کرتے کرتے انتہائی حد تک پہونچ گیا۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا وحی یا الہام نہ تھا بلکہ قیاس اور عقل کی دقیقہ رَسی سے ایک مدّت کے بعد خود یہ حالت پیدا ہوگئی۔

شاید کوئی کہے کہ ہر دوا کے لئے اُس کی ضد کا ہونا کیا ضرور ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں نے قاتل البیش کو دیکھا (یہ ایک بوٹی ہے جو زمین سے اُگتی ہے اور جب بیش کسی درخت پر لپٹ جاتی ہے تو اُس کو خشک کردیتی ہے) تو قیاس کیا کہ یہ خاصیت اور بوٹیوں میں بھی ہوگی۔ اِسی قسم کے تجربے سے ایک نکتہ رس عالم اور دوسرے معلومات کا بھی استنباط کرسکتا ہے۔

جالینوس نے اس مسئلہ پر کہ تمام فنون کیوں کر ایجاد کئے گئے ایک کتاب لکھی ہو لیکن ہم نے جو لکھا ہو اُس سے کوئی بات زیادہ اُس نے نہیں لکھی۔ ہم نے جس قدر مختلف اور متنوع باتیں اوپر بیان کیں اُن سے صرف یہ مقصود ہو کہ ہر فریق کے خیالات معلوم ہوں لیکن چونکہ اس فن کے متعلق سخت اختلاف آرا رہا ہو اس لئے نمایاں طور پر پہلا موجد متعین کرنا نہایت مشکل ہو۔ تاہم اگر کوئی ہوش مند اپنی سمجھ کے مطابق غور کرے تو اِس امر کو بعید از قیاس نہیں خیال کرے گا کہ اس فن کے ابتدائی اُصول اُنہیں طریقوں سے حاصل ہوئے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ کیونکہ فنِ طب انسان کے لئے نہایت ضروری چیز ہو انسان کہیں ہو اور کسی زمانے میں ہو اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

البتہ اختلاف مکان۔ کثرتِ غذا اور قوتِ تمیز کی وجہ سے طب کی ضرورت میں اختلافِ مراتب ہوتا ہو۔ اس بنا پر یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کو اس کی زیادہ ضرورت ہو اور کسی کو کم۔

مثلاً بعض اطراف میں اکثر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور خصوصاً جبکہ وہاں کے لوگ مختلف النوع غذائیں کھاتے ہیں۔ اور ہمیشہ میوہ جات کھایا کرتے ہیں ان کا بدن بیماریوں کے لئے آمادہ رہتا ہو اور کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کو کوئی نہ کوئی بیماری نہ لاحق ہو۔ تو ان لوگوں کو فنِ طب کی ضرورت ان لوگوں سے زیادہ ہوگی جو اُن مقامات کے رہنے والے ہیں جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو اور جہاں مختلف قسم کی غذائیں نہیں ہوتیں اور با ایں ہمہ تقلیل غذا کرتے ہیں۔ مثلاً ان حصص کے باشندوں میں جہاں سرسبزی اور شادابی اور ردئیدگی بکثرت ہو اور وہ لوگ جو غذاؤں میں تنوع کرتے ہیں اور دودھ اور میوے اور کھانے کی چیزوں میں اعتدال کا خیال نہیں رکھتے وہ اکثر امراض کا ہدف رہتے ہیں۔ اور اُن میں اُس فن کی ضرورت زیادہ اور جلد اور مقدم ہو۔ اور جن حصوں میں غلہ وغیرہ کھانے پینے کی چیزیں بہت کم ہیں۔ اور جو لوگ سختی اور تنگیٔ معیشت میں بسر کرتے ہیں اُن میں یہ ضرورت بھی کم اور خفیف اور متاخر ہے۔ غرض آب و ہوا اور طرز معاشرت کا اثر انسان کے بدن میں اور اُس کے تمام حالات میں ظاہر ہوتا ہو۔ اور ہم صریحاً دیکھتے ہیں کہ چٹیل میدانوں کے باشندے جسمانی اور اخلاقی خوبیوں کے لحاظ سے بھی اُن سرسبز پہاڑیوں کے رہنے والوں کے نسبت اچھے ہوتے ہیں۔ جو فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اُن کے رنگ زیادہ صاف اور جسم پاکیزہ اور شکلیں خوشنما اور اخلاق معتدل اور ذہن معلومات اور عقید... میں زیادہ روشن ہوتے ہیں حتیٰ کہ چٹیل میدانوں اور خشک زمینوں کے ... ہرن۔ شتر مرغ۔ جنگلی گائے۔ زرافہ۔ جنگلی گدھے۔ وغیرہ جانوروں کو انہیں جیسے جانوروں سے مقابلہ کرو تو جلد کی لطافت جسم کی خوبصورتی صورت کی خوشنمائی اعضاء کے تناسب اور عقل حیوانی کے تیزی کے لحاظ سے اُن میں بہت فرق پایا جاتا ہو۔ مثلاً جنگلی ہرن کو پالتو بھیڑوں سے اور زرافہ کو شہری اونٹوں سے اور جنگلی گدھوں اور گایوں کو پالتو گایوں اور گدھوں سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں صاف طور پر فرق نظر آئے گا۔ اور اِس کا سبب یہی ہو کہ زمینوں کی سرسبزی۔ ردی فضلے اور فاسد اخلاط پیدا کرکے وہاں کے حیوانات پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ اور چٹیل میدانوں کی پاکیزہ آب و ہوا اور غذا کا کم میسر آنا اُن کو جسم اور شکل کے لحاظ سے لطیف اور خوش نما بنا دیتا ہو۔ پس ثابت ہوگیا کہ بعض ممالک۔ اور حصص کے خصوصیات سے انسان بہت متاثر ہو سکتا ہو۔ اور جن مقامات میں غذاؤں کی کثرت اور اُن کی رطوبتوں کی وجہ سے اجسام میں ناقص فضلات کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے سبب سے فاسد اور متعفن اخلاط زیادہ جمع ہوتے رہتے ہیں تو اس سبب سے اُن کے جسم بھی بے ڈول اور بد قوارہ

ہوجاتے ہیں، اور جب اُن غذاؤں کی وجہ سے کثیف بخارات معدہ سے اُٹھ کر دماغ میں چڑھ جاتے ہیں اور ذہنی اور فطری قوتوں پر رطوبتیں چھا جاتی ہیں تو اُس سے کُند ذہنی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور مزاج کے اعتدال میں فرق آجاتا ہے۔

المختصر اسی قسم کے حالات پر عمیق نظر ڈالنے کے بعد وہ لوگ جن کے ذہن روشن اور جن کی قوتِ ممیزہ قوی ہوتی تھی وقتاً فوقتاً اپنے تجارب کو جمع کرتے رہے اور امتداد زمانہ کے بعد اُن کی کوششوں سے ایک کافی ذخیرہ فنِ طب کے متعلق فراہم ہوگیا۔

عاصی کرنالی

# اُنؑ کے حضور

جنؑ کا ... "صرف ایک تبسّم سروسامانِ دو عالم"

اے بزم نشینو! مجھے معذور سمجھنا<br>گر لکھ نہ سکوں مدحتِ سلطانؐ دو عالم

یہ عرش ہے، یہ بارگہِ مُصطفوی ہے<br>جھکتی ہے یہاں گردنِ شاہانِ دو عالم

عاجز ہیں یہاں فکر کی ہر قوّتِ پرواز<br>ساکت ہیں یہاں مدح سرایانِ دو عالم

رُکتا ہے یہاں سلسلہ گردشِ دوراں<br>تھمتی ہے یہاں گردشِ طوفانِ دو عالم

اِس خاک کے ذرّے، سرِ جمشید و فریدوں<br>اِس در کے گدا عقدہ کشایانِ دو عالم

جب زلفِ رسالتؐ کو مشیّت نے سنوارا<br>سُلجھا گئی گیسوئے پریشانِ دو عالم

حاصل ہے مجھے سایۂ دامانِ محمّدؐ<br>اب میں نہیں وابستۂ دامانِ دو عالم

اُس کے درِ اقدس کا ہوں میں ذرّۂ خوش بخت<br>وہ ذات جو ہے مہرِ درخشانِ دو عالم

سردارِ عرب، شاہِ عجم، خواجۂ گیتی<br>توقیرِ جہاں، فخرِ زماں، شانِ دو عالم

اللہ کا بندہ ہے تو اللہ نگہباں<br>اللہ نگہباں، تو نگہبانِ دو عالم

بھیگے ہوئے گیسوئے نبیؐ ابرِ گہربار<br>ہنستا ہوا چہرہ، چمنستانِ دو عالم

صرف ایک نظر ہی سروبرگِ چمنِ زیست<br>صرف ایک تبسّم، سروسامانِ دو عالم

وا ہیں لبِ ارشاد، تو قرآنِ معانی<br>چُپ ہے نگہِ پاک تو عنوانِ دو عالم

اُمڈی ہوئی آنکھوں کے گہر دولتِ دارین<br>اُٹھے ہوئے ہاتھوں کی دُعا جانِ دو عالم

ہو دُور - تو ہے فاصلہ تا حدِّ قیاسات<br>ہو پاس - تو نزدیکِ رگِ جانِ دو عالم

اوّل بھی ترا نور ہے، آخر بھی تری ذات<br>کیا شان ہے اے خاصۂ خاصانِ دو عالم

عاصی کو بھی اِک گوشۂ محفل ہو عنایت<br>اے زیب دہِ مسندِ ایوانِ دو عالم

شفیق صدیقی
جونپوری:

# جنونِ حکمت

وہی اک چاندنی تھی اپنے نظارے کے قابل بھی
جمالِ یار بھی پیشِ نظر تھا ماہِ کامل بھی

نظر آتے ہیں اب، تو اجنبی یارانِ محفل بھی
ہمارا ہم زباں مُرغِ سحر بھی تھا عنادل بھی

ستم کیسا کرم ہے وقت پر قیدِ سلاسل بھی
سمجھتا تھا کہ دیوانے ہیں آزادی کے قابل بھی

تجھے اے ناخدا تسلیم کرنا ہی پڑا آخر
بچا سکتی ہیں موجیں بھی ڈبو سکتا ہے ساحل بھی

توجہ ہر قدم پر چاہیئے اُس کی نگاہوں کی
بڑی مشکل سے طے ہوتی ہے رسوائی کی منزل بھی

مقدّم ہے وہاں عجز و نیاز و بندگی لیکن
خدا توفیق دے تو لے چلے ٹوٹا ہوا دل بھی

مرے نالوں پہ تم بھی مُسکراتے ہو مگر سُن لو
بہار آئی تو یاد آئے گی فریادِ عنادل بھی

خدا محنت کسی کی رائگاں کرتا نہیں پیارے
جو گردِ کارواں ہوگا وہ ہوگا میرِ منزل بھی

انہیں کی جلوہ آرائی کی خاطر جشنِ عشرت تھا
وہ جاتے ہیں تو دامن سے بُجھا دیں شمعِ محفل بھی

اسیری کی شکایت اور تیرے دور میں توبہ
مگر زنجیر ہو ہم سے گرفتاروں کے قابل بھی

جگن ناتھ آزاد

# پروازِ خیال

ناکام ہے ادراک کی پرواز ابھی تک فریاد کہ ہے راز ترا راز ابھی تک
پایا نہ ترا نام و نشاں ذوقِ طلب نے تو ہے فقط آواز ہی آواز ابھی تک
بس ایک جھلک جلوۂ مقصودِ تمنا ہے ذوقِ جنوں محوِ تگ و تاز ابھی تک
جس دل پہ کھلے رومی و اقبال کے نکتے وہ دل ہے مرا شوخ و نظر باز ابھی تک

اے کاش کبھی تجھ پہ بھی ظاہر ہو کہ آزاد
ہے کس کے لئے زمزمہ پرداز ابھی تک

عبدالمجید حیرت

# آئینۂ حیرت!

نہ رخشندگی ہے، نہ تابندگی ہے یہی زندگی ہے، تو کیا زندگی ہے
حرم کو سمجھتے تھے ہم پاک، لیکن وہاں بھی بتوں کی نمایندگی ہے
ترقی ہو احباب کی، یا تنزل ہمارے لئے وجہ شرمندگی ہے

معاصی سے بے داغ، حیرت بتاؤ
تمہارا ہی کب دامنِ زندگی ہے

زبانوں پہ تسلیم ہے بندگی ہے مگر دل کے اندر وہی گندگی ہے
ہماری عبادت، ہماری ریاضت حقیقت نہیں، صورت بندگی ہے

غرض، جس طرف دیکھئے آج حیرت
پراگندگی ہی پراگندگی ہے

شوق (کھنڈوی)

# شوقِ فراواں

میری جہانِ عشق میں حرص و ہوس نہیں
صد شکر دل کی راہ میں یہ خار و خس نہیں
گھبرا رہا ہوں میں کہ کوئی ہم نفس نہیں
صحرا میں دور دور صدائے جرس نہیں

---

وہی رسمِ آہ و فغاں آج بھی ہے
زمینِ چمن آسماں آج بھی ہے
مرے درد کی ترجماں آج بھی ہے
مری آنکھ میری زباں آج بھی ہے
جمالِ حقیقت نہاں آج بھی ہے
جو کل تھا وہ خوابِ گراں آج بھی ہے
فسردہ سے ہیں لالہ و گل
بہاروں میں رنگِ خزاں آج بھی ہے
اٹھائے خرد نے بہ ہر گام فتنے!
محبت جہاں تھی وہاں آج بھی ہے
تلاطم بھی اٹھے حوادث بھی آئے
مگر کشتیٔ دل رواں آج بھی ہے
ترا درد تیری محبت سلامت
یہ دل بے نیازِ جہاں آج بھی ہے
ہوئیں مدتیں دل نے اک آہ کی تھی
میں سنتا ہوں وہ بدگماں آج بھی ہے
خرد کو نہ آئے یقیں شوق لیکن
جنوں عقل کا پاسباں آج بھی ہے

# ہوش و مستی

احمد کوثر

یہ جہاں کچھ بھی نہیں عظمتِ انساں کی قسم
میرے تخیل میں اک اور جہاں ہے ساقی
آج بھی خون سے رنگین نظر آتی ہے زمیں
کون کہتا ہے کہ عالم میں خزاں ہے ساقی
دستِ نازک میں ترے جام بہت خوب۔ مگر
بادۂ زیست سے لبریز کہاں ہے ساقی
بحرِ ہستی کے تلاطم کا شناور ہوں میں
مجھ کو آرام کی فرصت ہی کہاں ہے ساقی

اصغر نثار قریشی:

# غنچہ و گل

جی رہا ہوں تری خوشی کے لئے ورنہ مرنا تو کوئی بات نہیں
تقاضائے لب گلفام کیا ہے نہ جانے دوست کا پیغام کیا ہے
کرشمے ہیں یہ ساقی کی نظر کے صراحی کیا۔ شراب و جام کیا ہے
جسے ذوق جنوں بخشا ہے تو نے اُسے پروائے ننگ و نام کیا ہے
گر تری آرزو نہ کی ہوتی زندگی موت بن گئی ہوتی
ایک عالم تھا گوش بر آواز تم نے آواز بھی تو دی ہوتی
کوئی تو بات ہم میں تھی صیّاد دیکھ وہ رونقِ قفس نہ رہی
وہ اُمید و بیم کا عالم۔ وہ عہد انتظار گلستاں بھی تھے مری آنکھوں میں ویرانی بھی تھے
میں لکھ رہا ہوں فسانے شباب رفتہ کے اور آپ ان کیلئے سُرخیاں تلاش کریں

ڈاکٹر اختر

# احساسِ اختر

بزمِ عشرت میں بیٹھنے والے ہم کو آدابِ غم سکھاتے ہیں
ترے حضور دلِ ناتواں کو لایا ہوں میں بے نوا بھی کون و مکاں کو لایا ہوں
ہیں وہ میرے لئے سرتابقدم اک جلوہ اور میں دیدۂ حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں
مری بزم میں نہ آئے ابھی گردشِ زمانہ مرے جام میں ہے باقی ابھی بادۂ شبانہ
آپ اور التفات کی زحمت ہم پہ اور یہ کرم ارے توبہ!
یہ ماہ یہ نجوم یہ موسم بہار کا ایسے میں کوئی آکے کہے آپ آگئے
دیکھ کر آیا ہے شاید آپ کو دیکھنے والا بڑا مغرور ہے

فاروق محشر بدایونی:

در باز ہے میخانے کا گردش میں ہے ساغر آجائے جسے گردشِ دوراں سے گلہ ہے
ہنستے ہی چلے جائیں گے گل مجھ پہ کہ مجھ کو دل تنگیِ یارانِ گلستاں سے گلہ ہے

ماہر القادری

# رباعیات

احساس بلند و پست ہو جاتا ہے
عقبیٰ کا بھی بندوبست ہو جاتا ہے
خود نفس پہ اپنے غور کرتے کرتے
انسان خدا پرست ہو جاتا ہے

---

دل وہم و گماں کی نیند سو جاتا ہے
خود اپنی ہی جستجو میں کھو جاتا ہے
زنداں کی فضا میں سانس لیتے لیتے
شیروں کا مزاج سرد ہو جاتا ہے

---

برسات میں برگ و بار دھل جاتے ہیں
گلشن نہیں کوہسار دھل جاتے ہیں
ایسی بھی کوئی گھٹا برستی اے کاش!
جس سے دل کے غبار دھل جاتے ہیں

---

سوتی ہوئی زندگی کو چونکانا ہے
بھٹکے ہوئے دل کو راہ پر لانا ہے
شعلوں پہ بھی احتساب کرنا ہوگا
بجھتی ہوئی آگ کو بھی بھڑکانا ہے

---

غفلت کی جو نیند سو رہا ہے ساقی
سرمایۂ زیست کھو رہا ہے ساقی
انساں کی برائیوں سے خوش ہو ہو کر
ابلیس جوان ہو رہا ہے ساقی

ماہر القادری

# خط؟

فیروز سینما کے آس پاس رات کے ایک بجے تک خوب چہل پہل رہتی تھی، مگر آج نہ تماشائیوں کا شور تھا، نہ رکشاؤں اور گھوڑا گھاڑیوں کی قطاریں تھیں اور نہ میوہ فروشوں کے ٹھیلے اور مٹھائی بیچنے والوں کے خونچے دکھائی دیتے تھے، ساری رونق آدمی کے دم کی ہے، آدمی نہ ہو تو قصر و ایوان اور گلی کوچے اُجڑے اُجڑے سے نظر آتے ہیں۔

محلّہ کے کتّے جن کو کباب کے پتے، دہی بڑے اور مٹھائی کے دونے چاٹنے کو مل جایا کرتے تھے، آج کچھ نڈھال نڈھال سے پھر رہے تھے، چال میں وہ پھرتی اور تیزی ہی نہ تھی، کوئی راہ گیر اُدھر سے جاتا ہوا دکھائی دیتا تو بڑی حسرت سے اُس کا منہ تکنے لگتے ——— سینما ہاؤس کے دروازے پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا، جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا:-

"فیروز سینما کے پروپرائٹر رائے بہادر شیام لال جی کی دھرم پتنی کا دیہانت ہوگیا، اس لئے اس سوگ میں آج سینما بند رہے گا ——"

مگر کتوں کے لئے یہ اعلان بیکار تھا، وہ بیچارے نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ آدمیوں کی بولی سمجھ سکتے تھے، خونچے والوں اور گاہکوں کا وہاں نہ ہونا اُن کے لئے بالکل نئی اور اچنبھے کی بات تھی، کیسے کیسے چٹخاروں کے ارمان لیکر آئے تھے یہ "کتے" ! مگر رائے بہادر صاحب کی شریکِ زندگی کی موت نے اُن کے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا"

آج سے دو مہینے پہلے اسی شہر میں اس زور کی آگ لگی کہ پچاس مکان اور کئی دوکانیں جل کر خاک ہوگئیں، بیس بائیس جانوں کا بھی نقصان ہوا مگر سینما اُس دن بھی بدستور "چالو" رہا ——— لیکن آج اُسے بند ہی ہونا چاہیئے تھا، یہ رائے بہادر صاحب کی بیوی کے انتقالِ پُر ملال کا معاملہ تھا، تمام جانیں اور سب زندگیاں ایک جیسی تو نہیں ہوتیں اور پھر اپنے اور پرائے غم میں بھی بہت کچھ فرق ہوتا ہے، دوسرے کے سینہ کے گھاؤ کے مقابلہ میں اپنے تلوے میں چبھی ہوئی پھانس زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔

بارہ بجنے والے تھے، سینما کے قریب کی گلی کے نکڑ پر پنواڑی کی دُکان تھی، آج وہ بیچارہ بھی اُداس بیٹھا تھا، بکری ہوئی مگر نہ ہونے کے برابر! وہ شوقین ہی آج نہیں آئے جو پان کا بیڑا کلے میں دباکر، سگرٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوئے سینما ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں، ایک کے "سوگ" نے کتنوں کو سوگوار بنا دیا، پنواڑی دل ہی دل میں رائے بہادر صاحب کی مرنے والی بیوی پر ناراض ہو رہا تھا کہ نہ وہ مرتی نہ سینما بند ہوتا، وہ پرارتھنا کر رہا تھا ——— زبانِ حال سے کہ "ہے ایشور! دنیا مر جائے مگر رائے بہادر صاحب کے گھر کا کوئی آدمی نہ مرنے پائے" ——— قدرت ہنس رہی تھی، انسان کی خود غرضی پر!

پنواڑی دکان بڑھا ہی رہا تھا کہ اتنے میں دو جیپ کاریں سامنے کی بلڈنگ کے دروازے پر آکر رُکیں، گاڑیوں سے دَھم دَھم آدمی کودے اور بلڈنگ کے زینہ پر چڑھتے ہوئے چلے گئے ——— آدمی، پُراسرار بلکہ خوفناک آدمی ——— فوجی لباس، ہاتھوں میں پستول، ایک دو کے پاس رائفلیں بھی تھیں! چہرے آدھے کھلے اور آدھے ڈھکے ہوئے، عینکیں کافی لمبی

چوڑی تھیں!

بڑا خوفناک منظر تھا، پنواڑی کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں اُس نے دکان سے نیچے اُترنا چاہا، تختہ پر پیر ہی رکھا تھا کہ جیپ کار کے پیچھے سے ایک آواز آئی ـــــ "اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے۔۔" بیچارہ پنواڑی دکان کے تختہ سے چپک کر ہی تو رہ گیا، جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، وہ غریب اپنی جان بچانے کے لئے ہی تو بھاگ رہا تھا، مگر اب صورت یہ تھی کہ نہ بھاگنے سے جان بچ سکتی تھی، تختہ پر بیٹھتے ہوئے گھبراہٹ میں کتھے کا برتن اُس کے کپڑوں پر گر گیا، تمام کپڑے کتھے میں لت پت ہو گئے، مگر وہ دم سادھے ہوئے لیٹا رہا۔

مسلح آدمی تیسری منزل پر دراتے ہوئے پہونچے، دروازہ کو دستک دی گئی، اندر سے گھر کے کسی آدمی نے ذراسی کواڑ کھولی تھی کہ فل بوٹ کی ٹھوکر نے کواڑوں کے پٹ دھڑام سے کھول دیئے، یہ ہتھیار بند آدمی مکان میں داخل ہوئے، گھر کے آدمی ڈر کے مارے چلانے لگے مگر پستول کے ایک ہوائی فیر نے سب کو چپ کر دیا، مکان میں داخل ہونے والوں نے للکار کر کہہ دیا تھا کہ کسی نے شور مچایا، بھاگنا چاہا یا ذرا سی بھی مزاحمت کی تو جان کی خیر نہیں اس کا جواب گولی سے دیا جائے گا۔

گھر کے لوگ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے، بچے ماؤں سے چمٹ گئے، سب کے چہروں پر ہوائیاں چھُٹ رہی تھیں، دو آدمی اُن کی طرف پستول تانے کھڑے تھے۔ موت بہت سے بہت چار پانچ قدم کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی، جان کے لالے پڑے تھے کہ نہ جانے کب کس کی اُنگلی کی جنبش ہو اور پستول کی گولی سینہ میں پیوست ہو جائے، اس قدر خوفناک حادثہ پھر کسی کو زندگی میں پیش کب آتا ہے، یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا، وہم و گمان سے دُور اور تصور سے ماورا، جیسے کسی پر راہ چلتے اچانک بجلی گر پڑے یا بیچ بازار میں کسی پر شیر حملہ کر دے ـــــ ہونٹوں پر ذرا سی دیر میں پپڑیاں جم گئیں، زبانیں سُوکھ گئیں، آنکھیں کجلائی ہوئی چنگاریوں کی طرح بجھی بجھی سی ہو گئیں ـــــ حیران و ششدر، اُن سے ہلکا یا بھی تو نہ جاتا تھا۔

جمیلہ کو گھر والوں نے بیچ میں لے لیا تھا، بوڑھی ماں جوان بیٹی کو اپنے بدن کی آڑ میں چھپائے ہوئے کھڑی تھی، ماں کے لُٹیرے عصمت و عفت کے غارتگر بھی ہو سکتے ہیں اور ایسا سُننے میں آتا رہتا ہے کہ فلاں جگہ ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالا اور ایک جوان خوبصورت لڑکی کو اُٹھا کر لے گئے، خوبصورتی کبھی وبالِ جان بھی بن جاتی ہے اور آدمی تمنا کرتا ہے کہ کاش! میں بدصورت ہوتا! ـــــ یہ ایسا ہی موقع تھا، مگر لوگوں کے چاہنے سے نہ کوئی بدصورت، خوبصورت بن سکتا ہے اور نہ خوبصورتی بدصورتی سے بدلی جا سکتی ہے، اگر قدرت آدمی کی ہر خواہش اور تمنا کا ساتھ دیا کرے تو دُنیا کا کارخانہ شاید زیادہ دنوں تک اس توازن اور اعتدال کے ساتھ نہ چل سکے۔

اندر سے الماریوں کے کھولنے، صندوقوں کو اُٹھانے اور ٹٹولنے اور بکس کے توڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور اب خوف میں غم بھی شامل ہو گیا، غم، جی ہاں! غم! قیمتی کپڑوں کا، جڑاؤ زیوروں کا، نوٹوں کی گڈیوں اور اشرفیوں کے توڑوں کا! شیخ لطافت حسین نے کس کس احتیاط اور عرقریزی کے ساتھ دولت اکٹھا کی تھی ـــــ ایک نہیں تین پشتوں کا سرمایہ جمع تھا اُن کے یہاں! اور آج وہ سب چھنا جا رہا تھا ـــــ شیخ جی نے کیا کیا چلے حوالے کر کے انکم ٹیکس والوں سے اپنی دولت بچائی تھی لیکن اُن کو یقین تھا کہ آج گھر میں ایک پائی بھی نہ چھوڑیں گے یہ لُٹیرے! مگر کوئی کر بھی کیا سکتا تھا، پستول اور بندوقوں کا خالی ہاتھ کیا مقابلہ کرتے! "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" والا معاملہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے آنے والوں کے پیروں کی چاپ سُنائی دی، اُن میں سے ایک رومال کا اشارہ کرتا ہوا باہر چلا گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے باقی لوگ بھی چل دیئے، آخری آدمی اُلٹا چل رہا تھا، گھر والوں کی طرف اُس کا منہ تھا اور پستول

تانے ہوئے تھا، پھر وہ سب زینہ سے اُتر کر جیپ کاروں میں بیٹھے اور آن کی آن میں یہ جا وہ جا!

پستول کی آواز سے ہی آس پاس کے مکانوں میں جاگ ہوگئی تھی، مسلح آدمیوں کے چلے جانے کے بعد گھر کے آدمیوں نے شور مچایا، ذرا سی دیر میں محلہ والوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا اور تھوڑی دیر میں پولس بھی آگئی، گھر والے بُری طرح ڈرے ہوئے تھے، کہنا کچھ چاہتے تھے اور منہ سے نکلتا کچھ تھا ——— پنواڑی بھی اپنی دُکان کھلی کی کھلی چھوڑ کر یہاں آ گیا، اُس کے کپڑوں کی رنگت دیکھ کر انسپکٹر نے خیال کیا کہ ڈاکو جاتے جاتے پنواڑی کو شاید زخمی کر گئے، اُس سے دریافت کیا گیا، پنواڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——— ناہجور! میرے تو اُنھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، اُن کی طرف سے یہ آواز آئی تھی کہ "تم اگر بھاگو گے تو گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے" تو سرکار! میں اپنے دکان کے تختہ پر دم سادھے ہوئے پڑا رہا اور کتھے کا برتن گھبراہٹ میں اوندھا ہوگیا، یہ لہو نہیں ہے داروغہ جی! کتھے کی رنگت ہے ——— اور میں خدانہ کرے گھایل ہو جاتا تو کیا اس طرح کھڑا رہتا، ہاتھ ہاتھ بھر کے پستول اور یہ یہ موٹی (ہاتھ کے اشارے سے) بندوقیں تھیں اُن کے پاس! میں تو پودنے کی برابر ہوں اگر ہاتھی کے بھی وہ گولی مار دیتے تو وہیں ڈھیر ہو کر رہ جاتا۔

پولس نے گھر والوں سے کہا کہ اپنے مال اسباب کی جانچ پڑتال کر کے فہرست تیار کرو کہ تمہارا کیا کیا مال ہے؟ ٹرنک، الماریاں اور تجوریاں دیکھی گئیں اور فرط حیرت و مسرت سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
——— اُن کی باتیں!

——— جمیلہ کے جہیز کی چیزوں کو تو اُنھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، ایک ایک کیل اور ایک ایک کترن موجود ہے ——— اور اشرفیوں کے توڑے جیسے کے ویسے! گرہ بھی تو نہیں کھلی اُن کی! اندھے تھے یہ ڈاکو، شاید اشرفیوں کو کوڑیاں سمجھ کر چھوڑ گئے۔

——— اور اماں جان! یہ ہے میرا نیکلس، یہ ہیں بُندے، اور یہ میرے ہیروں کے لچھے! اللہ نے بڑا فضل کیا میں تو سمجھ رہی تھی کہ ناک میں پہننے کی کیل بھی یہ موئے ڈاکو گھر میں نہ چھوڑیں گے،

——— یہ چاندی کا پاندان تو میز پر کھلا ہی رکھا تھا ... اور اُس کے خانوں میں قیمتی گھڑیاں سُنہری توڑوں کے ساتھ تھیں! کسی چیز کو چھوا تک نہیں!

——— یہ کس قماش کے ڈاکو تھے کہ نوٹوں کی گڈیاں بندھی کی بندھی رکھی رہیں، پھر آخر یہ آئے کیوں تھے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ کچھ لوگ نشہ میں مست ہو کر گھر میں گھس آئے ہوں ... مگر اُن کے پستول، رائفلیں، کوٹ، برجس، جوتے، عینکیں، چال ڈھال، گھر میں داخل ہوتے وقت اُن کا وہ للکارنا، جب تک دوسرے ساتھی مکان کے اندر رہے اُن کا ہماری طرف پستول تانے کھڑے رہنا ... یہ سب ڈاکوؤں کی باتیں ہیں! شرابی کہیں اس اہتمام کے ساتھ شراب پی کر تھوڑی نکلتے ہیں۔

——— تو پھر ——— آخر یہ ہوا کیا؟ مذاق؟ مگر کوئی عقلمند آدمی اس قدر خوفناک مذاق نہیں کر سکتا، اگر وہ لوگ موقعہ پر پکڑ لئے جاتے تو ہر کوئی اُن کو ڈاکو ہی سمجھتا، رات کے وقت کسی غیر کے گھر میں ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس طرح آدھمکنا ڈکیتی اور لٹیرا پن نہیں تو اور کیا ہے؟

——— بڑی ریاض کی کمائی ہے میری لوگو! بے ایمانی، رشوت اور لوٹ کا مال نہیں ہے جو اس آسانی سے چلا جاتا۔

——— اور میں وظیفہ جو پڑھ رہی تھی، اُس کا حال تو کسی کو معلوم ہی نہیں،

گھر والے اسی قسم کی باتیں کرتے رہے جن میں مزاح اور خوش طبعی بھی شامل تھی، مُسلح ڈاکوؤں کا گھر میں گھس کر یوں ہی خالی ہاتھ واپس چلا جانا بہت بڑے اچنبھے اور ساتھ ہی انتہائی خوشی کی بات تھی اور مزاح وظرافت کی باتوں سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے، دل گرفتہ اور ملول آدمی ہنسی مذاق کی باتیں نہیں کیا کرتے، ہنسوڑپن تو خوشی ہی میں سوجھتا ہے۔

ڈکیتی بہت بڑا سنگین جُرم ہے، قتل اور آتش زنی کے برابر! پُولس نے مکان کے کونے کونے کو دیکھا، گھر والوں کے بیانات کو پُوری توجہ کے ساتھ سُنا ——— پولس کی نگاہ میں یہ معاملہ بہت پُراسرار اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل انوکھا اور عجیب تھا، ہتھیار بند ڈاکو ایک مکان میں ایک گھنٹہ تک رہیں، اُن سے کسی قسم کی مزاحمت بھی نہ کی جائے اور وہ مکان کے ایک صندوق سے بس چند کاغذات نکال کرلے جائیں ——— شہر میں اس واقعہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گرم تھیں، ہزار منھ اور ہزار باتیں!

پُولس بڑی سرگرمی کے ساتھ اس وقوعہ کا کھوج لگا رہی تھی، خفیہ خفیہ تفتیش ہو رہی تھی، خفیہ پولس کے تجربہ کار اور ماہرِ فن عُہدیدار اس کام میں لگے ہوئے تھے، پُورا ایک مہینہ گزر گیا مگر کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا، یہ نہیں تھا کہ پُولس نے درگزر یا غفلت سے کام لیا، پولس والوں نے اپنے فرض کو اچھی طرح پہچانا، بہت کچھ دوڑ دھوپ کی لیکن یہ گتھی سلجھ نہ سکی، پبلک سمجھ رہی تھی کہ پُولس نے شاید ناکام ہو کر تفتیش اور تحقیقات کرنی چھوڑ دی مگر یہ لوگوں کی محض قیاس آرائی بلکہ غلط فہمی تھی، پُولس اپنے کام سے غافل نہ تھی، سب کچھ چپکے چپکے ہو رہا تھا، پُراسرار واقعات کا پتہ لگانے کیلئے انتہائی رازداری کی ضرورت ہے، پولس کی کارگزاریاں منظرِ عام پر آتی رہا کریں تو پھر واقعات بے نقاب ہی نہ ہو پائیں۔

خفیہ پُولس کے ایک انسپکٹر کی ڈائری کے چند اقتباسات یہاں پیش نہ کئے جائیں گے تو یہ افسانہ ادھورا رہے گا۔

——— ڈائری میں لکھا تھا۔

——— شیخ جی کے یہاں بدّو قصائی کی دکان سے بکری کا گوشت آتا ہے، گوشت لینے کے لئے جو چھوکرا جاتا ہے اُس کا نام رمضانی ہے، رمضانی کی عمر بارہ، تیرہ سال کے لگ بھگ ہے، جس رات کو شیخ جی کے مکان میں ڈاکو آئے تھے اُس دن اُن کے یہاں چار پانچ مہمانوں نے کھانا کھایا تھا، چھ سات قسم کے کھانے پکے تھے، دہی کا قورمہ، کوفتے، ماش کی دال، کچی بریانی، کوپھی اور ایک یا دو میٹھے تھے، ان مہمانوں میں میونسپلٹی کے سکتر، انکم ٹیکس افیسر، ریلوے کے ایک عہدیدار اور شہر کے مشہور ٹینس کے کھلاڑی حمید شامل تھے۔

——— شیخ جی کے یہاں ننھے دودھ والے کے یہاں سے دودھ آتا ہے اور اُن کے گھر کے کپڑے چندی دھوبی کے یہاں دُھلنے کیلئے جاتے ہیں، کپڑے دینے اور لینے کے لئے زیادہ تر دھوبی کی بہو آیا کرتی ہے، گرم کپڑے "فیکٹری" میں دیئے جاتے ہیں۔

——— شیخ جی کی لڑکی جمیلہ گورنمنٹ زنانہ کالج میں پڑھتی ہے، گرلس کالج کی لاری میں کالج آتی جاتی ہے،

اس لڑکی کو شعر شاعری اور افسانہ نگاری سے خاص دلچسپی ہے، ماہنامہ "کرن" میں اُس کے افسانے اور نظمیں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، اس مہینہ جمیلہ کا افسانہ "بال روم میں" اور اُس کی نظم "سہاگ" رسالہ میں چھپی ہے، جمیلہ قبول صورت لڑکی ہے، گندمی رنگت، چھریرا بدن، شربتی آنکھیں، سر کے بال گھونگریالے ہیں اور کم لانبے ہیں۔

——— شیخ جی کے گھر میں ایک چت کبری بلی پلی ہوئی ہے، اُس کا نام "سوسن" ہے، چھوٹے بڑے سب کے سب سوسن کو چاہتے ہیں، چھوٹے بچوں تک کا یہ عالم ہے کہ کھانے کی کوئی چیز اُنھیں دی جائے گی تو پہلے سوسن کو کھلانیکی کوشش کریں گے!

——— شیخ جی کے یہاں جو نوکرانی کھانا پکاتی ہے، اُس کا نام شبراتن ہے! پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی اُس کی عمر ہے کہ بال اکّا دکّا سیاہ ہوں تو ہوں، تمام چونڈا سفید دکھائی دیتا ہے، شبراتن کھانے کپڑے اور پانچ روپیہ ماہوار پر نوکر ہے مگر سودا سلف لانے میں اُوپر سے بچت ہو جاتی ہے، تین چار آنے روز کی افیون کا خرچ اسی میں سے نکلتا ہے، شبراتن کے شوہر نے دوسرا بیاہ کر لیا ہے، شبراتن سے اُس کے بس یوں ہی سے تعلقات ہیں!

پولس کی اس ڈائری سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولس کی کس قدر جزئیات پر نظر تھی اور کیسی کیسی باتوں کا اُس نے کھوج لگایا تھا، مگر اصل واقعہ ابھی تک "راز" بنا ہوا تھا، جمیلہ کی ایک ایک نقل و حرکت کا پولس بغور مطالعہ کر رہی تھی، شیخ جی کے گھر کون آتا جاتا ہے، کیوں آتا ہے؟ یہ سب باتیں پولس کے نوٹس میں آرہی تھیں، نئی نئی معلومات اور اطلاعات ملتی رہتیں، یادداشتوں اور روزنامچوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا لیکن اُن سے سُراغ رسانی میں ذرا بھی مدد نہ ملی۔

خفیہ پولس کے ایک سب انسپکٹر کا نام تھا روشن علی! درمیانہ قد، بھوری مونچھیں، چہرے پر چیچک کے داغ، آنکھیں چھوٹی اور چمکیلی ——— یہ شخص اس معاملہ کا بڑی توجہ اور کمالِ غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کر رہا تھا، اُس نے جمیلہ کے افسانوں اور نظموں کو بار بار پڑھا، اُس نے افسانوں میں خاص طور سے یہ بات محسوس کی کہ کسی مسلمان کا کیرکٹر ہو تو "بہادر خاں" اور ہندو کردار ہو تو "ویر سنگھ" نام بار بار لیا گیا ہے، اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ ان ناموں سے افسانہ نگار کو کوئی نہ کوئی دلچسپی اور تعلقِ خاطر ضرور ہے!

اُس نے شہر اور خاص طور سے جس محلہ میں شیخ جی رہتے تھے وہاں "بہادر خاں" نام کے لوگوں کا پتہ لگانا شروع کیا، معلوم ہوا کہ شہر میں اس نام کے درجنوں آدمی ہیں، بہادر تیلی ہے، بہادر رنگریز ہے، شہر کی ایک مشہور طوائف کے سازندہ کا نام بہادر ہے، ایک خانقاہ کے سجادہ نشین بہادر شاہ ہیں اور "خان بہادر" اور "رائے بہادر" تو ایک درجن سے کچھ اوپر ہی ہوں گے!

دوسرا آدمی ہوتا تو مایوس ہو جاتا مگر روشن علی اپنے کام میں لگا رہا، اُس نے گھنٹوں سوچا، پہروں غور کیا ——— آخرکار ایک چیز ذہن میں آئی کہ لاؤ "شجاعت" نام کے کسی آدمی کے حالات کا پتہ لگا کر دیکھوں، شاید اس طرح مشکل حل ہو جائے!

روشن علی سب انسپکٹر قیاس و گمان کے تیر تکّے لڑا رہا تھا مگر سُراغ رسانی میں یہ تیر تکّے بعض اوقات بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں، شہر میں شجاعت نام کے پانچ آدمیوں کا اُسے پتہ لگا، جن میں سے ایک شجاعت علی تو انجینیر تھے ایک دو سال میں اُن کی پنشن ہونے والی تھی، دوسرے تھے شجاعت حسین وہ ایک زمیندار کے کارندے تھے، دو صاحب اور اسی نام کے تھے اور پانچویں صاحب کا نام شجاعت احمد تھا، نوجوان آدمی، زیادہ سے زیادہ پچیس سال کی عمر ہوگی، فیشن ایبل، ہنسوڑ، کھیل کود کا شوقین! شعر شاعری اور گانے بجانے کا رسیا، سب انسپکٹر کی تمام توجہ اسی شجاعت احمد پر مرکوز ہو کر رہ گئی، اُسے یہاں کچھ سُراغ رسانی کے آثار سے نظر آنے لگے، اُس کے تجربہ کی نگاہ کچھ بھانپ گئی!

روشن علی سب انسپکٹر نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا شروع کیا مگر آگے چل کر کچھ دھندلکا سا نظر

آنے لگا۔ ۔ ۔ اور پھر گھپ اندھیرا! مگر وہ مایوس نہیں ہوا، ہمت نہیں ہاری اُس نے! اب کچھ کچھ اُجالا دکھائی دینے لگا، بس ڈور کے سرے کی ملنے کی دیر تھی، گتھی کا سلجھانا کیا مشکل تھا، اور اس گتھی کا سِرا اُسے مل گیا، خود بخود نہیں! بڑی محنت اور جستجو کے بعد! اس کام کے لئے اُسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ـــــــــ بھیس بدل بدل کر اُس نے بھیک مانگی، ڈاک خانہ کا ڈاکیہ بنا، کئی مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے غزلیں پڑھیں، بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بن کر گھوما، یہاں تک کہ شجاعت احمد خاں کے والد خان بہادر رستم خاں کے یہاں نوکر ہو کر چلیں تک بھریں اور اُن کے پیر تک دبائے۔

آدمی کوشش کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ سب کچھ ممکن ہے، اللہ نے آدمی کے ارادے اور عمل میں بڑی طاقت دی ہے ـــــــــ سراغ کی کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی، واقعات کے چہرے سے ایک ایک کر کے پردے اُٹھتے گئے، یہاں تک کہ مجرموں کا پولس نے چالان کر دیا اور ملزمین میں سے ایک شخص سرکاری گواہ بن گیا ـــــــــ اس گواہ نے عدالت میں بیان دیا! ـــــــــ

ـــــــــ شجاعت احمد خاں کی بہن شکیلہ اور شیخ جی کی لڑکی جمیلہ ایک ہی کلاس میں پڑھتی ہیں، کالج میں ایک گارڈن پارٹی کے موقعہ پر لڑکیوں کا فوٹو کھینچا گیا اور اُس فوٹو گروپ کی کاپی شکیلہ کو بھی ملی (عدالت۔ ۔ ۔ کالج کی طرف سے فوٹو کی کاپیاں مفت تقسیم ہوئی تھیں؟) جی نہیں! لڑکیوں سے قیمت لی گئی تھی! (مجسٹریٹ خاص انداز میں سر ہلاتا ہے، یعنی تم نے جہاں سے بات چھوڑی تھی، وہیں سے کہنا شروع کرو۔ ۔ ۔ ) تو جناب والا! وہ فوٹو گروپ شکیلہ نے اپنے کمرے کی میز پر لاکر رکھ دیا، شجاعت احمد نے اُسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی کے ناک نقشہ پر تنقید کرنی شروع کی، کسی کی بُرائی، کسی کی تعریف، کسی پر نکتہ چینی۔ ۔ ۔ مگر جمیلہ کی تصویر دیکھ کر اُس کی خوب خوب تعریفیں کیں کہ مجھے یہی ناک نقشہ پسند ہے۔

شکیلہ نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ وہی "ج، بیگم" ہیں، جن کے افسانے رسالوں میں چھپا کرتے ہیں، شجاعت احمد نے اپنی بہن شکیلہ سے کہا کہ اپنی سہیلی جمیلہ کو ہماری "بزم ادب" میں کسی دن لیکر آؤ وہاں شاعروں اور ادیبوں کا بڑا اچھا اجتماع ہوتا ہے، پردہ نشین خواتین پردے میں بیٹھ کر اپنا کلام اور افسانہ سُناتی ہیں۔

شکیلہ نے جمیلہ سے "بزم ادب" میں چلنے کے لئے اصرار کیا، جمیلہ نے صاف انکار کر دیا کہ میں ایسی محفلوں میں شرکت نہیں کر سکتی اور میں چاہوں بھی تو میرے گھر والے قیامت تک مجھے وہاں جانے کی اجازت نہ دیں گے، شکیلہ نے اپنے بھائی سے جمیلہ کا جواب لفظ بہ لفظ بیان کر دیا اس پر شجاعت نے بہن کو سمجھایا کہ تم جمیلہ سے ابکی بار یہ جاکر کہنا ـــــــــ شکیلہ نے جمیلہ سے کہا کہ اس "بزم ادب" کی طرف سے تمہارے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جائے گا، اخباروں اور رسالوں میں اُس پر ریویو ہوں گے، دیکھتی نہیں ہو کہ فرخ ہاشمی کو شہرت اسی "بزم ادب" کی بدولت حاصل ہوئی ورنہ وہ بالکل گمنام تھا، جمیلہ ایک دن وہاں جاکر تو دیکھو، پھر تمہارا دل نہ چاہے تو نہ جانا میں ہرگز ہرگز اصرار نہ کروں گی!

جمیلہ نے "بزم ادب" میں چلنے کے لئے ہامی بھر لی، گھر والوں سے یہ بہانہ کیا گیا کہ ایک اُستانی صاحبہ کے یہاں جائے کی دعوت ہے، جمیلہ نے پردے کی آڑ سے افسانہ سُنایا، ایک ایک جملہ پر یار لوگوں نے وہ داد دی کہ مشاعرہ کا سا سماں پیدا ہو گیا ـــــــــ (عدالت:- تم اُس جلسہ میں خود شریک تھے ـــــــــ) ۔ ۔ جی ہاں میں نے اُس میں شرکت کی تھی، "بزم ادب" کے جلسوں میں، میں پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتا ہوں۔ ۔ ۔

جمیلہ اب "بزم ادب" کے جلسوں میں جانے لگی، شجاعت احمد سے ربط ضبط بڑھنے لگا۔ (مجسٹریٹ:۔ ربط ضبط سے تمہارا کیا مطلب ہے؟) آنا جانا، بات چیت، تحفے تحائف،۔۔۔ جمیلہ کی افسانہ نگاری کے ساتھ اُس کے افسانہ پڑھنے اور لب و لہجہ کی بھی تعریف! اُس کے بعد خوبصورتی پر بھی کچھ چُست فقرے! "بزم ادب" بیچاری کے پاس سرمایہ کہاں تھا، شجاعت احمد نے جمیلہ کے افسانوں کے چھپوانے کا ذمہ اپنے سر لیا۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔اس کے بعد دونوں کی بے تکلفی بڑھنے لگی، میں نے کمپنی باغ میں شجاعت احمد اور جمیلہ کو ٹہلتے ہوئے دیکھا (وکیل صفائی:۔ جمیلہ کو تم بھی تو پسند کرتے تھے۔۔) جی! میری پسند اور ناپسند کیا بیرسٹر صاحب! مفلس و قلاش آدمی کو حُسن و محبت کے بازار میں کون پوچھتا ہے، میرے پاس جمیلہ کے افسانوں کے مجموعہ کو چھپوانے کا بندوبست ہوتا تو شاید میں بھی۔۔ ۔۔ ۔۔ (وکیل سرکار نے بیچ میں بول کر گواہ کے جملہ کو پورا نہ ہونے دیا) وہاں! تو حُسن اور جوانی کا مال اور شہرت سے سودا ہو رہا تھا۔

شجاعت احمد مالدار باپ کے لڑکے ہیں، کئی سو روپیہ ماہوار تو جیب خرچ ہے اُن کا! (وکیل صفائی:۔ اور تمہیں اُنھوں نے اپنے جیب خرچ میں شریک کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے تم اُن سے ناراض ہو۔۔ ۔۔؟ گواہ قدرے پریشان ہوکر سر کھجانے لگتا ہے ۔۔۔ وکیل سرکار:۔ (عدالت سے مخاطب ہوکر) یہ غیر متعلق سوال ہے حضور والا! ۔۔۔ عدالت (گواہ سے) ہاں! تو پھر کیا ہوا؟۔۔ ۔۔) شجاعت صاحب رنگین مزاج واقع ہوئے ہیں اور کیوں نہ ہوں! روپیہ ہے، جوانی ہے، کوئی اونچ نیچ کی بات آن پڑے تو اُن کے باپ بیٹے کی پشت پناہی کے لئے موجود ہیں۔۔۔ شجاعت صاحب کی سلک سٹورز کے مالک مسٹر فیروز سے دوستی ہے مسٹر فیروز کلکتہ سے ایک اینگلو انڈین لڑکی لیکر آگئے (عدالت:۔ یہ کب کا واقعہ ہے) بڑے دن کی چھٹیوں کا! اس لڑکی کا نام ڈی سوزا ہے، بہت خوبصورت اور صحت مند لڑکی ہے۔۔۔ اب میں کیا عرض کروں۔۔ ۔۔ (عدالت:۔ جو کچھ تم جانتے ہو، وہ تمہیں کہنا پڑے گا، فصاحت اور راست گوئی کو مدِ نظر رکھو) شجاعت اور فیروز میں یہ بات طے پائی کہ شجاعت فیروز سے جمیلہ کا اور فیروز ڈی سوزا سے شجاعت کا دوستانہ کرادے گا۔۔۔ جمیلہ اس پر شدید ناراض ہوگئی کہ تم اس قدر بے غیرتی پر اُتر آئے ہو بس اُس دن سے دونوں کی دوستی ہے!

جمیلہ کے پاس شجاعت احمد کے بعض خطوط تھے، ان میں وہ خط بھی تھا جو مس گرین اور مسٹر وڈ کے حادثہ قتل پر بہت کچھ روشنی ڈالتا تھا، مس گرین نے شجاعت کو لکھا تھا کہ مسٹر وڈ ہماری راہ کا کانٹا بنا ہوا ہے (وکیل صفائی:۔ یہ خط جمیلہ کے پاس کس طرح پہونچا) شجاعت نے جمیلہ کو متاثر کرنے کے لئے وہ خط دکھایا کہ مجھے اینگلو انڈین لڑکیاں تک چاہتی ہیں مگر تمہارے لئے میں نے سب کو دھتکار دیا۔۔۔ اسی قسم کے چند اور خط جمیلہ کے پاس تھے۔

شجاعت احمد کو اِن خطوں سے بہت کچھ اندیشہ تھا اور اُن کا اندیشہ بجا تھا! ان خطوں کے لانے کے لئے اسکیم سوچی گئی ان (ایک ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو دو ہزار روپیہ کے نوٹ، دو سونے کی انگوٹھیاں اور کانوں کے آویزے اسکیم کی تیاری کے لئے دیئے گئے اور جناب والا! ۸ فروری کو رات کے وقت شیخ جی کے مکان میں پستول اور بندوقوں کے ساتھ (ملزموں میں سے ایک ایک کا نام لیکر) گھس کر، جمیلہ کے صندوق سے وہ خطوط نکال لائے۔

عدالت میں سناٹا طاری تھا، مجسٹریٹ کے پائپ کا دھواں فضا میں پیچ بنا رہا تھا اور اخباروں کے رپوٹر پورے انہماک کے ساتھ سرکاری گواہ کا بیان لکھ رہے تھے یہاں تک کہ شام ہوگئی اور مجسٹریٹ اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ ۔۔ ۔۔ "پُراسرار خط۔۔ ۔۔" "سرکاری گواہ کا عجیب انکشاف۔۔۔ یہ جلی سُرخیاں تھیں صبح کے وقت چھپنے والے اخباروں کی! ٭

# روحِ انتخاب

## رسولوں کی اُمتوں کا بگاڑ

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ پیغمبر اپنے دین کی بُنیاد کتنی مضبوط قائم کر جاتے ہیں، بڑی بڑی تحریکوں اور اصلاحی کاموں کو دیکھو، کس دُھوم دھام سے اُٹھے اور کہاں سے کہاں تک پہونچ گئے، لیکن جیسے ان کے بانیوں کی آنکھ بند ہوئی کام بگڑنے لگا اور چند برس کے اندر ہی اندر اس کی صُورت اتنی مسخ ہوگئی کہ اگر اس تحریک کا بانی دنیا میں واپس آئے تو اس غم میں شاید اپنی جان دے دے۔ یا اپنے جانشینوں ہی کے خلاف جنگ شروع کر دے، لیکن پیغمبروں کے دین کئی کئی ہزار برس تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے، اور ان کی بہت کچھ خصوصیتیں قائم رہیں، اور دین اسلام تو پورے کا پورا دنیا میں موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص اس پر عمل ہی نہ کرے، ورنہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے لئے اس سے رہنمائی اور مفصل ہدایات حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ دُنیا میں آنکھ کھولنے سے لیکر دُنیا سے رُخصت ہونے تک انسان کی کونسی حالت ہے جس کے لئے اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ موجود نہیں ؟

لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ شیطان اپنے کام سے غافل نہیں، پیغمبر کے آنے اور اُس کی کامیابی سے اس کو اتنی ذلّت اُٹھانی پڑتی ہے اور ایسی ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑتا ہے کہ اُس کا دل ہی جانتا ہے، پیغمبر کی آمد اور اس کے پیغام سے اُس کے دماغ اور اُس کی زندگی کی چولیں ہل جاتی ہیں، اس کی سیکڑوں برس کی کوششوں اور کامیابیوں پر آن کی آن میں پانی پھر جاتا ہے۔ کوئی اور ہو تو کبھی کوشش کا نام نہ لے، مگر وہ ہے بڑا سخت جان اور دُھن کا پکّا، یا یوں کہہ لو کہ بڑا بے حیا، پیغمبر کے زمانے میں تو اس کا داؤں چلتا نہیں، لیکن پیغمبر کے جاتے ہی وہ ہم ٹھونک کر میدان میں آجاتا ہے، اور پیغمبر کے بنائے ہوئے قلعے میں گُھسنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے، لیکن اس کی ترکیب ہے کہ اکثر وہ سامنے کے بجائے دائیں بائیں سے آتا ہے، اور کُھلے پھاٹک کے بجائے چور دروازوں سے داخل ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی تعلیم و تاثیر اور اُن کی صُحبت کے اثر سے لوگوں میں دین کا اتنا احساس، اور اپنے دین سے ایسا تعلق اور محبت ہوتی ہے کہ اگر ان کو اس سے روکا جائے تو وہ اپنی جان دے دیں، اور دوسروں کی جان لے لیں، شیطان اس بات کو خوب جانتا ہے، وہ یہ خطرہ مول نہیں لیتا، یہ کبھی نہیں کہتا کہ دین کا کام نہ کرو، مگر وہ ایسی چال چلتا ہے کہ اگر دین کا کام ہو بھی تو بالکل بے جان، یا غلط۔ پُرانے مذہبوں کے تنزل و انحطاط کی تاریخ پڑھکر اور مسلمانوں کا حال بھی دیکھ کر ہمیں کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان کیا حربے اختیار کرتا ہے، اور کیسی کیسی چالیں چلتا ہے، اس موقع پر ہم اس کے دو چار حربوں کا تذکرہ کرتے ہیں:۔

۱۔ آپکو معلوم ہے کہ پیغمبر کے آنے سے پیشتر پہلا دین جو گزشتہ پیغمبر لیکر آئے تھے بالکل دُنیا سے ناپید نہیں ہوچکا ہوتا ہے، اس کی بہت سی چیزیں ماننے کی، کرنے کی، جوں کی توں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کی رُوح نکل چکی ہوتی ہے، چند رسموں کا ایک مجموعہ جس میں نہ جان نہ طاقت، نہ کرنے والوں میں اخلاص و نیّت، نہ ذوق و شوق، بس صرف ایک خانہ پُری اور رسم پرستی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

ان کاموں کے روحانی، اخلاقی، اور دینی و دنیاوی نتیجے برآمد نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ کے ان کاموں پر جو وعدے ہوتے ہیں وہ پورے ہوتے ہیں وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے، اس لئے کہ وہ وعدے ان کاموں کی حقیقت پر ہوتے ہیں نہ کہ صورت پر۔ نتیجے ہمیشہ حقیقت کے نکلا کرتے ہیں نہ کہ صورت کے۔ کاٹھ کے گھوڑے کو کسی نے دوڑتے، اور مٹی کے شیر کو کسی نے جست لگاتے دیکھا؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کاموں کو بے نتیجہ بے مزہ دیکھ کر ان میں سستی کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر ان کی شکل بھی قایم نہیں رہتی، پیغمبر جب آتے ہیں تو ان صورتوں میں اخلاص و نیت، عزم و ہمت اور ذوق و شوق کے ذریعے حقیقت پیدا کر دیتے ہیں اور ان بے جان جسموں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی تعلیم اور ان کی صحبت سے ان چیزوں کی حقیقت ہی بدل جاتی ہے۔ ان میں اس درجہ کا اخلاص، اس قدر ذوق و شوق، ایسی محبت، ایسا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے کہ جو ان کے پاس بیٹھتا ہے اس کا سینہ اخلاص، ذوق و شوق اور محبت سے بھر جاتا ہے، عبادات تو عبادات، روزمرہ کی عادات، کھانے پینے، سونے جاگنے، اور پیشہ و کاروبار بھی نیت اور عبادت کے دھیان کے بغیر تجارت و زراعت اور محنت مزدوری تک نہیں کرتے، ان کی ظاہری عبادات نماز، روزہ اور اللہ کی یاد کا کیا حال ہوگا۔ ان کو عبادات میں ایسا ذوق و شوق اور ایسی محویت اور ایسی روحانی لذت حاصل ہوتی ہے کہ ان کو جسمانی تکلیف، مالی نقصان، کسی چیز کا خطرہ کچھ محسوس نہیں ہوتا، انہیں کا حال آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایک جگہ دو صحابی پہرہ پر مقرر ہوئے، آپس میں طے ہوا کہ باری باری سے سوئیں اور جاگیں۔ ایک صاحب سونے کے لئے لیٹ گئے، ایک صاحب نے نماز کی نیت باندھ لی کہ بے کار رہنے سے کیا فائدہ، دشمن نے دیکھا تو ان کو تیروں پر رکھ لیا۔ تیر پر تیر کھاتے رہے اور نماز نہیں توڑی، جب نماز ختم کی اور ساتھی جاگے تو انہوں نے کہا کہ بندۂ خدا تم نے مجھے جگایا کیوں نہ لیا، کہنے لگے کہ میں نے سورہ کہف شروع کر دی تھی، کچھ ایسا مزہ آیا کہ نماز توڑنے کو جی نہ چاہا۔ بھلا اس ذوق و شوق کے آدمی عمل میں سستی کیا کریں گے اور ان سے نماز چھوٹنے کا کیا اندیشہ ہے۔

اب شیطان کی ترکیب ہے کہ نماز پڑھنے والوں کو نماز سے تو نہ روکا جائے، اس لئے کہ اس کو ڈر ہوتا ہے کہ ایسا کہنے سے مسلمان میں مقابلے کی طاقت ابھر آئے گی اور پھر اس کی خیر نہیں۔ اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس عمل کی صورت تو قایم رہے، اور مسلمان کو اطمینان رہے کہ اس کا عمل جاری ہے مگر اس کی روح نکل جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ وہ عمل خود چھوٹ جائے گا بے روح کا جسم کب تک رہ سکتا ہے، لوگ اس سے جلدی اکتا جاتے ہیں، جس درخت کی زندگی اور شادابی ختم ہوگئی ہو وہ کب تک کھڑا رہ سکتا ہے، اور باغ کا مالک جس نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے یا اس کے بزرگوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا، زیادہ دن اس کو کھڑا دیکھ نہیں سکتا، اصل میں روح کا نکل جانا یہ فنا کا پہلا قدم ہے، دوسرا قدم یہ ہے کہ اس کی شکل بھی غائب ہو جائے، پہلی امتوں میں یہی ہوا ہے کہ پہلے احکام کی روح نکلی پھر ان کی ظاہری شکل و صورت بھی ختم ہوگئی اور مذہب کے صرف کچھ مٹے مٹے سے دھندلے دھندلے سے نشانات رہ گئے۔ جیسے کسی صحرا میں کوئی قافلہ ٹھیرا ہو، پھر چند دن ٹھیر کر روانہ ہوگیا ہو۔

پیغمبروں کی تعلیم اور ہدایت و صحبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کی عادات بھی عبادات بن جاتی ہیں، طبعی کام بھی عبادت کی نیت، ذہنیت اور کیفیت کے ساتھ ہونے لگتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ان کے آدمیوں میں کھانا کھاتے وقت عبادت کی جو کیفیات اور روح، خدا کی طرف دھیان، اور خدا کی معرفت و محبت میں ان کو جو ترقی ہوتی ہے وہ بگڑی ہوئی امتوں کے آدمیوں میں عین عبادت کی حالت میں بھی نہیں ہوتی۔ ان کی عبادت بھی محض ایک بے روح رسم، گانا بجانا اور تفریح اور کھیل کود رہ جاتا ہے، جس میں بعض اوقات نہ کوئی نیت ہوتی ہے نہ سنجیدگی، نہ عبادت کی روح نہ معرفت نہ محبت، ظاہر ہے کہ ایسی عبادت سے شیطان کو کیا شکایت ہو سکتی ہے اور اس کا زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

جس طرح پیغمبر کے اثر سے عادات عبادات بن جاتی ہیں، اسی طرح شیطان کے اثر سے عبادات عادات بن جاتی ہیں اور عادات میں تبدیلی، ترمیم ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ بالکل ترک بھی ہو جاتی ہیں، بعض پرانے مذہبوں میں یہی ہوا کہ اب ان کو مذہب کہنا مشکل ہے، وہ صرف ایک قوم کی معاشرت رسم و رواج اور ایک ملک کی تہذیب ہے جس میں بہت ردو بدل ہوا ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ یہ ہے اور یہ بھی بہت کاری ثابت ہوا ہے کہ وہ بڑی معصوم اور دین دار صورت بنا کر آتا ہے اور کسی خیر کو منع کرنے کے بجائے اس میں بے اعتدالی اور زیادتی پیدا کر دیتا ہے، قرآن مجید کی زبان میں اس کو "غلو" کہا گیا ہے۔ یہ اعتقاد میں بھی ہوتا ہے اور عمل میں بھی، پچھلی امتیں ان دونوں میں گرفتار ہو چکی ہیں۔ اعتقاد کا غلو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے کسی نیک بندے کو پیغمبر سے بڑھا دیا، اور پیغمبر کو خدا بنا دیا، بلکہ بزرگوں کو خدا کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ ہر امت میں شرک و بت پرستی کی ابتدا اسی غلو سے ہوئی، اور غلو کی ابتدا محبت اور عقیدت کی زیادتی سے ہوئی۔ جو چیز بھی اپنی حد سے بڑھ جائے گی اس کا انجام یہی ہوگا۔ اچھی سے اچھی غذا زہر قاتل بن سکتی ہے۔

یہودی اور عیسائی اور سچ پوچھو تو تمام پرانے مذہب اس غلو کا بری طرح شکار ہوئے۔ اور ہے یہ بھی بڑی میٹھی چھری، آخر محبت و عقیدت ہی کی تو ترقی ہوتی ہے، اور محبت و عقیدت کس کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر جب اس کی بنیاد مذہبی ہو۔ لیکن ظالم اسی میں اپنا کام کر جاتا ہے، اور محبت کو پرستش اور بزرگی کو خدائی ہی کے مرتبے پر پہنچا کر دم لیتا ہے۔ یہاں پر بس پیغمبروں ہی کی تعلیم حفاظت کرتی ہے، انھیں کی پیروی سے صحیح اعتقاد اور پورا اعتدال حاصل ہوتا ہے، جو اس سے ہٹا وہ بے اعتدالی کی خندق میں اوندھے منہ گرا۔ اور اس کی عقل، تجربہ، علم سب رکھا کا رکھا رہ گیا۔ سب عقل مندوں، علم والوں کا انجام دیکھ لیا، ایسی ایسی حماقتوں اور جہالتوں میں مبتلا ہوئے کہ الٰہی توبہ، کبھی انسان کو خدا بنا دیا، کبھی خدا کو انسان کے اندر اتار دیا، کبھی کسی کو خدا کا بیٹا بتایا، کبھی خود اپنے منہ میاں مٹھو خدا کے بیٹے اور لاڈلے بن گئے۔ غرض ایسی باتیں کیں کہ بچوں کو ہنسی آئے، دوسری طرف دیکھو تو پڑھے لکھے، بڑے فلسفی، بڑے حساب داں، بڑے شاعر اور ادیب لیکن مذہب کی سمجھ بچوں سے بھی کم۔ اس سے تو یہی معلوم ہوا کہ سیدھا راستہ پیغمبروں کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، اور ان کی رہنمائی کے بغیر عقل صحیح طور پر کام نہیں کرتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی زبان سے کہلوایا ہے:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔ —— سب تعریف اور شکریہ خدا کا ہے جس نے ہمیں یہ راستہ سمجھایا، اگر وہ نہ سمجھاتا تو ہمیں خود کبھی نہ سوجھتا بے شک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق لے کر آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب امتوں کا انجام تھا، اور آپ آخری طور پر توحید کو قائم کرنے آئے تھے، اس لئے آپؐ نے اس غلو کے دروازے کو بالکل بند کر دینا چاہا، جس سے شرک و بت پرستی گھس آتی ہے۔ آپؐ نے خود اپنی ذات کے متعلق صاف صاف فرما دیا کہ دیکھو مجھے ایسا بڑھانا چڑھانا نہیں جیسا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو بڑھا چڑھا دیا ہے، جب ہم آپ کی عمر کے تھے تو مسدس حالی کے توحید کے اشعار ہم کو بڑے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اور ہم ان کو مزے سے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ توحید کا مضمون ہوتا ہی ہے بڑا میٹھا، اور ہمارا اب بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اگرچہ آپ کو یہ شعر یاد ہوں گے، مگر ہم بھی آپ سناتے چلیں:۔

وہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق

اُسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ
ہمیشہ اُسی پر بھروسہ کرو تم اُسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اُسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اُسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اُس کی خدائی
نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی
نصاریٰ کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رُتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سر فگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اُس کا بندہ
بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

یہ تو ہوا اعتقاد کا غلو، عمل کا غلو یہ ہے کہ ایک بات جو سیدھی سیدھی تھی جس طرح آدمی کا جی چاہے کرے، جس وقت بن پڑے، اور جس طرح بن پڑے کرے۔ اس میں شاخیں نکالنا، اور اپنی طرف سے اس کا ایک پورا قانون بنا دینا، اس کو شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" کہتے ہیں، مثلاً نفل نماز بڑی اچھی چیز ہے مگر وہ وقت نہ ہو تو آدمی بڑے شوق سے پڑھے، لیکن اس کے لئے کسی جگہ کی تخصیص، وقت کی تخصیص، لباس کی تخصیص، سورتوں کی تخصیص وغیرہ وغیرہ۔ اب چلا ایک طومار جس کی کوئی سند نہیں، اور جو اس طرح نہ کرے وہ گنہ گار قابلِ ملامت اس طرح ہزاروں بدعتیں نکل آئیں اور ایک دوسرا مذہب تیار ہو گیا۔ جس کی فقہ الگ، جس کی شریعت الگ۔

بدعت کے ذریعے شیطان کا بڑا کام ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ انسان کا بنانے والا ہے، وہ اس کی طاقت، کمزوریوں اور گنجائش سے پوری طرح واقف ہے وہ انسان کے پیمانے اور ظرف کے مطابق قانون اور احکام دیتا ہے جس کے متعلق انسان کو کبھی شکایت نہیں ہو سکتی کہ یہ میری طاقت سے زیادہ یا میری ضرورت سے کم ہے۔ لیکن بدعت ایجاد کرنے والوں کو اس سے کیا بحث کہ انسان کر سکے گا یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ دین کی ایک حد ہے اور دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آخری حد تک پہنچ گیا اور مکمل ہو گیا۔ بدعات کی کوئی حد نہیں، ہر روز ایک نئی چیز نکل سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدعات جمع ہو کر انسان کی قوتِ برداشت سے بڑھ جاتی ہیں، اور جیسا کہ کہتے ہیں "آخری تنکا اونٹ کی کمر توڑ دیتا ہے"، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سب کچھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور ان غیر ضروری چیزوں کے پیچھے ضروری چیزیں بھی چلی جاتی ہیں۔ پچھلی اُمتوں میں ایسا بہت ہوا ہے، اور غور سے دیکھو گے تو موجودہ مسلمانوں میں بھی دعملی

کا کہیں کہیں یہ سبب ملے گا، کہ جس پورے مجموعے کو دین سمجھا جاتا ہے وہ تو ہو نہیں سکتا، اس لئے سب کو خیر باد! عیسائیت تو اسی میں تباہ ہوئی، اور سچ پوچھو تو دنیا اسی میں تباہ ہوئی۔ یورپ نے عیسائیت کو چھوڑا اس لئے کہ وہ اگر اس کو لے کر بیٹھتا تو دنیا کا کوئی کام نہ کر سکتا، مذہب تھا یا رسموں اور بدعتوں کا ایک طومار! اس نے اس عیسائیت کو تو دونوں ہاتھوں سے سلام کیا، اور سیدھے سیدھے خالص دنیا داری اور مادہ پرستی کا راستہ اختیار کیا، وہ تھا ہماری بدقسمتی اور مسلمانوں کی کوتاہی سے دنیا کا پیشوا اور لیڈر، بس ساری دنیا اس کے پیچھے آنکھ بند کر کے مادیت اور دنیا پرستی کے راستے پر ہو لی۔ اس لئے ہم نے یہ کہا کہ ان بدعات نے ساری دنیا کو تباہ کیا۔

شیطان کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ پیغمبروں کے جانشینوں کو خراب کرتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کے اصلی حریف ہیں، پیغمبروں ہی کے ہاتھوں وہ زک اٹھاتا ہے اور شکست کھاتا ہے، ان سے تو وہ انتقام لے نہیں سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت ہوتی ہے، لیکن وہ ان کے بعد سارا غصہ ان کے جانشینوں پر اتارتا ہے اور دین کے عالموں سے پورا پورا بدلہ لیتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، یا تو ان کو دین میں تحریف کرنے یعنی دین کے احکام کا مطلب بدل دینے یا بالکل شکل تبدیل کر دینے پر آمادہ کر لیتا ہے، جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کثرت سے ہوا۔ یا کم سے کم ان کو خاموشی پر آمادہ کر لیتا ہے کہ وہ کسی چیز پر روک ٹوک نہ کریں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور کوئی کہنے والا نہیں ہوتا کہ غلط ہو رہا ہے، آخر رفتہ رفتہ ہر غلط چیز مستند بن جاتی ہے اور مذہب یا زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ علماء میں وہ مال و دولت یا جاہ و عزت کا شوق اتنا پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر صحیح و غلط حکومت میں اقتدار پیدا کرنے کے لئے مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اہل دنیا اور اہل حکومت کی خوشامد اور تعریف کی ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے، اور جن لوگوں کا کام زمانے کو اپنے ساتھ لے چلنا ہوتا ہے وہ لوگوں کا اشارہ دیکھ کر بات کرتے ہیں۔ اور ان کا کام ہر صحیح و غلط چیز کے لیے دلیل فراہم کرنا اور سند دینا رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین بالکل لاوارث بن جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اہل غرض اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، عیسائیت کا حشر یہی ہوا، قسطنطین نے پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کی مدد سے عیسائیت کا چولہ ہی بدل دیا۔ اور اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر دیا۔ جس سے حضرت مسیح کو کچھ بھی تعلق نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ مسلمان پچھلی امتوں کے قدم بقدم چلیں گے، اس لئے اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کا پورا امکان اور خطرہ ہے کہ یہ سب منزلیں مسلمانوں کو بھی پیش آئیں، اور ان کو بھی شیطان کے ان حملوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اب یہ آپ کی واقفیت کا امتحان ہے کہ آپ دیکھیں کہ کہاں کہاں اس کے حملے کارگر ہوئے، اور کس کس طرح اللہ تعالےٰ نے اس دین کی حفاظت کی جس سے اس کو قیامت تک کام لینا ہے۔ اور

## ہمارے فرائض کیا ھیں؟

(مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی)
("الحسنات" رسالت نمبر)

# ہماری نظر میں

**سیدالبشر** "سیدالبشر" از :۔ قاضی محمد سلیمان منصورپوری مرحوم ضخامت ۹۶ صفحات، دیدہ زیب طباعت، نظرافروز کتابت، قیمت ایک روپیہ ــــ ملنے کا پتہ :۔ ۱۲/ جودھ پور بلڈنگ ہمارشنٹر روڈ، رام سوامی کراچی ــــ

دو کتابیں اُردو ادب کا سرمایۂ سعادت و افتخار ہیں، علامہ شبلی نعمانی کی "سیرۃ النبیؐ" اور مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری کی "رحمۃ للعالمین" ــــــــ یہ دونوں کتابیں "سیرت" کے موضوع پر اُردو زبان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، "سیدالبشر" بھی انھی قاضی محمد سلیمان منصورپوری کی اُن تقریروں کا مجموعہ ہے، جو ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول امرتسر میں قاضی صاحب مرحوم کی زبان سے سُنی گئیں، اور اب ان تقریروں کو قاضی ابوالفضل حبیب الرحمٰن صاحب طارق نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔

"سیدالبشر" میں حضرت ختمی مرتبت فخرِ موجودات سیدالاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مقدس زندگی کے حالات انتہائی آسان، سہل اور عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہیں، قاضی صاحب مرحوم کو رسالتِ مآب کی ذاتِ گرامی سے رسمی عقیدت نہیں عشق تھا، اور یہی عشقِ نبی اور حُبِ رسُول اُن کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے، دین و دُنیا کی یہ سب سے بڑی سعادت ہے جو قاضی محمد سلیمان منصورپوری کو نصیب ہوئی، اُن کا قلم "البرامکہ" اور "ابن رُشد" بھی لکھ سکتا تھا، مگر عجم کی مدح کی بجائے اُنھوں نے سیدالعرب والعجم کی مدحت سرائی اور سیرت نگاری کو اپنا موضوع بنالیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب مرحوم کی تقریروں کے ترتیب دینے والے سے کہیں کہیں جُملوں کی ترکیب اور لفظوں کی ترتیب میں تسامح ہوگیا ہے۔ ۔ ۔ مثلاً (صفحہ ۶۶) "لیکن آپؐ دنیا کے لئے رحمت ہو کر آئے تھے، یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ آپؐ کسی کو بُری نظر سے دیکھتے؟" یہاں "بُری نظر" میں ذم کا ایک پہلو پایا جاتا ہے، کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ان لفظوں کو ضرور بدل دینا چاہیئے۔ (صفحہ ۸۵) "حج کے ارکان سے فارغ ہو کر حضُورؐ نے معہ صحابہ مدینہ منورہ کی طرف مراجعت فرمائی" ــــــ "معہ" کی جگہ "صحابہ کے ساتھ" ہوتا تو جملہ کا یہ جھول نکل جاتا۔

قاضی محمد سلیمان منصورپوری شعر بھی کہتے تھے سلمان تخلص تھا، اس کتاب کے شروع میں ندائے سلمان کے عنوان سے ایک "حمد" درج ہے جس کا ایک شعر ہے :۔

تقدیرِ کبریا کی، تقدیس ذوالمنن کی
دقتِ کرب پُکارو، حینِ دُعا پُکارو

اس میں "کرب" کی "ر" جو ساکن ہے اُسے متحرک نظم کیا گیا ہے، قاضی صاحب کی نظمیں اگر آئندہ شائع کی جائیں تو ناشرین اور مرتبین کو چاہیئے کہ اُن کا انتخاب کرلیں۔

## شرار وگل

"شرار وگل" ——— پرواز جعفری کے منتخب اشعار، ضخامت ۴۸ صفحات، خوبصورت جیبی سائز، مجلد شاعر کی تصویر کے ساتھ، رنگین گردپوش، چکنا کاغذ، قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور۔

جناب مشتاق آخگر نے حضرت پرواز جعفری کے اشعار منتخب اور مرتب کرکے "شرار وگل" کے نام سے شائع کئے ہیں، اس کتابچہ کا آغاز شاعر کے "تعارف" سے ہوتا ہے، یہ "تعارف" مشتاق آخگر صاحب نے لکھا ہے اور گنتی کی چند سطروں میں زبان وبیان کی بہت سی غلطیاں ملتی ہیں، فرماتے ہیں ——— "حضرت فرید جعفری (جو آجکل لندن میں ہیں) پرواز کے بڑے بھائی ہیں، جن کی ادبی سرگرمیوں کی آنچ محسوس کرنے سے پہلے ہی سید زبیر ——— پرواز ہوگئے" ——— "ادبی سرگرمیوں کی آنچ محسوس کرنا" کس قدر غیر ادیبانہ طرزِ نگارش ہے ——— اور آگے چلئے ——— "آج پرواز کی نظر بالغ اور فکر جوان ہے وہ شہر کی بلندی سے آبادی کے حسین ہنگامے کو دیکھ کر، ویرانے کے مہیب سناٹے کو سوچتا ہے" ——— یہ آخرت کیا ہوئی؟ اور "ویرانے کے مہیب سناٹے کو سوچنے" کی تو داد نہیں دی جا سکتی ———

"پرواز زندگی کی قدروں کا محرم اور مزاج داں ہے اُس کا احساس ملائم، تجربہ پختہ اس کی شاعری شعلہ وشبنم کا احسن ترین امتزاج ہے" ——— کہنا چاہیئے تھا "احساس نازک" اور کہہ گئے "احساس ملائم" ——— "احسن ترین امتزاج" فریاد کررہا ہے کہ مجھے "حسین ترین امتزاج" سے بدل دو ——— تعارف نگار نے مجنوں گورکھپوری کا جو قول نقل کیا ہے اُس میں "کڑے سے کڑتر" پڑھ کر وجدان نے اذیت محسوس کی۔

اس تعارف کے بعد جناب ناصر کاظمی مُدیر "اوراق" نے چند صفحے تحریر فرمائے ہیں، جس کا کوئی عنوان قایم نہیں فرمایا، سرِ مضمون پر نشانِ استفہام (.. .. .. ؟) بنا دیا ہے اس "پیش لفظ" کا یہ عالم ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

"اس کتاب کے اشعار لمحاتِ فرصت کے عارضی لیکن شدید احساسات کے تاروں کو اس طرح جھنجھناتے ہیں جیسے سرِ شام ہوا کا ایک لطیف جھونکا بیتے جگنوں کی اَن گنت یادیں اور اُن کے محبوب سائے لے آتا ہے .. .. .." ———

"لمحاتِ فرصت کے شدید احساسات کے تار" پھر اُن کا "جھنجھنانا" اور "سرِ شام ہوا کے لطیف جھونکے کا بیتے جگنوں کی اَن گنت یادوں اور اُن کے محبوب سایوں کو لے آنا" ادب وانشا کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ ——— اور جہاں ایک طرف ہماری روایات اور دوسرا سرمایہ جل کر راکھ ہوچکا ہے" ——— اس "دوسرے سرمایہ" کا اشارہ آخر کس طرف ہے، یہ کیا طرزِ نگارش ہے کہ جس لفظ کو جہاں چاہا رکھ دیا، آخر عبارت کے سیاق وسباق، جملے کی ترکیب لفظوں کے توازن اور مفہوم میں کوئی ربط تو ہونا چاہیئے!

"غزل دلوں کی شدید اور ذاتی کیفیات کی ترجمان ہے ——— جس کی سب سے بڑی کیفیت اس کا موسیقانہ بہاؤ ہے" ——— اس "موسیقانہ بہاؤ" کی کہاں تک تعریف کی جائے ——— اور سُنئے "ذہنِ شاعر خواہشات اور عقاید کی اَن تھک مشین ہے، جو رسم ورواج کی فرسودہ راہوں میں غیر ترقی پذیرانہ تسکین نہیں محسوس کرسکتا ہے بلکہ اپنے ذاتی تجربات محرکات اور داخلی احساسات کے ساتھ ساتھ محبت کی دُور رس اخلاقی ذمہ داریوں کو نہیں

بھولتا۔ ۔ ۔" اس انکشاف پر ابنِ رشیق، حالی اور شبلی کی روحیں جھوم جھوم اٹھی ہوں گی کہ "ذہنِ شاعر خواہشات اور عقاید کی اَن تھک مشین ہے۔" پورا مضمون لفظوں کے اسی گورکھ دھندے اور ذہنی اُلجھاؤ کی نذر ہو کر رہ گیا۔
حیرت وافسوس کا مقام ہے کہ اس قدر ناپختہ تحریریں کتابوں میں "پیش لفظ" اور "تعارف" کی حیثیت سے شائع کی جاتی ہیں ——— !!

"شرار وگل" میں اس قسم کے دلکش اشعار ملتے ہیں:۔

دل کی دھڑکن میں کچھ کمی نہ ہوئی — سُن رہا ہوں سُنی ہوئی آواز
گردشِ ایام تیرے ساتھ ساتھ — ایک تنہا بس ہمیں ہم رہ گئے
تھی قیامت آپ کی پہلی نظر — بعد کی ہر چوٹ تو ہم سہہ گئے
دو گھڑی اور بھی رہے ہوتے — منھ اندھیرے چلے گئے ہوتے
سُنا ہے گردشِ افلاک کا ہے مجھ پہ کرم — مگر مجھے تو ستاروں کا اعتبار نہیں
خرامِ کواکب میں وہ لوچ کب ہے — جو ذرّوں میں ہے اک رمِ دلبرانہ
غم میں غم ہی ہوا شریکِ حیات — درد ہی درد آشنا نکلا
لے شمعِ محبت، غمِ فرقت کو دعا دے — احساس کی لو آج ذرا تیز ہوئی ہے

دوسرا رُخ:۔

کسی کی یاد میں تم کو بھی رونا آگیا آخر — مبارک ہو کہ تم نے بھی مذاقِ چشمِ تر جانا!

مصرعِ ثانی میں شدید ابہام پایا جاتا ہے، کچھ نہیں کھلتا کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے، اس "مذاقِ چشمِ تر جانا" نے شعر کے حلیہ کو بگاڑ دیا ——— محبوب کو کسی کی یاد میں رونا آگیا اور اس طرح اُس نے چشمِ تر کے ذوق کو جان اور پہچان بھی لیا ——— تو "مبارکباد دینے" کا یہاں آخر کیا محل ہے؟

رُخِ پُر نور پہ چھائی رہی زلفوں کی گھٹا
اور بھیگی ہوئی برسات نے دم توڑ دیا

دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نہیں ہے! رُخِ پُر نور پر زلف کی گھٹا اگر چھائی ہوئی رہی تو بھیگی ہوئی برسات نے آخر دم کیوں توڑ دیا؟ "برسات کا دم توڑ دینا" بھی بہت کچھ محلِ نظر ہے، شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کے رُخِ روشن پر زلفوں کی گھٹائیں دیکھ کر برسات یا برسات کی رات شرما گئی، اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو اس خیال کے اظہار کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، وہ نادرست اور ناموزوں ہے! "بھیگی ہوئی برسات" بھی عجیب ترکیب ہے کیا برسات خشک بھی ہوا کرتی ہے۔

وہ اُلٹتے اگر نقابِ جمال — کتنے گمراہ قافلے ہوتے

شعر سے یہ مفہوم مترشح ہوتا ہے کہ وہ اگر رُخ سے نقاب اٹھا دیتے تو جانے کتنے قافلے اپنی راہ بھول جاتے! مگر یہاں "قافلے" کا لفظ اجنبی اجنبی سا لگتا ہے "دلوں کے قافلے" کہا جاتا تو یہ ابہام دُور ہو جاتا۔

تیری تصویر میں اک عکس نمایاں ہے مرا
میں ترے حسن میں ہو جاؤں گا اک دن تحلیل

"حُسن میں تحلیل ہو جاؤں گا" یہ اندازِ بیان وِجدان کو تشویش میں ڈال دیتا ہے اور پھر غزل کی طبعِ نازک پر لفظ "تحلیل" کی گرانی بھی بار گزرتی ہے۔

پھر محفلِ انجم میں ہوا میرا گزر آج　　　پھر شام ہوئی نکلے چلے آتے ہیں آنسو

مصرعہ ثانی میں جو نغمگی پائی جاتی ہے اُس کے اعتبار سے "نکلے چلے آتے ہیں" میں صوتی آہنگ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

جب مرے احساس کے تاروں کو نیند آئی نہ تھی
حاصلِ ہستی وہی گزرے ہوئے لمحات ہیں

"احساس کے تاروں کو نیند نہ آنا" میں ضرورت سے زیادہ تکلف پایا جاتا ہے اس لئے طبیعت اس شعر کو پڑھ کر یا سُن کر کوئی اثر قبول نہیں کر سکتی۔

جناب پرواز جعفری کے کلام کی خصوصیت شدّتِ احساس ہے، یقین ہے کہ اُن کا زیر طبع مجموعہ کلام "رگِ ساز" ——— سخن سنج طبقہ اور اربابِ نظر کے ذوق کی پذیرائی زیادہ اچھے انداز میں کر سکے گا۔

## اقبال اور پاکستان

"اقبال اور پاکستان" از:- مُسلم (مدیر بصیرت) ضخامت ۱۵۰ صفحات، لکھائی چھپائی عمدہ، چکنا کاغذ، مجلّد گرد پوش کے ساتھ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- اُردو بک اسٹال بیرونِ لوہاری دروازہ، لاہور! علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا، اقبال نے اپنے کلام میں دینِ فطرت کی حکمت پیش کی تھی، اس چیز نے کلامِ اقبال کی وسعتوں کو بے پایاں اور نا محدود بنا دیا، یہ کتاب بھی اقبال کی بارگاہ میں عقیدت و ستایش کا پُر خلوص ہدیہ ہے ——— مگر صرف "ہدیہ" ہی نہیں مسلمانوں کے لئے ہدایت نامہ بھی!

فاضل مُصنف نے تاریخی حوالے دے کر بتایا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے "جُداگانہ ریاست" کا تصور سب سے پہلے اقبال نے پیش کیا، اور یہی تصور پاکستان کی بُنیاد ہے۔۔۔ پھر اقبال نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح مرحوم کو خط لکھا کہ شمالی مغربی ہند بلکہ غالباً تمام ہندوستان میں ایک سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے آپ ایسی حالت میں مسلمان قوم کی رہنمائی فرمائیں ——— اقبال کا تصور، جناح کی رہنمائی، مطالبۂ پاکستان پر قوم کی "صدائے لبیک" اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم، پاکستان وجود میں آ گیا۔

ایک ڈاکٹر جیلانی برق ہیں جنھوں نے اسلام اور قرآن کو مسخ اور محرّف کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے کہ جو خود اپنے اور دوسروں کے جس نظریہ کو چاہتے ہیں "اسلام" بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور ایک جناب مسلم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی فہم عطا فرمائی ہے اور یہی دینی فہم اور اسلامی بصیرت اس کتاب میں جگہ جگہ جھلکتی ہے۔

"اقبال اور پاکستان" میں مصنف نے علامہ اقبال کے اشعار و اسلامی تصورات کی شرح کی ہے جو خود اپنی جگہ ایک مستقل سلسلۂ مضامین بن گیا ہے، ان مضامین میں ربط و تسلسل اور خرد آگہی کے علاوہ لکھنے والے کا دلی خلوص، اسلام سے عقیدت، رسول ؐ سے محبت اور دین سے وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ، یورپ اور روس کے جمہوری اور معاشی نظریے زندگی سے بہت دُور ہیں اُن میں تنگ نظری اور فطرت کے خلاف داعیات پائے جاتے ہیں، زندگی کا صحیح اور کامل ترین تصور ہی

نہیں بلکہ "حل" اسلام پیش کرتا ہے جس کے مقابلہ میں دُنیا کا کوئی باطل تصوّر اور کافرانہ نظام نہیں ٹھیر سکتا۔

مصنّف نے اچھی ہی نہیں سچی بات کہی ہے کہ گاندھی جی جن کا نصب العین "اہنسا" تھا، اُنھوں نے بھارت کو کشمیر پر چڑھائی کرنے کی اجازت دے کر خود اپنے "عدم تشدد" پر تشدد کیا ـــــــ یہ بات تو صرف نبیوں اور رسولوں ہی کی زندگی میں ملتی ہے کہ شروع سے لیکر آخر تک اُن کے پیام، تعلیم، نصب العین اور پروگرام میں کمال درجہ کا ربط، توافق اور انتہائی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ـــ

"اقبال اور پاکستان" کے شروع میں مصنّف کا قلم رُک رُک کر چلا ہے، مگر آگے چل کر روانی پیدا ہوگئی ہے ـــــــ (صفحہ ۸) "ہندوستان کے فرزندانِ توحید نے ترکوں کے پاؤں کو غلامی و محکومی کی نوساختہ زنجیروں سے مامون و مصئون رکھنے کے لئے دار و رسن کے لئے اپنی گردنیں پیش کیں اور اپنا خون بدیں وجہ نذرِ خلافت کیا کہ شاید وہ ترکی کے مریضِ سخت جان کے سنبھالے کا سبب بن سکے" ـــــــ "مامون اور مصئون" یہاں وجدان کو اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ـــــــ "بدیں وجہ نذرِ خلافت کیا" اس میں "بدیں وجہ" عدالتوں کے حکناموں اور قانونی دستاویزوں کی زبان کا انداز ہے۔ "سنبھالا" بھی یہاں غلط استعمال ہوا ہے۔ "افاقہ" کا محل تھا۔

(صفحہ ۹) "اُنہوں نے کانگرس کے آئینی پیکر میں بہار کی رُوح پھونکی" ـــــــ "بہار کی روح" یہاں بےجوڑ ہے، لکھنا اس طرح چاہئیے تھا "کانگریس کے آئینی پیکر میں روحِ عمل پھونکی" (صفحہ ۴۸) "ہندی مجالس کا آغاز ٹیگور کے کلام یا عندلیبِ ہند نائیڈو کے کسی نغمے سے نہیں ہوتا" مسز نائیڈو کا خطاب "بلبل ہند" تھا، "عندلیبِ ہند" نہ تھا اور لقب، خطاب اور کنیت میں تصرّف درست نہیں چاہے وہ تصرّف اور تبدیلی معنوی اعتبار سے غلط نہ ہو ـــــــ (صفحہ ۵۳) "ان کی نگاہِ مومنانہ کا شاہکار ہے" قواعد کے اعتبار سے یہ لفظ "مومنانہ" غلط نہیں ہے مگر چونکہ بولا نہیں جاتا اس لئے کانوں کے لئے نامانوس سا ہے ـــــــ

علامہ اقبال نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اپنے نونہال جاوید کے نام ایک وصیت تحریر فرمائی تھی، جس میں لکھا تھا:۔

دینی معاملہ میں، میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقاید میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکانِ دین میں سے نہیں ہیں سلفِ صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو بھی میرا مشورہ یہی ہے وہ اسی راہ پر گامزن رہے ـــــــ (صفحہ ۷۳)

اللہ تعالیٰ اقبال کی قبر کو اپنی رحمت کے سدا بہار پھولوں میں چھپا دے کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں! مگر ایک وہ صاحب جو اقبال کا اپنے کو سب سے بڑا مفسّر بلکہ "مظہر" سمجھتے ہیں، اُن کا آج کل مشن ہی یہ ہے کہ "سلفِ صالحین" کا استہزا کریں، اُن کا مذاق اڑائیں اور اُن کی راہ سے الگ ہو کر نئی راہ نکالیں۔

لائق مصنّف نے جن کو علامہ اقبال کے کلام، مضامین، حالاتِ زندگی، تصوّرات اور معتقدات سے ایک گونہ ابدا اور آگہی ہے، یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اقبال صرف "قرآن" کے قائل تھے وہ غلط کہتا ہے، اقبال قرآن کے ساتھ احادیثِ نبوی کے بھی ماننے والے تھے!

(۳) حضرت زید رضؓ از:- صلاح الدین احمد ندوی ضخامت ۳۰ صفحے، قیمت چار آنہ

(۴) حضرت ابوہریرہؓ از:- احتشام علی ندوی ضخامت ۴۰ صفحے، قیمت پانچ آنہ

ادارۂ تعلیماتِ اسلام قابل صد مبارکباد ہے کہ اُس نے مشاہیر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقدس حالات خوبصورت کتابچوں کی صُورت میں پیش کئے ہیں، زبان اتنی سلیس اور سادہ ہے کہ چھوٹے بچے اور معمولی لکھی پڑھی عورتیں بھی استفادہ کر سکتی ہیں، پھر لکھنے والوں نے واقعات کو تاریخ و سیر کی مستند کتابوں سے اخذ کر کے ترتیب دیا ہے، مسلمان گھرانوں میں ان کتابوں کے پہونچائے جانے کی سخت ضرورت ہے، یہ مقدس نفوس اسلامی تاریخ کے " HEROES " ہیں، ان کی زندگیوں میں ہمارے لئے ہدایتیں، نصیحتیں اور برکتیں ہیں

مسلمانوں کی نئی پود فلمی لٹریچر اور رومان زدہ ادب کی خوگر ہوتی جا رہی ہے، ہم نے اچھے خاصے گھرانوں میں رسالہ "شمع" اور "چترا و بجلی" کے فلمی سوالات اور جوابات کے چرچے سُنے ہیں، کچھ دن اور اسی حالت میں گزرتے رہے تو دل و دماغ میں جاہلیت رچ جائے گی اور اسلامی تہذیب کے رہے سہے آثار بھی باقی نہ رہیں گے، ضرورت ہے کہ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے!

(۵) اسی مکتبہ نے جمال الدین افغانی کی سوانح حیات بھی اسی جیبی سائز پر شائع کی ہے سجاد علی صاحب ندوی اس کے مُصنف ہیں، ضخامت سولہ صفحے، اور قیمت صرف دو آنہ، یہ پانچوں کتابیں ادارہ تعلیماتِ اسلام ۱۰/۲۹ مارٹن روڈ، کراچی نمبر ۵ سے ملتی ہیں۔

## دلچسپ کہانیاں

(۱) "فریبی چڑیا" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۲) "بلی کی توبہ" ضخامت ۱۶ صفحے قیمت دو آنہ (۳) "چاند کا پل" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ۔ (۴) "دل کی خوشی" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۵) "بدھو کمہار" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۶) "نقلی جادوگر" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۷) "چور کمپنی" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۸) "افیم کی شہزادی" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۹) "سچا قاتل" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ (۱۰) "خوفناک بنگلہ" ضخامت ۱۶ صفحے، قیمت دو آنہ، ملنے کا پتہ:- (۱) ریاض بک ڈپو بھلوال اور (۲) نیاز بک ڈپو تعلیمی بازار سرگودھا۔

یہ دسوں کتابیں جناب فیض لودھیانوی کی لکھی ہوئی ہیں، "دل کی خوشی" میں بچوں کے لئے ہلکی پھلکی ہنسانے والی دلچسپ نظمیں ہیں ـــــ "نقلی جادوگر" ایک انگریزی کہانی کا آزاد ترجمہ ہے اور "بلی کی توبہ" بھی ایک فارسی کہانی ہے جسے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے، باقی تمام کہانیاں فیض لودھیانوی کے ذہن رسا کی تخلیق ہیں۔

(۱) افیم کی شہزادی (صفحہ ۱۰) "کہ پتھروں کو بھی وجد آ جائے" کیونکہ یہ کتاب چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے لفظ "وجد" اُن کی فہم سے بہت اونچا ہے، اس طرح لکھنا چاہیے تھا، "کہ پتھر بھی جھوم جھوم اٹھیں" ـــــ (صفحہ ۱۶) "اسی وقت ایک پودا پھوٹ پڑا" ـــــ "اُسی وقت ایک پودا اُگ آیا" زیادہ صحیح ہے!

(۲) "چور کمپنی" (صفحہ ۱۳) "ماں دھوکا کھا گئی تو بھولی بھالی نو عمر لڑکی کا کیا تھا؟" ـــــ یوں لکھنا چاہیے

تھا۔ ماں دھوکا کھا گئی تو بھولی بھالی لڑکی کیا چیز تھی"[1]؟

(۳) فریبی چڑیا (صفحہ ۱۲) "جھوٹا شکار" کو "جوٹھا شکار" لکھا ہے، شاید یہ کتابت کی غلطی ہو۔

(۴) "خوفناک بنگلہ" (صفحہ ۴) "وہ بڑا حوصلہ کرکے پندرہ ہزار روپیہ کا مول ڈالتا تھا"۔ "مول لگاتا تھا" روزمرہ ہے ۔۔۔ (صفحہ ۶) "کمزور لوگوں کے اپنے وہمات ہوتے ہیں" ۔۔۔ یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے، "توہمات" کی "ت" کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم کی نذر ہوگئی مگر چھوٹے بچوں کے لئے "توہمات" بہت مشکل لفظ ہے!

(۵) "دل کی خوشی" میں جو نظمیں ہیں، ان میں ظرافت کا رنگ ذرا زیادہ گہرا ہوگیا ہے، "کھلاڑی کوا" سب سے اچھی نظم ہے اس میں شعریت بھی ہے ۔۔۔

(۶) "سچا قاتل" (صفحہ ۵) "لیکن نیلامی کے وقت خدا جانے وہاں کیا مصیبت نازل ہوئی" صرف "نیلام" لکھنا چاہیے تھا۔ AUCTION "کو نیلام" کہتے ہیں، ہاں جو مال نیلام ہوتا ہے اُسے "نیلامی مال" بولتے ہیں ۔۔۔ (صفحہ ۵) "رسمی تو تکار کے بعد نوبت ہاتھا پائی تک جا پہونچی" "رسمی" بھی بچوں کیلئے مشکل لفظ ہے اور "تو تکار" مقامی لفظ ہے اُردو روزمرہ نہیں ہے، جملہ اس طرح ہوتا تو اچھا تھا "اور گالی گفتار کے بعد ہاتھا پائی کی نوبت آگئی" (صفحہ ۱۳) "ایک گرانڈیل نوجوان تھا" ۔۔۔ "ایک کڑیل نوجوان تھا" ۔۔ فصیح تر ہے "گرانڈیل" زیادہ تر طنز کے موقعوں پر بولا جاتا ہے۔

فیض صاحب کی کہانیاں بہرحال دلچسپ ہیں، زبان سادہ اور سلیس ہے اور کہانیوں کے خاکے بچوں کی نفسیات سے ملتے جلتے ہیں، بیان میں گھلاوٹ اور مٹھاس ہے، فیض صاحب کے اشہب خامہ کا رُخ اگر اسلامیات کی طرف ہوجائے تو وہ دین کی خدمت انجام دے سکیں گے اور بچوں کے دل میں اسلام کی عظمت اور جامعیت کا نقش بٹھا دیں گے۔

[1] یا اسی انداز کا کوئی جملہ ۔۔ (م ۔ ق)

# فاران
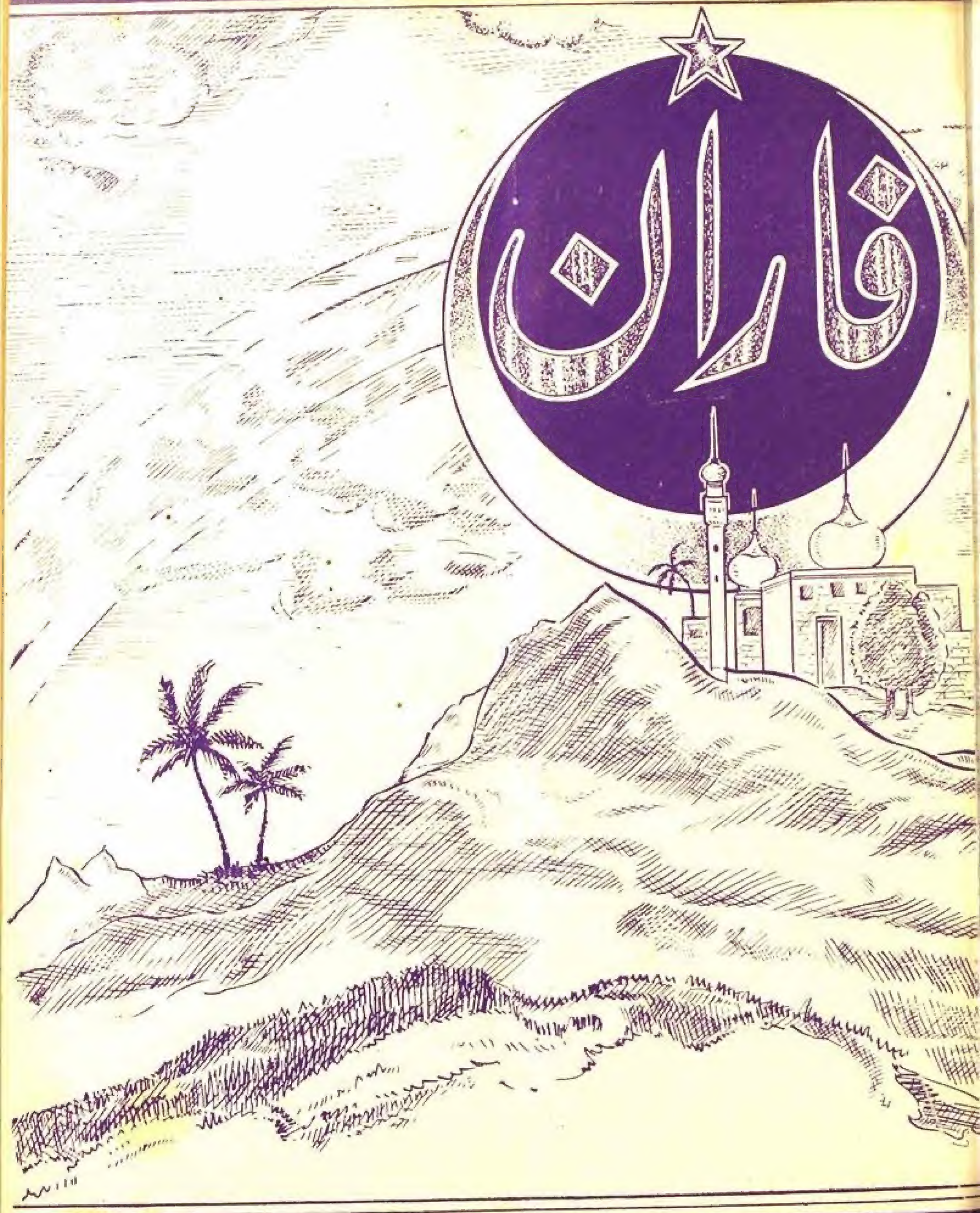
# قائد اعظم رح

کا ارشاد ہے :-

'' خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ عظیم‌الشان موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم ایک نئی مملکت کے معمار کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا اظہار کریں تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہم اس کام کے اہل ثابت نہیں ہوئے ''
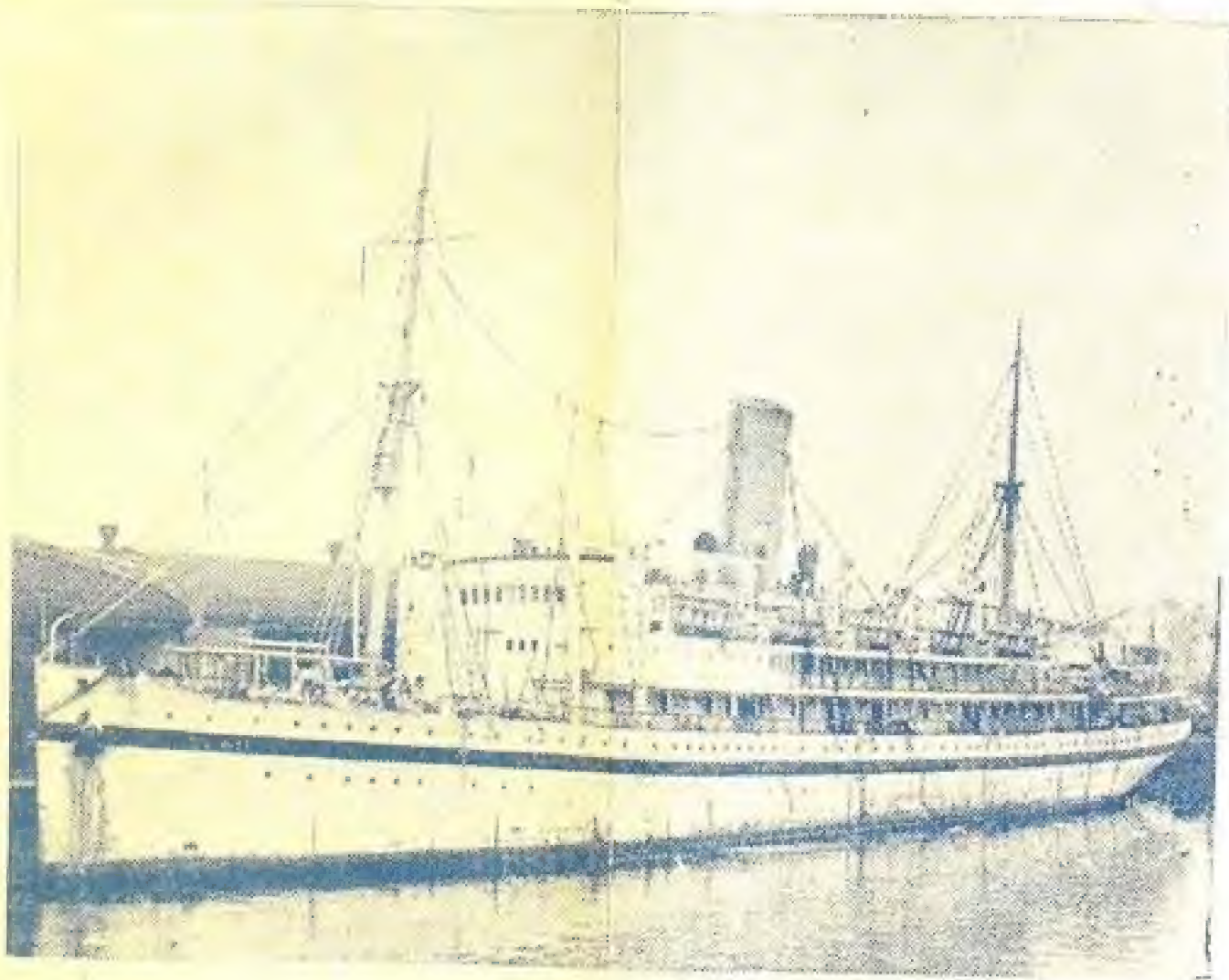
## پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

نے قائد اعظم کی خواہش کو کلی جامہ پہنانے کے لئے آٹھہ ہزار ٹن کا جہاز ''النیل'' خرید لیا ہے۔ یہ جہاز جسکی تصویر اوپر دی گئی ہے جرمنی میں تیار ہوا تھا

آپ بھی اس عظیم‌الشان قومی ادارہ کے حصہ دار بنیں

جاری شدہ سرمایہ ایک کروڑ روپیہ

فی حصہ ایک سو روپیہ

مطبوعہ لٹریچر اور فارم طلب فرمائیے

## پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

۴ بندوق والا بلڈنگ، میکلوڈ روڈ کراچی

جلد (۲) ——— شمارہ (۱۲)
ماہنامہ

# فاران

مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ——— فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) ——— فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر:- فاران کیمبل اسٹریٹ
کراچی ۱

## نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقشِ اوّل

اظہارِ شکر اور سپاس گزاری کا ایک وہ مقام بھی آتا ہے جبکہ پیشانی کے ساتھ دل ہی نہیں رُوح بھی سجدہ گزار ہوتی ہے اور ہم تشکر و امتنان اور سپاس و نیاز کے اُسی عالم میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل کی کوئی انتہا ہے کہ "فاران" کسی وقفہ کے بغیر زندگی کی دو منزلیں خیر و خوبی کے ساتھ طے کر چکا اور اب دوسری جلد کا آخری شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں ہے ——— ہماری اُمید سے بڑھ چڑھ کر نوازا گیا، توقع سے بہت زیادہ عنایت فرمائی گئی، ہمیں اسباب پر نہیں "مُسبّب" پر ناز ہے "اُس" کو منظور نہ ہوتا تو اسباب فراہم ہی کہاں سے ہوتے!

انسان ——— خاک کا پُتلا، جس کی زندگی سانس کے کمزور رشتہ سے وابستہ ہے، اس عالمِ کون و فساد اور جہانِ حوادث میں اُس بیچارے کی بساط ہی کیا ہے

کریں کیا اپنی ہستی کا یقیں ہم<br>
ابھی سب کچھ، ابھی کچھ بھی نہیں ہم

آدمی اپنی کوشش سے ایک سفید بال کو بھی سیاہ نہیں کر سکتا، اُس کی تمنّاؤں کے قصر اور آرزوؤں کے محل پانی کے بلبلوں کی مانند ہیں، پلک جھپکتے ہستی نیستی سے اور وجود عدم سے بدل جاتا ہے، انسان کی زندگی چھوئی موئی کی طرح ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ کمزور اور منفعل! مگر اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو اسی خاک کے پتلے میں وہ طاقتِ پرواز آجاتی ہے کہ مہ و پرویں اور زہرہ و عطارد اُس کی گردِ راہ بن جاتے ہیں، وہ دریا کی موجوں پر عصا مارتا ہے اور اُس کی ضرب سے دریا پھٹ جاتا ہے، وہ اُنگلی کا اشارہ کرتا ہے اور چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، بے جان کنکریاں اُس کے ہاتھ میں

بولنے لگتی ہیں! طاقتوں اور توانائیوں کا سررشتہ خالقِ کائنات کے دستِ قدرت میں ہے، وہ چاہے تو ہر چیز ممکن اور نہ چاہے تو ہر بات محال! تدبیرِ امر بھی وہی فرماتا ہے اور خود ہی کاتبِ تقدیر بھی ہے۔ عظمت و کبریائیِ خالقِ کائنات ہی کو زیبا ہے، ہر تعریف اور حمد و ستایش اُسی کی ذاتِ بے ہمتا کو سزاوار ہے، بندہ غرور کرے اور اِترائے تو آخر کس بات پر اِترائے! اُس بے چارے کے بس میں کیا ہے، اُس کی کوششوں کی اساس و نمود ہی کیا! یہ بات اپنی جگہ بے شک صحیح اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ "خالق" ہے اور بندہ "کاسب" ہے مگر بندہ کا کسب بھی اللہ کی مشیت کا تابع ہے۔

اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے کہ "فاران" صرف اُسی کے فضل و کرم کے بھروسہ پر نکالا تھا اور اُسی کی ناخدائی کے اعتماد پر ہولناک طوفان میں اس کمزور سفینہ کو ڈالا تھا، حالت یہ تھی کہ ہم بلبلوں اور قمریوں کو پکڑنے کے پھندے لیکر، شیر کے شکار کے لئے نکلے تھے ——— نیا ماحول، اجنبی فضا، دشوار راستے! لوگ ہمیں دیکھ کر ہنستے تھے کہ "آپ کو دیکھئے اور ماہنامہ کی ادارت کو دیکھئے۔۔۔" اس طنز و تبسم پر ہم جھنجھلائے نہیں، خفا نہیں ہوئے، ہم نے اپنا غم اپنے مالک و آقا سے بیان کیا کہ "مولا! تیرے نام کی عظمت سے "فاران" کا آغاز ہو رہا ہے، تو اپنے نام کی لاج رکھنا!" ——— اور آج ہم اُس کے نام کی عظمت کی قسم کھا کر کہہ رہے ہیں کہ اُس نے اپنے نام اور ہمارے کام کی لاج رکھ لی، جو کل ہنس رہے تھے آج حیران ہیں کہ یہ قطرۂ شبنم سورج کی کرنوں کے سامنے آخر کس طرح ٹھیرا رہا!

معبود اور کارساز کی کارسازی کے قربان جائیے کہ دو سال کی مدت میں ایک دن کے لئے بھی ہم پر "بیم و یاس" کا عالم طاری نہیں ہوا، اسباب خود بخود فراہم ہوتے چلے گئے، کوئی دشواری آئی بھی تو زیادہ دیر تک ہمارا راستہ روک کر کھڑی نہیں رہی، کام بنتا اور سلسلہ جڑتا ہی چلا گیا، قدم قدم پر اُس کے کرم نے ہمیں سہارا دیا اور منزل کے ہر موڑ پر اُس کی رحمت نے دستگیری فرمائی جس کی قدرت عرش و کرسی اور آسمان و زمین کو تھامے ہوئے ہے اُسی کی قدرت نے ہمارے دل کو بھی تھاما اور حالات کو سازگار بنایا۔

کسی انکسارِ نفس کے بغیر عرض ہے کہ خالقِ ارض و سمٰوٰت نے اپنے اُس ناکارہ اور عاجز بندہ سے کام لیا جو علم و عمل کے اعتبار سے تہی دامن ہے! تحدیثِ نعمت کے طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ بعض مضامین کو اہلِ علم و فضل اور اربابِ نظر نے سراہا، ستایش، تحسین اور تبریک و تہنیت کے اس ہجوم میں مغرور ہونے کے تمام اسباب اور محرکات جمع ہو گئے تھے، قریب تھا کہ ہم کبر و غرور میں مبتلا ہو جائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے نفس کی اس سب سے بڑی سرکشی اور گمراہی سے ہمیں بچا لیا، اور یہ جذبہ اظہارِ شکر اور تحدیثِ نعمت میں تبدیل ہو گیا۔

اگر یہ نفس کی کمزوری ہے تو اس کمزوری کا ہم کھل کر اظہار کرتے ہیں کہ تحسین و ستایش سے ہماری حوصلہ افزائی ضرور ہوئی اور اس حوصلہ افزائی میں مسرت بھی شریک تھی، اس مسرت نے ہمارے لبوں کو جہاں متبسم کیا ہے، وہاں آنکھوں کو اشکبار بھی بنایا ہے، تبسم پر ہمیں ندامت ہے کہ اس

میں ریا اور دکھاوے کے شامل ہونے کا خوف ہے اور "ریا" کے بعد بڑی سے بڑی عبادت، ریاضت اور نیکی آدمی کے منھ پر مار دی جاتی ہے، بارِ الٰہا! اِس رُسوائی سے ہمیں بچانا۔!

دو سال کی مدت میں سیکڑوں ورق ہم نے سیاہ کئے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں کیا کیا مقبول ہوا اور کیا نامقبول! نفس کی چوریاں بعض اوقات اس قدر باریک اور پُرپیچ ہوتی ہیں کہ خلوص اور ریا میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ہم کیا اور ہماری بساط کیا، اس دوراہہ پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں! اللہ کے نیک بندوں کی زبانی یہ خبر ہم تک پہونچی ہے کہ بارگاہِ احدیت میں نیکی کا غرور ٹھکرا دیا جاتا ہے اور عصیاں کی ندامت قبول فرمالی جاتی ہے، بیشک اُس کی رحمت اُس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ قیامت کے دن جب انصاف کی ترازو کھڑی کی جائے گی تو اخیار و ابرار تک کو پسینہ آجائے گا ——— "فاران" ہمارا لکھا لکھایا نامۂ اعمال ہے جس کے لئے غالباً حساب و کتاب لکھنے والے فرشتوں کو بھی زحمت نہ دی جاتی ہو، میزانِ قیامت میں نہ جانے کونسا "ورق" کیا نکلے، ہلکا، بھاری، سیاہ، سپید، صبحِ بشارت یا شامِ وعید! مگر ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مغفرت کی اُمید رکھتے ہیں!

"ماہنامہ" کی تیاری کا پہلا مرحلہ مضامین کی ترتیب و تدوین ہے، اُن لوگوں کے لئے یہ مرحلہ بہت آسان ہے جو ہر قسم کے مضامین اور رطب و یابس کو چھاپ دیتے ہیں، مضامین لکھنے والوں کی اُردو زبان میں کمی نہیں ہے، ایک "مخلوق" ہے کہ اخباروں اور رسالوں میں چھپنے کے شوق میں مبتلا ہے، اس قسم کے مضمونوں، مقالوں، نظموں اور غزلوں سے رسالہ چند گھنٹوں میں ترتیب دیا جا سکتا ہے ——— مگر اُس شخص کے لئے یہ مرحلہ سخت دشوار ہے جو جلبِ منفعت پر اُصول کو ترجیح دیتا ہو، جس کے سامنے پہلے "مقصد" اور اُس کے بعد سود و زیاں کا تصوّر ہو، جو ادب و اخلاق کے توازن کے ساتھ ساتھ ادب و انشا کے سُلجھاؤ، زبان کی صحت اور لفظوں کی قدر و قیمت کا بھی احساس رکھتا ہو، اگر کسی مضمون نگار کے مضمون کے ایک جملہ میں "مگر" دوبار آجائے تو وہ دوسری جگہ "مگر" کو "لیکن" سے بدل دے، اس احتیاط، ذمہ داری اور مقصد و اُصول کے ہاتھوں مضامین کے انتخاب میں ہمیں سخت دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ہم نے مضامین پر پہلے احتساب کیا، پھر انتخاب جب یہ دونوں مرحلے گزر چکے، تب کہیں جاکر مضمون کی کتابت کی نوبت آئی!

مضامین کی کتابت کے بعد اُس کی تصحیح کا نمبر آتا ہے جو بڑا صبر آزما کام ہے، ہم نے کوشش کی ہے کہ "فاران" میں کتابت کی کم سے کم غلطیاں رہیں، اس کے لئے ہم نے کتابت شدہ کاپیوں کو بار بار پڑھا ہے اور خدا کا فضل ہے کہ مضمون نگاروں اور شاعروں کے سامنے ہمیں زیادہ شرمسار نہیں ہونا پڑا ——— ایک کاپی کو ہم کم سے کم تین بار پڑھتے ہیں اور پڑھتے وقت تمام توجہ کو اُس پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں [illegible] بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ذہنی پریشانی اور نفسی کیفیت کے سبب توجہ کا خاطر خواہ ارتکاز دشوار ہو جاتا ہے، اس لئے کتابت کی صحت میں اسقام رہ جاتے ہیں ———

آدمی کے کام سو فیصدی ٹھیک ہو بھی تو نہیں سکتے! نسیان اور بھول چوک تو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور فطرت بدلی نہیں جا سکتی! مجموعی طور پر "فاران" کتابت کے معاملہ میں صحت سے قریب تر رہا ہے ——

کتابت کے بعد ڈاک میں رسالہ کو پوسٹ کرتے وقت تک اور بہت سے مرحلے درمیان میں آتے ہیں، خدا جانتا ہے کہ جس دن رسالہ ڈاک میں ڈال دیا جاتا ہے اُس دن ہم چین کی نیند سوتے ہیں، سب سے زیادہ فکر ہمیں اس کی ہوتی ہے کہ خریدار صاحبان کو شکایت کا موقعہ نہ ملے، اُن کی خدمت میں رسالہ ضرور پہونچ جائے —— مگر رسالہ کے نہ پہونچنے کی شکایتیں آتی رہتی ہیں، کسی کسی شکایت کا لہجہ تلخ اور تند و تیز بھی ہوتا ہے، جو شخص رسالہ کا چندہ دے کر خریدار بن چکا، وہ ہماری مشکلات کو آخر کیوں سوچے، اُسے تو مقررہ تاریخ پر رسالہ ملنا چاہیئے —— رسالے پوسٹ ہونے کے بعد آخر کیا ہو جاتے ہیں؟ زمین نگل جاتی ہے یا آسمان اُچک لیتا ہے، اس بھید کو ڈاک خانہ والے ہی بتا سکتے ہیں!

کاروباری معاملہ میں جس شخص کا آج بھی یہ عالم ہو کہ وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ ایک "رم" کاغذ میں کتنے دستے ہوتے ہیں —— اُس کے رسالہ کے لئے انتظامی اسباب کا فراہم ہو جانا اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان نہیں تو اور کیا ہے، ہم خدائے قادر و قیوم کی تدبیر امر پر بھروسا رکھتے ہیں اور اپنی سعی کو اُسی کے حُسنِ اہتمام پر چھوڑتے ہیں۔

## خدا فراموش ماحول

یہ دَور جسے دُنیا "ترقی و انقلاب" کا دَور کہتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ "جہالت و معصیت" کا بدترین دَور ہے، دُنیا میں اتنی ابتری، اس درجہ فساد اور اس قدر گناہ اور بدکاریاں شاید ہی کبھی پھیلی ہوں، بُرائیاں ہوا اور پانی تک میں اتر گئے ہوئے ہیں اور آدمی کے سانس سے معصیت کی بُو آتی ہے، دَورِ جاہلیت جس پر ہم طنز کرتے ہیں اس "ترقی زدہ" دَور سے پھر اچھا تھا کہ اُس میں کچھ "نادانیاں" اور "بے خبریاں" بھی شریک تھیں اور آج تو "علم و ادب" کی فراوانی ہے اور اطلاعات و معلومات کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر آدمی حیوانیت کی سطح سے بھی نیچے پہونچ چکا ہے"

قومِ نوح، اُمتِ لوط، عاد و ثمود اور دوسری مغضوب اور بدکار قوموں نے جو کچھ صدیوں اور قرنوں میں کیا تھا، وہ آج کی دُنیا مہینوں اور ہفتوں میں کر رہی ہے، حضور رحمۃ اللعالمینؐ کا وُجود درمیان میں نہ ہوتا تو یہ دُنیا کبھی کی تلپٹ ہو چکی ہوتی، پھر بھی اللہ کا قہر مختلف شکلوں میں ظاہر ہو رہا ہے، یہ زلزلے، یہ قحط، یہ بے روزگاری، یہ خوفناک آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ رزم آرائیاں —— یہ "عذاب" نہیں تو کیا رحمت ہے! امن دامانِ دُنیا سے اس طرح ناپید ہوا ہے کہ جیسے یہاں شاید کبھی تھا ہی نہیں، نہ دماغوں کو چین نصیب ہے اور نہ دلوں کو آرام میسّر ہے، ہر شخص اپنی جگہ غیر مطمئن اور کسی آنے والے خطرے کے سبب سہما ہوا کہ

نہ جانے کس وقت کیا بپتا آن پڑے اور کیا سے کیا ہو جائے۔

طوفان اُٹھ رہے ہیں، زلزلے آ رہے ہیں، زمین کا جغرافیہ تک بدلا جا رہا ہے ـــــــ خطرے کے یہ قدرتی "الارم" یہ گرجتی ہوئی تنبیہیں (WARNINGS)! یہ چونکا دینے والی ٹھوکریں! مگر انسان ہے کہ غفلت کے نشہ میں سرشار ہے، اُس کے معمولات میں ادنیٰ تغیر واقع نہیں ہوتا، وہی غفلتیں، وہی سرکشی، وہی بدکاریاں ـــــــ انسان شاید ہی تاریخ کے کسی دَور میں اس قدر بے ضمیر اور اتنا بے حِس رہا ہو!

ایک تو وہ مادہ پرست گروہ ہے جو ڈنکے کی چوٹ خدا کا انکار کرتا ہے، اُس کے ماحول میں تو خدا سے بیزاری کے آثار پائے جانے ہی چاہئیں مگر سوسائٹی کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے ہیں، وہ بھی "خدا فراموش" ہو گئے ہیں، اُن کی محفلوں کا یہ رنگ ہو گیا ہے کہ وہاں بیٹھ کر اور تو سب کچھ یاد آتا ہے مگر خدا یاد نہیں آتا، وہی ہوا و ہوس کی باتیں، دوسروں کی غیبتیں، اپنی بڑائی کی داستانیں، عہدیداروں سے اپنے تعلقات اور روابط کا ذکر!

جس دُنیا میں "خدا سے بیزاری" اور "خدا فراموشی" کا دور دورہ ہو، وہاں کا "شعر و ادب" کیا ہوگا؟ درخت اپنے پھل ہی سے تو پہچانا جاتا ہے! آج دنیا میں اُس لٹریچر کی مانگ ہے، جو ہوسناک جذبات کو زیادہ سے زیادہ خوش کر سکے، عُریاں تصویروں اور فحش ادب کی گرم بازاری ہے، وہ رسالہ ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے، جس کے سرورق پر کسی خوبصورت عورت کی انگڑائی کی تصویر ہوتی ہے، آنکھیں عُریاں تصویریں دیکھنا اور ننگے افسانے پڑھنا چاہتی ہیں، کانوں میں فلمی گانے سُن کر رس پڑتا ہے، فکر و خیال لذتوں میں ڈوب جانا چاہتے ہیں ـــــــ اس ماحول میں "فاران" جیسے روکھے پھیکے ماہنامہ کی قدردانی معلوم! جس بُک اسٹال پر "فاران" کے مشکل سے آٹھ دس پرچے بکتے ہیں وہاں ایک ایک فلمی رسالہ سیکڑوں کی تعداد میں فروخت ہوتا ہے، اِدھر پرچہ آیا اور اُدھر ہاتھوں ہاتھ بک گیا بک اسٹال والے بھی مجبور ہیں اگر وہ رسالوں میں "صالح" اور "غیر صالح" کی تمیز روا رکھیں تو بیچارے کھائیں کیا؟ اور اس دُنیائے نان و شکم میں اس جُرأت کے لوگ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں جو اپنی آخرت بنانے کے لئے اس دُنیا کے ہر نقصان کو گوارا کریں، موجودہ ماحول کی تو سرشت ہی میں آخرت کا انکار شامل ہے، اُس کے نزدیک جو کچھ ہے وہ یہی مادی دُنیا ہے، کھاؤ پیو، چین کرو، مزے اڑاؤ اور جب موت آئے تو مر جاؤ ـــــــ اگر ماحول صالح ہوتا تو پھر ایک مُسلمان کتب فروش کی دوکان میں قرآنِ پاک کے ساتھ کوک شاستر کی جلدیں ہرگز دکھائی نہ دیتیں، جہاں مقصد صرف شکم پروری اور جلبِ منفعت ہو وہاں نیکی اور بدی میں امتیاز کون کرے؟

اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے زمانہ کی راہ پر چلنے کی بجائے زمانہ سے لڑنے اور جنگ کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائی، ہم وقت کے دھارے پر بہے نہیں، بلکہ اُس کی مخالف سمت

چل کر وقت کے دھارے کو اپنے ساتھ موڑنے کی کوشش کی، بڑا سخت مقابلہ تھا، قدم قدم پر دشواریوں اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا فحش لٹریچر اور خدا ناشناس ادب کے نقار خانہ میں "فاران" کی آواز طوطی کی آواز تھی مگر قدرت کا یہ معجزہ ہے کہ "یہ آواز" نقاروں کے شور سے دب نہ سکی، سننے والوں نے اس آواز کو سنا اور اس وقت تک سنتے رہیں گے جب تک اللہ کو اس آواز کا سنانا منظور ہوگا۔

یہ نہیں ہے کہ دنیا میں شرافت، غیرت، انسانیت، پاکیزگی اور خدا شناسی کہیں پائی ہی نہیں جاتی، ماحول کوئی شک نہیں کہ بہت زیادہ تاریک ہے مگر اس اندھیرے میں سچائی کی روشنی بھی نظر آتی ہے، اِسی مادہ پرست دنیا میں ایسے نیک لوگ بھی موجود ہیں جن کو دنیا سے زیادہ آخرت عزیز ہے، جو اپنے دلوں میں اللہ کا خوف رکھتے ہیں، یہ زمین و آسمان انھی خدا کے نیک بندوں کے دم سے قایم ہیں! پھولوں کے طفیل میں کانٹوں کو بھی زندگی مل رہی ہے۔

جہاں کے لوگ ہیں زندہ قلندروں کے طفیل
گلوں کے سایہ میں کانٹوں کی کھل گئی تقدیر

"فاران" کے قدردان وہی لوگ ہیں جو توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم اپنے ان قدردانوں پر فخر کرتے ہیں کہ اُن میں کا ایک ایک فرد خدا ناشناسوں کی پوری قوم پر بھاری ہے، اعتبار کمیت کا نہیں کیفیت کا ہے۔

ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی اعتراف ہے "فاران" میں وہ "صالحیت" اور وہ یک رنگی نہیں پیدا ہو سکی جو "ترجمان القرآن" اور "چراغِ راہ" کا طرۂ امتیاز ہے، جاہلیت کے تمام چٹخاروں سے ہم ابھی تک پورے طور پر کنارہ کش نہیں ہو سکے، ہماری اس کوتاہی پر جن بزرگوں اور مخلص دوستوں نے ہمیں ٹوکا ہے، اُن کے احتساب کے ہم شکر گزار ہیں، ہم منزلِ مقصود کی طرف آرہے ہیں اگرچہ رفتار سست ہے ـــــ مگر

کم کوش سہی لیکن بے ذوق نہیں راہی

ہم جب عوام اور خواص پر تنقید کرتے ہیں تو اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہوتے کہ ہم خود فرشتے اور قدسی الاصل ہیں اور ہمارا دامن ہر قسم کی لغزشوں اور معصیتوں سے پاک ہے، اپنی برائیوں کا ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے اور جب اپنے نفس پر احتساب کرتے ہیں تو دل میں کٹ کٹ جاتے ہیں کہ ہماری تحریریں پڑھ کر لوگ ہمارے بارے میں کتنی اچھی رائے قایم کرتے ہوں گے کہ "جو یہ کہتا ہے وہ خود کیا ہوگا"؟ اور یہاں الفاظ کا پلہ اعمال سے بھاری ہے، کاش! ہمارا قال، ہمارا حال ہو جائے اور یہ انشاء اللہ ایک دن ہو کر رہے گا، ضمیر کی ملامت بے اثر نہیں رہ سکتی، جس طرح ہم لفظ و بیان اور اظہارِ خیال میں غلطی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں خدا کرے "اعمال" اور "کردار" میں بھی اسی احتیاط کو ملحوظ رکھیں۔

## قلمی تعاون ......... اور ....... ؟

جن مضمون نگاروں اور شاعروں نے ہمارے ساتھ قلمی تعاون فرمایا اُن کے ہم شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ اس محنتِ بے مزد اور سعیٔ بے معاوضہ پر اجرِ جزیل عطا فرمائے گا، جن کے مضامین اور اشعار "فاران" میں نہ چھپ سکے، اُن کا بھی ہم شکریہ ادا کرتے ہیں مگر اُن سے "معذرت خواہ" نہیں ہیں کیونکہ معذرت کسی کوتاہی اور غلطی پر کی جاتی ہے اور ہم نے اُن کے مضامین نہ چھاپ کر کوئی غلطی نہیں کی، "فاران" کی ایک پالیسی ہے اُس کا ایک معیار ہے اور ہم کسی کی دل دہی کے لئے نہ اپنی پالیسی بدل سکتے ہیں اور نہ اپنے معیار کو گرا سکتے ہیں ——

جن لوگوں کو قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا، ہاں! موزوں طبع ضرور بنایا ہے، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے، دنیا میں شہرت و ناموری حاصل کرنے کے لئے بھی ہزاروں راہیں کھلی ہیں، وہ کسی اور فن اور شعبہ میں قسمت آزمائی کر کے دیکھیں، اس غریب "شاعری" کو اُن کے لئے رہنے دیں، جو اس کے اہل ہیں، ہر شخص کے لئے شاعر بننا کیا ضرور ہے، اور شاعری اُتنی عزت کی چیز بھی نہیں ہے؛ جتنی اس زمانہ میں سمجھی جاتی ہے اگر شاعری بہت بڑی عزت کی چیز ہوتی اور اسی پر انسان کے شرف و اجتبا کا مدار ہوتا تو انبیائے کرام ضرور شاعر ہوتے ۔

ہماری قوم میں شعر و افسانہ کا یہ ضرورت سے زیادہ چرچا اور شاعروں کی کثرت خطرے سے خالی نہیں، اس طرح قوم کی تمام عملی قوتیں شل ہو کر رہ جائیں گی، رسالوں اور اخباروں کی بہتات ہے، اُنھیں کاغذ سیاہ کرنے کے لئے مضمون اور اشعار چاہئیں، پس جن کم سواد لوگوں کی چیزیں اخباروں اور رسالوں میں چھپ جاتی ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری مضمون نگاری اور شاعری کو سند مل گئی، اس "غلط فہمی" نے بہت سوں کو جہلِ مرکب میں گرفتار کر رکھا ہے، یہ لوگ ماہناموں میں اپنا کلام پڑھ پڑھ کر جھومتے ہیں کہ بس کوئی دن میں ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر رکھا جانے والا ہے —— کسی زبان کی شاعری پر ناقدری کا ایسا دَور کا ہیکو آیا ہوگا۔ کہ کنکر اور ہیرے کا امتیاز مٹتا جا رہا ہے۔

ہمارے پاس ایسی "غزلیں" (؟) اور "نظمیں" (؟) بھی آئی ہیں جو آسان زمینوں میں ہونے کے باوجود بحر سے خارج تھیں۔ ۔ ۔ اُس پر مکتوب گرامی میں ارقام فرمایا جاتا ہے کہ "اپنے دوستوں کے اصرار پر یہ چیز بھیجی جا رہی ہے۔ ۔ ۔" ہم حیران ہیں کہ دُنیا میں ایسے ایسے برخود غلط لوگ بھی رہتے ہیں اور سوسائٹی اُنھیں برداشت کرتی ہے۔

جن حضرات نے دین و اخلاق پر مضامین بھیجے، اور وہ انتخاب میں نہ آسکے اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ باطل کے مقابلہ میں حق اور زیادہ حُسن اور سلیقہ کے ساتھ پیش کئے جانے کا مستحق ہے، گنجلک، غیر متوازن، سپاٹ اور بے مزہ عبارت کا چاہے وہ قرآن اور حدیث کی تفسیر ہی کیوں نہ ہو، طبائع پر اچھا اثر نہیں ہو سکتا، شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک کریہ الصوت قاری کی حکایت بیان کرتے ہوئے بڑا نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا ہے:۔

چوں تو قرآں بریں نمط خوانی　　ببری رونقِ مسلمانی

گفتگو، تقریر اور تحریر کا انداز دل نشین ہونا چاہیئے، اسی لئے قرآن شریف عربی زبان کے بہترین اسلوب پر نازل فرمایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "جامع کلمات" عطا کئے گئے۔

جو حضرات تحریر کے ذریعہ دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے صرف معلومات اور مطالعہ ہی کافی نہیں ہے، اُن کو چاہیئے کہ اسلامی ادب کے صفِ اوّل کے انشاپردازوں کی تحریروں کو بغور پڑھیں، اُن کے مضامین کی تبویب و ترتیب، جملوں کی ساخت، لفظوں کے استعمال اور اسلوبِ نگارش کو دیکھیں، جب تک تحریر میں دل نشینی اور پختگی پیدا نہ ہو جائے اُس وقت تک اپنے مضامین منظرِ عام پر نہ لائیں۔

"فاران" میں کتابوں اور رسالوں پر نقد و تبصرہ جس دقتِ نظر اور ذمہ داری کے ساتھ کیا جاتا ہے، اُس کے لئے ہم اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں گے، ہمارے کئے ہوئے تبصرے پڑھ لئے جائیں! "نقد و نظر" پر کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے، ہم اس معاملہ میں ذاتی تعلقات کی بھی پروا نہیں کرتے اور نہ کسی کی شہرت سے مرعوب ہوتے ہیں۔

دو سال کی مدت میں جو نئی کتابیں اردو زبان میں شائع ہوئی ہیں، اُن کو پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہیں کہ مجموعی طور پر کتابوں کا معیار پست رہا ہے، اردو ادب میں کمیت (QUANTITY) کے اعتبار سے تو اضافہ ہو گیا مگر کیفیت (QUALITY) کے لحاظ سے اضافہ برائے نام ہوا "چھپ جانے کا شوق" وبائے عام کی طرح پھیل رہا ہے اور شوقِ اشاعت کے اس طوفان کا روکنا اب شاید ممکن ہی نہیں رہا۔

صرف کتابوں کی کثرت علم کے عام ہونے کی دلیل نہیں ہے، یونان میں کتابیں نہ تھیں مگر "علم" تھا اور ایسا علم تھا کہ آج تک اُس کی عظمت کے چراغ روشن ہیں، عہدِ رسالت میں گنتی کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن علم و عرفان اور بصیرت و آگہی کے جس بلند مقام پر وہ فائز تھے اُس کی ایک بھی نظیر اس "کتابوں کے دور" میں نہیں ملتی، ——— ہمارے زمانہ میں کتابیں بڑھ رہی ہیں مگر "علم" گھٹ رہا ہے! خود "کتابوں" میں الفاظ اور جملے تو ہوتے ہیں لیکن "علم" کم ہوتا ہے، اور اُن کو پڑھ کر جو ذہن اثر قبول کرتے ہیں اُن میں علمی استعداد کی کمی اور تشنگی ہونی ہی چاہیئے، خود شکر میں مٹھاس کی کمی ہو گی تو ذائقہ پورے طور پر حلاوت آشنا کہاں سے ہو گا، یہی حال کتاب اور مطالعہ کا ہے۔

تنقید میں ہم نے جہاں لکھنے والوں کی غلطیاں پکڑی ہیں اور لغزشوں کو گنایا ہے وہاں حسین و دل نشیں جملے نقل کر کے اُن کو سراہا بھی ہے، زبان و بیان کی غلطیوں کی ہم نے خاص طور پر گرفت کی ہے اور وہ اس لئے کہ جس موسم میں جس مرض کا زور ہوتا ہے طبیب ہر نسخہ میں اُس مرض کی رعایت ضرور رکھتا ہے، آج کل لوگ زبان کی صحت اور عدمِ صحت کی زیادہ پروا نہیں کرتے اور لفظوں کا استعمال بہت غلط ہو رہا ہے، اس لئے ہم تنقید میں زبان و بیان کی غلطیوں کا خاص طور سے خیال

رکھتے ہیں، شاعر اور مضمون نگار کے لئے سب سے مقدم چیز لفظوں کی پرکھ اور زبان کی صحت ہے، جس میں یہ استعداد نہیں، اُس کے ایک درجن "دیوان" اور ڈیڑھ سو "ناول" بھی چھپ گئے ہوں تو بھی وہ نہ شاعر ہے اور نہ ناول نگار! ان نام نہاد "ترقی پسندوں" نے اُردو ادب کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے ہم اُسے ٹھیک بنانا چاہتے ہیں اور یہ چیز آج نہیں تو کل انشاءاللہ ضرور ہو کر رہے گی۔

ہماری تنقید سے بہت سے لوگ خفا ہیں، ہم نے خفا ہونے والوں سے زبانی کہا ہے اُن تک پیام بھجوائے ہیں کہ ہماری تنقیدی غلطیوں پر ہمیں مطلع کر دیا جائے تو ہم شکر گزار ہوں گے اور "فاران" میں اُسے چھاپیں گے، لیکن ہمیں اس سلسلہ میں ایک بھی خط موصول نہیں ہوا، جو لوگ کل تک ہمارے مدح خواں تھے، اپنی کتاب پر تنقید پڑھ کر ہماری حرف گیری پر اُتر آئے، کل تک اُن کی نظر میں ہم اہلِ ذوق تھے، صاحبِ نظر تھے —— اور نہ جانے کیا کیا تھے اور آج ہم کم نظر ہیں، زعمِ ہمہ دانی رکھتے ہیں، ساری بُرائیاں ہم میں آگئیں —— اہلِ علم کو تو بڑا سنجیدہ اور وسیع الظرف ہونا چاہیئے! یہ انسان کی بڑی کمزوری بلکہ منافقت ہے، ہر شخص یہی کہتا ہے کہ "آدمی خطا و نسیان کا پتلا ہے"، مگر جب کسی کو اُس کی غلطی پر ٹوکا جاتا ہے تو اُس کی پیشانی پر خفگی کی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں ——

دو سال کی اس مدت میں بہت سے اجنبی لوگوں سے سابقہ پڑا جن میں سے بعض لوگ معاملہ کے بہت کھرے، وعدے کے پابند اور دیانتدار ثابت ہوئے، اور کچھ ایسے بھی خدا کے بندے ملے جنھوں نے بد معاملگی ہی کو شاید اپنا پیشہ بنا لیا ہے، ہم انھیں خدا کا واسطہ اور آخرت کا خوف دلاتے دلاتے تھکے جاتے ہیں کہ اپنے فرض کو پہچانو، خوش معاملگی اور دیانت داری سے کام لو، مگر اُن کے کان پر جُوں نہیں رینگتی کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں رحم ڈال دے اور وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کر لیں۔

## حرفِ آخر

ہمیں اس کا دعویٰ نہیں ہے (اور کوئی انسان جس کے پاس رتی بھر عقل بھی موجود ہے اتنا لغو دعویٰ کر بھی تو نہیں سکتا) کہ ہم نے اب تک "فاران" میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا لفظ لفظ صحیح اور درست ہے! ہم سے بھی دوسروں کی طرح غلطیاں ہوئی ہیں اس منزل میں ہم نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، ہم گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی اور پچھلی غلطیوں کی اصلاح کی انشاءاللہ کوشش کریں گے۔

مستقبل کو پردے میں رکھا گیا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اک آن میں کیا ہونے والا ہے، "فاران" کی آئندہ زندگی کے بارے میں ہم کسی قسم کی پیش گوئی نہیں کر سکتے، تاریک اور روشن دونوں پہلو ہمارے سامنے ہیں "فاران" طویل مدت تک جاری بھی رہ سکتا ہے اور ذرا سی دیر میں بند بھی ہو سکتا ہے، ہماری تو یہی تمنا اور دُعا ہے کہ جس بُوٹے کو ہم نے دل کا لہو دے دے کر پالا ہے وہ کم سے کم ہمارے جیتے جی تو ہرا بھرا اور جیتا جاگتا رہے لیکن اللہ کی مشیّتِ تکوینی ہماری تمناؤں کی پابند نہیں ہے!

ہم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ "فاران" کا کوئی "خاص نمبر" یا "سالنامہ" نہیں نکلا، ——— جی! نہیں نکلا۔ ... مگر جب اللہ تعالےٰ کو منظور ہوگا تو اُس کے لئے بھی اسباب فراہم ہوجائیں گے، ہم دوسرے رسالوں کے سالناموں اور خاص نمبروں کو دیکھ دیکھ کر کیا "شکر" کو "شکایت" سے بدل دیں، جو کچھ ہو رہا ہے، یہی کیا کم ہے، ہم اس رحمتِ بے غایت کے لائق کہاں تھے (اس تنہائی میں خدا کے سوا ہماری آنکھوں کے آنسوؤں کو اور کوئی نہیں دیکھ رہا، یہ شکر کے آنسو ہیں، ان آبگینوں میں کچھ تمنائیں اور آرزوئیں بھی جھلملا رہی ہیں... ...)

نہ جانے کیا کیا کہہ دیا، اور کیا کیا کہنا باقی ہے، غالبؔ نے کہا تھا:-

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مگر ہم چاہتے ہیں کہ جذب و شوق میں ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اُسے سُنا اور سمجھا جائے، گوشِ شنوا اور سمعِ قبول کی ہمیں جستجو ہے، ہر شخص کے اپنے اپنے احوال ہوتے ہیں، غالبؔ کا وہ حال تھا اور ہمارا یہ عالم ہے ——— بہت کچھ کہہ دیا، پڑھنے والے تھک گئے ہوں گے اور کیا عجب ہے کہ اُکتا بھی گئے ہوں مگر دل کی ایک خلش بھی تو ٹھیک طور سے کاغذ پر منتقل نہیں ہوئی، کتنی آہیں لب تک آنے کے لئے بے چین ہیں!

خدا کے نام سے اس مضمون کا آغاز کیا تھا، اور اُسی کے نام پر اس کو ختم کیا جاتا ہے، ہم اللہ تعالےٰ سے بُرائی سے دُوری اور نیکی سے قربت کی توفیق طلب کرتے ہیں، زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے دُنیا میں نظامِ حق کو قایم اور برپا دیکھ لیں ——— ——— آمین یا رب العالمین۔

ماہر القادری
۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء

ادارہ

اخذ و اقتباس

# اشتراکیت

## رُوس کی تجربہ گاہ میں

### آہنی دیوار کے پیچھے

شخصی مطلق العنانی کی قہرمانیاں ——— فواحش کی آزادی
مگر فکر و ضمیر کے لئے زنجیریں

> اشتراکیت ایک ہاتھ سے "روٹی" دیتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے ضمیر، شرافت، اخلاق اور پاکیزگی چھین لیتی ہے!

زہر کو جب تک زہر سمجھا جاتا رہے گا، لوگ اُس کی مضرتوں سے محفوظ رہیں گے مگر "زہر" کو لوگ تریاق سمجھنے لگیں تو پھر زہر انسانی زندگی کے لئے مستقل عذاب بن جائے گا، جو چیز جیسی واقع ہوئی ہے اُسے ٹھیک اُسی طرح سمجھنا اور برتنا چاہیئے، سانپوں کو اگر خرگوش کے بچے سمجھ کر کوئی اُن سے کھیلنے لگے تو اس کا نتیجہ ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ——— آج کی دُنیا میں "کمیونزم" کے ساتھ ٹھیک یہی معاملہ پیش آ رہا ہے لوگ انگاروں کو پھول سمجھ کر اُن کی طرف بے تحاشا لپکے چلے جا رہے ہیں، "جہنم" پر "جنت" کا گمان ہو رہا ہے، لوگوں کے حُسنِ ظن اور خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ اسٹالن جو دُنیا کا سب سے بڑا جابر و قاہر ڈکٹیٹر ہے اُسے دُنیا کا نجات دہندہ سمجھ رکھا ہے۔

کمیونزم کی مقبولیت کا سبب ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے اور یہ ایسی غلط فہمی ہے جس میں اچھے خاصے پڑھے لکھے اور ہوشمند اشخاص مُبتلا ہیں ——— بھوک، فاقہ، بے روزگاری اور افلاس نے

عوام کو سرمایہ داری سے بیزار کر دیا ہے بلکہ اُس کا دشمن بنا دیا ہے "کمیونزم" کو لوگ "سرمایہ داری" کا مخالف اور حریف سمجھے ہوئے ہیں، اس لئے "کمیونزم" کی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی ہے ——— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے سب سے بڑے داعی "مارکس کا فلسفہ دراصل سرمایہ داری کی تکمیل تھی اُس نے بوژروائیت کو ختم کر دیا لیکن "حکومتی سرمایہ داری" کو جنم دیا جو اُس سے زیادہ خطرناک اور ظالم ہے"
(اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں)

اشتراکیت نے روس میں "سرمایہ داری" کو ختم نہیں کیا بلکہ اُسے اور منظّم اور مستحکم بنا دیا، روس میں پہلے "سرمایہ داری" افراد کے ہاتھوں میں منتشر اور بکھری ہوئی تھی، اب اُسے "یکجا" کر دیا گیا اس لئے "سرمایہ داری" کے ہاتھوں عوام کے ساتھ جو ظلم و ستم ظہور میں آتے تھے، اُن میں اور اضافہ ہو گیا، سرمایہ داری کا وہی ہتھیار جو کارخانہ داروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھا، اب رُوسی حکومت کے ہاتھ میں ہے، صرف ہتھیار پکڑنے والے ہاتھ ضرور بدل گئے ہیں مگر "ہتھیار" نہیں بدلا، اُس کی دھار کی تیزی اب بھی وہی فرض انجام دے رہی تھی، جو پہلے دیا کرتی تھی —

جناب اصغر علی عابدی کی ترتیب دی ہوئی کتاب ——— "اشتراکیت رُوس کی تجربہ گاہ میں" ہمارے سامنے ہے، اس کتاب کو فاضل مؤلف نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مُرتّب کیا ہے، اس میں عقلی دلائل میں، مُستند حوالے اور تاریخی ماخذ ہیں، واقعات اور تجربے ہیں، ایک ایک چیز کو حقیقت کی کسوٹی پر پُوری ذمّہ داری کے ساتھ پرکھا گیا ہے، جذبات سے الگ رہ کر حقایق اور واقعات سے بحث کی گئی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور "اشتراکیت" اپنے فطری خدوخال اور اصلی رنگ میں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اصغر علی عابدی نے اپنے مضمون میں بڑی اچھی بات کہی ہے:—

"مظلوم کو ظالم کے مقام پر لے آنے سے ظلم مٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ظلم کرنے والے بدل جاتے ہیں، مارکسی اشتراکیت کا فلسفہ بس اسی قدر ہے ... " اصل کام تو یہ ہے کہ "سبب ظلم" کو مٹا دیا جائے، ظلم کی راہیں تو بند نہ ہوں صرف ظلم کرنے والوں کو بدل دیا جائے تو اس سے ظلم کا انسداد تو نہیں ہو سکتا "اشتراکیت" مزدوروں اور کسانوں یا اُن کے لیڈروں کو سرمایہ داروں کا مقام دیدینا چاہتی ہے اور روس میں یہی ہو رہا ہے کہ "سرمایہ داری" کو نہیں بدلا گیا بلکہ "سرمایہ داری" کو "حکومت" میں منتقل کر دیا گیا ہے اور حکومت کی باگ ڈور چند لیڈروں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ "سرمایہ داری" کی ظلم سامانیوں اور زیادتیوں سے وہی کام لے رہے ہیں" جو ڈیوک، نواب، ساہوکار اور کارخانہ دار لیا کرتے تھے"

مکتبہ نشاۃ ثانیہ (حیدرآباد دکن) نے اس کتاب[1] کو چھاپ کر سوسائٹی کے ساتھ بڑی بھلائی کی ہے جس کے لئے وہ تبریک و تحسین کا مستحق ہے، یہ مضمون اسی کتاب (اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں) سے

[1] ضخامت ۲۸۰ صفحے، مجلّد، رنگین گردپوش کے ساتھ، قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

ماخوذ ہے[۵۲]، ہم اربابِ فکر و نظر کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں، جذباتی نعروں" کی رو میں بہہ جانا عقلمندوں کو زیب نہیں دیتا، حقایق اور واقعات کو" امریکہ اور انگلینڈ کا پروپیگنڈا" کہہ کر نہیں چھپایا جا سکتا، اگر کسی میں ہمّت اور صداقت ہے تو ان واقعات کی تردید کرے!

## سوویٹ رُوس کی اخلاقی حالت

" اشتراکی نظریہ حیات کی اساس اس اُصول پر ہے کہ انسانی اعمال کے اصلی محرک یہی " بھوک " اور " شہوت " کے محرکات ہیں، لہذا انھی کی پرستش کرنی چاہیئے اور نئے سماج کی بنیاد انسانی زندگی کے انھی دو محرکات پر اُٹھانی چاہیئے، یہ وہ بنیادی تصور ہے جو انسانی زندگی کے متعلق فلسفۂ اشتراکیت پیش کرتا ہے، اشتراکیت نے انسان کو ایک مشین فرض کر کے جو "میکانکی نظریہ حیات " اختیار کیا ہے اُس کی تبلیغ و اشاعت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام اخلاقی قدریں ہٹ گئیں اور اخلاق کی بنیادیں اُکھڑ کر پھینک دی گئیں، خاندان کے بجائے فرد کو معاشرے کا جزوِ ترکیبی ( UNIT ) قرار دیا گیا جس کا نتیجہ عائلی زندگی کی پراگندگی کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے اخلاق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اشتراکیت انسان کو اس زمین پر ایک برتر مخلوق نہیں سمجھتی بلکہ وہ حیوانات کی بہت سی قسموں میں سے ایک حیوان فرض کیا جاتا ہے، اس میں اور دوسرے حیوانات میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ یہ عقل کی زیادہ ترقی یافتہ قوتیں رکھتا ہے، جو جذبات اور حسیات بھی وہی رکھتا ہے جو حیوانوں کے ہیں۔ ـــــ اس نقطۂ نظر سے جب ہم کمیونزم کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اس سے نہ تو تقسیم دولت کا کام صحیح طور پر انجام پا سکا اور نہ انسانیت کو کوئی عروج نصیب ہوا بلکہ اشتراکی فلسفہ اور نظمِ اجتماعی سے اُلٹا اخلاق اور انسانیت کو نقصان اُٹھانا پڑا، اشتراکیت نے پیٹ کی روٹی کی خاطر وہ چیز انسانیت سے چھین لی، جس کی بدولت انسان، انسان ہوتا ہے۔"

" ایک رُوسی مصنف اپنے ناول " SEMING " میں ایک آیڈیل ideal اشتراکی سوسائٹی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے :-

> " شراب خواری اور زنا کوئی قابلِ شرم چیز نہیں، محبّت کرنا خوب پینا اور عورتوں کا تعاقب کرنا خاصّہ مردانگی ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے اور جو چیز فطری ہو وہ گناہ کیسے ہو سکتی ہے "

خود لینن کے اخلاقی تصورات کا یہ عالم ہے، وہ کہتا ہے :-

> " جس طبقہ کو اب تک لوٹا جا رہا ہے، وہ جب اپنے دُشمنوں کے خلاف جدوجہد کرے گا تو ایسی جدوجہد میں جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہوگا۔۔"

---

[۵۲] اس مضمون میں " اقتباسات " کو " رُوحِ انتخاب " کا قایم مقام سمجھنا چاہیئے !

اشتراکیت کا انقلاب قتل وغارت گری کا انقلاب ہے، وہ اپنے حامیوں کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ اپنے مخالف لوگوں کے خون کی بے دریغ ندیاں بہادیں، اشتراکی حکومت کا تخت انسانی لاشوں پر بچھایا جاتا ہے، چنانچہ ۱۹۳۲ء تک روس میں لاکھوں انسانوں کو ہلاک کیا جاچکا ہے اور ان مقتولین میں نو لاکھ تو خود بیچارے کسان ہیں، یہ تمام تفصیلات ایک اشتراکی مصنف (JOHN WYNE HEERID) نے پیش کی ہیں، جس کی زندگی کے تیس سال روس میں بسر ہوئے ہیں۔

"روس کے نظامِ معاشرت (اور عائلی زندگی) کی بنیاد آزاد محبت (FREE LOVE) ہے" ــــــ یہ عاشقانِ چاک گریباں کی "محبت" اور فرہاد و قیس کا "عشق" نہیں ہے، آج کل کی اصطلاح میں "ہوسناکی" کو لوگوں نے محبت کا نام دے دیا ہے، روس میں رہنے والا انسان ہر قسم کی حیوانی خواہشات کسی روک ٹوک کے بغیر پورا کر سکتا ہے ــــــ "ایک ممتاز روسی سائنس داں "ANTOM NO MI LOVO" جو اشتراکیت کا پرجوش حامی ہے اپنی کتاب "عورت کا حیاتی خزینہ" میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ مزدوروں میں "صنفی انارکی" عام ہوگئی ہے، وہ شہوانیت کے اس طوفانِ عظیم کو جو اشتراکی سوسائٹی کے اونچے طبقوں سے لیکر نیچے طبقوں تک سب پر چھایا ہوا ہے، سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی صورتِ حال آخر کار اشتراکی نظام کو تباہ کر کے رہے گی۔ ۔ ۔ ۔"

مشہور اشتراکی روزنامہ "پرودا" میں اب سے چند سال قبل ایک مضمون نکلا تھا جس کے متعلق روسیوں کا بڑے سے بڑا حامی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرمایہ داروں کا پروپگنڈا ہے، اس مضمون کے یہ الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں :-

"محبت کے معاملات میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان سب اصولوں کی تہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہونچنے میں کامیاب ہو گے یا بالفاظِ دیگر جس قدر زیادہ حیوانیت سے قریب ہو گے اسی قدر زیادہ اشتراکی بنو گے، لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالبِ علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کے اصولِ متعارفہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جب لیبر فیکلٹی میں داخل ہو اس کو لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں میں کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلاحیل و حجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے۔"

اشتراکی نظام کی ایک ممتاز رکن مادام سیمیو ڈورش (SEMI DORICH) نے صنفی انارکی کے متعلق بکثرت واقعات نمونہ کے طور پر پیش کئے ہیں، مثلاً وہ لکھتی ہیں :ــ

"نوجوان اشتراکیوں کے نظام میں "افریقی راتیں" (AFRICAN NIGHTS) منانے کا رواج بکثرت پھیل گیا ہے جن کی وجہ سے یہ ادارے، نوجوانوں کا مرکز و مرجع بن گئے ہیں، ان افریقی راتوں میں بکثرت لڑکیوں کی زندگیاں خراب کر دی جاتی ہیں اور اسی وجہ

سے اب عورتیں ان اداروں میں شریک ہوتے ہوئے گھبراتی ہیں، اس تباہ کن صنفی انارکی کا تمام الزام صرف غلط اخلاقی نظریات ہی پر عاید نہیں ہوتا بلکہ بڑی حد تک اس کی ذمہ داری حکومت کے اس نظام پر عاید ہوتی ہے کہ اس نے مزدوروں، کارکنوں اور طالبعلموں کو ایسے مکانات میں رکھا ہے، جہاں لڑکے اور لڑکیاں، مرد اور عورت سب خلط ملط ہو کر رہتے ہیں"

"پہلے کہا جا چکا ہے کہ بھائی بہن کے درمیان ازدواجی تعلقات کا قایم ہو جانا کارل، مارکس اور اینجلز کی نگاہ میں کوئی عیب نہیں ہے، چنانچہ روس نے جب مارکسیت کو عملی جامہ پہنایا تو یہی سوال ضابطۂ تعزیرات کے مرتبین کے سامنے پیش ہوا کہ بہن بھائی کے ازدواجی تعلقات کو کس قانون کی بنا پر خلافِ قانون قرار دیا جائے، مختلف ماہرینِ طب و نفسیات سے مشورے طلب کئے گئے، انھوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ تاریخی، نسلی اور طبعی لحاظ سے بہن بھائی کا ازدواج نہ تو صحتِ عامہ کے لئے ضرر رساں ہے اور نہ آئندہ نسل کے لئے نقصان دہ، چنانچہ اس قسم کا ازدواج روسی قانونِ تعزیرات میں کوئی جُرم نہیں ہے۔ .. .. .."

۵ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

روس کی یونیورسٹیوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے باہمی میل جول اور اختلاط پر کوئی نگرانی نہیں کی جاتی، جس کا جو جی چاہتا ہے کر گزرتا ہے، جوانیاں شروع ہی سے بے راہ ہو جاتی ہیں اگر ہوسناک تعلقات کسی لڑکی کے یہاں بچّہ کے پیدا ہونے کا سبب بن جائیں تو سوسائٹی میں اُس لڑکی کے وقار کو ذرہ برابر صدمہ نہیں پہونچتا۔

"حقیقت یہ ہے کہ سوویٹ روس میں نئے اخلاقی معیار نے انسان کو حیوانی زندگی سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ ان کے ذہنوں میں ایشیائی شرم و حیا کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا، ماسکو کے بازاروں میں مرد اور عورتیں خالی لنگوٹ پہن کر پریڈ کرتے ہوئے گزرتے ہیں، موسم گرما کے کسی گرم دن میں ہزاروں مرد اور عورتیں دریا کے کناروں پر مادر زاد ننگے مٹر گشت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، ماسکو میں کسی دعوت کے وقت اگر رات گئے محفلِ عیش و نشاط جمی اور گھر جانے کا موقعہ نہ رہا تو عورتیں وہیں بنچوں پر مردوں کے پہلو بہ پہلو سو رہیں گی ———— ۱۹۴۶ء میں سوویٹ فیڈریشن کے حدود میں ۱۶۰ ننگوں کے ادارے موجود تھے، پچھلے سال ایسے ہی تین ادارے (ننگوں کے کلب) زاغستان، یاقوت اور خفاش کی مسلم سوویٹ جمہوریت میں بھی کھول دیئے گئے ہیں اور آئندہ سال اسی قسم کے چودہ مزید ادارے پورے ملک میں قایم کرنے کا پروگرام ہے (ماسکو نیوز ۱۱ر مارچ)

"غرض سارا ملک اخلاقی بے راہ روی اور بد قماشی کے سیلاب میں بہ رہا ہے اور خیر و شر کا کوئی معیار ہی موجود نہیں رہا۔ .. .." یہ جو آزاد خیال نوجوانوں کو اشتراکیت سے ایک خاص قسم کی دلچسپی ہے اُس کا سب سے بڑا سبب یہی "صنفی انارکی" ہے، وہ جانتے ہیں کہ اشتراکی حکومت میں

وہ جنسی معاملات میں آزاد ہوں گے اور اُن کی ہوسناکی کو زیادہ سے زیادہ سیراب ہونے کا موقعہ ملے گا۔

## طبقہ واریت! بڑے اور چھوٹے

اگر طبقہ واریت کے ختم ہونے سے ہماری مُراد صرف ذاتی ملکیت کا ختم ہونا ہے، تب تو روس نے یقیناً کسی حد تک اس طرف موثر قدم اُٹھایا ہے لیکن اگر اس سے ہماری مُراد امیر و غریب کے باطل امتیاز کو مٹانا ہے، ناجائز معاشی انتفاع کو ختم کرنا ہے تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ حکومتوں اور اشتراکی روس میں قطعاً کوئی فرق نہیں، اگر اس خونیں انقلاب سے پیشتر غریب مزدور کی محنت سے اُمراء ناجائز فائدہ حاصل کرتے تھے تو اس تغیر کے بعد اب حکومت اور اُس سے ذاتی مفاد وابستہ رکھنے والے اصحاب مستفید ہو رہے ہیں، فرق جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو نگل کر حکومت خود ایک بہت بڑی سرمایہ دار بن کر تختِ حکومت پر متمکن ہو گئی ہے ــــــ اس کے ثبوت کے لئے ایک فرانسیسی کمیونسٹ لی کامرڈیون (LE COMRADE YUON) کے بیانات قابلِ غور ہیں، روس کے معاملات پر اُس کی نظر سرسری اور سطحی نہیں بلکہ اُنھوں نے رُوس کے اندر کم و بیش بارہ سال بسر کئے اور حکومت کے ہر شعبہ کا نہایت ہی عمیق مطالعہ کیا ــــــ اُنھوں نے لکھا ہے کہ روس کے اندر طبقہ واریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، جہاں اُمرا بھی ہیں اور غربا بھی، غالب بھی اور مغلوب بھی! ان کے معیار میں نمایاں تفاوت ہے، ریلوے میں مختلف درجوں کا موجود ہونا اسی "طبقہ واریت" کی دلیل ہے کچھ لوگ صحت افزا مقامات پر محلات میں ہر طرح کی آسایش اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور سر چھپانے کے جھونپڑوں تک سے محروم ہے غریب اور امیر کا امتیاز ہوٹلوں اور تھیٹروں اور دوکانوں غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ .. .. ..سرمایہ داروں کی جگہ اب بڑے بڑے حکام نے لی ہے، غریب مزدوروں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑا نہیں بلکہ بدلا ہے اور یہ نئی زنجیریں پہلی زنجیروں سے کہیں زیادہ مضبوط اور وزنی ہیں ــــــ"

روس میں آمدنی کے تفاوت کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک شخص کی آمدنی پچیس روپے ہے تو وہاں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کی یافت دس ہزار رُوبلز ماہانہ سے بھی زیادہ ہے ــــــ" ایک مزدور کی تنخواہ سے جو رقم وصول کی جاتی ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱) آمدنی پر ٹیکس ــــــ ۷ء۶ ء ۵ سے ۳ء۳ فی صدی، البتہ ۱۵۰ روبلز سے کم کمانے والے افراد اس سے مستثنٰی ہیں۔

(۲) کلچرل ٹیکس ــــــ تھیٹرز، سینماؤں اور لائبریریوں کے قیام کے لئے۔

(۳) ٹریڈ یونین کا ماہانہ چندہ، کل آمدنی کا دو فی صدی

(۴) ریاست کو قرضہ، تنخواہ کا دس فی صدی، یہ قرضہ برائے نام رضاکارانہ ہے درحقیقت یہ ہر ملازم کو دینا پڑتا ہے۔

(۵) دوسری انجمنوں کے لئے چندہ ایک فی صدی۔

اگر ان تمام رقوم کو جمع کیا جائے تو یہ آمدنی کا ۲۱ فی صدی بن جاتی ہیں اور یہ وہ رقم ہے جو ہر شخص کی تنخواہ سے وضع کی جاتی ہے!

"جو لوگ روس گئے ہیں اُنھوں نے مزدوروں کو انتہائی کس مپرسی کی حالت میں پایا حکومت نے اپنے مزدوروں کو بیرونی دُنیا سے بالکل الگ تھلگ رکھا ہے، کسی قسم کی اطلاع بھی اُن کے ملک میں نہیں جاسکتی، حکومت نے اپنے اردگرد انتظامات کی ایسی دیوار چُن دی ہے، جس سے بیرونی دُنیا کی کسی خبر کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔"

**جابر ڈکیٹر** شہنشاہوں کو بہت مستبد اور قاہر بتایا جاتا ہے، مگر مزدوروں کا یہ عوامی رہنما اسٹالن جبر و استبداد میں بادشاہوں کو بھی میلوں پیچھے چھوڑ گیا:۔

"اسٹالن کے آہنی ہاتھوں نے اپنے راستہ کے تمام کانٹوں کو صاف کر دیا، اسٹالن کے ہر مخالف پر تخریبِ وطن کا الزام لگایا گیا، یہ بات نہایت ہی افسوسناک ہے کہ ہزاروں اشخاص جو دوسروں کی موت میں اسٹالن کے ممد و معاون ثابت ہوئے، خود اپنی جانوں کو اس ظالم سے کسی صورت میں نہ بچا سکے!

مخالف خیالات پر احتساب کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص ٹراٹسکی (TROTOSKY) اور بخارائن (BUKHRIN) یا ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب نہیں پڑھ سکتا جس کے ساتھ اسٹالن کا اختلاف تھا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ سوویٹ کے مصنفین، سائنس داں اور صنعتی کام کرنے والوں کو دوسرے ممالک میں جانے کی عام اجازت نہیں دی جاتی؟ کیوں روسی عوام کو بیرونی ممالک کے ریڈیو پروگرام سننے کی اجازت نہیں! روس کے اندر سوائے چند بڑے فوجی یا سیاسی افسران کے کوئی روسی بھی طاقتور ریڈیو سیٹ نہیں رکھ سکتا، مبادا وہ غیر ملکی خبریں سُن لے، اسٹالن کو اپنی رعایا پر اعتماد نہیں ہے!

اسٹالن کی جنبشِ لب بلکہ اُس کی تیوری روس کا موجودہ قانون ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے دستور دفعہ ۱۲۱ کے مطابق سوویٹ یونین کے ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا پُورا پُورا استحقاق تھا اور ابتدائی لازمی تعلیم ہر شہری کو میسر تھی، اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی بے شمار وظائف دئے جاتے تھے تاکہ ہر خاص و عام زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکے لیکن ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو ایک جنبش قلم نے سارا قانون بدل کر رکھ دیا، مفت ثانوی تعلیم ختم کر دی گئی اب بغیر فیس کی ادائیگی کے کوئی شخص بھی ہائی اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور صنعتی اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا... کسی شہری کو جُرأت نہیں ہوئی کہ وہ حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکے۔"

آہنی پردے کے پیچھے کی ایک جھلک دیکھئے:۔

روس کے اندر ہر وہ شخص جس کا اسٹالن سے اختلاف ہے، یا جو اسٹالن کا منظورِ نظر نہیں ہے، رجعت پسند ہے، حکومت نے محنت کے ساتھ دماغ کو بھی خرید لیا ہے، ۶ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء

میں سوویٹ کے نئے دستور پر ۳۰ روسی زعماء نے دستخط کئے، جن میں اسٹالن مولوٹوف، ٹوخاچوسکی (Tukhachevsky) شامل تھے، سنہ ۱۹۳۹ء تک ان میں سے پندرہ کو ختم کر دیا گیا۔ اور بیشتر گولی کا نشانہ بنے، ظلم کے تختۂ مشق بننے والوں میں ایک MARTIAL BLUCKER) بھی تھا، جو فار ایسٹرن ریڈ آرمی کا کمانڈران چیف تھا، ان میں (ROSTY SHER YEIHOV) یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بھی موجود تھا، ان میں جی، پی، یو کا افسر اعلیٰ —— بھی تھا، اس کے علاوہ (LYUBE HENKO) یوکرین کا وزیر اعظم بھی تھا۔

روس کا نصاب تعلیم و تربیت انسانوں کو صرف مشین کی طرح کام کرنا ہی نہیں سکھاتا، بلکہ ان سے قوتِ فکر بھی سلب کر لیتا ہے، ان کے فکر کا رقاص صرف اشیاء کے پیدا کرنے تک ہی محدود رہتا ہے ایک سوویٹ ناول میں جس کا نام (UNKNOWN ARTIST) ہے ایک روسی کیریکٹر بیان کیا گیا ہے، وہ کہتا ہے، کہ اخلاق ایک ایسا لفظ ہے، جس کے متعلق مجھے کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا، میں اشتراکیت کی تعمیر میں بے حد مشغول ہوں، اگر مجھے اخلاق اور پاجامہ میں ایک چیز کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو صرف پاجامہ ہی کو پسند کروں گا، یہ الفاظ روسی ذہنیت کی پوری طرح غمازی کر رہے ہیں، ڈکٹیٹر اگر مادی اشیاء کی پیدائش کو بڑھا سکتا ہے، تو پھر وہ ہر تنقید سے بالاتر ہے، چاہے اس مقصد کے حصول کے لئے کتنے ہی ناپاک ذرائع استعمال میں لائے جائیں، اور اپنے نصب العین کو کتنی دفعہ پامال کرنا پڑے۔

اسٹالن کے ساتھ یہ بے پناہ عقیدت اور اس کے ہر اشارے پر جاں نثاری ایک منظم تحریک کا نتیجہ ہے، اس میں تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو پوری ہوشیاری و عیاری کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے، ہر کامیابی کا سہرا اس کے سر ہے، اور ہر ناکامی کی لعنت کا طوق اس کے مخالفین کے گلے میں ہے، سوویٹ نازی جنگ کے پہلے مہینے میں جب کہ روسی افواج بری طرح پسپا ہو رہی تھیں، اسٹالن لوگوں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا، ریڈیو اور پریس میں اسٹالن کا نام کبھی نہیں آتا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا، کہ اس کا نام شکست کے وقت لیا جائے، مگر جونہی سُرخ فوج نے بڑھنا شروع کیا، اسٹالن کا نام شہرت کے افق پر درخشاں نظر آنے لگا۔

## معاشی عدم مساوات

اُجرتوں اور تنخواہوں کی مساوات ایک خیال تھا، جو ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو چکا ہے اب تنخواہیں کام کی نوعیت اور کارکن کی لیاقت کے حسب حال دی جاتی ہیں، ۸۰ روبل سے لے کر ۱۲ سو، ۲ ہزار، ۲½ ہزار روبل پانے والے کارکن موجود ہیں، بعض اہلِ قلم ۳ لاکھ روبل سالانہ رائلٹی اپنی کتابوں پر حاصل کر رہے ہیں، میرے پاس سوویٹ روس کی آفیشل نیوز ایجنسی تاس کے شائع کردہ تحریری ثبوت موجود ہیں، کہ میکسم گورکی چھ ہزار روبل ایک ایک کتاب پر حاصل کرتا رہا، یا دش بخیر یہ میکسم گورکی وہی روسی مصنف ہے جس سے امریکہ کی سیاحت کے موقعہ پر کسی نے پوچھا تھا، کہ اپنے ساتھ یہ کون عورت لئے پھرتے ہو، کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟ جواب ملا "یہ بیوی نہیں میری دوست ہے، اور ایک دوست سے جنسی تعلق رکھنے میں آخر کیا عیب ہے"!

روس میں نہ صرف یہ کہ اقتصادی لحاظ سے خوش حال اور مفلوک الحال لوگوں کی الگ الگ گروہ بندی عالم وجود میں آگئی ہے، بلکہ مالدار لوگوں کو اپنی دولت منافع پر لگانے کے بھی اعلیٰ مواقع حاصل ہیں، حتیٰ کہ سیونگ بنکوں کا سسٹم جاری ہے، اور ان میں جو روپیہ جمع ہوتا ہے، اس پر تین سے دس فی صدی سود دیا جاتا ہے۔

"پیپل کمیسار آف فائننس (PEOPLE COMMISSOR OF FINANCE) کے ماتحت اسٹیٹ سیونگ بنک ہے، جس کی بیس ہزار شاخیں ملک کے اندر پھیل رہی ہیں، ۱۹۲۷ء میں لوگوں نے ان بنکوں میں ایک سو کروڑ روبل جمع کر دیئے، اور ۸ فی صدی سود دیا گیا، ان جمع شدہ رقوم کو انکم ٹیکس، وراثت ٹیکس اور مختلف دوسری اسٹمپ ڈیوٹیوں سے مستثنٰی رکھا گیا۔"

روس کا سب سے بڑا بینک گوس بینک کے نام سے مشہور ہے" یہ بینک عوام سے قرضے طلب کرتا ہے، اور ان قرضوں پر حکومت کی طرف سے بھاری سود ادا کرتا ہے، سرمایہ دار اور مال دار طبقوں کو اپنا سرمایہ لگانے کے بہترین مواقع مہیا کرتا ہے۔

روس میں چھوٹے سے لے کر بڑے سرکاری آفیسر کے لئے نجی کمائیوں کے بے شمار دروازے کھلے ہیں، ایک فرڈ ورکار خانے یا ورکشاپ کا مستری ہمسایوں اور محلہ والی کی نجی خدمات انجام دے کر روپیہ کماتا ہے، ایک میڈیکل آفیسر، نرس یا دایہ اپنے خالی وقت میں پرائیوٹ پریکٹس کرتی ہے اور خوب کماتی ہے، گانے والے موسیقار، ناچنے والے رقاص اور تھیٹروں کے ایکٹر سب ملازمت کے علاوہ مختلف کنسرٹوں میں نجی طور پر جاتے ہیں، اور معاوضے حاصل کرتے ہیں، صحت افزا مقامات پر حکومت کے کنٹرول کے علاوہ مکانات کے کرایہ کی نہایت ذلیل قسم کی چوربازاری ہوتی ہے، پولیس کے شوفر اور سرکاری گاڑیاں چلانے والے مسافروں کو بٹھا کر کرائے وصول کرتے ہیں، اور اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں، راشن شدہ اشیاء انتہائی افراط و کثرت سے بلیک میں فروخت ہوتی ہیں۔ غرض جتنی گندگیاں اور تعفن کسی سوسائٹی میں ایک سرمایہ دار نظام پیدا کرتا ہے، اس سے کئی گُنی غلاظت روس کے موجودہ اشتراکی نظام کے ہاں ملتی ہے۔

---

روس کی ناخداشناس سرزمین میں اشتراکی حکومت کے نام سے مزدور اور عام محنت کش طبقہ پر ظلم و تعدی کا جو بازار گرم ہے، یہ سطور اس کی جانب صاف صاف اشارے کرتی ہیں، سوچنے اور سمجھنے والے دوست انہی سے اندازہ فرما سکتے ہیں، کہ ہمارے عدل و انصاف کے اشتراکی داعی کس طرح مزدور کی خون پسینہ ایک کرکے پیدا کی ہوئی کمائیوں پر پل رہے ہیں، اور حد یہ ہے، کہ بے چارہ مزدور اپنی لائی ہوئی اس مصیبت کے خلاف ایک آہ بھی بلند نہیں کر سکتا۔

روس میں کوئی فیکٹری ایسی نہیں، جس پر ہمیشہ سخت فوجی پہرہ لگا ہوا نہ ہو، حتیٰ کہ کارخانوں کے اندر بھی فوجی سپاہی سنگین چڑھی ہوئی رائفلیں لئے ٹہلتے پھرتے ہیں، اس پہرہ داری کے لئے "سابوٹاج" کارخانے تباہ کرنے کی سازشوں کو بہانہ بنایا گیا ہے، حالانکہ دراصل مقصد مزدوروں کو خوفزدہ رکھنا ہے،

کہ وہ حکومت کے عائد کئے ہوئے ضبط و نظام کے خلاف ہڑتال تو درکنار دم ہی نہ مار سکیں، دراصل تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے، کہ اشتراکی حکومت ایک ایسے سرمایہ دار کا نام ہے، جو تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کو نگل کر ایک بڑا سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنتا ہے۔ حکومت بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، تمام وسائل معیشت بھی اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور تمام ملک کی دولت پر بھی اس کا قاہرانہ تسلط ہوتا ہے، ظالم سرمایہ داری میں کم سے کم اس کا موقع ہے، کہ ایک سرمایہ دار فرد یا کمپنی کو چھوڑ کر مزدور کسی دوسرے سرمایہ دار کے آستانہ پر چلا جائے، یا حکومت سے فریاد کرے۔ یا ہڑتال کا ہتھیار استعمال میں لائے، لیکن جہاں اشتراکیت کا دیوتا ظلم پر اُتر آئے، وہاں یہ سب دروازے بند ہیں، وہاں تو ایک ہی کارخانہ دار ہے، وہی حاکم ہے اور رزق کے سارے وسائل پر قابض، شیطان کے ترکش میں شاید یہ آخری تیر باقی رہ گیا تھا، جو اس نے انسان پر چھوڑا ہے۔

روس میں ضروری آمدنی کے لئے وقت اور محنت کا اوسط بھی دوسرے ممالک سے بڑھا ہوا ہے، یعنی ایک روسی مزدور کو ایک کلوگرام (۲،۲ پونڈ) مکھن خریدنے کے لئے جتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اُس کے لئے اُسے تقریباً ۲۳ گھنٹے اور ۲۳ منٹ جملہ کام کرنا پڑتا ہے، حالانکہ اس کے برعکس انگلستان میں اتنی قیمت کے لئے صرف ایک گھنٹہ اور تیرہ منٹ، اور ناروے میں دو گھنٹے اور ۲۸ منٹ کام ہوتا ہے، اسی طرح ایک معمولی قسم کا سوٹ خریدنے کے لئے روسی مزدور کو ناروے کے مزدور کے مقابلہ میں ساڑھے چھ گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، ایک جوڑ جوتے کے لئے ۹۸ گھنٹے اور ۲ منٹ یا ناروے کے مزدور کے مقابلہ میں تقریباً ۶ گنا زیادہ عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔

## مزدوروں کو سخت سزائیں

۱۵ر اگست ۱۹۴۰ء کو اعلیٰ سوویٹ عدالت (U. S. S. R. Supreme court) کے فیصلہ کی رُو سے مقررہ اوقات میں صرف ۲۰ منٹ کی سُستی یا دیر کے سبب چھ ماہ تک اُجرتوں میں ۲۵ فیصدی کمی کی سزا مقرر ہے، جو لوگ فوجی سپلائی، محکمۂ آب رسانی، اور ریل کی پٹریاں بچھانے کا کام کرتے ہیں، اُن کے لئے تو نہایت سخت سزائیں مقرر ہیں۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۱ء کے ایک اعلامیہ میں کہا گیا ہے، کہ:- "فوجی سپلائی کے دفتری کارکنوں یا عام مزدوروں میں سے اگر کوئی بالارادہ اپنا کام چھوڑ دے، یا کام کرنے سے انکار کرے تو حکومت کی نظر میں اُسے مُجرم قرار دیا جائے گا، اور اس کی پاداش میں پانچ سال سے آٹھ سال تک قید بھگتنا پڑے گی"۔ اسی طرح ۱۵ر اپریل اور ۹ر مئی ۱۹۴۳ء کے اعلامیوں کی رو سے محکمہ آب رسانی اور ریل کی پٹریوں پر کام کرنے والوں کی ذمہ داریوں کو سُرخ فوج کے سپاہیوں کے مماثل قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے، کہ کام سے غیر حاضری کی صورت میں ان کی سزا بھی وہی ہوگی جو فوجی سپاہی کی ہوتی ہے چنانچہ (R S S R) کے قانون فوج کے فقرہ ۱۹۳ (۷) (د) کی رو سے "مفوضہ کام سے قصداً ارادتاً چوبیس گھنٹوں سے زائد کی غیر حاضری پر پانچ سال سے دس سال تک آزادی کو سلب کیا جاسکتا ہے"۔

آج کی روسی تعلیمی پالیسی بڑی تیزی سے وطن پرستی اور رجعت پسندی کی طرف بڑھ رہی ہے،

ادب اور فنونِ لطیفہ کی تعلیم کے علاوہ سائنس اور علوم صحیحہ کی تعلیم تک قوم پرستانہ نقطۂ نظر سے دی جانے لگی ہے، اس غرض کے لئے تاریخ کو نئے قومی نقطۂ نظر کے مطابق دوبارہ لکھا گیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے، کہ بالشویزم کی داخلی پالیسی کو کامیاب بنایا جائے، تمام مخالف سرمایہ دارانہ جذبات کو رفتہ رفتہ غیر ملکوں اور مغربی ممالک کی مخالفت میں تبدیل کر دیا جائے، سوویٹ یونین کی برتری ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے قصّے اور کہانیاں گھڑی جانے لگیں، جیسے پرانے رجواڑوں میں راجوں اور نوابوں سے عقیدت پیدا کرنے کے لے ان کے منہ لگے مسخرے بنایا کرتے تھے، آج سوویٹ نوجوانوں کو باہر کی دنیا سے یکسر بے خبر کر دیا گیا ہے، یا ان کو اس نقطۂ نظر سے تعلیم دی گئی ہے، جیسے روس کو سب پر فوقیت حاصل ہے، روس "خداؤں" کا اپنا ملک ہے، ابھی ابھی حال میں اس قسم کی (کہانیوں) میں سے ایک کہانی جنگِ عالم گیر سوویٹ یونین کی فتح سے متعلق یوں گھڑی گئی ہے، کہ "سوویٹ یونین نے فاسسٹ اور امپیریلسٹ لیڈروں کے خلاف "تن تنہا" مشرق اور مغرب میں جنگ جیتی اور اس عظیم ہنگامے میں فتح مند ہو کر نکلی" (بحوالہ

BOLSOVEIK NO17 SEPTEMBER 15 (1948) PAIGE 5

روس میں اب تو وہ دور پلٹ آیا ہے، جو کبھی زار روس کے زمانہ میں تھا، یا جیسا آج کل اکثر سرمایہ دار اور سامراجی ممالک میں ہر طرف پایا جاتا ہے، وہاں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں زیادہ تر انہیں لوگوں کو ملتی ہیں، جو کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، یا پارٹی کے سفارشی ہوتے ہیں، ان سفارشی ٹٹوؤں کے علاوہ جو لوگ آزادی سے ترکی وتازی کی طرح اپنے جوہر دکھانا چاہتے ہیں، انہیں کوئی نہیں پوچھتا، اب وہاں، کمیونسٹ نوابیت (Communist Aristrocacy) نے جنم لیا ہے، اور کمیونسٹ لارڈ حکومت کی گدیوں پر بیٹھے عوام کے جمہور سے اُسی طرح کھیل رہے ہیں، جس طرح فرانسیسی نواب انقلاب سے قبل مینڈکوں کے ٹرّانے پر نیند میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے اپنے ملازموں اور نوکروں کو زد و کوب کیا کرتے تھے، اس وقت روس میں اعلیٰ تعلیم پانے والے بہت ہی کم "خوش قسمت نوجوان ہیں، اس کی ایک وجہ تو بہی اثرات" کی کمی ہے، دوسرے اونچے درجہ کی تعلیم کے لئے پابندیاں اور سختیاں بھی اس قدر زیادہ ہیں کہ بہت ہی کم افراد ان سے نمٹ سکتے ہیں، خاص طور پر قصبات اور دیہات کے لوگوں کو تو اس کا کبھی موقع ہی نہیں آتا، اور وہ بیچارے اسی طرح گاؤں کی ہری ہری گھانس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اور مشترکہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے عمریں گزار دیتے ہیں، دنیا کی چہل پہل اور رنگینی ان سے آج بھی اتنی ہی دور ہے، جتنی پہلے کبھی تھی"

جب ایک ادیب کوئی کتاب لکھتا ہے، تو اُسے اُس کتاب کو مصدقہ بنانے کے لئے سوویٹ پروپگنڈہ افسر کے پاس بھیجنا پڑتا ہے، وہ افسر اس میں متعدد تبدیلیاں کرتا ہے، اس وقت ادیب کی بے چینی انتہائی عروج پر پہونچ جاتی ہے، اس کو ان تبدیلیوں کے مطابق اپنے مضامین کو مرتب کرنے میں سخت روحانی دُکھ ہوتا ہے، مگر چار و ناچار یہ آپریشن برداشت کرنا پڑتا ہے، اسی طرح یہ تغیرات ایک پڑھنے والے کے لئے بھی نہایت عجیب ہوتے ہیں، کیونکہ بسا اوقات وہ ایک کتاب کے مضامین کو محض اس لئے پڑھتا

اور اپنے علم کا جزو بناتا ہے، کہ اس کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن کے مطالعہ کے بعد اُسے اپنے ذہن سے خارج کرنے کے لئے زور لگائے، اِس طرح اُس کا سارا مطالعہ اور محنت ضائع ہو جاتی ہے، اور وہ علم کے اُسی نقطہ پر رہتا ہے، جہاں سے وہ چلا تھا۔

**ایک دلچسپ واقعہ!** اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے، جو ملٹری پبلشنگ ہاؤس کی جانب سے روسی مبارزین (SOVIET HEROES) کے سلسلہ کی ایک کتاب کی تیاری میں پیش آیا، یہ کتاب ایک روسی ہوا باز کرنل پی، اے پلیوتوف (P. A. PLUGOTOV) کی زندگی اور اس کے کارناموں پر لکھی تھی، اس کی اشاعت سے قبل اس کے لکھنے والے میجر اے بیوروف (A. BUROV) نے اسے پلیوتوف کو تصحیح کے لئے دکھایا، اُس نے اپنی سوانح سے متعلق صحیح اعداد و شمار اور واقعات کی جانچ کی اور انہیں درست کیا، لیکن جب یہ کتاب مکمل شکل میں چھپ کر اس کے سامنے آئی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اُس نے دیکھا کہ کتاب میں لاتعداد غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے، مثلاً اس میں بتایا گیا ہے، کہ اُس کا بچپن اُس کے وطن بلورشیا (Beloruss) میں گزرا، یہاں وہ مستقبل کی زندگی کے خواب دیکھا کرتا تھا، اور سوچا کرتا تھا، کہ کیا اس کا وطن ایک نئی وضع کی بستی بن جائے گا، جہاں خوب صورت سڑکیں نکالی جائیں گی، حالاں کہ واقعہ یہ تھا، کہ پلیوتوف بلورشیا میں پیدا تو ضرور ہوا تھا، مگر اس کا سارا بچپن یورال میں گزرا، اور وہ وہیں پلا بڑھا تھا اسی طرح ایک اور جگہ دورانِ جنگ میں پلیوتوف کے زخمی ہونے کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے، کہ "وہ آپریشن کی میز پر ہنستا ہوا لیٹا رہا" اس پر پلیوتوف نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، کہ جب اُس کے جسم سے بیس لوہے کے ٹکڑے نکالے گئے تھے، تو وہ ہنس نہیں رہا تھا! (بحوالہ (Soviet Literary Gazette)

بات دراصل یہ تھی، کہ جب یہ کتاب لکھی جا چکی تو روسی مبارزین کے سلسلۂ کتب کے مرتب اے، ڈی گوگن (GOGON) کے پاس بھیجدی گئی، اُس نے اُسے اُٹھا کر ایک اور ادیب بی، اے ویدتسکی (B. A. Vedestskii) کے حوالہ کر دیا تاکہ وہ اُس میں کچھ "ادبی نزاکتیں" پیدا کر دے، چنانچہ قلم کاری کا یہ مرحلہ اصل مصنف یا خود اس کتاب کے "موضوع" سے بغیر کسی مشورے کے تکمیل کو پہنچا، اور اس میں وہ سب کچھ بھر دیا گیا، جو ایک روسی ہیرو کو انتہائی بلندی پر پہنچانے کے لئے ضروری تھا، اور جس کے ذریعہ برسر اقتدار شخصیتوں کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی تھی۔

کمنزم (Communism) کا تذکرہ کرتے وقت ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن میں زبردست فرق ہے، ۱۹۲۵ء میں "کمنزم کی تحلیل اور برخاستگی کی خاصی تفصیل موجود ہے، لیکن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن میں اس تفصیل کو صفحۂ قرطاس سے محو کر دیا گیا، اسی طرح "پنکراٹووا" (Pankratova) کی کتاب میں روس اور جاپان کی لڑائی کو شکلیں بدل بدل پیش کیا گیا ہے، مثلاً ۱۹۴۲ء کے ایڈیشن میں روس کی شکست خوردگی کو پوری طرح ظاہر کیا گیا ہے، لیکن ۱۹۴۵ء کے ایڈیشن میں اس کھلی ہوئی حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے، پہلے "فوج" کے لئے "زارسٹ فوج" (Tsarist Army)

کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، لیکن بعد میں قوم پرستی کو ابھارنے کے لئے "روسی فوج" (Russian Army) لکھا جانے لگا، مگر شکست اور ناکامی کے جتنے واقعات تھے سب کے سب "روسی فوج" کے بجائے "زار شاہی" (Tsarist Government) کی طرف منسوب کئے گئے، یہ ردّ و بدل نہایت ہی مضحکہ خیز اور دل چسپ ہے، اس لڑائی میں صلح کا مطالبہ کس کی طرف سے ہوا؟! یہ سوال بھی نہایت ڈرامائی بن گیا ہے، کیوں کہ کتاب کے دو مختلف ایڈیشن دو متضاد باتیں بیان کرتے ہیں، ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن میں بتایا گیا ہے کہ: "جنگ کی وجہ سے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۵ء تک انقلاب بہت تیز رفتار ہو گیا، نتیجہ انقلاب کی بڑھتی ہوئی تیزی کو روکنے کے لئے زار شاہی نے ۲۳ / اگست ۱۹۰۵ء کو جاپان کو صلح کی پیش کش کی"

لیکن اس کے برعکس ۱۹۴۸ء کے ایڈیشن میں درج ہے:- "جنگ کی وجہ سے جاپان اس قدر پریشان ہو گیا تھا، اور اسے اس قدر نقصان پہنچا تھا، کہ "سوشیما" (TSUSHIMA) کی لڑائی کے بعد اس نے مجبور ہو کر صلح کی تجویز رکھی" !!

ان تمام مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اور ایک خاص پارٹی کے اقتدار کے تحفظ کے لئے روسی حکومت کس طرح "ادب" (Sikaramushka) پر نگرانی کرتی ہے۔ افسانہ نویسوں اور تفریحی ادب کے میدان میں اپنے کارنامے دکھانے والوں کا گروہ بھی ان پابندیوں سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ جب اونچے ادبی کاموں میں یہ اصول برتا جاتا ہے، تو ان معمولی درجہ کے کاموں میں "آزادیٔ تحریر" تو تقریباً ناپید ہے، روس میں صرف وہی ادیب اپنا نام پیدا کر سکتا ہے جو حکومت کا خوشامدی ہو، اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے رہوار قلم کی باگیں موڑ دے، جس ادیب میں ابن الوقتی اور زمانہ پرستی کا یہ جوہر نہیں ہے، وہ کسی طرح سوویٹ سماج میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتا، جو شخص ٹھوس حقائق سے تعلق رکھنا چاہتا ہے، وہ جلد ہی مخالف سوویٹ زمرے میں شریک ہو جاتا، اور اُس کی قبر ٹراٹسکی کی قبر کے برابر بنا دی جاتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے، کہ روسی حکومت کو آئے دن اپنے نظریات افکار اور اُصولوں میں یہ تبدیلیاں کیوں کرنی پڑتی ہیں؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ کمیونزم کے پاس سرے سے کوئی مستقل حقیقت ہی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنی عمارت کو لامحدود بلندی تک تعمیر کرتی چلی جائے بلکہ اُسے ہر نئے طلوع آفتاب کے ساتھ پُرانی عمارت گرا کر ایک نئی عمارت کا آغاز کرنا پڑتا ہے۔

## ملزموں کی درگت

۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ بلغاری پارلیمان کے ایک ممبر اور کاشت کار پارٹی کے لیڈر "پیٹر کوف" کو اچانک گرفتار کر لیا گیا، بلغاریہ "بلقان" کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے، جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، اور ایک مدت تک ترکی کے قبضہ میں رہ چکی ہے، لیکن اب ایک اشتراکی ریاست ہے، اور روس کے زیر نگیں ہے۔

دنیا نہیں جانتی کہ "پیٹر کوف" سے کون سا جرم سرزد ہوا تھا، بلغاری عوام کو کوئی علم نہ ہوا کہ ہمارے لیڈر کی خطا کیا ہے، اگر اس کا کوئی قصور ہو سکتا تھا، تو یہ کہ وہ روسی استعماریت کو تسلیم

کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اسٹالن کی آمریت کے سامنے جھکنا نہ چاہتا تھا ــــــ اور اسی بنا پر اُسے پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا گیا، اور جھوٹے الزامات کی ایک طویل فہرست اس کے خلاف تیار کر دی گئی۔

تین مہینوں کے بعد پیٹر کوئف کو رہا کر دیا گیا ــــ لیکن اس قلیل عرصہ میں اس کی صحت تباہ ہو چکی تھی، وہ ہڈیوں کا ایک مریل سا ڈھانچہ رہ گیا تھا، ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید قسم کی ذہنی اور اعصابی کشمکش میں مبتلا ہے وہ اس حالت کو کیوں کر پہنچا؟ ــــ اس کا جواب خود اس نے دیا، کہ وحشت اور بربریت کے جتنے حربے ہو سکتے تھے، وہ اس پر استعمال کئے گئے، تاکہ وہ ان الزامات کا اقرار کر لے ــــ بیس بیس دن تک سوائے روٹی کے چند ٹکڑوں اور پانی کے اسے کچھ کھانے کو نہیں دیا گیا، پانچ پانچ دن تک اُسے بھوکا پیاسا رکھا گیا، اور سونے کی مہلت بھی نہیں دی گئی، چار چار دن مسلسل اس پر کوڑے برستے رہے، اور اس پوری عقوبت کے دوران میں اُس پر جرح بھی ہوتی رہی۔

اس جہنم زار سے نکلے ہوئے کوئف کو زیادہ دن نہ ہوئے تھے، کہ فروری ۱۹۴۸ء میں اُسے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، اور اس مرتبہ اس نے بہت جلد اقرارِ جرم کر لیا، اور اپنے لیڈر پیٹر کے خلاف شہادت بھی دے دی، چنانچہ ساڑھے بارہ سال کے لئے اسے متمدن دنیا سے الگ کر دیا گیا، اتفاق ایسا ہوا کہ گرفتاری سے تھوڑی دیر پہلے کوئف کو پتہ چل گیا کہ جبر و استبداد کی بجلی دوبارہ گرنے والی ہے، اور اسے یہ بھی اندازہ تھا، کہ اس مرتبہ اس کی قوتِ مدافعت ساتھ نہیں دے سکے گی چنانچہ اس موقعہ کو اس نے غنیمت جانا اور بلغاری پارلیمان کو مخاطب کر کے ایک بیان لکھ دیا، جسے بعد میں کوئف نے ایوان میں پڑھ کر سنایا، اس نے لکھا:-

"میں آپ کے سامنے اعلان کرتا ہوں، اور آپ کی معرفت بلغاری عوام تک اپنا یہ پیغام پہنچا دینا چاہتا ہوں، کہ میری گرفتاری کے بعد اگر میرا اقرار نامہ شائع کیا جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ میرا نہیں ہوگا، اس میں میری رضا و رغبت شامل نہیں ہوگی، میں یہ پیشین گوئی اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ میں ایک بار جیل کے انسانیت سوز مظالم سے دوچار ہو چکا ہوں، اور جانتا ہوں کہ "میرے جیسے مجرم" کن حالات میں اور کس طرح اپنے جرم" کا اقرار کر لیتے ہیں۔ میں اپنے سیاسی رفقاء سے درخواست کرتا ہوں کہ جب وہ میرے اقبالِ جرم کی خبریں پڑھیں تو ان پر ایمان نہ لائیں، اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں، کہ اس قسم کے اقرار ناموں پر ایسی حالت میں دستخط کئے جاتے ہیں، جب ایک آدمی کی قوتِ ارادی وحشت و بربریت کے مظاہروں تلے کچل دی جاتی ہے۔ اور اسے اپنی رائے پر ذرہ برابر بھی اختیار نہیں رہ جاتا۔"

## ہر مجرم اقراری کیوں ہے؟

یہ ان سینکڑوں اور ہزاروں مقدمات میں سے ایک کی روئیداد ہے، جو سوویٹ روس اور اس کی ماتحت اشتراکی ریاستوں میں پیش ہوتے رہتے ہیں، ان مقدمات کی سب سے بڑی خصوصیت جس کا بھید نہیں کھلتا۔ وہ یہ ہے کہ ہر مجرم عدالت میں پیش ہونے سے پہلے اپنے "جرم" کا اقرار کر لیتا ہے، اس بھید پر پیٹر کوئف

کا مقدمہ کچھ روشنی ڈالتا ہے، یعنی مجرم کو مسلسل جسمانی تکالیف میں مبتلا رکھ کر اس کے بال بچوں کو مارنے کی دھمکیاں سُنا کر، بھوکا رکھ کر، سونے کی مہلت نہ دے کر اور طرح طرح کے عذاب کے ذریعہ اس کے دماغی توازن کو کمزور کر دیا جاتا ہے، اور وہ اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ مزید عقوبت سے بچنے کے لئے یا اپنے بال بچوں کو مصائب سے بچانے کے لئے ذلیل سے ذلیل حرکت پر آمادہ ہو جاتا ہے، بعض لوگ تو اتنا ڈر جاتے ہیں، کہ وہ کھلی عدالت میں اپنے سابقہ بیان کی تردید کی بھی جُرأت نہیں کر سکتے، کیوں کہ انہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے، کہ بعد میں پھر ان پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔

اشتراکی نظامِ حکومت میں قانون، عدالت اور انصاف کا تصوّر دنیا کے دوسرے تصوّرات سے بالکل جداگانہ ہے، سوویٹ روس میں حکومت کو کلّی اختیارات ہیں کہ وہ کسی آدمی کو بغیر جُرم کی وضاحت کرے مہینوں اور سالوں نظر بند رکھ سکتی ہے، اور ملزم کو انصاف کی اپیل کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، پھر غدّاری اور بغاوت جیسے سنگین جُرم کے متعلق قوانین اتنے مبہم رکھے گئے ہیں، کہ معمولی سا بہانہ لے کر فردِ جُرم عاید کی جا سکتی ہے، کمیونسٹ مبلغین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ سوویٹ روس میں عوام کی اپنی حکومت ہے، تو یہ بالکل غلط ہے، وہاں کا ہر شہری حکومت کے زرخرید غلام کی سی حیثیت رکھتا ہے، وہ ریاست کی ملکیت ہوتا ہے، وہ کہ اس کا معمار، عدالتوں کی بنیاد عدل و انصاف پر نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کا مقصد قانون کو بہ جبر عوام پر مسلّط کرنا ہوتا ہے۔ خود مسٹر وشنسکی نے اپنی کتاب "سوویٹ ریاست کا قانون" (THE LAW OF THE SOVIET STATE) میں لکھا ہے۔ کہ

"عدالت جب کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتی ہے، تو اس کا مطمحِ نظر عدل و انصاف کا کوئی موہوم معیار نہیں ہوتا، بلکہ اس کا بنیادی نصب العین عوام میں سوویٹ قانون کا احترام پیدا کرنا ہوتا ہے۔"

## استبداد

" مارکسیت اگرچہ مادی لحاظ سے ایک استبدادی اور آمری نظامِ حکومت کی شدید مخالف تھی لیکن عملی لحاظ سے مارکسیت کا نظامِ معاش و سیاست شدید آہنی گرفت کے بغیر ایک دن نہیں چل سکتا، اس نظام کی فطرت ہی ایک جابر و قاہر ڈکٹیٹر شپ نظام کی طالب ہے اور ہر وقت ایک ایسی طاقت کا تسلط چاہتی ہے جو ملک کے باشندوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑا رکھے ——— روس کا ایک پُر جوش ہمدرد ڈاکٹر ہیکر اپنی کتاب (RELIGION UNDER THE SOVIET) میں تحریر کرتا ہے۔ کہ

" بالشوزم اپنی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ بلاشبہ ایک استبداد ہے، جس کی شدّت قدیم استبداد سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

اس استبداد پر روسی گستاپو پولیس (G. P. V.) جسے عام روسی زبان میں چیکا (TCHEKA) کہا جاتا ہے ایک مزید اضافہ ہے۔ یہ پولیس جرمنی کی نازی گستاپو کی حقیقی بہن ہے۔ اس کی کارروائی اور عدالتیں حتیٰ کہ سزائیں بھی خفیہ ہوتی ہیں اور انتہائی اخفا میں اسٹالین اور اس کی پارٹی کے بڑے سے لے کر ہر چھوٹے رقیب کو موت کی نیند سلا دیتی ہے۔

اپنی ستم رانیوں اور جفا کاریوں میں یہ پولیس فرد ہے۔ سوویٹ کمیونزم کے مصنف لکھتے ہیں:-

"یہ خفیہ پولیس زار روس کے عہد کی یادگار ہے اس وقت اسے "اخ رانا" کہتے تھے۔ لیکن زار کی خفیہ پولیس اور چیکا کا باہم کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اوّل الذکر کے اختیارات بالکل محدود تھے۔ مگر موخر قید و بند، جلا وطنی۔ موت اور مہیب سے مہیب سزائیں دینے کی مجاز مطلق ہے۔"

سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک کا عہد اس پولیس کے جور و ستم کا سب سے خونیں عہد تھا۔ سوویٹ کمیونزم والے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کے دستِ ستم سے کوئی انسانی جان محفوظ نہ تھی۔ یہاں روسی گستاپو کے کارناموں کی روداد سنانے کا موقع نہیں ہے اور یہاں اس خونیں عہد کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی جو اس خفیہ پولیس کی خونریزیوں سے لالہ زار ہے۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ ایران کی سرحد سے ایک سدِ سکندری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے انسانیت سُرخ لباس میں ایک ثلث صدی سے دنیا کی سخت ترین فاسستی آمریت کی فولادی زنجیریں جھنکار رہی ہیں۔

اِس سرزمین کے جور و استبداد کے نتیجہ میں تین سو روسی بیویاں اپنے امریکی اور غیر روسی خاوندوں سے محض اس لئے نہیں ملنے دی جاتی ہیں کہ کہیں شوہر کی محبت میں سوویٹ روس کے داخلی حالات کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں (یونائیٹڈ پریس آف امریکہ) روس کے بیشتر اضلاع غیر ملکی باشندوں پر بند ہیں خواہ وہ عام سیّاح ہوں۔ کسی ملک کے نمایندہ ہوں یا کسی دوست مملکت کے سفیر ہوں۔

## روس میں مذہب

مارکس اور انجلز نے اپنی تحریروں کے دفاتر میں انکار خدا کے بارے میں غیر مصالحانہ اور مثبت پالیسی اختیار کی۔ ان ہی کی طرح لینن نے اپنی تعلیم کی بنیاد انکارِ خدا یا مابعد الطبیعی طاقت کے اظہار کے انکار پر پورا پورا زور نہ صرف کیا بلکہ وہ لگاتار اصرار کرتا رہا کہ انسانوں کی ہر ضرورت کا حل (مادی یا ذہنی) سائنس کی دسترس سے باہر نہیں۔ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے جو ہدایات درکار ہیں وہ آہستہ آہستہ انسان کو علم کی ترقی اور سائنس کے تجربات سے مل سکتی ہیں (کسی غیر انسانی غیبی طاقت کی رہنمائی کی ضرورت نہیں) اُس نے کہا کہ واقعتاً کوئی غیبی طاقت بھی تو نہیں یہ معجزات وغیرہ محض ڈھکوسلے ہیں۔ یہ ابدی زندگی کا تخیل غلط ہے۔ موت کے بعد کوئی دوسری زندگی بالکل ہے ہی نہیں بس یہی اصل زندگی ہے اسے انکارِ خدا۔ انکارِ وحی اور انکار آخرت پر اتنا اصرار تھا کہ وہ اس بارے میں شک و شبہ کو بھی راہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال ہے کہ مذہب مجموعۂ اوہام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صرف آدمی کو جادو ٹونے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس کی بنیاد علم و حکمت پر نہیں اور جیسا کہ مارکس نے کہا تھا مذہب فی الواقع عوام کے لئے افیون کا ہی کام دیتا ہے۔

## جبری تعلیم اور مظالم

حکومت کی پالیسی اور عمل کی بنیاد چونکہ انکارِ خدا کے اذعانہ اور بے باکانہ نظریہ پر رکھی گئی۔ اس لئے پہلے تو ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کے لوناچارسکی

(Bolshevik manifesto) کے اعلان کے مطابق فوراً ہی تمام مدارس سے مذہبی تعلیم بند کر کے ان کو بے دین بنایا گیا (ص ۸۱۰) اور پھر جن اصولوں پر اشتراکی کارکن تیار کئے گئے وہ یہ تھے (۱) اشتراکیت پر ایمان (۲) خدا کا انکار (۳) خدا کی مقرر کردہ اخلاقی اقدار کی تبدیلی، چونکہ انقلابی جماعت کا ہر رکن ان جذبات کے نشہ میں چور تھا۔ لہٰذا مذہبی طبقہ کے خلاف اور عبادت گاہوں پر اسی شدت سے سختی کی گئی۔ جس شدت سے سرمایہ داروں پر کی گئی۔ خانقاہوں اور عبادت خانوں کے اوقاف کو ضبط کر کے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ مذہبی قسم کے لوگوں کو نامعلوم تعداد میں مار دیا گیا۔

## سُرخ مذہب کی آندھی

عوام میں انکارِ خدا کے عقیدہ کی آندھی اس زور شور سے چلائی گئی کہ اچھے اچھے لوگوں کو ان کے عقاید کی جڑوں سے ہلا دیا اور نتیجۃً گاؤں میں فیکٹریوں میں انکارِ خدا کے مذہب میں لوگ جوق در جوق اسی طرح آئے جس طرح ہزاروں سال پہلے عیسائیت میں گروہ در گروہ داخل ہوئے تھے عوام کو تیار بھی اسی جذبہ کے تحت کیا گیا تھا۔ اور ان میں سے بھی کمیٹیوں کے ارکان وہ لوگ تھے جو مذہب کا آخری نشان بھی مٹانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ حکومتِ اشتراکی نے ان کو اختیار دے دیا کہ ایسی کمیٹیوں کی اکثریت کو حق ہے کہ مذہبی عبادت گاہوں اور معبدوں کو جو چاہیں کریں۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو کلبوں اسکولوں اور گوداموں میں تبدیل کر دیا گیا۔ حکومت روس عوام کے اس جذبہ کو شہ دیتی اور اُبھارتی تھی۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو مذہب کے خلاف سرگرمیوں کا مرکز بنایا گیا۔ شہری عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو خدا کے خلاف میوزیم میں تبدیل کیا گیا۔

## فوج در فوج داخلہ

ہم بھول جاتے ہیں کہ رضاکارانہ طور پر عہدِ وسطیٰ میں عیسائیت قبول کرنے کے لئے عوام نے گروہ در گروہ اپنے مذہب کو تبدیل کیا۔ بعینہ روس میں ۱۹۱۷ء کے بعد لینن کا مذہب قبول کرنے کے لئے عوام میں گروہ در گروہ مذہب کی تبدیلیاں ہوئیں۔ چونکہ لینن کا مذہب اشتراکیت زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی شریعت کا نفاذ چاہتا ہے۔ اس لئے ڈیب لکھتا ہے کہ "ان لاکھوں نفوس کو اپنے نئے طریقِ زندگی کا خوگر بنانا اور ایک نئے ضابطۂ اخلاق کا ان کے دلوں میں اُتارنا قدرتی طور پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کے استیصال اور وسائلِ پیداوار کو قومی ملکیت میں تبدیل کرنے سے مشکل اور دیرپا کام تھا۔ (صفحہ ۵۷) اس مقصد کے حصول کے لئے اشتراکیوں نے پہلے پہل حکومت ملنے کے فوری جوش اور طاقت کے نشہ میں آ کر مذہب کے علم برداروں کا قتل۔ ان کی بے عزتیاں ان پر سفاکیاں اور زیادتیوں کا جو خونی ڈرامہ کھیلا اس کے اثر سے لوگ مذہب سے کنارہ کش ہو گئے۔ باقی سہم گئے اور ڈر کر رہ گئے۔

## منظم جماعتیں

اب حکومت روس نے موقع شناسی سے کام لیا اور مذہبی طبقہ کے عام قتل و غارت اور عبادت گاہوں کو انکارِ خدا کے مراکز میں تبدیل کرنے کے پروگرام کی بجائے دوسری مہم جاری کی۔ پہلے دین اشتراکیت کا فرداً فرداً لوگوں میں پروپگنڈا کیا گیا۔ پھر ہم خیال لوگوں کو سوسائٹیوں اور گروہوں میں منظم کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری

کیا گیا۔اس کا نام تھا "منکر خدا" ان لوگوں کی ۱۹۲۵ء میں ماسکو میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں طے پایا کہ مذہب کا مقابلہ کرنے کے طریقوں کو برسرِ عام لانے اور مختلف طبقوں میں بے دینی پھیلانے کے لئے مقالات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔خصوصاً یہ سلسلہ بچوں نوجوانوں جن کا آغاز شباب ہے کالج کے طلبار۔سُرخ فوج کے ارکان۔گاؤں کے کلب اور مختلف اقلیتوں میں جاری کیا جائے۔ بعد ازاں منفرد کام کرنے والوں کو بے دینوں کی انجمن کے تحت ایک سلک میں منسلک کر دیا گیا جس نے ملک میں اپنی شاخوں کا جال پھیلا دیا۔ ۱۹۲۹ء میں اس انجمن کو "انجمن مجاہدین ملاحدہ" میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت اس جماعت کی شاخوں کی تعداد ۹۰۰۰ ہزار تھی۔ تمام ارکان کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ نہ تھی کل ایک صد سے زیادہ نسلی اور لسانی گروہوں کے نمایندے تھے اب اس انجمن کا کام صرف لادینی پھیلانا ہی نہیں تھا بلکہ ساتھ ساتھ اجتماعی کاشتکاری کی اسکیم کو رائج کرنا اور مدافعانہ جنگ کے لئے پروپگنڈا کرنا بھی تھا۔گزشتہ ۹ سالوں میں یہ تحریک غیر معمولی رفتار سے بڑھی ۹۰۰۰ شاخوں سے یہ سال بہ سال اس طرح بڑھی ۳۰،۰۰۰ ۵۰۰۰ اور ۷۰۰۰۰ شاخیں ہوگئیں اور ان ارکان کی تعداد جو معمولی فیسیں ادا کرتے تھے۔ لاکھوں تک پہونچ گئی۔

## سرمایہ اور افلاس کی کش مکش

"اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں" ——— سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں وہ اصل کتاب میں مستند حوالوں کے ساتھ درج ہیں! یہ نہیں ہے کہ مضمون نگاروں نے سُنی سنائی باتوں کو یوں ہی لکھ دیا ہو "کتاب" میں اخذ و اقتباس کے حوالے " RFERENCES " دیئے گئے ہیں اور بعض تو روس کے مصنفین کی کتابوں اور وہاں کے اخبارات و جرائد سے ماخوذ ہیں!

کمیونزم کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ اس پر ہمارا ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ——— اس زمین میں پھول اور کانٹے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح بھلائی اور برائی اور ظلم و انصاف دنیا میں شاید تاریخ انسانیت کے آغاز ہی سے پائے جاتے ہیں اس لئے ملوکیت اور سرمایہ داری کی لعنت بھی بہت قدیم ہے۔

سرمایہ داری اور امپریلزم کے ہاتھوں خدا کی مخلوق بہت کچھ پریشان رہی ہے ——— مگر آج کے زمانہ میں سرمایہ داری کی دست درازیاں اور جاگیردارانہ نظام کی ستم رانیاں بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہیں اور اس کے بھی کچھ اسباب اور محرکات ہیں :۔

(۱) انسانی آبادی میں اضافہ ——— گزشتہ سو سال کے مقابلہ میں دنیا کی آبادی تقریباً دوگنی زاید ہو گئی ہے، آبادی کی کثرت نے بعض ممالک میں "غذا" کے مسئلہ کو بڑا نازک اور دشوار بنا دیا ہے! جہاں غذا کی کمی ہے وہاں کے لوگ خاص طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان امیروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے عیش و امارت نے ہماری یہ حالت کر دی ہے، وہ تو طرح طرح کے ذائقہ دار کھانے اُڑاتے ہیں اور ہم کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔

(۲) تہذیب و تمدن کی بوقلمونیوں نے عیش و آرائش کے اسباب میں غیر معمولی تنوع پیدا کر دیا ہے اور "سرمایہ" کے اظہار و نمود کے لئے قدم قدم پر مواقع موجود ہیں! جس کے گھر میں ریڈیو سیٹ نہیں ہے وہ دوسرے کے گھر میں ریڈیو سیٹ دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتا ہے، جن کے یہاں موٹر نہیں ہیں وہ موٹر نشینوں کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں اور یہ سلسلہ ہاتھ کی انگوٹھی، جیب کے فاؤنٹین پین اور کلائی کی گھڑی سے لیکر مکانوں کے اسباب آرائش تک پھیلا ہوا ہے۔

(۳) پچھلے زمانہ میں "سرمایہ" کے اظہار کے ذرائع محدود تھے، آج ان کی کوئی انتہا نہیں، ریل گاڑیوں میں نیچے اور اونچے درجے! سینما ہاؤسوں اور تھیٹر ہالوں میں چار آنے سے لیکر پانچ اور دس روپے تک کا تفاوت! اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر اہل جاہ و دولت ہی کی تصویریں چھپتی ہیں! طرح طرح کی سواریاں، کلب گھروں اور ہوٹلوں کی عیش! سیر و سفر کا لطف اور اس کے لئے آسانیاں ——— جن کو یہ سہولتیں اور آسانیاں میسر نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا سبب فقدان دولت یا دولت کی کمی ہے ——— وہ لوگ "سرمایہ داروں" کی عیش سامانیوں اور لطف اندوزیوں کو "ظلم" سے تعبیر کرتے ہیں اور سرمایہ داری کے خلاف نفرت ہی کا نہیں بلکہ عداوت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

(۴) وہ ذہین لوگ جو "بے قید" زندگی گزارنا چاہتے ہیں، جو خدا کے منکر ہیں اور اخلاقی قدروں پر ایمان نہیں رکھتے ——— انھوں نے سرمایہ اور افلاس کی کشمکش کو پروپیگنڈے کے ذریعہ اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے، اس پروپیگنڈے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے سوا دنیا کے ہر نظام میں کوئی نہ کوئی اخلاقی پابندی ضرور پائی جاتی ہے، لہٰذا ہر نظام کو ٹوٹ جانا اور توڑ دینا چاہیئے تاکہ اشتراکی نظام کے لئے جگہ خالی ہو جائے اور اشتراکی حکومت میں وہ اخلاقی قیود سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کر سکیں۔

عوام بیچارے فلسفۂ اشتراکیت کو کیا جانیں؟ ان کے کانوں میں تو یہ باتیں پڑتی رہتی ہیں کہ "کمیونزم" بھوکوں کو روٹی ننگوں کو کپڑا اور بے روزگاروں کو روزگار دیتا ہے، اس لئے "کمیونزم" ان میں مقبول ہو رہا ہے اور "کمیونزم" پر ہی کیا موقوف ہے، ننگے بھوکے لوگ ہر اس نظام اور تحریک کی ہم نوائی کے لئے تیار ہو سکتے ہیں جو ان کو روٹی اور کپڑا دیتی ہو، چاہے وہ "ڈکٹیٹر شپ" یا "امپیریلزم" ہی کیوں نہ ہو!

دنیا میں ایسا کون ہے جو تنگ دست اور پریشان حال رہنا چاہتا ہو، ہر آدمی خوش حال زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتا ہے ——— لہٰذا اس "تمنا" اور "آرزو" کے حصول کے لئے انسانوں کو آسانی کے ساتھ ابھارا جا سکتا ہے، اگر سوویٹ روس میں عوامی پروپیگنڈے کی اجازت دیدی جائے تو خود وہاں کے لوگوں کو حاکموں اور رعایا کے معیار زندگی کے تفاوت کو دکھا کر، انقلاب اور بغاوت کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے، یوکرین کے محنت کش کسان سے جب یہ کہا جائے گا کہ "آ تجھے ہم اسٹالن کی زندگی کی سہولتیں اور مسرتیں دلانے کی ضمانت دیتے ہیں" تو وہ بھی آپ کے ساتھ "انقلاب زندہ باد" اور "اسٹالن مردہ باد" کے نعرے لگانے کے لئے آمادہ ہو جائے گا ——— ہم کہتے ہیں بھڑکانے

والے بیٹوں کو اُن کے والدین سے اور بیویوں کو شوہروں سے بدظن بلکہ مخالف بنا دیتے ہیں، اور اس بدظنی اور مخالفت کی بنیاد لالچ ہوتی ہے، یعنی بیٹوں سے یہ کہا جائے کہ تمہارے والدین تو خوب کشادہ دستی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور تم پر یہ پابندیاں ہیں اور بیویوں کو بھی اسی قسم کا احساس دلایا جائے تو منفعت ........ اور مساوات کے نام پر بغاوت کی آگ بہت جلد بھڑک سکتی ہے!

## غلط فہمیاں

سرمایہ داری، جاگیرداری اور ملوکیت کے نظام میں جو بُرائیاں ہو سکتی ہیں، وہ "سوویٹ روس" میں بھی موجود ہیں، وہاں معیارِ معیشت کے اعتبار سے اونچے، نیچے طبقے ہیں جو حکومت ریل کے ڈبوں اور سینماؤں کی سیٹوں میں طبقاتی امتیاز کو ختم نہ کر سکی، وہ معیشت و معاشرت میں طبقہ واریت کو بھلا کس طرح مٹا سکتی ہے۔

بعض اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "اشتراکیت" بس معیشت کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے، مذہبی معتقدات سے اُس کو کوئی سروکار نہیں ہے یعنی ایک مسلمان ایک ہی وقت میں مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور اشتراکی بھی!

یہ بڑی خطرناک قسم کی ناسمجھی اور سخت مضرت رساں بے دانشی ہے، اشتراکیت اپنے مزاج سرشت (nature) فطرت، ساخت، ہیئتِ ترکیبی اور اُصول کے اعتبار سے "لادین" اور "منکر خدا" واقع ہوئی ہے اُس کا نظام نہ صرف یہ کہ خدا کے تصوّر سے آزاد ہے بلکہ "خدا" کی مخالفت اور بغاوت پر مبنی ہے، اشتراکی رہنماؤں کی تحریریں اس کی شاہد ہیں اُن کو ہر کوئی پڑھ سکتا ہے اور سوویٹ روس میں انقلاب کے بعد مذہب کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ بھی اس کی گواہی دے رہا ہے —— اتنی کھلی ہوئی دلیلوں اور واضح شواہد کے بعد پھر بھی کوئی یہی کہے جائے کہ "اشتراکیت" مذہب سے کوئی سروکار نہیں رکھتی" تو اس عقل اور فہم کا آدمی انسانی معاشرے میں جہالت اور دیوانگی کے جراثیم پھیلا رہا ہے!

روس کا اشتراکی نظام معیشت گاہوں میں آدمی کو مشین کا پُرزہ بنا کر رکھ دیتا ہے اور معاشرت میں جانوروں کی طرح آزاد چھوڑ دیتا ہے اُس کے یہاں "انتہا" اور "غلو" ہے اعتدال اور اقتصاد نہیں ہے.. ........ اور انسانی معاشرے کے لئے اعتدال اور اقتصاد بہت ضروری ہے۔

مذہب پر طنز کی جاتی ہے کہ اُس میں شدید عصبیت پائی جاتی ہے حالاں کہ اشتراکیت کی عصبیت کے مقابلہ میں مذہب کی عصبیت "رواداری" نظر آتی ہے، سوویٹ روس میں کوئی شخص حکومت کے کسی فعل اور آئین کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا، روس کی پوری حکومت میں ایک اخبار اور رسالہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو حکومت کی پالیسی کے خلاف نکتہ چینی بھی کر سکے، بادشاہتوں میں بھی اس بُری طرح آزادیِ رائے کا گلا نہیں گھونٹا گیا، حزبِ مخالف (opposition party) کے لئے سوویٹ روس کے جیل خانوں میں تو جگہ مل سکتی ہے مگر ملک کے اور کسی حصہ میں اُس کے لئے کوئی گنجایش نہیں ہے —— روس کے کسانوں نے حکومت کی آئینی سختیوں کے خلاف ایجی ٹیشن کیا

تھا سو اُس کی پاداش میں لاکھوں کسانوں کو گولیوں کا نشانہ بن جانا پڑا،
فرعون اور نمرود کے بارے میں جو قصے سُنتے آئے ہیں اسٹالن کی "خدائی" کے آگے وہ سب داستانیں پھیکی معلوم ہوتی ہیں، بڑی بڑی حکومتوں کے سُفراء مہینوں اور برسوں اس تمنا میں رہتے ہیں کہ کسی طرح حضورِ پُر نور اسٹالین کی "بارگاہِ کیواں جناب" میں شرفِ باریابی حاصل ہو جائے مگر یہ سعادت شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے، اسٹالین نے اپنی شخصیت کے اردگرد ایسا طلسم تیار کیا ہے کہ اگر وہ مر بھی جائے تو لوگوں کو اس کی موت کی خبر نہیں ہو سکتی۔ اسکولوں اور کالجوں میں "اسٹالین" کی کبریائی کے ترانے گائے جاتے ہیں، روسی تاریخ کے صفحات اسٹالین کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں رب العٰلمین کی پرستش کا مذاق اُڑانے والے اپنے ہی جیسے انسان کی پرستش کر رہے ہیں!
سوویٹ روس میں سُفراء تک کو حکومت کے اکناف و اطراف میں گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے، دار الخلافہ کا رقبہ اُن کی جولان گاہ ہے بس اُس سے آگے نہیں جا سکتے، اخباروں' اداروں اور عوام سے وہ ربط پیدا نہیں کر سکتے۔
اشتراکی نظام میں انسانی جان کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہے، کسی غیر اشتراکی حکومت میں صرف ہیجان پھیلانے کے لئے مسافروں کی ٹرین کو تباہ کیا جا سکتا ہے اور ہزاروں آدمیوں کے جلسہ کو بم سے اُڑا دے سکتے ہیں۔

## اسلام

اشتراکیت چوں کہ غیر فطری نظام ہے اس لئے یہ نظام بہت دن تک چل نہیں سکتا، کیا عجب ہے کہ ہم اپنی زندگی ہی میں اس کی شکست دیکھ لیں! یہ تو زمانہ کی ہوا ہے جو اسے اُبھرنے کا موقعہ مل گیا —— اس دنیا میں حجاج، نیرو اور چنگیز کو بھی تو اُبھرنے کے موقعے ملے ہیں، وقتی کامیابی پر اشتراکی حضرات نہ اترائیں، ایسے طوفان تو آتے ہیں چڑھتے ہی رہتے ہیں۔
انسانیت کے لئے بہترین نظام "اسلام" ہے جو زیادہ سے زیادہ قابلِ عمل ہے، یہ نظام ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے اپنی عقل کے زور سے تراش لیا ہو، یہ خالقِ کون و مکاں کا بھیجا ہوا نظام ہے اس لئے "اسلامی نظام" انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔
اسلامی نظام میں آدمی کو مشین بنا کر نہیں رکھا جاتا، اسلام انسانوں پر اس ظلم کو ہرگز روا نہیں رکھ سکتا، وہ آدمی کو اس کی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کے زیادہ سے زیادہ موقع اور لائسنس عطا کرتا ہے اور پھر ساتھ ہی اُس نے چند اخلاقی حدود مقرر کر دیئے ہیں تاکہ انسانی زندگی حیوانی زندگی نہ بننے پائے "بے اخلاق زندگی" تو جانوروں ہی کو زیبا ہے، انسان حیوان سے بہر حال بلند ہے اور اُس کی اس بلندی کی بنیاد ہے کردار کی پاکیزگی!
"اسلام"، کمیونزم کی طرح وہ غلط بات نہیں کہتا کہ "سرمایہ داری" کی مخالفت بھی کی جاتی ہے اور سرمایہ داری کے لوازم بھی موجود ہیں، اسلام "سرمایہ" سے دشمنی نہیں رکھتا، وہ چاہتا ہے کہ "سرمایہ"

سے نیکی کے حدود میں رہ کر فائدہ اُٹھایا جائے ـــــ اسلام نے "سود" کو اُس وقت ناجائز قرار دیا تھا جبکہ اقتصادی نزاکتوں سے دنیا ناآشنا تھی، حُرمتِ سُود "سرمایہ داری" پر سب سے زیادہ کاری ضرب ہے اور اس اوّلیت کے پھول اسلام ہی کے سہرے میں نظر آتے ہیں۔

اسلام نے غلاموں کو وہ مقام عطا کیا جو آج "آزاد" انسانوں کو حاصل نہیں ہے، اسلامی حکومت کے خلیفہ ـــــ عمر فاروقؓ جب بیت المقدس میں پہونچے ہیں تو غلام اُونٹ پر سوار تھا اور آپ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے زمین پر چل رہے تھے ـــــ اسلامی خلیفہ کے یہاں نہ حاجب تھے اور نہ دربان! ہر کسی کے لئے اُن کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ عام لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر رہتے تھے، اُن کی غلطی پر ایک بڑھیا بھی اُنھیں ٹوک سکتی تھی، اُن پر عدالت میں مقدمہ بھی چلایا جا سکتا تھا ـــــ اسلامی خلیفہ کی سادہ زندگی کا یہ عالم تھا کہ زیتون کے تیل میں جَو کی روٹی بھگو بھگو کر کھا لیا کرتے ـــــ اور جنگل کی ببول پر پھٹی ہوئی چادر کو تان کر اُس کی چھاؤں میں فرشِ خاک پر سو جاتے ـــــ بیت المال کے اونٹوں کے بدن پر وہ اپنے ہاتھوں سے تیل ملتے تھے ـــــ اس احتیاط، احساسِ ذمّہ داری، نیک نفسی اور حق شناسی پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ڈرتے رہتے کہ ادائے فرض میں نہ جانے کہاں کہاں کوتاہی رہ گئی ہے ـــــ اُنھوں نے کسی شہر، محلہ یا گلی کا نام اپنے نام پر نہیں رکھا، اُنھوں نے اپنے مجسمے نصب نہیں کرائے، اُن کے ہر کام خلوص اور سچائی پر مبنی تھا۔

اسلامی نظامِ حکومت پر اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ جو چیز اثر انداز ہوتی ہے، وہ محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس زندگی ہے، یہ مبارک ذات غریبوں کی دردمند، فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ، یتیموں کی والی اور مظلوموں کی غمگسار تھی، جس نے بچپن میں جنگلوں میں بکریاں چرائی ہوں، جو جنگل کی جھربیریاں کھا کر پانی پی لیتا ہو، جس نے سر پر بوجھ ڈھویا ہو، جو شکستہ حالوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہو، جس نے مٹی کھودی ہو، جو اپنے کپڑے ہاتھ سے دھو لیتا ہو، جو خون کے پیاسے دشمنوں پر قابو پا کر ان کو معاف کر دے، جو بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلائے، جس کی پیاری بیٹی کے سر پر ثابت اوڑھنی نہ ہو، مگر غریبوں اور یتیموں کو دولت تقسیم کرتا ہو، جو گالیاں سُن کر دعائیں دے ـــــ اُس سے بڑھ کر "عوام کا رہنما" اور کون ہو سکتا ہے، فاقہ کشوں اور بھوکوں کے دُکھ درد کی اُسی کو خبر ہو سکتی ہے جس نے کئی کئی وقت کے فاقے کئے ہوں، یہ مئے ارغوانی اور شرابِ پرتگالی سے کھیلنے والے غریبوں کے دُکھ درد کو کیا جانیں ـــــ یہ تو غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے نام پر ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں، جہاں اُن کی ہوسناکی کو زیادہ سے زیادہ سہارا مل سکے!

اسلامی نظام کی بنیاد "تقویٰ" پر ہے اور اسی ایک لفظ (تقویٰ) میں اس نظام کی رُوح بند ہے، "تقویٰ" ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جس میں تمام اچھائیاں اور نیکیاں سموئی ہوئی ہیں، انسانیت کے دُکھ کی دوا "روٹی" نہیں "تقویٰ" ہے!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسانیت کے دُکھ کی دوا روٹی نہیں تقویٰ ہے ـــــ تو اس کا یہ

مقصد نہیں ہے کہ "تقویٰ" روٹی کی نفی کرتا ہے اور اسلام دُنیا کو افلاس اور فاقہ میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے، اسلام کے نظام میں "روٹی" بھی شامل ہے مگر وہ اشتراکیت کی طرح بھوک اور شہوت ہی کو "زندگی" نہیں سمجھتا اور آج کل اس بھوک اور شہوت ہی نے قیامت اُٹھا رکھی ہے اور اشتراکیت اس "قیامت" کا مقدمتہ الجیش ہے۔

آدمی کو اتنا جذباتی نہ ہونا چاہیئے کہ وہ "نعروں" (SLOGANS) میں اپنی فکر و دانش کو گم کر دے، عقل سوچنے اور سوچ کر فیصلہ کرنے کے لئے دی گئی ہے، اشتراکیت اور اسلام دونوں آپ کے سامنے ہیں، اور اُصولوں کے ساتھ ساتھ مارکس، اینجلز، لینن اور اسٹالن کی زندگیاں اور دوسری طرف صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ، اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کی سیرتیں آپ کے روبرو ہیں ان کو دیکھئے، جانچئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ سچائی کس کے ساتھ ہے؟

مولانا حکیم نور الدین اجمیری

# فتنۂ انکارِ حدیث کے "پرووڈیوسر" سے

## ملاقات ــــ اور ــــ مناظرہ

مخبرِ صادق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیشین گوئی کی تصدیق ــــ اور "حق"
واضح ہو گیا!

[ ہندستان میں "فتنۂ انکارِ حدیث" کی خشتِ اوّل عبد اللہ چکڑالوی نے رکھی تھی اور اُسی بنیاد پر مولانا اسلم جے راج پوری اور جناب پرویز جیسے اہلِ قلم ایک قلعہ تیار کر رہے ہیں، اس قلعہ کی فصیلوں پر جو منجنیقیں نصب ہیں اُن کا کام ہی یہ ہے کہ جس سمت سے بھی "قال قال رسول اللہ" کی آواز آئے اُس طرف بے تحاشا آگ برسانا شروع کر دیں ــــ ان لوگوں کو دنیا میں سب سے زیادہ دشمنی اور بیزاری سنتِ رسولؐ اور حدیثِ نبوی سے ہے یہ لوگ اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے کردار اور افکار پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا کوئی دھندلا سا نقش بھی باقی نہ رہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حدیثِ رسولؐ کو ہر زمانہ اور ہر دور میں مسلمانوں نے دینی حجت سمجھا ہے، کتاب اللہ کے بعد شریعت کا سب سے بڑا ماخذ سنتِ رسولؐ ہی تو ہے؟ مگر ان منکرینِ حدیث کی نگاہ میں یہ پورا سلسلہ ہی غلط ہے، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ، فقہا، محدثین اور علما، یہ سب کے سب حدیث کو دینی حجت مان کر گمراہی پر جمع ہو گئے تھے (خاک بدہن گستاخ)! اس گمراہی کی ہندستان میں سب سے پہلے عبد اللہ چکڑالوی نے نشان دہی کی اور اب جے راج پوری اور بٹالوی صاحبان اُمتِ مسلمہ کی اس "تیرہ سو سالہ گمراہی" کے خلاف جہاد کر رہے ہیں ــــ یہ (منکرین حدیث) وہ لوگ ہیں جو

"فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا ... ... ..." کے مصداق ہیں گمراہی

کی کوئی انتہا ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کا قلاوہ اُتار کر، عبداللہ چکڑالوی کے افکار کی اطاعت کا قلاوہ اُنھوں نے اپنی گردنوں میں پہن لیا ہے۔

ہندستان میں اس فتنہ (انکار حدیث) کو فروغ نہیں ہوا مگر پاکستان میں یہ فتنہ پر پرزے نکال رہا ہے اور اب تو ان گمراہ کن خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک "روزنامہ" نکلنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں اور کافی سرمایہ سے ایک ٹرسٹ قایم کیا جا رہا ہے ـــــــ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے حق اور باطل کے ٹکراؤ ہی میں سچوں اور جھوٹوں کی تمیز ہوتی ہے اللہ کی مشیّت تکوینی اپنے بندوں کو اس قسم کی آزمایش میں ڈالتی ہی ہے تاکہ حق پرست اور حق ناشناس چھٹ چھٹا کر الگ الگ ہو جائیں! مرزا غلام احمد قادیانی کے "خرافات" پر جب ہزاروں آدمی جمع ہو سکتے ہیں تو "منکرینِ حدیث" کی آواز پر لبیک کہنے والے بھی میسّر آسکتے ہیں! حق و ناحق کی یہ کشمکش نہ ہو تو جہالت اور علم، حماقت اور دانش و آگہی ایک دوسرے سے مُمیز کس طرح ہوں!

یہ مضمون عبداللہ صاحب چکڑالوی سے متعلق ہے جس میں ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کی تفصیل درج ہے، خدا اور رسول سے محبت رکھنے والوں کے لئے اس میں بہت کچھ ہے! مگر وہ جو اطاعتِ رسُولؐ سے بیزاری کو اپنا مسلک بنا چکے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت جن کا مشن ہے اُن کی ناگواری شاید "موتوا بغیظکم" کی حد تک ہو پہنچ جائے گی! مگر ہم کیا کریں اُن کی دل دہی کے لئے حق بات کو نہیں چھپایا جاسکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (م-ق)

اب سے ۴۳ سال پہلے یعنی ۱۳۲۶ھ ہجری کا ذکر ہے، میرا طالبِ علمی کا زمانہ تھا، میں اپنے برادر معظم اور اُستاد محترم حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے شہر لاہور میں پڑھتا تھا، حضرت مولانا مرحوم اُن دنوں لاہور میں درس دیتے تھے، پنجاب کے علمی حلقوں میں آپ کے فضل و کمال اور مہارتِ علوم دقیقہ کا غلغلہ بلند تھا اور مولانا اجمیری کے نام سے شہرت تھی! فضل الدین نام کا ایک قادیانی طالبِ علم میرے ساتھ ہدایہ اخیرین میں شریکِ درس تھا ـــــــ ایک دن فضل الدین نے مجھ سے کہا کہ شہر لاہور میں مولوی عبداللہ چکڑالوی۔ "بانی مذہب اہل قرآن" سریاں والی گلی میں اپنے معتقد خاص چٹو نامی کے یہاں رہتے ہیں اگر آپ کو اُن سے ملنے کا شوق ہو تو چلو کسی دن وہاں چل کر اُن سے ملیں چکڑالوی کا نام سُن کر مجھے اُن کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، اور وہ اس لئے ـــــــ میں نے احادیث شریفہ میں پڑھا تھا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ ایک زمانہ میں ایک ایسا شخص پیدا ہو گا جس کا نیچے کا دھڑ بیکار (زمن) ہو گا، اُس کا سر منڈا ہوا ہو گا، وہ اپنے تخت (اریکہ) پر سہارا لئے بیٹھا ہو گا، جب میری حدیث اُس کو سُنائی جائے گی تو وہ اُس کے ماننے سے انکار کریگا، اور کہے گا۔۔۔۔

" ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ "[1]

فضل الدین کی زبانی اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شخص (عبداللہ چکڑالوی) حدیثِ نبوی کا منکر ہے اور علمِ دین کے بارے میں صرف قرآن پر حصر کرتا ہے، لیکن مجھے اُس کا حلیہ، صورتِ نشست وغیرہ کو بھی دیکھنا تھا کہ دیکھوں آیا حدیث شریف کی پیشین گوئی اُس پر منطبق ہوتی ہے یا ابھی اس حلیہ کا کوئی دوسرا گم کردہ راہ آنے والا ہے، چنانچہ میں اپنے عزیز ہم درس مولوی محمد عباس صاحب کے ہمراہ فضل الدین کو لیکر چکڑالوی صاحب کو دیکھنے کے لئے گیا، ہم وہاں اُس وقت پہونچے ہیں تو نمازِ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔

عبداللہ صاحب چکڑالوی جس مکان میں رہتے تھے اُس کا صحن اچھا خاصہ وسیع تھا، گرمی کا موسم تھا اس لئے سب لوگ صحن ہی میں تھے، چکڑالوی صاحب اپنی جماعت کے لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز باجماعت پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے، جماعت اس طرح ہوئی کہ اُن کا امام صف کے بیچ میں کھڑا ہوا، تکبیر تحریمہ کے وقت سب نے کان پکڑے اور پوری نماز کے تمام ارکان، قیام رکوع وسجود، قومہ وجلسہ سب میں قرآن کی مختلف آیتیں پڑھتے رہے، میں نے مولوی محمد عباس صاحب کے ساتھ مل کر علٰحدہ نماز پڑھی کیوں کہ چکڑالویوں کی یہ نماز ہمارے لئے بالکل اجنبی تھی! فضل الدین قادیانی نے ہم سے علٰحدہ ہو کر نماز ادا کی۔

نماز سے فارغ ہو کر جب مولوی عبداللہ چکڑالوی اپنے تخت پر براجمان ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہ نیم دراز ہو کر اپنے ہاتھ کی کہنی کو تخت پر ٹیک کر، سر کو ہتھیلی پر سہارا دے کر حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے، اُن کے زمن (جامانده ہونے) اور سر کے منڈے رہنے کو میں پہلے دیکھ چکا تھا، حدیث شریف کی پیش گوئی حرف بہ حرف اُس منکرِ حدیث پر صادق آتی تھی۔

میں چکڑالوی صاحب کے قریب جا کر سلام کرکے بیٹھ گیا، اُنھوں نے میرے سلام کے جواب میں "سلامٌ علیکم" کہا اور میری جانب متوجہ ہوئے، میں نے دریافت کیا ـــ سُنا ہے کہ آپ حدیث کو نہیں مانتے اور ابھی میں نے دیکھا کہ آپ نے بھی مغرب کی تین ہی رکعتیں پڑھیں، میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید میں نماز پنج گانہ کے لئے علٰحدہ علٰحدہ تعدادِ رکعات کن آیتوں میں مذکور ہے ...... کہ صبح کے دو فرض، ظہر، عصر، عشاء کے چار چار اور مغرب میں تین فرض پڑھے جائیں۔

اس کے جواب میں چکڑالوی صاحب نے فرمایا میں نے قرآن کی ایک تفسیر لکھی ہے وہ چھپ گئی ہے اس کی صراحت بھی اُس میں موجود ہے آپ اس کو دیکھ سکتے ہیں، میں نے پھر کہا کہ جب خود مفسّر صاحب میرے سامنے موجود ہیں تو مجھے اس دردسری کی کیا ضرورت ہو کہ روپیہ خرچ کرکے آپ کی تفسیر خریدوں

[1] حضرات محدثین نے اس فقرے کے دو معنیٰ بیان کئے ہیں (۱) ہم نے کتاب اللہ میں ایسا نہیں پایا کہ ہم اُس کی اتباع کریں۔ (۲) ہم جو کتاب اللہ میں پائیں گے اُسی کا اتباع کریں گے۔

اور اُسے دیکھوں، بہتر ہوگا کہ آپ خود ہی اُن آیاتِ کریمہ کو بتادیں جن سے آپ نے پنج گانہ نمازوں کے لئے تعدادِ رکعات معلوم کی ہیں، اس کے جواب میں چکڑالوی صاحب نے پھر اپنے پہلے جواب کو دُہرایا کہ آپ میری تفسیر دیکھئے، میں نے اُس میں لکھ دیا ہے، میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ شخص جواب دینے سے قصداً گریز کر رہا ہے، میرے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اس لئے بات کو ٹال رہا ہے —— پھر میں نے دوسرا سوال کیا۔ —— "یہ تو فرمایئے، آپ کو حدیث کے ماننے سے انکار کیوں ہے؟" اس کے جواب میں چکڑالوی صاحب بولے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صریح طور پر فرمادیا ہے کہ قرآن کا مثل نہیں ہوسکتا اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ نے کہا۔ "اوتیت القرآن ومثلہ" (مجھے قرآن اور اُس کا مثل دیا گیا ہے) دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
"وَان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسورة من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین" کفارِ قریش جو قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے سے انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سورتیں خود محمدؐ نے بنائی ہیں، اللہ پاک نے اسی واضح دلیل سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کو بتایا جو فصحائے عرب کے لئے بُرہانِ قطعی کا حکم رکھتی ہے — یعنی "اگر تم کو شک ہو اُن کے کلامِ الٰہی ہونے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہو تو تم اُس جیسی ایک سورت ہی لاؤ اور اپنے مددگاروں کو سوائے خدا کے بُلاکر مدد لو، اگر تم (اپنے اس انکاری دعوے میں) سچے ہو۔"
یہ تذکرہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ ناظرین خود بھی اپنی جگہ چکڑالوی صاحب کے مغالطہ آمیز جواب کو سمجھ سکیں، میں نے کہا کہ یہ بیان بالکل دھوکا ہے۔ "اللہ پاک نے یہ کہاں فرمایا ہے کہ قرآن کے مثل سے خود اللہ تعالیٰ بھی (معاذ اللہ) عاجز ہے" بلکہ ارشاد ہوتا ہے کہ اے فصحاء و بلغاء عرب اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود تصنیف کیا ہے اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا تو جب کہ تمہارے خیال کے مطابق اگر ایک اُمّی تنہا ایسا کلام تصنیف کرسکتا ہے تو تم تو فصحاء ہو خود کوشش کرو اور اپنے تمام مددگاروں سے خدا کے سوا امداد لیکر ایسی ایک سورة تو بنالاؤ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو۔ بڑا فرق ہے اس میں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "مجھے خدا کی طرف سے دیا گیا ہے قرآنِ پاک اور اُس کا مثل" یعنی ایک وحی متلو جو واسطہ جبریل علیہ السلام نازل ہوئی اور اُس کی نظم (الفاظ) بھی خدائے تعالیٰ کی طرف سے آئی اور دوسری وحی غیر متلو یعنی معانی القا ہوتے ہیں اور حضور الفاظ میں ان "معانی" کو بیان فرماتے ہیں —— اور اس مثل میں جو غیر اللہ سے بطور تحدّی طلب کیا گیا ہے۔

میری اس جوابی تقریر کے دوران میں چکڑالوی صاحب سے یہ سوال بھی کرلیا گیا کہ جب قرآن مجید میں خود اللہ تعالےٰ نے "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کا حکم دیا ہے تو آپ کو اطاعت رسول اللہ سے گریز کیوں ہے، تو چکڑالوی صاحب نے فرمایا کہ آیت کو شروع سے پڑھو، میں نے تلاوت کی۔ "یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" تو اس پر چکڑالوی صاحب کہنے لگے۔ "اچھا تبلایئے یا ایھا الذین آمنوا" میں رسول اللہ بھی مومنین کے ساتھ شریک ہیں" میں نے فوراً جواب میں کہا کیوں نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے۔ "انا اوّل المومنین (میں پہلا مومن ہوں)

اس پر چکڑالوی صاحب اپنے زعم باطل میں بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے اچھا تھوڑی دیر کے لئے ایسا سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو ہی "یا ایہا الذین آمنوا" سے خطاب کرکے "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" فرمایا ہو تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ اللہ یہ فرماتا کہ "اے نبی! تم اللہ کی اطاعت کرو اور خود اپنی بھی" میں نے اُن سے دریافت کیا کہ اچھا آپ "رسول اللہ" کے کیا معنیٰ لیتے ہیں" تو کہا کہ "رسول اللہ کے معنیٰ ہیں کتاب اللہ اب اس ترجمہ میں کوئی خلافِ عقل بات لازم نہیں آتی میں نے کہا سبحان اللہ! ارشاد فرمایئے کہ اس سے آگے جو خدائے تعالےٰ نے "واولی الامر منکم" ارشاد فرمایا ہو تو کیا "اولی الامر" کے معنیٰ بھی "کتاب اللہ" ہی ہیں یا کچھ اور ہیں، اس پر جواب دیا گیا کہ "اولی الامر" کے معنیٰ بادشاہ اور حاکم ہیں، میں نے دریافت کیا کہ فرمایئے رسول اللہ کے زمانہ میں کون بادشاہ یا حاکم تھا جس کی آپ نے اطاعت فرمائی، اس کا جواب چکڑالوی صاحب نے یہ دیا کہ رسول اللہ کسی حاکم یا بادشاہ کی اطاعت نہیں کر سکتے کہ یہ اُن کی شان کے خلاف ہے، میں نے دل میں کہا کہ یہ ذاتِ شریف وہیں آگئے جہاں میں اِن کو لانا چاہتا تھا، میں چکڑالوی صاحب کو مخاطب کرکے بولا تو آپ اس آیۂ پاک کا ترجمہ کیونکر کریں گے کہ ایسی کوئی قباحت لازم نہ آئے تو فرمایا رسول اللہ اس حکم سے مستثنیٰ رہیں گے اور دوسرے مومنین یہاں مخاطب سمجھے جائیں گے، میں نے اس پر عرض کیا کہ جناب والا یہی صورت ایک قدم پہلے بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور رسول اللہ کو یہ معنیٰ "کتاب اللہ" لینے کے تکلفِ بعید سے بھی بچا جاسکتا ہو تو کیوں نہ ابتدا سے اس کا لحاظ رکھا جائے اور کہا جائے کہ "اطیعوا اللہ" تک تو رسول اللہ بھی دوسرے مومنین کے ساتھ شریک ہیں اور اُس کے بعد رسول اللہ کے علاوہ دوسرے مومنین مخاطب ہیں ——— اس کا جو جواب چکڑالوی صاحب نے دیا وہ خلافِ توقع نہ تھا فرمایا اچھا پھر کسی فرصت کے وقت ملئے دوسرے اصحاب بھی کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں!

میں نے بھی اُس وقت بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ چکڑالوی صاحب خود اس بحث سے کترا رہے تھے، میں اُن سے اجازت لیکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے چلا آیا، اور طے کرلیا کہ کسی دن چکڑالوی صاحب سے پھر آکر ملوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کا ذکر کروں گا ممکن ہے کہ اس شخص کو کچھ تنبیہ ہو جائے اور میں بھی تبلیغِ حق کا فریضہ اپنی حد تک ادا کردوں ———

## دوسری ملاقات

اس واقعہ کے چند دن بعد تنہا فرصت کا وقت نکال کر نماز ظہر کے بعد چکڑالوی صاحب کے پاس گیا، حُسنِ اتفاق سے اس وقت وہ اکیلے ہی بیٹھے تھے، اُن کا ارادت مند چیلا بھی موجود نہ تھا، میں چکڑالوی صاحب کو سلام کرکے بیٹھ گیا، پوچھا کہاں سے آئے ہو، میں نے کہا اِسی لاہور سے! پھر دریافت کیا کیسے آئے ہو، میں نے کہا اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میں نے حدیث شریف میں پڑھا ہو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ میں ایک شخص پیدا ہوگا، جو جا ماندہ[۱] (زمن) ہوگا، سر اُس کا منڈا ہوگا اور اپنے تخت (اریکہ) پر سہارا لیکر بیٹھے گا اور جب

---

[۱] نیچے کا دھڑ بیکار ہوگا۔

میری حدیث اُس کے سامنے بیان کی جائے گی تو وہ اُس کے ماننے سے انکار کرے گا اور کہے گا "ما وجدنا فی کتاب اللہ (اتبعناہ) ——— میں یہی دیکھنے کے لئے آیا ہوں، خدا کی شان کہ یہ پیشین گوئی آپ پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔

میرے اس بیان سے چکڑالوی صاحب کو بہت غصہ آیا اور آنا ہی چاہیئے تھا، حدیث کا انکار نہ کرسکے کہ اُن کو خود بھی اس کا علم تھا، کہنے لگے کہ کوتہ جے بخاری (پنجابی زبان میں کوتہ گدھے کو کہتے ہیں) نے یہ بات گھڑی ہو، رسول اللہ نے ایسا نہیں کہا، اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا کہ میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے یہ پیشین گوئی فرمائی ہو اور آپ کی پیشین گوئی صحیح بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو "علم" دیا جاتا تھا، لیکن آپ کے کہنے کو صحیح مان لوں تو پھر مجھے امام بخاریؒ کو ایک اعلیٰ پایہ کا محدث ماننے کے علاوہ خدا کا رسول بھی ماننا پڑے گا، اس لئے کہ امام بخاریؒ کو گزرے ہوئے ہزار سال سے زیادہ ہوگئے اور اُن کی بیان کردہ پیش گوئی آج صحیح ثابت ہورہی ہے، میری اس ہنسی اور جواب پر چکڑالوی صاحب کا غصہ اور زیادہ تیز ہوگیا مگر وہ بیچارہ کر ہی کیا سکتا تھا، منہ میں جھاگ آرہے تھے اور بار بار امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گستاخانہ کلمے بک رہا تھا اور میں ہر بار ہنس کر یہی کہتا تھا کہ چلو آپ کی خاطر میں امام بخاریؒ کو ہی اللہ کا رسول مان لوں گا کیوں کہ اُن کی بات تو تو ماشاء اللہ سچی ہوگئی جو انھوں نے کہی تھی ——— چکڑالوی صاحب کے پیچ و تاب کا عالم قابلِ دید تھا، میں وہاں سے یہ پڑھتا ہوا اُٹھ آیا ——— من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ———

صدق اللہ تعالیٰ وصدق رسولہ الکریم علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم ؛

ماہرالقادری

# نوادرِ امیر مینائی

هزاراں داغ بردل خوردم وزیں انجمن رفتم
چمن گل کردم از آغوش و بیروں از چمن رفتم
(امیر مینائی)

ایک ہوتا ہے "باکمال" اور ایک ہوتا ہے "جامعِ کمالات ـــــ" باکمال سے اگر اُس کا کمال چھین لیا جائے تو پھر اُس کی شخصیت میں کچھ باقی نہیں رہتا اور "جامعِ کمالات" کا کوئی ایک وصف یا ایک کمال حذف ہو جائے تو دوسرے کمالات کے سبب اُس کی شخصیت ممتاز رہتی ہے۔

حضرت امیر مینائی کی ذات جامعِ کمالات تھی اور اُنھی کمالات میں "شاعری" بھی شامل ہے ـــــ بہت سے باکمال اور نامور شعراء سے اگر کمالِ شاعری جُدا کر لیا جائے تو اُن کی شخصیتیں صفر ہو کر رہ جائیں گی، مگر امیر مینائی کی ذات گوناگوں کمالات کی حامل ہے، وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی بہت کچھ ہوتے، صرف "شاعری" ہی اُن کا سرمایۂ عز و افتخار نہیں ہے۔

امیر مینائی ایک باکمال شاعر، مستند زباں داں اور صاحبِ فن اُستاد تھے اُن کے فیضِ اصلاح و تربیت نے ایسے شاگرد پیدا کئے جن کا ہر فرد خود اپنی جگہ ایک مستقل "دبستانِ شعر و سخن" ہے، شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ حفیظ جون پوری جن کا یہ مطلع اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا:۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

امیر مینائی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے اور پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی امیر ہی کے خوشہ چینوں میں تھے۔ "امیر اللغات"، اُن کی زباں دانی، ژرف نگاہی اور وسعتِ معلومات کی بولتی ہوئی شہادت ہے کاش! یہ صحیفۂ لفظ و معانی پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتا مگر جتنا حصّہ چھپ چکا ہے، وہ اپنی جگہ بے مثال ہے، امیر مینائی نے ہمیں بتایا کہ "لغت[1]" اس انداز پر مُرتب ہونی چاہیئے، سر سیّد احمد خاں اور اکبر الٰہ آبادی نے "امیر اللغات" کو بہت سراہا ہے ـــــ اس پر احتیاط، تواضع اور وسعتِ ظرف کا یہ عالم ہے کہ محاوروں اور لفظوں کے ثبوت میں اپنے معاصر داغ دہلوی تک کے اشعار پیش کر دیئے ہیں مگر اپنے کسی شعر کو ثبوت میں نہیں لائے۔

[1] "لغت" (ڈکشنری) کو مؤنث اور مذکر دونوں طرح بولتے ہیں اور میری زبان پر یہ اسی طرح چڑھا ہوا ہے۔ (م۔ ق)

حضرت امیر مینائی عالم تھے، فقیہ تھے درویش تھے، منطق و فلسفہ پر عبور اور فنِ طب میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، ہندی زبان کے ماہر اور سنسکرت بھی جانتے تھے، ست سیا بہاری میں ہندی کے سات سو شعروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، عربی زبان و ادب سے شغف اور دلچسپی کا ثبوت اُن کی یہ تضمین ہے :-

حصل الشفا بخیالہ، وصل الاسیٰ بوصالہ عذبت عیون مقالہ عظمت شیون جلالہ
نصبت لواء نوالہ، حمدت جمیع فعالہ شرف الثریٰ لظلالہ، سمک السما بنعالہ
بلغ العلیٰ بکمالہ ، کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ ، صلوا علیہ و آلہ

علم سیاست اور قانون و دستور پر ہدایۃ السلطان اور ارشاد السلطان ایک متن کی فارسی زبان میں شرحیں لکھیں، واجد علی شاہ کے رسالہ صوت المبارک[۱] کی فارسی زبان میں "نغمہ قدسی" کے نام سے شرح کی ——— سرمۂ بصیرت میں "عربی فارسی اُردو کے اُن الفاظ سے بحث کی جو غلط مستعمل ہیں یا مختلف فیہ ہیں" ——— "انتخاب یادگار" (اُردو) شعراء کا تذکرہ لکھا ——— "رسالہ بحث اعداد حروف تہجی" میں تاریخ گوئی سے متعلق جن حروف کے اعداد میں اختلاف ہے اُن کی تحقیق فرمائی ——— جامعیت اور ہمہ گیری کی کوئی حد ہے کہ جس قلم نے علمِ جفر میں رمز الغیب اور رموز غیبیہ دو رسالے تصنیف کئے اُس نے نواب ناجد علی شاہ کے کبوتروں کی تعریف میں کبوتر نامہ لکھا ——— زاد الامیر اور وظیفہ جلیلہ میں احادیث سے دعاؤں کو مقتبس کر کے جمع کیا اور "نماز کے اسرار" میں جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، نماز کے اسرار، لطائف و عجائب اور نکات بیان کئے ———

شاعروں میں اس بلند کردار اور پاکیزہ سیرت کے لوگ بہت کم گزرے ہوں گے، امیر مینائی شاعر ہوتے ہوئے بھی پاکباز تھے اور دنیوی معاملات میں حق شناس اور مصلحت ناشناس! نواب فصاحت جنگ جلیل مرحوم نے سوانح امیر مینائی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے :-

"نواب کلب علی خاں بہادر نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں مفتی امیر احمد صاحب سے اپنے باورچی کے لئے سفارش کی جس پر عدالت[۲] میں مقدمہ تھا مگر حضرتِ امیر نے بلحاظ روداد فیصلہ باورچی کے خلاف کیا اور ولی عہد صاحب نے سُنا تو فرمایا کہ اچھا دیکھا جائے گا ——— حضرت امیر کو اس بات کا خیال رہا مسند نشینی کے بعد حضرت امیر نے رام پور سے روانگی کی تیاری کی کہ یہاں قیام مناسب نہیں ہے اس کی خبر کسی طرح نواب کلب علی خاں کو ہوگئی، حضرت امیر کو بعد مغرب بلا کر فرمایا کہ میں نے سُنا ہے آپ یہاں سے جا رہے ہیں اس کا کیا سبب ہے؟ حضرت نے عرض کیا "مجھے حضور کی ناخوشی کا علم اپنی نسبت ہے" نواب صاحب نے فرمایا "واقعی اُس وقت مجھ کو ناخوشی ہوئی تھی مگر اب آپ کی اس کارروائی کا مجھ سے زیادہ کوئی قدر شناس نہیں ہے، جب آپ نے میرا اثر نہ مانا تو اُمید ہے کہ آپ انصاف کے جاری کرنے میں کسی کا لحاظ نہ کریں گے، اطمینان سے یہاں رہیئے"

مقصود امیر مینائی کی سیرت لکھنا نہیں ہے، ایک بات درمیان میں آگئی تھی اُس کا ذکر کر دیا، چند صفحوں میں امیر کی سیرت اور ان کے کمالات بیان بھی تو نہیں ہو سکتے یہ کام تذکرہ نگاروں کے کرنے کا ہے مگر ہمارے انشاء پردازوں کو

---

[۱] یہ رسالہ فنِ موسیقی میں ہے۔ [۲] امیر مینائی رام پور ریاست میں عدالتِ دیوانی کے حاکمِ اعلیٰ تھے!

تو چیخوف اور میکسم گورکی کی منقبت سرائی ہی سے فرصت نہیں ملتی ——— خیر! اہلِ کمال کو کوئی نہ بھی سراہے تو بھی اُن کی شخصیت اپنی جگہ ثابت اور مسلم ہے، گوہر و الماس اگر گمنامی میں پڑے رہیں تو سب سے زیادہ نقصان اُن انگلیوں، گردنوں، کلائیوں اور پیشانیوں کا ہے جو ان کی چمک اور تابانی سے محروم ہیں!

حضرت امیر مینائی کے بعض قلمی مسودات جناب اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی اور اسرائیل احمد صاحب مینائی کی نوازش سے مجھے دیکھنے کو ملے، جی چاہا کہ علم و ادب کے ان پارکھوں کی دوسروں کو بھی سیر کرادوں، تنہا لطف اٹھا کر خاموش رہنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا، یہ مضمون امیر مینائی کے ان مسودات کا ایک مختصر تعارف ہے، یقین ہے کہ اہلِ ذوق اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔

(۱) امیر مینائی دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں کو خط لکھا کرتے تھے تو اُن کی نقل کرا لیا کرتے تھے ان خطوط کا اچھا خاصہ مجلد قلمی مسودہ موجود ہے، امیر مینائی کا طرزِ انشا بہت سادہ اور سلیس ہے، اظہارِ مطلب کے لئے اتنے ہی الفاظ لاتے ہیں جتنے کی ضرورت ہے، ان خطوں میں شعر و ادب اور علم و حکمت کے نکتے بھی ہیں اور بعض خطوں سے اُس زمانہ کے تمدن بلکہ سیاسی حالات پر بھی کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے ——— امیر مینائی کا خط بھی بہت پاکیزہ تھا اور لکھنے میں دائروں کی کشش، مرکز اور نقطوں کے محلِ نصب اور بین السطور کے فاصلہ کا خیال رکھتے تھے۔

(۲) "امیر اللغات" کی تیسری جلد (فصل بائے موحدہ) بڑا سایز، ضخامت ۳۱۰ صفحے، پاکیزہ خط لغت کی ترتیب و تسوید کے بعد اس پر نظرِ ثانی ہوئی ہے، اور سرخ اور بینجنی روشنائی سے حک و اصلاح اور اضافہ و ترمیم کی گئی ہے ——— چند نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

**بات رہ جانا:** نمبر (۱) وقعت اور شان میں فرق نہ آنا، آن رہ جانا ـــ قلق:-

بات اُس نے کی نہ ایک سے چپ دیکھ کر مجھے
کل بات رہ گئی مری بزمِ رقیب میں

فقرہ "تم دم بھر کو چلے آئے مری بات رہ گئی" (یہ عبارت نظرِ ثانی میں بدلی گئی ہے، مسودہ میں پہلے اس طرح تھا "تم نے منہ سے بول دیا چلو میری بات رہ گئی")

نمبر (۲) بھلائی بُرائی کا یاد رہ جانا ـــ ہوس:-

حالتِ نزع میں ہوں اب تو تو کھا مجھ پر رحم
بات رہ جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے

نمبر (۳) فرد گزاشت ہو جانے کی جگہ ـــ فقرہ ـــ "خط روانہ کر دیا مگر افسوس ایک بات رہ گئی"

**بڑا گھر:** نمبر (۱) دولت مند گھرانا (پہلے "ذی مرتبہ" تھا) امیر گھر، مصحفی:-

ہم غریب آدمی ہیں دل ہے ہمارا کیا مال
تاک اے دزدِ حنا جا کے بڑا گھر کوئی

فقرہ "لڑکے کی کسی بڑے گھر شادی ہو جاتی تو آرام سے رہتا"

---

۵۱؎ یہ دونوں بھائی حضرت امیر مینائی کے پوتے اور منشی محمد احمد صریر مینائی مرحوم کے لائق فرزند ہیں۔

نمبر (۲) جیل خانہ ——— فقرہ "بچا! بدمعاشیاں تم کو ایک دن بڑا گھر دکھائیں گی" نظر ثانی میں اس جملہ کا سُرخ روشنائی سے اضافہ کر دیا گیا "بازاریوں کی زبان ہے بطور ظرافت و مذاق کے ثقات بھی بولتے ہیں"

**بڑ کی مارنا:** افسوس کرنا، ......... بدحواس کر دینا، عورتوں کی زبان ہے ——— مگر نظر ثانی میں اس محاورے اور اس کی پوری تشریح کو سُرخی سے قلمزد کر دیا۔

**بڑیاں:** مؤنث نمبر (۱) ماش یا مونگ کی پیٹھی سے نقل کی شکل بنا کر خشک کر لیتے اور مسالہ ڈال کر (پہلے "مسالہ لگا کر" تھا) پکاتے ہیں، ان معنیٰ میں جمع کے ساتھ مستعمل ہے نمبر (۲) نیل یا چونے کی ڈلیاں (پہلے "بٹی" تھا، سُرخی سے "بٹی" کاٹ کر "ڈلیاں" لکھ دیا)

**بلبلانا:** نمبر (۱) اونٹ کا آواز نکالنا اور چلانا (پہلے اس طرح تھا "اونٹ کے آواز نکالنے کو کہتے ہیں) ——— نمبر (۲) مجازاً مستی میں آنا، جوش میں آ دل فول بجنا" اس کے بعد محشر کے اس شعر کا اضافہ سُرخ روشنائی سے کیا گیا۔

پی کے مے مستیوں میں آنے لگا اونٹ کی طرح بلبلانے لگا

**بم:** مؤنث:۔ بمبو سے بگڑ کر بنا ہے جس کے انگریزی میں معنیٰ بانس کے ہیں (یہ فقرہ نظر ثانی میں بڑھایا گیا) بگھی، ٹمٹم وغیرہ میں آگے کی طرف دو لکڑیاں ہوتی ہیں جن میں گھوڑا جوتا جاتا ہے۔

**بمبا:** (اس کی اصل انگریزی پمپ معلوم ہوتی ہے جس کے معنی ہوا یا پانی نکالنے یا بھرنے کی کل ہیں اور یہ بھی خیال ہے کہ شاید یہ لفظ "منبع" سے بگڑ کر بنا ہے جس کے معنی سرچشمہ ہیں) نمبر (۱) نل جس میں حوض یا نہر کا پانی کل کے ذریعہ سے بھر کر دوسری جگہ پہونچاتے ہیں (پہلے شروع میں عبارت اس طرح تھی "بہت لمبا سائل ہوتا ہے")

**بہشتی:** سقا، پانی بھرنے والا، مجازاً نہایت نیک سیدھا سادا (نظر ثانی میں ان لفظوں کا سُرخی سے اضافہ کیا گیا) بھولا، دنیا کے کاٹ پیچ سے ناواقف۔

**بیرا:** نمبر (۱) (انگریزی میں اس کی اصل بیرر بمعنی قاصد ہے) انگریزوں کے خانساماں کو کہتے ہیں (پہلے اس طرح تھا "انگریزی خانساماں کو کہتے ہیں) نمبر (۲) دروازے کے بازو میں مضبوطی کے واسطے لگائی جاتی ہے۔

**قصاید**

"قصیدہ" عجمی شاعری کی مخصوص صنف ہے، فارسی شعراء میں بہت کم ایسے ہوں گے، جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی نہ کی ہو، رودکی، منوچہری دامغانی اور انوری سے لیکر قاآنی تک قریب قریب ہر شاعر نے قصیدے کہے ہیں، انوری کو قصیدہ گوئی کا "پیغمبر" کہا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عرفی کے قصاید میں جو کیفیت، شکوہ اور جوش پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ مثال نہیں رکھتا، روانی، شگفتگی اور لفظوں کی دروبست کا جہاں تک تعلق ہے قاآنی اپنا آپ جواب ہے۔

اردو شاعری میں سودا اور ذوق کے قصیدے بہت مشہور رہیں ——— امیر مینائی کو رام پور کے دربار سے وابستگی کے سبب یہ ناگوار فرض انجام دینا پڑا ——— قصاید کے مجلد میں پہلا قصیدہ "معرکہ خزان و بہار" ہے، اس کی تشبیب

BAMBOO سے

میں فوج کے تلازمہ سے کام لیا ہی :-

گولی ڈھلیں تگرگ کی کہہ دو سحاب سے | توپیں ہوں برق و رعد کی سر، وقت کارزار
پھولوں کی پلٹنوں کو ملیں سُرخ وردیاں | پہنیں لباس سبز سوارانِ شاخسار
رکھیں سروں پہ خود دبہا در حباب کے | ترکش سجیں بدن پہ دلیرانِ آبشار
صد برگ کی زرہ ہو تو سنبل کی ہو کمند | گُل کی سپر ہو، شاخ کی شمشیر آبدار
لاکھوں بٹیں سپاہ میں غنچوں کی پیچکیں | سورج مکھی کے خود ہوں تقسیم بیشمار
اس فوج کے سوا بھی کچھ آئے کمک کو فوج | سو ایک سمت سے تو کسی سمت سے ہزار

شاہین و باز و جرہ، کلنگ و خروس و بط
کبک و تدرو فاختہ و طوطی و ہزار

اس کے بعد بہار آتی ہو اور خزاں کی بساط اُلٹ جاتی ہو، معرکہ بہار کے ہاتھ رہتا ہو اور ہر طرف بہار ہی بہار نظر آتی ہو :-

سامانِ بزم ہو گیا میدانِ رزم میں | کیا کیا مۓ طرب کے چلے جام خوشگوار
مُطرب تھی عندلیب تو قوال فاختہ | طاؤس گرمِ رقص تھے محفل میں ہر کنار
شبنم نے پائے گوہرِ غلطاں گلوں نے زر | جاری ہوا یہ فیضِ کفِ حاکمِ بہار
رومالِ سُرخ دوشِ شقایق پہ چار باغ | شبنم کے پھول پہنے ہوئے موتیوں کے ہار

پھر اس کے بعد گریز ہی :-

یہ جشن اُس کی فتح کا ہے جو سپاہ ہے
زیرِ لوائے کلب علی خانِ نامدار

دوسرے قصیدہ میں "توسن" کا تلازمہ ہی، گھوڑے کے جسم کے جوڑ بند کی تعریف ہی، قصیدہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہی کہ ایک صبا رفتار اور پیکرِ جمال گھوڑا آنکھوں کے سامنے کھڑا ہی

دونوں کانوں کے جو کچھ بیچ میں سنبل سے ہیں
سنبلہ کا نظر آتا ہے یہ جوزا میں مقام

اس اشہبِ برق رو کی تیزی کا یہ عالم ہے :-

کرکے طے مشرق و مغرب کو پھر آئے یوں جلد
کہ مخاطب کا مخاطب سے نہ ہو قطعِ کلام

تیسرا قصیدہ بہاریہ ہی، تشبیب کا ٹھاٹ دیکھئے :-

جما ہے گلشنِ آفاق میں یہ رنگِ نشاط | کہ ہاتھ سُرخ حسینوں کے ہیں بغیر حنا
جمالِ شاہدِ گلشن ہے حُسنِ رہگذرے | سرودِ خانہ ہمسایہ بلبلوں کی صدا

پھر اپنے ممدوح (نواب کلب علی خاں بہادر) کی تعریف کی ہی :-

سخی وہ جس کو ہے ہر روز اشتیاقِ فقیر — کریم وہ جسے ہر شب ہے انتظارِ گدا

عجیب محفلِ عالی عجیب صدر نشیں — حکیم جس کے مصاحب، ندیم ہیں عُلما

ایک قصیدے میں نواب کلبِ علی خاں مرحوم والیٔ رامپور کے دورِ حکومت کو سراہا ہے کہ ان کے زمانہ میں چیزوں کی تاثیر تک بدل گئی ہے :-

بدن کو زہر سے قوّت ہے نوش دارو کی

جگر کو ریزۂ مینا ہوا ہے حُبِ شفا

"شاخ" ردیف، ختن، نسترن ... قافیہ، ردیف کی اس پابندی نے زمین کو کس قدر سنگلاخ اور دشوار گزار بنا دیا ہے مگر پختہ مشقی کا یہ عالم ہے کہ ساٹھ سے اوپر شعر کہے ہیں اور کسی شعر میں بھی ردیف کو بیکار نہیں جانے دیا :-

چاہیں جو وقتِ سیر ہوا خواہ مورچھل

دے توڑ کر نسیم اُنھیں ناروں کی شاخ

ایک قصیدے کی تشبیب نعتیہ ہے ،

کیا خدا نے جو ایجادِ عالمِ ایجاد — ظہورِ نورِ محمدؐ تھا اُس سے اصل مُراد

کوئی ضرور تھا حامی پئے حمایتِ خلق — کوئی ضرور تھا ہادی پئے طریقِ رشاد

چمن شگفتہ ہو کس طرح بے نسیمِ سحر

رواں سفینہ ہو کیونکر بغیر بادِ مُراد

اس کے بعد ایک قصیدے کا مطلع ہے :-

خواب میں طالعِ بیدار کا آیا جو خیال — نظر آیا مجھے اک شاہدِ خورشید جمال

اور

خندہ آلود لبِ لعل مگر چیں بہ جبیں — لُطف آمیز نگاہیں مگر آثارِ ملال

یا الٰہی یہ کوئی خواب کہ بیداری ہے — بحر سے قطرے کا خورشید سے ذرے کا وصال

ممدوح کے دشمن کو اس طرح پیش کیا ہے :-

تیرے دشمن کو ستاتی ہے اگر بیماری — ملک الموت ہی آتا ہے پئے پرسشِ حال

اور جس بیمار کی پرسشِ حال ملک الموت کرے اُس بیچارے کا انجام معلوم !

"ہولی" کا سماں ایک تشبیب میں دیکھئے :-

خادموں کے دوش پر کیا کیا ہیں چاندی کے گھڑے — کیسی کیسی ہیں طلائی ہاتھ میں پچکاریاں

خُلد سے حوریں طبق بھر بھر کے لاتی ہیں عبیر — مثلِ باغِ خلد خوشبو سے معطر ہو جہاں

اور سرمستی اور خوش فعلیوں کا یہ عالم ہے :-

یہ بھی کیا دن ہے کہ ہے ساری بزرگی طاق پر

نواب کلبِ علی خاں کے عدل و انصاف کا یہ انداز ہے :-

بیٹھے ہوئے ہیں ایک جگہ باز و کبوتر
کیا خوف کہ گلّہ کے لئے گرگ شباں ہے

شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پانی پینے میں وہ بات نہیں ہے جو کیفیت باز و کبوتر کی یکجائی اور بھیڑیے کی بکریوں کے گلّہ کی رکھوالی اور چوپانی کرنے میں ہے!

دوسرے نامور شعراء سے شاعر خود اپنا مقابلہ کرتا ہے :-

میرے جامِ فکر کا جامی بھی ہے اک جرعہ خوار
مجھ سے سیکھا ہے نظامی نے شیوۂ نظم دری

فکرِ صایب نے مری صایب کو شرمندہ کیا
روبرو میرے ہوئی فطرت کی گم دانشوری

پاگیا تھا بزمِ معنیٰ میں مری جھوٹی شراب
ہے جو سرخوش سرخوشِ صہبائے معنی پروری

ہاتھ آیا ہے جو سرمایہ سخن کا ہے بجا
کی ہے سودا نے مرے بازار میں سوداگری

عرض مطلب کا عنوان کتنا نفسیاتی ہے :-

سارے عالم کو تو اس عہد میں ہے آسائش
گردشِ چرخ اگر ہے تو ذرا مجھ سے خلاف

کیوں فلک! سب کو مئے ناب مجھے خونِ جگر
شرطِ انصاف نہیں ہوتی ہے اے ناانصاف!

بزم و انجمن کا ٹھاٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

صدر میں مسندِ زرین و مرصع ہے وہ نصب
جس میں انجم کے گہر جس میں ہے سورج کی کرن

شامیانہ ہے مکلّل تو طلائی ہر چوب
جھالر ایسی کہ مکاں جس کی چمک سے ایمن

اور اس محفل میں ——————

عورتیں زہرہ جبیں رشکِ پری رقاصہ
نئے تیور، نئے انداز نرالی چتون

نوک پلکوں میں نگاہوں میں فسوں لب پہ ہنسی
گرمیاں باتوں میں ہر بات میں بیساختہ پن

سُرِ دیپک کے بھریں آگ لگائیں دل میں
تیر برسائیں کلیجوں پہ جو گائیں ساون

باجے ایسے کہ نہیں جن کی کوئی حد و شمار
نے و طنبور و دف و رود و سرود و ارغن

امیر مینائی نے اس قصیدے میں کہا ہے کہ میرے بلانے کے لئے بہت سے رئیسوں کے پیغام آئے مگر میں رامپور کا دربار چھوڑ کر کہیں نہیں گیا کیونکہ یہاں شعر و سخن اور کمال و ہنر کی خوب قدردانی ہوتی ہے ——————
—— پھر ممدوح کے حق میں دعا کی ہے :-

گلِ مقصود سے لبریز گریباں تیرا
دامنِ صبح میں جب تک کہ ہے سورج کی کرن

صاحبِ فوج رہے تو ترا لشکر قائم
جب تک افلاک پر انجم کی جمی ہے پلٹن

"باغ بے نظیر" —————— چاندنی رات میں :-

جتنے ہیں نخل و برگ و ثمر سب ہیں نور کے
شاخیں سفید، مرغ سفید، آشیاں سفید

سبزے پہ کیسے قطرۂ شبنم ہیں صاف صاف  دنداں ہیں ایسے سبز خطوں کے کہاں سفید
مقیش کو کتر کے جو چھڑکا ہے ہر طرف  وہ چند چاندنی سے ہے فرشِ مکاں سفید

پھر گریز کے بعد نواب کی تعریف میں گہر افشانی کی ہے:-

تبدیلِ رنگ کا ہو جو آب و ہوا کو حکم
بیلا زمیں سے سُرخ اُگے، ارغواں سفید

## غزلوں کی بیاض

غزلوں کی ایک بیاض ہے جس کی بعض غزلیں کہیں طبع نہیں ہوئیں اور بعض مشاعروں کے گلدستوں اور "پیام یار" وغیرہ رسالوں اور دوسرے اخباروں میں چھپ چکی ہیں —— ان غزلوں سے جو اشعار ایک نظر میں ہم نے انتخاب کئے ہیں، وہ ناظرین کے ذوق کی پذیرائی کے لئے حاضر ہیں:-

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے —— آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کے
کہتے ہیں کہ تو پھر مجھے کیا غیب کا ہے علم —— تم سے تو جو دل میں ہے بیاں ہو نہیں سکتا
زبانِ شمع ہر مجلس میں وقتِ صبح کہتی ہے —— کہ اُٹھا چاہتے ہیں یہ بھی جو دو چار بیٹھے ہیں
ابھی سے یہ رنگِ خود پرستی، ابھی سے یہ نازِ تیز دستی —— گلے سے شمشیرِ نازِ قاتل ابھی تو چھو بھی نہیں گئی ہے
جب کبھی گورِ غریباں میں وہ اترا کے چلے —— ہو لیا ساتھ وہ اُن کے جسے ٹھکرا کے چلے
کرتا ہوں آرزو جو رفیقِ طریق کی —— کہتا ہے سایہ آپ چلیں ہم سفر ہوں میں
دادخواہی کو جو ہم پہنچے فرشتوں نے کہا —— آپ بھی کب آئے جب برخاست محشر ہو گیا
ملامت کے مزے اب یوں لئے جائیں —— کہ برسے جائے واعظ ہم پئے جائیں
ندامت، معصیت کا خوب ہے جوڑ  گنہ کے ساتھ توبہ بھی کئے جائیں
نکھر کر حور بھی تجھ سی نہ ہوگی  اگر کوثر میں بھی غوطے دیئے جائیں

## فارسی دیوان

فارسی دیوان خاصہ خوشخط لکھا ہوا ہے، حیدرآباد دکن میں یہ قلمی دیوان مولانا عبداللہ العمادی مرحوم کو دیکھنے کے لئے دیا گیا تھا کہ کتابت کی غلطیوں کو درست کر دیں، مولانا نے دیوان پڑھ کر کتابت کی غلطیوں کو درست فرما دیا جس کے دو نمونے ہم یہاں پیش کرتے ہیں:-

اصل مسودہ میں لکھا تھا:-

خرمنم در مُرغے نے آشیاں در گلشنے  مطلب ایں برق و ایں صرصر نمیدانم کہ چیست

مولانا عمادی نے "مُرغے" کو "مزرعے" بنا دیا! شاعر نے یقیناً "مزرعے" ہی کہا ہوگا مگر کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم نے "مزرعے" کو "مُرغے" کر دیا —— ایک اور شعر ہے:-

تو وصد بزم آرائے باغیار  من و زاری کہ نتواں گفت بادل

مولانا عمادی کی ذہانت نے کاتب کی غلطی پکڑلی اور شعر کو اُس کی اصلی حالت پر لوٹا دیا۔

تو وصد بزم آرائی باغیار  من و رازے کہ نتواں گفت بادل

حافظ شیرازیؒ کی مشہور غزل (دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را) پر غزل کہی:-

دل رفت و با تپیدن مانوس کرد ما را
حق مغفرت نماید آں دردِ آشنا را

اس غزل کے مقطع میں اپنی کمتری اور حافظ کی برتری کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں:-

صد شعر از امیر و یک مصرعے ز حافظ
دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

امیر مینائی کو فارسی زبان پر جو قدرت حاصل ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے ــــ

وفا افسانہ ہا دارد کہ می باید شنید ایں جا — تپیدن، نالہ کردن، داغ گشتن خاک گردیدن
بر رحمتش نگاہ نہ کردن گناہ کیست — واعظ! بشراب ترک نہ کردن گناہ من

حالانکہ شراب چکھنی تو بڑی چیز ہے، امیر نے دختِ رز کو کبھی آنکھ سے بھی نہ دیکھا ہوگا، یہی رنگ امیر کے قابلِ فخر شاگرد ریاض خیر آبادی نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور شاعری کو مے و میخانہ بنا دیا۔

قطعِ ایں راہ بغیر از تپشِ دل نشود — منزلِ دوست بسے دور بود ہرزہ مگرد
یارب آلودہ بخوں دامنِ قاتل نشود — او بخوں ریزی و من محوِ دعایم دمِ ذبح
وائے بر قسمتِ مرغے کہ گرفتار نہ بود — صد چمن بود بہر گوشۂ دامِ صیاد
از کشتگانِ تست یکے نیم جاں ہنوز — جز چشمِ یاس کیست کہ گوید بقا تلم
آں راکہ درد نیست کجا غم کجا نشاط — دارد نہ رنج و غم دلِ درد آشنا نشاط
دستِ تو گیرم و از دستِ تو فریاد کنم — داد گر ہم تو و بیداد گرم نیز تو ئی
مزاج نازکے دارد دلِ اُمید وارِ من — قدم آہستہ نہ اے یاس! در جانِ نزارِ من
مرگ است زندگی چو نمیرم برائے تو — مُردن بعشق تست بہ از زندگی مرا
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ — از خود گزشتیم شد قصہ کوتاہ
اندک توقف اے مرگِ ناگاہ! — اشکے ز خجلت، آہے ز حسرت
تو در خوابی و در دامِ تو افتاد ست عنقائے — دلِ من صیدِ زلفِ تست از غفلت برآ غافل
تو بخود جلوہ کن ایں جا نہ دماغ ست نہ ہوش — تابِ دیدارِ تو آئینہ نہ دارد اے دوست

زماہی تا بہ مہ وز ذرہ تا مہر ست نخچیرش
زمیں تا آسماں دامے و بیدا نیست صیادے

(حاشیہ صفحہ ۴۸) لہ مولانا عبداللہ العمادی مرحوم جون پور کے رہنے والے تھے، عربی کے فاضل اور ادیب فارسی میں دستگاہِ کامل رکھنے والے، اُردو کے پختہ مشق انشاپرداز، ناقد، شاعر اور سخن سنج! حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں مترجم تھے، عربی کی کئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا، اس علم و فضل کے باوجود بیحد منکسر مزاج اور متواضع! شعر کا اتنا پاکیزہ ذوق بہت کم دیکھنے میں آیا، اس جامعیت کے لوگ اب کہاں؟ سنہ ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا اور بہت سے علمی اور مذہبی مضامین اور کتابیں یادگار چھوڑیں!

## داسوخت

"داسوخت" غالباً اُردو زبان کے شاعروں کی ایجاد ہی ——— "ایجاد" سے ہمارا مطلب ہے "پلاٹ"! ورنہ یوں تو "داسوخت" دراصل مُسدس ہوتا ہی اور "مسدس" نام بتا رہا ہی "کہ میں عربی نژاد ہوں" ——— "داسوخت" کا عام طور پر یہ پلاٹ ہوتا ہی کہ پہلے شاعر "عشق و محبت" کے محرکات داعیات اور اُس کے مآلِ کار پر گفتگو کرتا ہی" اس میں عشق پر طنز ہوتی ہی، کچھ تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں ... یہ کہ عشق نے بیچارے مجنوں سے جنگلوں کی خاک چھنوائی ——— فرہاد کو عشق ہی کی بدولت پتھر کاٹنے پڑے ...... جس کسی کو عشق کا آزار لگ گیا اُس غریب کی زندگی تباہ ہو گئی نہ وہ دین کا رہا نہ دُنیا کا! اس طنز و تعریض میں دلکشی اور جاذبیت ہوتی ہی ——— مریض اپنے مرض کی اسقدر لُطف کے ساتھ کیفیت بیان کرتا ہی کہ پڑھنے اور سُننے والوں کو حسرت ہو کہ ہائے! ہم بھی اس مرض میں مبتلا کیوں نہ ہوئے!

اس کے بعد معشوق کا سراپا بیان ہوتا ہی، اور اُس کے حُسن و جمال اور جسم و اعضا کے تناسب کی تعریف کے بعد خلوت و اختلاط کا ذکر کیا جاتا ہی ——— پھر پلاٹ میں " CLIMAX " کا آغاز ہوتا ہی، محبوب سے بے وفائی، بے رُخی اور کج ادائی ظہور میں آتی ہی، اغیار اُس سے دوستانہ کی پینگیں بڑھانے لگتے ہیں ——— یہ جناب عاشق صاحب بھی بڑے حضرت ہیں، یہ اپنے محبوب سے انتقام لیتے ہیں اور اُس کے جلانے کے لئے ایک دوسرے پری جمال اور حور تمثال سے ربط ضبط پیدا کرتے ہیں ......!

امانت لکھنوی کا داسوخت سب سے زیادہ مشہور ہی، ضلع جگت، کا امانت نے سچ تو یہ ہی کہ ایک طلسم کھڑا کر دیا ہی ——— امیر مینائی کے زمانہ میں "داسوخت" کہنے کا رواج تھا، امیر نے بھی داسوخت کہے[۱]، ایک بند ملاحظہ ہو:-

نہ مرا جُرم ہی اس میں نہ تمھارا ہی قصور ——— فتنہ انگیزی اعداء سے بڑا ہی یہ فتور
کچھ کا کچھ مجھ سے کہا تم سے کیا کچھ مذکور ——— آزمائش ہوئی ہاں! دونوں طرف سے منظور
دونوں جانب خبر کذب برابر گزری
آج جو آپ پہ گزری وہی مجھ پر گزری

امیر مینائی کا ایک اور "داسوخت" ہی ——— جس میں یہ سماں دکھایا گیا ہی کہ ایک مکان میں نقّال نقل کر رہی ہیں، اور شاعر بھی وہاں اتفاق سے موجود ہی، چلمن کے پیچھے عورتیں ہیں، ایک نقل پر چلمن سے قہقہہ کی آواز آتی ہی:-

ایک نقال نے اُس وقت جو کی نقل عجیب ——— قہقہہ مار کے چلمن میں ہنسا تب وہ حبیب
پہونچی اُس شوخ کی آواز جو کانوں کے قریب ——— ہو گیا دل کو یقیں ہی یہ وہی وائے نصیب!
کان ہنسنے میں جو آواز کو پہچان گئے
وہی خورشید ہی اس ابر میں ہم جان گئے

"صفیرِ آتشبار"[۲] کا رنگ دیکھئے:-

---

[۱] امیر مینائی کے چھ داسوختوں کا مجموعہ "مضامینِ دل آشوب" کے نام سے چھپ چکا ہی اور ساتواں داسوخت غیر مطبوعہ ہی۔

رنج کے نام سے ناواقف تھا نہ میں خستہ جگر کس فراغت سے مرے ہوتے تھے اوقات بسر
پہچھے راتوں کو رہتے تھے ہنسی دن دن بھر اب ہو یہ حال کہ اپنی نہیں کچھ مجھ کو خبر
ایک اُلفت نے مجھے داغ دکھائے لاکھوں
ایک چاہت نے کنویں مجھ کو جھکائے لاکھوں

اور پھر عشق میں رفتہ رفتہ یہ عالم ہو جاتا ہے۔

عکس رم کرتا ہے گھبرا کے اب آئینے سے
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے یہ دل سینے سے

تمام شاعروں کے "واسوختوں" میں شروع سے لیکر آخر تک ہوا و ہوس پائی جاتی ہے، ان استعاروں اور کنایوں میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ کسی طرح کھینچ تان کر تصوف کا پیوند جوڑا جا سکے ——— ہم جانتے ہیں کہ امیر مینائی ہوا و ہوس کے کوچہ گرد نہ تھے اُن کے اس قسم کے اشعار "رسمی" اور "روایتی" ہیں اس کو زیادہ سے زیادہ تفنن طبع کہا جاسکتا ہے ——— مگر شراب خانہ سے چاہے کوئی نماز پڑھ کر ہی کیوں نہ نکلے، دیکھنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ یہ حضرت جام و مینا سے شغل فرما کر برآمد ہوئے ہیں۔

**مثنوی** امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ عاشقانہ مثنوی میر حسن کی مثنوی کی بحر میں ہے، تین ہزار سے کچھ اوپر اشعار میں مثنوی سرخ اور سبز کاغذ پر خوش خط لکھی ہوئی ہے، "نیرنگی عشق" کا بیان اس صورت سے کرتے ہیں:-

محیطِ زمین و زماں عشق ہے زمیں عشق ہے آسماں عشق ہے
اسی سوز سے دل میں لالہ کے داغ اسی بو سے سنبل پریشاں دماغ
جو لب پر دمِ سرد بن کر رہا تو سینے میں یہ درد بن کر رہا
کبھی نافۂ چینِ گیسو بنا کبھی سرمۂ چشمِ جادو بنا
دھوئیں میں شرارہ اندھیرے میں نور یہی شمعِ ایمن یہی برقِ طور
کہیں کارفرما کہیں کارساز کہیں روح فرسا کہیں جانگداز
کہیں شانۂ موئے آشفتگاں کہیں بسترِ راحتِ خفتگاں
غرض یہ تلاطم ہے ہر نہر میں
یہ آشوب برپا ہے ہر شہر میں

اس افسانہ کا ہیرو شاہزادہ "ماہ پیکر" اپنی محبوبہ کی تلاش میں جنگل جنگل کی خاک چھانتا پھرتا ہے:-

وہ صحرا وہ جنگل نہ بستی نہ گاؤں پھڑتے تھے نقشِ قدم اُس کے پاؤں
سنبھلنے کی طاقت نہ معلوم راہ کبوتر ہو آندھی میں جیسے تباہ

شہر اُلفت آباد میں بادشاہ کے یہاں بڑی آرزوؤں اور مرادوں کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے، زہرہ جبیں اُس کا نام رکھا جاتا ہے، تخت و تاج کی یہی شاہزادی وارث ہے:-

قمر چہرہ زہرہ جبیں نام تھا بہارِ چمن روئے گلفام تھا

جو ہوتے ہیں شہزادیوں کے چلن　　وہ حاصل کئے اس نے سب علم و فن
جمال اُس کا مشہورِ آفاق تھا　　زمانہ نظارے کا مشتاق تھا
غضب کالی کالی وہ آنکھیں دلیر　　کہ ظاہر میں آہو تھیں باطن میں شیر
بچے اُن سے کیا کوئی پرہیزگار　　جو مژگاں کی ٹٹی میں کھیلیں شکار
ہوا گیارھواں سال آغاز جب　　تو گھر گھر ہوا جشنِ عیش و طرب
گرہ سالِ نو کی جو پڑنے لگی　　غریبوں کی تقدیر لڑنے لگی
ہوئی محفلِ جشن آراستہ　　یہ کثرت کہ تھا بند ہر راستہ

پڑی تھاپ طبلوں پہ ایسی کرخت
کہ سُن کر ہوئے نرم دلہائے سخت

جس زمانہ میں امیرؔ مینائی نے یہ مثنوی کہی ہے، اُس زمانہ میں مثنویوں اور داستانوں کا پلاٹ قریب قریب ایک ہی جیسا ہوتا تھا ——— کسی بادشاہ کے یہاں بڑی منتوں کے بعد اولاد کا ہونا، اس شاہزادے کا کسی دوسرے ملک کی شاہزادی پر خواب میں یا اُس کی تصویر کو دیکھ کر عاشق ہو جانا، پھر اُس کی جستجو میں جنگل جنگل اور بستی بستی مارے مارے پھرنا، راستہ میں کسی پری کا شاہزادے پر فریفتہ ہونا، اور شاہزادے کا بڑی مشکل سے اُس پری کے دام سے رہائی پانا ——— روشن ضمیر فقیروں کی دُعاؤں کے اثر سے حلِ مشکلات، جادو کے زور سے کچھ کا کچھ ہو جانا، عجیب و غریب واقعات کا پیش آنا ——— پلاٹ کی یہی خصوصیات امیرؔ مینائی کی اس مثنوی میں بھی پائی جاتی ہیں۔

مثنوی کے ایک باب کا عنوان "نثر" میں اس طرح لکھا ہے:-

"لے جانا پری چہرہ کا گلشن پری کو اپنی فرودگاہ میں اور بعد دریافتِ حال اُن دونوں کا ملکہ زہرہ جبیں کے پاس جانا اور گلشن پری کا بکنا اور بعد کنیز کی سرگزشت اپنے عشق کی شاہزادہ ماہ پیکر کے ساتھ بیان کرنا اور شاہزادے کے گم ہوتے پر ملکہ زہرہ جبیں کا بیقرار ہونا"

سب جانتے ہیں کہ اس قسم کے تمام "خاکے" قطعاً فرضی ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر واقعات کی اعجوبگی فطرت کے حدود کو بھی پھاند جاتی ہے، مگر عبارت کی دل نشینی کے سبب دل چسپی میں فرق نہیں آنے پاتا، رجب علی بیگ سرورؔ کے "فسانہ عجائب" میں کتنی بناوٹ، تکلف اور اعجوبگی ہے، مگر طرزِ بیان نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔

امیرؔ مینائی کی عاشقانہ مثنوی میں روانی اور بیساختگی پائی جاتی ہے، زبان کا لطف ہے محاوروں کا چٹخارہ ہے اور مضمون آفرینی بھی ہے، مقام اور محل کے اعتبار سے "تلازمہ" بھی خوب بنا ہا ہے ——— مگر انصاف یہ ہے کہ یہ مثنوی، میر حسنؔ کی مثنوی کی برابری نہیں کر سکتی!

حمد کے بعد نعت کا آغاز اس طرح کیا ہے:-

جو کوثر سے دھوؤں زبانِ قلم　　تو نعتِ محمدؐ کرادن میں رقم
ورق پردۂ دیدۂ حور ہو　　قلم شاخِ نخلِ سرِ طور ہو

سیاہی جو درکار ہو سب ملک　　مجھے اپنی آنکھوں کی دیں مردمک
یہ ساماں مہیا ہوں جس دم تمام　　لکھوں شوق میں نعتِ خیرالانام
اسی نور سے دفعِ ظلمت ہوئی　　سرافراز ایماں سے خلقت ہوئی
اسی نور سے دین گلشن ہوا
اسی نور سے کچھ روشن ہوا

کیا اچھا ہوتا کہ حضرت امیر مینائی کی قدرتِ سخن عاشقانہ مثنوی کی جگہ اخلاق و موعظت کے موضوع پر صرف ہوتی ــــــ اس مثنوی میں جس قلم نے رامش ورنگ کے چھینٹے اڑائے ہیں وہ اخلاق کے پھول بھی برسا سکتا تھا!

## ایک غلط فہمی!

بہت سے نامور شعرا، ایک دوسرے کے ہم عصر ہوئے ہیں، مگر معاصرت کی یہ خصوصیت امیر اور داغ ہی کو حاصل ہے کہ جب ان میں سے کسی ایک کا ذکر آئے گا تو دوسرے کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا جائے گا، یہ خود ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ سخن سنجوں اور اربابِ ذوق کی جس محفل میں داغ کے شعر پڑھے جاتے ہیں وہاں امیر مینائی کے شعروں کا ضرور تذکرہ ہوتا ہے۔

داغ کا تذکرہ کرنے سے قبل ہم اپنے اس خیال کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ داغ کے کمالِ شاعری کے ہم سے زیادہ معترف اور مداح بہت ہی کم لوگ ہوں گے، وہ جو اقبال نے کہا تھا:-

؎ اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون ؟

تو واقعہ بھی یہ ہے کہ میدانِ شعر و سخن میں ناوک فگنی بہت سوں نے کی مگر داغ جیسا قدر انداز پھر پیدا نہ ہوسکا، داغ نہ ہوتا تو اردو غزل ناتمام رہ جاتی، اردو شاعری پر داغ کا بہت بڑا احسان ہے، غزل آج کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے لیکن داغ کی شخصیت اب بھی منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔!

اس اعتراف کے بعد ہم آج کی صحبت میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کے ازالہ کی کوشش کر رہے ہیں، اس سے ہمارا مقصد کسی کو گھٹانا یا بڑھانا نہیں ہے، ہم ایک واقعہ اور حقیقت کو پیش کرنا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ ہماری باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھا جائے۔

شاعری میں معاصرانہ چشمکیں اگر حدود کے اندر رہوں تو بڑی پرلطف بلکہ فائدہ مند ہوتی ثابت ہوتی ہیں، مسابقت کا جذبہ جوہرِ کمال کو جلا دیتا ہے اور اس کوشش اور تگ ودو میں فطری استعداد کو ابھرنے کا موقعہ مل جاتا ہے ــــــ داغ اور امیر ہم عصر شاعر تھے، دونوں نامور اور با کمال! ان میں معاصرانہ چوٹیں بھی رہتی تھیں مگر وہ ایک دوسرے کے کمال کو پہچانتے تھے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ بعض شاگردوں نے اس معاصرانہ چشمک کو طول دے کر "رقابت" کی حد تک پہونچا دیا، ہم نے بعض تنقیدی مضامین میں امیر اور داغ کے معتقدین کی حریفانہ معرکہ آرائیاں دیکھی ہیں، ان معرکہ آرائیوں میں دلی اور لکھنؤ کے حریفانہ تصورات بھی شریکِ کار ہیں!

یہ تصور بھی اسی رقیبانہ کشمکش کی پیداوار ہے کہ "داغ دہلوی کے رنگِ شاعری کی مقبولیت سے متاثر ہو کر امیر مینائی نے بھی یہی رنگ اختیار کر لیا" ــــــ یہ رائے بہت کچھ شہرت پا چکی ہے، مگر داغ اور امیر کے

کلام کو پڑھ کر ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ اس خیال اور نظریہ کی تائید نہیں کرتا، ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، بعض لوگ وہ کہتے ہیں جو ابھی ابھی بیان کیا گیا ہے اور ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ داغ اور امیر دونوں کے دونوں آسمانِ شعر و سخن کے آفتاب و ماہتاب ہیں، دونوں کی شخصیتیں اپنی جگہ منفرد ہیں، اُن میں کوئی کسی کا مقلد نہیں ہے!

جب زبان معیاری بن جاتی ہے تو اُس زبان کے شاعروں کے یہاں "ایک رنگ" ایسا ہوتا ہے جس میں عمومیت پائی جاتی ہے اور یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے! بابا فغانی، سعدی، خسرو، عرفی، نظیری، خان خاناں، یہاں تک کہ علی حزیں اور غالب تک کے کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو ان شاعروں میں سے ہر شاعر سے منسوب کئے جا سکتے ہیں —— مثلاً غالب کا یہ شعر:-

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود
چشم من سوئے فلک روئے سخن سوئے تو بود

فارسی زبان کے بیشتر غزل گو شعراء سے منسوب کیا جا سکتا ہے، اس شعر میں "وہ چیز" ہے جو ایک زبان کے شاعروں میں مشترک ہوا کرتی ہے —— ندرت میرٹھی کے اس شعر کو:-

وعدہ کرتا ہوں مگر وعدہ وفا ہوتا نہیں
میری قسمت تم سے اپنا بھی کہا ہوتا نہیں

میر، مصحفی، آتش، مومن، امیر، داغ، وزیر، منیر، رسا، ریاض، مضطر، جلیل، سائل، بیخود، نوح، اور دوسرے شاعروں کا کہہ کر پڑھا جا سکتا ہے اور کوئی اہلِ ذوق یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شاعر کے رنگ کا یہ شعر نہیں ہے!

امیر اور داغ کے کلام میں بھی یہ "رنگِ عمومی" اور "کیفیت مشترک" پائی جاتی ہے، امیر کے اس شعر کو

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

داغ سے اور داغ کے اس شعر کو

وعدۂ وصل پہ ہر ایک کو لگائے رکھیے
کہ زمانہ اسی دھوکے میں اسی دم میں رہے

امیر سے منسوب کر دیں تو کوئی اس "غلط نسبت" کو پہچان نہیں سکتا!

داغ اور امیر کی شاعری جب شباب پر تھی اُس وقت "غزل" کا عام طور پر یہی رنگ تھا، جو ان دونوں اُستادوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔

غم نصیبوں میں محبت کے خوشی کا کیا کام —— کہیں ہنستے تو نہ آیا ہو تبسم مجھ کو (جلال)
ہنستے ہنستے کبھی روتا ہوں تصور میں ترے —— روتے روتے کبھی آتا ہے تبسم مجھ کو (داغ)

یہ دونوں شعر بندش، اسلوب اور مضمون کے اعتبار سے کس قدر ملتے جلتے ہیں —— تو کیا اس یکسانی اور ہم رنگی کو دیکھ کر یہ حکم لگا دیا جائے کہ جلال نے بھی داغ کا رنگ اختیار کر لیا تھا! —— اس "یک رنگی"

کا ایک منظر اور دیکھئے :-

زمانہ وصل میں لیتا ہے کروٹیں کیا کیا فراقِ یار کے دن کوئی انقلاب نہ تھا (امیر مینائی)

پھری تھی آنکھ وہاں دل یہاں بدل جاتا مرے شریک زمانہ کا انقلاب نہ تھا (جلال لکھنوی)

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا (داغ دہلوی)

## امتیازی خصوصیت

اس "یک رنگی" کے ساتھ ساتھ امیر اور داغ کے کلام میں امتیازی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جس کو دیکھ کر ایک اہلِ ذوق کہہ سکتا ہے کہ یہ داغ کا اور یہ امیر کا شعر ہے اور امیر و داغ ہی پر کیا منحصر ہے تمام نامور اور باکمال شعراء کے کلام میں جہاں "یک رنگی" ہے، وہاں اُن کا اپنا منفرد رنگ بھی جھلکتا ہے ـــــ مثلاً سعدی کے یہاں سلاست، حافظ کے یہاں مستی، عرفی کے یہاں جوش اور نظیری کے یہاں بلندیٔ تخیل ملتی ہے، جو ان سب کی امتیازی خصوصیات ہیں!

داغ کا یہ مطلع ؎

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

بول رہا ہے کہ میں "داغ کا شعر ہوں" اور امیر کا یہ شعر ؎

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں

آواز دے رہا ہے کہ مجھے امیر نے تخلیق کیا ہے!

امیر کے اس شعر میں ؎

گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل
آئی صدا ابھی تو مقام امتحاں کے ہیں

شوکت و وقار کا عالم نظر آتا ہے اور داغ کے یہاں :-

دل دیکھنے کو کہتے تھے دل پھیر لیجئے
پہلو نئے نئے تمھیں یاد امتحاں کے ہیں

معاملہ بندی کا لطف پایا جاتا ہے، دونوں شعر ایک ہی زمین اور ایک ہی ردیف قافیہ میں ہیں مگر انداز جدا جدا ہے! امیر شاعری کے میدان میں سج سجا کر آتے ہیں اور داغ بے تکلفی کے ساتھ انگلیاں چٹخاتے ہوئے نکل پڑتے ہیں، امیر سجاوٹ کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور داغ کے پیش نظر سادگی رہتی ہے، حسن سجاوٹ میں بھی ہے اور سادگی میں بھی! "آرٹ" دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے، ان میں سے کسی ایک کے "آرٹ" کا انکار یا تو بے ذوقی کی دلیل ہے یا "تعصب" کا ثبوت ہے، زمینِ شعر میں داغ و امیر دونوں نے پھول کھلائے ہیں!

## ضرب المثل اشعار

اُردو زبان میں امیر مینائی کے جتنے اشعار "ضرب المثل" ہوئے ہیں شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہوئے ہوں اور یہ کھلی ہوئی دلیل ہے، امیر کے کلام کی مقبولیت کی ـــــ امیر کے اس شعر کو :-

قریب ہے یار، روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

جسٹس سید محمود نے ہائی کورٹ کے ایک معرکہ آرا فیصلہ کا "عنوان" قرار دیا اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے کامریڈ کے افتتاحیہ مقالہ میں درج کیا ——— آمیر کے چند "ضرب المثل" اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر ——— خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ——— دونوں جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب ——— عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا
دل ہی نہ رہا امید کیسی ——— جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی
جو ہے بہار اُس کو خزاں کا خطر بھی ہے ——— اے باغباں! بسنت کی تہ کو خبر بھی ہے
شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیر ——— سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں
تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر ——— سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
بات رکھ لی مرے قاتل نے گنہ گاروں میں ——— اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا
ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں ——— پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے ——— زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

## اصلاحیں

امیر مینائی با کمال شاعر ہی نہیں، صاحبِ فن اُستاد بھی تھے! شاگرد کے شعر کو کاٹ کر خود اپنی طرف سے اچھا شعر لکھ دینا "اصلاح" کہاں ہوئی یہ تو "تصنیف" ہوئی! استادی تو اس کا نام ہے کہ شاگرد ہی کے مصرعوں کے رد و بدل اور اضافہ و ترمیم سے شعر کے نوک پلک درست کر دئے جائیں امیر کو اس فن میں "ید طولےٰ حاصل تھا" نواب کلب علی خاں مرحوم کا شعر تھا:۔

یہ کون آیا کہ جس کے بیٹھنے سے ——— اُٹھے ہیں سیکڑوں فتنے زمیں سے

امیر مینائی نے مصرعہ ثانی میں ذرا سی ترمیم کر دی ؎ یہ کون آیا کہ جس کے بیٹھتے ہی، اب اس اصلاح کے بعد شعر پڑھئے تو کچھ اور ہی لطف محسوس ہوگا، "ہی" میں کس قدر "FORCE" پایا جاتا ہے اور یہاں اس کا محل بھی تھا!

نواب صاحب مرحوم کے اس شعر کو ؎

بنائے ہیں ستمگر کیسے کیسے تو نے دنیا میں
پئے بیداد یارب دل بھی ہوں دو چار پہلو میں

بس ذرا قلم لگا کر، کہیں سے کہیں پہونچا دیا، ؎ ستم سہنے کو یارب دل بھی ہوں دو چار پہلو میں ———

"پے بیداد" میں تکلف تھا، اور لفظوں کے دروبست کے اعتبار سے بھی تناسب نہ تھا، اس "ستم سہنے" نے شعر میں دل نشینی پیدا کر دی۔

ریاض خیرآبادی نے غزل اصلاح کے لئے بھیجی، جس کا مطلع تھا

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا　　　آپ ہی بتائیں کون یہ موقعہ ہنسی کا تھا

امیر مینائی نے دوسرے مصرعہ کو یوں بنا کر ——— ؎ تم ہنس پڑے یہ کونسا موقعہ ہنسی کا تھا، شعر کے زمین و آسمان ہی بدل دئے، تنہا اس شعر نے ریاض کو کتنی شہرت دی ہے!

کوثر کا شعر تھا:-

کسر نہ رونے میں اے چشمِ تر اٹھا رکھنا　　　ذرا جو تھم گئے آنسو تو کرکری ہوگی

امیر مینائی نے اس طرح بدل دیا:-

جھپک نہ جائے مری آنکھ ابر ترسے کہیں　　　ذرا جو تھم گئے آنسو بڑی ہنسی ہوگی

"کسر" اور "کرکری" بازاری زبان کے لفظ تھے، امیر نے اس سخافت میں قیامت کی سلاست پیدا کر دی!

حضرت داغ دہلوی نے امیر مینائی کے واسوختوں کے مجموعہ پر قطعہ تاریخ لکھا ہے، اس میں اُن کے کمالات کا کس قدر کھل کر اعتراف کیا ہے:-

کیوں نہ ہوں لاجواب یہ واسوخت　　　ہے کلامِ امیرِ سحر بیاں

وہ سخنورِ سخن کی جس سے نمود　　　وہ ہنرورِ ہنر کا جس سے نشاں

نظم و نثر و عروض میں یکتا　　　رمل و جفر و نجوم میں ہمہ داں

منشی و مفتی و فقیہ و ادیب　　　کاملِ عہد و اکملِ دوراں

چشم بد دور مختصر یہ ہے　　　کہ نہیں اس کمال کا انساں

. . . . . . . . . . . . . . .

داغ نے اس کی یہ کہی تاریخ

دردِ عشاق و حالِ معشوقاں

۱۲۸۵ ہجری

## منتخب اشعار

امیر مینائی کا ایک قطعہ ہے جو اُردو شاعری کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا:-

اربابِ کمال چل بسے سب　　　سو میں کہیں ایک دُور ہے ہیں

محفل برخاست سب پتنگے　　　رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت آسماں پر　　　تارے کہیں نام کو رہے ہیں

ان کی بھی نمود ہے کوئی دم　　　وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

دُنیا کا یہ رنگ اور ہم کو

کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

آمیر مینائی کے چند منتخب اشعار :-

آمیر اس باغ میں رہ کر کریں کیا دم اُلجھتا ہے — نہ نخوت چھوڑتے ہیں گُل نہ کانٹے خو بدلتے ہیں

گُل نسیمِ سحری، شمعِ سحر کو نہ کرے — کوئی دم میں یہ غریب آپ بُجھی جاتی ہے

نہ گُل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں رو دیتے — تمھیں کو بلبلو آتا نہیں اندازِ شیون کا

تجھے کیا ہم جو وصفِ ساقیٔ گلفام کرتے ہیں — تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار — مُسکرا لینے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں

حُسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی نگاہ — جس قدر دیکھو اُبھرتا ہے بدن تصویر کا

ایک بار اے برق تکلیف اور کر جھگڑا مٹے — پھونک دے مجھ کو بھی میرے آشیانے کی طرح

اے طولِ زمانۂ اسیری! — بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے

اپنی کہو گزرتی ہے کس طرح سے آمیر — ہم ہیں فقیر لوگ ہماری بھلی کہی

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں — چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

آنکھ اُس نے پھیر لی تو کہاں پھر ہماری نسبت — آدھی تو جان نیم نگاہی میں رہ گئی

عجب دل چسپ نقشہ عالمِ ایجاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اُسے دل یاد رکھتا ہے

آمیر مینائی کا ایک سلام ہے :-

اجل بھی روئی شہیدانِ بے وطن کے لئے — خزاں اُداس ہوئی مُجرئی چمن کے لئے

دکھائی اصغرِ معصوم نے جو خشک زباں — اَجل نے پیار سے بوسے لبِ دہن کے لئے

غضب ہے چادرِ تطہیر کے جو مالک ہوں — شہید ہو کے وہ محتاج ہوں کفن کے لئے

عیاں ہیں سالِ وفات اس سے پنجتن کے آمیر
شرف عجیب یہ حاصل ہے "یاسمن" کے لئے

حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا سال وفات سنہ ۱۱ ہجری ہے جو "یا" سے نکلتا ہے، حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ سنہ ۴۰ ہجری میں شہید ہوئے اور حرف "م" کے چالیس عدد ہوتے ہیں حضرت امام حسنؓ نے سنہ ۵۰ ہجری میں وفات پائی، اُس کی تاریخ "ن" سے نکلتی ہے اور حضرتِ امام حسینؓ نے سنہ ۶۰ ہجری میں جامِ شہادت نوش فرمایا اور حرف "س" کے "۶۰" عدد ہوتے ہیں ——— "یاسمن" سے پنجتن پاک کے سالہائے وفات کی تاریخ کا نکلنا، خود "فن تاریخ گوئی" کا معجزہ ہے۔

**دوسرا رُخ** ہم نے پُوری ذمّہ داری کے ساتھ خوب جانچ کر اور تول تول کر تنقید کی ہے، ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ "تنقید" صرف بابِ مناقب ہی بن کر نہ رہ جائے، عقیدت کے اس غلو نے بہت سی حقیقتوں کو مسخ کر دیا ہے ——— آمیر مینائی کی شاعری کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ انھوں نے

اس قسم کے اشعار بھی کہے ہیں :-

اور اُبھرا جو ہوئی محرم چُست
کب دبائے سے دبا جوبن ہے

ایسے اشعار اول تو کسی شاعر کو بھی نہ کہنے چاہئیں مگر "مفتی امیر احمد مینائی" کو تو کسی طرح زیب نہیں دیتے! کاش ان شعروں کو امیر کے کلیات میں جگہ نہ ملتی! یہی سبب ہے کہ اسلام نے شاعری کی حوصلہ افزائی نہیں کی، امیر مینائی پر ہی کیا موقوف ہے بڑے بڑے صوفی اور پاک باز شاعر اس حمام میں آکر نیم برہنہ ہو جاتے ہیں اور خود اس مضمون کا لکھنے والا بھی اپنے دامنِ شاعری کو داغدار پاتا ہے، جس پر اُسے ندامت ہے اور اللہ تعالےٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔

شعر و سخن کا بہت زیادہ چرچا اور اُس سے غیر معمولی شغف دورِ جاہلیت کی باتیں ہیں، جاہلیتِ عرب کی تاریخ گواہ ہے کہ شاعری اور شراب دو چیزیں تھیں جو اہلِ عرب کی گھٹی میں پڑی تھیں، میخانوں سے لیکر رزم گاہوں تک شاعری ہی کا دور دورہ تھا، جام و مینا کی کھنک اور تلوار کی جھنکار سے قصیدوں اور غزلوں کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی تھی، اسلام کے بعد بھی کہیں کہیں یہ ذوق اس شدت اور مُبالغہ کے ساتھ باقی رہ گیا تھا کہ ایک مشہور شاعر اچھا شعر سُن کر زمین پر اپنی پیشانی رکھ دیتا، لوگوں نے اُس سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو، اُس نے جواب دیا کہ "تم لوگ قرآن میں سجدے کے مقامات سے واقف ہو اور میں یہ جانتا ہوں کہ کس شعر پر سجدہ کیا جاتا ہے" ...... یہ ذہنیت ہے جو "آرٹ" کی پرستش کرتی ہے اور "وجدان" جس کا معبود ہوتا ہے۔

اسلام کا ظہور ہوا اور قرآن کا غلغلہ بلند ہوا تو اُس کے آگے شاعری کے نغمے دب کر رہ گئے، سبعہ معلقہ پر پھر ایک شعر کا بھی اضافہ نہ ہو سکا، عکاظ اور ذوالمجنہ کے میلے ٹھیلے اور بازار سرد پڑ گئے، شعر خوانی اور التنا دمفاخرت کا وہ رنگ ہی باقی نہ رہ سکا ——— شاعری مُطرب و مُغنی اور شاہد و ساقی کو چاہتی ہے، عرب میں جب شاعری کا زور تھا تو وہاں عورتوں کے ساتھ بے باکانہ اختلاط بھی تھا، تمار و مے خواری بھی تھی اور نغمہ و سرود کی بھی ارزانی تھی، اسلام نے جاہلیت کی ان عیش پرستیوں کو یک قلم مٹا دیا، اور اُس کے ساتھ شاعری کی وہ جاہلانہ روح بھی ختم ہو گئی، اسلام کو صرف کی نہیں حسان بن ثابت جیسے شاعروں کی ضرورت تھی، اسلام میں قومی تفاخر اور نسلی غرور کی بھی گنجائش نہ تھی اس لئے فخر و ہجو کی شاعری بھی اُبھر نہ سکی - قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کو قرآن کی صرف ایک آیت جہاد کے لئے اُبھار سکتی تھی، اُن کو رجزیہ اشعار کے انجکشنوں کی ضرورت نہ تھی !

اسلام نے شاعری کو مٹایا نہیں بلکہ اس کا رُخ بدل دیا، جو شاعری فسق و فجور کی تبلیغ کے لئے وقف تھی اور جس سے ہوس ناک جذبات کی ترجمانی کا کام لیا جاتا تھا، وہ اخلاق و نیکو کاری کا درس دینے لگی، جس اسلام نے بُت پرستوں اور مُشرکوں کو آشنائے توحید، ڈاکوؤں اور چوروں کو امانت دار، لیٹروں کو دُنیا کا رکھوالا اور فاسقوں کو پاکباز اور قدسی کردار بنا دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عربوں کے "لٹریچر" کو جوں کا توں رہنے دیتا، اسلام

لے انگلیوں پر دھاریاں مہندی کی، لب رشکِ گلاب ※ اُس نے جی بھر کر لٹا دیں سُرخیاں میرے لئے (ماہر)

کا انقلاب زندگی کا مکمل انقلاب تھا، جاہلیت کی ایک ایک چیز کو بدلا گیا تو پھر شاعری اچھوتی کس طرح رہ جاتی۔
مسلمانوں میں دین سے بیزاری اور دوری پیدا ہوئی اور ہوا و ہوس کا غلبہ ہوا تو جاہلیت کی مٹی ہوئی یادگاریں پھر اُبھر آئیں، بنو امیہ اور بنو عباس کے درباروں اور محفلوں میں سب کچھ وہی ہونے لگا جو دَورِ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا ——— رقص و نغمہ، عورتوں کا آزادانہ اختلاط، شغلِ مے و مینا اور شعر خوانی! شاہی دربار سے لیکر حماموں تک شاعری ہی کا چرچا تھا، ایران میں پہونچ کر یہ نشہ اور تیز ہوگیا، بادشاہوں اور امیروں کی محفلوں کا ہم حال پڑھتے ہیں تو سب سے زیادہ ذکر شعر و سخن کا ہی ملتا ہے، اُن کے تعیش کدوں کا ایک ستون شاعری بھی تھی؛

آمیر مینائی تک بھی یہی رنگِ شاعری پہونچا، مسلمان رنگ رلیوں میں مبتلا تھے، ماحول پر جاہلیت کا اچھا خاصہ اثر تھا، لوگ عشق عاشقی کی باتیں شعروں میں سُننا چاہتے تھے یہی انداز مقبول تھا، آمیر مینائی آخر کہاں تک فکر و خیال کا دامن بچاتے، سب کے سب شاعر ایک ہی لے میں نغمہ سرائی کر رہے تھے ——— مگر پھر بھی آمیر نے اس ماحول میں یہ "پیام" دے کر بڑی جُرأت کا ثبوت دیا :۔

آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر

آخرت کا خوف دلانے والے شاعر اس دُنیا میں اتنے کم پیدا ہوئے ہیں کہ انھیں اُنگلیوں پر گنا جاسکتا ہے ——— آمیر کو یہ سعادت نصیب ہوئی!

اقبال نے اپنی شاعری میں "نکہتِ گل" اور "رنگِ چمن" سے کیا کیا کام لیا ہے مگر اقبال سے پہلے آمیر مینائی نے پیام دیا۔

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر

حضرت آمیر مینائی کا نعتیہ کلام اُن کے لئے پروانۂ بخشش اور سندِ مغفرت ہے، عشقِ رسولؐ ایک ایک شعر سے جھلکتا ہے ——— اور اُن کا یہ شعر :۔

کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ آمیر
نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

تو ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے اور مادہ پرستی کے بُت کدے میں حق و صداقت کی اذان و تکبیر!

ماہر القادری

# پیام

(جمعیۃ علماء پاکستان (سندھ) نے حضرت سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور دوسرے عرب زعماء اور اسلامی ممالک مندوبین کو عصرانہ دیا تھا، یہ نظم اسی اجتماع میں خود شاعر کی زبان سے سُنی گئی!)

اسلام کی تاریخ ورق لوٹ رہی ہے — ہیں ایک ہی مرکز پہ عرب اور عجم بھی
آنسو ہیں جو یک رنگ تو آہیں بھی ہم آہنگ — کشمیر کا ہے درد فلسطین کا غم بھی
تقریر میں یہ جوش، یہ الفاظ کی گرمی — جب اتنا ہوا ہے تو پھر اُٹھ جائیں قدم بھی
دُنیا کی قیادت کی سزاوار ہے وہ قوم — جو اُمتِ وسطیٰ بھی ہے اور خیرِ اُمم بھی
تقدیرِ الٰہی ہیں مسلماں کے ارادے — شاہد ہیں مہ و مہر بھی اور لوح و قلم بھی
وہ دل نہیں شایستۂ توحید کہ جس میں — افکار کے بُت بھی ہوں خیالوں کے صنم بھی

عزت کے نشاں، شوکت و اقبال کے سائے
گزرے تھے اسی راہ گزر سے کبھی ہم بھی

# شاہیں!

قابل اجمیری

تیرے مسلک میں نہیں سود و زیانِ تقدیر — تیری پرواز سے ہے شام و سحر کی تعمیر
چاک ہے تیری تگ و تاز سے دامانِ فضا — عقل پہنا نہ سکی تیرے جنوں کو زنجیر
خم ہے مغرور ہمالہ کی جبیں تیرے حضور — تیرے پنجے میں مہ و انجم و خورشید اسیر
رزق کی طمع تجھے لا نہیں سکتی تہِ دام — رائیگاں جاتی ہیں صیاد کی سعی و تدبیر

فاش کر دے تو مسلمان پہ فطرت کا یہ راز
بھوک کی آگ بجھا سکتا ہے اوجِ پرواز

شاعر لکھنوی

# شعر و نغمہ

چمن کو رُوحِ تبسم بھی ساز گار نہیں		بہار نام کی ہے۔ کام کی بہار نہیں
تری شکست گوارا جمالِ یار نہیں		میں کیا کروں کہ نگاہوں پہ اختیار نہیں
کلی کلی کے تبسم میں ہنس رہی ہے خزاں		بہار ایک حسیں خواب ہے بہار نہیں
اب اُس مقام پہ لائی ہیں گردشیں کہ جہاں		غمِ حیات کی تلخی بھی ناگوار نہیں
فریبِ چشم تماشا بھی کیا قیامت ہے		وہ سامنے ہیں مگر مجھکو اعتبار نہیں

سمجھ سکے گی وہ کیا روحِ انقلابِ چمن
کہ جو خزاں کی ستائی ہوئی بہار نہیں

# مجاز و حقیقت

مجاز دہلوی

بشر تھا موضوعِ آفرینش وجودِ کون و مکاں سے پہلے		قدم قدم پر تھے آسماں سن میں اس آسماں سے پہلے
مرے ہی ذوقِ نیاز مندی نے بندگی کو فروغ بخشا		یہ راہ نامحرمِ نشاں تھی مری جبیں کے نشاں سے پہلے
نیاز مندی طریقِ محکم نیاز مندی سرشتِ آدم		مچل رہے تھے جبیں میں سجدے تمہیں آستاں سے پہلے
روش روش میری منزلیں تھیں، شجر شجر میری رہ گزر تھی		چمن چمن تھا مرا نشیمن تصورِ آشیاں سے پہلے
وہی تھا مسکن تجلیوں کا وہی تھا مرکز مسرتوں کا		وہی تھا ظالم مرا نشیمن دھواں اُٹھا تھا جہاں سے پہلے
کلی کلی سے غمِ مآلِ بہار کا تھا اثر نمایاں		فضائے گلشن پہ چھا چکا تھا خزاں کا عالم خزاں سے پہلے

خدا رکھے جذبۂ جنوں کو مجاز یہ بھی عجیب شے ہے
بچھڑ کے ہم کارواں سے اپنے پہونچ گئے کارواں سے پہلے

نلیر اکبر آبادی:

وہ بے نقاب ہوا بھی تو بے نقاب نہ تھا		نظر حجاب بنی جب کوئی حجاب نہ تھا
بڑھی ہے قلب کی دھڑکن تمہارے وعدوں سے		اُمیدوار کو پہلے یہ اضطراب نہ تھا
نظر تو آج لڑی ہے نظر سے کیا کہیے		خراب کب یہ دلِ خانماں خراب نہ تھا
وہ ایک تم، تمھیں پھولوں پہ بھی نہ آئی نیند		وہ ایک میں مجھے کانٹوں پہ اضطراب نہ تھا

باطن بدن پوری:

کبھی جہاں کا، کبھی عیش جاوداں کا خیال		کبھی یہاں کا خیال اور کبھی وہاں کا خیال
حرم کی فکر، کبھی کوچۂ بتاں کا خیال		نہ جانے دل میں ہے میرے کہاں کہاں کا خیال

---

لہو روتا ہے جس کی یاد میں دل		وہ بزمِ عیش برہم ہو گئی ہے
گرفتارِ تگ و دو ہے زمانہ		ہر اک شے مایلِ رم ہو گئی ہے

ماہر القادری

# دفتریں!

—— یہ سید صاحب تو مسجد کے مُلّاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں، اس قسم کے بے وقوفوں اور عقل کے کودنوں کو سوسائٹی آخر برداشت کس طرح کرتی ہے! ان فرسودہ خیال مولویوں کے فتوے اس ترقی کے زمانہ میں چل نہیں سکتے، دُنیا فقہ کے مسائل اور شریعت کی موشگافیوں سے بہت آگے بڑھ چکی ہے! ان قل اعوذی قسم کے "مولاناؤں" کے کہنے میں آکر کیا میں لڑکی کے مستقبل کو تباہ کردوں —— آج کل بی۔ اے، ایم۔ اے جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور میری لڑکی کو ڈھائی سو روپیہ کی نوکری کا "start" مل رہا ہے، اتنا شاندار آغاز ہر کسی کو کہاں میسر آتا ہے!

یہ تنگ نظر اور بوالہوس دوسروں کو بھی اپنا ہی جیسے سمجھتے ہیں، ان کے دل میں خود چُور ہے، وہمی، بدگمان، بدنیت اور ہوس پرست کہیں کے! عورتوں کے اخلاق کو چلمنوں، بُرقعوں اور نقابوں سے ناپتے ہیں، ہر بے پردہ عورت ان کی نگاہ میں بدکار نہیں تو مشتبہ ضرور ہے! میرا بس چلے تو اس ذہنیت کے لوگوں کو عرب کے ریگستان میں جاکر چھوڑ دوں کہ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلّوں اور کھجوروں کے جھنڈ میں رہ کر اپنی تہذیب کو زندہ کرتے رہو، سائنس کی دُنیا میں تم رہنے کے قابل نہیں ہو، تمہارا وجود ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے —— ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہا، سننے والوں میں سے کسی نے مخالفت نہیں کی، کچھ خاموش رہے، دو تین سروں کو جنبش ہوئی کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، کسی کسی کی پیشانی سے گہرے سوچ کا بھی اظہار ہو رہا تھا، اسی عالم میں یہ صحبت برخاست ہوگئی!

دوسرے دن اتوار تھا، دفتر بند تھے، تیسرے دن شاہدہ کو ایک کمپنی میں ٹائپ کرتے ہوئے دیکھا گیا، یہ ایک لمیٹڈ کمپنی تھی، باہر کے ملکوں سے مختلف قسم کی مشینوں کے پُرزے یہاں سپلائی ہوتے تھے، کمپنی کا کام ایک لاکھ کے سرمایہ سے شروع ہوا تھا، اور چھ سال کی مدت میں سرمایہ کا پھیلاؤ بیس لاکھ روپیہ تک پہونچ گیا، مشینوں کے پُرزوں کے بیوپاریوں کو مُنھ مانگے دام ملتے ہیں، اس تجارت میں بہت نفع ہے، لوہا چاندی اور سونے کے مول بکتا ہے!

شاہدہ نے چند دن بہت سنجیدگی اور وقار کے ساتھ گزارے، کوئی ضرورت ہوتی تو دفتر والوں سے بات چیت کرتی اور وہ بھی سیدھی سادی "دفتری گفتگو" اس سے زیادہ کچھ نہیں! کام کرنے کو نہ ہوتا تو کتاب پڑھتی رہتی، دفتر کے کلرک شاہدہ کی کم آمیزی کے رنگ کو دیکھ کر بس جی ہی جی میں "زہرِ عشق" گنگناتے رہتے، اقدام کی جُرأت کسی کو نہ ہوئی، ان لوگوں کو جس قسم کی ٹائپسٹ گرلز سے واسطہ پڑتا رہتا تھا، شاہدہ اُن سے بالکل مختلف تھی، اُن کو خود حیرت تھی کہ یہ خانقاہ کی "راہبہ" یہاں کیسے آگئی!

اس کمپنی کے ہیڈ آفس میں کئی لڑکیاں ملازم تھیں، ان میں دو کا رنگ اس قدر سیاہ تھا جیسے ان کے بدن پر کسی نے کولتار پھیر دیا ہے، بھاری جسم، ٹھنگنا قد، کمر کافی گھیردار، موٹی موٹی پنڈلیاں —— ایک کی آنکھیں البتہ ذرا بڑی تھیں —— یہ شکل صورت اور اس پر پاؤڈر اور لپ اسٹک کی وہ لیپا پوتی کہ تہیں

سی جمی ہوئی نظر آتی تھیں، باہنوں میں گداز، گردن میں خم، باتوں میں لوچ، پنڈلیوں میں لچک اور انداز میں جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش اس پر مستزاد! بناوٹ اور بدصورتی کا شاید چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ایک اور لڑکی تھی جس کا رنگ تو صاف تھا مگر چیچک کے گہرے گہرے داغوں نے اُس کے چہرے کو بدنما بنا دیا تھا، چیچک کے داغ نہ ہوتے تو وہ خوبصورت ہوتی! یہ لباس کی شوقین تھی، روزانہ نئی نئی وضع کی فراکیں پہن کر آتی، ہنسوڑ اور خوش طبع بھی تھی، اُس کی چال ڈھال اور رفتار گفتار سے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ اپنا دل ہر وقت مٹھی میں لئے پھرتی ہے، ہر کسی سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی، دو ایک مسکراہٹیں اور ایک آدھ چُست فقرہ اُسے بے تکلف کرنے کے لئے کافی تھا ——— چوتھی لڑکی قبول صُورت تھی، گندمی رنگ کھڑا ناک نقشہ، میانہ قد کشادہ پیشانی، گردن البتہ ذرا نیچی تھی جسے "کوتاہ" تو نہیں کہہ سکتے مگر "صراحی دار" بھی نہ تھی، اس کا نام تھا مس مہتا، دفتر والوں کی دلچسپیاں اسی کے دم سے قائم تھیں۔

کمپنی کا منیجر مس مہتا کو پسند کرتا تھا، اس کے دو سبب ہو سکتے تھے ایک تو "کام"، دوسرا "شکل و صورت"! اب ان میں سے جو بات بھی ٹھیک ہو، بہرحال منیجر صاحب مس مہتا کو پسند فرماتے تھے، ان کی کوشش اور سفارش سے اس لڑکی کو دوسری ٹائپسٹ گرلز کے مقابلہ میں تیس روپیہ ماہوار کا الاؤنس زیادہ ملتا تھا، کمپنی کا منیجر چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔

یہ منیجر بڑا ہوشیار اور تجربہ کار تھا، اپنے کام میں مشّاق! انتظامی قابلیت تو اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اُس کے کام، تجربہ کاری اور فرض شناسی کی بڑی شہرت تھی، آدمی بھی توڑ جوڑ کا تھا، چند ہی مہینوں میں ایک دوسری کمپنی نے اُسے اپنے یہاں چھ سو روپیہ زیادہ تنخواہ پر لے لیا ——— اس کمپنی میں منیجر کی جگہ خالی ہو گئی، جس کے لئے اخباروں میں اشتہار دئے گئے، درخواستیں آئیں ——— دس بیس نہیں سیکڑوں، بارہ سو روپے ماہوار کی جگہ تھی! کمپنی کے ڈائرکٹروں کا بورڈ بیٹھا، درخواستیں چھانٹی گئیں، پھر اُمیدوار بلائے گئے، انٹرویو ہوا اور آخرکار ایک صاحب کا انتخاب ہو گیا۔

نئے منیجر صاحب کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس بیالیس سال کی ہو گی، خوب کھلتا رنگ لانبا قد، توانا جسم لیکن ناک کے خم نے چہرے کے سارے جغرافیہ ہی کو بگاڑ دیا تھا ——— مگر تجارتی کمپنیوں اور کاروباری اداروں میں ملازم کے ناک نقشہ کی موزونیت سے زیادہ اُس کی کارکردگی، قابلیت اور تجربہ کو دیکھا جاتا ہے اور یہ باتیں اس شخص میں موجود تھیں۔

منیجر نے دفتر میں آکر جس دن چارج لیا اُسی دن اُس نے دفتر کو گھوم پھر کر دیکھا، الماریوں پر نظر ڈالی مشینوں کے پُرزوں کے نقشوں (C H A R T S) پر نگاہ کی، عملہ کے آدمیوں کو دیکھا، کسی کسی سے بات چیت بھی کی، ٹائپسٹ لڑکیاں کیا کیا بن سنور کر آئی تھیں، ہر لڑکی نے منیجر صاحب کو پہلی نگاہ میں اپنا گرویدہ بنا لینا چاہتی تھی، شاہدہ البتہ متانت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی اور منیجر کو سب سے زیادہ اُسی نے متاثر کیا، نیلے رنگ کی ساری میں وہ اُس کا صبیح جسم، کتابی چہرہ، گھنی زُلفیں ——— اپنے ماتحتوں کی انگشت نمائی کا خیال نہ ہوتا تو وہ شاہدہ کو شوق و دلچسپی کی پوری قوت کے ساتھ دیکھتا۔

منیجر نے کمپنی کے عملہ کے پچھلے کام کو دیکھا اور دفتر کے فرائض اپنی مرضی سے کلرکوں کے سپرد کئے، اس نئے انتظام میں شاہدہ اُس کی اسٹینو گرافر مقرر ہوئی! منیجر نے خط کا مضمون بولتے میں قدرے بے تکلف ہو جانا چاہا مگر شاہدہ کی پیشانی کو اُس نے شکن آلود پاکر بات کو وہیں چھوڑ دیا، آدمی تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھا، ایک دو نہیں درجنوں ٹائپسٹ لڑکیوں سے اُس کا واسطہ پڑ چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ کس طائر کے لئے کونسا پھندا درکار ہے، ہوسنا کی اپنے محاذوں کو موقعہ محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، کبوتر اور چکور، ہریل اور بگلے ایک ہی طرح کے جال میں تو نہیں پھنس سکتے۔

چند دن کے بعد منیجر نے آفس سپرنٹنڈنٹ کی معرفت ٹائپسٹ لڑکیوں کے کان تک یہ خبر پہونچائی کہ کمپنی کی جانب سے ایک لڑکی انگلستان ٹریننگ کے لئے بھیجی جائے گی، یہ بہت بڑا لالچ تھا، انگلستان کی سیر و تفریح، اپنے پیسہ سے نہیں، کمپنی کے پیسہ سے! ہوائی جہاز کا سفر، دوگنی تنخواہ پھر ٹریننگ کے بعد ترقیوں کے میدان کھلے ہوئے! یہ تو وہ مقام تھا جہاں سے تقدیر کے نوشتے اور زندگی کے رُخ بدل جاتے ہیں!

دفتر کے انتظامی معاملات کی باگ ڈور منیجر کے ہاتھ میں تھی، شاہدہ ہی کیا دفتر کی تمام ملازم لڑکیاں جانتی تھیں کہ منیجر صاحب جس لڑکی کو چاہیں گے وہی لڑکی انگلستان جاسکے گی، انھی کی چشمِ کرم اور نگاہِ انتخاب خاک کو پاک اور ذرہ کو آفتاب بنا سکتی ہے۔

اس اعلان کے بعد منیجر نے محسوس کیا کہ شاہدہ کے انداز میں پہلی سی دوری اور بے گانگی نہیں رہی، وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ ایک ہی داؤں میں حُسن کا ایوانِ ناز و تمکین اپنی جگہ سے ہل گیا، ایک دن منیجر نے فائل پر دستخط کرتے ہوئے شاہدہ سے کہا — شاہدہ! تم نیلی رنگت کی ساری پہنا کرو، یہ رنگ تمھیں زیب دیتا ہے — وہ پیشانی جو ذرا سی بات پر شکن آلود ہو جایا کرتی تھی، آج ہموار تھی!

بات بڑھنے لگی، اقدام کی راہیں اب رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے خالی تھیں، ایک دن ایک خط کا پتہ لکھاتے ہوئے، منیجر نے "LOVE LANE" کہا اور پھر خود ہی بولا شاہدہ! اس گلی کا کتنا پیارا نام ہے "LOVE LANE" یعنی "کوچۂ محبت"! اور شاہدہ مسکرا دی، اُس مسکراہٹ نے منیجر کی ہوس کو اور دن سے زیادہ سہارا دیا، اُس نے شاہدہ کے حُسن کی تعریف کی، اس قسم کی گفتگو کا آج پہلا موقعہ تھا — مکان پہونچ کر شاہدہ کے ضمیر نے ملامت کی کہ نادان لڑکی یہ تو کس راہ پر جا رہی ہے! دیکھ! اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اُٹھا ہوا قدم اپنی جگہ پر واپس آسکتا ہے — وہ جھنجلانے لگی، جی میں آیا کہ والد سے جاکر آج کی باتوں کا ذکر کردوں مگر نفس فتنہ طراز نے کان میں کہا، "اور انگلستان کی سیر، وہاں کے مناظر، وہ ٹریننگ اور پھر ترقی اور کامرانی کی بارشیں...... " اس تصوّر کے آتے ہی جھنجلاہٹ رفو چکر ہو گئی، ضمیر کی آواز کو دبا دیا گیا اُس میں ایک سپردگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی

بے تکلفی ضرورت سے زیادہ بڑھ چکی تھی، اُسے بڑھنا ہی چاہئے تھا، طوفان میں چھلانگ لگا کر سوکھا کوئی کس طرح رہ سکتا ہے۔ منیجر اپنی کامیابی پر نازاں تھا — ہوسنا کی اوچھی اور کم ظرف بھی ہوتی ہے؛ ایک دن اُس نے کلب گھر میں خوب شراب پی اور شراب پی کر ہنکارنے لگا کہ میں راجہ اندر ہوں،

شہر کی خوب صورت لڑکیاں مجھے گھیرے رہتی ہیں، میں یہ ہوں، میں وہ ہوں ——— اور یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک تصویر جیب سے نکال کر میز پر رکھ دی ——— اور ہنستے ہوئے بولا :-

ع ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے ہیں!

کلب گھر میں لوگ اپنے اپنے شغل اور تفریح میں مشغول تھے، کوئی بلیرڈ کھیل رہا تھا، کہیں برج اور رمی ہو رہی تھی، کوئی شراب پی رہا تھا، کسی جگہ سیاسی مسائل پر تبصرہ ہو رہا تھا اور وھسکی کے پیگ بھی چل رہے تھے کمپنی کا منیجر کلب کے لان پر ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ایک رہا تھا، اُس کے قریب ہی کلب کے دو ممبر اور بیٹھے تھے، اُن میں ایک شخص نے تصویر اُٹھا کر دیکھی، یہ اُس کی بہن شاہدہ کی تصویر تھی ——— وہ (انجم) غصہ کے مارے آپے سے باہر ہوگیا، اُس نے پانی کا جگ اُٹھا کر منیجر کے سر پر دے مارا، جگ چھن سے ٹوٹ گیا اور منیجر کی پیشانی سے خون کے فوارے چھٹنے لگے، پھر انجم بھاگ کر گھر پہونچا، شاہدہ آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تصویروں کا اخبار دیکھ رہی تھی، اُس نے میز پر سے قلمدان اُٹھایا اور شاہدہ کے پھینک کر مارا، قلمدان شیشہ کا تھا جس کی دھار نے شاہدہ کے رُخسار کو خربوزے کی پھانک کی طرح دو ٹوک کر دیا۔

کلب گھر ہی سے لوگ اُس کا تعاقب کر رہے تھے، مکان میں ایک دوسرا وقوعہ ہوگیا، انجم کو گرفتار کر لیا گیا، ایک نہیں دو مقدمے اُس پر قایم ہوئے اور وہ بھی اقدام قتل کے! منیجر نے کلب گھر میں جو تصویر دکھائی تھی، وہ بھی عدالت میں پیش ہوئی، یہ ایک فوٹو گروپ تھا جس میں منیجر شاہدہ کے بالوں کو سلجھا رہا تھا اور شاہدہ مسکرا رہی تھی ——— شاہدہ کا باپ اس صدمہ سے پاگل ہوگیا، بیٹا اُس جرم میں ماخوذ تھا جس کی سزا پھانسی بھی ہوسکتی تھی، بیٹی کی وہ بدنامی ہوئی کہ سارا شہر تھو تھو کر رہا تھا، غیرت مند اور حساس کے لئے دو ہی صورتیں تھیں خودکشی یا دیوانگی!

شاہدہ کا باپ پاگلوں کی طرح گلی گلی چیختا، چلاتا اور بکتا پھرتا :-

"سید صاحب! میری خطا کو معاف کردو، میں نے تمھاری نصیحت کو ٹھکرا دیا، تمھیں بُرا بھلا کہا، میرے منہ پر تھوکو! ہاں! ہاں! تھوکو میرے منہ پر سید صاحب ——— !

شہر میں یہ جملہ اس واقعہ کے بعد سے ایک کہاوت اور ضرب المثل بن گیا، کوئی کسی کو چھیڑنا چاہتا تو کہتا :-

"سید صاحب! تیرے منہ پر تھوکیں ———"

---

JUG ۵۱ء

# ہماری نظر میں! | مشامِ رُوح

"مشامِ روح" از:— تاباںؔ القادری، ضخامت ۱۶۲ صفحات
مجلد رنگیں گرد پوش کے ساتھ، قیمت ڈھائی روپے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ قادریہ ۲۲ خانقاہ شریف لین، کلکتہ ۱۴

"مشامِ روح" ـــــ جناب تاباںؔ القادری کے کلام کا مجموعہ ہے، جس پر خان بہادر رضا علی صاحب وحشتؔ نے مختصر سی تقریظ لکھی ہے، اور اپنی پسند کے گیارہ منتخب اشعار درج فرما دیئے ہیں، اُس کے بعد خود شاعر نے دو صفحوں کا پیشِ لفظ تحریر کیا ہے جس کا یہ رنگ ہے:- (صفحہ ۲) کلام پست اور رائے موافق سُنا آپ نے یہ وہ منطق ہے جو پہلے مرد کو عورت فرض کروالے پھر مرد کے بچہ پیدا ہونا ثابت کر دکھائے .. .. .." ـــــ "پیش لفظ" کے آخری پیراگراف کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے "مشامِ رُوح میں، میں نے اپنی شاعری کا دَور دور قائم کر لیا ـــ" شاعر کی لکھی ہوئی ان چند سطروں کو پڑھ کر اُس کے ادبی ذوق کے متعلق اچھی رائے قایم نہیں ہو سکتی!

تاباں صاحب کے چند منتخب اشعار ہم یہاں درج کرتے ہیں:—

منزل بھٹک رہی ہے ہماری تلاش میں        کھوئے گئے ہیں راہِ محبت میں ہم کہاں
بس اتنا کہہ کے ہوئی شمعِ بے زباں خاموش        کوئی کسی کی محبت کا راز داں نہ بنے
دل اپنی راہ کا تنہا مسافرِ دُور افتادہ        نظر ناواقفِ منزل، قدم گم کردۂ جادہ
کچھ کھو چکا ہوں عشق میں اتنا خیال ہے        کیا چیز تھی یہ بات فراموش ہو گئی
کیا سنبھلنے کا نہ موقع دے گا دل کا اضطراب        کیا بیانِ درد پر مجبور ہو جاؤں گا میں
گرا دیا ترے قدموں پہ لغزشِ پا نے        ہم اپنے شوق کی وارفتگی کو کیا کرتے
گناؤ گے کہاں تک یہ پاؤں کے چھالے        ہیں تم سے دور بہت دُور کارواں والے

## رُباعی

ہر عقدۂ دشوار کو سر کرنا ہے        شبنم کی حقیقت کو گہر کرنا ہے
پھولوں کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے        کانٹوں کی حقیقت پہ نظر کرنا ہے
یہ منزل سے مجھے تم نے صدا دی        کہ آواز درائے کارواں ہے
تڑپ رہا ہے زمانہ سکون کی خاطر        سکون کا کہیں نام و نشاں جہاں میں نہیں
تھا مرے لب پر مقدر کا گلہ        کیا ہوا یہ آپ کیوں شرما گئے
ہونا پڑے گا سب کو گرفتارِ رنگ و بُو        پھیلا ہوا ہے دام چمن میں بہار کا

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے:- خیالِ خبطِ ناروا، حضورِ حُسن میں خطا        بہ شانِ بندۂ رضا فغاں بلب کبھی کبھی

مصرعہ اولیٰ گنجلک ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ "خبطِ ناروا" اپنی جگہ خود ایک مستقل "معمہ" ہے!        ہجومِ یاس و غم، جلوؤں کی کثرت نور کی بارش        زیادہ ہے مری خلوت میں رونق اُن کی محفل سے

"جلوؤں کی کثرت اور نور کی بارش" کی توجیہہ ضروری تھی کہ عاشق کی خلوت میں یہ نور کی بارش آخر کہاں سے ہو رہی ہے، "ہجومِ یاس و غم" کے بعد ہی کثرتِ جلوہ اور بارشِ انوار کا ذکر بے جوڑ سا ہے!

بڑھتے ہی جا رہے ہیں سوالاتِ بیکسی        سوئی پڑی ہے غیرتِ اہلِ کرم کہاں

"سوالاتِ بیکسی" نہایت ہی نامانوس ترکیب ہے! یہ شعر شاعر کی ناپختہ کاری کی غمازی کر رہا ہے!

ڈھونڈ ہی لوں گا الم کی تلخیوں میں کیف کچھ بند مجھ پر بابِ میخانہ ہوا تو کیا ہوا

اس "کیف کچھ" نے مصرعِ اولیٰ کا ستیاناس کر دیا، دوسرا مصرع اچھا خاصہ ہے کاش! مصرعِ اولیٰ دوسرے مصرع کی ٹکر کا ہوتا

کس کے نغموں سے ہے پُر اپنا ربابِ ہستی چھیڑ کر دیکھ تو لے تارِ رگِ جاں کوئی

"پُر" اور اُس کے بعد "اپنا" ان دونوں لفظوں نے مصرع کو کرخت بنا دیا، کاش! یوں ہوتا

؎ کس کے نغموں سے ہے معمور ربابِ ہستی" —— حالت کا کوئی علم نہ بیداد کا شکوہ پابندِ محبت کے ہیں لب بند، نظر بند

مصرعِ ثانی خوب ہے مگر "حالت کا کوئی علم" اس ٹکڑے نے شعر کا سارا حُسن ہی غارت کر دیا

"صفحہ ۲۵) پر "سادہ" کا قافیہ "وعدہ" باندھا ہے —— حیرت ہے!

مجھے جنونِ محبت، انھیں حیا کا خیال سکوں کی شکل اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

"جنونِ محبت" اور "حیا" میں آخر مماثلت یا وجہِ تقابل کیا ہے؟ اور "خیالِ حیا" کیا سببِ بیقراری اور "سکوں دشمن" ہوتا ہے۔

ہے کائناتِ محبت کا انتشار وجود جہانِ شوق کو وابستہ قرار نہ کر

یہاں "انتشار" نہیں "اضطراب" کا محل ہے!

نامُرادی ہم کو بن جاتی ہے تحریکِ عمل برق سے پیدا خیالِ آشیاں کرتے ہیں ہم

"ہم کو بن جاتی" ہے روزمرہ کے خلاف ہے "ہمارے لئے بن جاتی ہے" کہنا تھا!

تاباںؔ صاحب کو اپنے مجموعہ کلام کو منظرِ عام پر لانے میں اتنی جلدی نہ کرنی چاہئے تھی اُن کی طبیعت میں روانی اور شگفتگی ضرور ہے مگر کلام میں پختگی نہیں آئی، یہ نالہ، چونکہ ابھی تک "خام" ہے اس لئے سینہ میں اُسے چند دن اور تھامنا تھا، یہاں تک کہ شاعر اس طرح کے شعر

بے زباں شمع کو آشفتہ بیانی دے دوں کوہ و صحرا کو گلستاں کی کہانی دے دوں (صفحہ ۶۶)

بکثرت کہنے لگتا —— غزلوں کے مقابلہ میں تاباںؔ صاحب کی نظموں میں روانی اور جوش زیادہ پایا جاتا ہے، اُن کی طبیعت کو اجمال سے کم اور تفصیل سے زیادہ مناسبت ہے۔

کوئی صاحب شاعر آفاقی ہیں، اُن کا لکھا ہوا "تعارف" کتاب کے آخر میں شامل ہے جس نے "شامِ رُوح" کے وزن کو کم کر دیا —— فرماتے ہیں:۔

"آپ میں اُستادانہ صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے" ... ... "ہر چند آپ کی اصلاحی صلاحیت کا اندازہ اربابِ نظر بخوبی لگا سکتے ہیں پھر بھی ایک مطلع عام تشفی کے لئے پیش کرتا ہوں ... ..."

اس "عام تشفی" کا جواب ہے، اُردو ادب میں؟ —— ابھی تو "فاران" کے ناظرین مُسکرا ہی رہے ہیں، قہقہہ کی نوبت کہاں آئی ہے، مگر اس کے لئے بھی شاعر آفاقی صاحب یا شاعر صاحب آفاقی کے مضمون میں کافی مسالہ موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

"تاہم آپ (تاباںؔ صاحب) کی صحبت میں مجھے جس قدر آپ کے خیالات کا علم ہو سکا ہے وہ میں عرض کرتا ہوں، آپ اپنی شاعری کو "الہامی شاعری" تصور فرماتے ہیں، مطلب آپ کا یہ ہوتا ہے کہ آپ کی طرح نہ کسی شاعر پر الہام ہوا ہے نہ ہو سکتا (اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ ایسا الہام نہ کسی شاعر پر ہوا نہ ہو سکتا ہے) اب اگر اس کی تاویل "خاتم الشعرا" سے کی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

—— تاباںؔ کی شخصیت ایک بہت بلند شخصیت ہے اور کسی بلند شخصیت کی صحیح قدر نہ کسی زمانہ میں ہوئی ہے نہ آج اُمید کی ...